ہز ہائینس مہاراجہ پٹیالہ

نانکن میں شہر پناہ کے دروازہ سے جمہوریہ چین کے بانی
سن یات سن کے مقبرے کا نظارہ

بنام قوت وحیات

کلیم دہلی

آئے گا مگر جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم

آ بھی گئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

منظور شدہ
ڈائرکٹران تعلیم
ریاستہائے میسور، پٹیالہ وحیدرآباد (دکن)

سالانہ چندہ: چھ روپے
ششماہی چندہ: تین روپے آٹھ آنے
چندہ سہ ماہی: دو روپے
قیمت فی پرچہ: نو آنے

جلد ۵ | بابتہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۸ء | نمبر ۱

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ کلیم دریا گنج نمبر ۲ دہلی سے شائع کیا)

اشارات

ہندوستان کی غلامی کے ذمہ دار

اسلامی حکومت کے زوال، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عروج کے اسباب و علل پر میں کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہتا —— نہ یہ عرض کرنا ہی چاہتا ہوں کہ وہ کیا اسباب تھے، جن کی بناء پر ہندوستان کا سا ملک، ایک غلام ملک بن کر رہ گیا۔

اس وقت تو صرف اِس امر پر غور کرنا مقصود ہے کہ اِس بیسویں صدی میں، جب کہ تمام قومیں بیدار ہو چکی ہیں، وہ کونسی بنیادی شے ہے جو ہندوستان کو اُبھرنے کا موقع نہیں دیتی۔ اور بدستور اُسے مغلوب و محکوم بنائے ہوئے ہے؟

اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان کو غلام بنائے ہوئے ہے، انگریز کا تدبر، انگریز کی حکمت عملی، انگریز کے جنگی جہاز، انگریز کی فوجیں، توپیں، اور مشین گنیں، یا انگریز کی وہ چیز جسے ہم اہلِ ایشیاء اقبال کے وسیع المعنی لفظ سے منسوب کرتے ہیں، تو میں نہایت بلند آواز سے کہوں گا کہ یہ غلط، اور سراسر غلط ہے۔

بیشک انگریزی حکومت کا شعورِ حکمرانی، انگریزی حکومت کی بحری و بری و ہوائی قوت، اور انگریزی حکومت کا طنطنہ ایک بہت ہی بھیانک اور مہیب چیز ہے لیکن ہندوستان کے سے دیو پیکر و عظیم الشان براعظم کی طاقت کے سامنے، بشرطیکہ وہ اپنی طاقت کو استعمال کر سکے، بیچارہ انگلستان

مدیر

تو کیا چیز ہے، تمام یورپ کی تمام مجموعی قوتیں بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہیں۔

لیکن اِس تمام عظمت و پہنائی کے باوجود ہندوستان آج ایک مغلوب و مفتوح ملک بنا ہوا ہے۔

آخر اِس کے اسباب کیا ہیں؟

ہر چند میں سیاسیات کا ماہر نہیں ہوں، اور اسی وجہ سے یہ بہت ممکن ہے کہ میری رائے سطحی، یا غلط ہو، مگر میں نے خلوص کے ساتھ جس چیز کا پتا چلایا ہے، اجازت دیجئے کہ اُسے آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔

میرے نزدیک ہندوستان کو انگریز نہیں، بلکہ غلام بنائے ہوئے ہیں ہندو، اور مسلمان —— جی ہاں، آپ کے کانوں کو دھوکا نہیں ہوا، میں نے یہی عرض کیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو غلام بنائے ہوئے ہیں، اُن کے مذاہب۔

مذاہب کا نام سنکر آپ چونکئے نہیں۔ یہ ہم میں بڑا عیب ہے کہ اِدھر مذہب کا نام سُنا، اُدھر ہم کف در دہاں ہو کر حیص و بیص کرنے لگے۔

حواس کو مجتمع کر کے میری بات سُنیئے —— میں نفسِ مذہب پر کوئی حملہ نہیں کر رہا ہوں —— یہ میرا ادعا نہیں کہ ہندوؤں مسلمانوں کا مذہب ایسا ناقص ہے کہ وہ اُنھیں غلام بنائے ہوئے ہے۔

میں تو صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ہندو، اور مسلمان، دونوں مذہب اور مفہوم مذہب کو اِس غلط طور سے استعمال کر رہے ہیں کہ اُن میں مشترکہ قوم کی مجموعی قوت پیدا ہی نہیں ہونے پاتی، اور اِسی وجہ سے ہندوستان

اب تک آزادی سے محروم ہے ۔

مذہب اور مفہوم مذہب کے غلط استعمال سے میری یہ مراد ہے کہ ہم مذہب کو زندگی کے ہر مسئلے میں پیش پیش رکھتے، اور حیات کے ہر چھوٹے بڑے شعبے کو مذہب، اور صرف مذہب ہی کی ترازو میں تولا کرتے ہیں، تمدن ہو کہ معاشرت، سیاست ہو کہ اقتصادیات، فنونِ لطیفہ ہوں کہ علوم ریاضی اور علم مجلسی ہو کہ تدبیر منزل، یہ تمام مسائل اُس وقت تک ہمارے نزدیک ہیچ و پوچ ہیں، جب تک کہ مذہب اُن پر مُہر تصدیق ثبت نہ کردے ۔

ہندوستان کے علاوہ اس کرۂ ارض میں اور بھی بہت سے ملک ایسے ہیں جہاں متعدد مذاہب کا وجود پایا جاتا ہے، لیکن ہندوستان کی طرح وہاں یہ اندھیر نہیں ہے کہ مذہب کے بغیر قدم ہی نہ اُٹھایا جاتا ہو۔ ہزاروں ٹھوکریں کھانے، اور کثیر مقدار میں خون بہا چکنے کے بعد دیگر اقوام کی سمجھ میں یہ بات آچکی ہے کہ مذہب نام ہے ایک ذاتی اور پرائیویٹ تصور کا، ایک ایسے ذاتی اور پرائیویٹ تصور کا جسے زندگی کے دیگر مسائل پر حاوی نہ ہونا چاہئیے، اور جس کی بنا پر انسان کو انسان سے نفرت کرنا کسی طرح جائز نہیں ہوسکتا۔

لیکن ہندوستان میں مشکل یہ آپڑی ہے کہ یہاں مذہب کے بغیر سانس تک لینا حرام سمجھا جاتا ہے —— ذرا تصور کیجئے۔ اُس ملک کی بدبختی کا جہاں چھینک آتے ہی "الحمد للہ" کا نعرہ لگایا جاتا ہو، اور جہاں جماہی آتے ہی فوراً چٹکیاں بجنے لگتی ہوں —— اور جہاں غسل خانے میں داخل ہوتے ہی کان پر ڈورا لپیٹ لیا جاتا ہو ——

میں، جیسا کہ ابھی عرض کرچکا ہوں، مذہب کی تنقیص نہیں کرنا چاہتا، لیکن اتنا کہوں گا اور ضرور کہوں گا کہ مذہب لاکھ مقدس سہی، مگر اُس کے سبب سے وطنیت کے حقوق کو مجروح نہ کرنا چاہئیے ——

کیونکہ کسی چیز کو خواہ وہ کتنی ہی مقدس کیوں نہو، عقلِ انسانی اِس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ زندگی کے بنیادی اصول، اور اساسی مسائل کو تباہ کردے۔

میں اس قول کو بسر و چشم قبول کئے لیتا ہوں کہ مذہب ایک آسمانی چیز ہے، لیکن کسی کی مجال ہے کہ وہ اِس حقیقت سے انکار کردے کہ مذہب ایک ایسی آسمانی چیز ہے، جسے آنِ واحد میں تبدیل کردیا جاسکتا ہے، اور اس کے برخلاف وطنیت ایک ایسی ارضی شے ہے کہ کروڑوں صدیوں کی گردشِ پیہم کے بعد بھی تبدیل نہیں کی جاسکتی —— اس لئے آئیے آج سے ہم یہ عہد کرلیں کہ ایک آنِ واحد میں تبدیل ہوسکنے والی چیز کو، خواہ وہ کتنی ہی مقدس کیوں نہو، ہم اس قدر اقتدار و اختیار کبھی نہیں دیں گے کہ وہ اُس شے کو ٹھیس پہونچا دے جو کبھی، اور کسی حالت میں بھی تبدیل نہیں ہوسکتی ہے۔

اچھی طرح اسے ذہن نشین فرمالیا جائے کہ مشورہ یہ نہیں دیا جارہا ہے کہ ہندو، ہندو — اور مسلمان، مسلمان نہ رہے، اور یہ دونوں خدا نخواستہ اپنے اپنے مذہب کو ترک کردیں —— ہندوؤں اور مسلمانوں کو کامل اختیار اور مکمل آزادی ہے کہ وہ صرف تمام عمر ہی نہیں، بلکہ حیات بعد الممات میں بھی ہندو اور مسلمان ہی رہیں۔ لیکن صرف اسی قدر مؤدبانہ درخواست ہے کہ اپنی فلاح و بہبود کی خاطر اور اپنی آئندہ نسلوں پر رحم کھا کر ہندو اور مسلمان یہ تہیہ کرلیں کہ وہ

(۱) مذہب کو ایک شخصی، اور پرائیویٹ چیز سمجھیں گے۔

(۲) مذہب کی بنا پر ایک دوسرے کو آزار نہیں پہونچائیں گے۔

(۳) مذہب کی رُو سے اپنے کو علیحدہ علیحدہ دو قومیں نہیں سمجھیں گے،

(۴) اپنے کو ایک قوم سمجھکر، جیسا کہ درحقیقت ہے، زندگی کے تمام اُمور میں دوش بدوش جنگ کریں گے۔

(۵) اور پبلک میں اپنے کو "ہندو" اور "مسلمان" کہنے کے عوض خود کو "ہندوستانی" اور صرف "ہندوستانی" کہیں گے۔

(۶) اور اگر کوئی اُن سے اُن کے مذہب کے باب میں سوال کرے گا تو وہ اُسے اپنے وطنِ عزیز، اور اپنی متحدہ قومیت کا دشمن سمجھکر نہایت درشتی کے ساتھ یہ جواب دیں گے کہ "تجھے ہمارے پرائیویٹ حالات، اور ہمارے سربستہ اسرار دریافت کرنے کا حق کہاں سے پہونچتا ہے؟" اور اُسی کے ساتھ ساتھ اُس سے یہ بھی کہیں گے کہ "تو ایک ایسا خطرناک جاسوس معلوم ہوتا ہے کہ خانہ تلاشی کے عوض ہماری "ذہنی تلاشی" کی فکر میں لگا ہوا ہے —— جا اپنے کیمپ تک یہ افسوسناک خبر پہونچا دے کہ ہم ہندوستانی اور صرف ہندوستانی ہیں، ہندوستانی کے سوا ہم اور کچھ نہیں ہیں۔

کسی کو یقین ہو کہ نہو —— مگر مجھے تو یقین، بلکہ کامل یقین ہے کہ

بس روز ہم سب اپنے کو ہندوستانی صرف ہندوستانی، خالص ہندوستانی، ظاہر و باطن ہندوستانی اور اوّل و آخر ہندوستانی سمجھ لیں گے، تو اُس کی دوسری صبح کو جب آفتاب طالع ہوگا تو وہ آزاد ہندوستان کے اُفق سے طالع ہوگا۔

موت زندہ باد!

روزنامہ "پیام" حیدرآباد دکن، مورخہ ۱۲ر اکتوبر ۳۷ء کے ذریعے سے یہ خبر معلوم ہوئی کہ حیدرآباد میں منشی پریم چند مرحوم کی برسی بڑے تزک و احتشام سے منائی گئی اور حیدرآباد کے اکابر و ادبا نے اس میں سرگرم حصہ لیا۔ اور منشی صاحب مرحوم کے ادبی و قومی خدمات کو بڑے پُرجوش طریقے سے سراہا گیا۔

یہ وہی چیز ہے جس کے وقوع کی پہلے ہی سے توقع تھی۔ اور منشی صاحب کی وفات کے موقع پر "کلیم" میں جس کے متعلق اس طرح اظہارِ خیال کیا گیا تھا کہ:-

"پریم چند! مبارک ہو کہ تو اس مایا کے جال، اور اس جھوٹے سنسار سے نکل گیا، جہاں دولت کے سوا کسی جوہر کی پرستش نہیں ہوتی، تو اس ہندوستان کی بھری محفل کے ویرانے سے اُٹھ گیا، جہاں اہلِ قلم کو رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔

اے ہندوستان کے مُردہ پرستو! آؤ، اب تمہاری جست و خیز کی باری ہے ـــــ پریم چند مر گیا، اب اخباروں میں مقالے لکھو، اُس کی تعریفوں کے پُل باندھ دو۔ اور اُس کی یادگار قائم کرنے کی، جھوٹے پلیٹ فارموں سے آوازیں بلند کرو۔ تاکہ دُنیا تمہاری معارف نوازی، اور علم دوستی پر ایمان لے آئے ـــــ ایسے زرّیں مواقع کہیں روز روز ملا کرتے ہیں ـــــ یہ خود نمائی کا دن تو کہیں برسوں ہی میں آتا ہے ـــــ مگر میں جانتا ہوں تم کیسے ہو ـــــ مجھے تمہاری علم دوستیاں خوب اچھی طرح معلوم ہیں۔

آج تم جس پر مقالے لکھ رہے ہو، اور لکھنے والے ہو، وہی پریم چند مجھ سے تمہاری بے التفاتیوں اور سرد مہریوں کا رونا آئے دن رویا کرتا تھا۔ اُسے تم نے ایک دن بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ وہ لاغر و نحیف انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ تلاشِ معاش میں گھبرایا گھبرایا پھرا کرتا تھا، مگر تم مربیانِ علم و ادب نے اُسی کے مصائب کا احساس ایک بار بھی نہیں کیا۔

میں بہ آوازِ بلند کہتا ہوں، سُننے والے سُن لیں کہ پریم چند کو موت نے نہیں، ہندوستان کی ناقدریوں نے شہید کر ڈالا ہے۔"

آپ نے ملاحظہ فرمایا "کلیم" میں جو کچھ عرض کیا گیا تھا، وہ کس طرح حرف بحرف پورا ہوا۔

ابھی کیا ہے، ابھی تو پریم چند کی موت کو صرف ایک ہی سال گزرا ہے کہ اُن کی برسی میں اکابر و اُدبا شریک ہونے لگے ہیں۔ ذرا اُن کی موت کو اور مدت گزر جانے دیجئے۔ پھر دیکھئے ہندوستان کے مُردہ پرست کیا کیا شاندار سوانگ بھرا کریں گے، اور کتنے شہروں میں منشی جی کے اسٹیچو نصب کئے جائیں گے۔

اگر زندگی میں منشی پریم چند حیدرآباد جاتے اور کوشش کرتے کہ اُنھیں ملازم رکھ لیا جائے، یا کم سے کم اُن کی ادبی پنشن مقرر کر دی جائے تو یہی اکابر و ادبا اُن پر قہقہے مارتے، اُنھیں حقیر الفاظ سے یاد کرتے، اور اُنھیں ممالکِ محروسہ سے خارج کرا دیتے۔ مگر چونکہ وہ آج دنیا میں موجود نہیں ہیں، اور ہمیں اس کا اطمینان ہو چکا ہے کہ اب ہمیں اُن کی کوئی امداد نہیں کرنا پڑے گی، اس لئے ہم چوڑے پڑ رہے ہیں، اور اُن کی تعریفوں کے پُل باندھ باندھ کر یہ ثابت کر رہے ہیں کہ ہم دنیا کے بزرگ ترین قدر شناسانِ علم و ادب میں سے ہیں۔

اگر اسی برسی کے موقع پر یکایک منشی جی کی بیوہ اسٹیج پر آ جاتیں اور اپنے مرحوم شوہر کے نام پر صرف اتنی سی درخواست کرتیں کہ مرحوم کے چند غیر مطبوعہ ناولوں کی اشاعت کے واسطے تھوڑے سے سرمائے کا انتظام کر دیا جائے، تو مجھے کامل یقین ہے کہ برسی منانے والوں میں سے کچھ تو کرسیوں کے نیچے چھپ جاتے، اور کچھ گھبرا کر بالا خانے کی کھڑکیوں سے سڑک کی طرف کود پڑتے۔ خواہ اس کود پڑنے سے اُن کی ٹانگیں ہی کیوں نہ ٹوٹ جاتیں۔

یہ کچھ حیدرآباد ہی پر موقوف نہیں ہے (حیدرآباد میں تو پھر بھی اربابِ علم و فن کی نسبتہً بہت کچھ قدر دانی کی جاتی ہے) ہمارے تمام صوبوں ضلعوں، کمشنریوں، شہروں، اور قصبوں کا یہی حال ہے کہ ہم اپنے اربابِ جوہر کی زندگیوں کو نہایت ہی حقارت سے ٹھکراتے رہتے ہیں۔ لیکن اُن کے

مرتے ہی اُن کی قبروں کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ ہندوستان ایک مُردہ ملک، اور ہندوستانی ایک مُردہ قوم ہے ظاہر ہے کہ مُردوں کو زندوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہوسکتی۔ زندہ ہی زندوں کو سمجھ سکتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب تک کوئی شخص زندہ رہتا ہے، ہندوستان کے مردے اُس سے بے خبر و بیگانہ رہتے ہیں۔ اور جب وہ مر کر اُن کے گروہ میں شامل ہو جاتا ہے تو "کند ہم جنس با ہم جنس پرواز" کے تحت یہ اُس کی قدر افزائی کرنے لگتے ہیں۔

وہ اربابِ فکر جن کے قلوب ریڈیو کی طرح فضا سے آوازیں اور دلوں کے ضربات سنا کرتے ہیں، اُن کا بیان ہے کہ جب رات بھیگ جاتی ہے تو صبح تک یہ آوازیں آتی رہتی ہیں کہ اے ہندوستان کے پریشان حال اربابِ ہنر تم سرنگوں اور آبدیدہ کیوں ہو —— یہ کونسی دانش مندی ہے کہ تم زندہ ہو —— تم آخر مر کیوں نہیں جاتے —— تمہارے لباس بوسیدہ اور تمہارے معدے خالی ہیں محض اس جرم میں کہ تم زندہ ہو، تم سانس لے رہے ہو —— اگر عقلمند ہو تو مر جاؤ، خدا کے لئے مر جاؤ۔ ہم تمہاری قوم کے افراد تمہاری خدمت گزاری کے شرف سے کب تک محروم رہیں گے —— ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ جس روز تم مر جاؤ گے ہم تمہارے نام پر لنگر جاری کریں گے، غریبوں کو کپڑے پہنائیں گے اور تمہاری قبر پر سونا چڑھا کر دنیا کو دکھائیں گے کہ ہم ہندوستانی اپنے مایۂ ناز افراد کی قدر دانی میں کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔

مر جاؤ، مر جاؤ، خدا کے لئے مر جاؤ، اور ہمارے
صبر کو دیر تک نہ آزماؤ!

میری مشاعروں کی شرکت

مجھے اس کا نہایت قلق ہے کہ دوسروں کی طرح، آخر کار میرے لئے بھی یہ دن آنا لازمی تھا جس دن انسان میں وہ چیز بیدار ہو جاتی ہے، جسے شعورِ سود و زیاں کا لقب دیا جاتا ہے۔

میں اب تک اِسی شعور سے بیگانہ رہا، بیگانہ ہی نہیں، بلکہ نافر—

مگر خیام کے اِس قول کے مطابق کہ؛

برموجبِ عقل، زندگانی کردن
شاید کردن، ولے ندانی کردن
اُستادِ تو روزگار چابک دست است
چنداں لگدے زند کہ خوانی کردن

میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ ایک میرے سے قلیل الوسائل شخص کے لئے جو خود بھی زندہ رہنا چاہتا ہے، اپنے اہل و عیال کو بھی زندہ رکھنا چاہتا ہے، اور کچھ نہ کچھ اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی بھی مالی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ شعورِ سُود و زیاں سے نافر ہے، اور اس سرد مہر دنیا میں ایک لااُبالی انسان کی طرح زندگی بسر کر کے اپنے متعلقین کے حقوق کو کُند چھری سے ذبح کر ڈالے۔

اِسی لئے میں اپنے کو اِس اعلان پر مجبور پاتا ہوں کہ اب میں اُس وقت تک کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہوں گا، جب تک مقامی مشاعرے کی شرکت کے لئے مبلغ پچیس روپے اور بیرونی مقامات کے واسطے (ملازم سمیت) سیکنڈ کلاس کے کرایۂ آمد و رفت کے علاوہ، میرے دیگر ضروریات، اور "کلیم" کے اُس مالی نقصان کی خانہ پُری کے طور پر جو میری عدم موجودگی کے باعث ہمیشہ ہوتا رہتا ہے، مزید سو روپے وصول نہ ہو جائیں گے۔

آج سے دو برس پیشتر تک میں اسے ایک ننگ سمجھتا تھا کہ اربابِ مشاعرہ سے کرایہ لوں۔ مشاعروں کی طرف سے جب کبھی کرایہ روانہ کرنے کے واسطے لکھا جاتا تھا تو میں اِس قدر برافروختہ ہو جاتا تھا کہ انتقام کے طور پر اُس مشاعرے میں شریک نہیں ہوتا تھا —— جس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ ہر مشاعرے کے سلسلے میں کم سے کم میرے سو، سوا سو روپے صرف ہو جاتے تھے۔

لیکن اب حالات کی وہ نوعیت باقی نہیں رہی ہے۔ میری زندگی، ایک بہت بڑے مالی انقلاب سے دو چار ہو چکی ہے۔ اور اسی کے دوش بدوش دوسری مشکل یہ آپڑی ہے کہ میری غیر حاضری کا "کلیم" کی انتظامی اور مالی حالت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے —— اس لئے، ہر چند کہ اس اعلان سے میرے جمالیاتی شعور کو تو ضرور صدمہ پہونچ رہا ہے، مگر میرا ضمیر بالکل مطمئن ہے۔

یہ دُنیا ہے —— سرد بے مہر دُنیا —— اِس کے قوانین سے نہ انبیاء مستثنیٰ ہو سکتے ہیں نہ شاعر —— ہم لطافت کے پروں پر اُڑتے ہوئے خواہ عرش و کرسی ہی سے کیوں نہ گزر جائیں۔ مگر یہ دنیا ہمیں ہماری تمام

بلند پروازیوں کے باوصف آخر کار کثافت کے غاروں میں اُتار کر دم لیتی ہے کیونکہ :-

لطافت، بے کثافت جلوہ پیدا ہو نہیں سکتی

ایک خط

"کفر" "الحاد" اور "دہریت" ایسے سستے اور چٹپٹے الفاظ ہیں جنھیں ہم بڑی آسانی سے، اُن کا مفہوم متعین کئے بغیر، بے دھڑک استعمال کرتے رہتے ہیں۔

ہندوستان میں ہر وہ چیز جو ہمارے روایاتِ کہن اور اوہامِ پارینہ کے خلاف ہو، کفر، الحاد، اور دہریت کے نام سے منسوب کر دی جاتی ہے۔ اور یہ کے یہاں تک بڑھی ہوئی ہے کہ مذہبی عقائد سے گزر کر اُن تمام دیگر مسائل کو بھی مذہبی روشنی ہی میں دیکھا جاتا ہے، جن سے مذہب کو کوئی دُور کا بھی علاقہ نہیں ہوتا ——— مثال کے طور پر کانگریس ہی کو لے لیجئے۔ مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ اس دورِ بیداری میں بھی موجود ہے جو کانگریس کو ہندوؤں کا ایک بُت، اور کانگریس کے ارکان کو بُت پرست سمجھتا ہے اور جو مسلمان کانگریس کی حمایت کرتا ہے، یہ خاصانِ خدا اُس پر کفر کا فتویٰ لگا دیتے ہیں ———

سچ ہے مسلمانوں میں عقلی و مالی افلاس، اور کفر و الحاد سے زیادہ ارزاں کوئی جنس ہی نہیں ہے ———

ایک زمانہ تھا کہ بریلی کی دار الضرب میں کفر کے فتوے ڈھلا کرتے تھے، لیکن یہ وبا اب اس قدر عام ہو چکی ہے کہ ہر شہر اور ہر محلے میں کفر کے سکے ڈھالنے کی مشینیں لگا دی گئی ہیں۔

سب سے زیادہ عبرتناک بات یہ ہے کہ کارخانۂ عالم پر آزادی کے ساتھ سوچنا تک کفر میں داخل فرما لیا گیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم آب تک یہ شرمناک اعلان کر رہے ہیں کہ ہم صرف اپنے محلے کے "بڑے مولوی صاحب" ہی کے دماغ سے سوچیں گے، اور جو شخص ہمیں اس "بگاڑ" کا مشورہ دے گا کہ ہم اپنے ذاتی دماغ سے بھی سوچنے کا کام لیں تو ہم اُسے جھٹ سے کافر کہہ دیں گے۔

چنانچہ مندرجۂ ذیل خط جو مدراس سے دفتر "کلیم" میں شرفِ صدور لایا ہے، قارئینِ "کلیم" کی عبرت انگیزی کے واسطے لفظ بہ لفظ درج کیا جا رہا ہے جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ وہ اسلام جو دنیا میں غلامی اور وہم پرستی مٹانے کے واسطے آیا تھا، اب اُس کے فرزند غلامی و وہم پرستی کے کس قدر زبردست مبلغ بنے ہوئے ہیں ——— اور وہ پیغمبرِ اعظم جس نے منافقوں تک کو دائرۂ اسلام سے خارج نہیں فرمایا تھا، اب اُس کی اُمت تالیفِ قلب اور رواداری کی دشمنی پر کس شدت سے تُلی ہوئی ہے،

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا!

خط ملاحظہ ہو! ———

۷۸۶

چوک ترملکھڑی مدراس
مورخہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۷ء

مکرمی جناب منیجر صاحب رسالہ "کلیم" دہلی

آپ اگر جوشؔ صاحب کے ہم عقیدہ ہیں تو خدا جانے کس پیام کے مستحق ہیں، ورنہ سلام مسنون قبول فرمائیے۔ ختمِ میعادِ خریداری کا اطلاع نامہ بابت یاد فرمائی کا شکریہ، جواباً عرض ہے کہ "اسلام، اہلِ اسلام اور ہمدردانِ اسلام کی بدترین دشمن کانگریس کا دوست "کلیم" اردو زبان کی شدید ترین مخالف اور ہندو راج کی علمبردار کانگریس کا حامی کلیم۔ اور الحاد و دہریت کے مضامین کا حامل "کلیم" ہرگز ہرگز اس قابل نہیں کہ کوئی قوم پرست اور سچا مسلمان اس کا خریدار بنا تو درکنار اس کو دیکھنا تک گوارا کرے۔ صرف میری ہی نہیں بلکہ میرے ان تمام عزیز و احباب کی جنھوں نے گزشتہ بارہ مہینے "کلیم" کا مطالعہ کیا ہے یہی متفقہ رائے ہے۔ لہٰذا "کلیم" کی خریداری اس کے ہم مسلک اور ہم عقیدہ حضرات کو مبارک۔ مجھے وی، پی روانہ فرمانے کی زحمت نہ کیجئے۔ خدا حافظ۔ فقط

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنْ!

اگر ایک لمحے کے واسطے بھی مجھے یہ شک ہو جائے کہ کانگریس "اسلام"

"اہلِ اسلام" اور "تمدنِ اسلام" کی "بدترین دشمن" ہے، یا کانگریس اُردو زبان کی "شدید ترین مخالف" اور "ہندو راج" کی علمبردار ہے تو میں ہندوستان کا وہ پہلا شخص ہوں گا جو کانگریس کے سر پر اپنے ہات کے تمام اعصاب کو پوری شدت کے ساتھ کھینچکر ایک ایسا زبردست گھونسہ اور ایک اتنا ہولناک گُرز مارے گا کہ کانگریس کا بھیجا ناک کے راستے سے نکل جائے گا ——

مجھے میرے بھائی مذہبی نقطۂ نظر سے خواہ وہ مُلحد سمجھیں یا مُرتد۔ لیکن اُنھیں یہ معلوم ہو جانا چاہیئے کہ میں مسلمان خاندان میں پیدا ہوا ہوں، مسلمانوں کا خُون میری رگ وپے میں گردش کر رہا ہے، اور مجلسی زندگی میں مجھے قطعی طور پر اجنبیت محسوس نہیں ہوسکتی ہے تو وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی جماعت اور ہندی مسلمانوں کا حلقہ ہے۔

میری معاشرت، اور میرا مزاج، میرا ادبی ذوق، اور میرے عادات تمام تر اسلامی ہیں —— میرے دل سے کوئی قوت مسلمانوں کی محبت چھین نہیں سکتی ہے۔ اگر میں خود بھی کوشش کروں کہ میرا دل مسلمانوں کی محبت سے خالی ہو جائے، تو بھی میں اس سعی میں تمام عُمر کامیاب نہیں ہوسکتا ہوں۔ اس لئے کہ مسلمانوں سے محبت نہ کرنا، میرے واسطے خود اپنی ذات سے محبت نہ کرنا ہے۔ اور کون ایسا ذی حیات ہے جسے اپنی ذات سے محبت نہو۔

لیکن مُجھ میں اور دوسرے غیر کانگریسی مسلمانوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ہندوؤں سے محبت کیسی، نفرت کرتے ہیں۔ اور اِس نفرت کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان متحدہ قومیت کے تمام برکات سے محروم ہے۔

میں ہر چند طبعاً مسلمانوں کی محبت پر مجبور ہوں، اسی طرح مجبور رہوں جیسے کوئی ہندو، ہندوؤں کی محبت کرنے پر مجبور ہوتا ہے —— اور یہ محبت ایک ایسی فطری شے ہے جس پر صرف عقل کے اندھے ہی اعتراض کرسکتے ہیں، مگر اُسی کے ساتھ ساتھ میرا دل ہندوؤں کی محبت سے بھی خالی نہیں ہے۔ اسی لئے کہ میں اس قدر شقی واقع نہیں ہوا ہوں کہ اُس گروہ سے محبت نہ کرسکوں جو میرا پڑوسی، میرا ہموطن اور میرا بھائی ہے۔

مجھے صفائی کے ساتھ یہ کہنے کی بھی اجازت دیجئے کہ نسلی، اور آبائی اثرات کی بنا پر اس محبت کے باوجود جو مجھے مسلمانوں سے ہے، اگر میں یہ دیکھوں گا کہ ہندوؤں، اور مسلمانوں میں جنگ ہو رہی ہے، اور مسلمان سراسر برسرِ ناحق ہیں، تو میں ایک لمحے کے پس وپیش کے بغیر ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر حملہ آور ہو جاؤں گا۔

میرے دوستو! افراط وتفریط سے بچ کر اعتدال پر چلنا بہت ہی سخت کام ہے، ہم صرف جذباتی حیوان ہی نہیں ہیں، قدرت نے ہم میں عقل وشعور اور عدل وانصاف کا بھی مادہ رکھا ہے، اور ہمارا یہ فرض ہے کہ جب عقل وشعور اور عدل وانصاف سے ہمارے جذبات ٹکرانے لگیں تو ہم جذبات کو ترک کرکے عدل وانصاف کا ساتھ دیں، اس لئے کہ اسی میں ہمارے واسطے برکت وسعادت ہے۔

میں نے اپنے سینے کی دولوں پٹ کھول کر اپنی پوری کیفیت دکھادی ہے، اب آگے آپ کو اختیار ہے کہ مجھے مسلمانوں کا دشمن سمجھکر مجھ سے کنارہ کشی اختیار کریں۔ یا میری طرف سے جو اشتباہ آپ کے دل میں پیدا ہوا تھا اُس سے توبہ کرلیں۔

اگر یہ کوئی جُرم ہے کہ میرے نزدیک کانگریس ہی وہ جماعت ہے جو ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے سے ملک کو آزاد کرا سکتی ہے تو بیشک میں مجرم ہوں۔ آپ جو سزا دینا چاہیں، میں اُسے قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

پُرامن ہندوستان یا سنسان مقبرہ

"تمام ممالکِ یوروپ کے مقابلے میں ہندوستان غیر معمولی طور سے پُرامن ہے۔ بمبئی کے سے بڑے شہر میں کوئی بھا رطیارہ نہیں، حالانکہ یورپ کا ایک شہر بھی ایسا نہیں ہے، جہاں تین سو میل کے اندر اندر پانسو بم بار طیارے ہر وقت موجود نہ رہتے ہو، اور یہی وجہ ہے کہ میں ہندوستان میں اس قدر خوش ہوں، جہاں ہر شے نہایت پُرامن، اور ہر منظر نہایت ہی خوشگوار ہے"!

یہ ہیں وہ بظاہر شیریں، اور بباطن تلخ الفاظ جو ہمارے مربی وسرپرست حضور لارڈ لنلتھگو بہادر نے دوسری یا تیسری دسمبر ۳۷ء کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن بمبئی سے رات کے وقت براڈکاسٹ فرمائے تھے۔

شاید ہم سے اکثر بھولے بھالے ہندوستانی "لاٹ" صاحب بہادر کی اس شاطرانہ تقریر سے دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ ہمارا

ہندوستان، ماشاء اللہ چشمِ بد دور، اس قدر پُرامن اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ اس درجہ "خوشگوار" واقع ہوا ہے کہ حضور "لاٹ" صاحب اُسے اپنے وطنِ عزیز کے مقابلے میں زیادہ پسند فرماتے ہیں۔

اس میں کس کافر کو شک ہے کہ لارڈ صاحب موصوف ہندوستان کے "پُرامن" اور "خوشگوار" ہونے سے نہایت ہی خوش ہیں۔ لیکن یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کی "امنیت" و "خوشگواری" پر لارڈ صاحب بہادر کی یہ مسرت، اُسی قسم کی طمانیت آمیز مسرت ہے جو ایک ہوشیار آقا کے دل میں اُس وقت پیدا ہوتی ہے، جب وہ اپنے قوی غلام کے جسم کو کاہیدہ اور اُس کی میان کو بے تلوار دیکھ کر اِس نتیجے پر پہونچتا ہے کہ اب میری طاقت کے سامنے میرا غلام کلیتہً عاجز، اور قطعی بے دست و پا ہو چکا ہے۔

اِس زمانے میں جب کہ دنیا کی ہر چھوٹی سے چھوٹی قوم اپنی بقا کی خاطر اپنے مقبوضات کی توسیع پر جان دیئے دے رہی ہے، اور ہر چھوٹے سے چھوٹا ملک ہی نہیں، ہر معمولی سے معمولی شہر اپنے جسم پر زرہ اور سر پر خود پہن چکا ہے۔ عین اِس دَورِ فتنہ و فساد میں ہندوستان کی عسکری رُوح کا مضمحل، اور ہندوستانی قوم کا غیر مسلح رہنا ایک ایسی شامتِ اعمال ہے، جس پر خود موت تک آنسو بہا سکتی ہے ـــ لیکن ہمارے لارڈ صاحب بہادر اِس صورتِ حال پر ماتم کرنے کے عوض، اظہارِ مسرت فرماتے ہیں۔

واضح ہو کہ لارڈ صاحب کا یہ اظہارِ مسرت، کسی نوع کی سادہ لوحی، یا عصرِ حاضر کے مقتضیات سے بےخبری کا نتیجہ نہیں ـــ لارڈ صاحب، خدا اُنھیں سلامت رکھے، نہایت ہی ہوشیار واقع ہوئے ہیں، اس اظہارِ مسرت سے صاحب بہادر کا مقصود یہ ہے کہ ہم ہتھیاروں، اور طیاروں کی عدم موجودگی کو اپنے ملک کے واسطے ایک برکت و سعادت خیال کریں، اور جب ہم میں سے کوئی ہندوستانی شہری، اور ہندوستانی قوم کو مسلح ہونے کا مشورہ دے، تو ہم اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں، اس وجہ سے انگلیاں دے لیں کہ ان "منحوس" اور "امن شکن" "سامانِ حرب کی عدم موجودگی ہی وہ دولتِ بیدار ہے، جس پر ہمارے امن پسند لاٹ صاحب اظہارِ مسرت فرما چکے ہیں ـــ اور ظاہر ہے کہ لارڈ صاحب جس چیز کو بُرا سمجھتے ہیں، اُسے ہم کیونکر اچھا سمجھ سکتے ہیں۔

اِس اظہارِ مسرت، یا افیون کی گولی میں ایک غیر ملفوظ اعلان یہ بھی ہے کہ اے ہندوستانیو، سجدۂ شکر بجا لاؤ، کہ ہم تمہارے ایسے شفیق حاکم ہیں کہ عین اِس دَورِ فتن میں، جب کہ خاکِ یوروپ مشتعل ہو چکی ہے، اور مغرب کے ہر ذرّے سے لَو نکل رہی ہے، ہم نے تمہارے گرد سلامتی کی ایک ایسی دیوار اُٹھا دی ہے کہ تم ہر فتنے اور ہر ہلاکت سے بےخبر رہ کر چین سے زندگی بسر کر رہے ہو، اور عین اُس لمحے میں کہ بیدار یوروپ میں آگ اور خُون کا کھیل کھیلا جا رہا ہے، ہم نے تمہیں ایسی خاموش خوابگاہیں عطا فرمادی ہیں کہ تم میٹھی نیند سو رہے ہو۔

اس میں لارڈ صاحب بہادر کا کوئی خاص قصور نہیں ـــ دُنیا کے ہر صیاد کا مزاج ایسا ہی واقع ہوا ہے ـــ ہر صیاد قفس کے پاس آ کر یہی کہتا ہے کہ اے میری پیاری ہلکے پھلکے پَروں والی چڑیو، تمہیں کیا معلوم کہ آزاد طائروں پر زمین اور فضا میں کیا کیا مصیبتیں گزر رہی ہیں ـــ وہ دانے دانے کے لئے مارے مارے پھر رہے ہیں، دشمنوں کے تعاقب، اور موسموں کے شدائد نے اُنہیں زندہ درگور کر رکھا ہے ـــ مبارک ہیں تمہاری ہستیاں کہ تمہارے گرد و پیش "پُرامن" سلاخیں ہیں، اور تمہارے آب و دانے کے فرائض میں نے اپنے ذمے کر رکھے ہیں ـــ

لارڈ صاحب ہندوستان کی جس چیز کو "امن" کے نام سے منسوب فرماتے ہیں، وہ دراصل ہندوستان کی ایک ایسی کمزوری ہے، جسے اب ہمیں زیادہ دیر تک برداشت نہ کرنا چاہیئے۔

ظالم ہونا کوئی عیب ہو کہ نہ ہو، لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مظلوم ہونا عیب اور سب سے بڑا عیب ہے ـــ ظالم کی پشت پر وہ چیز ہوتی ہے، جسے **عظیم الشان طاقت** کہتے ہیں، اور **طاقت** دنیا کی سب سے بڑی **سعادت** ہے۔ لیکن مظلوم کے شاملِ حال وہ چیز ہوتی ہے جسے **ناطاقتی** کہتے ہیں، اور ناطاقتی اس کرۂ ارض کی سب سے بڑی **نحوست** ہے۔

لارڈ صاحب بہادر! ہماری نحوستوں کو "سعادت" ہماری کمزوریوں کو "طاقت" اور ہماری نزع کو "امن" کا خطاب دے کر ہمیں کب تک دھوکے میں رکھیے گا؟

لنلتھگو صاحب نے ہندوستان کو صرف "پُرامن" ہی نہیں فرمایا ہے، اس بدبخت خطۂ ارض کو "خوشگوار" کا بھی خطاب دیا ہے۔

ہندوستان ـــ اور ـــ "خوشگوار"! سچ ہے!-

خون ہے خادم کا، آقا کے گلستاں کی بہار

لارڈ صاحب! آپ نے بالکل بجا فرمایا، ہندوستان نہایت ہی "خوشگوار" واقع ہوا ہے۔ کیوں نہ ہو اگر ہندوستان کا ساجواں بخت و آزاد ملک "خوشگوار" نہ ہوگا تو پھر اور کون ہوگا ——

ہاں وہ بلند اقبال ہندوستان، جہاں کا سونا، ایک ہمیشہ جاری رہنے والے آبشار کی طرح دوسرے ممالک کی طرف لگا تار بہتا چلا جا رہا ہے، وہ خوش قسمت ہندوستان، جس کا غلہ اور خام مال دوسروں کے معدوں اور کارخانوں میں ہر روز داخل ہو رہا ہے۔ وہ بے روزگار ہندوستان جس کے ننانوے فیصدی گریجویٹ پیٹ پکڑے پکڑے دفتروں میں صدائیں دیتے پھر رہے ہیں —— وہ بھوکا ہندوستان جس کے نوّے فیصدی فرزندوں کو بصد ہزار دشواری صرف ایک وقت غذا ملتی ہے، اور وہ بھی ناکافی۔ وہ دماغی علیل ہندوستان جہاں "مسلم لیگ" اور "مہاسبھا" کے مداری، مسلمانوں اور ہندوؤں کو اپنی اپنی لکڑیوں پر نچا نچا کر حزن ریزیاں کرا رہے ہیں —— وہ ہندوستان جہاں مدحِ صحابہ کے سلسلے میں بڑے بڑے پڑھے لکھے حضرات وائسرائے کے پاس وفد لے جانے کی شرمناکیوں میں مبتلا ہیں —— وہ ہندوستان جہاں مطبع و منبر کا گلا گھٹتا رہتا ہے —— اور وہ ہندوستان جس کے گلے میں غلامی کا طوقِ لعنت پڑا ہوا ہے —— اگر "خوشگوار" نہ ہوگا تو اور کون ملک ہوگا؟

اگر جنّت نشان ہندوستان "خوشگوار" نہیں ہے، تو پھر کیا امریکہ انگلستان، جرمنی، فرانس، اور اٹلی کو خوشگوار کہا جائے گا جہاں زندگی کی کشمکش، توپوں کے دہانے کھولے ہوئے ہے؟

ہاں مرزا غالب نے خوب فرمایا ہے:-

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

پایندہ باد گوشۂ قفس

زندہ باد گوشۂ قبر!

"کلیم" کی دوسالہ زندگی پر

ایک نظر

جنوری ۱۹۳۸ء کے ساتھ کلیم ماشاء اللہ تیسرے سال میں قدم رکھ رہا ہے، بظاہر یہ کوئی جشن کی تقریب نہیں ہو سکتی۔ اتنی سی مدت زندگی عمر دراز کیا معنی "کمسنی" بھی نہیں کہی جا سکتی! تاہم چونکہ ہندوستان "شیر خوارگی کے ایام کی ہلاکتِ عام" (Infantile mortality) کی سرزمین ہے، اس لئے کسی سفینۂ ادب کے لئے ابتدائی ۲۴ مہینوں کا محفوظ بحری سفر خاصی نادر خوش تقدیری کی بشارت ہے! ہماری ادبی کشتیوں کے اکثر حادثات، ساحلی رہے ہیں، اس لئے سواحل کے قرب و جوار کی ان خلیجوں، آبناؤں، اور تحت البحر چٹانوں سے سلامت گزر جانا عملاً اک "ہفتخوان" کے طے ہو جانے کے ہم معنی سمجھا جا سکتا ہے! ؎

غافل مرو کہ تا درِ بیت الحرام عشق
صد منزل ست و منزلِ اول "قیامت" است

تاہم ہم ان صدہا منازل و مراحل کی میزانِ کل کو محسوب کرنے سے انکار نہیں کر رہے ہیں! ہمیں "دامگاہِ حیات" کی اُس لبریزی خطرات کا پورا علم ہے جس کی پیمائش "زندانِ زندگی" کے کسی "دائم الحبس" نے کبھی اس طرح کی تھی کہ: ؎

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک؟

بایں ہمہ ہم مستقبل کی فکر کو مستقبل ہی پر چھوڑ سکتے ہیں! ہم اک علوم و مشہور مثل کی تقبیل پر یہ کسی قدر اک نیا مقولہ بنا سکتے ہیں کہ "تم حال کا انتظام کرو، اور مستقبل اپنا انتظام خود کرے گا!" —— درحقیقت یہ اک وسیع و عمیق حکمتِ حیات ہے! وہ نہ صرف ساری زندگی پر حاوی ہے، بلکہ آخرت تک پر متجاوز ہے! اک محتاط جوانی اک محفوظ پیری کا بیمہ ہے، اور اک متقی حیاتِ ارضی اک بامراد عاقبت کی ضمانت! لاریب کہ ہم اپنے موجودہ طرزِ عمل سے اپنی آئندہ تقدیر کی کتابت کیا کرتے ہیں! ع

باشد نہ نقشِ پا "رقم" "سرنوشت" ما!

الغرض ماضی کے تبصرے اور حال کے "محاسبے" سے زیادہ نہ ہم پر کچھ "مقتضیات" ہیں نہ ہمارے کچھ ممکنات! ہم انہی حدود کی حد تک اپنا جائزہ لیتے ہیں اور —— اگر یہ کوئی خود ستائی یا خود فریبی ہو تو —— اپنی ذات سے شکایت کے چنداں اسباب نہیں پاتے: جو کچھ ہم سے ہو سکا ناقابلِ اعتنا نہیں کہا جا سکتا، اور جو ہو سکا اُس کے لئے وہ گوناگوں موانع اور از شمار افزوں مشکلات کافی ذمہ دار ہیں، جو ہندوستان کی ادبی صحافت میں خاصی معروف و بدنام ہیں! ہم اپنے معیار کی رفعت سے ناآشنا نہیں لیکن اس صحرائے لق و دق میں "سالک" کی "راہ و رسمِ منزل سے باخبری" کچھ برائے نام ہی "توشۂ سفر" بہم پہنچا سکتی ہے! سنگینِ مشکلات کو محض خوش نظری کہاں تک تخییل کر سکتی ہے؟! ؎

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا

فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے!

میں بارِ دگر یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ کلیم کی موجودہ دوسالہ عمر میں میں اُس کے شبابِ مقدر کی بعض شعاعیں اُس کی جبینِ صبیح پر درخشاں پاتا ہوں۔ ممکن ہے بعض حضرات میرے ہم نظر ہوں، لیکن مجھے تو اپنی اس مسن مولودِ فکر و کاوش —— کلیم —— کی چشم و ابرو کی بعض اداؤں میں یہ کتبۂ کندہ نظر آتا ہے کہ ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی

می تافت ستارۂ بلندی

کم از کم اتنا کہنے میں تو مطلق کلام نہیں کہ میرا اک رسالے کا نکالنا میرے جن مخلص ترین دوستوں کے لئے اک فرمائشی قہقہے کی دعوت بنا تھا، یا جن "للہی دشمنوں" کے لئے مستقبل قریب کی اک یقینی "شماتتِ ہمسایہ" کی بشارت! ان ہر دو طائفوں کے ارکان کے خدشات و توہمات کی روشنی میں میں نے "عقلِ معاش" کا اک دیدنی معرکہ سر کیا ہے! ؎

نومید ہم مباش کہ رندانِ جرعہ نوش

ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

بہرحال کلیم کے مستقبل کے ممکنات و مقدرات کے متعلق اگر کمترین اندازہ بھی لگایا جائے تب بھی اُس کی زندگی و سلامتی کے بارے میں تمام سامعین کیلئے میری اتنی اطمینان دہی تو ہر شائبۂ شک سے بالاتر ہی تسلیم کی جائے گی کہ ع

گزر گیا ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے!

کیا تجھ کو ہے یہ وہم کہ دشمن ہے ترا جوش؟ افسوس کہ تو واقفِ اسرار نہیں ہے

آگاہ ہو آگاہ کہ اس جوش کے دل میں بیہودگیٔ اندک و بسیار نہیں ہے

واللہ کہ یہ جوش، خرابات نشیں جوش منجملۂ زہادِ ریاکار نہیں ہے!

وہ نشۂ صہبا کا ہے چڑھتا ہوا پارہ ہاں زہد کی گرتی ہوئی دیوار نہیں ہے

ہو اس میں جو ہے ابر کی مستانہ خرامی رکتی ہوئی نبضوں کی تو رفتار نہیں ہے

ہاں ہاں وہ نظر باز و قدح خوار ہے یعنی توفیقِ الٰہی کا گنہ گار نہیں ہے!

اس آدمِ خاکی کے ہوا خواہ کے دل میں جز مہر و وفا اور کچھ آزار نہیں ہے!

ہاں اس کو مبارک ہو غم و غیظ و عداوت جو زلفِ محبت کا گرفتار نہیں ہے!

دشنام و ملامت کا تو کیا ذکر کہ یہ شخص یاروں کی شکایت پہ بھی تیار نہیں ہے

اس خلوتیٔ شاہدِ توحید کے دل میں آشفتگیٔ سبحہ و زنار نہیں ہے!

اس واقفِ اضداد کی دنیائے نظر میں — بیہودگی کا فر و دیندار نہیں ہے!

ہاں اُس کا یہ ایمان ہے اس باغِ جہاں میں — ہر خار و خس اک گل ہے کوئی خار نہیں ہے!

اِس شخص کے سینے میں ہیں بیگانے بھی داخل — یہ صرف یگانوں ہی کا غمخوار نہیں ہے

ہاں خانۂ دشمن کی بھی جاروب کشی میں — واللہ کہ اس شخص کو کچھ عار نہیں ہے!

اس واقفِ احوال و وراثت کی نظر میں — قاتل بھی ملامت کا سزاوار نہیں ہے!

آواز دو، آواز، کہ یہ رندِ قدح خوار — کیا دوست کہ دشمن سے بھی بیزار نہیں ہے

اس محرمِ خودداریٔ عشاق کے نزدیک — ابلیس بھی مردود و گنہگار نہیں ہے!

رکھے گا وہ، اور تجھ سے عداوت کا تعلق؟ — کونین سے کچھ جس کو سروکار نہیں ہے!

خود جنسِ دو عالم ہو تو ہو اُس کی خریدار

وہ جنسِ دو عالم کا خریدار نہیں ہے!

جوش ملیح آبادی

پیدا وہ شیون ہے ترنم سے میرے
فریاد کی اک لے ہے تکلم سے میرے
مانگے گا اسے کون کہ ہوتا ہے طلوع
ہر نفس کے افق سے ہے تبسم میرا

(جوش)

آغاز ہی آغاز ہے اور کچھ بھی نہیں
انجام سب اک راز ہے اور کچھ بھی نہیں
کہتی ہے جسے نغمۂ شادی دنیا
اک ٹوٹے رباب کی آواز ہے اور کچھ بھی نہیں

(جوش)

مولانا ابوالکلام آزاد

قرآن اور اُس کے مخالفوں میں بنائے نزاع!

مولانا ابوالکلام، آزاد

اب چند لمحوں کے لئے اُس نزاع پر غور کرو جو قرآن اور اُس کے مخالفوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ یہ مخالف کون تھے؟ پچھلے مذاہب کے پیرو تھے، جن میں سے بعض کے پاس کتاب تھی، بعض کے پاس نہ تھی۔

اچھا بنائے نزاع کیا تھی؟

کیا یہ تھی کہ قرآن نے اُن کے بانیوں اور رہنماؤں کو جھٹلایا تھا، یا اُن کی مقدس کتابوں سے انکار کیا تھا؟ اور اس لئے وہ اس کی مخالفت میں کمربستہ ہو گئے تھے؟

کیا یہ تھی کہ اُس نے دعویٰ کیا تھا، خدا کی سچائی صرف میرے ہی حصہ میں آئی ہے، اور تمام پیروانِ مذاہب کو چاہیئے، اپنے اپنے مذہبوں کی دعوت سے برگشتہ ہو جائیں؟

یا پھر اُس نے دین کے نام سے کوئی ایسی چیز پیش کر دی تھی، جو پیروانِ مذاہب کے لئے بالکل نئی بات تھی، اور اس لئے قدرتی طور پر انھیں ماننے میں تامل تھا؟

قرآن کے صفحے کھلے ہوئے ہیں اور اُس کے نزول کی تاریخ بھی دنیا کے سامنے ہے، یہ دونوں ہمیں بتلاتے ہیں کہ ان تمام باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ تھی، اور نہ ہو سکتی تھی۔ اُس نے نہ صرف اُن تمام رہنماؤں کی تصدیق کی جن کے نام لیوا اُس کے سامنے تھے، بلکہ صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا، مجھ سے پہلے جتنے بھی رسول اور مذاہب کے بانی آچکے ہیں میں سب کی تصدیق کرتا ہوں۔ اور اُن میں سے کسی ایک کے انکار کو بھی خدا کی سچائی کا انکار سمجھتا ہوں۔

اُس نے کسی مذہب کے ماننے والے سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اپنے مذہب کی دعوت سے انکار کر دے۔ بلکہ جب کبھی مطالبہ کیا تو یہی کیا کہ اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہو جاؤ، کیونکہ تمام مذہبوں کی اصل تعلیم ایک ہی ہے، اُس نے نہ تو کوئی نیا اصول پیش کیا، نہ کوئی نیا عمل بتلایا، اُس نے ہمیشہ اُنہیں باتوں پر زور دیا جو دنیا کے تمام مذاہب کی سب سے زیادہ جانی بُوجھی ہوئی باتیں رہی ہیں، یعنی ایک پروردگارِ عالم کی پرستش، اور نیک عملی کی زندگی! اُس نے جب کبھی لوگوں کو اپنی طرف دعوت دی ہے تو یہی کہا ہے، اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقی تعلیم از سرِ نو تازہ کر لو، تمہارا ایسا کرنا ہی مجھے قبول کر لینا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب قرآن کی دعوت کا یہ حال تھا، تو پھر آخر اُس میں اور اُس کے مخالفوں میں وجہ نزاع کیا تھی؟ ایک شخص جو کسی کو بُرا نہیں کہتا، سب کو مانتا اور سب کی تعظیم کرتا ہے، اور ہمیشہ اُنہی باتوں کی تلقین کرتا ہے جو سب کے یہاں مانی ہوئی ہیں، کوئی اُس سے لڑے تو کیوں لڑے؟ اور کیوں لوگوں کو اُس کا ساتھ دینے سے انکار ہو؟

کہا جا سکتا ہے کہ قریش مکہ کی مخالفت اِس بنا پر تھی کہ قرآن نے بُت پرستی سے انکار کر دیا تھا اور وہ بُت پرستی کے طریقوں سے مالوف ہو چکے تھے، بلاشبہ ایک وجہ نزاع یہ بھی ہے، لیکن صرف یہی وجہ نزاع نہیں ہو سکتی، سوال یہ ہے کہ یہودیوں نے کیوں مخالفت کی جو بُت پرستی سے قطعاً کنارہ کش تھے۔ عیسائی کیوں برسرِ پیکار ہو گئے، جنھوں نے کبھی بُت پرستی کی حمایت کا دعویٰ نہیں کیا؟

اصل یہ ہے کہ پیروانِ مذاہب کی مخالفت اس لئے نہ تھی کہ وہ اُنھیں جھٹلاتا کیوں ہے، بلکہ اس لئے تھی کہ جھٹلاتا کیوں نہیں؟ ہر مذہب کا پیرو چاہتا تھا کہ وہ صرف اُسی کو سچا کہے، باقی سب کو جھٹلائے، اور چونکہ وہ یکساں طور پر سب کی تصدیق کرتا تھا، اس لئے کوئی بھی اُس سے خوش نہیں ہو سکتا تھا، یہودی اس بات سے تو بہت خوش تھے کہ قرآن حضرت موسیٰؑ کی تصدیق کرتا ہے، لیکن وہ صرف اتنا ہی نہیں کرتا تھا، وہ حضرت مسیحؑ کی بھی تصدیق کرتا تھا، اور یہیں آکر اُس میں اور یہودیوں میں نزاع شروع ہو جاتی تھی۔ عیسائیوں کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا کہ حضرت مسیحؑ اور حضرت مریمؑ کی پاکی و صداقت کا اعلان کیا جائے! لیکن قرآن صرف اتنا ہی نہیں کرتا تھا، وہ یہ بھی کہتا تھا کہ نجات کا دار و مدار عمل پر ہے نہ کفارہ اور اصطباغ پر، اور قانونِ نجات کی یہ عالمگیر وسعت عیسائی کلیسا کے لئے ناقابلِ برداشت تھی!

اسی طرح قریشِ مکہ کے لئے اس سے بڑھکر کوئی دلخوش کُن صدا نہیں ہو سکتی تھی، کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی بزرگی کا اعتراف کیا جائے، لیکن جب وہ دیکھتے تھے کہ قرآن جس طرح ان دونوں کی بزرگی کا اعتراف کرتا ہے، اُسی طرح یہودیوں کے پیغمبروں اور عیسائیوں کے داعی کا بھی معترف ہے، تو اُن کے نسلی اور جماعتی غرور کو ٹھیس لگتی تھی۔ وہ کہتے تھے، ایسے لوگ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے پیرو کیونکر ہو سکتے ہیں، جو اُن کی بزرگی اور صداقت کی صف میں دوسروں کو بھی لا کھڑا کرتے ہیں؟

مختصراً یوں سمجھنا چاہئیے کہ قرآن کے تین اصول ایسے تھے جو اُس میں اور تمام پیروانِ مذاہب میں وجہ نزاع ہو گئے:

(۱) وہ مذہبی گروہ بندی کی رُوح کا مخالف تھا، اور دین کی وحدت یعنی ایک ہونے کا اعلان کرتا تھا۔ اگر پیروانِ مذاہب یہ مان لیتے تو اُنھیں یہ تسلیم کر لینا پڑتا کہ دین کی سچائی کسی ایک ہی گروہ کے حصہ میں نہیں آئی ہے، سب کو یکساں طور پر ملی ہے، لیکن یہی ماننا اُن کی گروہ پرستی پر شاق گزرتا تھا۔

(۲) قرآن کہتا تھا، نجات اور سعادت کا دار و مدار عمل پر ہے، نسل، قوم، گروہ بندی اور ظاہری رسم و ریت پر نہیں ہے، اگر یہ اصل وہ تسلیم کر لیتے تو پھر نجات کا دروازہ بلا امتیاز تمام نوعِ انسانی پر کُھل جاتا، اور کسی ایک مذہبی حلقہ کی ٹھیکیداری باقی نہ رہتی، لیکن اس بات کے لئے اُن میں سے کوئی بھی تیار نہ تھا۔

(۳) وہ کہتا تھا، اصل دین خدا پرستی ہے، اور خدا پرستی یہ ہے کہ ایک خدا کی براہِ راست پرستش کی جائے، لیکن دنیا کے تمام مذہبی گروہوں نے کسی نہ کسی شکل میں شرک و بُت پرستی کے طریقے اختیار کر لئے تھے، اور گو اُنھیں اس سے انکار نہ تھا کہ اصل دین خدا پرستی ہی ہے، اور خدا ایک ہی ہے، لیکن یہ بات شاق گزرتی تھی کہ اپنے آلوف و معتاد طریقوں سے دست بردار ہو جائیں۔

خلاصۂ بحث

متذکرۂ صدر تفصیلات کا ماحصل حسبِ ذیل دفعات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) نزولِ قرآن کے وقت دنیا کا مذہبی تخیل اس سے زیادہ وسعت نہیں رکھتا تھا کہ نسلوں، خاندانوں، اور قبیلوں کی معاشرتی حد بندیوں کی طرح، مذہب کی بھی ایک خاص گروہ بندی کر لی گئی تھی یا ہر گروہ بندی کا آدمی سمجھتا تھا، دین کی سچائی صرف اُسی کے حصہ میں آئی ہے، جو انسان اس کی مذہبی حد بندی میں داخل ہے، نجات یافتہ ہے، جو داخل نہیں ہے، نجات سے محروم ہے۔

(۲) ہر گروہ کے نزدیک مذہب کی اصل و حقیقت محض اُس کے ظاہری اعمال و رسوم تھے، جونہی ایک انسان اُنھیں اختیار کر لیتا، یقین کیا جاتا کہ نجات و سعادت اُسے حاصل ہو گئی، مثلاً عبادت کی شکل و طریقہ، قربانیوں کے رسوم و عوائد، کسی خاص طعام کا کھانا یا نہ کھانا، کسی خاص وضع و قطع کا اختیار کرنا یا نہ کرنا۔

(۳) چونکہ یہ اعمال و رسوم ہر مذہب میں الگ الگ تھے۔ اس لئے ہر مذہب کا پیرو یقین کرتا تھا کہ دوسرا مذہب مذہبی صداقت سے خالی ہے، کیونکہ اُس کے اعمال و رسوم ویسے نہیں ہیں جیسے خود اُس نے اختیار کر رکھے ہیں۔

(۴) ہر مذہبی گروہ کا دعویٰ صرف یہی نہ تھا کہ وہ سچا ہے، بلکہ یہ بھی تھا کہ دوسرا جھوٹا ہے، نتیجہ یہ تھا کہ ہر گروہ صرف اتنے ہی پر قانع نہیں رہتا کہ اپنی سچائی کا اعلان کرے، بلکہ یہ بھی ضروری سمجھتا کہ دوسروں کے خلاف تعصب و نفرت پھیلائے، اس صورتِ حال نے نوعِ انسانی کو ایک دائمی جنگ و جدال کی حالت میں مبتلا کر رکھا تھا، مذہب اور خدا کے نام پر ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرتا اور اُس کا خون بہانا جائز سمجھتا۔

(۵) لیکن قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا۔

(الف) اُس نے نہ صرف یہی بتلایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے،

بلکہ صاف صاف کہدیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں، اُس نے کہا کہ دین خدا کی عام بخشش ہے، اس لئے ممکن نہیں کہ کسی ایک قوم اور جماعت ہی کو دیا گیا ہو، اور دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو!

(ب) اُس نے کہا، خدا کے تمام قوانین فطرت کی طرح انسان کی روحانی سعادت کا قانون بھی ایک ہی ہے، اور سب کے لئے ہے! پس پیروانِ مذاہب کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ اُنھوں نے دینِ الہیٰ کی وحدت فراموش کرکے الگ الگ گروہ بندیاں کر لی ہیں۔ اور ہر گروہ بندی دوسری گروہ بندی سے لڑ رہی ہے۔

(ج) اُس نے بتلایا کہ خدا کا دین اس لئے تھا کہ نوع انسانی کا تفرقہ اور اختلاف دُور ہو، اس لئے نہ تھا کہ تفرقہ و نزاع کی ایک علت بن جائے! پس اس سے بڑھ کر گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو چیز تفرقہ دُور کرنے کے لئے آئی تھی، اُسی کو تفرقہ کی بنیاد بنا لیا ہے؟

(د) اُس نے بتلایا کہ ایک چیز دین ہے، ایک شرع و منہاج ہے، دین ایک ہی ہے، اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے، البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا، اور یہ اختلاف ناگزیر تھا، کیوں ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی، اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اُس کے لئے اختیار کئے جائیں، پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جا سکتے۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے، محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو!

(ھ) اُس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور اُن کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں! یہ گروہ بندیاں تمہاری بنائی ہوئی ہیں، ورنہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین تو ایک ہی ہے، وہ دین حقیقی کیا ہے؟

وہ کہتا ہے، ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی، جو انسان بھی ایمان اور نیک عملی کی راہ اختیار کرے گا، اُس کے لئے نجات ہے، خواہ وہ تمہاری گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ ہو!

(و) اُس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اُس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب اپنی مشترک اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں، وہ کہتا ہے تمام مذاہب سچے ہیں، لیکن پیروانِ مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں! اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِ نو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا۔ اور انھوں نے مجھے قبول کر لیا، تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ سچائی ہے، جسے وہ "الدّین" اور "الاسلام" کے نام سے پکارتا ہے!

(ز) وہ کہتا ہے، خدا کا دین اس لئے نہیں ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے نفرت کرے، بلکہ اس لئے ہے ہر انسان دوسرے سے محبت کرے، اور سب ایک ہی پروردگار کے رشتۂ عبودیت میں بندھ کر ایک ہو جائیں، وہ کہتا ہے جب سب کا پروردگار ایک ہے، جب سب کا مقصود اُسی کی بندگی ہے، جب ہر انسان کے لئے وہی ہوتا ہے جیسا اُس کا عمل ہے تو پھر خدا اور مذہب کے نام پر یہ تمام جنگ و نزاع کیوں ہے؟

(۶) مذاہب عالم کا اختلاف صرف اختلاف ہی کی حد تک نہیں رہا ہے بلکہ باہمی نفرت و مخاصمت کا ذریعہ بن گیا ہے، سوال یہ ہے کہ یہ مخاصمت کیونکر دُور ہو؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تمام پیروانِ مذاہب اپنے دعوے میں سچے مان لئے جائیں، کیونکہ ہر مذہب کا پیرو صرف اسی بات کا مدعی نہیں ہے کہ وہ سچا ہے، بلکہ اس کا بھی مدعی ہے کہ دوسرے جھوٹے ہیں، پس اگر اُن کے دعاوی مان لئے جائیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر مذہب بیک وقت سچا بھی ہے، اور جھوٹا بھی ہے، یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ سب کو جھوٹا قرار دیا جائے، کیونکہ اگر تمام مذاہب جھوٹے ہیں، تو پھر مذہب کی سچائی ہے کہاں؟ پس اگر کوئی صورت

رفعِ نزاع کی ہوسکتی ہے، تو وہ یہی ہے جس کی دعوت لے کر قرآن نمودار ہوا ہے، تمام مذاہب سچے ہیں، کیونکہ اصل دین ایک ہی ہے، اور وہ سب کو دیا گیا ہے، لیکن تمام پیروانِ مذاہب سچائی سے منحرف ہوگئے ہیں، کیونکہ اُنھوں نے دین کی حقیقت اور وحدت ضائع کردی ہے، اور اپنی گمراہیوں کی الگ الگ ٹولیاں بنالی ہیں، اگر ان گمراہیوں سے لوگ باز آجائیں، اور اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہوجائیں تو مذاہب کی تمام نزاعات ختم ہوجائیں گی، ہر گروہ دیکھ لیگا کہ اُس کی راہ بھی اصلاً وہی ہے جو اور تمام گروہوں کی راہ ہے، قرآن کہتا ہے تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ حقیقت "الدین" ہے، یعنی نوعِ انسانی کے لئے حقیقی دین، اور اِسی کو وہ "الاسلام" کے نام سے پکارتا ہے۔

(۷) نوعِ انسانی کی باہمی یگانگت اور اتحاد کے جتنے رشتے بھی ہوسکتے تھے، سب انسان کے ہاتھوں ٹوٹ چکے، سب کی نسل ایک تھی، مگر ہزاروں نسلیں ہوگئیں، سب کی قومیت ایک تھی، مگر بے شمار قومیتیں بن گئیں، سب کی وطنیت ایک تھی، لیکن، لیکن سینکڑوں وطنیتوں میں بٹ گئے، سب کا درجہ ایک تھا، لیکن امیر و فقیر، شریف و وضیع، اور ادنیٰ و اعلیٰ کے بہت سے درجے ٹھہرا لئے گئے، ایسی حالت میں کونسا رشتہ ہے جو ان تمام تفرقوں پر غالب آسکتا ہے، اور تمام انسان ایک ہی صف میں کھڑے ہوجاسکتے ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ خدا پرستی کا رشتہ، یہی ایک رشتہ ہے جو انسانیت کا بچھڑا ہوا گھرانا پھر آباد کردے سکتا ہے، یہ اعتقاد کہ ہم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے، اور ہم سب کے سر اُسی ایک چوکھٹ پر جھکے ہوئے ہیں، یک جہتی و یگانگت کا ایسا جذبہ پیدا کردیتا ہے کہ ممکن نہیں، انسان کے بنائے ہوئے تفرقے اُس پر غالب آسکیں۔

رفیقۂ حیات کے نام

میں اپنی طبع کی آوارگی سے خائف ہوں　　کہ مجھکو پھر یہ ہوا و ہوس میں ڈال نہ دے
مرے لہو کو یہ وحشت سے ملتہب نہ کرے　　سکونِ قلب کو ترغیبِ اشتعال نہ دے
تری نظر نے جو مجھکو کمال بخشا ہے　　یہ اُس کمال کو خمیازۂ زوال نہ دے
ترے لئے یہ کہیں وجہِ غم نہ بن جائے　　مجھے کہیں قلقِ شرم و انفعال نہ دے!
خدا کرے کہ مجھے فصلِ گُل کی رعنائی　　تخیلاتِ ملوث بہ ابتذال نہ دے

مبادا اپنا مقامِ بلند کھو بیٹھوں
مری ہوس مجھے فردوس سے نکال نہ دے!

محمد ملک

انسانی فرائض و حقوق کی بحث

جوزف میزنی کے خیالات

سید اختر علی تلہری

(گذشتہ سے پیوستہ)

اٹلی کے مزدورو!

میرے بھائیو، میری باتیں اچھے طریقے سے سمجھو۔ میں جب یہ کہتا ہوں کہ حقوق کے علم سے انسان اس قابل نہیں بنتا کہ وہ کوئی قابلِ مدح مستقل ترقی وجود میں لائے تو اُس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے حقوق ترک کر دو۔ میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ حقوق کا قیام فرائض کے تکمیل کے نتیجہ ہی کی شکل میں ہو سکتا ہے۔ حقوق کی منزلِ مقصود تک پہونچنے کے لئے ابتداءً فرائض کی انجام دہی کے جادہ پر چلنا لازمی ہے۔ اسی طرح میں جب یہ کہتا ہوں کہ خوشحالی و خوشوقتی و بہبودی یعنی مادی اغراض کو زندگی کا مقصد قرار دینے سے ہم ایسے لوگوں کی آفرینش کے خطرہ میں مبتلا ہوں گے جن میں "انانیت" و "خودپسندی" پورے طور سے موجود ہوگی تو اُس کا مدعا یہ نہیں ہے کہ تمہیں ان چیزوں کے حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہ کرنا چاہیئے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ صرف مادی اغراض کے حاصل کرنے کی سعی کرنا اور اُنھیں کو اصل قرار دے لینا خوفناک نتائج پیدا کرنے کا سبب ہو سکتا ہے۔

جن ملکوں نے اپنے شہنشاہوں کے ماتحت سوائے مادی اغراض حاصل کرنے کے اور کسی چیز سے مطلب نہیں رکھا تو اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ وہ ایک ذلیل قوم بن گئے اور اپنے بادشاہوں کے سفاکانہ اور خونخوارانہ مظالم سہتے سہتے وحشی حملہ آور قوموں کی غلامی میں نہایت ذلیل طریقہ سے گرفتار ہو گئے۔ فرانس میں اور دوسرے مقامات میں معاشرتی ترقی کے دشمنوں نے مادی جد و جہد کو ترقی دے کر تخریب و افساد کی تخم ریزی کی اور تغیر و تبدل کے خیالات دوسری طرف موڑ دیئے۔ کیا ہم دشمنوں کی مدد اپنے ہاتھ سے خود کریں گے؟ مادی ترقی ضروری ہے اور ہمیں اُس کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے، لیکن اس لئے نہیں کہ ایک انسان کے لئے یہ ضروری ہے کہ آسے "اچھا کھانا" اور "اچھا مکان" ملے بلکہ صرف اس لئے کہ کسی شخص میں "خودداری" اور "اخلاقی ترقی" کا احساس اُس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ خواہشوں اور ضرورتوں سے "مسلسل جنگ" میں مشغول ہے جیسی کہ آجکل حالت ہو رہی ہے۔ تم ہر روز دس یا بارہ گھنٹے کام کرتے ہو، تم کو اس کا وقت کہاں مل سکتا ہے کہ تم اپنے کو تعلیم دو۔ تمہاری بڑی تعداد مشکل سے اتنا کماتی ہے جو اُسے اور اُس کے متعلقین کے لئے کافی ہو سکے۔ ایسی صورت میں تمہارے پاس وہ ذرائع کہاں ہیں جن سے تم اپنے کو تعلیم دے سکو! کام کے یقینی نہ ہونے اور پھر اُس میں متواتر رخنوں کے پیدا ہونے سے یہ صورت ہوتی ہے کہ یا تو تم اپنا وقت کاہلی و سستی میں صرف کر دو یا پھر بہت زیادہ

کام کرو۔ اس صورت میں ترتیب اوقات پابندیٔ اوقات اور مسلسل سرگرمی
کی عادت، تم میں کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟ کمائیوں کی کمی کی وجہ سے تم اتنا بچا
ہی نہیں سکتے جو تمہارے بچوں کے یا عالمِ ضعیفی میں تمہارے کام آسکے۔ ایسی
حالت میں تم کیونکر اپنے میں کفایت شعاری کی عادت پیدا کر سکتے ہو؟ افلاس
کی وجہ سے تم میں سے بہتیرے اس پر مجبور ہیں کہ اپنے بچوں کو (یہ تو میں کہہ
نہیں سکتا، ماؤں کی پُرانہاک تربیت سے کیونکہ غریب مزدوروں کی غریب
بیویاں اپنے بچوں کو تربیت ہی کون سی دے سکتی ہیں۔ البتہ یہ کہوں گا کہ)
ماؤں کی محبت بھری نگاہوں سے علیحدہ کر دیں، اور اُنھیں چند پیسوں کے
لئے گھر سے باہر فیکٹریوں میں غیر صحت بخش محنتوں کے لئے بھیج دیں۔ ان
صورتوں میں خاندانی محبت کے سوتے تمہارے دلوں سے کیونکر پھوٹ
سکتے ہیں۔ اور اُن میں شرافت کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟ تمہیں شہریوں کے
حقوق حاصل نہیں ہیں اور نہ انتخاب یا ووٹ کے ذریعے سے تم اُن قوانین
کے بنانے میں کوئی شرکت رکھتے ہو جو تمہارے اعمال اور زندگی پر حاوی
ہیں۔ ایسی صورت میں تم میں "شہریت" کا کونسا فخر یا حکومت کے متعلق کونسا
جوش یا قوانین کا کونسا سچا خیال پیدا ہو سکتا ہے؟ دوسرے طبقوں کے
ساتھ جو انصاف روا رکھا جاتا ہے وہ تمہارے ساتھ نہیں۔ ایسی صورت
میں عدل و انصاف کی محبت اور عزت تم میں کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟ سوسائٹی
تمہارے ساتھ بالکل ہمدردی کا برتاؤ نہیں کرتی۔ ایسی صورت میں سوسائٹی
کے ساتھ ہمدردی کا سبق تمہیں کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے؟ اِن اسباب
کی بنا پر تمہیں اپنے مادی حالات کے بدلنے کی ضرورت ہے تاکہ اخلاقی
حیثیت سے تم ترقی کر سکو۔ تمہیں اس کی ضرورت ہے کہ محنت اور مزدوری
کا کافی معاوضہ ملے تاکہ تم کچھ پس انداز کر سکو، مستقبل کی طرف سے مطمئن
ہو جاؤ، اور اپنے نفوس کو اُن تمام جذباتِ انتقام و قصاص سے پاک
کر لو جو اُن لوگوں کی طرف سے تمہارے دلوں میں جاگزیں ہیں جنھوں نے کبھی
تمہارے ساتھ رحم کا برتاؤ نہیں کیا۔

اس تغیر کے لئے تمہیں کوشش کرنا چاہئے اور اس طرح تم کامیاب بھی
ہو گے۔ لیکن اس کے حصول کی کوشش تمہیں اسے ذریعہ و واسطہ سمجھ کر کرنا
چاہئے۔ اُسے مقصد نہیں قرار دے لینا چاہئے۔ نہ صرف حق سمجھ کر بلکہ ایک فریضہ
سمجھ کر اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرو، صرف مادی حیثیت سے اپنے خوشحال
بنانے کے لئے نہیں بلکہ اپنے بہتر بنانے کے لئے اس کے حصول کی کوشش کرو۔
اگر یہ صورت نہیں ہے تو پھر تم میں اور تمہارے ظالموں میں کیا فرق ہوگا؟ وہ صرف
اسی لئے تو ظالم کہلاتے ہیں کہ اُنھیں اپنی بہتری عیش اور طاقت کے سوا کسی اور
بات کی پروا نہیں ہے۔

اپنے کو بہتر بنانا تمہاری زندگی کا مقصد ہونا چاہئے۔ اپنی حالت کو
ترقی ہی دے کر تم اپنے کو مستقل طور سے خوشحال بنا سکتے ہو۔ اگر تم صرف مادی
اغراض کی خاطر یا کسی مخصوص جماعت کے نام سے جنگ کرو گے تو ہزاروں
ظالم تم میں پیدا ہو جائیں گے۔ اگر تم موجودہ پست و فرومایہ جذبات اور انانیت
اپنے میں بدستور باقی رکھو گے تو "معاشرتی تنظیم" کے تبدل سے کوئی فرق نہیں
پیدا ہوگا۔ یہ سوسائٹیاں یا جماعتیں مثل پودوں کے ہیں جو اپنے طریقِ استعمال کے
لحاظ سے زہر یا تریاق پیدا کرتے ہیں۔ اچھے آدمی بُرے سماجوں اور بڑی جماعتوں
کو اچھا بنا دیتے ہیں اور بُرے آدمی اچھی جماعتوں کو بُرا۔ تمہیں اُن طبقوں کی
جو اختیاری یا اضطراری طور سے تم پر آج ظلم کرتے ہیں اصلاح کرنا اور اُنھیں
ان کے فرائض جتانا ہیں، لیکن تم اس میں اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے
جب تک کہ امکانی حد تک اپنی حالت کے بہتر بنانے سے ابتدا نہیں کرتے۔

جب تم اُن لوگوں کو جو مکمل معاشرتی تبدیلی کی ضرورت کی تمہیں
تلقین کرتے ہیں یہ کہتے ہوئے سنو کہ وہ صرف تمہارے حقوق سے اپیل کر کے
اس ضرورت کو پورا کر دیں گے تو اُن کی نیک نیتی کے تو شکر گزار ہو لیکن
اُن کے پیش نظر نتیجہ پر اعتبار نہ کرو۔ غریب آدمیوں کی تکلیفیں اور مصیبتیں کم
سے کم ایک حد تک امیر طبقہ کو معلوم ہیں۔ لیکن اُسے اس کا احساس نہیں ہے۔

ایک مشترکہ عقیدہ کے فقدان کی وجہ سے جو عام بے پروائی موجود
ہے اور اتنے برسوں تک مادی بہتری و خوشحالی کی مسلسل تبلیغ و تلقین کے
سبب سے جو انانیت پیدا ہو گئی ہے اُس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ لوگ
جو ان مصیبتوں اور تکلیفوں سے الگ ہیں وہ رفتہ رفتہ اس خیال کے
عادی ہو گئے ہیں کہ یہ تکلیفیں "معاشرتی تنظیم" کے رنجیدہ لوازم میں سے ہیں،
اور اسی لئے اُنھوں نے اُس کے درمان کی تلاش آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ
دی ہے۔ اُن کو اس کا یقین دلانا دشوار نہیں ہے بلکہ دشواری جو کچھ ہے وہ
اس میں کہ اُن کی اس بے عملی کی حالت کو اُن سے دور کیا جائے اور اُن کو
اس کی ترغیب دی جائے کہ وہ اپنے یقین پر عامل ہوتے ہوئے تمہارے ساتھ

متحد اور شریک ہو کر بھائیوں کی طرح ایسی معاشرتی ہئیت اجتماعیہ" کے وجود میں لانے کے لئے جدو جہد کریں جو اُس حد تک جہاں تک کہ انسانی حالات اجازت دیں، تمہاری مصیبتوں اور اُن کے خوف کو مٹا دے مگر یہ بغیر "عقیدہ" کے نہیں ہو سکتا بغیر اُس عقیدہ کے جو انسان کو اُس مشن پر ہونا چاہیئے جس کی تبلیغ کے لئے وہ دنیا میں بھیجا گیا ہے بغیر اُس عقیدہ کے جو اُس ذمہ داری پر ہو جسے انجام دئے بغیر ہر شخص ایک قسم کا بار محسوس کرے۔ بغیر اُس عقیدہ کے جو اُس فریضہ پر ہو جو ہر فرد کو صداقت کی خاطر "عمل مسلسل" اور قربانی پر مجبور کرتا ہے۔

حقوق اور مادی خوشحالی کے تمام نظرئے صرف اُن کوششوں تک منتہی ہو سکتے ہیں جو اگر جماعتی اور تنہا تمہاری قوت پر منحصر رہے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ البتہ بدترین قسم کے معاشرتی جرائم اور سوسائٹی کے مختلف طبقوں میں باہمی جنگ پیدا کر دیں گے۔

اٹلی کے مزدورو! میرے بھائیو!! جب مسیح کا ظہور ہوا تھا اور اُنھوں نے دنیا کی ظاہری حالت بدل دی تھی تو اُن کی طرف سے نہ تو کبھی امیروں کو "نظریۂ حقوق" کی تلقین کی گئی تھی (جن کے حاصل کرنے کی فی نفسہٖ انھیں ضرورت بھی نہ تھی) اور نہ کبھی غریبوں کو جو بہت ممکن تھا کہ امیروں کی نقل میں اُن سے ناجائز فائدے اُٹھاتے۔

جناب مسیح نے کبھی اپنے فائدے اور ذاتی اغراض پر نظر رکھنے کی تبلیغ اُس قوم کو نہیں کی جسے یہی چیزیں تباہ و برباد کر چکی تھیں۔ اُنھوں نے فرائض کی بجا آوری کی تلقین کی، محبت کی تلقین کی، قربانی کی تلقین کی، اعتقاد کی تلقین کی۔ اُنھوں نے یہی کہا کہ سب سے آگے والی جگہ وہی لوگ پائیں گے جنھوں نے دوسروں کے ساتھ سب سے زیادہ بھلائی کی ہے۔ ان خیالات نے اُس "سماج" کو جس میں زندگی کی کوئی چنگاری باقی نہیں رہی تھی پھر سے زندہ کیا۔ لاکھوں کو مغلوب کیا۔ دنیا پر فتح حاصل کی۔ اور انسانی جماعت کی تعلیم کو ترقی کے راستہ پر لگایا۔

اٹلی کے مزدورو۔ ہم بھی حضرت عیسیٰ ہی کے سے زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم بھی اسی "سماج" میں سانسیں لے رہے ہیں جو رومی سلطنت ہی کی طرح فاسد ہو چکی ہے۔

ہم اپنی روح اپنا میں یہ احساس رکھتے ہیں کہ اس سوسائٹی کو بالکل بدل دیں۔ اُس میں نئی روح پیدا کر دیں۔ اُس کے تمام افراد اور کام کرنے والوں کو ایک عقیدہ میں ایک قانون کے ماتحت ایک مقصد پر لگا دیں اور خدا نے اپنی مخلوق میں جو قوتیں اور صلاحیتیں عطا کی ہیں اُن کو آزادانہ اور صحیح نشو و نما دیں۔ ہم دنیا پر ویسی ہی بلکہ اُس سے کچھ بہتر طور پر خدائی حکومت چاہتے ہیں جو آخرت میں ہوگی۔ تاکہ دنیا عقبیٰ کے لئے تیاری کی جگہ اور سوسائٹی کا قیام "یزدانی تصور" کی طرف رہنمائی کی کوشش بن سکے۔

حضرت عیسیٰ کا ہر عمل اُن کے اُس عقیدہ کا جس کی وہ تلقین کرتے تھے مظہر ہوتا تھا، اُن کے ارد گرد جو حواریین جمع ہو گئے تھے اُن کے اعمال بھی اُسی عقیدے کے مظہر تھے جسے انھوں نے قبول کیا تھا۔ انھیں جیسے تم بھی ہو جاؤ۔ تم بھی مظفر و منصور رہو گے۔ اُن طبقوں کو جو تم سے بالاتر ہیں فرائض کی تلقین کرو اور جہاں تک ہو سکے اپنے فرائض پورے کرو۔ نیکی، قربانی اور محبت کی تعلیم دو۔ خود نیک، محبت کرنے والے اور قربانی کے لئے آمادہ اور مستعد بنو، جرأت کے ساتھ اپنی ضرورتوں اور اپنے خیالات کا اعلان کرو۔ لیکن اس میں غصہ نہو۔ انتقامی جذبہ نہو اور کوئی دھمکی نہو۔ سب میں زیادہ طاقتور دھمکی (اگر اس کی ضرورت کچھ لوگوں کو ہو) تو وہ تقریر ہوتی ہے جو عزم و ارادہ کی مالک ہو۔ وہ تقریر نہیں جو غیظ و غضب پر مشتمل ہو۔

جب کہ تم اپنے ساتھیوں میں اپنے مستقبل کے انجاموں کے تخیل اور ایک ایسی قوم کے تخیل کا پروپیگنڈا کرتے ہو جو تمہیں تعلیم۔ کافی مزدوری اور کام کے دوش بدوش خودداری اور مہارت عطا کر سکے اور اسی طرح جب کہ تم اُن کا جوش اس لئے اُبھارتے ہو کہ وہ کشمکش کے لئے اپنے کو آمادہ کر سکیں اور خراب و اجنبی حکومت کی طاقتوں کے باوجود وہ تمام چیزیں حاصل کر سکو تو یقیناً تمہیں چاہیئے کہ اپنے کو بہتر بناؤ۔ اپنے فرائض اچھے طریقہ سے سمجھو، اور اُن پر عمل کرو۔

اٹلی کے بڑے حصہ میں عوام کے لئے یہ کام ناممکن ہے۔ جمہور کے واسطے مفید تعلیم و تربیت اُس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی، جب تک کہ لوگوں کی مادی حالت میں تغیر اور سیاسی فضا میں انقلاب نہ ہو۔ وہ لوگ جو کہ اپنے تئیں دھوکہ دے کر اس کے خلاف اُمید رکھتے ہیں اور آزادی کی تیاری کے لئے اِسے ضروری سمجھکر اس کی تبلیغ کرتے ہیں وہ

بے عملی کے علاوہ کسی دوسرے امر کی تعلیم نہیں دے رہے ہیں۔

اس کام کو تمہارے درمیان میں وہ لوگ انجام دے سکتے ہیں جن کے حالات کسی قدر اچھے ہیں اور جنہوں نے غیر ممالک میں قیام کی وجہ سے آزاد تعلیم حاصل کی ہے اُنہیں لوگوں کو یہ کام انجام دینا چاہیے۔

یہی چند افراد جیسے ہی ان میں وہ سچے اصول سرایت کر گئے جن پر ایک قوم کی داخلی تعلیم کا انحصار ہے انہیں ہزاروں آدمیوں میں منتشر کر دیں گے۔ یہی اصول راستہ کے رہنما رہیں گے اور اُن مغالطوں اور باطل نظریوں سے تحفظ کا کام دیں گے جو صحیح اصولوں پر رہزنی کے لئے راستہ میں ملتے ہیں۔

باغی شاعر

مظلوم کیتھلوی

وہ شاعر تھا، اس کی نظموں میں آزادی کا پیغام مضمر تھا، وطن کی حالت زار پر خاک میں تڑپنے والے آنسو پوشیدہ تھے، غریبوں کا خون چوسنے والے ظالموں کے خلاف اعلانِ جنگ کی تلقین تھی، ہر شعر دل میں اُتر جانے کی تاثیر رکھتا تھا، مظلوم، مغلوب اور مجبور لوگ اس کے اشعار پڑھ پڑھ کر جھومتے تھے، اس شاعر کا نام تھا سحور ——

سحور ایک ایسی ریاست میں رہتا تھا جس کا راجہ بدچلن تھا اور ظالم —— وہ ہر وقت شراب میں غلطاں اور خوبصورت عورتوں کے حلقہ میں گھرا رہتا تھا، مگر اس عیش پسندی کے باوجود اُسے شہرت کی تمنا تھی۔ نام آوری کا جنون تھا، عظمت کی خواہش تھی۔

سورج طلوع ہو اور روشنی نہ پھیلے یہ ناممکن ہے، سحور بھی آسمانِ ادب پر آفتاب بن کر چمک رہا تھا، راجہ کی عیش گاہوں میں اس آفتاب کی کرنیں پہنچیں۔ راجہ نے اُسے طلب کر کے کہا "ہماری شان میں قصیدہ لکھو شاعر!"

سحور نے حیرت کو ضبط کرتے ہوئے پوچھا "آپ کی شان میں؟" —— وہ سوچ رہا تھا کہ ایک ظالم، شرابی اور اوباش کی شان میں کیا لکھا جا سکتا ہے!

اِسے شش و پنج میں دیکھ کر راجہ نے کہا "ہم تمہیں خوش کریں گے شاعر! —— زر و مال سے تمہاری جھولی بھر دیں گے۔"

"لیکن حضور میں اپنے ضمیر کی قیمت مال و زر سے کہیں زیادہ سمجھتا ہوں" شاعر نے جواب دیا۔

اشارہ گو لطیف تھا، مگر راجہ فوراً سمجھ گیا، آنکھوں سے آگ برسنے لگی، بھویں خنجر کی طرح تن گئیں اور رعد کی طرح گرج کر بولا "اِسے جیل میں ٹھونس دو" شاید اُسے معلوم نہ تھا کہ آج کا باغی کل کا تاجدار بن سکتا ہے۔

راجہ کے حکم کی تعمیل کر دی گئی، سحور قید خانہ میں ڈال دیا گیا، بلبل پنجرے میں ٹھونس دی گئی، لوگوں نے یہ دیکھا اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے، راجہ کے حکم سے شاعر کا نام لینا جرم قرار دے دیا گیا۔ لوگ اس کی نظموں کو ترسنے لگے، راجہ کے حکم کی خلاف ورزی کی سزا موت تھی، اور اسی خوف سے لوگ خاموش تھے، مگر راجہ سمجھتا تھا "میں نے باغی شاعر کی یاد لوگوں کے دلوں سے نکال دی ہے"

ایک روز جب سورج اپنے پورے جلال میں زمین پر آتشیں کرنیں برسا رہا تھا جیل کے بڑے پھاٹک سے ایک ارتھی باہر نکلی۔ یہ شاعر کی ارتھی تھی، —— اس شاعر کی جو اپنا ضمیر فروخت کرنے کی بجائے موت سے ہم آغوش ہو گیا، ارتھی کو دیکھ کر لوگوں کے دلوں میں راجہ کے خلاف نفرت و حقارت کا سمندر موجزن ہو گیا، راکھ میں دبی ہوئی چنگاری بھڑک اُٹھی، ان کی نظروں میں راجہ پہلے ظالم، بدچلن اور بے رحم ہی تھا مگر اب قاتل بھی بن گیا تھا ——

دریا کی روانی رک سکتی ہے مگر جذبات کی روانی کو نہیں روکا جاسکتا۔ نفرت نے قہر وغضب کی صورت اختیار کرلی۔ راجہ اپنی زندگی خطرے میں دیکھکر تخت وتاج چھوڑ کر بھاگ نکلا اور جنگلوں میں جا چھپا، لوگوں نے شاعر کا ایک طلائی بُت تخت پر رکھ دیا، اور شہر کے بہترین دماغ اس کے نام پر حکومت کرنے لگے۔

اب سب آزاد تھے، ظالم اور بدچلن راجہ کا خوف مٹ چکا تھا، اور لوگ ہر طرف وہی نظمیں گانے لگے جن میں آزادی کا پیغام مضمر تھا، وطن کی حالت زار پر تڑپنے میں آنسو پوشیدہ تھے، غریبوں کا خون چوسنے والے ظالموں کے خلاف اعلانِ جنگ کی تلقین تھی۔

مقالاتِ زرّیں

عالمِ شباب میں موت آنا، کہانی شروع ہوئی تھی کہ نیند آگئی۔

وہ تبسم ہی نہیں، جس کی جلو میں آنسوؤں کا لشکر نہ ہو۔

خدا نہ کرے، خوشی درجۂ کمال تک پہونچ جائے۔

جس مرض کا علاج نہیں اُس سے مصالحت کرلو۔

محبّت، تلوار کے بغیر ذبح کرنے کی صناعی ہے۔

حسد کے محکمے میں کبھی تعطیل نہیں۔

سزا بھی وہی دے جو محبت کرتا ہے۔

صرف رقیق القلب ہی بہادر ہوسکتا ہے۔

تاریکی بھی ایک قسم ہے خواب کی۔

جوانی کی بے اعتدالیاں بار قرض ہیں جنھیں پیری مع سود ادا کرے گی۔

خوبصورتی کا نازک ترین حصّہ وہ ہوتا ہے جو تصویر میں نہ آسکے۔

ہمارے دَور میں نیک آدمیوں کے سوا سب شریک ہیں۔

اے مغرور! کوئی ایسی ترکیب بھی ہے کہ تو قبر میں نہ لیٹے؟

رواج بُری سے بُری چیز سے مصافحہ کرا دیتا ہے۔

تمام دنیا کی بہترین عقلیں، شاعر کے ایک جنون کی قیمت نہیں دے سکتیں۔

اگر اتنے بُرے آدمی نہ ہوتے تو اس قدر اچھے وکیل بھی نہ ہوتے۔

سچّے شاعر کائنات کے اتالیق ہیں۔

بہت سے استاد، شاگردوں کے بنائے ہوئے ہیں۔

بعض مرگئے اور زندہ ہیں، اور بعض زندہ ہیں اور مُردہ۔

ایک اچھا دل بہتر ہے دنیا کے تمام اچھے دماغوں سے۔

صرف شہید، ملک الموت کو شکست دیتا ہے۔

شباب کی آنکھوں کے سامنے کوئی بدصورت نہیں۔

بیماریاں کیا ہیں؛ اجل کے تقاضے — اور "صحت" اُن تقاضوں پر کامیاب معذرت کا نام ہے۔

خوشی کے پھُول کو زیادہ پیار نہ کرو، ورنہ اُس کی نازک پنکھڑیوں سے غم کا عرق ٹپکنے لگے گا۔

دولت کی کم وقعتی اسی سے ظاہر ہے کہ جب تک اُسے جدا نہ کیا جائے، راحت ممکن نہیں۔

میں آج کے مسرت خیز واقعات سے کیا خوش ہوں؟ جانتا ہوں کل یہی واقعات "ایک عبرت انگیز یاد" بن کر ستانے آئیں گے۔

اے دنیا ہم فقیروں کو نہ تھپک، ہم شاعروں کو نہ لُبھا۔ بڈھے پالنے میں نہیں جھُلائے جاتے۔

بیوقوفوں کی مہربانیاں بڑی بڑی بوندیں ہیں، جو یکایک پڑنے لگتی ہیں، اور چشم زدن میں غائب۔

تکیہ کلام ایک عصا ہے، جس کے سہارے ضعیف گویائی ٹٹولتی ہوئی چلتی ہے۔

(جوشؔ ملیح آبادی)

وطن کے نوجوانوں سے خطاب

تو ہی تو اے نوجواں تعبیرِ خوابِ قوم ہے!
قوتِ پایندۂ ہستی ہے، شبابِ قوم ہے!

زندگانی کے قصیدے کی تو ہی تشبیب ہے
حریت کی تو وطن کے واسطے تقریب ہے

نوجواں یہ یاد رکھ تمہیدِ مستقبل ہے تو
قوم گویا جسم ہے۔ اس کا دماغ و دل ہے تو

ہے عروسِ زندگی کا تو ہی سرتاج اور سہاگ
تو ربابِ ہستئ انساں کا ہے کلیان راگ

کیا فقط ماں باپ ہی کی آنکھ کا تارا ہے تو
ہے وطن کا نورِ چشم، اور قوم کا پیارا ہے تو

کارگاہِ دہر میں ہے تو اک ایسی خوردبیں
جس سے آئینہ ہو اسرارِ فلک۔ رازِ زمیں

طعن کی باتیں بھی سنتے ہیں جوانوں کے خلاف
کچھ کنایہ میں کہی جاتی ہیں تو کچھ صاف صاف

جا و بیجا لوگ کہہ اٹھتے ہیں تم کو دیکھ کر
"تم میں نسوانی ادائیں آ گئی ہیں بیشتر

بن سنور کر کالجوں کو اس طرح جاتے ہو تم
اپنی زیبائش سے دلہنوں کو بھی شرماتے ہو تم

وقت ٹائی اور برش کنگھے میں ہو جاتا ہے صرف
اس سے جو بچتا ہے پڑھ لیتے ہو اس میں چار حرف

زیب و زینت اور خود بینی کا ہے تم کو مرض
یہ بدیسی ہے کہ دیسی چیز؟ اس سے کیا غرض

دم سے چلتی ہیں تمہارے یہ دکانیں مال کی
(دال سوڈا)
جان ہو تم ہی سنیما اور تھیئٹر ہال کی

ہوسٹل، لکچر کے کمرے، کھیل کے میدان میں
بھول جائے حضرت یوسف کو دیکھے جو تمہیں

زیب و تزئیں کے ہو بندے، سادگی سے دور ہو
تم خود آرائی کے نشہ میں ہمیشہ چور ہو

پاس ہونے کی خوشی ہوتی نہیں اتنی تمہیں
جتنی کالج چھوڑ کر ہوتی ہے مایوسی تمہیں"

اور کچھ باتیں بھی ہیں کہہ جاتے ہیں جو نکتہ چیں
ذمہ داران کانگریس تم کو کہہ سکتا نہیں

تھوپے جاتے ہیں جو تم پر عیب یا ہیں واقعی
متہم ان کے لئے تم ہو نہیں سکتے کبھی.

اس حقیقت سے مگر واقف نہیں ہیں خود وہ بھی — یہ سب اخلاق و راثت کے سوا کچھ بھی نہیں
مغربی یا مشرقی ہو کچھ بھی ان کی نوعیت — ان میں اسلاف و بزرگوں کا عطیہ ہے بہت
ذمہ دار اس کے سلف ہیں، کب تمہاری ذات ہے — ثمرہ ہے سوشل وراثت کا یہ سیدھی بات ہے
ان عوارض میں بہت ردِ عمل درکار ہے — یہ جو ہو جائے تو پھر اک دم میں بیڑا پار ہے

امرِ حق میں کچھ ضرورت استعارے کی نہیں — ہو جو نیت نیک تو حاجت اشارے کی نہیں
مجھ کو کہنا ہے یہ تجھ سے سن اسے اے نوجواں — تیری ہی جانب اٹھائے ہے نظر ہندوستاں
جو بڑے ہیں تجھ سے، لے اُنکے نقائص سے سبق — تو اولو العزمی کا اُن کوتاہیوں سے لے سبق
ہو وطن آزاد - اس کی لاکھ ہم باتیں کریں — ہے غلامی حاوی و ساری ہماری ذات میں
فرقہ بندی سے یہاں مجروح ہے حُبّ وطن — جل رہا ہے تفرقے کی آگ میں سارا چمن
ہم اُٹھاتے ہیں قدم تو پھونک کر اور تول کر — یہ ہماری چال نستعلیق اور لمبا سفر
تجزیہ ہو ذہنیت کا ان بزرگوں کی اگر — تو جگہ دی جائے اس کو اک صدی سے پیشتر
تجزیہ بدبختیوں، ناکامیوں کا ہے یہیں — آزمودہ کار ہیں ہم صبر میں اور شکر میں
سوچ کا اور فکر کا تو اب زمانہ ہو چکا — بند صبر و شکر کا اب کارخانہ ہو چکا
رہے ہماری عاقبت بینی کا یہ کچھ ماحصل — وقت آیا ہے کہ لو تم ہاتھ میں تیغِ عمل
ہا مصلحت اندیشیوں سے کام چلنے کا نہیں — یہ شجر آہوں کی گرمی سے تو پھلنے کا نہیں
کام وہ ہو جس سے نکھرے کچھ وطن کا رنگ روپ — اہلِ دنیا کو دکھا دو تم ہو بھارت کے سپوت

جو نہ آیا تھا کبھی وہ انقلاب آنے کو ہے — عالمِ تہذیب کو روزِ حساب آنے کو ہے
دیکھتے ہو کل جہاں کس کام پر تیار ہے — جانتے ہو تم کہ کیا اس عزم میں اسرار ہے
تم عصا ہو اے جوانو اپنی قومِ پیر کا — رنگ بدلو اس کی تم بگڑی ہوئی تقدیر کا
قومیت اپنی جو ہے وہ اک ملیّت کا نام ہے — ملیّت بھی کیا۔ کہ اک فرقہ سے ہے جو کام ہے
مغز فرسودہ میں ہے عزمِ بزدلی اس قدر — تیز چلنے میں نظر آتا ہے گرنے کا خطر
تُند توں صبر و سکوں کی شعبدہ بازی رہی — عقل کی ذوقِ عمل سے حیلہ پردازی رہی

دیکھتے ہیں جب جوانی کا کہیں جوش و خروش — تو یہ کہہ اٹھتے ہیں، لو کھو بیٹھے وہ سب عقل و ہوش

میں نے مانا کام بے سوچے کوئی اچھا نہیں — سوچ ہی میں کاٹ دینا عمر بھی اچھا نہیں

کاٹ دی ہے سوچنے میں ہم نے جو عمر عزیز — استفادہ تم کرو اس سے کہ ہو صاحب تمیز

سادگی اطوار میں ہو، دل میں ہو حبِّ وطن — اور ادائے فرضِ آئندہ کی ہو جی کو لگن

یہ جوانی تو نہیں بس خط اٹھانے کے لئے — رکھو محفوظ اس کو آئندہ زمانے کے لئے

گل سجاوٹ اور رونق باغ کی پھولوں سے ہے — غور سے دیکھو تو ہستی پھول کی کلیوں سے ہے

پھول تو کچھ دن میں مرجھا اور کمھلا جائیں گے — ہیں وہ غنچے ہی تو جو گلزار کو مہکائیں گے

تم سے آئے گی بہارِ بےخزاں گلزار میں — جلوہ گر ہوگا ارم اس وادیٔ پُرخار میں

تم وطن کے کام میں مصروف ہو گے جس گھڑی — خضر و نا آردبن کے آئیں گے بہت سے آدمی

ہادیوں کے بھیس میں بہکانے والے آئیں گے — تم کو راہِ راست سے بھٹکانے والے آئیں گے

لے کے تسبیح اور سُمرن بھی بہت آئیں گے لوگ — ڈاڑھیوں اور چوٹیوں سے تم کو بہکائیں گے لوگ

اک بھیانک نرک اور دوزخ دکھایا جائیگا — محشرِ کبریٰ کا منظر آگے لایا جائے گا

ایک بھی اُن کی نہ سننا وہ ریاکاری ہے سب — وہ تو چادر اور تختہ کی اداکاری ہے سب

چل چکا صدیوں وہ جادو اُن کا اپنی قوم پر — اُن کی لوری کام دے سکتی نہیں وقتِ سحر

فتنہ پردازی سے اُن کی بچکے رہنا نوجواں! — آپھنسے جو دام میں اُن کے تو آزادی کہاں

اُن کو ماضی جان کر مطلق نہ رکھو اُن سے کام — تم ہو مستقبل کرد آئندہ کا حسنِ نظام

ہے یہ میدانِ عمل! آجاؤ تم سر جوڑ کر! — اور وطن کے فرض کو انجام دو جی توڑ کر

اس قدر خود رفتہ ہو جاؤ طلب کی راہ میں — ہر قدم پر منزلِ مقصود خود ڈھونڈے تمہیں

جب تمہارا جذبۂ پنہاں عیاں ہو جائیگا
نوجوانو! پھر وطن بھی نوجواں ہو جائیگا

(علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی)

معاشی قومیت

عبدالرحیم شبلی بی کام

"معاشی قومیت" وہ جذبہ یا اعتقاد ہے جو اپنے ملک کو اقتصادی طور پر خودمختار اور کافی بالذات بنانے کے لئے کسی گورنمنٹ میں پایا جائے، اُس کو قومی ترقی یا ملکی خوشحالی کے مُرادف سمجھنا غلطی ہے۔

تاریخی لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ "معاشی قومیت" اُنیسویں صدی کے حامیانِ تجارتیت کے خیالات کی مرہونِ منت تھی، کیونکہ اِن لوگوں کا خیال تھا کہ ہمیں اپنی برآمد کو درآمد سے محض اس لئے زیادہ رکھنا چاہیئے تاکہ زائد مخارج کے عوض میں سونا حاصل ہو، اور ملک کی خوشحالی بڑھے، پس یہ جذبۂ حصولِ دولت اور معاشی اقتدار ہی "معاشی قومیت" کا باعث بنا۔

اُنیسویں صدی کے آخر میں آدم سمتھ نے "معاشی قومیت" کے نظریّہ کی پُرزور مخالفت کی۔ علاوہ ازیں کچھ سیاسی و معاشی حالات میں بھی تغیر رونما ہوگیا۔ اس لئے قومیت کی بجائے "معاشی بین الاقوامیت" کے خیالات زور پکڑنے لگے۔

کچھ عرصہ کے بعد فریڈرک لسٹ نے پھر معاشی قومیت کی حمایت کرنا شروع کردی، اور اپنے خیالات کی موافقت میں ہیگل کے اِس فلسفہ کو پیش کیا، کہ حکومت کا اقتدار اور وقار ہی سب سے بڑا شعور اور "عقلیت منفردہ" ہے۔ پس اِس وقار اور اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک معاشی طور پر خودمختار اور کافی بالذات رہے۔

لیکن باوجود اس حمائتی پروپیگنڈے کے معاشی قومیت عرصۂ دراز تک ایک مجبور کردینے والی طاقت کی بجائے ایک محکوم قوت رہی اور اندر ہی اندر اُس نے معاشی سامراجیت کے خیالات کو فروغ دیا جو بعد کو محاربۂ عظیم کا باعث بنے۔ اس جنگ کے بعد سب سے بڑا سبق جو اقوامِ عالم نے سیکھا۔ یہ تھا کہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ معاشی تفوق بھی حاصل ہو، اور اس کے لئے اُنھوں نے معاشی خودمختاری اور تجارتی انقطاع کے اصول وضع کئے۔

پس اگرچہ تاریخی لحاظ سے معاشی قومیت کا ارتقاء ثابت کیا جا سکتا ہے، لیکن معاشی طور پر اس کی حمایت میں کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی، دوسرے الفاظ میں تاریخ والوں کے نزدیک یہ نظریہ لابدی ہو تو ہو لیکن ایک ماہرِ معاشیات کے نزدیک یہ مطمحِ نظر قابلِ قبول نہیں۔ آیئے ہم اِس کی موافقت و مخالفت میں مختلف دلائل کا تفصیل تجزیہ کریں۔

پہلی دلیل معاشی قومیت کی حمایت میں حیاتیات یا بیالوجی سے مُقتبس ہے: "قدرتی انتخاب" اور "بقاءِ اصلح" کے قوانین نے اجتماعیات تو کیا حیاتیات کے بارہ میں بھی انسانی خیالات کو تبدیل کردیا ہے۔ اِن کی رُو سے کمزور کو فنا ہو جانا چاہیئے۔ صرف اصلح کو باقی رہنے کا استحقاق ہے، پس اگر کوئی ملک یا قوم زندہ رہنا چاہتی ہے تو اُسے چاہیئے کہ اپنے آپ کو سیاسی لحاظ سے مضبوط بنائے اور سیاسی لحاظ سے مضبوط بننے کے لئے ضروری ہے کہ معاشی طور پر خودمختاری حاصل کی جائے۔

پھرسٹ کا خیال ہے کہ چونکہ غیر مساوی اجزا میں ارتباط نہیں ہوسکتا۔ اس لئے معاشی عالمگیریت اور انحصارِ باہمی کے رشتہ میں منسلک ہونے کے لئے ضروری ہے کہ تمام اقوام و ملل یکساں طور پر مضبوط و مقتدر ہوں اور اس کے لئے معاشی قومیت ہی بہترین لائحہ عمل ہے۔

دلیل واضح ہے، لیکن یک طرفہ۔ اگر یہ درست ہے کہ انسان کے بارہ میں "قدرتی انتخاب" کا اصول کارفرما ہے تو مجھے خطرہ ہے کہ یہ مصنوعی انتخاب ہے۔

لیکن اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ تنازع للحیات کے لئے مصنوعی انتخاب کے معرضِ عمل میں آنے کا کوئی امکان نہیں تو بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اقتصادی انقطاع اور معاشی خودمختاری کمزور اقوام کو مضبوط اور طاقتور بنا دے گی۔ کمزور اقوام کو مضبوط بنانے کا طریق تو دوسروں سے اتحاد و ارتباط ہے نہ کہ انقطاع و خودمختاری۔ موخرالذکر طریق سے تو وسائلِ قدرت اور طاقت و قوت کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ اُن کے منفعت بخش رود بار میں رواں ہونے کی اُمید نہیں۔

دوسری دلیل جو معاشی قومیت کی حمایت میں پیش کی جاتی ہے "متوازن معیشت" ہے۔ یعنی ملک میں زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت یکساں نسبت سے ترقی یافتہ ہونا چاہئیں تاکہ ملک تمام پہلوؤں کے لحاظ سے متمدن کہلا سکے۔

خیال اچھا ہے۔ لیکن متوازن معیشت کی برکات کو صرف ایک ملک تک ہی محدود کیوں رکھا جائے۔ اُن کو بین الاقوامی کیوں نہ بنایا جائے؟

کہا جاتا ہے کہ اگر معیشت غیر متوازن ہو تو جنگ کے دوران میں جب خارجی تجارت منقطع ہوجاتی ہے تو اُس وقت لوازمِ حیات کا ملنا بھی دشوار ہوجاتا ہے۔ اندریں حالات کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہر ملک کافی بالذات ہو۔

اس قسم کی دلائل کا پیش کرنا نیک فال نہیں ہے۔ ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم انسانی جماعتوں کو آپس میں متحارب دیکھنا پسند کرتے ہیں پھر یہ بات میری دلیل کو اور بھی زیادہ قوی کرتی ہے۔ اگر معاشی خودمختاری کے بغیر جنگیں کامیابی سے نہیں لڑی جاسکتیں تو یہ تو بہت مفید بات ہے دوسرے الفاظ میں جنگوں کے انسداد کا بہترین طریق یہ ہے کہ کسی ملک کو معاشی طور پر خودمختار نہ ہونے دیا جائے۔

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ جب دوسری اقوام اس اصول پر عمل نہیں کرتیں تو ہمیں دوسروں پر انحصار رکھ کر تکلیف اُٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ بظاہر یہ دلیل وزنی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا دوسروں کی تقلید کسی لائحہ عمل کو درست ثابت کرسکتی ہے؟ میرے خیال میں تو یہ دلیل بالکل اُس دلیل کی طرح ہے کہ اسلحہ بڑھانے سے ہی اسلحہ کم ہوسکتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اعتبار صرف اعتبار کرنے سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ پس دوسروں کے دل سے شک و شبہ دُور کرنے کے لئے کسی قدر قربانی کی ضرورت ہوگی۔

حال ہی میں معاشی قومیت کی حمایت میں عالمگیر کساد بازاری کی دلیل پیش کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ تجارتی زبوں حالی سے بچنے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اقتصادی طور پر خودمختاری حاصل کی جائے۔ لیکن ایسا کہنے والے غالباً علت و معلول میں فرق نہیں کرسکتے۔

در اصل معاشی قومیت کی وجہ سے زر اندوزی کی مذموم عادت پیدا ہوتی ہے اور اس وجہ سے تجارت میں تعطل پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں صنعتی زبوں حالی اور اقتصادی انحطاط کا ظہور ہوتا ہے۔ پس معاشی قومیت کو، جو ایک علت ہے، کساد بازاری کی، جو معلول ہے، علاج کے طور پر پیش کرنا یقیناً حیرت انگیز ہے۔

علاوہ ازیں آج کل کے پیچیدہ تمدن میں معاشی انقطاع اقتصادی ناممکنات میں سے معلوم ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ معاہدۂ ورسائی سیاسی قومیت کی ایک بڑی فتح تھی۔ لیکن اقتصادی نقطۂ نظر سے اس کی ضرر رسانیاں اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اگرچہ سیاسی طور پر جرمنی کو دبانا ممکن تھا۔ لیکن اقتصادی طور پر اس کی وجہ سے تمام یورپی طاقتوں کو سخت نقصان ہوا۔

معاشی بین الاقوامیت کی موافقت میں سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ قدرت نے ہر ملک کو مختلف صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی خاطر، بہتر یہی ہے، کہ ہر ملک صرف

اُن اشیاء کی ساخت و پیدائش میں تخصیص کرے ۔ جن کے لئے اُس کے قدرتی وسائل اور جغرافیائی حالات سازگار ہیں ۔ مثلاً اگر کوئی ملک اپنے وسیع رقبات اور مخصوص آب و ہوا کے لحاظ سے صرف کاشتکاری کے اہل ہے تو اُسے چاہیئے کہ صرف زراعت کی طرف ہی توجہ رکھے ۔ لیکن اگر وہ صناعت و تجارت کے لئے مخصوص کیا گیا ہے تو اُسے اسی شعبے کی ترقی و تہذیب کی طرف متوجہ رہنا مفید رہے گا ۔

لسٹ اس کے خلاف یہ کہتا ہے کہ عمل کی اس جغرافیائی تقسیم اور مبادلۂ آزاد سے قوم کی تخلیقی قدر یا
تو بیشک بڑھ جائے گی ، لیکن تخلیقی قوتوں یعنی
پر اس کا بہت ناخوشگوار اثر پڑے گا ۔

لیکن میرا خیال ہے کہ "تخلیقی قوت" ایک مبہم اصطلاح ہے ، اور لسٹ نے خود اس کے معنی صنعت کے علاوہ اخلاقی اور سیاسی ادارہ کے بھی کئے ہیں ۔ لیکن بحیثیت معاشیات کے ایک طالب علم ہونے کے ہمیں اس کے معنی صرف صنعت و حرفت تک محدود رکھنا چاہئیں ۔

پھر میرے نزدیک کسی قوم کی دولت آفرینی کے لئے حسنِ کارکردگی کا کوئی مسئلہ معیار نہیں ہے ۔ اور نہ ہی جملہ ممالک پیدائش دولت کے لئے مساویانہ اہل ہوتے ہیں ۔

اگر ہم دولت آفرینی میں انسان کی قابلیت مساویانہ تسلیم کرلیں تو بھی آب و ہوا ، معاشرت ۔ اور جغرافیائی حالت یقیناً جدا جدا ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ان چیزوں کا پیدائش دولت پر کم اثر نہیں ہوتا ۔

پس چونکہ دولت آفرینی ایک اعتباری اور اضافی شے ہے اور ہر ملک کی قوتِ پیدائش دولت جداگانہ ہوتی ہے ، اس لئے بہترین لائحۂ عمل یہی ہے کہ ہر ملک صرف اُن اشیاء کی ساخت و پیدائش میں تخصیص کرے جس کے لئے اُس کے قدرتی وسائل سازگار ہیں ۔ اور باقی اشیاء بین الاقوامی مبادلہ کے ذریعے سے درآمد کرے ۔

پھر معاشی قومیت سے اقتصادی ضیاع کا بھی خطرہ ہے ۔ مثلاً اسی قومیت کے زمانہ میں ہر ملک جدا جدا جہاز بنانا ضروری سمجھتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ طلب کے مقابلہ میں جہازوں کی بہم رسانی بقدر ۲۴ فیصدی زیادہ ہے ۔ اگر تجارت آزادانہ ہو ، اور سب ممالک مل جل کر کاروبار کریں تو اس رائیگاں جانے والے سرمایہ کی بچت ہو سکتی ہے ۔ یہی حال دیگر آلاتِ دولت آفرینی کا ہے ۔

اب ہم اُن معاشی مسائل کو لیتے ہیں جو اس جذبۂ قومیت کی وجہ سے منصّۂ شہود پر آ گئے ہیں ۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ایک طرف تو جرمنی کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے جنگی قرضہ جات اور تاوان کا تصفیہ کرے اور دوسری طرف تحفظاتِ تجارت کے ذریعہ سے اُس کے لئے جو ادائی کا واحد راستہ تھا وہ بند کر دیا گیا ہے ۔

پھر معاشی قومیت کی وجہ سے سونے کو ایک طاقت تصور کیا جانے لگا ہے ۔ اور ہر ملک زیادہ سے زیادہ سونا اپنے بنکوں میں جمع کرنے کی سعی کر رہا ہے ۔ اس وقت دنیا کا ۹/۱۰ سونا فرانس اور امریکہ کے پاس ہے ۔

علاوہ ازیں آبادی اور مزید رقبجات کے حصول کا مسئلہ بھی اسی جذبۂ قومیت کی تخلیق ہے ۔

جنگ عظیم کے بعد یورپ کو لاتعداد چھوٹی چھوٹی "جیبی ریاستوں" میں تقسیم کر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ معاشی طور پر دیگر دنیا سے منقطع ہونے پر مجبور ہو گئے ۔ اور آج اُس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ جرمنی اور اطالیہ ایسے ممالک جو حربی اور سیاسی لحاظ سے قدرے مضبوط ہیں اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے باعث مزید رقبات کے حصول کے لئے سر توڑ کوشش کر رہے ہیں ۔ اور اس مقصد کے لئے وہ جنگ آزمائی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے ۔ حال ہی میں رومانے ایبے سینیا کو پامال کیا ہے ۔ اور مزید علاقہ جات پر دندانِ حرص و آز رکھتا ہے ۔ جرمنی نے اپنے "غصب شدہ" ممالک کی واپسی کے لئے جمعیتہ اقوام والوں کو چیلنج دیئے ہیں ۔ جس کا نتیجہ سوائے خون آشام محاربۂ عظیم کے اور کچھ نہ نکلے گا ۔

یہ سب معاشی قومیت کی "برکات" ہیں !!

معاشی خرابیوں کے علاوہ اس جذبہ سے کئی دیگر برائیوں کے پیدا ہونے کا بھی احتمال ہے ۔ اگر یہ نظریہ قائم رہا تو لوگ روز بروز متعصب اور تنگ نظر ہوتے جائیں گے ۔ اگر وہ انگلستان میں ہیں تو صرف انگریزی اشیاء کے استعمال پر مصر ہوں گے ۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ ردّی سے ردّی انگریزی فلم محض اس لئے دیکھیں گے کہ وہ قومی ہیں اور امریکن

فلم کا محض اس لئے بائیکاٹ کر دیں گے کہ وہ خارجی ہے۔ پھر بڑھتے بڑھتے یہ جذبہ کتابوں اور اخباروں کے بارہ میں بھی کارفرما ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ لوگ گوئٹے۔ ٹالسٹائی اور وکٹر ہیوگو کی کتابوں کا محض اس لئے مقاطعہ کر دیں کہ وہ "خارجی مصنفین" تھے۔

پس یہ جذبہ سوائے مجنونانہ حرکت کے اور کچھ نہیں، اور اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

نسیم اُن کو بھی ساتھ لانا

اگر کہیں ہو اُدھر بھی جانا
نسیم اُن کو بھی ساتھ لانا

سنبھل سنبھل کر قدم اُٹھانا ذرا دبے پاؤں پاس جانا
ہٹانا آہستہ اُن کی زُلفیں مگر اُنھیں ہاتھ مت لگانا
پیام بن کر جو دل میں اُترے وہ مست نغمہ اُنھیں سُنانا
زیادہ اٹھکھیلیاں نہ کرنا بہت متانت سے گدگدانا
بڑے ہی نازک مزاج ہیں وہ نزاکتوں سے اُنھیں جگانا
اگر وہ پوچھیں کہ کس نے بھیجا نہ کچھ بتانا پتا۔ٹھکانا
نہ آئیں گے گر ہوا بھی پالی یہی ہے بہتر ہوا بتانا
بنا کے جھوٹا کوئی بہانا
نسیم، اُن کو بھی ساتھ لانا

بزم۔ لکھنؤ

وقت سے جنگ

مجید ملک۔ بی اے، ایل ایل بی
علیگ

بعض باتیں درست ہوتی ہیں اور بعض غلط، لیکن دقت یہ ہے کہ ایک ہی بات کو کچھ لوگ درست بتاتے ہیں اور کچھ غیر درست۔

مثلاً ایک مرتبہ میں ایک لڑائی میں شریک ہوا۔ شریک کیا ہوا ہیں۔ اکیلا ایک طرف تھا اور دوسری جانب ——————

لیکن بہتر یہ ہوگا کہ ابتدا سے قصہ بیان کروں۔

میں ایک بارہ پندرہ روپے کی گھڑی خریدنا چاہتا تھا، میرا خیال تھا اور ہے کہ بڑی دوکانوں پر پندرہ روپے کی گھڑی پچیس روپے میں ملتی ہے، اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمارے ہی بازار میں گھڑیوں کی جو چھوٹی سی، لیکن پرانی اور مشہور دوکان ہے اسی سے گھڑی خریدوں گا۔

چنانچہ ایک دن دوپہر کے وقت میں اپنے ارادے کی تکمیل کے لئے ایک بے رنگ و روغن دروازے سے ایک بوسیدہ سی چق ہٹا کر دوکان کے اندر داخل ہوا۔ باہر کی تیز دھوپ کے بعد دوکان کی دھیمی روشنی میں تین چار لمحوں کے لئے میری آنکھوں نے پوری طرح سے کام نہیں دیا، اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ دوکان بالکل خالی ہے، دوکان کا مالک جس غیر معمولی طور پر اونچی کرسی پر بیٹھنے کا عادی تھا وہ کرسی یقیناً خالی تھی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد ایک کونے سے ایک آدمی نکلا اور میرے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔

میں نے کہا "مجھے ایک گھڑی چاہیئے۔"

اس نے جواب دیا "معاف کیجئے، گھڑیوں کی قیمتیں مجھے معلوم نہیں، مالک دوکان باہر گئے ہیں، تھوڑی دیر میں آئیں گے۔"

میں نے دل ہی دل میں باہر کی کڑکتی چلچلاتی دھوپ کا دوکان کی خنک، دھیمی روشنی سے مقابلہ کیا، اور بادلِ ناخواستہ واپس چلا، لیکن اس آدمی نے کہا "اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو کچھ دیر انتظار کر لیجئے۔"

میں ایک آرام کرسی پر جو کچھ ایسی آرام دہ نہ تھی بیٹھ گیا، مختلف گھڑیوں کی متوازن ٹک ٹک اور بجلی کے پنکھے کی تھمی مسلسل سنسناہٹ کے علاوہ دیر تک میں نے اور کوئی آواز نہیں سنی، آہستہ آہستہ خنکی اور دھندلکے نے اپنا اثر کیا۔ میری آنکھیں وزنی ہوگئیں۔ باہر بازار میں دو آدمی باتیں کر رہے تھے، ایک نے کہا "میں اس کا غلام نہیں کہ ہر وقت ہاں میں ہاں ملاتا رہوں" دوسرے نے کہا "جیسا وقت ہو ویسا ہی کرنا چاہیئے۔" پہلے نے کہا "وقت کی ایسی تیسی۔"

خدا جانے ان الفاظ میں کیا بات تھی کہ تمام گھڑیوں میں ایک خشونت ایک کرختگی پیدا ہوگئی۔ ٹک، ٹک، ٹک، ٹک، آوازیں بلند اور بلند تر ہوتی گئیں، اور انجام کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ گویا کوئی تنومند آہنگر ہتھوڑے کی چوٹیں لگا رہا ہے۔ بڑے بڑے کلاک اور معمر ٹائم پیسوں کی

آواز میں غیظ و غضب کے ساتھ تمکنت اور وقار بھی تھا۔ لیکن چھوٹی گھڑیوں کی آواز میں ایک مسلسل اور لامتناہی احتجاج کے سوا اور کچھ نہ تھا ـــــــ سب سے بڑا کلاک مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا۔ معاً اس کے ان دو سوراخوں میں جن سے چابی دی جاتی ہے ایک حرکت، ایک چمک، ایک جان سی پیدا ہو گئی۔ اور اب جو دیکھتا ہوں تو دو غضب آلودہ آنکھیں ہر چہار طرف دیکھ رہی ہیں۔ گھنٹوں اور منٹوں کی سوئیوں نے قوی بازوؤں کی صورت اختیار کر لی ہے، اور شاہ بلوط کا صد سالہ چوبیں فریم انسانی جسم کے حصۂ زیریں کی صورت میں مبدل ہو چکا ہے۔

میں نے اس ہیبت ناک مشاہدے کو ایک ڈراونا خواب سمجھنے کی کوشش کی اور گھبرا کر اس بڑے کلاک سے نگاہ ہٹا لی۔ لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ کمرے کی تمام گھڑیاں انسانی پیکر اختیار کر چکی ہیں، ایسا انسانی پیکر جس میں ایک بدیہی قسم کی آہنیت اور چوبیت کے باوجود لچک اور جان ہے، بڑے بڑے کلاک اور ٹائم پیس اپنے اپنے کارنسوں سے یوں اُتر رہے ہیں جس طرح کسی فاتح فوج کے قوی ہیکل، دیو پیکر، زرہ پوش سردار، ہزیمت خوردہ غنیم کے قلعہ کی فصیلوں سے اترتے ہیں، اور چھوٹی چھوٹی گھڑیاں نازنینانِ حرم کی طرح حریر و پرنیاں میں ملبوس مشرق و مغرب کے حُسن کو ماند کرتی ہوئی اپنے حجلوں سے نکل کر یوں زمین پر قدم دھر رہی ہیں جس طرح آخر شب میں شبنم گلاب کی پتیوں پر گرتی ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ان نازنینوں کے چہروں پر بھی عزم بلکہ خشونت اور خشم کے آثار موجود ہیں۔

بڑا کلاک تین چار قدم آگے بڑھ کر ایک دوکان کی اونچی کرسی پر بیٹھ گیا، اور بولا ـــ "میں اُس حق کی رُو سے جو مجھکو حاصل ہے اور جس کی تفصیلات کے اظہار کی ضرورت نہیں، اپنے آپ کو صدر نامزد کرتا ہوں۔ نامزد نہیں منتخب کرتا ہوں، اور میں حکم دیتا ہوں کہ آپ لوگ تقریریں کریں، اور ان تقریروں میں میرے خیالات کا اظہار کریں۔

کمرے میں جتنے مرد و زن یعنی کلاک، ٹائم پیس، اور چھوٹی بڑی گھڑیاں موجود تھیں، سب نے تالیاں بجائیں، جو زیادہ جوشیلے تھے اُنھوں نے نعرے بھی سر کئے۔ صدر نے ہاتھ اُٹھا کر کہا "خاموش"! اور ایک معمّر کلاک کی طرف اشارہ کیا، اس معمر کلاک نے دو قدم آگے بڑھکر کہا ـــ "خواتین و حضرات! انسان سمجھتا ہے ہم اس کی مخلوق ہیں، اس کی عقل و دانش اور صنعت کاری کا مظہر ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان ہمارا ادنیٰ غلام ہے، یہ غلام باغی ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس فکر میں ہے کہ ہمارے نظام سے نکل جائے، بلکہ انسانی جماعت کے وہ کج نگاہ و کج بیں افراد جو اپنی عقل کو عقلِ کل اور حاصل کائنات سمجھتے ہیں، اور جن کے دلوں میں غداری اور بغاوت کا زہر بدرجۂ اتم سرایت کر چکا ہے اس فکر میں ہیں کہ موجودہ نظام کو درہم برہم کر دیں، میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ انسان کو اس گستاخی کی قرار واقعی سزا دی جائے"۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا "بیشک، بیشک"۔ معمر کلاک بولا، "سزا کیا ہو؟" کسی نے کہا "سولی پر لٹکا دیا جائے"۔ ایک جوشیلے ٹائم پیس نے کہا "جس بجلی پر اِسے بہت ناز ہے اور جس کے بل بوتے پر اسے زمان و مکان کی منزلیں طے کرنے کا خبط ہے اسی کی لہروں میں پھنسا کر اس کی زندگی ختم کر دی جائے۔ کسی نے کہا "دن کو طویل کر دیا جائے، یہاں تک کہ آفتاب کی گرمی سے تڑپ تڑپ کر مر جائے"۔ پچھلی قطاروں میں سے ایک آواز آئی "نہیں، ایک لامتناہی رات کی تاریکی میں اسے خود سر پھوڑ پھوڑ کر مرنے کا موقعہ دیا جائے"۔ اس آخری تجویز پر ہر طرف سے آفرین و تحسین کی صدائیں بلند ہوئیں، اور میں نے سمجھا کہ یہی تجویز منظور ہو گئی۔

لیکن ایک نازنین آگے بڑھی، اور اُس نے کہا "میں موجودہ فیصلہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہوں، اور تجویز پیش کرتی ہوں کہ اُسے مسترد کیا جائے، اس لئے نہیں کہ یہ فیصلہ غلط ہے یہ فیصلہ صحیح اور بالکل صحیح ہے، لیکن اس کے باوجود یہ قابلِ استرداد ہے، کیوں؟ اس لئے کہ طبقۂ اناث کی رائے اس میں شامل نہیں۔

میں نے دیکھا کہ معمر کلاکوں کی پیشانی پر کچھ بل سے پڑ گئے، لیکن نوجوانوں نے شریک آہنگ ہو کر کہا "بجا ہے، درست ہے، بالکل درست ہے، یہ فیصلہ قابل استرداد ہے، صدر نے کہا "نہیں ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ خواتین ایک علیحدہ مجلس قائم کر کے فیصلہ کریں۔ چنانچہ اسی وقت خواتین کا ایک علیحدہ جلسہ ہوا جس میں بار بار نئے نئے لباس پہن کر گرم گرم تقریریں کی گئیں، بہت سے آنسو بہائے گئے اور پونچھے گئے یہاں تک کہ بعض مقررین اور سامعین کی ساڑیوں کے آنچلوں پر عاصیوں کے

دامنِ تر کا شبہ ہونے لگا۔ لیکن جذبات کا یہ تلاطم۔ سریلی آوازوں کا یہ زیر و بم، ملبوسات کا یہ رنگین تنوع نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا۔ اور مجلس کوئی رائے قایم نہ کر سکی۔ انجام کو سب نے مل کر صدر سے کہا "ہم رائے قائم کرنے سے انکار کرتی ہیں، کیونکہ یہ انکار ہمارا پیدائشی حق ہے۔ اور اس حق سے ہمیں کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ آپ لوگوں کے جی میں جو آئے وہی کیجئے۔"

تعجب اس بات پر ہے کہ اس وقت تک مجھے کسی نے بھی نہ دیکھا تھا۔ میں خائف اور مبہوت اپنی کرسی پر سمٹ سمٹ کر دشمنوں کی نگاہوں سے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن اس مرحلہ پر خوف مجھ پر اس قدر غالب آگیا کہ میں نے بھاگ نکلنے کی کوشش کی۔ یہی کوشش میرے لئے مصیبت کا باعث بن گئی۔ کیونکہ معاً کسی نے کہا "دیکھو! پکڑو! باغی فرار ہوتا ہے۔" ایک ہی لمحے میں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ میں نے دل میں کہا "موت کا ایک دن مقرر ہے۔ مردوں کی طرح جان دوں گا۔" چنانچہ دو قدم آگے بڑھ کر میں نے ایک جوان کلاک کے چہرے پر اس قدر زور سے گھونسا مارا کہ وہ چیخ مار کر زمین پر گرا اور پاش پاش ہو گیا۔ لیکن فوراً ہی دوسرا کلاک میرے اور نجات کے درمیان حایل ہوا، اور فرار کا راستہ پھر مسدود ہو گیا۔ اب میں مرنے اور مارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ خون میرے سر پر سوار تھا۔ میں دیوانوں کی طرح اپنے دشمنوں پر پل پڑا۔ آگے پیچھے دائیں بائیں، جہاں اور جس طرح ممکن ہوا، پینترے بدل بدل کر۔ موت سے بے خوف اور زندگی سے نا امید ہو کر میں نے پے در پے حملے کئے۔ میرے ہاتھ کانچ کی خراشوں سے لہو لہان ہو گئے۔ لیکن میرے دشمن ہر چہار طرف زخمی ہو ہو کر گر رہے تھے اور میں آزادی کی امید سے مخمور اور فتحمندی کے احساس سے سرشار ہو کر انھیں موت کے گھاٹ اُتار رہا تھا۔

آخر کار مجھے فرار کا راستہ مل گیا اور میں بوڑھے صدر کے جو دروازے کے سامنے کھڑا تھا پیٹ میں ایک گھونسا مار کر بھاگ نکلا، بوڑھا صدر تڑاق سے نیچے گر کر چکنا چور ہو گیا، لیکن جب میں دروازے سے باہر نکلا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کمرے کے اندر سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔

میں رواں دواں، افتاں خیزاں، ہانپتا کانپتا دور نکل گیا، اور اُس وقت تک دم نہیں لیا جب تک مجھے یقین نہیں ہو گیا کہ تعاقب کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ ایک کھلے میدان میں پہونچ کر میں سستانے کے لئے بیٹھ گیا۔ میں نے گرد و پیش کے حالات پر غور کیا۔ اپنی نجات پر خدا کا شکر بجالایا۔ اپنی چوٹوں کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر کہ کوئی شدید چوٹ نہیں آئی مطمئن ہو گیا۔ لیکن معاً مجھے احساس ہوا کہ میرے پاؤں میں ٹخنے کے پاس کوئی چیز مجھے تکلیف دے رہی ہے۔ میں نے پائنچہ اُٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بال برابر شے ٹخنے کے گرد لپٹی ہوئی ہے۔ میں نے اسے اتارنے کی کوشش کی، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ بلکہ وہ اور بھی لپٹ گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میرا حلق خشک ہو گیا، کیونکہ میں نے دیکھا کہ یہ باریک تار درحقیقت ایک گھڑی کا اسپرنگ ہے۔ اور اس کا ایک سرا میرے ٹخنے پر ہے اور دوسرا سرا —— خدا جانے کہاں ہے۔ میں نے گھبرا کر —— سٹپٹا کر —— جھنجھلا کر —— ڈر کر —— کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس تار کو پاؤں پر سے نوچ کر پھینکنے کی کوشش کی۔ لیکن میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس باریک تار نے مجھے شکنجے کی طرح جکڑ لیا۔ مجھے بے دست و پا کر دیا —— اور اب کسی نادیدہ طاقت نے مجھے کھینچنا شروع کیا۔ میں تڑپا۔ اُٹھا۔ بھاگا۔ گرا۔ لیکن وہ باریک اسپرنگ نہیں ٹوٹا، اور میں کھنچتا، گھسٹتا، گرتا، پڑتا، لڑکھڑاتا اور سنبھلتا ہوا پھر اسی کمرے میں پہونچ گیا، جس سے میں جان بچا کر بھاگا تھا۔

اور جب میں اس کمرے میں پہنچا تو سب کلاک اور ٹائم پیس اپنی انسانی شکلوں میں زندہ و سالم موجود تھے۔ اور مجھ پر ہنس رہے تھے۔ نازنین جیسی گھڑیوں نے سریلی آوازوں میں اور معمر کلاکوں نے کھوکھلے۔ پھٹے ہوئے گلوں سے کھانس کھانس کر قہقہے لگائے ....

میرے شانے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میں نے ڈر کر کہا "اوہ میرے خدا" —— لیکن میرے سامنے دوکاندار کھڑا تھا۔ اس نے کہا، "آپ سو گئے۔ کہئے آپ کو کیسی گھڑی چاہیئے؟"

اس سے غرض نہیں کہ میں نے کیسی گھڑی خریدی، یا خریدی

بھی یا نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنے دوستوں سے کہتا ہوں کہ میں نے اس بھیانک خواب میں جو کچھ دیکھا وہ سچ ہے۔ اور حقیقت پر مبنی ہے۔ اور میرے احباب کہتے ہیں کہ اس کی بنیاد لغویت پر ہے۔ سوال یہ ہے کہ سچا کون ہے؟

ریاکاری

ترے مخلص کدھر جائیں بتا اے ایزدِ باری
کہ بے دینی بھی اک فیشن ہے مذہب بھی ریاکاری

بنے بیٹھے ہیں سب معبود اپنے اپنے حلقوں میں
نمائش کا ہے تقویٰ اور تصنع کی ہے میخواری

ہیں کیفیات بھی مسٹر کی داخل دابِ مجلس میں
مثالِ گریۂ صوفی یہ ہنسنا بھی ہے مکاری

ضروری جان کر روتا ہے بیٹا مرگِ مادر پر
مگر سمجھا ہے اس کو بھی محرم کی عزاداری

ملی جمعیتِ خاطر بھی صوفی کو تو محفل میں
گویّے نے اگر خلوت میں گائی بھی تو "درباری"

مٹے جاتے ہیں باہم عاشق و معشوق الفت میں
مگر اسٹیج پر جس طرح کرتے ہوں اداکاری

لئے پھرتا ہے شوقِ خودنمائی سر پہ شاعر کو
ابھی چلنا نہیں سیکھا ہے یہ فرزندِ بیکاری

بحمد اللہ مسلماں ہو گئے تنظیم کے خوگر
کہ اب بے انجمن کرتا نہیں ہے کوئی غداری

اسی میں عافیت ہے کیجئے تعظیم مُلّا کی
اگرچہ شہر پر روشن ہے مُلّا کی سیہ کاری

اسی میں مصلحت ہے مانئے ہر حکم لیڈر کا
اگرچہ کھل چکی ہے قوم پر لیڈر کی غداری

غلط فہمی ہے دنیا کو مرے طرزِ تکلم سے
بیاں کرتا ہوں ورنہ میں تو میکش کی سیہ کاری

میکش اکبرآبادی

بھوکی آدمیت

التفات احمد خاں بی اے ملیح آباد

زمین، ہماری زمین، ہزاروں انقلابات کے کرشمے دیکھ چکی ہے۔ اور یہ قانون، قانونِ تغیر، آج بھی جاری ہے، جو کل تھا وہ آج نہیں ہے، جو آج ہے وہ کل نہ رہے گا۔

دفترِ امروزمیں، فرداؤ دوش کے نہ جانے کتنے صحیفے، حیاتِ انسانی کے نہ جانے کتنے دیوان، زیرِ ترتیب وتنقید ہیں۔ ہزاروں تغیرات، لاکھوں انقلابات ہو چکے ہیں۔ مگر آدمیت کی اشتہا، آج بھی اتنی ہی شدید ہے جتنی کبھی تھی، بھوکی آدمیت، گزشتہ شخصیت، آج بھی غیر آسودہ ہے، جو سوال کل تھا وہ آج بھی ہے، آدمیت کیا چاہتی ہے؟ آدمیت کا معدہ اتنا قوی ہے کہ علوم در علوم، اُس کی اشتہا کو ناکافی ہیں۔ مگر پھر بھی آدمیت، اپنی غذا کی نوعیت سے ناواقف نہیں، اپنی اشتہا کی اہمیت سے آگاہ ہے مسلسل جدوجہد جاری ہے۔ اور ہر قدم پر حرکت محسوس ہو رہی ہے۔

آدمیت کا عہدِ طفلی، طفلانہ حیرت واستعجاب میں صرف ہوا۔ یہ عظیم الشان کارخانۂ عالم، روحوں میں تھرتھری پیدا کر دینے والا کارخانۂ عالم، جاذبِ نظر بنا رہا۔ قوتِ متخیلہ کی بہترین پیداوار "نظریۂ تخلیق" اسی عہدِ حیرت واستعجاب کا مرہونِ منت ہے۔

زمین کو نظامِ شمسی کا مرکز قرار دیا گیا اور "آدمی" خالقِ کونین" کی محبوب مخلوق"۔ خود نظامِ شمسی کا وجود "آدم" کے وجود کا مرہونِ منت ہے

آدمی اشرف المخلوقات ہے۔ رُوحِ آدم کل اسرارِ کائنات کا گنجینہ ہے جس نے رُوح کو پہچان لیا، خدا کو پہچان لیا۔ اِس وقت آدمی کو اپنی زندگی کی ضروریات کے سلسلے میں جس عقیدے کی ضرورت تھی وہ نظریۂ تخلیق نے نہایت خوبصورت انداز میں بہم پہونچایا۔ اس عقیدے کی یوں اور ضرورت پیش آئی، کہ اس اشرف المخلوقات کو اپنے روحانی سفر میں کچھ ایسے بھدے پہلو نظر آئے، جو روحانی تکملہ کے خلاف ہیں۔ لہٰذا ایک مکمل آئین کے تحت —— مذہب نے —— اپنی رہنمائی شروع کی۔

ایک عظیم الشان ہمہ گیر "قوت" کا اقرار کیا گیا، جو رب العلمین ہے، خالق کونین ہے، پروردگار عالم ہے، ہر چیز پر قادر ہے، اُس کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ اُس کی قدرت وعظمت کا مقابلہ، دنیا بھر کی قوتیں مل کر بھی نہیں کر سکتیں۔ وہ سورج سے زیادہ جلیل القدر، شہنشاہوں سے زیادہ واجب التعظیم ہے۔

مذہب نے جہاں چشمِ انسانی پر مظاہرِ عالم کا عقدہ وا کیا وہیں چند نفسیاتی ضروریات کی ترجمانی بھی کی۔ یتیم آدمیت کو ایک سرپرست کی ضرورت تھی، ایک عادل فرمانروا کی ضرورت تھی، وہ مذہب نے پوری کی، قہر کے پہلو بہ پہلو رحم کی ضرورت تھی، لہٰذا خدا رحیم بھی ہے، کریم بھی، وہ رزاق ہے، رزق دیتا ہے، یتیموں کی فریاد سنتا ہے، شہ رگ سے زیادہ قریب ہے،

دعائیں سنتاہے۔ ظالموں سے خفا ہوتا ہے، اور جن نقصانات کی تلافی جمعیتِ انسانی نہ کرسکے اُن کا اجر عقبیٰ میں دیتاہے، خدا صابروں کے ساتھ ہے، جو لوگ نیک ہیں اُن پر رحمتیں نازل کرتا ہے وغیرہ۔

اس تصور سے تنظیم جمعیت میں بے حد و حساب مدد ملی، جس کے ہلکے اثرات بیسویں صدی میں بھی محسوس کئے جاتے ہیں۔ مگر ان تصورات سے اُن لوگوں کو بہت فائدہ ہوا، جو اپنی صدی کے فارغ البال گوشوں میں پیدا ہوئے۔ کیونکہ جمعیتِ انسانی فرمانِ الٰہی کے مطابق ہے، جو جہاں ہے وہی اُس کا مقام ہے، اور وہی تقدیر ہے۔ اس جمعیت سے انحراف، خدا سے انحراف ہے۔ لہٰذا منحرف ہر جبر و تشدد کا مستحق۔ ہندوؤں میں ذات پات کا طوق اسی لوہے سے بنایا گیا ہے۔ پیغمبروں نے اکثر جمعیتِ وقت سے انحراف کیا، مگر صرف اس عذر پر کہ وہ فرمانِ الٰہی کے مطابق نہیں ہے، اس روحانی تحریک کو "حیوانیت" سے اس قدر سوئے ظن تھا کہ مادیات اور روحانیات میں ایک وسیع خلیج پیدا کردی۔ عیسائیت نے اس میں سب سے زیادہ غلو سے کام لیا۔ مگر مثل مشہور ہے، ساجھے کی ہانڈی چوراہے پر پھوٹتی ہے، چنانچہ پوپ اور قیصر کی روحانی "ہاتھا پائی" زندگی کے دنگل میں ہزاروں شکوک کا سبب بن گئی۔ اس ہاتھا پائی میں قیصر نے پوپ کو چت کیا۔ کیونکہ آدمی نے اپنے کو مادیات سے زیادہ قریب پایا، وقتی طور پر اسلام نے وحدانیت کے بل بوتے پر اس قوت کا مقابلہ کیا مگر رفتہ رفتہ روحانیت اور مادیت کا تضاد روشن ہوتا گیا، اور روحانیت، مادیت کو اپنا سرخود حریف تصور کرنے لگی۔

بلاشبہ اسلام نے آدمیت کو وہ مراعات بخشیں جس میں دوسرے مذاہب نے دماغی بخل سے کام لیا تھا، مگر بہت جلد خود اسلامی اداروں کے سینے میں خلفشار پیدا ہوا اور متعدد فرقوں نے پیغام رسالت کی مختلف تاویلیں کیں، جب اسلامی سلطنتوں پر زوال آیا اور یوپ نے قومیت کی آرزو میں پوپ اور قیصر دونوں سے انحراف کیا، روحانیت بُری طرح زخمی ہوئی۔ قومیت کی تحریک نے آزادانہ تنقید و تحقیق کا سلسلہ شروع کیا۔ انقلابِ فرانس نے ان شغلوں کو اور تیز کیا، سائنس اور فلسفہ نے دینیات کے فرائض ترک کرکے، پوری جدوجہد جاری کی ——

اس کشمکش میں ڈاروِن اور دیگر مفکرین پیدا ہوئے۔ یہ قطعی طور پر غلط ثابت ہوگیا کہ زمین نظام شمسی کا مرکز ہے، بلکہ آفتاب ہے، کونین آدمی کے لئے خلق نہیں کی گئی ہے، بلکہ زندگی کا سلسلہ ارتقائی صورت سے قانونِ فطرت کی ضرورت کے مطابق آدمی کی شکل میں اختتام پر پہونچا ہے۔

آدمی حیوان ہے، حیوان کی آخری صورت ہے، حیوانی دنیا سے الگ، کوئی مخصوص مخلوق نہیں، وہی سلسلہ ہے، آدمی بطنِ ارتقا کی آخری اولاد ہے۔

زندگی کے اس تصور نے کایا پلٹ کردی۔ آدمی کی خودساختہ عظمت "خداداد" وقار، گھبرا اُٹھا، مذہبی روایات کو شدید دھکا پہنچا، اور آدمی کی برہنگی، آسمان سے زمین کی طرف رجوع ہونے لگی۔ جمعیت کے ہر طبقہ پر اس کا اثر پڑا، انقلاب و بغاوت کی چنگاریاں، تصورات سے اُڑنے لگیں اور بعض آدمیت نے مذہبوں کی طرح زندگی کے اس پہلو پر منہ ڈالا۔ مگر ہم کو بے لوثی سے ہر حقیقت کا اعتراف کرنا چاہئے، خواہ کسی سمت سے کیوں نہ آئے۔ یہ انتہائی طفلانہ خیال ہے کہ حقیقت صرف اُس ماضی کا حق ہے جو مذہب کے دَور کامرانی میں منکشف ہوئی، حقیقت کسی لباس، کسی بھیس میں آئے۔ اُس سے ہمکنار ہونا حق پرستی کی شان ہے، میں سمجھتا ہوں کہ صحیفۂ حقیقت کا تکملہ ابھی نہیں ہوا، ہزاروں اسرار ابھی اوجھل ہیں۔

"نظریۂ ارتقا" نے دفترِ حقیقت میں بیش بہا اوراق کا اضافہ کیا ہے جس سے مستقبل و حال کو ضرور فائدہ اُٹھانا چاہئے، مذہبی لوگ ہر وہ نیا تصور جو اُنھیں حال میں شکلِ ماضی نظر نہیں آتا، الحاد قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ کونسی دیانت داری ہے کہ ہم ایک حقیقت کا محض اس عذر پر انکار کردیں کہ وہ ہمارے بزرگوں کی نظر سے اوجھل تھی، میں نہیں کہتا کہ نظریۂ ارتقا، سلسلۂ حقیقت کی آخری کڑی ہے، ہاں یہ کہوں گا کہ حقیقت کی ایک اہم کڑی ضرور ہے۔

نظریۂ ارتقا نے آدمی کی "بنیادی حیوانیت" کا صحیح اندازہ کیا، اور اُس کے دماغ کو رسوم سے بڑی حد تک آزاد کردیا، جنھوں نے ابتک نہ جانے کتنے دماغوں کو تاریکی کے غار میں جھونک دیا ہے، اور مذہب کے پردے میں نہ جانے کتنے شخصی و قومی جوہر جوس لئے۔ کیا حیوانیت سے صرف اس وجہ سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ وہ خوشنما ارادوں کے سلسلے میں

ظاہر ہوئی۔

نظریۂ ارتقانے زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جس کی بدولت بیسویں صدی اک جگمگاتی ہوئی صدی ہے۔ اکثر لوگ جیں بر جبیں ہیں کہ ان تجربوں سے آدمی مادیات سے قریب تر ہو گیا۔ مگر میرا ذاتی خیال ہے کہ مادیت سے اتنا حسنِ ظن بطور ردِ عمل خود مذہب کی شدت سے پیدا ہوا، اور یہ مادہ پرستی، روحانیت کی پیداوار ہے، لوگ اسے قبول نہ کریں گے، مگر مجھے ایسا ہی خطرہ آتا ہے۔ آج مادی کشمکش کی مایوسیاں روحانیت کے حق میں مفید ثابت ہو جائیں تو عجب نہیں۔ مگر درحقیقت یہ بین الاقوامی تنظیم کی بے ضابطگی کی شہادت ہے، قومیں بے نظام ہو رہی ہیں بے احساس نہیں، مذہبی جماعت منظم ضرور تھی مگر بے اساس تھی، اور صرف ایک نفسیاتی کمزوری پر قائم تھی، یعنی خوف، لہٰذا بے اساس بھی تھی، غیر مستقل بھی، آج اگر کوئی جماعت مذہبی روایات پر منظم ہونا چاہتی ہے تو سائنس کے اثاثے کے بغیر ایک منٹ بھی سانس نہیں لے سکتی۔

نظریۂ ارتقانے بہت بڑا فائدہ تاریخی قدر و قیمت کو پہونچایا ہے، جن سے عہدِ ماضی کی اکثر تنظیمیں پوری توضیح سے اپنے سینے کے راز کھول دیتی ہیں، جو اصول عالمِ حیوانی میں کارفرما محسوس کیا گیا وہی جمعیتِ انسانی کا بھی راز ہے، یعنی فرد کی طرح اُس کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ بچپن، شباب اور پیری کے دور اُس پر بھی آتے ہیں، اگرچہ فرد و جماعت کی مدت میں ضرور فرق ہے، نظریۂ ارتقا کو الحاد سے کوئی تعلق نہیں، ہاں تجزیئے نے یہ ضرور بتایا کہ مذہب آدمیت کے ارتقائی سفر میں ایک خاص منزل پر ظاہر ہوا، جس نے اُس وقت آدمیت کی اشتہا کو آسودہ کیا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہر منزل کو یا دہ پا رہرو کی پوری پوری تھکن اور سفر کا پابند ہونا پڑے گا۔ ہر منزل کا ایک مقام ہے جہاں پہونچکر مسافر وہ نہیں رہتا جو ایک منزل قبل تھا، مذہب بھی جمعیتِ انسانی کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

مذہب کے اُس حصّے کا فیصلہ جو خدا کے وجود سے متعلق ہے ہنوز ناتمام ہے۔ ممکن ہے اس نظامِ عالم کی پشت پر ویسی ہی ہمہ گیر و ہمہ ساعت بیدار قوت ہو جیسی مذاہب نے تصور کی ہے۔ مگر پھر بھی حکیمانہ اقرار اور اقرار پر اُس کی تبلیغ محض "روحانی" معصومیت ہے، خدا کا اقرار بھی سفرِ ارتقا کی ایک منزل ہے، جسے بیسویں صدی میں یوں کہتے ہیں کہ خدا خالق نہیں آدمی کے ذہن کی مخلوق ہے۔ مگر میں اس خیال سے متفق ہونے کی کوئی دلیل نہیں رکھتا، میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ نہ اقرار ممکن ہے نہ انکار۔

جہاں تک معاشی و معاشرتی پہلو حیات کا ہے مذہب بُری طرح سے ذہنی افلاس میں مبتلا ہے۔ اس افلاس کے اسباب سے آگہی کے قبل پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ اس وقت آدمیت کے کیا مطالبات ہیں؟ وہ کس قسم کی غذا چاہتی ہے؟

اس وقت زندگی کے ہر گوشے پر آفتابِ تحقیق کی شعاعیں پڑ رہی ہیں، جو چہرہ توہمات کا کھچاؤ لیکر سامنے آئے گا وہ جھلس جائے گا۔ ضروری ہے کہ ہر پہلو کو بخوبی ٹٹولا جائے۔

فرد اور فرد کے ساتھ جماعت دونوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اور ہر تصور آج نیا سا محسوس ہو رہا ہے، اُنیسویں صدی نے دو زبردست شخصیتیں پیدا کیں، جنھوں نے فرد کی نفسیات اور جماعت کے تجزیئے میں بہت بیباکانہ اقدام سے کام لیا۔ اور ایک حد تک مسائلِ حیات کی نوعیت بدل دی۔

میرا اشارہ ڈاکٹر فرائڈ اور کارل مارکس کی طرف ہے۔ میں اُن کے دلائل کی صداقت کُلّی کا نہیں، اہمیت کا ضرور قائل ہوں۔ طوالت کے خوف سے مختصر تذکرہ دونوں کا ضروری ہے۔

ڈاکٹر فرائڈ نے اپنی تحقیق کا مرکز "فرد" کی نفسیاتی زندگی قرار دیا۔ فرائڈ نے اعلان کیا کہ محض "شعور" سے نفسِ انسانی کی توضیح نہیں ہوتی، شعور کی پشت پر ایک نیم شعوری دماغ ہے، جہاں ہزاروں غلبوں اور خواہشوں کا تلاطم ہوتا رہتا ہے، سیکڑوں تمنائیں، ہزاروں آرزوئیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ جو بہت کم اپنے اصلی رنگ میں "شعور" کی آنکھوں کے سامنے آتی ہیں، تہذیب و تمدن کی پابندیاں اُن فطری خواہشوں پر "بربریت" کا لیبل لگا کر روکتی ہیں۔ ضمیر کی بیداری، تہذیب و تمدن کی دخترِ حقیقی اُن پر نقاب ڈالتی ہے، اور ان کو مہلک سمجھکر تحت الشعور کے حجرے میں مقفل کر دیتی ہے جہاں ایک دوسرے سے جوتی بیزار ہوتی ہے، اور شعور کی بزم میں وہی خواہش بار پا سکتی ہے جو ضمیر کی بیداری اور اُس کے پاسبان بزرگوار، تمدن، کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جائے۔

ڈاکٹر فرائڈ کے نزدیک فرد فطرتاً باغی ہے۔ تہذیب و تمدن سے باغی، تمدن اُس کی فطری خواہشوں کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے، یہ خواہشیں

بہ زورِ شعور روب تو جاتی ہیں مگر فنا نہیں ہوتیں۔ تحت الشعور میں اُتر کر غدر کی ایسی کھلبلی ڈالتی ہیں جو اکثر صحیح ہدایت کی محرومی کے باعث فرد کی شخصیت کو علیل کر دیتی ہیں، نفس کی بنیاد دہل کر رہ جاتی ہے اور فرد اگر کافی بیدار نہیں تو غیر فطری رجحانات کے گرداب میں پھنس جاتا ہے۔

ممکن ہے ڈاکٹر فرائڈ کا نظریہ غلط ثابت ہو، اور جہاں تک ان خواہشوں میں مرکزی خواہش کا تعلق ہے اُس نے ضرور غلو سے کام لیا ہے تاہم ان خیالات کے بادلوں میں ایک خاص قسم کی چمک ہے۔ جن غلبوں کو ہم "شیطانی" غلبے کہتے ہیں ان کی اہمیت اور ہلاکت خیز نتائج کی نزاکت دوچند ہو جاتی ہے۔ جس سے والدین اور استاد کی سرپرستی اور زیادہ توجیہہ کی محتاج ہے۔ یہ شیطانی غلبے بھی ویسے ہی فطری ہیں جیسے "روحانی جذبے" اور یہ کہ فرد کی نفسیاتی زندگی نہایت نازک ہے۔ جن پر ہر دم گہری توجہ کی ضرورت ہے، فرد کی اصلاح روایات کی کورانہ عقیدت میں ان غلبوں کو قوت سے دبانے پر ممکن نہیں، بلکہ پورے پورے اظہار کا موقعہ دینا چاہیئے، اس سے یہ مطلب نہیں کہ انسان اخلاق کی ہر قید سے آزاد ہو جائے۔ بلکہ ان غلبوں کو صحیح راہ دکھا کر خواہشوں کو شخصیت کے لئے مفید بنانا چاہیئے۔

مجھے اپنے ایک نہایت گہرے دوست کا تجربہ ہے۔ جس کا ہر دورِ زندگی میری آنکھوں نے دیکھا تھا جس کی بیمار شخصیت نے عین عنفوانِ شباب میں، روایات کے منبر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دی۔ تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا، اور آج ملیح آباد کا ہر فرد اُس جوان کی موت پر کڑہتا ہے۔ مگر خود اُس کے والد کے "عقائد" میں تزلزل نہیں آیا، اُف عقیدہ بھی کس قدر سفاک ہوتا ہے۔

کارل مارکس نے اپنی تحقیقات کا مرکز جماعت کو قرار دیا، اور معاشی و معاشری زاویۂ نگاہ سے تجزیہ کیا۔ سماج کی دکھتی رگ پکڑی۔ آج سرمایہ و محنت کی معرکہ آرائیاں اُس کی نگاہ نے دیکھی تھیں۔ جب مارکس دورِ طالب علمی سے گزر رہا تھا۔ جرمنی میں ہیگل کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہیگل کا فلسفہ جرمنی کے جزو کل پر چھایا ہوا تھا، فلسفہ روحانی فلسفہ۔

ہیگل اپنے عہد کے مفکرین سے اِس خصوصیت کی وجہ سے ممتاز ہے کہ اُس نے مادی کشمکش کی اہمیت کو برقرار رکھا، مگر بہ حیثیت ایک فرض ثانوی کے، ہیگل کے نزدیک عالم آدمیت ایک ذاتِ مطلق کی تلاش میں ہنگامہ آرا ہے اور سلسلۂ اضداد سے رفتہ رفتہ وہ ذاتِ مطلق اپنے کو تدریجی ارتقا میں ظاہر کرتی جا رہی ہے۔ ہر عہد کی ایک اسپرٹ ہے، اور یہی مخصوص اسپرٹ ذاتِ مطلق کا عکس ہے، اس فلسفے سے حکومتِ وقت کی حقانیت تسلیم کر لی گئی، کارل مارکس نے اس "متحرک خیال" پر نظر دوڑائی، اداروں کے "روحانی" فریضوں کا اثر قبول کیا، مسحور ہو کر رہ گیا، وہ خود ہیگل کا شاگرد تھا مگر اُس کی ذہنیت ہندوستان کے "مذہبی عالم" کی نہ تھی جو صرف اُس صداقت کا قائل ہو جائے، جو کاغذ کے پُرزے پر بخطِ عربی ثبت ہو، قدرت نے اُسے دل بھی دیا تھا، دماغ بھی، اُس نے بہت جلد اس "بیرونی فلسفے" کو تاڑ لیا کہ مادی کشمکش کے کھدرے جسم پر یہ محض خوبصورت نرم و نازک لباس ہے اور کچھ نہیں۔

اگر وہ مخصوص اسپرٹ ہر ادارۂ قومی کو حرکت میں لاتی ہے تو خود اُس اسپرٹ کو متحرک کرنے والا کونسا عقدہ ہے؟ اس سوال نے ہیگل کی صوفیت کو ایک پھونک میں اُڑا دیا۔ مارکس نے ہیگل کا اصول "اضداد" (Dialectics) ترک نہیں کیا۔ مگر اُس نے اُس کا عکس نہیں اصلی رُخ دیکھا، "خیال" کے باہر مادی کشمکش کو دیکھا اور "خیال" کو اُس کا عکس قرار دیا۔ ہیگل کی کشمکش اضداد، سماج میں طبقاتی جنگ و فساد کی پیداوار ہے جو اپنی حفاظت کے لئے "خیال" کی نقاب ڈال لیتی ہے۔ سماج کو اُس نے دو بڑے اقتصادی طبقوں میں منقسم کیا اول وہ کہ جن کے ہاتھ میں قوم کی پیداوار و ذرائع پیداوار ہیں جو اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے ذہنی استحکام بھی کرتے ہیں، مذہب، فلسفہ، اخلاقیات اور قانون سے حسبِ مدعا مدد لیتے ہیں۔ دوم وہ گروہ ہے جس کی روزی صرف اُس کی محنت ہے، قوت و اقتدار سے محروم ہے۔ جب پیداوار، ذرائع پیداوار اور تقسیم پیداوار کے بدلنے پر سماج و حکومت کا جامہ تنگ ہو جاتا ہے، بےچینی پیدا ہوتی ہے۔ تغیرات و انقلابات رونما ہوتے ہیں۔ محروم طبقہ اپنے حقوق کے لئے جنگ کرتا ہے۔

ان طبقوں میں اُس وقت تک کشمکش رہے گی، جب تک جمعیت کی تنظیم طبقوں کے فرق و مراتب پر قائم رہے گی۔ آدمیت اُس دن سکون پائے گی، جب سماج میں صرف ایک طبقہ رہ جائے گا وہ طبقہ آدمیت کا طبقہ ہوگا جمعیت کی تنظیم طبقوں کے مفاد پر نہیں آدمیت کی فلاح پر ہوگی۔

کارل مارکس نے خصوصیت کے ساتھ نظام سرمایہ داری کا تجزیہ کیا، اور دکھایا کہ کس طرح یہ پیرزن فرہاد سے ہمدردی دکھا کر چالیں چل رہی ہے، نظامِ سرمایہ داری جمعیت میں صرف سرمایہ دار طبقے کے لئے ہے یا ان انجمنوں

کے لئے جو سرمایہ داری کی ہم آہنگی میں سازشیں کر رہی ہیں، محروم طبقہ، عوام کا طبقہ، اُس سے قوت چھین لینے کا حق رکھتا ہے کیونکہ کل دولت، کل پیداوار اُسی کی محنت کا ثمرہ ہے۔ سرمایہ داری کو اُس سے مستفید ہونے کا حق نہیں۔

کارل مارکس کے اس مطالبے نے روحانی اور مادی دنیا میں کھلبلی ڈال دی۔ انجمن روحانیان، اور محفل سرمایہ داران دونوں سر د پڑ گئیں۔ فرائڈ نے فرد کو ان تند و تیز غلبوں سے آگاہ کیا جو سیکڑوں معصوم افراد کو کچل چکے ہیں، مارکس نے "محروم طبقے" کو سیاسی قزاقوں سے متنبہ کیا جو آدمیت و تہذیب و تمدن کے نام پر اُس کا خُون چوس رہے ہیں۔ چنانچہ آج سرمایہ و محنت برسرپیکار ہیں، زمینِ سرمایہ پر مسلسل زلزلوں کے جھٹکے آ رہے ہیں، عنقریب بنیاد منہدم ہو جانے کو ہے۔ مارکس کا اثر سیاستِ حاضرہ پر بے حد و حساب پڑا ہے، رفتارِ وقت بدل گئی، محاذ بدل گئے۔

بالخصوص روس نے اُس کی عملی ترجمانی کر کے سرمایہ دار قوتوں کو چونکا دیا ہے۔ قزاقوں کو خبر ہو گئی ہے، کہ آدمیت کا گھر آسانی سے نہیں لوٹا جا سکتا، گھر والے جاگ پڑے ہیں، بالشویزم، جو مارکس کی محنتوں کا پہلا ثمرہ ہے، اُسے آسانی سے گھر لوٹنے نہ دے گا۔

اب سرمایہ داری کے پاس صرف دو ذرائع ہیں (۱) شہید ہو جائے یا (۲) شہید کر دے۔

اول تو ممکن نہیں، دوم ہی ممکن ہے، لہٰذا سرمایہ دار قوتیں قومیت و "نیشنلزم" کے پردے میں (بے پردہ یہ کبھی نہیں آتیں) "فاشیزم" کا عَلَم بلند کر رہی ہیں، جھنجھلا جھنجھلا کر علم بلند کر رہی ہیں، سرمایہ داری آج زندگی کے رن میں ہانپ رہی ہے، حکومتیں، سرمایہ دار حکومتیں آخری سانسیں لے رہی ہیں، اُکھڑی اُکھڑی سانسیں لے رہی ہیں۔ آخری زور آزمائی کے لئے فاشیزم کا دودھ پی پی کر سرمایہ داری خم ٹھونک رہی ہے، اُس کے سعادتمند فرزند مسولینی اور ہٹلر، دودھ کا حق ادا کر رہے ہیں، یہ جھنجھلائی ہوئی فاشیزم گیس اور بم میں پھولی ہوئی فاشیزم، یورپ کے دنگل میں کود رہی ہے، اور ایک عالمگیر جنگ کا خواب دیکھ رہی ہے، مگر شاید لسبارک حافظے سے اُتر گیا ہے۔

محکوم و غلام ممالک، اٹلی، جرمنی اور جاپان (اور برطانیہ؟) پر سفاکی و درندگی کے الزام رکھ رہے ہیں، کیونکہ اُن کے سامنے اٹلی نے حبش کو نگل لیا، اسپین کی وہ بغاوت جو اٹلی و جرمنی کے ایما سے ہزاروں معصوموں کا لہو پی چکی ہے، اُن کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ چین کے کراہنے کی صدا، جاپان کی ڈکار کی آواز اُن کے کانوں میں آ رہی ہے۔ مگر ان سفاکیوں پر اتنا استعجاب کیوں ہے؟ کیا اُنھیں خبر نہیں کہ "حفظِ خودی" کے غلبے وہ شدید غلبے ہیں، کہ جب زخمی ہو جاتے ہیں، آدمی پوری درندگی سے مقابل ہو جاتا ہے، درندگی کے علاوہ اور توقع ہی کیا ہے؟ کیا سرمایہ داری خوشی سے اپنا گلا آپ گھونٹ لے؟ خودکشی وہ حماقت (بانکپن؟) ہے جو صرف فرد سے سرزد ہو سکتی ہے، لیکن جماعت اُمید کے آخری لمحے تک ہنگامہ آرا رہیگی۔ یہ درندگی بالکل فطری ہے۔

یہ ہیں اس وقت کی آدمیت کے مطالبات۔ مذہب کا افلاس یہیں سے ظاہر ہو جاتا ہے، دو ہی طریق کار ممکن ہیں، مذہب یا تو غیر جانبدار رہے یا ان متضاد ارادوں میں سے ایک کا معاون بنے۔ حالاتِ موجودہ میں اول طریق کار محض دھوکا ہے، غیر جانبداری ناممکن ہے، اور جہاں تک حالات کی روشنی کام دیتی ہے، اغلب ہے کہ مذہب، استعماریت کا جوکھا مذہب، سرمایہ دار قوتوں کا ساتھ دے گا۔ اگرچہ اُس کا افلاس خود بہت ہی پُر ہول ہے۔

اس افلاس کے کیا اسباب ہیں؟ مذہب بیسویں صدی میں ایک رجعت پسند ذہنی رجحان ہے، جو معاشی دقتوں سے گھبرایا ہوا ہے، مذہب نے اپنے اوائلِ عمر میں آدمی کی صرف "روحانی" اصلاح کرنا چاہی، اور افراد کو بہ حیثیت افراد کے دیکھا، جمعیتِ انسانی سے قدرے بے نیازی دکھاتے ہوئے معاشی و معاشرتی مشکلات کو حل کرنے کے عوض اُن سے گریز کیا۔ مثلاً میرے دو چھوٹے بھائیوں میں آم کے پیڑ دل پر جھگڑا ہو گیا ہو، اب اگر میں یوں اِسے حل کروں کہ یہ باتیں دونوں مانیں، ورنہ جب گھر پلٹ کر آئیں گے تو ایک کو رسّی پر لٹکا دوں گا اور ایک کو آگ میں جلا دوں گا تو میں نے اس مسئلے کو حل کیا یا اُس سے گریز کیا؟ اگر میں اپنی ہٹ دھرمی سے اِسی کو "حل" کہوں، "بہترین حل" تو مجھے یہ بھی یقین کر لینا چاہیئے کہ جب میرے دونوں بھائیوں کو اس "بہترین" سے بہتر کوئی حل مل جائے گا تو دونوں نہایت حقارت و تنفر سے میرے "الہامی" حل کو جو بزعم بزرگی میں نے صادر کیا تھا ٹھکرا دیں گے۔ کیا

کہتے ہیں اس مسئلہ کے بیچ میں خواجہ حسن نظامی یا مولانا عبدالماجد دریا بادی صاحبان۔

مذہب نے معاشی مشکلات کا کیا حل پیش کیا ہے؟ میرے دماغ ناقص میں کچھ نہیں آتا۔ اخلاقیات کے کچھ اصول ضرور وضع کئے مگر وہ بھی اتنے مبہم (غالباً متضاد) جو بیک وقت "قاضی" اور "چور" دونوں کے ہم آہنگ ہوں یا جس کو جیسی قوت ہو، مذہب نے اس حیوان کو جسے اشرف المخلوقات کہتے ہیں، ایسے مشتبہ وعدوں پر فرشتہ بنانا چاہا جو مایوسی کے لمحوں میں اکثر و بیشتر شیطان پر زیادہ اعتبار رکھتا ہے، پولیس کی لاٹھی اور دوزخ کی آگ سے "نیکی" پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، اور نیکی بھی کیا، جمعیتِ وقت کی حمایت۔ ظاہر ہے غنیم دو ہی طرح پر فتح کیا جا سکتا ہے یا اپنی قوت سے یا خود اُس کی کمزوری سے، اس غنیم، تمدن کے پیدائشی باغی کو بھی انھیں حربوں سے فتح کرنے کی کوشش کی گئی، پولیس کی لاٹھی نے فاتح کی قوت کا مظاہرہ کیا، دوزخ کی آگ نے غنیم کو اُس کی کمزوری کا احساس دلایا۔

آج بیسویں صدی میں فرد اور سماج اپنے حقوق اور اپنے مقاصد سے بہت کچھ واقف ہیں لہٰذا اس دور میں دوزخ کی آگ کا حربہ زنگ آلود ہو گیا ہے، اب صرف پولیس کی لاٹھی سے کام لیا جا سکتا ہے لیکن اگر ایک طرف پولیس کی لاٹھی ہے تو دوسری طرف دہقان کا ڈنڈا، اب مذہب لاٹھی کا ساتھ دے گا یا ڈنڈے کا؟ دوسرے الفاظ میں یہ کہئے کہ مذہب اب سرمایہ دار استبداد کی حمایت کرے گا یا بھوکی آدمیت کا مونس و غمخوار ہوگا۔ مذہبی ادارے نے اب تک اس دنیا سے بہت کم دلچسپی کا اظہار کیا ہے (عملی نہیں) "خدا" سے اتنا شغف بڑھا رہا کہ "بندے" کے اُداس چہرے پر نظر ہی نہ گئی، اور اگر کبھی مادی ضروریات نے مجبور کیا تو ماضی کے منبر پر شعلہ افشانی کر کے افراد سے مطلب برآری کر لی۔ مذہب نے معاشیات و مادیات میں کبھی انقلاب پیدا کرنے کی تمنا ہی نہیں کی، کبھی بنیاد کو چھوا ہی نہیں۔ تقدیر سے رشوت لے کر ہر عہد کے فرمانروا کی تائید کی۔

چند افراد ضرور حیات کے اہم فریضوں کی طرف رجوع کرتے رہے۔ مگر مذہب نے بحیثیت ادارے کے بعد ختم نبوت کبھی انقلابی جد و جہد کی حمایت نہیں کی۔ بہت کچھ اس وجہ سے کہ مادیات کو حیوانیت کی بنیاد فرض کرتے ہوئے اُسے ہمیشہ روحانیت کے منافی سمجھا۔

مگر کیا کسی میں اتنی ہمت ہے کہ مادیات سے بے نیاز ہو جائے؟ کیا آدمی محض روحانیت سے آدمیت کو آسودہ کر سکتا ہے؟ کیا یہ "حیوانِ مہذب" یعنی —— آدمی —— صرف اخلاقی فتوؤں سے صلح کار بن سکتا ہے؟ اور کیا انفرادی تکمیل روحانی کی کج شعاری، جماعت سے بے نیازی کو اخلاقاً مستحسن قرار دے سکتی ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں، لاکھ بار نہیں اور اگر اس پر بھی کوئی سرپھرا کہے "ہاں" تو میں اتنا کہوں گا (بقول جوش صاحب) "اخاہ رے مادّے"!

مذہب نے اس خوف سے کہ آدمی مادیات میں پھنس نہ جائے جس کی لازمی شکل روحانیت سے انحراف ہوگی، اُسے اور مادیت سے قریب تر کر دیا، آدمی جس پر کبھی عقلی شباب نہیں آتا، جو ہمیشہ بچہ ہی بنا ہے۔ اوامر و نواہی کا اُلٹا ہی اثر قبول کرتا ہے۔ نتیجہ کیا ہوا، وہ مادیات پر اور زیادہ فریفتہ ہو گیا، اور اپنی عقیدت کا اظہار عالمگیر جنگوں میں کر رہا ہے، کیا یہ کہنا غلط ہے کہ جو دن حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا تھا، وہی سال سنہ ۱۹۱۴ء تھا؟

ماہرینِ نفسیات نے اس طریق کار کا ذہنی افلاس پوری طرح سے روشن کر دیا، بیسویں صدی کا پیغمبر روحانی پیغمبر نہ ہوگا، اُس کا صحیفہ بھوکی آدمیت کے لئے ہوگا، معاشی حل کا صحیفہ ہوگا، معاشری استحکام کا صحیفہ ہوگا، آسمان نہیں زمین کا صحیفہ ہوگا، نفسیاتی کمزوریوں کا نہیں قوتوں کا صحیفہ ہوگا، وہ پیغمبر حال و مستقبل کا پیغمبر ہوگا، آدمیت کا پیغمبر ہوگا، اُس کی اُمت میں نہ تاجدار ہوں گے نہ گدا، نہ امیر ہوں گے نہ غریب، اُس کے سایۂ عاطفت میں آدمیت کو فروغ ہوگا، آدمیت پہلی بار کھلی ہوا میں سانس لے گی۔ آسمان بڈھا ہو چکا، اب زمین جوان ہوگی۔ زمین پر شباب آئے گا، اور آدمی آزاد ہوگا آزاد۔

قلم اور قدم

مترجمہ اسرائیل احمد خاں

"قلم اور قدم" ــــــ یا اقوال و افعال ــــــ عظیم فرانسیسی رومان نویس اور انقلاب نگار وکٹر ہیوگو کی پبلک زندگی، خطبات اور مکتوبات کا جریدہ ہے، جو ۱۸۲۵ء اور ۱۸۸۵ء کے دوران میں شائع ہوا۔ اس تصنیف میں وکٹر ہیوگو نے فلسفۂ سیاسی و معاشی کے متعلق اپنے مسلک و مشرب کو بے نقاب کیا ہے۔ یہ کتاب متعدد جلدوں پر مشتمل ہے؛ پہلی جلد ۱۸۴۱-۱۸۵۱ء کے وقائع کو بیان کرتی ہے۔ دوسری، اُس کے سنینِ جلا وطنی کے واقعات و واردات کی ترجمان ہے، اور تیسری اور چوتھی جلد ۱۸۸۵ء کے حوادث و سوانح پر حاوی ہے! آخر الذکر سال اِس آفتابِ فکر، اور شبابِ مجاہدہ" کا "سنہ غروب" ہے! ڈاکٹر برانڈ کا تاریخی فیصلہ یہ ہے کہ: "وکٹر ہیوگو کی زندگی اُنیسویں صدی کے نیمۂ اول میں سرزمینِ فرانس کی ساری تحریکات کی آئینہ دار واقع ہوئی ہے!" ــــــ "قلم و قدم" میں بہ حیثیتِ مجموعی "انقلابِ فرانس" سے غداری پر اک صدائے احتجاج ثبت جریدہ کی گئی ہے! یہ ہیوگو کا معرکہ آرا کارنامہ ہے! وہ نپولین کو لوئی چہاردہم کا "اوتار" سمجھتا ہے! اُس کے دادا نے نپولین کے خلاف سازش کرنے کی پاداش میں تختۂ دار کا خیر مقدم کیا تھا! اپنے جدِ محترم کی یہ وصیت

ہیوگو کے کانوں میں ہمیشہ گونجتی رہی کہ "جانِ پدر! اعلانِ حق اور قیامِ عدل مقدم ترین وظیفۂ انسانی ہے! تمام اسباقِ تعلیم کا یہی عنوانِ جلی ہے!" ــــــ وکٹر ہیوگو لاریب کہ اک نادرۂ روزگار شخصیت گزرا ہے! وہ بیک وقت حکیم، شاعر، اور مجاہد واقع ہوا تھا! وہ بالفاظِ خویش "عورت کے دل کی نرمی اور غازی کے جگر کی گرمی" سے بنا تھا! ــــــ برگِ گل اور پارۂ خارا کا نادر الوجود امتزاج! قوسِ قزح اور ـ ـ ـ ـ موجِ خون کی اُنہونی ہم آغوشی!! ــــــ ایسے انسان خود اپنے خالق کے لئے موجبِ دلچسپی ہوتے ہیں! ع

خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست!

وکٹر ہیوگو کی سوانح عمری کے اس ملخص میں ایک چیز قابلِ غور ہے! آپ دیکھیں گے کہ ایک جگہ وہ اک "جماعتِ خوف" کا ذکر کرتا ہے! واقعہ یہ ہے کہ جماعتِ خوف، اقوام کی زندگی میں اک مستقل تاریخی مظہر ہے، ہر عہد کے وقتِ نزع اور اک دوسرے دور کے لمحۂ ولادت کے ماحول میں اک ناگزیر دہشت و وحشت، آغاز پذیر بابِ تاریخ کے متعلق محسوس کی جاتی ہے! یہ عموماً تو

صرف ناآشنائی کی خوف زدگی ہوا کرتی ہے، جس میں عوام وخواص سبھی کم وبیش مبتلا ہوتے ہیں، لیکن جو اک خاص جماعت اس واہمے کو اپنا بھوت بنا لیتی ہے، اور اُس کی بنا پر اک سیاسی پارٹی میں ڈھل جاتی ہے، وہ مخلصانہ خوف سے زیادہ اک ارادی خود غرضی کا شکار رہا کرتی ہے! ہم اُسے خوف سے یکسر خالی نہیں سمجھ سکتے —— اور سچ تو یہ ہے کہ ایسا شاذونادر ہی ہوا کرتا ہے کہ دل کی کسی کجی کے ساتھ دماغ کی کوئی تاریکی ہمرشتہ نہو! دل ودماغ اسی طرح یکساں شریکِ فساد ہوا کرتے ہیں، جس طرح کہ معدہ وجگر بیک وقت گرفتارِ سوئے ہضم وسستیٔ حرکت! —— تاہم غالب اور فیصلہ کُن عنصر ان کی نفسیت میں لوث ہوا کرتی ہے، نکہ فکری معذوری! لیکن یہ بات ضرور ہے کہ وہ جہاں کے سامنے خوفناک مستقبل کی اک لرزاں وترساں وعید ہی بن کر آتے ہیں! اس لئے کہ عوام جاہل ہوتے ہیں، اور اُن کے کانوں میں ہم جو چاہیں پھونک سکتے ہیں! اس طرح خوف چونکہ اُنکا سارا "مقدمۃ الجیش" ہوتا ہے، اس لئے "جماعتِ خوف" کا تسمیہ اگر اُن کا طغرائے امتیاز قرار دیا جائے تو بیجا نہیں، تاہم یاد رہے کہ اُن کے خوف کا تعلق اس قدر خود اُن سے نہیں ہوتا جس قدر کہ اُن کے سامعین سے ہوتا ہے! "جماعتِ خوف" دراصل دوسروں کے خوف کی حامل یا محرک ہوا کرتی ہے! وہ اتنی ڈرتی نہیں جتنی کہ ڈراتی ہے! بہرحال، خوف واندیشہ چونکہ اُس کا تکیہ کلام ہوتا ہے اس لئے اُسے اسی وصف سے متصف اور معروف ہونا چاہیئے۔

جدید العہد ہندوستان میں اس قسم کی دُہائیاں کہ "اسلام خطرے میں"! "تہذیبِ اسلامی خطرے میں"! "نظامِ مجلسی خطرے میں"! اسی ذہنیت کی نوائیں ہیں! حقیقتہً ان میں سے کوئی چیز بھی خطرے میں نہیں ہے —— اور اگر ہے تو "محرم کے ان کرائے کے پیٹنے والوں" کو مطلقاً اُس کا غم نہیں! —— جو چیز خطرے میں ہے وہ مروجہ مجلسی ومعاشی نظام میں اُن کی مفت خوریوں اور کامجوئیوں کا منصب ہے! (ہاں اس تقریب سے ہم براہِ راست بھی اس گروہ کو "جماعتِ خوف" کہہ سکتے ہیں!) تاہم یہ بندگانِ غرض اپنے ہی قلعے کی مدافعت کے لئے اپنی جانیں بلکہ خود اپنی راحتیں بھی، خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتے: اپنے معاملے کو "دوسروں کا مقدمہ" بنا دینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہوتا ہے! اس کے لئے اپنے مخاطبین کی زیادہ سے زیادہ تخویف وترہیب اُن کا مسلسل ومستقل شغل ہوا کرتا ہے۔ خوف وتخویف کی یہ مخصوص دعوت اُن کی پیشانیوں پر "جماعتِ خوف" کا سیاہ کتبہ کندہ کر دیتی ہے!

ہم ہندوستانی انقلابِ منتظرہ کے اس ماقبل مرحلے پر یہ مقالہ اس لئے بھی شائع کر رہے ہیں کہ وطن کا نوجوان طبقہ عہدِ حاضر کی "جماعتِ خوف" کو پہچانے! اور اُن کی مرگ نوائیوں کو "انقلاب زندہ باد" کے نعروں میں دفن کردے! ع

مردانہ قمارے کن، دستے بدو عالم زن!

(ا)

حق وباطل!

نسلِ آدم کا سارا دفترِ فصاحت وبلاغت —— تمامی اقوامِ عالم کا، اور جمیع قرونِ تاریخ میں فراہم ہونے والا! —— سب کا لُبِّ لُباب یہ ہے کہ وہ اک ضخیم مسلسل مقدمہ ہے "نزاعِ حق وباطل" کی! —— لیکن حق وباطل کی اس آویزش کی تاریخی رفتار یہ رہی ہے کہ اُس کی حرارت وحِدت مسلسل کم ہوتی رہی ہے! —— یہی کمی، مقیاس رہی ہے انسانی ترقی کی! جس شامِ غم میں یہ معرکہ ختم ہو جائے گا، اُسی کے ابد کی صُبحِ سعادت کو بشری تہذیب کا آفتابِ عالمتاب طلوع ہوگا! (جاء الحق وزھق الباطل! اِن الباطل کان زھوقا! —— قرآنِ حکیم) وہ چیز "جو ہونی چاہیئے" تھی، ہم آہنگ ہو جائے گی اُس شے سے "جو ہے"! (ع

آنچہ بود ست ونباید "زمیاں خواہد رفت

وانچہ بایست ونبودست، ہماں خواہد بود —— اقبال)

حوادث وسوانح کا سلسلہ ختم ہو جائے گا! —— اور گویا "واقعات وانقلابات" ہی کے ظہور کا ایک تعطل عمل میں آئے گا!!

(محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی!)

ہاں زمین پر انسان کی "مصنوعی تاریخ" کا متت بالخیر ہو جائے گا! اور معشرِ بشری

کا مولود، مادرِ فطرت کی آغوش میں پروان چڑھنا شروع ہوگا!

اِس دَورِ نو بنو میں نہ نزاعات ہوں گے نہ خصومات، اور اُن کے فَصل و قضا کے لئے نہ قوانین ہوں گے نہ آئین! ——— صرف ایک ناموسِ فطرت ہوگا، جو قانون کی طرح "وضع" نہ کیا جائے گا، الہامِ رَبانی کی حیثیت سے صرف "منکشف" کیا جائے گا! اک عظیم محکمۂ تعلیم تمام "دفاترِ جنگ" کو منسوخ کر دیے گا! اور اک "ہمہ گیر ووٹ" کے ذریعے قومِ آدم کے لئے اک "پارلیمانِ ذہن" کا انتخاب عمل میں آئے گا!!

(بریں مژدہ گرجاں فشانم رواست!)

اِس شاندار و قدوس عہد میں کوئی سرہنگانِ پیکار نہ ہوں گے ——— صرف "اربابِ کار" ہوں گے! ——— خالقین، کہ مہلکین!! "جنونِ عمل" کا تمدن ختم ہو جائے گا، اور "وجدانِ خیال" کا عمران اُس کا وارث بنے گا! اِس دَور کی دنیا کے "حوادثِ عظیمہ" صرف ادبیات اور فنونِ لطیفہ کے "اختراعاتِ فائقہ" ہوں گے!!

مُلکوں کی "سرحدات" معدوم ہو جائیں گی!" انقلابِ فرانس" کا مخلوق فرانس شہدار کی موت مر سے گا، اور بہر زماں از غیب جانِ دیگر ست" کے اعتبارِ سچائی کے تحت پھر اُٹھیگا، اور اُس کی یہ "نشاۃِ ثانیہ" اک آل یورپ حریت کے پیکرِ عظیم ترمیں نمایاں ہو گی! انقلابِ فرانس "تاریخِ عالم میں "بشریت کی رستا خیز" کا عنوانِ جلی اختیار کرے گا! فرانس نے یہ بے پایاں عرقریزی تنہا اپنے ہی لئے نہیں کی ہے، اُس نے عالمگیر اُمیدوں کو اپنی شورش کے اندر اک "پیامِ قُم" سنایا ہے، اپنے "حریت، مساوات، اخوت، عدالت" والے نعرۂ جلیل میں وہ تمامی بشریت کا ترجمان بنا ہے!!

"حق" اور "قانون" وہ دو قوتیں ہیں، جن کی ہم آہنگی سارے نظم و امن کے مولودِ سعادت کی ولدیت واقع ہوئی ہے، لیکن جن کی اَن بَن جملہ مصائبِ تاریخی کا شجرِ خبیث رہی ہے! حق "ملکوتی صداقت" ہے، اور قانون ارضی حقیقت "نفس الامری"! حق "لبرٹی" ہے، اور قانون "سوسائٹی"! گویا اس جنگاہِ عالم میں دو "ایوانِ عدل" ہیں: ایک "اہلِ واقعات" کا، اور ایک "اربابِ خیالات" کا! ——— اِن دو قطبِ شمالی اور قطبِ جنوبی کے درمیان بیشتر افرادِ بشری کی ضمیر میں کھپتی نہیں ہے! ——— حق اور قانون اک غیر مختتم آویزش کے حریف ہیں!

حق کے پرچم کے سائے میں انسانی جان، امن، اور آزادی کی حرمت ہے، اِنہی کے پہلو بہ پہلو ہر وہ چیز استادہ نظر آتی ہے جو ناقابلِ انفساخ ہے، ناقابلِ رجوع ہے، اور ناقابلِ تلافی! ——— قانون کے جھنڈے کے نیچے "تختۂ دار" کھڑا ہے، تیغِ جلاد لٹکی ہوئی ہے، اور عصائے شاہی عَلم ہے! ——— تمام سلب و نہب، اور جملہ جدال و قتال یہیں قیام پذیر ہیں! نیز ہر قسم کا طوقِ لعنت، ناقابلِ طلاق شادی کے اغلال و سلاسل سے لے کر محاصرۂ شہر کی شہر آشوبیوں تک! حق کی رخصتِ مطلق کے تحت عام خلقت کی آزاد آمد و رفت، خرید و فروخت، مبادلہ و تجارت انجام پاتی ہے، قانون اپنی سرحدوں کی فصیلیں کھڑی کرتا ہے، اور اپنے کمرک خانوں کی حراست گاہیں قائم کرتا ہے! حق کا فرمان ہے، لازمی مفت تعلیم، ——— جس کی فیس میں بچوں کی معصوم عمریں قرق نہیں کی جاتیں! قانون، جاہل و جامد راہبوں کو مسندِ درس پر بٹھاتا ہے! حق، حریتِ اعتقاد کا روح پرور پیام دیتا ہے، قانون "سرکاری مذہب" قائم کرتا ہے! عام و غیر مشروط حقِ ووٹ، حق کا عطیہ ہے، محدود و مخصوص حقوقِ شہریت قانون کی ایجادِ بندہ ہیں!! ع

ببیں تفاوتِ رہ، از کجاست تا بہ کجا!

اصلاح و تطہیرِ ہیئتِ اجتماعیہ کے سارے "جہاد باللسان" کا حلقوم اُس گوشے میں واقع ہے جو قانون کی "راج ہٹ" کے مقابلے میں حق کی "استقامت" کا میدان ہے! میری زندگی کا مقولہ رہا ہے "حق جو انسانوں کو بناتا ہے، نکہ "قانون" جسے انسان بناتے ہیں! میرا ایمان ہے کہ حریت، حق کا رفیع ترین مظہر ہے، نیز یہ کہ جمہوریت کے کلماتِ طیبات ——— حریت، مساوات، اخوت ——— آخری اتمامِ شریعتِ سیاسی کی بشارت ہیں!! اس لئے کہ حریت حق ہے، مساوات اک حقیقت ہے، اور اخوت اک فرضِ عین!! یہ انسانِ کامل کے جملہ عناصرِ ضروری ہیں، ہم صحنِ حیات کے اندر کھیلنے والے ہمجولی بھائی ہیں، مادرِ انسانیت کی آغوش کے اندر یکساں پستانوں سے دودھ پینے والے توام بچے ہیں! کنارِ لحد کے اندر یکساں عرض و طول کے بستر پر لیٹنے والے ہم چشم ہیں!

اور فضائے آزادی میں ہماری روحیں طیورِ جنت کی طرح غیر رشتہ بر پاہیں! ؎

(ما پرتوِ آفتابِ حُسنِ ازلیم
فرزندِ نہ ایم آدم و حوّا را!)

(۲)

ایامِ طفولیت

اس انیسویں صدی کے سرآغاز میں اک بچہ تھا، جو اک پُرشوکت قصر میں رہتا تھا؛ قصرِ مذکور اک خانۂ باغ کے آغوش میں تھا، لیکن یہ طلسم زارِ عشرت و معیشت شہرِ پیرس کے اک ایسے حصے میں اپنی جائے وقوع رکھتا تھا، جہاں عام ساکنینِ آبادی کی آمد و شد سب سے کم نظر آتی تھی! یہاں اُس کا رہنا سہنا اپنی ماں، دو بھائیوں، اور اک بزرگ سِن و فاضل پادری کی معیت و صحبت میں تھا۔ آخر الذکر بزرگ اس بچے کا مُعلّم و اتالیق بھی تھا، اس نے اپنے اس اس شاگرد کو بہت سی لاطینی پڑھائی، بھوڑی سی یونانی، لیکن تاریخ مطلقاً کچھ نہیں!—— پیرس کا یہ موقع تھا، اور فرانس کی "سلطنتِ اولیٰ" کا زمانہ، کہ یہ تینوں بچے کھیلتے تھے اور کام کرتے تھے، آسمان پر بادلوں کا تماشا دیکھتے تھے، اور درختوں پر چڑیوں کے گیت سُنتے تھے،—— اپنی ماں کے تبسّم کی تاثیرِ شیریں کے تحت! اس بچے کی یہ بدقسمتی تھی—— اگرچہ کسی کا اس میں کوئی قصور نہ تھا —— کہ اپنی تعلیم و تربیت میں اُسے اک پادری سے سابقہ پڑا! اس سے زیادہ ہولناک بات کیا ہوسکتی ہے کہ جھوٹ کا اک نظام تعمیر کیا جائے، اور اُس کی "محرابِ بطالت" میں "سجدہ ہائے عقیدت" نذر کئے جائیں!! اک پادری کی مسندِ درس کی حقیقت ایسی ہی واقع ہوئی ہے! وہ خرافات کی تعلیم دیتا ہے، اپنی جہل نوازی سے بالکل معصوم ہوتا ہے، اور یکسر اس ماجرے کی اک نظیر کہ ؎

آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہلِ مرکب ابد الدہر بماند

ایسا اُستاد اپنے بدبخت شاگرد کے لئے جو کچھ دماغ سوزی کرتا ہے وہ بجائے ذہنی تعمیر کے ذہنی تخریب کا کام انجام دیا کرتی ہے۔ ہر اُس ریشۂ دماغی کو جسے فطرت نے درست بنایا، وہ اک "زنگِ قلبی" میں تبدیل کر دیتا ہے؛ وہ اک معصوم کی رُوح کو مسموم کر دیتا ہے! وہ اک کمسن کے سینے کو کینۂ التنِ تعصّب سے پاٹ دیتا ہے! وہ سپیدۂ سحر کی ناصیۂ جمال پر غروبِ آفتاب کی نقاب ڈال دیتا ہے!

(روزے کہ شود اذا السماء انشقت
واں دم کہ بود اذا النجوم انکدرت
من دامنِ تو بگیرم اندر عرصات
پُرسم شیخا! بای ذنبٍ قتلت ــ خیامؔ)

وہ قدیم و عزلت گزیں مکان اور باغ، جو اپنے سابق زمانے میں اک خانقاہ رہا تھا اور بعد ازاں اس بچے کی مہدگاہ بنا تھا، آج اُس کی شامِ پیری میں بھی اُس کے لئے اک حرمِ محترم کی حیثیت رکھتا ہے!—— اگرچہ اُس کا مقدس موقع اب اک جدید العہد سڑک سے ناپاک کیا جارہا ہے، اُس کا شامہ یہاں اک کیف انگیز فضا کو سونگھتا ہے، جہاں شعاعہائے آفتاب اور شگوفہائے گلاب کے درمیان اُس کا غنچۂ رُوح کبھی کھلا تھا! اس مکان کے دیوان خانوں، یا اس خانقاہ کے حجروں میں کیسا دیدنی سکوت گوشہ گیر واقع ہوا تھا، صرف طویل وقفوں کے ساتھ اِس قصرِ خاموش کی مُہرِ سکوت ٹوٹا کرتی تھی! یہ وہ موقعے ہوا کرتے تھے کہ اک شمشیر در کمر اور پُر شرخاب در کلاہ سر جنرل نزولِ اجلال فرمایا کرتا تھا!—— یہ جنرل اس بچے کا باپ تھا، جو معرکۂ محاربہ سے شبستانِ خلوت کی طرف اپنی عنانِ توجہ موڑا کرتا تھا!—— اُس کا بچہ اب سِنِ تمیز کو پہونچ رہا تھا۔

یہ بچہ مَیں تھا!

ایک رات کا ذکر ہے—— "سلطنتِ فرانس" کے یہ کسی بڑے جشن کی تقریب تھی!—— سارا پیرس چراغاں سے مطلع الانوار بنا ہوا تھا! میری ماں اِسی خانۂ باغ میں محوِ خرام تھی! میرے باپ کے تین نوواردِ رفقائے جنگ کے جھرمٹ میں! میں بھی اسی جماعت کا اک مقتدی تھا!—— ناگہاں درختوں کی تاریکی میں اک طویل القامت پیکر پر میری نظر پڑی!—— یہ اُن ایام کا نامور باغی، وکٹر ڈی لیہارزی تھا!—— میرا دادا! یہ اُس سہیب بار وقت میں بھی قیامِ آزادی کی راہ میں جبّارہ و قہارِ نپولین کے ظہورِ استبداد کے انہدام کے لئے مصروفِ سازش تھا!—— مستقبل قریب ہی میں وہ تختۂ دار پر سرافراز ہوا۔

(چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود!)

مجھے اپنے جدِّ ذوالمجد کے کلماتِ جلیل یاد ہیں!—— "اگر روم اپنے

شاہوں کو برابر تاجپوش رکھتا، تو رومتہ الکبریٰ کے عنوانِ جلی سے وہ کبھی سرتاجِ عالم نہ بن سکتا!"

پھر وہ عظمتِ مجسم میری طرف متوجہ ہوا! اُس کی وصیت اُس سکوتِ شب میں اِن الفاظ کی جھنکار میں گونجی: "میرے بچے! آزادی کو ہر شے پر مقدم رکھیو!"

یہ چند کلمات میری مُدت العمر کے تمام خُطباتِ تعلیم پر غالب ہو کر رہ گئے!

(۳)

جلاوطنی سے قبل

جب تک کہ ۱۸۴۸ء میں مَیں نے تمام اعدائے حریت و مسلکِ سبقت کی کامرانیٔ کامل اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لی، اُس وقت تک اپنے اعماقِ قلب میں مجھے اس حقیقتِ سنگین کا احساس نہ ہوا کہ میرا تعلق صفِ فاتحین سے نہیں ہے، بلکہ میں زُمرۂ مغلوبین میں داخل ہوں!

فرانسیسی جمہوریہ اک نعشِ بیجان کی طرح پڑی ہوئی تھی! تاہم جب میں نے اُس پیکرِ ناز کو گھور کر دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہ وہی معشوقۂ جُرئیہ تھی! یہ بات اک راز فاش تھی کہ اِس جاں بحق تسلیم ہو جانے والی "ملکۂ دِلہا" کی روحِ پاک سے کسی عقیدت کا اظہار میری جلاوطنی اور خانماں بربادی کا پیش خیمہ ہوگا، لیکن اِس کے قطعاً علی الرغم میں نے اس مرحومہ کے سنگِ مزار ہی کو اپنی سجدہ گاہ بنایا! ؎

مرا عہدیست باجاناں کہ تاجاں در بدن دارم
ہوا داریٔ کویش راچو جانِ خویشتن دارم!

۱۵ر جون ۱۸۴۹ء کی فیصلہ کُن تاریخ کو ایوانِ عدل سے میں نے اپنا نعرۂ احتجاج بلند کیا! اور اُس دن کے بعد سے میں نے حریت اور جمہوریہ کی راہ میں بیشمار معرکے لڑے! ــــ یکے بعد دیگرے، مسلسل و غیر متزلزل عزم بالجزم کے ساتھ!! اور پھر ۲ر دسمبر ۱۸۵۱ء کے روزِ مسعود کو مجھے ان سب کاوشوں کا وہ صلہ بھی مل گیا جو اک نعمتِ منتظرہ تھی! ــــ جلاوطنی! بیس سال کی!!

(نالہ جُز حُسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں! ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں!)

یہ وہ سرگزشت ہے جس کا عنوانِ نادر رکھا گیا: "وکٹر ہیوگو کا سیاسی ارتداد"!

(دادری دارم، ولے یارب کرا داور کُنم؟!)

جلاوطنی سے قبل جو حیرت خیز ماہ و سال گزرے، اُس کی ایک ایک صبح و شام میں ماضی کا ہولناک سایۂ عفریتی مجھ پر چھایا رہا! ان ایام میں کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا، جس پر مناظرانہ معرکہ آرائی نہ ہو لی! ــــ استقلالِ قومی، حقِ کار، حقِ سکونت، مادرِ وطن، بخلاف جلاوطنی! ــــ حقِ حیات، بخلاف قانونِ تعزیر، مباحثِ تفریق مابین کلیسا و ایوانِ حکومت، ائتلافِ یورپ و تنسیخ سرحداتِ ممالک براعظم، تعطلِ گمرک خانجات، ــــ اِن جملہ تنقیحات و مذاکرات کو آزادانہ تختۂ مشقِ ذکر و فکر بنایا گیا، اور بعض کو اُن کے منطقی سرانجام کو بھی پہنچا گیا!

اِن تمام یادگار ذکر و اذکار میں میں نے شرکت بھی کی اور اپنا فرض بھی ادا کیا! نیز اِس ادائے فرض کی قرار واقعی داد بھی پائی! ــــ لعن و طعن!

(سخنِ حق کی داد لوں کس سے
سُن چکا ہوں فسانۂ منصور!)

مجھے یاد ہے کہ جب عہدِ سابق کے لال بُجھکڑ "حقوقِ والدین" پر وعظ فرمایا کرتے تھے تو بعض "بے وحدت" ایسے بھی ہوتے تھے جو یہ "بے ادب، بے تہذیب" کلمہ کہہ دیا کرتے تھے کہ "بچوں کے بھی کچھ حقوق ہیں"!

(ہم بھی مُنہ میں زبان رکھتے ہیں!
کاش پوچھو کہ ماجرا کیا ہے!)

میں وہ دیدنی لمحے بھی نہیں بھُولا ہوں، جبکہ لوگوں کو یہ کہہ کر میں غرقِ حیرت کر دیا کرتا تھا کہ "معشرِ بشری سے اُس کی ازلی نکبت و فلاکت کو ختم کر دینا دائرۂ امکان سے خارج نہیں"!

۱۷ر جولائی ۱۸۵۱ء کی آتشین تاریخ تھی کہ میں نے "لوئی بونا پارٹ" کی سازش "بخلاف انقلاب" کو بہ بانگِ دُہل نشانۂ ملامت بنایا! اور اُس کے اِس منصوبۂ شوُمہ کو بے نقاب کر دیا کہ "وہ پریزیڈنٹی کے پردہ ریاکاری کے پیچھے قبائے ملوکیت زیبِ تن کر رہا ہے"!

اک دوسرے عدیم النظیر دن کے روزِ روشن میں "ایوانِ عدل" کے صدر (منبر) سے میں نے چند ایسے کلمات کا تلفظ کیا جو اس سے پہلے فرنگستان کی فضا

میں نہ گونجے تھے!ـــــ "ریاست ہائے متحدۂ یورپ"!

معاً لعنت وحقارت کے کلماتِ تبرّیٰ کی مجھ پر بارش کی گئی! مگر میں اس ذلیل قال وقیل کو کیا در خورِ سماعت بنانے والا تھا!ـــــ کیا ان گدھوں نے جارج واشنگٹن کو بھی "جیب کترا" نہیں کہا تھا؟!

(دُور بینانِ ازل، کورئ چشم بد بیں!
ہم در اینجا نگرند، آنچہ در آنجا بینند!)

عہدِ پارینہ کی "فرتیہ کے" باقیات سیئات کے حامل یہ احمق اپنی ان باطل کوشیوں میں کیا سچ مچ کوئی کامیاب شرارت کرتے تھے؟ مطلق نہیں! شیطان کے یہ فریب خوردگان اپنے ہی کو اپنی دسیسہ کاریوں کا نشانہ بنا رہے تھے! بلا شبہ وہ جھوٹ بولتے تھے، لیکن اُن کی بطالی علاّ حق کی وکیل ثابت ہو رہی تھی:

(عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد!)

وہ زبان سے مجسم خلق پر بدزبانی ہو رہے تھے، لیکن اُن کی خلق بُری کی جہاں آشوبی چیخ رہی تھی، اُن بیشمار قوانین وضوابط کے اغلال وسلاسل میں جو خلق اللہ کے لئے جانستان بنے ہوئے تھے!

(تا عزم من قنع شدہ نقش نگیں ترا!
دارند اہلِ فقر ز دستِ تو صد جزع!)

وہ "مجلسِ مملکت" نہ تھے: خدائی فوجداروں کا اک غول تھے! بوہر اس گروہ لایعقل کے خضرِ طریق بھی ماشاء اللہ وہ تھے جو بدترین خلائق واقع ہوئے تھے!

آؤ "لعنت بکارِ شیطان" کا لاحول پڑھیں، اور اُن کے ذکرِ زشت کو کوتہ کریں!ـــــ شبِ دیجور کو اجازت دو کہ وہ تاریکی کی ذریات پر آخری پردہ ڈال دے! (الا بعداً للقوم الظالمون!ـــــ قرآن)

کیا پروا ہے ہماری ساری خونریزیوں، خونفشانیوں، جگر کاویوں اور جلا وطنیوں کی، اگر اُن کا مآل وماحصل بشریت کے لئے ایسا ثمرِ شیریں بنا؟!

(سفینہ جبکہ کنارے پہ آلگا غالب!
خدا سے کیا ستم وجورِ ناخدا کہئے!)

اگر نسلِ انسانی سچ مچ بہن دوسرے کی زہر ریزی سے آزادی بہشت وخورداد کی شگفتہ فضا اور شیر گرمی کی طرف رواں ہے! اگر واقعتہً زمستان کے شدائد تابستان کی نو رنگینیوں سے تحلیل ہو رہے ہیں! اگر بیدردانہ مظالم کی برفباریاں اور ملعون پادشاہتوں کے ابر غلیظ حقیقتہً چھٹتے رہے ہیں، اگر سیاہ بخت بشریت کی قسمت کو نحوست کو گنبد گرداں برابر لپیٹتا رہا ہے؛ تو کچھ شک نہیں کہ ہم مطلعِ عالم پر اک گلابی صبح کے طلوع کا جشن منانے والے ہیں! (خوش باش، کہ عاقبت نکو خواہد بود!)

آؤ اپنے سارے دشمنانِ جہانستان کو اک پیامِ امن واخوت دیں! صلح وسلام کی صراطِ بہشتی پر کسی خار وخس کا گزر نہ ہونا چاہئیے! قسم خدا کی مادرِ گیتی کی آغوشِ شیریں میں بہت کچھ انسانی خون بہہ چکا ہے! قافلۂ آدم کب سمجھے گا کہ ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں؟! ہماری سیاسی جتھابندی اک "حصارِ آہنی" ہو گی، لیکن ہماری بشری برادری درختانِ گلاب کی اک صفِ جمیل بنے گی:

(ز اتفاق مگس شہد می شود پیدا!
خدا چہ لذتِ شیریں در اتفاق نہاد؟)

(۴)

اصولِ جمہوریہ!

قوم کا اقتدارِ اعلیٰ، ہمہ گیر ووٹ، اور آزادئ پریس یہ تینوں چیزیں تین مختلف ناموں کے پیراہن میں ایک ہی تن نگارِ حقیقت ہیں! یہ عناصرِ سگانہ ہماری پبلک زندگی کی تکوین کے اجزائے ترکیبی ہیں! پہلی چیز مقصود بالذات ہے، دوسری اُس کا طریق کار ہے، اور تیسری اُس کا پیرایۂ اظہار! اس طرح یہ سب ایک دوسرے سے غیر منفک واقع ہوئی ہیں! عامۃ الناس کی سیادت، قوم کی سیاست پر در روح رواں ہے، رائے عامہ فرمانِ حکومت ہے، پریس منارِ ہدایت ہے! لیکن پھر یہ ہر سہ ایک ہی چہرۂ حقیقت کے تین رُخسارے ہیں، جملہ خط وخال کی حامل صورت کی پیشانی پر "جمہوریہ" کا طغرا لکھا ہوا ہے! یہ تین جواہر اک نظامِ جمہوری میں جس طرح اپنے مظاہر رکھتے ہیں، وہ اک دلچسپ ماجرا ہے، قوم کا غلبہ سیاسی آزادی پیدا کرتا ہے، عام ووٹ سطحِ مساوات کو ہموار کرتا ہے، اور پریس اخوت کا منبرِ خطابت بنتا ہے!

روئے زمین کے جس گوشے میں یہ "عناصرِ ثلاثہ" اپنی پوری قوت اور

کثرت میں پائے جائیں گے، وہاں جمہوریت بھی صورتگر نظر آئے گی —— پھر چاہے
اُس پر ملوکیت ہی کا ملمع کیوں نہ منقوش ہو! —— اسی طرح جہاں ان
مقاصدِ جلیل سے خیانت کی جاتی ہے، اُن کی راہ میں مزاحمت پیش کی جاتی ہے،
یا اُن کی گلوگیری و زبان بندی کی جاتی ہے، تو حقیقی فرمان فرمائی وہاں ملوکیت
ہی کی ہے، —— اگرچہ جمہوریہ کے تسمیۂ سے اُس کی اک نظر فریب نمائش کی
جاتی ہو!

آخر؟ اگر صورتِ حالات میں ہم وہ ہولناک منظرِ سیاست دیکھتے ہیں،
جب کہ اک حکومت کو خود اُس کے "امین" دغا دیتے ہیں! یہی ماجرائے شگفت
ہے جسے دیکھکر بڑے بڑے راسخ الایمان قلوب، انقلاب سے بددل ہو جاتے
ہیں! انقلابات عبارت ہیں ناپید اکنار، شتر بےمہار تحریکات سے جو بحرِ
ظلمات سے عظیم ترین و عمیق ترین حقائق کے جواہر نکالتی ہیں، اور سفلہ ترین
انسانوں کو سطحِ بالائی کے منظرِ عام پر لے آتی ہیں۔

(ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من — وز درونِ من نجست اسرارِ من!
سرِّ من از نالۂ من دور نیست — لیک کس را فہم آں منظور نیست!)

جب ہم دیکھتے ہیں کہ انقلاب کی جلو میں کیسے جلیل الشان اصول
معرضِ ظہور میں آتے ہیں تو ہم اُس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن جب ہمیں یہ
نظر آتا ہے کہ اِس ہنگامے میں کیسے کیسے ناشدنی انسان اپنی سینہ زوری سے
صفِ اول میں آجاتے ہیں تو بادلِ ناخواستہ ہمیں انقلابات کو حادثات کا
نام دینا پڑتا ہے! (کَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ!
—— قرآنِ حکیم)

ہمیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ جمہوریہ کے مُصرحۂ بالا
اعضائے رئیسہ اک جسمِ واحد کی صورت میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں! یہ تینوں
باہم خواجہ تاش واقع ہوئے ہیں؛ وہ قیام و انہدام دونوں میں ساتھ ساتھ
رہتے ہیں! وہ ہجوم و دفاع ہر دو حالتوں میں رفقائے جنگ نظر آتے ہیں!
مثلاً اگر پریس کی آزادی خطرے سے دوچار ہوتی ہے تو رائے عامہ اُٹھتی ہے
اور اُس کی پشت پناہی کرتی ہے! اور اگر حقوقِ شہریت کو دھمکی دی جاتی ہے تو
پریس اُنھیں اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتا ہے، اِن دونوں میں سے کسی کے
خلاف اگر کوئی اقدام کیا جائے گا تو اُس میں قوم کے اقتدارِ اعلیٰ کے خلاف
اک غداری متصور ہوگی!

اِس عظیم انیسویں صدی کی جد و جہد کسی ایک قوم کی تحریک نہ شمار
کی جانی چاہیے، وہ تمام اقوامِ عالم کا اک ہمہ گیر جہادِ عام ہے! اس جلوسِ
انسانیت میں فرانس میرِ کارواں واقع ہوا ہے، اور باقی اقوام اُس کے
پیامِ قُم "پر اُٹھ اُٹھ کر اُس کے نقشِ قدم پر آرہی ہیں! ہم عہدِ قدیم کو خیرباد
کہہ کر عہدِ جدید میں داخل ہو رہے ہیں! اور ہمارے حُکامِ عالی مقام اور
ہمارے قوانینِ ذوالاحترام کی کوئی کاوش ساعتِ وقت کی سوئیوں کو اُلٹا
چلنے پر مجبور نہیں کرسکتی! قافلۂ بشریت، سوع

گزر گیا ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے!

فرانس اور سارے یورپ میں اس وقت ایک جماعت موجود
ہے جو جبریلِ اُمید کی نہیں، "ابلیسِ ہراس" کی مُلہم واقع ہوئی ہے! یہ لوگ کسی
سرزمین میں خضرِ راہ نہیں بن سکتے! ہاں یہی عناد و پرخاش کی اِس فضا میں
جو سوال اک غیر مختتم تسلسل سے پوچھا جا رہا ہے وہ یہ ہے .... "کون ملزم ہے؟"
جس نازک دَور سے ہم گزر رہے ہیں —— اگرچہ یہ دَور اپنی ساری
نزاکت کے باوجود بجز خیر کے کسی اور انجام کا پیش خیمہ نہ بنے گا ——
ہر شخص موجودہ خوفناک اخلاقی انارکی اور مجلسی خطرۂ اختلاط پر وحشت زدہ
و فریاد کُناں ہے! اچھا تو کون بانی کار ہے اِن مظالم و جرائم میں؟ سارے
براعظم یورپ میں "جماعتِ خوف" کا جواب ہے: "فرانس!" "سارے فرانس
میں اسی کا جواب ہے: "پیرس" "سارے پیرس میں جس چیز کی طرف اُنگلی اُٹھائی
جاتی ہے وہ ہے "پریس" لیکن ساری اغواءِ عام کے علی الرغم جو چیز بانی و
مبانی ہے وہ ہے: "روحِ انسان"!

(توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام!
دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک!)

ہاں لاریب کہ یہ "روحِ انسان" ہی ہے جس نے اقوامِ عالم کو اپنی
معلومہ ماہیت و حیثیت بخشی ہے! صبحِ آفرینش سے لے کر اس وقت تک،
بے پایاں بحث و مذاکرہ اور نامتناہی رَد و قدح کے دشوار گزار خارزار
سے عبور و مرور کرتے ہوئے، اس رُوحِ انسان نے برابر یہی کوشش و
کاوش کی ہے کہ اُس عقدۂ لاینحل کو حل کرے جو ازل سے اُس کے خالق
نے اُس کی راہ کا سنگِ راہ بنا رکھا ہے! —— یہ رُوحِ انسان ہی ہے جو
عہد بعہد تاریخ کے تمام انقلابات کے بارِ عظیم کی بارکش بنی ہے! اُس کے مظاہر

باری باری سے، ـــــ اور کبھی بیک وقت ـــــ رہے ہیں، غلطی، خطا، فریبِ نظر، ارتداد، نفاق وشقاق، نعرۂ احتجاج، اور گلبانگِ حق! ـــــ رُوحِ انسان ہی تمام نسلہائے بشری کی عظیم الشان "شان" رہی ہے! اُسے کتنے ہی گوناگوں منازل ومراحل پیش آئے ہوں، لیکن اُس کا شتبہ بر حال ہمیشہ قبلۂ حق اور کعبۂ عدل ہی کی سمت میں رہا ہے! اُس سے بیشمار لغزشیں اور لاتعداد کجرویاں سرزد ہوئی ہوں، تاہم اُس کی عام شاہراہ حق، حُسن، تنویرِ خلقِ اللہ، ارتفاعِ ارواح، تقرب مابین انسان واللہ کے رُخ ہی پر رہی ہے۔

فرنگستان کی "جماعتِ خوف" کو معلوم ہونا چاہئیے کہ جو مہم عظیم اُنھوں نے اپنے نازک شانوں پر اُٹھائی ہے وہ سچ مچ بہت ہی عظیم ہے، اُنھوں نے قبل ازیں "پریس" کو تباہ کر دیا ہے، لیکن یا د رہے کہ یہ اُن کی فتح کا تکملہ نہیں! ـــــ "پریس" کے بعد ابھی "اُنھیں" "پیرس" کو بھی تباہ کرنا ہے، قبل اس کے کہ اُن کی یہ مُہم اتمام کو پہنچے! لیکن "پیرس" کی تباہی کے بعد "فرانس" موجود ہے! اور "فرانس" بھی آخری خطِ مدافعت نہیں! ـــــ آخری حصارِ حُرّیّت وقلعۂ جمہوریت خود "رُوحِ انسان" ہے!

اور یہ "رُوحِ انسان" وہ شئ عجیب ہے جو ناقابلِ مَس ہے "نور" کی طرح! اور بالائے دسترس ہے "آفتاب" کی طرح!! (یریدون لیطفئو نور اللّٰہِ بافواھھم، واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ـــــ قرآنِ عظیم)

(۵)

عالمِ جلاوطنی میں!

کوئی چیز جلاوطنی سے بڑھ کر زہرہ گداز نہیں! میں یہ نہیں کہتا کہ جلاوطنی کا یہ قاتل اثر جلاوطن ہی پر ہوتا ہے! نہیں، بلکہ اس کا نشانہ وہ دیوِ استبداد بھی ہوتا ہے جس کے فرمان سے وہ صادر و نافذ ہوا کرتی ہے! ـــــ ایک یکہ وتنہا پیکر ہوتا ہے، جو کسی دور دراز ساحلِ بحر پر سرنگوں خراماں نظر آتا ہے، یا صبح کے وقت اُٹھتا ہے تو اپنی زبان پر یہ کلمات جاری پاتا ہے:

سہ چیز است آنچہ پایانے ندارد
شبِ من، دردِ من، افسانۂ من!

یا گو شہہائے کوہستان اور کُنجہائے اشجار میں خدا کو پکارتا ہے:

کس پردے میں ہے آئینہ پردازِ لے خدا!
رحمت کہ عذرخواہِ لبِ بے سوال ہے!

آہ کہ اُس کے بال کالے سے بھُورے ہو جاتے ہیں، اور بھورے سے سفید! ماہ وسال، شب و روز، صبح وشام کس صبرآزما گراں گامی سے گزرتے ہیں، ہیہات کہ وطن اور گھر نہیں ملتا، اور قافلۂ عمر منزلِ فنا سے دوچار ہونے لگتا ہے! اُف! اُس کی مُسمت کیسی سوہانِ رُوح ہوتی ہے! ـــــ باایںہمہ اُس کی معصومی، وناکردہ گناہی اک مستقل چیلنج ہوتی ہے اُس "تاج پوشِ باطل کوش" کے لئے۔ ع۔ کہ سرکوہ وبیاباں تو دادہ مارا ۱۸۱۵ء سے لیکر ۱۸۲۱ء تک مجبور پر یہی روزِ حشر طاری رہا، ع آہ! ماہ وسال کا ہائے! "آبنائے انگریزی" کے وہ جزائر کتنے بہشت سواد واقع ہوئے ہیں! ـــــ اور محبوبِ فرانس کے کتنے روکش! جزیرۂ جرسی، شاید گرنسی سے بھی زیادہ دل رُبا ہے! اُس کا حُسن عزور آخرالذکر سے بڑھ کر ہے، اگرچہ وہ اتنا پُرشوکت نہو! جرسی کی گلزمین میں نیستان اک چمنستان بن گیا ہے! سارا جزیرہ اک گلدستہ نظر آتا ہے! جو شہر لندن کی قدو قامت کا ہوگا! ـــــ یہ گویا اک نگینۂ لعلین ہے جو بحرِ محیط کی انگشتری میں جڑ دیا گیا ہے!

جلاوطن پر جلد اک خاص حقیقت کا انکشاف ہونے لگتا ہے! ـــــ وہ یہ کہ اگرچہ وہ اک دُور دست جگہ میں پھینک دیا گیا ہے، تاہم ظالم کی دست درازی نے اُس پر سے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی ہے! اِس دور اُفتادۂ وطن کے لئے کتنے جال ہوتے ہیں، اور کیسے کیسے شاطرانہ! مثلاً اِس عالمِ جلاوطنی میں اک "شہزادہ"، تم سے ملنے کو آتا ہے، لیکن اگرچہ بلاشُبہ وہ خاندانِ شاہی کا اک رکن ہے، تاہم وہ سررشتۂ پولیس کا اک "جاسوس" بھی ہے! اک ثقہ وتقطیع پروفیسر، تمہارے ہاں چند روز قیام کرتا ہے۔ اور تم ایک دن یہ دیکھکر حیران رہ جاتے ہو کہ اپنی "معلوماتِ عامہ" میں اضافہ کرنے کے لئے وہ تمہارے کاغذات کا مطالعہ کر رہا ہے! تمہارے خلاف ہر بات مُباح ہے! اِس لئے کہ تم "باغی" ہو! ـــــ امانِ قانون سے باہر! دائرۂ حقوقِ انسانی سے خارج! اِن "کراماً کاتبین" میں سے بعضے ایسے آئیں گے،

جو تم سے باہمی گفتگو کو شائع کرنے کی اجازت لے لیں گے، اور پھر تمہارے وہ الفاظ نقل کریں گے، جن سے تمہارے ہونٹ کبھی مَس نہیں ہوئے! ہاں جلا وطنی میں کبھی کسی دوست یا عزیز کو کوئی خط نہ لکھنا! ہر مکتوب کے مکتوب الیہ یہ سرکاری نکیرین خود بن جاتے ہیں! اُن ذاتہائے شریف سے ہوشیار رہنا جو جلاوطنی میں تمہیں دلسوز خط لکھا کرتے ہیں! یہی بزرگ پیرس میں بیٹھے تمہاری جڑیں کاٹ رہے ہیں!

تم اکھو جذامی کی طرح الگ تھلگ کر دئے گئے ہو، لیکن ہر لحظہ لوگ تمہارے گلے کا ہار بنے ہوئے ہیں، ایک پُر اسرار اجنبی آتا ہے اور محرمانہ سرگوشی کرتا ہے: "کہو تو بونا پارٹ کو قتل کر دوں؟!" ـــــ یہ بونا پارٹ ہی، بونا پارٹ کے قتل کی پیشکش کر رہا ہے!

ہر طلوعِ صبح اک نیا فتنہ لاتا ہے، اور ہر غروبِ آفتاب اک نئے فریب پر پردہ ڈالتا ہے!

صرف ایک ہی عالم کی پہنائیاں جلاوطن پر کھلی ہوئی ہوتی ہیں! ـــــ علمی و فلسفیانہ ذکر و فکر کی دنیا!

یہاں کم از کم وہ بحرِ اعظم کا ہم نشین ضرور ہوتا ہے ـــــ جو اُسے وسیع النظر، عمیق الفکر، اور غواصِ حکمت بنانے کے لئے کافی ہے! وہ ابدی تصادم، امواجِ طوفان کا سواحل سے، اور اُن کی سرکوبی و پسپائی ان سواحلی پشتہائے سنگِ خارا سے، گویا یورشیں ہوتی ہیں، باطل کورش استبداد کی، اعلان و اعلائے کلمۂ حق پر! ظلم و کذب کا طغیان و تلاطم بیہودہ نعل در آتش ہوتا ہے! کف در دہاں دریائے شور کو اس رعب انداز شورا شوری سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا! ساحلِ خارا کیا اس سے شکستہ و فرسودہ ہو جاتا ہے؟ نہیں، بلکہ اُس کی اور شست و شو ہو جاتی ہے، اور آفتاب عالمتاب کی تجلی میں اور براق ہو جاتا ہے!

جلاوطنی کا ایک فیضان نہایت عظیم ہوتا ہے! ـــــ اس حالت میں ایک انسان تفکر، تخیل اور شدائدِ حیات سے تنہا نبٹنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے! یکہ و تنہا ہونا اور پھر بھی اس عالمِ ہُو میں یہ محسوس کرنا کہ میں ساری بشریت کے ساتھ "من تو شدم تو من شدی" کے مقام میں ہوں! "شہر بدر" ہونا اور اس کے علی الرغم مملکتِ انسانیت کا "شہری" بن جانا، سارے مراکزِ تمدن سے خارج البلد ہو جانا، اور اس کے باوجود اپنے بازوئے ہمت پر نظر ڈالنا اور اپنے ہی لئے قوت لایموت بہم پہنچانا! یہ خواب دیکھنے کیلئے یکسو ہو جانا کہ خیر و عدل کیا ہے، اور پھر اس منصوبے کے لئے فارغ ہو جانا کہ اس خواب کی عملی تعبیر کیونکر حاصل ہو! خلق اللہ کے مفاد کے معاملے میں مجسم جلالِ حق ہو جانا، لیکن اپنے ذاتی عناد و کاوش پر ضبط کے معاملے میں یکسر اک نفس کُش راہب بن جانا! عزلت صحرا کے بسیط کرۂ باد میں سانس لینا اور روحاً بے پایاں ہو جانا! اک عمیق غیظ و غضب کو اک عمیق تر طمانیت و سکینت سے سمو دینا! ـــــ

رہانیدی مرا از شرِ ہستی
چہ بیہودی پیاپے جامِ مے را!

چنانچہ جلاوطنی کے اس وحشت زار میں بھی میں اکثر اپنے سے کہا کرتا تھا کہ

اگر تسلط یافتہ موجودہ ملوکیت و دورِ استبداد کے
خلاف اک کامیاب جوابی انقلابِ جمہوریت ظہور میں آئے
اور بونا پارٹ اپنی جان لے کر بھاگے اور میرے کلبۂ احزاں
پر آکر دستک دے تو واللہ کہ مجھے یہ نعرۂ میزبانی بلند کرنا
چاہیئے کہ ع

قدم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست!

ہاں! ے

کہیں کیا دل کی وسعت اپنی ہم، اللہ ری وسعت
اگر "نُہ آسماں" ہوں جمع "اک خالِ سویدا" ہو!

ہاں لاریب کہ اک مقہور و مُنظر و جلاوطن اک عاشقِ فطرت مُحبِ عالم بن جاتا ہے! وہ گلاب کے پھولوں پر آنکھیں سینکتا ہے! چڑیوں کے گھونسلوں کے آشیانۂ امن کے نظارے سے آسودگیٔ دل پاتا ہے! تیتلیوں کی پروازِ رنگ سے اک اہتزازِ رُوح حاصل کرتا ہے! وہ وحوش و طیور کی محفلِ فطرت سے خلا ملا پیدا کر لیتا ہے، اور جلوہ زارِ عالم کے پیچھے اک دیدنی مہر و نوازش کو جُنباں پاتا ہے! اس جولاں و جُنباں حقیقت پر اُس کے سینۂ عرفان میں اک غیر متزلزل ایمان بالغیب پیدا ہو جاتا ہے! نیستان کے کُنج اُس کی چیدہ خلوتگاہیں ہوتے ہیں! اُس کے سالِ عمر میں اک مستقل ماہِ اردی بہشت رہا کرتا ہے! وہ گھانس کے ایک فرشِ زمردیں لیٹا ہوا اک "برگِ درخت" پر معرفتِ کردگار کا اک "ورقِ دفتر" تلاوت کیا کرتا ہے! ایک ایک شاخِ گُل میں وہ گویا ایک ننھی سی "ہری بھری ریاستِ جمہوری" دیکھتا

دیکھتا ہے! وہ چڑیوں کو اُن کے چہچہوں سے ایسا پہچاننے لگتا ہے جیسا کہ ہم اپنے دوست آشناؤں کی شناخت اُن کے لب و لہجے سے کر لیتے ہیں! وہ نادار بچوں کو برہنہ پا ساحلِ بحر کی کنارِ ریگزار میں کھیلتا دیکھتا ہے، اور خود بھی، بایں ریش و فش، مادرِ فطرت کی آغوش میں مچل جانا چاہتا ہے!

یہ ہے وہ خطرناک انسان جس کے شر و فتنے کو پا بزنجیر کرنے کے لئے حکومتیں اور سلطنتیں اپنی "طاقتِ خداداد" کا سارا زور صرف کر دیتی ہیں! رحمت مآب حضرت علیا ملکۂ معظمہ وکٹوریہ، فرانسیسی مہاجرینِ انقلاب کو سرکارِ دولت مدارِ فرانس کے حوالے کر دینے کی پیشکش فرماتی ہیں! اور مجرمینِ انسانیت کی اِن دو کمین گاہوں —— تختِ انگلستان و فرانس —— کے درمیان "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" والا ماجرا پیش آتا ہے! ع

مدارِ روزگارِ سفلہ پرور را تماشا کن!

مگر یہ "حسابِ دوستاں در دل" کی داد و ستد عملاً ظہور میں نہ آئی! برطانیہ کے شاہ پرست پریس نے تو اِس پر صدائے احسنت و مرحبا بلند کی، لیکن قلبِ انگلستان —— لندن —— کی پبلک اِس شرمناکی کی روادار نہ ہوئی! اس عظیم الشان شہر کے آسمان کے مُکدّر مطلعے پر احتجاج کی بند بند گرج سنائی دی، اور اِس مجوزہ ناشدنی حرکت پر مُہر ہو کر رہ گئی "ملوکیت، ملبوس بہ شرافت"! —— یہ ہے انگریزی قوم کی سیرت!

الغرض اس نیک سرشت اور غیور قوم کو جلال آگیا! اور عالی جناب پامرسٹن اور اعلیحضرت بوناپارٹ کے درمیان اس سے زیادہ ہدایا و تحائف کا مبادلہ عمل میں نہ آیا کہ جلاوطنوں کا بس باہمی اخراج ہو گیا!

اپنی غیبت و جلاوطنی کی بست سالہ طویل شبِ دیجور میں "قمرِ پیرس" ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں سے اوجھل نہوا۔ جب کہ فرانس، بلکہ سارا یورپ، گہن میں آگیا، پیرس کا مطلعِ روشن بدستور میرے مشتاق نظارے کے سامنے رہا! ؎

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار!

لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا!

اِس کی وجہ یہ ہے کہ پیرس مُلکِ مستقبل کی سرحد ہے! —— غیر معلوم عالمِ نو کا مشہود آستانہ! پیرس کل کے روزِ روشن کی "شبِ آبستن" ہے! منزلِ نو رہ کو جانے والے جتنے مسافر ہیں اُن کی نزول گاہِ اوّل پیرس ہے!

اِس لئے کہ پیرس اک "ستونِ روشنی" ہے! ع

مبادا ایں جمع را یارب غم از بادِ پریشانی!

(۶)

جلاوطنی کے بعد

میری زندگی کے یہ "ابوابِ ثلاثہ" —— ماقبل جلاوطنی، دورانِ جلاوطنی، مابعد جلاوطنی" —— اس قدر میری کارفرمائی نہیں جس قدر کہ "نپولینِ ثالث" کی کارستانی ہے! اُسی نے میری حیاتِ ارضی کی توحید کو اِس "تثلیث بالاکراہ" میں تبدیل کر دیا۔ اِس میں اُس نے میری رُوح کے ارتقار کے "مراتبِ سہگانہ" —— خام بدم، پختہ شدم، سوختم —— کو پورا پورا ملحوظ رکھا!

۵ ستمبر ۱۸۷۰ء کو جب بیس طویل سالوں کے بعد میرا دوبارہ معانقہ اپنے وطنِ مالوف سے ہُوا تو میں نے اِس زمین کے آسمان کو اور بھی زیادہ تاریک و اَبر آلود پایا، جس کی تنویر و تطہیر کے لئے میں نے محسوس کیا کہ میرے "شعلۂ فریاد" کی اک پہلے سے بھی بڑھ کر "برقِ خاطف" کی ضرورت ہے!

آہ! وطنِ مقدس کو خیرباد کہنا کون کہتا ہے کہ شاق نہیں؟ لیکن اس حالتِ ناشدنی میں اُس کی طرف مُراجعت کرنا بمراحل شاق تر ہے! واللہ کہ اک فرانسیسی تازلیت جلاوطنی کا خیر مقدم کرے گا، بمقابلہ اِس کے کہ فرانس کو پرشیا کی ایڑھی کے نیچے اِس طرح پامال اور گھایل پائے! وہ سرزمینِ وطن میں اِس عالم میں لوٹے کہ میٹز اور اسٹراسبرگ کے لختہائے جگر اُس کے پہلوِ مجروح سے کاٹ لئے گئے ہوں۔

(نہ خواہم زمانے کہ ایں نو عروس!

بیفتد بزیرِ جوانِ "پروس"![1])

تمدن زارِ فرانس پر یہ بالکل وحوش و بربرہ کی اک یورش تھی! لیکن اِسی مصیبت کی جلو میں اک دوسری بدتر افتاد بھی تھی! —— میرا "مشارٌ الیہ" ہے،

---

[1] پروشیا یا پروسیا سے "پروس"، جس طرح روسیا سے "روس"! —— اصل شعر نامور شہید ایرانی شاعر و انقلابی، آقا کرمانی، کا ہے، جس کے دوسرے مصرعے میں "پروس" کے بجائے روس ہے اپر روسیا، جرمن وطن اور جرمن مسلک ہے، بیت کا خاص "جان خط"!

فرانس پر بحرِ ظلمات کا اک طوفان! انیسویں صدی کے مطلع الانوار پر قرونِ تاریک کی رجعتِ قہقری! "شہنشاہِ فرانس" کی مفقودی کے بعد "پاپائے روم" کی سبز قدمی! برلن والی گردن زنی کے بعد روم والی گلوگیری! "شمشیر" کی قتالی کے بعد "شبِ دیجور" کا حبسِ نظر! ــــ اس لئے کہ تمدن کے ماہتاب کی قندیل کو دو آندھیاں بجھا سکتی ہیں ــــ ایک فوجی حملہ، دوسرے استبدادِ دینی کا اک محاصرہ! اول الذکر مادرِ فرانس کے لئے اک خطرہ ہے، آخر الذکر مولودِ مستقبل کا گلا گھونٹ دینے کی اک دھمکی ہے!!

دو حرمتیں ہیں جو اک مہذب قوم کی قیمتی ترین متاع ہیں ــــ اس کا وطنی حصارِ ارضی، اور اس کا اندرونی حرمِ ضمیر! حملہ آور عسکری پہلی چیز میں مداخلت کرتا ہے، اور سختگیر پادری دوسری کی بے احترامی کرتا ہے! لیکن ان کاروبار میں عسکری "مارشل لا" کی فرمانبرداری کرتا ہے، اور پادری اپنے "بے روح کلماتِ دینی" کی! اس طرح آخر کار دو ہی ہستیاں رہ جاتی ہیں، جن کی گردن پر سارا بارِ جرم واقع ہوتا ہے! ایک "قیصرِ قاتل" دوسرا "پیرِ باطل"! (استکباراً فی الارضِ ومکر السیئ! ــــ القرآن)

متعارف ادیان و مذاہب میں کوئی ایسا نہیں جس کا حرم، روحِ انسانی کے لئے اک محبس نہ بن گیا ہو! فرانس آج اسی گردش میں گرفتار ہے!

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ہمارے زمانے کی تعلیم و تلقین کے مدرسے میں دو مسند ہائے درس واقع ہوئی ہیں، ایک کی انگشتِ قبلہ نما مستقبل کی طرف اٹھی ہوئی ہے، دوسری کی انگلی ماضی کی طرف اک اشارۂ معکوس کر رہی ہے! تمدنِ انسانی کی تقدیر آج انہی دونوں قوتوں کی کشاکش میں معلق ہے! اول الذکر مدرسہ "پیرس" کہلاتا ہے، اور آخر الذکر کا نام "روم" ہے! یہ ہر دو مدارس یا معابد اپنا اپنا ایک ایک صحیفۂ دینی رکھتے ہیں: پہلے کے صحیفے کا نام "اعلانِ حقوقِ انسان" ہے، دوسرے کا "پاپائی تورۂ چنگیز خاں"!! پہلا "ترقی" کو کہتا ہے: "خوش آمدی"! دوسرے کا پیام ہے: "کاش کہ بازگشتی" ان دو متضاد لواؤں میں کلمۂ حق دخل دیتا ہے، اور پہلی کو پروانۂ راہداری بخشتا ہے! ــــ لاریب کہ "ترقی و تقدم" خود خدائے قدوس کا "نقشِ قدم" ہے!!

"پیرس" کے مجمع "اخوان الصفا" کے ارکان ہیں، منتین، ربیلائے، پاسکل، کارنیل، مولیر، بانٹسیکیو، دیدرو، روسو، والٹیر، میرابو، اور ڈینٹن! "روم" کے حصے میں داخل ہیں، پوپ انوسینٹ سوم، پوپ پائس پنجم، اسکندر ششم، اربن ہشتم، آربیوز، سپنسراس، اینیئیر، گلانڈس، اور اِگنیشس!

لوگوں کو تعلیم دینا ان پر حکومت کرنے کا دوسرا نام ہے! مسندِ درس، ایوانِ حکومت کی ہم اقتدار ہے! پس اک دفتری تعلیم کے اجراء کے معنی اک دفتری حکمرانی کے قیام کے ہیں! اس قصرِ حکومت کا سنگِ بنیاد جہالت ہوتا ہے، اور قلۂ آخرین استبدادِ شخصیت!

روم کے پنجۂ قہر میں بلجیم پہلے ہی آچکا ہے، اور پیرس اس کی گرفت کی دوسری زد میں آنے والا ہے! ہم اک موت و حیات کے معرکے کے تماشبین بن رہے ہیں! ہمارے خلاف صف آرا ہے وہ قرن الشیطان والی قوت جس کا سرچشمہ چاہِ ماضی ہے! ــــ تاریکی کی یہ ذریات ہیں، عفریتِ ملوکیت، عصبیت، فوجی بارک، دینی خانقاہ، جن کی اخواتِ طریقت ہیں بزدلی، دیدہ دلیری، بیحیائی، خوفزدگی، شک گزیدگی!

ہمارا تنہا حلیف اس معرکہ آرا مقابلے میں علم دلنواز ہے!

یہی وجہ ہے کہ فتح ہماری ہوگی، ہمارا حربۂ جنگ روشنی ہے! روشنی، زنجیرِ غلامی کے آہن کو تحلیل کر ڈالے گی! لیکن حقیقی صالح آزادی، ذمہ داری کی اک "پازیب" اپنے ساتھ لاتی ہے! آزادی سے بڑھکر کوئی چیز سنگین و نازک نہیں! وارستہ مزاج حریت کے دوش پر بھی بڑے بڑے بار واقع ہوئے ہیں! وہ انسانی جسم کے اعضا و جوارح سے جتنے بند کاٹتی ہے اتنی ہی قیدیں انسانی ضمیر پر عاید کر دیتی ہے! ہم محرومیوں کی حق تلفیوں کو ختم کر کے حقوق حاصل کرتے ہیں، لیکن دوسرے ہی قدم پر ہمارے یہ حقوق ہماری "ذمہ داریاں" بن جاتے ہیں! ع

خود بخود آزاد بودی، خود گرفتار آمدی!

پس ہم کو بڑے احتسابِ نفس کی ضرورت ہے! ہم ماضی کے مصلح ہیں، اور مستقبل کے امین! اس ۱۹۳۸ء میں اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم شترِ بیمہار غوغا کو اک خوش عنان فرسِ مراعات میں تبدیل کر دیں! انسانی تہذیب کی شاہ گام رفتار ایسی ہی ہونی چاہیئے! ترقی کے معنی ہیں اک خاموش انقلاب کی سبک روی!

پس اے واضعانِ قوانین اور اے شہریانِ ریاست! آؤ اک سینۂ بے کینہ پیدا کریں! آؤ سارے زخموں کو مندمل کریں! ہر آتشِ عداوت

کو سمجھا دیں!، باہمی نفرت و عناد پر غالب آکر ہی ہم جنگ کو پا بزنجیر کر سکتے ہیں! آؤ ہر ممکن حادثے کو ہر ممکن پیش بندی سے روکیں! مستقبل کے غیر مشہود عالم میں ہمارا داخلہ ان مکروہات کے بغیر ہی کچھ کم دشوار نہیں ہے! ہیں اُن لوگوں میں ہوں جو غیر معلوم مستقبل پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں! لیکن اس شرطِ ناگزیر کے ساتھ کہ ہم اِس دَورِ زرّیں کے مہمانِ عزیز کے لئے زیادہ سے زیادہ اپنے صحنِ دل کی رُفت و روب کریں!

آؤ، اپنے انسانی جمال و جلال کی ایک ایک رگ کو جُنبش میں لے آئیں!!

آؤ، قوموں کے مشتعل جذبات پر صلح و آشتی کا مرہم تبرید رکھیں!

آؤ، قلوبِ انسانی کو اخوت کے پیام کی زُلفِ گرہ گیر کا اسیر کر لیں۔

آؤ، اِس حقیقت کو اپنے اُفقِ قلب سے کبھی اوجھل نہ ہونے دیں کہ ہم اک عظیم ماضی اور اک عظیم تر مستقبل کے مابین اک "برزخ" واقع ہوئے ہیں، پہلی چیز "انقلابِ فرانس" ہے، دوسری چیز "انقلابِ یورپ"!

کب آئے گا؟

"وعدہ خلاف" "وعدۂ فردا" کب آئے گا؟ — یارب وہ میرا بھولنے والا کب آئے گا؟

وہ منتہائے ذوقِ تمنا کب آئے گا؟ — فردوسِ دل بہشتِ نظارہ کب آئے گا؟

جانِ ادا و نازِ سراپا کب آئے گا؟ — میری طرف نہ دیکھنے والا کب آئے گا؟

وہ جس کے پاس بیٹھنا فردوس ہے مجھے — وہ مجھ سے دُور بیٹھنے والا کب آئے گا؟

دل ہے بجھا بجھا سا، تمنا اداس، اُداس — وہ جانِ دل، وہ جانِ تمنا کب آئے گا؟

کب تک رہے گا سلسلۂ اشک متصل — ان آنسوؤں کا پونچھنے والا کب آئے گا؟

ہنس ہنس کے لوگ دیکھیں گے کبتک مری طرف — وہ مسکرا کے دیکھنے والا کب آئے گا؟

آتا ہے جس سے دل میں زمانہ بہار کا — یارب بہار کا وہ زمانہ کب آئے گا؟

کاندھے پہ زلفِ ناز کی موجیں لئے ہوئے — وہ سروِ گلستانِ تمنا کب آئے گا؟

وہ جس کا ہر نشانِ قدم صد بہارِ خلد — وہ پیکرِ بہارِ سراپا کب آئے گا؟

اس میری جانکنی کی قسم ہے تجھے صبا — اُس جانِ انتظار سے کہنا کب آئے گا؟

بسمل، پھر آئے گا وہ ضرور آئے گا، مگر!
اب اُس کو یاد "وعدۂ فردا" کب آئے گا؟

بسمل سعیدی جوشی، ٹونک راج

افواہیں!

مصلح الدین احمد اسیر

(مسز ہیرم اینڈ اسکیرم کے منیجر مسٹر تھامس بورسل اپنے دفتر سے ذرا دیر سے گھر پہونچتے ہیں، اُن کی بیوی اُن کی دیر رسی پر باز پرس کرتی ہے وہ اُس کے جواب میں مسکرا کر چپ ہو جاتے ہیں)

بیوی - پیارے! آج تم غیر معمولی تاخیر سے آئے؟

بورسل - ہاں پیاری،

بیوی - کیوں؟

بورسل - کوئی خاص بات نہیں، دفتر ہی میں دیر لگ گئی،

بیوی - (ذرا جھنجھلاہٹ سے) آخر اِس کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟

بورسل - (ذرا بے صبری سے) چونکہ آج مہتمم کو ایک نوخیز لڑکی سے ملاقات کرنا تھی، اس لئے میں بھی بیٹھا رہا۔

بیوی، نوخیز لڑکی؟

بورسل، ہاں، وہ اُس کے ہمراہ دیر تک رہی اور میں مہتمم سے پیشتر کسی صورت دفتر سے اُٹھ ہی نہ سکا۔

بیوی، (اپنے ہونٹ پھلا کر) میرا خیال تھا کہ تمہارا دفتر ایک مہذب ادارہ ہے، آخر وہاں مہتمم کو ایک لڑکی سے کیا تعلق؟

بورسل، مجھے کچھ خبر نہیں، غالباً وہ اس کو رکھنا چاہتا ہے، کیونکہ ہمارے محرر منشی کے متعلق کچھ شکایتیں پہونچی ہیں۔ لیکن میں ٹھیک طور پر ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا

بیوی، لیکن تمہارا مہتمم تو شادی شدہ ہے؟

بورسل، تو اس سے کیا ہوتا ہے ـــــ مگر پیاری ڈارس یہ ایک دفتری راز ہے اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔

(دونوں اندر چلے جاتے ہیں)

(۲)

(مسز ڈارس بورسل، اپنے بالاخانہ پر کھڑی ہوئی اپنی پڑوسن مسز اسنیپٹ سے باتیں کر رہی ہیں)

ڈارس، کیا تم میرے شوہر کے مہتمم مسٹر ہمیلٹن سے واقف ہو؟

اسنیپٹ، ہاں، کیوں کیا بات ہے؟

ڈارس، دراصل مجھے تم سے یہ بات نہ کہنی چاہیئے مگر مجھے تم پر اعتبار ہے کہ تم اس کو راز رکھوگی،

اسنیپٹ، (اشتیاق سے) ہاں، ہاں قطعی، کیا معاملہ ہے؟

ڈارس، وہ منسوب ہو گیا ہے، وہ لڑکی اُس کی محرر منشی ہونیوالی ہے۔

اسنیپٹ۔ تم ایسا مت کہو، وہ تو شادی شدہ ہے،

ڈارس، تو اس سے کیا ہوتا ہے، مگر دیکھو قطعی اس کو راز رکھنا،

اسنیپٹ، ہاں ہاں عزیز من قطعی۔

(۳)

(مسز اسنیپٹ، مسز ہاوارڈ روس اسٹنٹ بیک سے راستہ میں ملتی ہے)

اسنیپ، عزیزو صبح بخیر،
ہاولر، واسٹف بیک، صبح بخیر مسز اسنیپ،
اسنیپ، تم لوگوں سے آج بہت دلوں کے بعد ملاقات ہوئی ،
ہاولر، تم بھی تو عید کا چاند ہو گئی ـــــ کوئی تازہ خبر؟
اسنیپ، کوئی خاص بات نہیں صرف ـــــ لیکن مجھے تم سے نہیں کہنا چاہیے۔ کیونکہ مجھے تم سے نہیں کہنا چاہیے۔ کیونکہ میں نے اُسے راز رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔
اسٹف بیک، اللہ، اللہ، مسز اسنیپ،
ہاولر، آخر وہ کیا ایسا عجیب راز ہے؟
اسنیپ، نہیں کوئی عجیب راز تو نہیں ہے، میں سمجھتی ہوں کہ اس معاملے میں مجھے تم پر اعتبار کرنا چاہیے، آہ آئیوی بٹن۔
ہاولر، عزیز من، کیوں وہ کس حال میں ہے؟
اسنیپ، مسٹر بٹن اس کے شوہر نے ایک خاتون رکھ لی ہے، اس کا ارادہ ہے کہ آئیوی کو طلاق دے کر اسی کے ساتھ شادی کرلے، فی الحال تو وہ اس کی محرر منشی کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ ـــــ لیکن دیکھو اس کو قطعی کسی پر نہ کہنا۔
ہاولر واسٹف بیک (بیک دم) آہ دنیا کا بھی عجیب رنگ ہے،
اسنیپ، دیکھو کسی سے کہنا نہیں کہ یہ بات تم کو مجھ سے معلوم ہوئی۔
ہاولر، نہیں،
اسٹف بیک قطعی نہیں،
(وہ دونوں مختلف شاہراہوں پر روانہ ہو جاتی ہیں)

(۴)

(مس اسٹف بیک "مسز براڈ کاسٹ" سے ملتی ہے، دونوں آخرالذکر کے یہاں بیٹھی ہیں، کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد مس اسٹف معنی خیز ہنسی ہنستی ہے)
براڈکاسٹ، عزیزم یہ بے وجہ ہنسی کیسی؟
اسٹف بیک، نہیں کچھ نہیں، مجھے صرف دنیا پر ہنسی آتی ہے۔
براڈکاسٹ، کیا دنیا نے تمہیں بھی کوئی چرکا دیا؟
اسٹف بیک، مجھے؟ نہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ مرد کس قدر مکار ہوتے ہیں، مجھے تو عزیب آئیوی کے حال پر ترس آتا ہے،
براڈکاسٹ، تو یہ کہو کہ تم بھی اس راز سے واقف ہو، مسز لورسل، اور ڈنیس اسنیپ، سے مجھے بھی معلوم ہوا تھا، مگر خبر نہیں کہ طلاق کی کارروائی کا کیا حشر ہوا!
اسٹف بیک، تو اس کے یہ معنی ہیں کہ تم کل قصہ سے واقف نہیں ہو، مجھے تو اندرونی حالات بھی معلوم ہوئے ہیں کہ طلاق منظور ہو چکی ہے،
براڈکاسٹ، اس قدر جلدی؟ افسوس عزیب آئیوی اب کیا کرے گی۔
اسٹف بیک، یقیناً اس کی بسر اوقات کے لئے کچھ گزارہ مقرر کرا دیا جائے گا۔
(مس اسٹف بیک رخصت ہوتی ہے)

(۵)

(زنانہ دارالتفریح میں چند خواتین آپس میں گفتگو کر رہی ہیں، مسز آئیوی بیٹن کے آتے ہی سب کی سب بیک دفعہ خاموش ہو جاتی ہیں، وہ سب کو سلام کرتی ہے اور کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)
ایک خاتون (دوسری خاتون کی جانب آنکھ مارتے ہوئے) آہ مسز بٹن کہو تم یہاں سے کب رخصت ہو رہی ہو؟ ہم لوگ ابھی تمہاری ہی مشکلات کا ذکر کر رہے تھے،
بٹن، میرے مشکلات کیسے؟ میں تو ان دنوں کہیں باہر نہیں جا رہی ہوں،
دوسری خاتون، ہاں، مگر ہم لوگوں نے خیال کیا کہ اب تم بیچاری شاید اپنے باپ کے پاس شیفیلڈ ہی چلی جاؤ گی۔
بٹن، کیوں خیریت ہے؟ میں شیفیلڈ کیوں جانے لگی، میں تو یہاں خدا کے فضل سے بہت مزے میں ہوں۔
تیسری خاتون، بہت مزے میں، اس واقعے کے بعد بھی؟ جو ابھی ابھی ہم لوگوں نے سنا ہے،
بٹن، کیا تم لوگوں نے سنا ہے آخر کچھ میں بھی تو سنوں؟
پہلی خاتون، یہی تمہاری تکالیف کے متعلق۔ افسوس عزیز آئیوی، ہم لوگ سب تمہارے غم میں شریک ہیں،
بٹن، میری سمجھ میں تو مطلق نہ آیا کہ تم کیا پہیلیاں بجھا رہی ہو،
چوتھی خاتون، ہم لوگوں کو معاف کرو۔ ہم لوگوں نے سنا ہے کہ تمہارے شوہر نے تم کو طلاق دیدی ہے اور انھوں نے اپنی محرر منشی خاتون کے ساتھ

عقد کر لیا ہے،

تیسری خاتون، ہم لوگوں کو یہ معلوم کرکے مسرت ہوگی کہ یہ خبر صحیح نہیں ہے۔

بٹین، (دانت پیس کر) تم لوگ سب او ندھی عقل کی ہو، طلاق بھی کیا کوئی کھیل ہے، میرے شوہر کی پشتی میں کوئی خاتون نہیں ہے، تم سبھوں کی ملی بھگت ہے،

(اور غصہ میں اُٹھ کر چل دیتی ہے)

(۶)

(مسٹر بٹین جب دفتر سے گھر واپس آتے ہیں تو دروازہ پر بیوی کو معمولی استقبال کرتے ہوئے نہ پاکر عجلت کے ساتھ بالا خانے پر جاتے ہیں جہاں اُن کو بیوی اپنے آرام کمرے میں روتی ہوئی ملتی ہے،)

بٹین، پیاری تم کو کیا تکلیف ہے؟

بیوی، ہٹ مکار،

بٹین، (پریشان ہو کر) آئیں میں نے کیا کیا؟

(بیوی اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے، اور جو کچھ اُسے دار التفریح میں پیش آیا تھا سب رو رو کر اپنے شوہر کو سناتی ہے)

بٹین، (جھنجھلا کر) لغو، دار التفریح کی وہ مردار یں یقیناً ذبح کر دینے کے قابل ہیں، اس میں ذرا بھی حقیقت نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ کیونکر یہ قصہ بنا گیا ہے، سر دفتر نے مس ڈاکٹ کو ہماری شاخ میں نئی ایجنسی کے قیام کے متعلق گفتگو کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ کل وہ کلکتے رخصت ہو رہی تھیں، میں اُن کو اُن کے ہوٹل تک پہونچانے کے لئے بیشک گیا تھا، اوہ! کس قدر غلط افواہیں اُڑائی جاتی ہیں،

(مسز بٹین آنسو پونچھتی ہوئی اُٹھ کر اپنے شوہر کے ساتھ اُن کے دار المطالعہ میں جاتی ہیں، جہاں نئی ایجنسی سے متعلق وہ کل پوشیدہ خط و کتابت دیکھ کر اپنا اطمینان کرتی ہیں)

بیوی، اے میری پیارے کس خوفناک دنیا میں ہم نے جنم لیا ہے،

مسٹر بٹین، بیشک کچھ عجیب دنیا ہے، تم کو چاہئیے کہ جو کچھ سنو اُس پر مطلق اعتبار نہ کرو، اور جو کچھ دیکھو اُسے آدھا ہی تسلیم کرو۔

تجاہلِ عارفانہ

کیوں صبح یوں عرق میں نہلائے ہوئے ہو تم — شاید کسی خلش کے جگائے ہوئے ہو تم

الجھا ہوا ہے کرب سے ہر رشتۂ نفس — گو دیکھنے میں زلف بنائے ہوئے ہو تم

جن مشغلوں سے کھیلتی رہتی تھی کم سنی — اُن مشغلوں سے ہاتھ اٹھائے ہوئے ہو تم

شاید یہ اہتمام ہو اخفائے راز کا — ہمجولیوں سے آنکھ چرائے ہوئے ہو تم

خود کو لئے ہوئے ہو مگر کہہ رہے ہیں طور — سینے میں ایک حشر چھپائے ہوئے ہو تم

کیا جوشؔ نامراد کو دیکھا ہے خواب میں
یوں صبح کو جو شام بنائے ہوئے ہو تم

جوش ملیح آبادی

بلاکش بحر

ایک خلوت پسند انسان

وکٹر ہیوگو

گلیٹ گرنیز کا ایک باشندہ تھا جس سے اُس کی خلوت پسندی وفطرت پرستی کے باعث جسے بالعموم شیطانی چیز سمجھا جاتا ہے، لوگ محترز رہا کرتے تھے، ایک دن یہ مچھلی کے شکار سے واپس آرہا تھا۔ سمندر کی موجیں چڑھ رہی تھیں کہ یکایک اسے سامنے سمندر میں ایک چٹان پر کسی انسانی سائے کا دھوکہ ہوا۔

گلیٹ اس منظر کو دلچسپی سے دیکھنے لگا، ایسی جگہ اسے نہایت مرغوب تھی، پہاڑ کی بلند چٹانوں کے درمیان قدرت کی تراشی ہوئی ایک ایسی نشستگاہ جہاں سمندر کے دلکش مناظر بلا روک حدود نظر میں آسکیں، یہ ایسی جگہ تھی جہاں ایک قیدِ منزل سے آزاد مسافر ساحل سے ہوتا ہوا مسرت کے ساتھ مناظر کے کھلے ہوئے دریچے میں بیٹھ جائے اور محویت کے عالم میں سمندر کی چڑھتی ہوئی موجوں کے خطرہ کو بھی بھول جائے، یہاں تک کہ سلامتی کا دروازہ اس پر بند ہو جائے، اس خاموش شیطانی کرسی سے چیخ پکار کی رسائی کسی انسانی کان تک ناممکن تھی۔

گلیٹ اپنی کشتی اس چٹان کے قریب لے گیا، اس نے دیکھا کہ چٹان پر یہ سایہ واقعی ایک انسان کا تھا،

اب سمندر کافی چڑھاؤ پر تھا، چٹان کے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا، گلیٹ اور زیادہ قریب ہو گیا، اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی سو رہا ہے، وہ سیاہ لباس میں ملبوس ایک پادری معلوم ہوتا تھا جس کو گلیٹ نے اس سے پیشتر کبھی نہیں دیکھا تھا، گلیٹ چٹان کے دامن کے ارد گرد چکر لگاتا ہوا چوٹی کے اس قدر قریب پہونچ گیا کہ وہ اپنی کشتی پر کھڑا ہو کر اس معروفِ خواب انسان کے پاؤں کو چھو سکتا تھا، چنانچہ وہ اُس کو جگانے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ آدمی اٹھا اُس نے آہستہ سے کہا "میں جستجو میں تھا"۔

گلیٹ نے اسے اپنی کشتی میں کود پڑنے کا اشارہ کیا، جب وہ اس انسان کو جو کسی قدر نسائی بناوٹ کا جسم اور شفاف آنکھیں رکھتا تھا، ساحل پر اُتار چکا تو گلیٹ نے دیکھا کہ وہ نہایت گورے ہاتھ سے ایک ساورن پیش کر رہا ہے، گلیٹ نے زمی کے ساتھ اس کا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا ایک لمحہ کے سکوت کے بعد وہ نوجوان سلام کرتا ہوا چلا گیا۔

گلیٹ اس اجنبی شخص کو بالکل بھول چکا تھا کہ کسی آواز نے اس کا خیر مقدم کیا، یہ اسی کے گاؤں کا ایک باشندہ تھا، جو جلدی جلدی اُس کی طرف آرہا تھا،

"گلیٹ! پرویز پر ایک ہنگامہ ہو رہا ہے" اُس نے ہانپتے ہوئے کہا،

"کیا معاملہ ہے ؟"

میں جلدی میں بیان نہیں کرسکتا۔ جلدی واپس جاؤ، تمہیں سب علم ہو جائے گا۔

پرویز لیتھری کے مکان کا نام تھا جس نے گرنیز اور نارمنڈی کے سواحل کے درمیان پہلی دفعہ سٹیم کے جہاز کا سلسلہ جاری کرکے اپنی مالی حالت کو مضبوط بنا لیا تھا، اُس نے اپنے جہاز کا نام لاڈ یورینڈ رکھا تھا، دیہات کے باشندوں میں جو اس مہیب شے کو شیطانی ایجاد تصور کرتے تھے، یہ جہاز شیطانی کشتی کے نام سے مشہور تھا، لیکن ڈیورینڈ ان دونوں بندرگاہوں کے درمیان بلا خوف وخطر آتا جاتا رہا جس سے لیتھری کی امارت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا، اُسے تمام دنیا میں اس جہاز سے زیادہ کوئی شے عزیز نہ تھی، البتہ اس کے بعد وہ اپنی بھانجی ڈراوچیٹ کو عزیز رکھتا تھا جو اُس کے گھر کی منتظمہ تھی،

ایک دن گلیٹ برف سے ڈھکی ہوئی سڑکوں پر ٹہل رہا تھا، ڈراوچیٹ دوسری چٹان پر اس کے سر کی بلندی پر تھی، وہ ایک لمحہ کے لئے رک گئی اس نے جھک کر اپنی انگلی سے برف پر کچھ لکھا اور چلی گئی، جب یہ ماہی گیر وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس ننھی سی شوخ جان نے اسی کا نام لکھا تھا، اس لمحہ کے بعد گلیٹ اپنی زندگی کی گہری خلوتوں میں ہمیشہ ڈراوچیٹ کے خیال میں محو رہنے لگا۔

اب پرویز پر ہنگامے کی خبر سنتے ہی اس خلوت پسند انسان نے لیتھری کے مکان کا رُخ کیا جو ڈراوچیٹ کا آشیانہ تھا، ہنگامے کی تشریح بہت جلد کر دی گئی، ڈیورینڈ دھند کے بادلوں میں خوفناک چٹانوں کے ساتھ ٹکرا کر تباہ ہو گیا تھا، البتہ اس کا انجن ابھی تک شکستگی سے محفوظ تھا، اب اگرچہ تمام جہاز کو بچا لینا تو ناممکن تھا، لیکن انجن کو بچا لینا ممکن ہو سکتا تھا، یہ انجن بے نظیر تھا، اسی قسم کا دوسرا تیار کرانا روپیہ کا دریا بہانا تھا، اور پھر اُس کے معمار کی تلاش اس سے بھی زیادہ مشکل تھی، اس کا معمار مر چکا تھا، اور مشینری دو ہزار پونڈ کی لاگت سے تیار ہوئی تھی، اب اگر کوئی ناقابل عمل اور خلوت فہم خیال دماغ میں آسکتا تھا تو وہ انجن کو بچانے کا تھا، جو اس وقت ڈوریز کی چٹانوں میں پھنسا ہوا پڑا تھا، ان چٹانوں پر کسی ملاح کو کام کرنے کے خیال سے بھیجنا فضول تھا، یہ بحری طوفانوں کا موسم تھا، علاوہ ازیں سمندر کے درمیان چٹان کی بلند ترین چوٹی پر مشکل ایک آدمی کے کھڑے ہونے کی جگہ تھی، لہٰذا جہاز کو بچانے کے لئے صرف ایک آدمی ڈوریز پر جا سکتا تھا، جہاں وہ سمندر کے درمیان ساحل سے پانچ میل کے فاصلے پر ہفتوں تنہا رہ کر کام کرے، بالکل تنہا، اس ہیبت ناک خطہ میں ہر طرح کے خطروں کے مقابلہ کے لئے، بھوک اور عریانی کی صورت میں بالکل ناچار، جہاں اس کا موت کے سوا دوسرا کوئی ساتھی نہ ہو۔

ایک ملاح نے الستادہ ہو کر فیصلہ سنایا۔

"نہیں اب کام تمام ہو چکا ہے، اس وقت وہ آدمی زندہ نہیں ہے، جو وہاں جاکر ڈیورینڈ کے انجن کو بچا سکے۔"

"اگر میں نہیں جاتا" ڈیورینڈ کے انجینیئر نے کہا "تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اب یہ کام انسانی طاقت سے باہر ہے،

"اگر ایسا شخص زندہ ہو۔۔۔۔۔۔" ملاح نے اپنی تقریر کو پھر جاری کیا۔

ڈراوچیٹ نے فوراً اس طرف رُخ کرکے ملاح کی بات کو کاٹ دیا،

"تو میں اس سے شادی کرلوں۔" اس نے معصومانہ انداز سے کہا پھر ایک سکوت طاری ہو گیا، ایک آدمی مجمع کو چیرتا ہوا اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا، لیکن زرد اور متفکر "تم اس سے شادی کرلوگی ڈراوچیٹ!"

اس نے شوق سے پوچھا، یہ گلیٹ تھا، سب کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں، لیتھری نے بھی اُسے دیکھا، اس کی آنکھیں محبت سے چمک رہی تھیں، اس نے اپنی بحری ٹوپی کو اُتار کر فرش پر رکھدیا، پھر استقلال کے ساتھ سامنے دیکھا اور مجمع کا خیال نہ کرتے ہوئے کہنے لگا "تو ڈراوچیٹ اس کی ہوگی"

"میں اس کام کا بیڑا اُٹھاتا ہوں"

چٹانوں کی دو عمودی دیواروں میں تباہ شدہ جہاز کا باقی حصہ دروازے کی ڈاٹ کے مانند سختی سے پھنسا ہوا تھا، اس کا وحشت انگیز خاکہ شفاف آسمان کے نیچے بالکل صاف نظر آرہا تھا، جب گلیٹ اپنی دخانی کشتی میں وہاں پہنچا۔

یہ چٹانیں اپنے شکار کو دبوچے ہوئے نہایت ہیبت ناک نظر آتی تھیں، ان کی وضع میں ایک دھمکی کا انداز تھا، وہ اپنے وقت کی حکمران نظر

آتی تھیں، اس سے زیادہ غرور اور تکبر کے منظر کا تخیل پیدا نہیں ہو سکتا تھا،

شکست خوردہ جہاز، فتحمند عمیق خلیج ـــــ گزشتہ روز کے طوفان کے باعث دونوں چٹانوں سے دھارے اس طرح اُبل رہے تھے، جیسے دو پہلوانوں کے جسم سے پسینہ بہ رہا ہو جو ابھی ابھی پیکار سے فارغ ہوئے ہوں۔ دماغ اُنھیں پانی سے باہر نکلے ہوئے دو شیطانی بازو تصور کرتا تھا، جو سمندر کے طوفانوں کو تباہ شدہ جہاز کا مشاہدہ کرا رہے ہوں، اگر گلیٹ کو جہاز کی تباہی کی وجہ معلوم ہوتی تو وہ اس ہیتناک منظر سے اور بھی زیادہ متاثر ہوتا، تباہی کی وجہ ایک حادثہ کے باوجود ارادہ پر مبنی تھی۔

کلبن یعنی اس جہاز کے عیّار کپتان نے جہاز سے روپیہ اُڑا لیا۔ اب اسکی پیٹی میں تین ہزار پونڈ تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ ساحل سے ایک میل کے فاصلہ پر جہاز ہینوویز میں ڈال کر غرق کر دے اور جب مسافر کشتیوں کے ذریعے ساحل پر چلے جائیں تو یہ جہاز کے ساتھ ہی ڈوبنے کا ارادہ ظاہر کر کے کچھ دیر ڈیورینڈ میں توقف کرے اور بعد میں تیر کر ساحل پر پہونچ جائے، جہاں سے کشتی لے کر مشرق کی جانب فرار ہو جائے، اس کے مختصر ڈرامہ کے عمل کی تکمیل ہو چکی تھی، ہر ایک کپتان کلبن کے ایثار کی تعریف کرتا ہوا چلا گیا ـــــ جب ڈھندلکا صاف ہو گیا تو کلبن کے خوف کی انتہا نہ رہی، اُس نے دیکھا کہ وہ ہینوویز کی بجائے ڈاوریز پر تھا، جہاں سے ساحل ایک میل نہیں بلکہ پورے پانچ میل تھا،

کلبن نے دور سے ایک جہاز کو دیکھا، اس نے تیر کر دوسری چٹان پر پہنچنے کا ارادہ کیا، جہاں سے وہ جہاز والوں کو نظر آ سکے، اس نے اپنے چمڑے کی پیٹی کے سوا تمام کپڑے اتار کر عرشۂ جہاز پر رکھدئے اور سر کے بل سمندر میں کود پڑا، چونکہ وہ بلندی سے گرا تھا وہ پانی کی تہ تک پہونچ گیا، اس نے سمندر کی تہ کو محسوس کیا، ایک لمحہ کے لئے وہ زیر آب چٹانوں کے گرد پھرا، پھر دوبارہ سطح آب پر آ گیا، اسی وقت اس نے محسوس کیا کہ اس کا ایک پاؤں کسی چیز کے پنجے میں ہے،

لیکن جب گلیٹ ڈوریز پر پہونچا تو وہ اس حقیقت سے مطلق آگاہ نہ تھا، وہ تباہ شدہ جہاز کے منظر کو دیکھکر حیرت میں تھا، اس نے دیکھا کہ ڈیورینڈ کی مشینری بالکل محفوظ تھی، جس کو سمندر نے آہستہ آہستہ منہدم کرنے کے لئے بچا لیا تھا جس طرح ایک بلّی اپنے شکار سے کھیلتی ہے یہ بحری امواج کی وحشیانہ دل لگی کے لئے ایک کھلونہ بنا ہوا تھا، اب کوئی صورت نہ تھی، مشینری کا بلاک جو بیک وقت وزنی اور نازک بھی تھا اپنے بوجھ سے دو چٹانوں کے درمیان پھنس چکا تھا، اور اُسے اس عالم سکوت سے نکال کر ساحل تک لے جانے کا خیال بھی دیوانگی معلوم ہوتا تھا،

گلیٹ نے اپنے بدن کا جائزہ لیا۔

جب وہ اپنے بیٹھنے کی جگہ بنا چکا تھا اُسے معلوم ہوا کہ وہ اپنی خوراک کی ٹوکری کھو چکا ہے، اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی،

ڈیورینڈ کے انجن کو چٹانوں سے نکالنے کے لئے جن میں وہ تین چوتھائی سے زیادہ دھنس چکا تھا، ایک پورے لشکر کی ضرورت تھی اور گلیٹ بالکل تنہا تھا، یہاں بڑھئی کے پورے ہتھیار اور انجنیئر کے پورے اوزار درکار تھے، لیکن گلیٹ کے پاس صرف آری چھینی، کلہاڑی اور ایک ہتھوڑا تھا، اس کو ایک پورے ورکشاپ کی ضرورت تھی، لیکن وہاں سائے کے لئے چھت بھی نہ تھی، اس خشک چٹان پر خوراک بھی ضروری تھی، لیکن اس کے پاس سوکھی روٹی تک نہ تھی،

پہلا ہفتہ اس نے شکستہ جہاز کے کارآمد منتشر ٹکڑوں کو فراہم کرنے میں گزرا، وہ ہر ایک چٹان پر پھرا اور ہر وہ چیز سمندر کی موجوں نے چٹانوں پر پھینکی تھی اکٹھا کرتا رہا، گلے ہوئے کپڑوں کی دھجیاں، لوہے کے ٹکڑے، چولوں کے پُرزے، منتشر تختے، ٹوٹی ہوئی سلاخیں، کہیں سے زنجیر کہیں سے چرخی، الغرض جو کچھ ملا اکٹھا کرتا رہا، اس نے سیپوں کے کیڑوں اور پانی پر گزارا کیا، وہ چنگھاڑتے ہوئے بحری شیروں اور اڑتے ہوئے اژدہوں کے نرغے میں گھرا ہوا تھا، شوریدہ موجوں کی آواز اس کے کانوں سے کبھی جدا نہیں ہوئی، وہ دن کو دُھوپ کی بھٹی میں تپتا اور شب کو بسیط سمندر کی یخ کر دینے والی سردی سے سُن ہو جاتا، اور ہر وقت بھوکا پیاسا رہتا تھا۔

ایک دن چٹان کے گوشوں میں پھرتا ہوا گلیٹ ایک غار میں پہنچ گیا جو بحری پھولوں سے لدی ہوئی سمندر کی دیوی کی خلوت گاہ معلوم ہوتی تھی، یہاں سیپیاں جواہر کی طرح چمک رہی تھیں۔ پانی میں چاند کی روشنی مرتعش تھی، اکثر پھول سبزے کی مانند تھے، ایک عمیق گڑھے کے کنارے کھڑے ہوئے شفاف پانی میں گلیٹ نے اچانک ایک طلسمی چیز کو بڑھتے ہوئے

دیکھا، ایک گول گول شے جھومتی ہوئی موجوں میں حرکت کر رہی تھی، یہ تیرتی نہیں تھی، بلکہ پھلانگ رہی تھی، اس وقت یہ ایک مقصد کے ساتھ ایک طرف تندی سے بڑھ رہی تھی، اس کی مشابہت ایک کھلونے کی مانند تھی، جس کی لوکدار لٹکتی ہوئی شاخیں موجوں میں تہ و بالا ہو رہی تھیں، یہ کیچڑ سے اس طرح ڈھکی ہوئی نظر آتی تھی، جس پر پانی کا مطلق اثر نہ ہو سکے۔ وہ غار کا تاریک ترین پہلو تلاش کر رہی تھی، جہاں وہ بالآخر غائب ہو گئی۔

گلیٹ اپنے کام پر واپس آگیا۔ لیکن اس کے دل میں یہ ہیبت ناک منظر ہر وقت تازہ رہتا۔ انتہائی جانفشانی کے بعد مشینری کشتی میں اتارنے کے لئے تیار ہو گئی۔ گلیٹ نے ایک کنڈا تیار کیا، اس کی طویل مشقت کامیابی سے بدل چکی تھی، اب دوسرے روز وہ گرنیز کو لوٹ جانے والا تھا، لیکن نہیں اس نے انتظار کیا، کہ موجیں کشتی کو آویزاں انجن کے قریب ترین لے آئیں، وہ بھیڑ کی کھال اوڑھ کر سو گیا۔

جب وہ اُٹھا تو طوفان کی آمد آمد تھی، اب اس کھائی کو چڑھتی ہوئی موجوں سے بچانے کے لئے ایک فصیل ضروری تھی، اس نے ڈیورینڈ کی ساخوں، ٹوٹے ہوئے تختوں کو اکٹھا کر کے خدائی غضب سے بچاؤ کا سامان کیا — ۔

جب غضبناک طوفان کا چڑھاؤ کم ہو گیا گلیٹ بھوک سے دیوانہ ہو رہا تھا، اس نے اتری ہوئی موجوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مچھلی کی تلاش میں نکلنے کا ارادہ کیا۔ وہ نیم عریانی کی حالت میں دانتوں میں چھُرا دبائے ہوئے ایک ایک چٹان پر بھاگ رہا تھا، اچانک اُس نے اپنے آپ کو دوبارہ اسی غار میں پایا جو جواہر کے مانند چمکتے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی تھی، اس نے پانی کی سطح پر ایک شگاف میں ایک مچھلی کو دیکھا، اس نے فوراً اپنا ہاتھ پانی میں ڈال دیا اور تاریکی میں زیر آب ٹٹولنے لگا، دفعتہً اُس نے اپنے بازو کو کسی چیز کے پنجے میں جکڑا ہوا محسوس کیا۔ اس پر ایک عجیب ہیبت طاری ہو گئی۔

ایک باریک کھردری چپٹی سی ٹھنڈی اور لیسدار چیز اس کے بازو پر لپٹ چکی تھی جو اس کے سینے کی طرف رینگتی جاتی تھی، اس کا دباؤ ایک نسی کے مانند تھا، اور اس کا متواتر بڑھتے جانا جسم پہ ایک برمے کی طرح محسوس ہوتا تھا، ایک لمحے کے اندر اندر یہ بل کھاتی ہوئی چیز اس کی کلائی اور کہنی سے گزر کر شانے تک پہونچ چکی تھی اور ایک تیز نوک اس کی بغل میں کھُب گئی۔

گلیٹ لرز گیا۔ لیکن اس کو ہلنے کی تاب نہ تھی، وہ اسی جگہ پر گڑ گیا، اُس نے اپنے بائیں ہاتھ سے جو ابھی تک آزاد تھا چھُرا پکڑ کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی، لیکن بحری بلا نے اپنا قبضہ اور بھی مضبوط کر لیا، یہ چمڑے کی مانند نرم لوہے کی مانند مضبوط اور رات کی مانند ٹھنڈی تھی۔

ایک دوسری شکل، تیز اور سکڑی ہوئی شگاف سے اس طرح برآمد ہوئی جیسے ایک اژدھے کے منہ سے زبان پہلے وہ اس کے ننگے جسم کو چاٹتی ہوئی محسوس ہوئی پھر یکایک باریک اور طویل ہو کر اس کے جسم کے گرد لپٹ گئی، شدید درد کی وجہ سے گلیٹ کے جسم کے تمام پٹھے اکڑ گئے، اُس نے اپنے جسم پر کئی نشتر چبھتے ہوئے محسوس کئے، اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کئی ہزار جونکیں اُس کے جسم پر چمٹ کر اس کا چوس رہی ہوں۔

ایک تیسری لمبی متحرک شے سوراخ سے باہر آئی، اور اُس کے بدن کو ٹٹولتی ہوئی اُس کی پسلیوں کے گرد رسّی کی مانند مضبوطی سے لپٹ گئی، گلیٹ ان تمام اشکال کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا —— ایک اور چیز تیر کی طرح تیزی سے اُس کے پیٹ پر حملہ آور ہوئی۔

یہ جاندار چیزیں جا بجا اُس کے جسم کے گرد لٹکی ہوئی تھیں، اس نے دباؤ کے مقامات پر خون چوستے ہوئے جبڑوں کو محسوس کیا، جو ہر لحظہ اپنی جگہ بدلتے تھے۔

پھر ایک بھاری لیسدار چیتھڑے سی شکل پانی سے نمودار ہوئی، یہ اسکا وسطی حصہ تھا، جس کے اطراف پر کئی [illegible] نما زبانیں آویزاں تھیں، اس نے اس لیسدار ڈھیر کے وسط میں دو چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔

اب گلیٹ نے شیطانی مچھلی کو پہچان لیا۔

اس کے پاس صرف ایک ہی ہتھیار یعنی چاقو تھا۔

وہ جانتا تھا کہ یہ خوفناک عجیب الخلقت بلائیں صرف ایک مقام سے زخم پذیر ہو سکتی ہیں، اس کے جسم کا ایک ایک مقام اس سنگین گرفت میں مضروب اور مجروح ہو رہا تھا، گلیٹ نے شیطانی مچھلی کی آنکھوں کو دیکھا اور شیطانی مچھلی گلیٹ کی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔

شیطانی مچھلی کے مقابلے میں بیل کے مقابلے کی طرح ایک ایسا وقت

ہوتا ہے جب اُن پر قابو پالینا چاہیئے، یہ موقعہ اس وقت ہوتا ہے جب
بیل اپنا سر نیچا کرے اور شیطانی مچھلی اپنا سر اٹھائے، یہ موقعہ نہایت قلیل
ہوتا ہے۔ اور جو فریق اُسے کھو دے وہی تباہ ہو جاتا ہے،

یکایک شیطانی مچھلی نے ایک اور شاخ چٹان سے باہر نکالی،
اور اس سے گلیٹ کا بایاں بازو بھی پکڑ لیا اور ساتھ ہی اپنا سر آگے
بڑھایا۔

جتنا بھی یہ موقعہ مختصر تھا گلیٹ نے اتنی ہی تیزی سے تمام کوشش
کے ساتھ اپنا خنجر اس نرم نرم لیسدار چیز میں گھونپ کر فوراً اس کی آنکھوں
کے گرد ایک زخم کا حلقہ بنا دیا۔

تمام جونکیں بیک وقت گر گئیں اور تمام کا تمام ڈھیر پانی کی تہ میں
غائب ہو گیا۔

گلیٹ زخموں سے چور ہو چکا تھا اس نے اپنے آپ کو پانی میں
ڈال دیا۔ اس کی نظریں ایک گوشے کی جانب پہونچیں۔ وہ قریب گیا۔ یہ
کیا چیز تھی—ایک انسانی پنجر جس میں سفید ہڈیوں کے سوا کچھ باقی
نہ تھا۔—ہاں ایک چیز—ایک چمڑے کی پیٹی اور تمباکو کا ڈبہ۔
پیٹی پر گلیٹ نے کلبن کا نام پڑھا، پھر اس نے تمباکو کے ڈبے کو چاقو سے
کھول کر دیکھا، اس میں تین ہزار اشرفیاں تھیں،

جب گلیٹ اس ڈبے اور پیٹی کو لے کر اپنی کشتی کی جانب پلٹا تو
اس کے خوف کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے دیکھا کہ کشتی میں پانی بھر
رہا ہے۔ اگر وہ ایک گھنٹہ اور دیر سے آتا تو اسے پانی کی سطح پر کچھ نہ
ملتا۔ اس نے زنجیر کے ساتھ ایک ترپال کشتی میں لپیٹ کر سوراخ
بند کر دیا۔ اور کشتی میں پانی آنا بند ہو گیا۔ گلیٹ نے اپنے تمام کپڑے
سوراخ کے منہ میں پھنسا دئے۔

اس تنہا خاموش چٹان پر گلیٹ کو لاتعداد اذیتیں پہنچیں، وہ تنہائی،
بھوک، پیاس مشقت اور نیند پر فتح پا چکا تھا لیکن ایک مایوس کن چیز
کا مقابلہ ابھی باقی تھا۔ گلیٹ کی چٹان کی چوٹی پر چڑھ گیا، اور دور
دور نظر دوڑانے لگا۔ اس کے پاس کوئی لباس نہ تھا، اور وہ اس بے
پایاں سمندر کے وسط میں بالکل عریاں کھڑا تھا،

ان طوفان خیز امواج کی گونج میں جہاں اس کے نیچے بحر بے پایاں
اور سر پر بسیط آسمان تھا، اس نے تمام جد و جہد چھوڑ دی، وہ ایک
چٹان پر لیٹ گیا، اس نے نہایت آزردگی اور عاجزی سے اپنے ہاتھ
اُٹھائے، اس کی زبان کی بے ربط جنبشوں میں رحم، رحم کی پکار تھی،

جب وہ اس بے خودی کے عالم سے بیدار ہوا، تو سورج کافی
بلند ہو چکا تھا، وہ دوبارہ تازگی سے کھڑا ہو گیا، اس نے ہمت باندھی
ایک دن کی محنت سے کشتی کا سوراخ بند کیا۔ دوسرے روز وہ فراہم
کردہ چیتھڑوں سے ملبوس ڈاریز سے ساحل کی جانب چل پڑا۔

قسمت کی آخری ضرب

گلیٹ اپنے چیتھڑوں میں ملبوس رات کے وقت ساحل پر پہنچا، اور
لیتھری کے مکان کی تاریکی میں کچھ دیر تک ادھر اُدھر پھرتا رہا، پھر اُس نے ملحقہ
باغ کا رُخ کیا، وہ گھاس پر بیٹھ گیا، اور اردگرد دیکھنے لگا، باغ کے پھول
پتیاں اور مکان اس کی نظر میں تھے، اُس نے ڈراوچیٹ کے کمرے کی کھڑکیوں
کو دیکھا، اس کا تنفس بھی ایک رکاوٹ کے ساتھ جاری تھا، ان کھڑکیوں میں
ایک عجیب کشش تھی، جن میں دیکھتے رہنا اس کے لئے دائمی مسرت کا شغل تھا،

اچانک اس کی نظر ڈراوچیٹ پر پڑی،

وہ قریب آرہی تھی، کچھ فاصلے پر وہ کھڑی ہو گئی پھر چند قدم پیچھے
ہٹ کر ایک لمحہ کے لئے ٹھہر گئی اور ایک لکڑی کی بینچ پر جا کر بیٹھ گئی، چاند
درختوں کی آڑ میں تھا، زرد زرد ستاروں میں بادل کے چند ٹکڑے تیر رہے
تھے، سمندر کی موجیں زیر لب گنگنا رہی تھیں،

گلیٹ کے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی، وہ اس وقت اپنے آپ کو انتہائی
بدبخت اور بدرجہا خوش نصیب محسوس کر رہا تھا، وہ اس مخمصہ میں تھا کہ اسے کیا
کرنا چاہیئے۔ وہ ایک خوشی سے اس پر سرسام کی حالت طاری تھی، اس نے
ڈراوچیٹ کی گردن اور سنہری بادلوں کو غور سے دیکھا،

اچانک ایک آہٹ نے دونوں کو ہشیار کر دیا، کوئی شخص باغ میں
ٹہل رہا تھا، ڈراوچیٹ نے اپنی آنکھ اُٹھائی، وہ شخص قریب ہوتا گیا، اب درختوں
کی شاخیں درمیان میں اس طرح حائل تھیں کہ ڈراوچیٹ تو نو وارد کو دیکھ سکتی
تھی، لیکن گلیٹ نہیں دیکھ سکتا تھا، اُس نے ڈراوچیٹ کی طرف دیکھا،

وہ بالکل زرد ہو رہی تھی، اس کے نیم وا لب ایک حیرانی کی ہچکی کو دبائے

ہوئے معلوم ہوتے تھے،

نووارد جو صرف گلیٹ کے لئے اجنبی تھا، مصروف گفتگو ہوا، درختوں کے درمیان ایک آواز سنائی دی جو نسوانی لہجہ سے زیادہ نرم تھی، گلیٹ ایک طویل گفتگو سنتا رہا، اس کے بعد

"اے خوبصورت دوشیزہ تم غریب ہو، میں آج صبح سے امیر ہوں، کیا تم مجھے اپنا خاوند قبول کرو گی، میں تم سے محبت کرتا ہوں، خدا نے انسان کا دل خاموش رہنے کے لئے نہیں بنایا، اُس نے اس سے حیاتِ ابدی کا وعدہ اس لئے کیا ہے کہ یہ اکیلا نہ رہے، میرے لئے روئے زمین پر صرف ایک خاتون ہے اور وہ تم ہو، میرا ایمان خدا پر ہے اور امید تم پر"،

گلیٹ نے اس کو گفتگو کرتے ہوئے سنا، وہ اس سے محبت کرتا تھا، اُس کا سایہ راستے کی پٹڑی پر پڑ رہا تھا، پھر اُس نے اسی آدمی کو کہتے ہوئے سنا "دوشیزہ تم خاموش رہو میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں"

"میری آواز خدا سُن چکا ہے" ڈراوجیٹ نے جواب دیا۔

پھر وہ آگے بڑھی، اب پٹڑی پر دونوں سائے نظر آ رہے تھے، دونوں سائے مل گئے، گلیٹ نے دونوں کے عکس کو ہم آغوش ہوتے ہوئے دیکھا۔

اچانک دور سے چیخ پکار کا شور سنائی دیا "مدد، مدد" ساتھ ہی بندرگاہ کی گھنٹی بجنے لگی،

یہ لیتھری تھا، اس نے ڈیورینڈ کے نشل کو ساحل پر دیکھ لیا تھا، اس کے نظارے نے اُسے خوشی سے دیوانہ بنا دیا تھا، اور وہ مدد مدد پکارتا ہوا باہر بھاگ آیا، یکدم وہ ٹھہر گیا، اُس نے ایک آدمی کو ابھی گھاٹ سے مُڑتا ہوا دیکھا، یہ گلیٹ تھا، لیتھری لپک کر اُس سے بغلگیر ہو گیا، اور پیار کرتے ہوئے بر دیز کے زیریں کمرے میں کھینچ کر لے گیا۔

"مجھے یقین دلاؤ کہ میں دیوانہ تو نہیں"، وہ کہتا جاتا تھا "یہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ انجن کا ایک ایک پن سلامت ہے، یہ کس قدر عجیب ہے، اب صرف تیل دینے کی ضرورت ہے، تم میرے عزیز بچے ہو، بہادر بچے، تم سمندر کے وسط میں اپنی جان پر کھیل کر میرے عزیز ترین جہاز کو چٹانوں سے سلامتی کے ساتھ واپس لے آئے، میں نے اپنی زندگی میں کئی عجیب واقعات دیکھے لیکن اتنا عجیب واقعہ کبھی نہیں دیکھا۔

گلیٹ نے کلبن کی پیٹی اور ٹین کا ڈبہ جس میں تین ہزار پونڈ تھے لیتھری کو پیش کر دیا، دوبارہ لیتھری بحرِ حیرت میں غرق تھا۔ "کیا کسی نے گلیٹ کا سا شریف آدمی دیکھا ہے"۔ اس نے کہا "میں خاک میں مل گیا تھا اور بالکل تباہ ہو چکا تھا، تم نے میری حالت کو دوبارہ سنبھال دیا، ہاں تو عزیز کیا تمہیں یاد ہے کہ تمہیں ڈراوجیٹ سے شادی کرنا ہے،

گلیٹ دیوار سے اپنی کمر ٹیک کر کھڑا ہو گیا، اس نے نہایت دھیمے لیکن صاف آواز میں کہا "نہیں"۔

لیتھری چونک اُٹھا "کیسے نہیں"

"میں اس سے محبت نہیں کرتا"

لیتھری نے اس کے خیال پر انفرت آمیز قہقہہ مارا، وہ خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا، گلیٹ اور صرف گلیٹ ہی ڈراوجیٹ سے شادی کرے گا۔

اب ہمسائے بھی گھنٹی کی آواز سنکر اکٹھا ہو گئے تھے، تمام کمرہ بھر گیا تھا، اب ڈراوجیٹ بھی کمرے میں داخل ہوئی، لیتھری نے اُسے دیکھا اور ہجوم میں اسے خبر سنائی ——— "ہم دوبارہ امیر ہیں، اور تم اس بہادر سے شادی کرو گی، جس کے سر پر کامیابی کا سہرا لہرا رہا ہے" ——— اس کی نظریں ایک دوسرے آدمی پر پڑیں، جو ڈراوجیٹ کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا، یہ وہی نوجوان پادری تھا، جس کو گلیٹ نے سمندر کے وسط میں چٹان سے بچایا تھا،

"کیا آپ بھی یہاں ہیں" بوڑھے لیتھری نے کہا "آپ ان دونوں کا نکاح پڑھ دیجئے" اس نے ڈراوجیٹ اور گلیٹ کی طرف اشارہ کیا،

گلیٹ کا چہرہ اس وقت ڈراونا معلوم ہو رہا تھا وہ ابھی تک انہیں چیتھڑوں میں ملبوس تھا، جن کے ساتھ وہ ڈوریز کی چٹانوں سے چلا تھا، اسکی ننگی کہنیاں، لٹکتی ہوئی دھجیاں، پریشان بال، خون آلود آنکھیں، اس کے بدن پر جابجا ناسور، اس کے خراشوں اور زخموں سے بھرے ہوئے ہاتھ ——— الغرض وہ ایک عجیب حالت میں تھا،

"یہی میرا داماد ہے" لیتھری نے چلّا کر کہا "اس نے سمندر کے ساتھ کُشتی مقابلہ کیا ہے، وہ چیتھڑوں میں ملبوس ہے، اس کے شانے اور ہاتھ قابلِ تعریف ہیں، یہ ایک بہت بڑا انسان ہے"

لیکن گلیٹ لیتھری کی آنکھ بچا کر کمرے سے باہر نکل چکا تھا، اس نے

خود ڈراوجیٹ اور پادری کی شادی کا انتظام کیا اور ان کے سفر کے لئے ایک جہاز میں انتظام کیا، جو انگلینڈ کو روانہ ہو رہا تھا،

یہ تمام انتظام کر کے گلیٹ نے سمندر میں اسی چٹان کی راہ لی، اور وہاں انتظار میں بیٹھ گیا، تاکہ خلیج سے جہاز کو نکلتا ہوا دیکھے، یہاں تک کہ وہ حدِ نظر سے بعید ہو جائے۔

جہاز نہایت سست رفتار سے نکلا، گلیٹ نے اُسے دیکھا، اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی، اس نے سر جھکا لیا، سمندر چڑھ رہا تھا، اور پانی اُس کے پاؤں تک آ چکا تھا۔

اُس نے نگاہیں جھکا لیں، پھر اوپر دیکھا، اب جہاز چٹان کے مقابل آ چکا تھا۔ اس کے سیاہ مستول سمندر میں نہایت خوبصورت معلوم ہوتے تھے، اونچے اونچے بادبان ایک لمحہ کے لئے سورج کی شعاعوں سے منور ہو گئے، پانی کا شور جہاز کے چلنے سے زیادہ ہو گیا تھا۔

گلیٹ عرشۂ جہاز پر زندگی کی چہل پہل کا نظارہ کر رہا تھا، یہ اس قدر صاف نظر آ رہا تھا جیسے گلیٹ اسی میں سوار ہو، اُس نے عروس اور نوشہ کو ایک جگہ بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ان دو معصوم چہروں پر سماوی نور تھا، اور خاموشی میں ایک بہشتی سکوت مضمر تھا۔

جہاز گزر گیا، گلیٹ کی نگاہیں اس پر ہوئی تھیں، یہاں تک کہ بادبان آہستہ آہستہ دور ہوتے ہوتے شفق پر ایک سفید دھبہ کے برابر نظر آنے لگے، اُس نے محسوس کیا کہ پانی اس کی کمر تک پہنچ گیا ہے۔

جہاز متواتر دُور ہوتا گیا،

چٹان کے گرد جہاں گلیٹ بیٹھا ہوا تھا، کوئی جھاگ نہ تھا، اُس کے اطراف کوئی شوریدہ موج نہیں ٹکراتی تھی، پانی نہایت سکون سے چڑھ رہا تھا، اب یہ گلیٹ کے شانوں تک آ چکا تھا۔

چیختے ہوئے پرندے اس کے سر پر پھڑپھڑا رہے تھے، اب صرف اس کا سر پانی سے باہر رہ گیا تھا۔

طوفان اپنے پورے زور پر تھا، شام قریب آ رہی تھی، گلیٹ کی آنکھیں شفق کی جانب جہاز پر جمی ہوئی تھیں، اس سکوت میں غم خیز گہرائیاں تھیں، ان میں مایوس امیدوں کی تسکین تھی، اُس پر ایک خاموش، لیکن معصوم طریق سے اپنے انجام کو قبول کرنے کا جذبہ، جو اُس کی اُمیدوں کے بالکل برعکس تھا، طاری ہو گیا۔

رفتہ رفتہ شام کی ہلکی ظلمت پھیلنے لگی، لیکن گلیٹ کی آنکھیں اسی طرف جمی ہوئی تھیں۔ رفتہ رفتہ شام کی دیوی نے آنکھیں موند لیں، اور سمندر کی چڑھتی ہوئی تند موجوں نے گلیٹ کی آنکھوں کو بند کر دیا۔

عین اُس وقت جب جہاز نگاہوں سے اوجھل ہوا، گلیٹ کا سر غائب ہو گیا، اب سطحِ آب پر پانی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

(منتظر)

عورتوں کی لڑائی

کوثر چاندپوری

بوا سلام!

سکینہ نے اپنے کوٹھے کی دیوار سے سر نکال کر رضیہ کو مخاطب کرکے کہا جو مکان کے صحن میں بیٹھی چرخہ کات رہی تھی۔ اس نے اپنی سفید، سفید بھویں سکیڑ کر بے رونق نگاہوں سے اوپر کو دیکھا، اور بے رُخی سے کہا،

پڑے خاک ایسے سلام پے!

کیا ہوا بُوا، آج کیوں منہ سُجائے بیٹھی ہو؟

چل پرے، ملبی بن۔ آئی وہاں سے بُوا کی لاڈلی۔

بُوا کیا ہو گیا تمہیں، کیوں تمہارے سر پر سنیچر سوار ہے آج؟

سنیچر سوار ہو تیرے سر پر، دیکھ سکینہ میرے منہ مت لگیو!

بُوا کیا باؤلے کُتّے نے کاٹ کھایا تمہیں، جو کاٹ کھانے کو دوڑتی پڑتی ہو،

کُتّا کاٹے تجھے، تیرے پیاروں کو، اللہ نہ کرے جو مجھے کاٹے باؤلا کُتّا!

بُوا، دیکھو میرے پیاروں کا نام لیا تو چُٹیا کی خیر نہیں، ذرا منہ سنبھال کر بات کرو،

مُنہ وہ سنبھالے جو تیری دبی لسبی رہتی ہو، تیرا دیا کھاتی ہو، مجھ پر تیرا کیا دباؤ ہے، جو میں سنبھالوں منہ کو،

دیکھ سکینہ منہ میں لوکا دیدوں گی، جو میرے بوڑھے چونڈے کا نام لیا!

بوا تمہارا تو دماغ چل گیا ہے، زبردستی جیب چلانے کو بیٹھ گئیں تم، میں نے بھلا کہا کیا تھا، تمہیں سیدھے سبھاؤ سلام کرنے کو چلی آئی تھی، مجھے کیا خبر تھی، یوں جلی بھنکی بیٹھی ہو،

جلے تو، بھنکے بھی تو، میں کیوں جلتی، جیب جلانے کو مجھے تیرا کیا ڈر پڑا ہے؟

ہے کیسی لُگائی، باز ہی نہیں آتی، بالکل سر پے ہی چڑھی جا رہی ہے، ہم تو بڑھاپے کا خیال کر رہے ہیں، آپ ہیں کہ آپے ہی سے باہر ہوئی جا رہی ہیں،

آئی وہاں سے بیچاری بڑھاپے کا خیال کرنے والی، بڑھاپے کا خیال کرتی تو مردوں میں بیٹھکر میری صورت میں کیڑے ہی تو ڈالتی، ارے میرے منہ میں دانت نہیں رہا، آنکھوں سے پانی بہتا ہے، تو تیرے باوا کا کیا نقصان ہے، یہ تو اللہ کی قدرت ہے جس کو چاہے جیسا بنا دے، مگر بندے کو کسی بات پے گھمنڈ نہیں کرنا چاہئے۔

بُوا، ذرا دوسرے کی بھی سنا کرو، تم تو اپنی ہی کہے جا رہی ہو، کون کہتا ہے میں نے تمہاری صورت میں کیڑے ڈالے، بوا جھوٹ بولنے کی میری عادت نہیں، دیکھو، ایسے طوفان مت اُٹھاؤ تم مجھ پر، کوئی سنے گا تو کیا کہے گا، میرے ہی جسم میں تھوکے گا کہ ضرور اس نے بوا کو کچھ کہا ہوگا،

اس گھر میں رہتے رہتے میرے بال سفید ہو گئے، آج تک کوئی کہہ تو دے، میں نے کس پر طوفان اُٹھائے ہیں، کس پر تہمت لگائی ہے، اکیلی تم ہی تو رہتی ہو، محلے میں کوئی اور تو رہتا ہی نہیں، ایک تم پر ہی طوفان توڑ رہی ہوں میں!

اور وں گی میں کیا جانوں بُوا، میں تو اپنی کہتی ہوں، خدا اپنا دیدار اور محمدؐ کی شفاعت نصیب نہ کرے، جو میں نے کسی کے سامنے تمہیں کچھ کہا ہو!

خدا کے خوف سے ڈر سکینہ!

اب اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں کہ آئی ہوئی بات کو تم میرے سر تھوپ دو، کوئی بیچ میں ہو تو اس کا نام لو، میں اولاد کی قسم دے کر پوچھو کس کے آگے کہا میں نے بُوا کو بُرا بھلا!

سکینہ یوں باتوں میں مت اُڑاؤ مجھے، میں نے دھوپ میں یہ بال سفید نہیں کئے۔

بوا تم نے دھوپ میں سفید کئے ہوں بال یا سایہ میں، مجھے اس سے واسطہ نہیں میں تو یہ کہتی ہوں تم اُس بندی کا نام بتاؤ جس کے سامنے میں نے تمہیں بُرا بھلا کہا، جب جھوٹ سچ کھلے گا، بُوا اللہ کرے میں اتنی ہی بڑی مر جاؤں، جو میں نے ایک حرف بھی زبان سے نکالا ہو۔

کس کس کا نام بتاؤں سکینہ، کوئی ڈھکی چھپی بات ہو تو میں نام بھی بتاؤں، کسی کا بھرے مجمع میں بیٹھکر تم نے اُس دن نیم والے گھر میں مجھے اندھا بنایا، منحوس کہا، آنسو ڈھال کہا، تم نے کہا صبح صبح کوئی اس کی صورت بھی نہ دیکھے جس دن میں اس کا منہ دیکھ لیتی ہوں شام تک چین نہیں ملتا،

توبہ کرو بوا توبہ! دیکھو ایسا طوفان مت اُٹھاؤ، اللہ، کیسے بہتان باندھ رہی ہو، خدا جانے آسمان کس کے بھاگوں کھڑا ہے۔

اچھا قسم کھاؤ، تم نے نہیں کہا،

بوا تمہارے سر کی قسم، اپنے بچّہ کی سوں، جو میں نے تمہارا نام بھی لیا ہو، پڑے خاک جھوٹ بولنے والے کی صورت پے، بچّہ سے زیادہ دنیا میں مجھے اور کیا ہے؟ ہاں اتنی بات تو ہوئی تھی، بوا، دیکھو میں سچی سچی بتاؤں تمہیں کہ بلّو دھوبن کا ذکر آگیا تھا، تو میں یوں بولی کہ اب تو اُسے سُوجھتا بھی نہیں، اور منہ پے تو چھبڑوں نُور برستا ہے جس دن سویرے ہی سویرے صورت دکھا جاتی ہے، روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی، اور کچھ نہیں تو کُتّا ہی ہنڈیا میں مُنہ ڈال جاتا ہے، بوا لو یہ بات تو ضرور میں نے کہی تھی، تمہارا تو نام بھی نہیں لیا، نہ معلوم بڑھاپے میں تمہاری عقل چرنے چلی گئی ہے کیا، پہلے بات کا انجام سوچ لیا کرو، پھر منہ سے کچھ نکالا کرو، وہ تو اچھا ہوا میں چلی آئی اس وقت، نہیں تو تمہارے دل میں یہ میل بھرا ہی رہتا۔

سکینہ اللہ تیرا کلیجہ ٹھنڈا رکھے بچی! بے میری کیا خطا ہے، مجھ سے تو جیسا کسی نے کہہ دیا، میں نے یقین کر لیا، میں آپ تو کچھ سننے گئی نہیں تھی، مجھے کیا خبر کہ بلّو دھوبن کا قصّہ تھا، میں تو یہی سمجھی کہ تو مجھی کو کہہ رہی ہو گی، سکینہ میرا دل تو اندر سے گواہی دے رہا تھا کہ زمین آسمان ٹل جائے اپنی جگہ سے، مگر سکینہ میرے لئے ایسے بول منہ سے نہیں نکال سکتی، اور انھیں باتوں کی بدولت تو رات دن تیرے لئے دعائیں نکلتی رہتی ہیں، میرے بدن کے روئیں روئیں سے!

مگر بوا اتنے کچے کان بھی کس کام کے آج تو یہ ہوا کل کو اور کچھ کہہ دیا کسی نے تم سے، تو میں کیا بگاڑ لوں گی، اس کا یا تمہارا۔

یوں کہنے سے کیا ہوتا ہے سکینہ! ایسی میں بالکل سڑی تھوڑا ہی ہوں، جو ہر کسی کے کہنے سے یقین کر لوں گی، اب لے اتنی بات تو کہنے والے نے بھی جھوٹی نہیں کہی، کسی کا ذکر تو تھا، تم خود ہی کہتی ہو، بلّو دھوبن کو کہہ رہی تھیں، ہاں اتنی بات اور بڑھ گئی، کہ اس کی جگہ میرا نام لے دیا۔

یہی تو کرتوت ہیں بوا دشمنوں کے میں تمہاری ہی جان کی قسم کھا کر کہتی ہوں بلّو دھوبن کو کہہ رہی تھی، تمہیں کیا معلوم نہیں اس کی صورت دیکھ لو صبح صبح تو روٹی نہیں ملتی، سارے دن بھوکا رہنا پڑتا ہے، بھائی خدا کی قسم میں نے تو جس روز اس مردار کی صورت دیکھی، مجھے سورج ڈوبنے تک چین نصیب ہوا نہیں،

کیا کہہ رہی ہو سیدانی، بلّو دھوبن کا دم نہ ہوتا تو جھینک جھینک کر مر جاتیں تم، یہ میں ہی تھی کہ جب ٹانگیں پھیلائے پلنگ پر پڑی تھیں تم اور کوئی پانی پلانے والا بھی پاس نہ تھا تو اپنے بچوں کو بلکتا چھوڑ کر تمہاری پٹی نیچے آبیٹھی تھی، پھر میں نے دبائے تمہارے، منہ ہاتھ میں نے دھلوایا، روٹی میں نے پکا کے کھلائی سارے کنبہ کو، اور آج تم کہتی ہو بلّو منحوس ہے، اس کی صورت دیکھنے سے روٹی نہیں ملتی، وہ دن بھول گئیں کیا جب بلّو کے سوا تمہیں کوئی پوچھنے والا بھی نہ تھا، سچ کہا ہے کسی نے نیکی کر اور کنوئیں میں ڈال!

سکینہ بلّو کو دیکھتے ہی چونک گئی، اس کے بدن میں کاٹو تو لہو کی بُوند نہیں۔ اسے سان گمان بھی نہ تھا کہ بلّو دیوار کے نیچے کھڑی

کھڑی سب کچھ سُن رہی ہے، وہ بہت ہی گھبرائی، بلّو نے سارا قصہ اپنے کانوں سے سُن لیا تھا، اب اس کی تردید ہی کیا ہوسکتی تھی، بُوا کو تو اُس نے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دیا تھا۔ وہ پُرانے وقتوں کی نیک دل بیوی تھیں، مگر بلّو باہر پھرنے والی بیباک عورت، اس کی زبان کسی کے سامنے رُکنے والی ہی نہ تھی، مگر سکینہ نے ہمت کر کے کہا،

بلّو کیوں آپے سے باہر ہوئی جا رہی ہے، میں تو مذاق کر رہی تھی، بُوا کو معلوم کیا ہو گیا تھا، ایک دم سے مجھ پر برس ہی تو پڑیں، اُن کا غصہ ٹھنڈا کرنے کو میں نے تیرا نام لے دیا تھا، تیرے بچّہ کی قسم کوئی اور بات تھوڑا ہی تھی، پوچھ لے بُوا سے میں نے کوئی گالی دی ہو تجھے تو!

گالی تم کیا دیتیں سیدانی، میں تو اچھے اچھوں کی نہیں سُنتی، تم تو بیچاری ہو کس شمار قطار میں، اور گالی دینے میں تم نے کیا کسر رکھی ہے، منحوس تم نے کہا، اندھا تم نے کہا، اور کیا رہ گیا بھلا کہنے کو، سیدانی مجھے تمہارے یہ گُن معلوم نہ تھے، نہیں تو کبھی تھوکتی بھی نہیں، تمہارے گھر آ کے اور اب دیکھو آگے کو۔

بلّو معلوم ہوتا ہے تو بھی بھنگ پی کے آئی ہے، میں نے تو گھر بسی منحوس اور اندھا نہیں کہا تجھے، پوچھ لے بُوا سے!

آنکھوں میں انگلیاں مت کرو سیدانی، میں بہری تو ہوں نہیں، اللہ رکھے میرے کان ابھی سلامت ہیں، میں یہیں بیٹھی سب کچھ سُن رہی تھی، کوئی اور ہوتا تو اینٹ مار کے یہیں سے سر پھوڑ دیتی، اللہ کی سوں! وہ تو معلوم کس بات کا خیال آ گیا، اور بُوا سے کیا پوچھ لوں، یہ تو تم سب کی کہی بدی ہے، تم سب ایک تھیلی کے چٹّے بٹّے ہو، پھر بُوا کاہے کو کہیں گی؟

بلّو دیکھ میں اور قسم کی عورت ہوں، سکینہ ہی سے منہ بلائے جا، میرا نام لیا تو ٹھیک نہیں!

کس قسم کی عورت ہو تم بُوا، میرا بھلا کیا کر لو گی، جیسا کہو گی، ویسا سنو گی، میں کب تمہاری دی ہوئی روٹی کھاتی ہوں جو دبوں گی! دبے گی کیسے نہیں —— کمینوں کو منھ لگانے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ سکینہ دیکھو ہماری برابر بیٹھتے بیٹھتے آج بلّو کا یہ حوصلہ ہو گیا کہ وہ کہتی ہے

جیسا کہو گی ویسا سنو گی، بلّو اچھی طرح سن لے کان کھول کر میں تیری برابری کی نہیں ہوں،

زمین پہ پاؤں رکھ کے چلو بُوا زمین پہ!

اب کیا تیرے سر پہ رکھ کے چل رہی ہوں۔

میرے سر پہ تم کیا پیر رکھو گی بیچاری، چرخہ کاتتے کاتتے تمہاری عمر گزر گئی، ایک دن چرخہ پونی لے کے نہ بیٹھو تو اگلے دن کھانے کو روٹی نہ ملے تم میرے سر پہ کیا پاؤں رکھو گی؟

بلّو دیکھ منہ میں لگام دے، چڑیل کہیں کی آئی وہاں سے باتیں بنانے ایران توران کی!

بُوا عمر کا خیال کرتی ہوں، سفید بالوں سے اللہ میاں کو بھی شرم آتی ہے نہیں تو وہ بے نقط سناتی کہ سر پیٹ لیتیں تم اپنا۔

کھڑی تو رہ مردار، —— پیڑھی سر پہ دے ماروں گی۔

میں چونڈا اکھاڑ لوں گی، پیڑھی مارنے والی کا!

بک بک کئے جا رہی ہے، چپ نہیں ہوتی، کمینی!

تم ہزار دفعہ کمینی!

سکینہ سن رہی ہو، اس دھوبن کی باتیں تم،

ہاں بُوا سن تو رہی ہوں مگر کیا کروں، کچھ بس نہیں چلتا۔

وہ کیا سُنے گی، ابھی تو مجھے اس کے دانے دیکھنے ہیں، تم تو ویسے ہی بیچ میں ٹانگ اڑا بیٹھیں، جھگڑا تو سیدانی سے ہو رہا تھا،

میرے کیا دانے دیکھے گی تو چڑیل؟

سیدانی زبان سنبھالو، نہیں تو منہ نوچ لوں گی، بالوں میں آگ لگا دوں گی،

میں تیری چٹیا مونڈ لوں گی!

میں تیرے لالوں کا خون پی لوں گی!

ارے تیرے منہ میں لگے آگ خون پی اپنے پیاروں کا۔

سیدانی اللہ کرے تو مجھ سی ہی ہو جا!

خدا نہ کرے مجھے تجھ سا،

تیرے مریں بچے سیدانی: مجھے منحوس کہنے والی

بلّو دیکھو زبان قابو میں رکھو، کیسا منہ بھر بھر کے کوس رہی ہے، نمک حرام!

تیرے مَریں لال۔
بَنّو خدا کے لئے۔
تیرا لُٹے سہاگ۔
تیرا مرے خصم!
تیرا نکلے جنازہ۔
بَنّو، تیرے پھوٹیں دیدے۔
تیرے منہ میں نکلے کالا دانہ۔
بُوا خدا کے لئے اس کی جیب کتر لو!
سیدانی، تو اتنی ہی بڑی مر جائے، اللہ کرے، تجھے شام ہونی نصیب نہ ہو، ——— اور بوار ذالی کون ہوتی ہے جیب کترنے والی!
بَنّو میں پہلے کہہ چکی ہوں میرے منہ مت لگ تو!
تُو میرا کیا بگاڑ لے گی۔
میں تیرا کلیجہ نکال لوں گی،
میں تیرے منہ پہ خاک ڈال دوں گی!
نکل چڑیل میرے گھر سے!

بوا دیکھو مجھے ہاتھ لگایا تو جان کی خیر نہیں، میں تو مرنے ہی کو پھر رہی ہوں، کل کی مرتی آج مر جاؤں، مجھے پروا نہیں، مگر تم کھنچی کھنچی پھرو گی زمانے بھر میں۔

بُوا اور بَنّو کو اُلجھا کر، سکینہ دبے پاؤں کوٹھے سے اُتر آئی، اور جلدی سے کواڑوں کی زنجیر لگا دی، تھوڑی دیر تو بَنّو بوا کو کوستی کاٹتی رہی، وہ بھی برابر جواب دیتی رہیں، اتنے میں دن چھپ گیا، اور بُوا نماز کو کھڑی ہو گئیں، بَنّو نے فرصت پا کر ادھر دیکھا تو سکینہ غائب! اُس نے غصہ میں بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر داہنے ہاتھ کو کھڑا کر کے زور سے مارا، اور دانت کچکچی کے بولی، تیرے کھاؤں قتلے! تو آگ لگا کر چل دی، چترا کہیں کی، مجھے بُوا سے لڑا دیا، اور آپ کھسک گئی۔ ———

آزادیٔ تحریر

افسوس کہ اب تک یہ خطرناک حقیقت
پوشیدہ ہے اس ملک کے اربابِ حشم سے

افراد کو دیوانہ بنا دیتے ہیں یکسر
آزاد ہوں جذبات اگر قیدِ رقم سے

لاکھ اُن کو دبائے کوئی یہ دب نہیں سکتے
آہو کو کوئی روک نہیں سکتا ہے رَم سے

جس خار سے خونبار رگِ جانِ وطن ہے
وہ خار نکل سکتا ہے بس نوکِ قلم سے

ہاں اور نہیں کوئی مداوائے غلامی
زنجیر کٹے گی یہ اسی تیغِ دو دم سے

جس قوم سے چھینی گئی آزادیٔ تحریر
نام اُس کا مٹا صفحۂ تاریخِ اُمم سے

جینا ہے تو حاصل کرو آزادیٔ تحریر
آزادیٔ تحریر کے قبضے میں ہے شمشیر!

حفیظ ہوشیارپوری ایم اے

شاعری اور تنقیدِ جدید

رامیش نارائن ماتھر ایم اے آگرہ

"شاعری اور تنقید سے عامتہ الناس کو کوئی تعلق نہیں، یہ صرف بیکاروں کا مشغلہ ہے، جو اپنے خلوت خانے میں لکھتے اور پڑھتے ہیں" اس طرح پوپ نے شاعری و تنقید کے متعلق ۱۷۱۶ء میں لکھتے ہوئے اس بات کا احساس کیا تھا کہ شاعری و تنقید کا ذوق محض چند تعلیم یافتہ بیکار لوگوں کی مختصر جماعت تک محدود ہے، لوگوں کا بالکل یہی خیال آج بھی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ شاعری کے اصلی مقصد و ماہیت کو کہ وہ حقیقت میں کیا ہے، اور ہمارے لئے کیا کر سکتی ہے غلط سمجھے ہوئے ہیں، نقادوں نے سمجھانے کی ہر چند کوشش کی، لیکن لفاظی سے مطلب کو خبط کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ تنقیدوں سے لوگوں کا یہ اعتقاد ہو گیا کہ شاعری مصنوعی لطافت و دلآویزی کا دوسرا نام ہے، وہ محض تقلید اور اطاعتِ فن کا نتیجہ ہے اور تضیعِ اوقات ہے، اس میں پاک و لطیف جذبات کا سراسر فقدان نظر آتا ہے، اس میں تصنع و تکلف، دور از کار تشبیہات و مرصع سازی ہے اس کا زندگی سے کچھ تعلق نہیں ہے، آتش کا شعر اس خیال پر صادق آتا ہے،

کھینچ دیتا ہے شبیہہِ شعر کا خاکہ خیال　　　عقلِ رنگیں کام اُس پر کرتی ہے پرداز کا
جنبشِ الفاظ جڑنے سے نگیں کے کم نہیں　　　شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

بہت سے لوگوں کے نزدیک حکمت اور شاعری میں یہ فرق ہے کہ حکمت میں امرِ حقیقی کا انکشاف ہوتا ہے۔ برعکس اس کے شاعری میں خیالی نکات سے بحث ہوتی ہے، حکمت اُن امور پر دلالت کرتی ہے جو زندگی میں کار آمد اور مفید ہوں۔ شاعری محض وہم و قیاس ہے، اور وہ خیال کے پلاؤ پکانے کے سوا کسی اور بات میں امداد نہیں کر سکتی ہے۔

عملی زندگی میں شاعری کی تائید میں کچھ کہنا امر لازمی ہے، یہ اکثر پوچھا جاتا ہے کہ "شاعری کے مطالعے سے کیا فائدہ ہے؟ اور وہ کیسا ہے"؟ لیکن جب غلط فہمیاں جو لوگوں کو اس کے بارے میں ہو گئی ہیں دور ہو جائیں گی، اور جب یہ بات منکشف ہو جائے گی کہ بہترین شاعری کیا چیز ہے اور وہ کیا کر سکتی ہے تو اس بات کی مطلق ضرورت باقی نہیں رہے گی، کہ اس کے پڑھنے کے فائدے بیان کئے جائیں، حکمت پر اُس کی فوقیت دکھائی جائے،

یہ ہم کسی پس و پیش کے بغیر کہہ سکتے ہیں کہ شاعری سے ہر شخص اور ہر فرد کو دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہمیں قوی امید ہے کہ ہم عاقلانہ تنقید سے شاعری کے حدود بڑھا سکتے ہیں، اور اس کے دامنِ عاطفت سے لوگوں کی ایک کثیر تعداد کو مستفیض کر سکتے ہیں، افلاطون نے جب شعرا کے خلاف الزام عاید کیا اور اُن کو اپنی مخصوص جمہوریت میں داخل ہونے سے محروم رکھا تو اس نے کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا تھا جس کے خلاف کوئی اپیل نہ ہو سکتی ہو۔ اگر شاعری کی عذر داری میں منصفانہ دلائل پیش کی جاتیں تو پھر اس کو جلا وطنی سے واپس ہونے کی اجازت مل جاتی، اور اس کا خوشی سے استقبال کیا جاتا، چنانچہ حضرت افلاطون خود فرماتے ہیں" اور شاعری کے تائید کرنے والوں میں سے جو خود شاعر نہیں ہیں، لیکن شاعری کے شیدائی ہیں، میں خیال کرتا ہوں،

ان کو اختیار ہے کہ وہ شاعری کی بابت نثر یں لکھیں، اور یہ بات ثابت کریں کہ شاعری خوشگوار ہی نہیں بلکہ امورِ سلطنت اور انسانیت کے لئے مفید ہے، اگر یہ مسئلہ طے ہو جائے تو ہم کو دوگنا فائدہ ہوگا کہ شاعری مفید بھی ہے اور فرحت بخش بھی۔"

اس زمانے میں نقّاد کا بھی یہی فرض ہے۔ اس کو دکھانا ہے کہ "شاعری زندگی کے لئے فرحت افزا ہی نہیں بلکہ مفید بھی ہے۔"

"ہمارا شاعری پر اسی وجہ سے اعتقاد ہے کہ دنیا کی شاعری میں بڑے بڑے حکما اور عقلا نے اپنے پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور شاعری کو زندگی سے تعلق ہے۔

شاعری زندگی سے وابستہ ہے، رومن لوگوں نے شاعری میں اخلاقی پہلو کو بڑی اہمیت دی تھی، اس یقین واثق پر کہ شاعری میں یہ قوت موجود ہے، کہ وہ انسان کو شائستہ بنائے، اس کے اخلاق کو درست اور اس کو نیک امور کے لئے آمادہ کرے، رومن لوگوں نے اس کو اپنا ذریعۂ تعلیم بنایا تھا، ان کے یہاں تعلیم کا اہم مقصد شعرا کے کلام کا مطالعہ تھا، شعرا لوگوں کو بہادر اور دلیر بناتے تھے، اُن کو خطیب اور مقرر بناتے تھے، اور اُن کو موزونیت بخشتے تھے، ہوریس کا قول ہے "شاعر بچے کی ناکمل اور لکنت زدہ زبان کو سنوارتا ہے، اور اس کے کانوں کو واہیات سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کو زندگی کے راز سکھاتا ہے۔ اس کے دل کے سانچے کو ڈھالتا ہے، اُس کے ناپاکیزہ خیالات کی اصلاح کرتا ہے، اسے عنفوانِ شباب میں کارنامۂ عظیم سناتا ہے، اور اعلیٰ مثالیں پیش کرتا ہے، جس سے اُس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

نشاۃ ثانیہ کے لوگ بھی شاعری کے اخلاقی پہلو سے بہت متاثر ہوئے۔ اس زمانے کے لوگ خیال کرتے تھے کہ لوگوں کو بہتر بنانے کے لئے سب سے قوی تر شے شاعری ہے، اسی خیال سے متاثر ہو کر سڈنی نے لکھا ہے، اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے بن جونسن نے وعظ سنایا ہے، اور یہی شے ملٹن میں ہے جو شاعری کی اخلاقی پہلو کو بہت زیادہ اہمیت دیتی ہے۔

اٹھارہویں صدی کے شعرا کا مزاج اور نقطۂ نظر مختلف تھا، اور وہ دنیاوی تھا، تاہم اس دور کے شعرا بھی شاعری کا اہم ترین مقصد زندگی کو شائستہ کرنا اور اخلاق اور سیرت کی تعلیم دینا سمجھتے تھے، یہی عقیدہ انیسویں صدی کے رومانٹک کے ورثہ میں آتا ہے۔ ہم بائرن کو ناصح کبھی خیال نہیں کرتے، لیکن وہ بھی یہی کہتا ہے "بہترین شاعری اخلاقی ہے، کیونکہ اخلاقی امور سب اشیا سے اعلیٰ تر ہیں۔"

یہ کہنا کہ ایک بڑے مصنف کا فرض نصیحت کرنا نہیں ہے، بعید از قیاس بات ہے، شاعرانہ دلائل میں درحقیقت مسائلِ زندگی کا انکشاف ہوتا ہے۔ شاعری میں جذبات کا جو اظہار کیا جاتا ہے تو وہ جذباتِ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں، جس سے ہمارے اخلاق کا گہرا تعلق ہے، اس لئے وہ نقّاد جو اخلاق اور شاعری میں ایک حدِ فاصل قائم کرنا چاہتے ہیں، سخت غلطی پر ہیں۔

اخلاق، انسان کا اہم ترین قابلِ غور مسئلہ ہے — ہم اس بات کا احساس کرتے ہیں کہ بذاتِ خود اخلاق بے لطف و ناخوشگوار چیز ہے، اور ہم اخلاقی دلائل سے اور بھی منحرف اس لئے ہوتے ہیں کہ ہمارے مذہبی اعتقادات میں بھی فرق آگیا ہے، اس لئے شاعری کی نہایت ضرورت ہے کہ وہ ان ناخوشگوار چیزوں کی جو مذہب اور فلسفے سے تعبیر کی جاتی ہیں، قائم مقام بنے۔

اپنے موضوع کی تائید میں کہ فنِ لطیف اور شاعری تفسیرِ حیات ہے، میں شاعری، ڈرامہ اور فنِ مصوری و معماری کے گذشتہ تجربات کے نتائج ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔

کسی ملک میں کوئی مشہور زمانہ فنِ لطیف یا صنفِ شاعری کا لے لیجئے، اور آپ کو واضح ہو جائے گا کہ شاعر کا مقصد زندگی کے نکات اور رموز کا انکشاف کرنا ہے، فنِ لطیف شمعِ حیات کا کام دیتا ہے، فنِ نقاشی یا شاعری میں جو حسن ہے بذاتِ خود وہ بے معنی و مہمل ہے، اگر وہ کسی خیال یا دلی آرزو یا دماغی کیفیت کا اظہار نہیں کرتا ہے۔

قدیم یونان اور قدیم ہند میں فنِ نقاشی کا کوئی شاہکار نہیں ہے، جو اس زمانے کے لوگوں کے عقائد اور دلی جذبات اور احساسات کا اظہار نہ کرتا ہو۔ قدیم ہندوستان، یا قدیم یونان کا کوئی ڈرامہ یا شاعرانہ کام نہیں ہے جو اس دور کے طرزِ زندگی اور سوسائٹی کی حالت کا بعینہٖ نقشہ نہ کھینچتا ہو، اسیرین بادشاہوں کے نقاشی کے شہ پاروں سے اُس زمانہ کی صحیح رفتار کا اندازہ ہو جاتا ہے، سانچی اور امروتی کی نقاشی اور مصوری

ہم کو بدھ مت کی زندگی سے آگاہ کرتی ہے۔

خواہ آپ مہابھارت کا ذکر کریں، یا کالی داس کے بڑے ڈراموں پر غور کریں، یا یونانی ٹریجڈی یا دائم الحیات شیکسپیر ین ڈرامہ، یا مغل سلطنت کی مصوری کا، یا گپتا دور کی بہترین ولطیف نقاشی کا، یا شمالی ہند کے بادشاہوں کی قدیم موسیقی کا، یہ سب کے سب زندگی کے مختلف پہلوؤں پر دلالت کرتے ہیں۔

اسلئے شاعری کا زندگی سے گہرا تعلق ہے، وہ زندگی کے مختلف اصول پر نظرِ عمیق ڈالتی ہے، ہم کو زندگی کا مقصد سمجھاتی ہے، اور ہماری زندگی کو فرحت بخش بنا دیتی ہے، شاعری تفسیرِ حیات ہے — بہترین شاعری وہی ہے جو واقعیت و اصلیت پر مبنی ہو، ایسی شاعری جو بظاہر دلآویز ہے، لیکن زندگی سے قطعی تعلق نہیں رکھتی، چند روزہ ہے، اور ایسی شاعری ہرگز قبولِ عام کا شرف حاصل نہیں کرسکتی۔ بہترین شاعری وہی ہے جو زندگی سے تعلق رکھتی ہے، وہ دائم الحیات ہے اور دلچسپ ہے، اور مقبولِ عام رہے گی۔

اے کاش......!

بیباک خطائیں ہیں، افسردہ سزائیں ہیں　　مقبول دُعائیں ہیں، مجبور قضائیں ہیں
بیتاب وفائیں ہیں، شرمندہ جفائیں ہیں　　مخمور ادائیں ہیں، سرشار نوائیں ہیں
پُر کیف صدائیں ہیں، بدمست فضائیں ہیں　　گلپاش ہوائیں ہیں، مے بار گھٹائیں ہیں

اے کاش کہ ایسے میں اک لمحہ کو آجاؤ!

اس دُھوم سے گلشن میں کچھ موسمِ گُل آیا　　ہر ذرّہ بے حس پر اک جوشِ نمو چھایا
پتّوں نے جو مِل مِل کر اک گیت نیا گایا　　لی سبزے نے انگڑائی، کلیوں کو بھی ہوش آیا

اے کاش کہ دم بھر کو ایسے میں تم آجاؤ!

کاندھے پہ لئے بادل سامانِ بہار آیا　　ہر قطرہ لیے دل میں طوفانِ بہار آیا
ہر بُوٹہ رکھے سر پر بُستانِ بہار آیا　　پڑھتا ہوا ہر پتّہ قرآنِ بہار آیا
ہر غنچے کے ہونٹوں پر عنوانِ بہار آیا　　ہر پھول لئے دل میں عرفانِ بہار آیا

اے کاش کہ تم خود بھی اک روز چلے آؤ!

(اعظم خسروی، جے پوری)

حُبِّ وطن اور مُسلمان!

ظرف، اور اِس حد کا تنگ اے حامیٔ دینِ مُبیں
حیف اے ناآشنائے "رحمتہ للعالمین"!

اختلافِ مذہب و ملت پہ، اور اِتنا جلال؟
بھائیوں کے خونِ ناحق کو سمجھتا ہے حلال!

حیف اے دیوار کے پابند، اے دَر کے اسیر
اپنے جرگے، اپنے گُنبد، اپنے منبر کے اسیر!

دل پہ تیرے نقش ہے وہ فلسفہ ادیان کا
کاٹتا ہے رشتہ جو انسان سے انسان کا!

چھین لیتا ہے جو لطفِ باہمی کے قہقہے
قلب میں پُھنکارنے لگتے ہیں جس سے اژدہے!

مجلسی اخلاق کے جذبے کو ٹھکراتا ہے جو
آدمی کو آدمی کا گوشت کھلواتا ہے جو!

مجھ سے کیا کرتا ہے ہندو کے تعصب کا گلہ؟
مجھ سے کیوں کہتا ہے ہندو کی جفا کا ماجرا؟

تنگ فکر و تنگ داماں، تنگ ظرف و تنگ جیب
مان بھی لوں میں کہ ہندو عیب ہے، اور زندہ عیب

فرض بھی کرلوں کہ ہندو، ہند کی رسوائی ہے
لیکن اِس کو کیا کروں، پھر بھی وہ میرا بھائی ہے!

مرد اگر ہوں بھائیوں کا خُون پی سکتا نہیں!
بھائیوں کا خون اگر پی لوں تو جی سکتا نہیں!

باز آیا میں تو ایسے مذہبی طاعون سے
بھائیوں کا ہاتھ تر ہو بھائیوں کے خون سے!

سُبحہ و زُنّار کی لہروں ہی پر بہتا ہے تُو
اور اِس تنگی پہ مجھ کو کم نظر کہتا ہے تُو؟

تیری ہستی تنگنائے کفر و ایماں کے لئے　　میں بنا ہوں آب و رنگِ نوعِ انساں کے لئے!

گو نجتی ہیں قصرِ آفاقی میں آوازیں مری　　کفر و ایماں سے بہت بالا ہیں پروازیں مری!

لیکن اس کے ساتھ ہی اے مبتلائے کفر و دیں　　دولتِ حُبِّ وطن کو چھوڑنا ممکن نہیں!

حصّہ ہے سب سے مقدم زندگی میں خویش کا　　خویش سے بچ جائے تو پھر مال ہے درویش کا!

سعی کرنا چاہیئے پہلے تو گھر کے واسطے　　گھر سے فرصت ہو تو پھر نوعِ بشر کے واسطے!

تیرے لب پر ہے عراق و شام و مصر و روم و چیں　　لیکن اپنے ہی وطن کے نام سے واقف نہیں!

کون کہتا ہے زمین و آسماں تیرا نہیں؟　　کُل جہاں تیرا، مگر ہندوستاں تیرا نہیں؟

مردِ حق کو قعرِ باطل سے اُبھرنا چاہیئے　　کعبۂ حُبِّ وطن میں سجدہ کرنا چاہیئے!

سب سے پہلے مرد بن ہندوستاں کے واسطے

ہند جاگ اُٹھے تو پھر سارے جہاں کے واسطے

جوشؔ ملیح آبادی

خسروؔ کا فیضان

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ ایک روز بانکی ٹوپی پہنے بیٹھے تھے کہ خسروؔ آ گئے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ مصرع پڑھا۔ ع

ہر دین راست راہے، ہر قوم قبلہ گاہے!

یہ مصرع سُنتے ہی خسروؔ نے اپنے پیر پر نظر جما کر فوراً یہ دوسرا مصرع پڑھا۔ ع

من قبلہ راست کردم بر طرفِ کج کلاہے

کل رات کو اس شعر نے دل پر ایک وجد کی سی کیفیت پیدا کر دی، اور اُس کیفیت سے ذیل کا شعر پیدا کر دیا۔ ملاحظہ ہو۔

ایں نکتہ را نداند ہر کس کہ ہیست عاشق

صد عشرتِ دو عالم، یک فرصتِ نگاہے!

جوشؔ

مادرِ ہند سے!

از اسمٰعیل امرتسر

ماں تو اغیار کی آماجگاہ
تیری مقدس سرزمین اجنبیوں کے لئے ایک مسلسل قمار خانہ
باہر کے لوگ تیری دولت پر ڈاکہ زن
۔۔۔۔۔ 'مہذب' جہاز تیرے سینے کو چیرتے پھریں
ماں تجھ پر یہ عالم دوزخ ۔۔۔۔۔ تو آبرو باختہ، شائستہ قوموں کی نظروں میں۔
تیرا جوبن پژمردہ پھول کی پتیوں کی طرح ۔۔۔۔ یہ سب کیوں
ہم ہی تیرے سپوت، تیرے نام لیواؤں کے باہمی نفاق کی وجہ سے،

ماں، تیرے یہ فلک بوس پہاڑ، قابلِ فخر حکایات کے آئینہ دار
رب العزت سے دست بدعا ہیں،
تیرے یہ ترنم ریز دریا پتھروں سے سر ٹپکتے ہیں۔
یہ وسیع میداں سوگوار، یہ شاداب مرغزار خزاں دیدہ
یہ سونا اُگلنے والی زمین زلزلہ بدوش
یہ کیوں ۔۔۔ ماں ۔۔۔۔ آہ ۔۔۔۔ محکومی ۔۔۔۔ ناقابلِ معافی گناہ

بوڑھی ماں۔ تیری آنکھیں اشکبار۔ تو رو رہی ہے،
ہم تجھے اپنا رہے ہیں، اپنا کر چھوڑیں گے،
تیرے غلامی سے ملوّث دامن داغدار نہ رہنے دیں گے،
یہ غلام آباد گود آزادی سے ہری ہوگی
تب یہ ہمارا دیش ایک نئی دنیا ہوگا، ماں
باہمی افتراق سے کوسوں دُور، اتحاد کا منظم مرکز
اور ہم تیرے سپوت ایک دوسرے سے ہم کنار
گنگا جمن کے سنگم کی طرح

محبّت

با وحید

رات زیادہ گزر چکی تھی، مگر میں جاگ رہا تھا، کمرے میں میٹھے تیل کا چراغ روشن تھا، اس کی ہلکی ہلکی روشنی میرے کمرے کو منور کر رہی تھی، میرا دل محبت کے جذبات سے لبریز تھا، مگر میں محبت کی حقیقت کو جاننا چاہتا تھا، غور کرتے کرتے میرا دماغ چکرانے لگا، میں نہیں جانتا تھا کہ میں ان جذبات کو اپنے دل سے کیونکر دور کروں، میں نے کوشش کی مگر ناکام رہا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا، مجھے پیاس معلوم ہو رہی تھی، حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے، میں نے تھوڑا پانی پیا اور پھر لیٹ گیا۔

ہوا قدرے تیز ہو چکی تھی، رات کی پریاں رقص میں محو تھیں، میرے کانوں میں کبھی کبھی ہوا کے گھنگروں کی آواز بھی آ جاتی تھی ۔۔۔۔ تارے ایک دوسرے کے شانے پر سر رکھے میٹھی نیند سو رہے تھے، کہ یکایک ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے چراغ گل کر دیا۔ ۔۔۔۔

چراغ گل ہوتے ہی کیا دیکھتا ہوں کہ میرا دل حقیقتِ محبت سے جگمگا رہا ہے، ۔۔۔۔ سچ ہے حقائق تاریکی ہی میں روشن ہوسکتے ہیں۔

قطعہ

وصل کی راتوں میں اب ایسا لطف سے آرہا ہے
ہجر کے عہدِ زبوں کا گریۂ صبح و شب
جیسے اک نغمہ میں کروٹ بدلے ذوقِ تجسّس
کان میں آتی ہے ہلکی موجِ باراں کی صدا

(روش)

رفتارِ وقت!

ادارۂ کلیم

منبرِ سیاست سے اک فتوائے کفر!

پچھلے مہینے مظفر پور (بہار) کے اک پبلک جلسے میں اک "لیگی" مولوی نذیر احمد نے مولٰینا ابوالکلام آزاد کے متعلق فرمایا کہ وہ "کانگریس نواز ہیں، ہندو پرست ہیں، اور خوگرِ کفر!" ؎

بدم گفتی و خورسندم، عفاک اللہ نکو گفتی!

• کیا مولٰینا ابوالکلام کی بالغ نظرِ حکمتِ اسلامی، اور ژرف نگاہ تدبر سیاسی کی یہی "دادِ بیداد" ہے؟ کیا چونکہ مولٰینا آزاد نے "ننگِ وجودِ مسلم لیگ" کی طفلانہ زارنالی اور شرمناک زبوں کاری کو سرپائے استحقار سے ٹھکرا دیا، اس لئے وہ (نعوذ باللہ من ذالک) "کافر" قرار پائے؟! ہمیں مسلم لیگ کے "دارالافتاء" کا معیارِ نفقہ اور اصل الاصولِ کفر و ایمان اچھی طرح معلوم ہے! یعنی ؎

ہر کو نہ خرافات کا فرش میخوانند!

ہم اپنے سامعۂ تخیل میں عظیم الشان ابوالکلام کی زبانِ قادر الکلام کا یہ اعلانِ اذغان گوش زد ہوتا ہوا محسوس کرتے ہیں:

کفر چو منے؟ گزاف آساں نشود!　　محکم تر از ایمانِ من، ایماں نشود!
در دہر چو من یکے، و آں ہم کافر؟　　پس در دو جہاں یکے مسلماں نشود؟

(ا-ا-خ)

جنرل نیل کا مجسمۂ عبرت!

جنرل نیل، جو غدر ۱۸۵۷ء کے ملک برطانوی ہیرو تھے، کانگریسی دورِ ۱۹۳۷ء تک ماؤنٹ روڈ، مدراس، کی اک عام گزرگاہ اور نمایاں نظرگاہ پر گویا اہلِ شہر کی چھاتی پر سوار تھے، اب خیر سے اُن کی "سنگی نعش" گورستانِ عجائب خانہ میں منتقل ہو گئی ہے، جہاں اُن کی ہشتاد سالہ روشناسیٔ کوچہ و بازار اب تا قیامت اک گوشۂ گمنامی کی خمیازہ کش بنے گی! ؎

بس کُن ز کبر و ناز کہ دیدہ است روزگار　　چینِ قبائے قیصر و طرفِ کُلاہِ کے!

جنگی خود نمائی، سیاسی اشتہار بازی، اور قوم پرستانہ کمظرفی کے اور جتنے مظاہر و مناظر، خدا کی پاک زمین کو ہنوز بدنما کر رہے ہیں، غالبًا ایک مزید عشرۂ سنین کے اندر، جنرل نیل کے بُت کی طرح، لحد کسمپرسی میں پہنچ جانے والے ہیں، افسانۂ بزم و انجمن چیزوں کا چند روزہ نمود و نمائش کے بعد اِس انداز سے اک سوختہ کھلجھڑی میں خاکستر ہو جانا کیسی دیدنی عبرت ہے! اللہ اللہ، جنرل نیل کا گرانڈیل جرنیلی پیکر، اور آثارِ قدیمہ کے قبرستان میں اک گوشۂ لحد کا دریوزہ گر؟! ؎

دیکھنا اے اہلِ عبرت! انتقامِ آسماں　　بنتے ہیں جامِ گدا خاکِ سرِ فغفور سے!

(ا-ا-خ)

کانفرنس عجائب خانجات!

کانفرنس عجائب خانجاتِ ہند کا اجلاسِ دہلی، گزشتہ ماہ کا اک قابلِ ذکر واقعہ ہے، کانفرنس مذکور کا سابق اجتماع یادش بخیر ایک ربع صدی اُدھر ۱۹۱۲ء میں بمقام مدراس عمل میں آیا تھا! ایک پورے قرن

میں بیداری کی کُلہم چار گردئیں لینا، اس میں شک نہیں کہ کلید بردارانِ آثارِ قدیمہ اور مجاورانِ عجائب خانہ کے شایانِ شان ضرور ہے! لیکن جدید العہد ہندوستان کی "نشاۃِ ثانیہ" کے مقتضیات کے لئے یاس انگیز بھی بدرجۂ غایت ہے! تاہم اب یہ شکر خوابی اور گرانگوشی زیادہ ممکن نہیں۔ ایک طرف خاکِ وطن کا ایک ایک ذرہ انگڑائی لے رہا ہے دوسری طرف خود مادرِ وطن اپنے بطن کے اسرار و آثارِ تاریخی کو اُچھال رہی ہے، ہمارا روئے سخن ہڑپا اور موہنجو دڑو کے لاثانی انکشافات کی طرف ہے! —— جو چالیس قرون قبل کے ماضیٔ بعید کے ہندوستانی تمدن و عمران کا ایک ہوشربا منظر دکھاتے ہیں! نیز ہندوستان کی تہذیب کو عراق و بابل کی یادگار شائستگی سے ہمعصر و ہم آغوش ہونے کی حیثیت کذائی سے پیش کرتے ہیں! الغرض اب ہمارے ہندوستانی عجائب خانوں کے خوابیدہ فرش، بیداری و سرگرمی کی اک رستخیز سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے! اب تک ہمارے "میوزم" نوادر کہنہ کے مردہ "نعش خانوں" سے کچھ ہی بہتر رہے ہیں! —— جہاں کبھی کبھی دیہی حوالیٔ شہر کے دہقانی، مویشی کے اک بھٹکے ہوئے گلّے کی طرح آگھستے تھے، جنھیں مہتممِ عجائب خانہ اپنے بجان متی کے کنبے کی نمائش سے مبہوت کر دیا کرتا تھا! عجائب خانے اپنے اصلی تمدنی مصرف و منصب کے لحاظ سے ملک کی تاریخ و ثقافت کے مراکزِ تعلیم واقع ہوئے ہیں! ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے قدیم، تاریخی اور لبریز مآثرِ علمی وطن کے عجائب خانے اپنا یہ موقف جلد از جلد حاصل کرنیکی جدوجہد کریں گے، اور پایۂ تخت کی محولہ بالا "موزیم کانفرنس" اس مطلوبہ عہدِ نو کا فتحِ باب ثابت ہوگی! ع

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا!

(ا۔ا۔خ)

نیشنل کانگریس اور ہندوستانی سوشلسٹ جماعت

انڈین نیشنل کانگریس کے شکمِ مادری میں ایک عرصے سے اک مولودِ نو کی ولادت کا شدید دَرد ِزہ اپنے سارے تشنج کے ساتھ نمایاں نظر آتا ہے! ایک معنی کر کے اس بچے کا وضعِ حمل عمل میں بھی آچکا ہے، اور "کانگریس سوشلسٹ پارٹی" کی صورت میں یہ طفلِ نو زائیدہ ہمارا کافی روشناس بھی ہو چکا ہے!

لیکن قسمت کی ستم ظریفی اور مادرانہ شفقت کی بوالعجبی یہ ہے کہ خود مادرِ کانگریس اُسے ہنوز اپنا نجیب الطرفین جگر گوشہ نہیں سمجھتی: وہ اپنے اِس (بہ خیالِ خویش) مجہول النسب بچے سے اپنی گود خالی کرنے کے درپے نظر آتی ہے! اور شاید عہدِ قدیم کی فراموش شدہ رسمِ دُختر کُشی کو تازہ کرنا چاہتی ہے! —— ہم کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی دُخترِ کمسن کو زبانِ حال سے یہ تلخ نوا شکوہ سنجی کرتے ہوئے پاتے ہیں۔

روزے کہ شود اذا السماء انشقت ۔۔۔ واں دم کہ بود اذا النجوم انکدرت

من دامنِ تو بگیرم اندر عرصات ۔۔۔ پُرسم صنما! بای ذنب قتلت؟

لطف یہ ہے کہ مسلسل دو سال سے کانگریس مہاراجی جن نوجوان مہاراج دھراج کی زوجیتِ صدارت میں ہیں —— ہمارے مُشارٌ الیہ راشٹر پتی جواہر لال نہرو ہیں! —— اُنھوں نے کانگریس سوشلسٹ پارٹی کو اپنی چہیتی اندرا کی طرح گود بھی لے لیا، تب بھی اس مادرِ مشفقہ نے اُسے "اچھوت کنیا" ہی سمجھا! بڑے بڑے "برہمنانِ کانگریس" اُسے کانگریس پنڈال کے "چوکے" میں ایک نظر دیکھنا نہیں چاہتے!

تاہم یاد رہے کہ بزرگانِ کانگریس کی یہ بہری و دیر آشنائی اپنا قدرتی دَور ختم کر چکی ہے! یہ کسی بعید مستقبل کی بات نہیں کہ کانگریس مہارانی کو اپنی راج گدی اپنی اس "منجھلی راجکماری" —— کانگریس سوشلسٹ پارٹی —— کے لئے خالی کرنی پڑے گی! اور وہ ہندوستان کی مجلسی تاریخ میں سوتیلی ماں کے بیہودہ جلاپے کی اک افسوسناک نظیر چھوڑ جائے گی! ؎

ہوشیار، اپنی متاعِ رہبری سے ہوشیار ۔۔۔ اے خلش نا آشنا پیری و شیب ہرزہ کار!

اُڑ گیا رُوئے نگار آسماں سے رنگِ خواب ۔۔۔ جھلملاتی شمع! رخصت ہو کہ اُبھرا آفتاب!

کام ہے میرا "تغیر" نام ہے میرا "شباب" ۔۔۔ میرا نعرہ، "انقلاب و انقلاب و انقلاب"!

باایں ہمہ ہم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ نیشنل کانگریس اور سوشلسٹ پارٹی کی باہمی آویزش مزید کاوش اختیار کرے، بقول پنڈت جواہر لال کے بالفعل ملک کی عام و منظم و کار آزمودہ جنگجو فوج کانگریس ہی ہے، اور جب تک کہ اُس کے ہاتھ میں پیکار آزمائی کا یہ پرچم ہے، نوجوان گروہ کو بھی اُس کی متابعت نیز بیعت سے عار نہ ہونی چاہئیے! لیکن ایک حقیقت ہماری اِس سیاسی جدّہ ماجدہ کے بھی گوش گزار رہے، کہ ہندوستان کی نجات کا مسئلہ اک "دوگونہ معرکہ" واقع ہوا ہے! —— ایک ہندوستانی مقہوروں اور برطانوی قیصریت پرستوں کے درمیان، دوسرا ہندوستانی محروموں اور ہندوستانی ہی

سرمایہ داروں کے مابین! نوجوان گروہ کا شکوہ و شبہ یہ ہے کہ قدامت نواز بزرگانِ کانگریس، ہندوستانی جنگِ حرّیت کو دوسرے خطۂ جنگ تک متجاوز ہونے دینا اپنے ذوقِ رجعت کے لئے کچھ زیادہ خوشگوار نہیں پاتے! اس طرح اُنکا جو کچھ مطمحِ نظر ہے وہ برطانوی "خداوندوں" اور ہندوستانی "بندگانِ عالی" کے درمیان اک انتقالِ اقتدار سے زیادہ نہیں ٹھہرتا! اپنی فطری ماہیت کے تقاضے سے یہ ماجرا ان فریقین کے درمیان "شرکتِ مالِ غنیمت" کا بن جاتاہے! —— درآنحالیکہ ہندوستانی قوم کا سوادِ اعظم —— کاشتکاران و مزدوران و عام غربا و مساکین —— خارج البلد ہو جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بدبخت ہندوستان صرف "آقاؤں کے مبادلے" کے لئے لڑا تھا؟! اگر تنقیح یہی اور اتنی ہی تھی تو اِس کے معنی نہ صرف یہ ہوئے کہ اصلی خلق اللہ کے کچھ ہاتھ نہ آیا، بلکہ اُس نے دوسروں کی تاج پوشی کے لئے، شکارِ ابلہ فریبی بن کر، یہ سارا عرق ریز اور خون سوز مجاہدۂ عظیم انجام دیا! ؎

کٹ مرانا داں خیالی دیوتاؤں کے لئے
شکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات!

تاہم ہمیں مستقبل کے مُقدرات سے یہ خوف نہیں! انقلاب، عوام کے لئے آتا ہے نہ کہ خواص کے لئے! مانسون کی طوفانی بارشوں کو اگر اُمراء اپنے صحن خانوں کے حوضوں میں مقید کرنا چاہیں گے تو صرف اپنے اِن تُنک ظرف آبدار خانوں کو دریا بُرد کریں گے! مناسب یہی ہوگا کہ ہمارے عمر رسیدہ و جہاندیدہ اکابرِ کانگریس، "مہاجنی" کے خط و خال کی شکنیں اپنی "جبینِ دولت" پر زیادہ نمایاں نہ کریں! اور ملک کی ممکن الاحتراز "تمدنی جنگ" (Civil War) کو وطن کے بیرونی معرکے سے پہلے دعوت نہ دیں!

"سوشیلسٹ پارٹی" کو بھی نہ خود کبیدہ خاطر ہونے کی ضرورت ہے، نہ راسخ الاعتقاد اربابِ کانگریس کو اُن کے وجود کو مخل کار یا مُخرّب تعمیر سمجھنے کا موقع! ہماری کانگریسی "حزب الاشتراکئین" بحالتِ موجودہ کانگریسی وزراء کی بہترین محتسب ہے، کانگریسی صوبجاتی حکومتوں کے اصلاحی و معاشی مہمات کے لئے اک مسلسل تازیانہ ہے، اور ڈکٹیٹر گورنروں اور منتخب وزیر اعظموں کے درمیان جمود کو روکنے کا اک بے خطا آلہ! —— "سوشیلسٹ پارٹی" کی مُنتظر موقع موجودگی میں کانگریسی حاملین وزارت و حکومت سے برطانوی قیصریت کا بگاڑ اک خونریز انقلاب" کی دعوت کے ہم معنی ہوگا! یادش بخیر "ٹائمز آف انڈیا" جو کانگریسی وزراء کے فضائل و مناقب میں یوں رطب اللسان ہے، وہ اِس قدر "لحُبّ علی" نہیں ہے جس قدر کہ "لبغضِ المعاویہ"! ؎

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں خنجر کھلا!

(ا-ا-ع)

پریزیڈینٹ کا دورۂ آسام!

پنڈت جواہر لال نہرو، صدر انڈین نیشنل کانگریس نے گزشتہ ماہ ہندوستان کے منتہائے مشرق و شمال کے گوشۂ آسام کا دورہ کیا۔ کانگریس کے اِس صدر نے اپنی سابقہ دو سالہ صدارت کے دوران میں کانگریس پنڈال کے اندر معلوم صدر نشینی زیادہ کی ہے، یا برِ اعظم ہند کے میدان و کوہستان میں گرداوری زیادہ! کانگریس نے صرف چند روز کے لئے جواہر لال کو اپنی مسندِ صدارت کی عزت بخشی، لیکن خود جواہر لال کی فرہاد صفت کوہکنیوں اور قیس مثال صحرا گردیوں نے اِس مسند کو اک ابدی شہ نشینِ عظمتہ وجلالتہ بنادیا! آج وسیع و عریض ہندوستان کے دشت دور کا چپہ چپہ جواہر لال کے دائماً گردش کُناں قدموں کے مَس سے گونج رہا ہے! ؎

سعیٔ پیہم ہے نشانِ قیس و شانِ کوہکن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت و کوہسار

اِس نازک بدن، لیکن حقیقتہً "رُوئیں تن" مردِ جوان کے اِس رہین آسمان کے قُلابے ملانے کی کوئی حد ہے، ہمارا یقین ہے کہ اگر مستقبلِ قریب میں کوئی "آل ایشیا یونین" کا خواب بار دَرِ تعبیر ہوا تو اُس کی سرکردگی و کارواں سالاری بھی ہمارا جواہر لال اتنی ہی چابکدستی و سبک پائی سے انجام دے لے گا، جس سے اُس نے کبھی شہر الہ آباد کی میونسپل کارپوریشن کے کاروبار کی سربراہی کی تھی! ؎

نگاہ روبرو اے رُوحِ عظمتہ داریں
بہوش باش کہ یزداں شکار ہیں ہم لوگ!

ہم حیران ہیں کہ جواہر لال، بال ہوا پر پرّاں ہے یا دوشِ برق پر سوار!
——— وہ آج آسام میں ہے تو کل صوبہ سرحد شمال و مغرب میں تھا، اور پرسوں
برما و ملایا میں! وہ سچ مچ ہمارا "مخدوم جہانیانِ جہانگشت" ہے! ———
ایسی شمعِ محفل: یہ سوز و گدازِ تن و جاں!!۔ اور ایسی شبلِ جام گردشِ مدام!؟

فیضیؔ! احسنت ازیں عشق کہ دوراں امروز
گرم داروز تو ہنگامۂ رسوائی را!

ہمارا دعویٰ ہے کہ جواہر نے تنِ تنہا مغرب کے سارے ڈکٹیٹروں کو، سرگرمی و گرم گامی، اضطراب و اضطرارِ ناشکیبائی و برق وشی کے میدان میں بمراحل پیچھے چھوڑ دیا ہے! ؎

ہم ہیں وہ گرم رہِ راہِ وفا جوں خورشید
سایہ تاک بھاگ گیا چھوڑ کے تنہا ہم کو!

کانگریس پریزیڈنٹ کا موضوعِ ذکر دورۂ آسام بعض معنی خیز اور انقلاب انگیز منظا ہر و مناظر رکھتا ہے! باوجود غیر کانگریسی صوبہ ہونے کے آسام میں اُن کا استقبال کانگریسی قلمروؤں سے بھی کچھ زیادہ شاندار ہوا، سرزمینِ ہند کے اس بعید گوشے میں اُن کا خیر مقدم سچ مچ وطن کے "بے تاج کے بادشاہ" کی طرح ہُوا! اُنھیں ریلوے اسٹیشنوں، پبلک مقاموں اور اُن کی نجی فرودگاہوں میں "خوش آمدی" کہنے والوں میں، بلا تفریق غیر سرکاری و سرکاری لوگ، ہندو و مسلمان فرقے، ہندوستانی و یوروپین طبقے، اور مرد و زن کے صِنفین یکساں شریک تھے! ؎

دو عالم نقدِ جاں بر دست دارند
ببازارے کہ سودائے تو باشد!

لُطف یہ ہے کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی ذہنی طور پر "پردہ نشین" آبادیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے، اُن سے براہِ راست خطاب و کلام کرنے کی اجازت بلکہ دعوت اِس مردِ حق و حریت کو دی گئی! پھر نہ صرف لوگوں نے اپنے چشم و گوش اُن کے پیامِ جاں نواز اور اُن رُوئے عشق خیز پر نثار کئے، بلکہ گراں قدر رقوم کی تھیلیاں اُن کے مجرے میں دیں! آسام کے مسلمان بھی اپنے تن من دھن کے ساتھ اِس ہجومِ عاشقاں میں شریک تھے! ؎

کشتے کہ عشق دارد نگذاردت بدینساں

(ا-ا-غ)

مَطلعِ عالم!

ڈاکٹر سید حسین نے رامجس کالج ہال، دریا گنج، دہلی میں "اسٹوڈنٹس فیڈریشن" (جمعیۃ الطلبہ) کے زیرِ اہتمام اک اجتماع کی تقریب سے ۱۴ دسمبر گزشتہ کو اپنی اک برق پاش تقریر میں لمحۂ حال کے سیاسی مطلعِ عالم پر سیر حاصل روشنی ڈالی! لیکچر کا ماحصل حسبِ ذیل ہے:

دُنیا پر جنگ و پیکار، اضطراب و عدمِ اعتماد کی اک مُزمن بیماری مستولی ہوگئی ہے! جنگِ عظیم (۱۴-۱۹۱۸ء) کی خونی و آتشین روشنائی سے لکھے ہوئے سبق یکسر فراموش ہوگئے ہیں! انگلستان کے سابقہ چند روزہ قیام و گشت کے دَوران میں یہ تحیر انگیز منظر دیکھنے میں آیا کہ شہروں کے کوچہ و بازار نوجوان آبادی سے تمام و کمال ویران ہوگئے ہیں! پُر امن ممالکِ عالم میں بھی اک نفسیاتی حالتِ جنگ کی فضا طاری ہے، اور ایک ایک نوخیز بُرو دوش مسلح کیمپوں سے پا بزنجیر ہے! اس وقت خطرے کے تین منطقے ہیں:-

(ا) **اسپین**:- جہاں اسما و رسماً تو اک "مدنی جنگ" جاری ہے۔ لیکن جو عملاً اک "بین الیوروپی محاربہ" بلکہ اک "بین الاقوامی معرکے" کا میدان کارزار بنا ہوا ہے! فضائے عالم میں اک سنگین تمدنی نزاع در پیش ہے ——— کمیونزم یا فاسزم؟ ایک لاکھ اطالوی سپاہی اسپین میں موجود ہیں! اور جرمن عساکر اس پر مستزاد ہیں! دوسری طرف روسی سرفروش اور آئرش جان باز اور مختلف اقوامِ عالم کے رضا کار جمہوریہ ہسپانیہ کے معروف عام "محاذِ خلق" پر سینہ سپر ہیں! اک قیامت کی رستخیز خونریز برپا ہے، جو روزِ قیامت ہی کی طرح طولانی و غیر مختتم ہے۔

(۲) **اٹلی اور جرمنی**: مسولینی اور ہٹلر بلا شبہ بڑی قہار و جبار ہستیاں واقع ہوئی ہیں، تاہم اُن کی آمرانہ نادر شاہی شہ نشینیں بڑی نازک اور متزلزل پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ قیصر جولیس کے خلف الصدق، سینار مسولینی اپنی "بینیٔ مبارک" ہی اِن شب و روز کی اُفتادوں کی نذر فرما چکے ہیں! جلیل القدر ہر ہٹلر ماشاء اللہ ۲۰۰ ارکانِ باڈی گارڈ کے حصارِ حراست میں رہتے ہیں اور ساری نقل و حرکت، خطرناک زمین سے بالا بالا کرۂ ہوائی میں بذریعۂ طیارہ عمل میں آیا کرتی ہے! یہ دونوں فرنگستانی آتش زن خاص

ڈائنامیٹ کے انبار لگا رہے ہیں، جنھیں صرف ایک چنگاری جبالِ ناز میں منتقل کر دے سکتی ہے، ذیلی طور پر مشرقِ قریب کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے، جہاں بعد جنگ کے اک کیسرِ مصنوعی و استبدادِ کوش نظم و نسق نے انبیا و رسل کی خنک سرزمین، فلسطین، کو اک جوش زن "دیگِ آتشیں" بنا رکھا ہے! ؎

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گِل میں ہے؟

(۳) **چین:** یہاں شاید بلا استعارہ اک قیامتِ کبریٰ گرم ہے! عظیم چین بجم کرور خلق اللہ کی ہم آہنگ تنہا جامعۂ بشری ہے! چند لاکھ چینیوں کے مقتول یا چند چینی علاقوں کے مفتوح ہو جانے سے یہ ظلمات ناپیدا کنار عبور نہیں کیا جا سکتا! پس مشرقِ بعیدہ کا چینی عرصۂ محشر غالباً مدّتِ دراز تک لالہ زار بنا رہے گا! جاپان کو جوع الارض کا موذی مرض بڑی طرح عارضِ حال ہے! تاہم ستم ظریفی یہ ہے کہ ؏

تیغ او جز لبسر و سینۂ یاراں نہ نشست!

دوسری طرف مشرق کا دوسرا عظیم ملک —— ہندوستان —— ہنوز برطانوی دولتِ مشترکۂ اقوام کے "شاہی زندان" کا محبوس اور امپیریلزم کے دام کا اسیر ہے،

یا دش بخیر برطانیۂ عظمیٰ جنگِ عظیم سے قبل کے تاریخی دور میں دنیا کی عظیم ترین بحری، بری، وسائلی، مالی، صرافی، اور اخلاقی قوت تھی، لیکن صرف دو عشراتِ سنین میں جو دیدنی انقلاب ظہور میں آ گیا ہے، اُس کا نقشہ یہ ہے کہ انگلستان آج امریکہ کا مقروض ہے —— اور اک نادہند مقروض"! بحری قوائے جنگی کے اعتبار سے انگریزی "ملکۂ بحر" تو دولت امریکہ کے ساتھ ہم نشینی کی لستی انگیز کر چکی ہے! پھر جنوبی امریکہ و مشرق بعید کی عظیم و زرریز تجارت گاہیں ریاستہائے متحدہ اور جاپان کے ملوک التجار کے نام "داخل خارج" ہو چکی ہیں: وادیٔ نیل اور وادیٔ گنگ کی کانہائے تجارتی بھی جزءِ انگلستانی "فرہادِ تجارت" کے تیشے کی زد سے پرے نکل چکی ہیں! مشرقِ ادنیٰ کے منطقۂ سیاسی میں برطانیہ کا زوالِ اقتدار اک عبرت آموز ماجرا ہے! براعظم یورپ میں انگلستانِ اعظم کی جو ہوا خیزی ہوئی ہے وہ اب اک طشت از بام رسوائی ہے، وہ نوخیز اٹلی اور اعادۂ شباب یافتہ جرمنی کی مسلسل لکدکوبی کا ہدف اک نعشِ بجیں بنا ہوا ہے! ؎

عظمۃ و جبروتِ یزداں را ببیں   انقلابِ روم و المآں را ببیں!

تاہم معذور و معزول انگلستان کے معنی اک آزاد و تاجپوش ہندوستان کے نہیں! یہاں اک صدائے غفلت شکن رسید کرنے کی ضرورت ہے! بہترین بیرونی و بین الاقوامی نقشۂ بساطِ سیاست بھی ہمارے لئے کوئی "زرین موقع" نہیں ہو سکتا! شاید یہاں "لسان الغیب غالب" ہمارا خضرِ راہ ہے، جب کہ وہ کہتا ہے کہ ؏

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو!   (ا-ا-خ)

جنگِ چین!

فی الحال تو چینی افواج، جاپانی چنگیزیوں کی یلغار کے سیلِ بے پناہ کے سامنے خس و خاشاک ہو کر بہہ گئی ہیں! —— اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ موجودہ آویزش پہلا موقع ہے کہ جمود و سکوت کے افیون نوش چینیوں نے حربیت و عسکریت کی شراب دوآتشہ سے بدمست جاپانیوں کا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے متعدد معرکوں میں سامنا کیا، مارشل چیانگ کائی شیک" کے روح پرور وجود کے نانکنگ سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی پایۂ تخت کے حصار کے قلعہ بند چینی لشکر نے مسلسل ایک ہفتے تک شبانہ روز حملہ آور غنیم کی اژدر دم توپوں اور بلائے آسمانی طیاروں کی برپا کی ہوئی قیامت میں جو آتش و خون کا غسل کیا ہے، وہ "جدید چین" کے شاندار رزمیہ کا عنوانِ جلی ہے! آئندہ کے متعلق بھی چینی سرعسکر، مارشل چیانگ، کے اعلان کی رو سے چینی شطرنجِ جنگ کی بساط کا مجوزہ نقشہ یہ ہے کہ وہ شہروں اور متمدن مرکزوں کے بجائے دیہات و مفصلات کے کھلے میدانوں میں قزاقی جنگ کے منصوبے رکھتے ہیں! —— جبکہ جاپانی افواج وسیع مفتوحہ علاقوں میں منقسم و منتشر ہو جائیں گی، اور اپنے خطوطِ مواصلات کی حفاظت اور اپنے غیر کمر گشتہ لشکر کے راتب کی بہم رسانی میں مخصوص دشواریوں سے دوچار ہوں گی،! چین کی "سرخ" سپاہ اسی موقعے پر خون کی اک ہولی کھیلنے کی منتظر ہے۔

پھر جنگِ چین و جاپان میں اُس وقت تک متعدد بیرونی مداخلتوں کا بھی احتمال ہے: اپنے جہازوں پر حال میں جاپانی دست درازی ہونے پر امریکی اور برطانوی حکومتوں نے جو سخت گیرانہ نوٹ ٹوکیو کو رسید کئے ہیں،

اُن میں اپنی زور آزمائی کے لئے اک حیلۂ جوئی مضمر پائی جاسکتی ہے۔ آگے جاکے چینی "جاپانیوں" میں اس قسم کے مزید "خونی" حوادث پیش آسکتے ہیں، اور انگریزی، امریکی جاپانی مُثلثی تصادم کے آثار کو قریب تر کر دے سکتے ہیں، سرزمین چین میں اپنے گوناگوں تجارتی و تمدنی منافع و مصالح کے تحفظ کے لئے یہ آخری مہلت ہے! چین کا لقمۂ تر ہنوز جاپان کے حلق میں ہے، لیکن بہت جلد وہ تین کے "ڈریگن" کے معدۂ جہنم میں ہضم ہو جائے گا! سوویٹ روس کی قسمت آزمائی بھی شاید ان خیالات میں اپنے تذبذب کو ترک کر دے! چینی جاپانی پیکار میں اُس کی انگلیاں گو روزِ اول ہی سے ہیں، حال میں کثیر التعداد مزید طیاروں کی چینی کارزار میں ارسال، نیز ماسکو کی شہ پر چینی شیرازۂ حکومت و سیاست کی ترتیب جدید ——— جس میں قوم کے سوادِ اعظم کے اغراض و مقاصد کی رعایت اُس کی خصوصیت خاصہ ہوگی، ——— اک معنی خیز اقدام کے پیامبر کی طرح مسموع ہوتی ہے! چین کے اندر روسی پیام کیمونزم کی راہ میں چیانگ کائی شیک کی غالی قوم پرستی مدتوں سنگ راہ رہی ہے! اب بعد خرابی بسیار وہ چینی ولدادگانِ سوشلزم کو ملت کا اک جزوِ لاینفک تسلیم کرنے کے آمادہ ہوا ہے! شاید یہ رو براہی بعد از وقت ہو، تاہم یہ تاخیر علاجِ کار بھی غنیمت ہے،

ابھی تک انگلستان و فرانس، بحر الروم اور اسپین کے معلومہ حالات میں گرفتار رہے ہیں، روس اپنے داخلی "فتنۂ بیدار" سے پریشان رہا ہے! نیز جرمنی و اٹلی کی طرف سے اک بیرونی حملے کی تہدید کی خبر گرم سے حیران! روم و برلن کا خطِ سیاسی "جو آناً فاناً ٹوکیو تک وسعت پذیر ہو گیا ہے، اُس نے ان تمام ایام میں سوویٹ روس کو لرزہ براندام اور اُس کا خواب و خور حرام رکھا ہے! تاہم انگلستان و امریکہ کی شرکت کے بعد بساطِ سیاست اُلٹ جائے گی! اُس وقت مسولینی و ہٹلر کی تیس مار خانیاں انگشتِ حیرت در دہاں رہ جائیں گی! پھر یہ بھی ناممکن نہیں کہ سُرخ روس کا ایک ہی احمرین چھینٹا جاپانی چہرے کو فق کر دے۔

پس کھیل ابھی ختم نہیں ہوا ہے! اگرچہ جاپان کی مخفی آرزو یہی ہے! "فتح نانکنگ کے بعد جاپانی افواج کا جشن و حکم کرکشائی، نیز جرمنی کی جانب سے بحیثیت "وسیط" کے فریقین کو پیشکشِ صلح، ان سب باتوں میں یہی عندیہ مرکزِ خاطر نظر آتا ہے! جرمنی، چینی، جاپانی ڈرامے میں شاید وہی "رول" کھیلنا چاہتا ہے جو حبش کے اسٹیج پر موسیو لاویل نے کھیلا تھا، اور جس جنگ زرگری میں برطانوی نظارتِ خارجہ کو بھی شریکِ سازش کر کے، پیرس کی بدنام "ہور لاویل تجاویز" معرضِ تشکیل میں آئی تھیں! ——— اور جن کا منشا یہ تھا کہ "اب جبکہ مالِ مسروقہ خانۂ رہزن کو منتقل ہو گیا ہے تو پھر محتسب را درونِ خانہ چہ کار؟!"

ہاں، چین، حبش کی طرح نہ حقیر و ناچیز ہے، نہ منقطع و گوشہ گیر، نہ بے وسیلہ و کسمپرس، نہ محرومِ حکومتِ نیابتی، نہ ناآشنائے عزمِ قومی! قبل اس کے کہ ہم چین کا آخری انجام دیکھیں، ہمیں بہت کچھ دیکھنا ہے! ع

صورتِ آئینہ سب کچھ دیکھ اور خاموش رہ!
شورشِ امروز میں محوِ سرودِ دوش رہ!

(ا۔ ا۔ خ)

پھول مٹھی میں اگر کچھ دیر تک رہتے ہیں بند
ہات میں ہوتی ہے پیدا اک معطر سی نمی
یونہیں جب کچھ دیر کرتا ہوں تصور حُسن کا
سانس میں ہوتی ہے خوشبو، اور آنکھوں میں تری
اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ جاناں نے مجھے
بھینچ کر آغوش میں تا دیر چھوڑا ہے ابھی

(جوش)

ضروری اطلاع

ہندوستان کے ہر دلعزیز رسالہ "کلیم" دہلی کی سول ایجنسی امرتسر میں نارورن انڈیا پبلسٹی سروس رجسٹرڈ ہال بازار امرتسر والوں کے پاس ہے۔

نقد و نظر!

ادارۂ کلیم

(۱) "گُل فروش"، دہلی

پایۂ تخت کے اس مُصوّر سیاسی و ادبی ہفتہ وار پر عرصہ ہوا ہم نے اک سرسری ریویو کیا تھا، صرف یہی نہیں کہ وہ سطحی نظر اک عمیق تر جائزے سے بدلی جانیکی طالب ہے، بلکہ گزشتہ دو تین مہینے کے دوران میں اخبار مذکور کی ظاہری و معنوی حیثیت میں اک نہایت خوشگوار تغیر ظہور میں آیا ہے جو اک نظرِ ثانی کا متقاضی ہے! ہم گلفروش کے صیغۂ ادارت و اہتمام کو مستحق مُبارکباد سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنے ماضیٔ قریب میں اک معتدبہ ترقی و بہتری کی چھوٹی سی مُہم سر کی ہے، ہمارے ملک کی علمی و ذہنی فضا ادبی صحافت کے لئے سازگار نہیں ہے، پس ایسی ہمت شکن ماحول کے علی الرغم اگر کوئی ہندوستانی رسالہ یا اخبار محض اُفتاں و خیزاں جاری بھی رہے تب بھی کافی داد کا مستحق ہے! اور اِس ریگزارِ خشک و گرم میں ترقی و سرسبزی کے کسی "نخلستان" کو نشوونما دے لینا تو اک "جوئے شیر" لانے سے کم نہیں! ہم "گُل فروش" کی تازہ "نشاۃِ ثانیہ" کو کچھ ایسی ہی "کوہ کنی" سمجھتے ہیں! جناب محمود مورّخ صاحب بی اے، عملۂ ادارت کے "میر کارواں" ہیں، اور گلفروش کا موجودہ دَورِ جدید بیشتر اُنہی کی کاوشوں اور عرق ریزیوں کا ثمرہ ہے! ہم اپنے مجوزہ مفصل نقد کو اب بھی ملتوی کرتے ہیں، بہت جلد "گلفروش" اپنے اک اسپیشل نمبر کی صورت میں "تازہ گُل" کھلانے والا ہے، ہم اُس کے "گُلِ حُسنِ بسیار" سے اپنے "دامانِ نگاہ" کو اُسی وقت گُل بدامن بنائیں گے! یار زندہ صحبت باقی!

(ا-ا-خ)

(۲) (ماہنامہ) "تنویر"، بمبئی

چوڑا رسالجاتی سائز۔ ضخامت ۸۰ صفحات، کتابت و طباعت، و کاغذ بدرجۂ اوسط، لوح مُصوّر و رنگین مع دو تین تصاویر آرٹ پیپر۔ زیر ادارت "سحر" صاحبہ، چندہ ہے سالانہ۔ مرکزِ اشاعت، ۸۰ عبداللہ بلڈنگ، کھتر ڈوسا نگلی اسٹریٹ، بمبئی ۸،

یہ اک نو اشاعت زنانہ ادبی و اصلاحی رسالہ ہے، جو اردو زبان کے کسی قدر سنگلاخ خطے، مغربی ہند سے شائع ہوا ہے، ہمارے سامنے (الغرض ریویو) اُس کا تیسرا نمبر ہے۔

تنویر اس معاملے میں خوش قسمت ہے کہ اُس کو ادبی ہندوستان کی بعض ممتاز شخصیتوں کے مبارکباد نامے نصیب ہوئے ہیں، پھر "شاعرِ انقلاب" کا منظوم پیامِ تہنیت، جو زیرِ نظر اشاعت کے صفحۂ اول کی زینت ہے، بلاشبہ اک مایۂ نازش فخر ہے! صنفِ لطیف کا عنصر، اجتماعی تحریکات کے اسلحہ خانہ میں جو ڈائنامیٹ کی حیثیت اور جو دوگونہ رزم و بزم بہم پہنچاتا ہے اُس کا سحر بیان، دو ایک شعروں میں ملاحظہ فرمائیے:

ہاں یہ عورت ہی میں قوت ہے کہ وہ چاہے اگر
بطنِ شبنم سے شرر پیدا ہوں، آہن سے گہر!
رقص کرتا ہے زمانہ عورتوں کے ساز پر
کارواں چلتے ہیں اُن کے شعلۂ آواز پر!

تنویر کے صفحات میں اک خاص جان و جولانی کروٹیں لیتی محسوس ہوتی ہے۔ جوشؔ صاحب کے اس شعر میں شاید جائز شاعرانہ جوشِ بیان سے برائے نام ہی کچھ زیادہ مُبالغہ ہوگا کہ:؎

اس کے ہر اک حرف میں غلطاں ہے ذہنی انقلاب
دوش پر اُس کے ہے روشن عصرِ نَو کا آفتاب!

جوانِ ہمت سحرؔ صاحبہ کی جد و جہد کا یہ کرشمہ قابلِ ذکر ہے کہ تنویر کے تحریری حلقۂ معاونین میں حضرتِ آزادؔ انصاری، حضرتِ فراقؔ گورکھپوری، حضرتِ محمودؔ اسرائیلی، حضرتِ جگرؔ مرادآبادی، حضرتِ ساغرؔ نظامی وغیرہم

ایسے خواص واکابر ابھی سے شریک ہیں؛ خود شہر بمبئی کے اندر تنویر وہاں کے بہترین ادبی قلمکاروں کی توجہات کو حاصل کرنے میں کامیاب ہُوا ہے۔ چنانچہ حصۂ نثر میں جناب عبد الحق صاحب "ودیارتھی" اور جناب مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی کے علمی و ادبی مقالے ممتاز چیزیں ہیں۔ خود سحر صاحبہ کی "ضوفشاں" "نگارشین اک" ادبی سرجری" کی برق دم نشتر کاریاں ہوتی ہیں! "نائب مُدیر" کے ترجمے اور شذرے "رنگ درد ستی" کے دلچسپ مُرکب واقع ہوئے ہیں! ہم تنویر کا خیر مقدم پوری گرمجوشی سے کرتے ہیں، اور اُس کی درازیٔ عمر کے لئے دُعاگو ہیں! (ا-ا-خ)

(۳) پیمانہ، میرٹھ

درمیانی کتابی قامت، کاغذ وکتابت وطباعت پاکیزہ، ضخامت ۵۰ صفحات، مع متعدد تصاویر آرٹ پیپر، چندہ سالانہ . . . .

شائع شدہ ادبی مرکز، میرٹھ۔

جناب صہبا کی براہِ راست ادارت میں، اور حضرت ساغر کی سیاسی سیادت میں، یادش بخیر "میخانۂ اکبرآباد" کا سابق "پیمانہ" اب ادبی مرکز، میرٹھ کی بزم رندان کے اندر دوبارہ "گردش" میں آیا ہے۔ پیمانہ پر بہت سی گردشیں آئیں، لیکن اُس کا "دورِ جام" اور سرشارِ شعر وادب ساغر کا صحافتی "شرب مُدام" ہمیشہ یہی وِرد کرتا رہا کہ ع

حب تک بس چل سکے "ساغر" چلے!

"ساغر" کی سرمستیاں صہبا کے ہاتھ میں "دو آتشہ" کی شررافگنیوں کے مناظر رکھتی ہیں! "پیمانہ" کے شذراتی "جرعات" اور "یا ۔ اِن میکدہ" کی "خرابات" "دورِ اول" سے بھی کچھ زیادہ شرابور ہے! بعض "چھینٹے" تو سینوں میں نہاہی دیتے ہیں! تاہم حضرت "سیماب" کو اب زیادہ "ماہیٔ بے آب" بنانے سے کیا فائدہ؟! پیمانہ کا نثری حصہ بھی عمومی ادبیات کے تمام معروف ومتداول شعبوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہاں ہم رنگ وبُو، اور ذائقہ وتغذیہ دونوں پاتے ہیں! (ا-ا-خ)

(۴) شاہکار گورکھپور

ضخامت ۵۰ صفحات، کاغذ وکتابت وطباعت، درجۂ دوم کی، مُصوّر و رنگین لوح منقوش مُرقع سابق اساطینِ ادب نثرِ اُردو، چندہ ہے رسالانہ، شاہکار خاصا متین ومُفید رسالہ ہے، اُس کے مضمون نگار، کم وبیش بلا استثنا اک مسلمہ پایۂ ادبی رکھتے ہیں، اور موضوعاتِ تحریر بھی عموماً اہم ووقیع پائے جاتے ہیں؛

شعرا میں حضرت فطرت واسطی کامیاب نیچرل شاعر ہیں۔ شبلی نعمانی مرحوم پر گوری سرن لال صاحب جوہر، بی اے، کا مختصر مقالہ بلاشبہ اک اجتہادی لب ولہجہ رکھتا ہے، تاہم شبلی کے شاعرانہ مرتبے کے متعلق اُن کا نظریہ محلِ نظر ہے! اسی طرح مولٰنا حسین احمد صاحب کی اک فرضی سیاسی قلابازی پر حکیم عارف صاحب کا احتساب اک "نیم حکیمانہ" تشخیص سے زیادہ معلوم نہیں ہوتا! "جانشینِ شیخ الہند" ہر ممکن شبہ وواہمہ سے بالاتر اک زبردست مجاہدِ حق اور مجتہدِ فکر واقع ہوئے ہیں! "عارف" صاحب کو ذرا بہتر "معرفتِ حقیقت" کا ثبوت دینے کی ضرورت تھی! (ا-ا-خ)

(۵) ہندوستان (ہفتہ وار)

اوسط اخباری سائز، ۱۶ صفحی ضخامت، کاغذ و عام گیٹ اپ وغیرہ پاکیزہ، چندہ سالانہ ہے، دفتر ہندوستان، نیل روڈ لکھنؤ

ہندوستان اک جدید الاشاعت سیاسی ومعاشی پرچہ ہے، اس کا مخاطب غربا ر وعوام الناس کا طبقہ معلوم ہوتا ہے! تاہم وہ اک عام مطالعے کا بھی ہر دل عزیز سیاسی آرگن کہا جا سکتا ہے! عملۂ ادارت اور حلقۂ مضمون نگاران کی اکثریت، یو۔پی کے مُسلم کانگریس مین اور مُسلم سوشلسٹ ہیں، جن کے سامعین اُصولاً وعموماً مسلمان غربا رو محرومین ہیں! "ہندوستان" یو، پی میں کانگریسی تحریک دربارۂ قیام "رابطۂ عوام مسلمین" کا علمبردار ہے! اپنی زبان وبیان، انتخابِ موضوعات، اخذ وتلخیصِ اخبار ومعلومات وغیرہ وغیرہ کے اعتبار سے وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہوتا نظر آتا ہے! خدا ہمچنیں کناد! زیرِ نظر نمبر میں مُعین احسن جذبی کی نظم "ہلالِ عید" اشتراکی ادب کا اچھا پارہ ہے! (ا-ا-خ)

(۶) کاروان پٹنہ

ضخامت ۳۲ صفحات، کاغذ وکتابت وطباعت خاصی خوب۔

چندہ عہ سالانہ، پتہ - کاروان بکڈپو، دفتر کاروان، بانکی پور - پٹنہ

کارواں اک خاصا کم خرچ بالانشین ماہنامہ معلوم ہوتا ہے! مضمون نویسوں یا افسانہ نگاروں میں جناب ایم اسلم صاحب، جناب عبد الباقی صاحب بی اے (جامعی) اور جناب اختر قادری بی اے (آنرز) قابلِ ذکر ہیں! کارواں کا یہ عین افتتاحی نمبر ہے! "اشاعتِ انقلاب" کی اک عمیق فلسفیانہ نظم "راہِ تلاش" کی اسمیں اشاعت، کارواں کے مرحلۂ ماہِ اول کو طے کرنے کا اک ایسا کمال ہے جو "سفر" لکانہ "آشنائی راہ ورسمِ منزل" کا معنی [illegible] (ا-ا-خ)

از

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

کی وجد آفریں نظموں کا مجموعہ جو مندرجۂ ذیل ابواب پر منقسم ہے

(۱) نگارخانہ (۲) خمریات (۳) تاثرات (۴) مطالعۂ فطرت (۵) نسیب

ہر نظم اپنی جگہ مکمل، مرصع اور کیفیاتِ شعری میں ڈوبی ہوئی ہے، اور اس کے سحرکن نغمے، دل و دماغ کے لئے ایک مستقل سکون اور روح کے لئے ایک خاص سرور کا باعث ہوتے ہیں، لکھائی چھپائی نفیس اور دیدہ زیب ہے

قیمت غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔ مجلد دو روپے (عہ)

کلیم بک ڈپو۔ حسینی لو اس نمبر ۴۔ دریا گنج، دہلی سے منگائیے

شعلہ و شبنم

از

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

کی پرجوش اور کیف آور نظموں کا مجموعہ ہے، جو آپ کو آتشکدے کی شعلہ افشانیوں، اسلامی شان و حریت کے خون کھولا دینے والے واقعات۔ بادۂ سرجوش کی سرمستیوں اور گلبانگِ فطرت کے روح پرور نغموں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دے گا،

شاعرِ انقلاب کا یہ لافانی شاہکار غیر مطبوعہ کلام سے مرصع ہے

کتاب مجلد ہے اور نہایت خوشنما گرد پوش سے آراستہ ہے

قیمت صرف تین روپے — کلیم بکڈپو حسینی لو اس نمبر ۴ دریا گنج دہلی

اُردو زبان کا بلند پایہ و ارزاں ترین ماہوار

رسالہ

یثرب لاہور

ماہ اکتوبر کے پرچہ میں مندرجہ ذیل مضامین ملاحظہ فرمائیں

(۱) واقعات وواردات (مسائلِ حاضرہ پر تبصرہ) (۲) ترکی تاریخ کا ایک غیر معروف صفحہ (ایک دلچسپ تاریخی افسانہ) (۳) دوشیزۂ مصر (ایک مصری ناول کا مسلسل ترجمہ) (۴) مشاہیر اسلام و دنیائے اسلام کی بڑی بڑی شخصیتوں کے عجیب وسبق آموز حالاتِ زندگی) (۵) سراہیر و بزرگانِ اسلام (ایک قابلقدر تاریخی جواہر ریزہ) (۵) دنیا کے امن کو کیا ہوا (سیاسیاتِ یورپ پر ایک دلچسپ بحث) (۶) انگلستان میں تحریکِ عریانی (ایک دلچسپ انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ) (۷) سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی نذر (۸) ابنِ خلدون۔ عہدِ گزشتہ کے مشہور ترین مورخ کی سوانح حیات) (۹) مشہور و معروف انگریزوں کے ہندوستان کے متعلق مقولے (۱۰) سبق (ایک نہایت ہی دلچسپ افسانہ) (۱۱) محاصرۂ بیت المقدس (تاریخ عروج و زوالِ امم کا ایک دردانگیز افسانہ (حضرت مولانا ابو الکلام آزاد کے قلم سے (۱۲) سلطان نورالدین زنگیؒ (۱۳) بدوی حمیت (ایک دلچسپ تاریخی مضمون) (۱۴) عہدِ حاضر و گزشتہ (۱۵) حصہ نظم۔

یثرب، ہر ماہ ۳۰x۲۰/۸ سائز پر شائع ہوتا ہے۔ حجم سا ٹھ صفحات طباعت وکتابت نہایت اعلیٰ۔ ٹائیٹل پیج رنگین اعلیٰ ولایتی کاغذ کا ہوتا ہے۔

چندہ سالانہ صرف ایک روپیہ

نمونہ مفت

منیجر رسالہ یثرب لاہور

بچوں اور بچیوں کا باتصویر ماہوار رسالہ

پیامِ تعلیم دہلی

یہ رسالہ محض بچوں کی خاطر جاری کیا گیا ہے، اس میں اُن کی دلچسپی کی ہر چیز ہوتی ہے، اچھے اچھے اور مزے دار قصے، کہانیاں، مفید اور دلچسپ معلومات۔ لطیفے مفید مشغلے۔ لیتھو اور بلاک کی اچھی اچھی تصویریں وغیرہ وغیرہ۔ غرض اسے پڑھنے کے بعد اُنھیں کوئی دوسرا مشغلہ تلاش کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، پچھلے سال سے ضمیموں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے۔ ان ضمیموں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ایک انجمن بھی "پیام برادری" کے نام سے کھولی گئی ہے۔ اس انجمن کے ذریعہ ان کے لئے نئے نئے دوست فراہم کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے، تاکہ مفید مشغلوں میں وہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔ اسی خیال سے اس کا چندہ بھی صرف دو روپے آٹھ آنے رکھا گیا ہے۔ اسی چندہ میں سالانہ بھی دیا جاتا ہے۔ یہ سنکر شاید تعجب ہو کہ ہندوستان کی کوئی دوسری زبان اب تک "پیامِ تعلیم" جیسا سالنامہ نہ پیش کر سکی۔

فوراً خریدار بن جائیے تو سالنامہ **مفت** ملے گا، ورنہ ۱۲ر آنے بھیج کر منگانا پڑے گا۔ سالنامہ ۲۹ر اکتوبر کو شائع ہوگا۔

مکتبہ جامعہ۔ قرول باغ، نئی دہلی

اس کو ضرور پڑھیے

خط وکتابت کرتے وقت خریداری نمبر ضرور لکھیے، اور جواب طلب امور کے لئے ایک آنہ کے ٹکٹ ارسال فرمائیے۔ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع ہر مہینے کی ۱۰ تاریخ تک آجانی چاہیئے۔ ورنہ پرچہ قیمتاً ارسال ہوگا۔ نمونہ کے لئے ساڑھے نو آنے کے ٹکٹ ارسال فرمائیے۔

منیجر کلیم دہلی

حکومت چین کی مرکزی نگرانی کمیٹی کا شاندار دفتر

جلد ۵ | بابتہ ماہ فروری ۳۸ء | نمبر ۲

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ کلیم جنیتی تواس نمبر ۹ دریا گنج دہلی سے شائع کیا)

اشارات

مدیر

سال نامہ

بعض احباب نے شکایت کی ہے کہ "کلیم" کا سال نامہ کیوں نہیں نکالا گیا،
حالانکہ شکایت یہ کرنا چاہئے تھی کہ سوگ نامہ کیوں نہیں نکالا گیا۔
سال نامہ وہ نکالے جس کا ملک آزاد، اور جس کی قوم آسودہ حال ہو
—— سال نامہ وہ نکالے جس کا ہر نوروز اُس کے ملک اور، اُس کی قوم کے لئے
ایک تازہ بشارت لاتا، اور ایک نئے فتح باب کا مژدہ سُناتا ہو۔
میں حیران ہوں، اور اپنی قوم کے جذبۂ غیرت کی افسردگی پر شرمندہ
بھی کہ ہمارے مدیر کس مُنھ سے سالنامے نکالنے کا ارتکاب کیا کرتے ہیں۔
اوّل تو عیسوی سال سے ہم ہندوستانیوں کو محکومی کے علاوہ،
کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں کہ ہم اُس کی پہلی جنوری کو یومِ جشن قرار دیں، ——
اِس کے علاوہ ہمارے سیاسی اور اُسی کے نتیجے میں اقتصادی حالات
اس ہولناک حد تک تاریک اور ڈراؤنے ہیں کہ ہمیں نوروز کے موقع
پر شادیانے بجانے کے عوض ماتم کرنا چاہیے، ماتم کرنا چاہیے اس بات کا کہ
ہم اب تک علیل و ذلیل ہیں۔
اُن لوگوں کو جو سالہا سال سے بیمار ہیں، تہواروں کے موقع پر آنسو
بہاتے ہی دیکھا جاتا ہے کہ افسوس یہ سا تہوار بھی بیماری ہی میں گزر گیا، اور
ان بدبختوں کو جو مدتوں سے نامراد چلے آرہے ہیں، ہر فصلِ گل کے زمانے میں
یہی ماتم کرتے دیکھا جاتا ہے کہ ع
اب کی بھی دن بہار کے یونہیں گزر گئے

لیکن خدا جانے ہماری صحافتی برادری کو پہلی جنوری کو کیا دولت بیدار
مل جاتی ہے کہ وہ بڑے بڑے پیمانوں پر سالنامے نکال کر جشن مناتے ہیں اور
اپنے قلیل وسائلِ معاش کو بُری طرح مجروح کرکے مفلس سے مفلس تر بنتے چلے
جاتے ہیں۔
کیا نوروز کے موقعے پر کسی پُرانے بیمار کو کبھی یہ نعرۂ مسرت بلند کرتے
دیکھا گیا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ آج میرے مرض کا بارہواں سال شروع ہوا
ہے؟ اور کیا یہ ایک حقیقتِ مسلمہ نہیں ہے کہ محکومی، دنیا کے تمام مہلک امراض
کی ماں ہے؟ اور کیا جنوری کی ہر پہلی تاریخ یہ اعلان نہیں کرتی کہ اے ہندوستانیو
آگاہ ہو کہ تمہاری غلامی کی عمر میں آج ایک سال کا مزید اضافہ ہو گیا ہے؟ اور
کیا اس موقعے پر ہمارا جشن منانا گویا بہ الفاظِ دیگر یہ اعلان کرنا نہیں ہے کہ خدا
کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم اب تک غلامی میں گرفتار اور غلامی کی جمیع ذلتوں سے
ہمکنار ہیں؟
جس طرح جرائم پیشہ بچوں کی ماں، کوتوال کا نام سُن کر کانپنے لگتی ہے،
بالکل اسی طرح جب دسمبر کی اکتیسویں رات کو میں بستر پر دراز ہوتا ہوں تو
انتہائی پشیمانی کے ساتھ غور کرتا رہتا ہوں کہ کل صبح کو جس وقت آزاد قوموں پر
چمکنے والا آفتاب مشرق سے طالع ہوگا، تو میں کیا مُنھ لے کر اُس کے سامنے
جاؤں گا —— اسی اُدھیڑبُن میں کروٹیں لیتے لیتے جب سو، یا یوں کہیے کہ بیہوش
ہو جاتا ہوں تو ایسے ایسے ڈراونے خواب دکھائی دینے لگتے ہیں کہ اللہ کی
پناہ۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کوثر و گنگا کے دھارے، نیولے اور سانپ کی طرح
ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہیں، پاجامے اور دھوتیاں دونوں

ہاتا پائی کر رہے ہیں، تسبیحوں اور زناروں میں رسہ کشی ہو رہی ہے، اذانیں اور ناقوس ایک دوسرے کا منھ نوچ رہے ہیں اور داڑھیاں اور چُٹیاں ایک دوسرے کی ناکوں پر حملے کر رہی ہیں، مندر دانت نکالے ہوئے غرا رہے ہیں، مسجدیں کاندھوں پر ڈنڈے رکھے چنگھاڑ رہی ہیں اور ان دونوں کے پیچھے کوڑھیوں کا ایک گروہ ہے جو تھوڑے فاصلے پر دبکا ہوا قہقہے مار رہا ہے ------
------ کہ یکایک گھبرا کر میری آنکھ کھل جاتی ہے، اور آنکھ کھلتے ہی میرے کان میں نو روز کے آفتاب کی یہ آواز گونجنے لگتی ہے کہ میں ہوں آزاد قوموں کا قدر شناس آفتاب، اے ہندوستانیو! بتاؤ تم زندگی کی کس منزل میں ہو ---- میں نے اپنی گردش کے سلسلے میں تمھیں دس بیس، سو دو سو نہیں، بلکہ کامل تین سو پینسٹھ موقعے دئے، کیا واقعی تم نے میرے دئے ہوئے ان سیکڑوں فیاضانہ مواقعے میں سے کسی ایک موقعے سے بھی اب تک کوئی فائدہ نہیں اٹھایا؟ تم کس قسم کے انسان ہو؟ آفتاب کا یہ نعرہ سنتے ہی میں کانوں میں انگلیاں دے لیتا ہوں، اور چھت کے نیچے سے نکلنے کی جرأت نہیں کرتا۔

ایک دوسرا خط

یاد ہوگا کہ جنوری ۳۸ء کے "کلیم" میں ایک صاحب کا خط مع جواب شائع کیا گیا تھا، اب انھیں صاحب نے میرا جواب الجواب روانہ فرمایا ہے، جو جواب کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے ---- ممکن ہے قارئین "کلیم" اس سے کچھ حاصل کر سکیں۔

مکرمی جوش صاحب تسلیم: آپ کا دعویٰ باطل، فیصلہ حق کا تب خطِ ہذا

آپ نے مدراس کے خریدار کا خط شائع فرما کر اپنے خیالات ظاہر فرمائے ہیں، گویا کہ خط شائع کر کے آپ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ آپ سیاست کے ایسے ماہر ہیں کہ خط میں جو وجوہات بیان کئے گئے ہیں وہ سب لغو ہیں، اور آپ نے جو رائے قائم کی ہے وہ ضروری ماننے کے قابل۔ حضرت آپ مدہوش ہیں کانگریس کے نشے میں، اور یہ نشہ بغیر ترشی کے نہیں اتر سکتا۔ وقت آ رہا ہے، انشاء اللہ تعالیٰ آپ جیسے منافق راہِ راست کو تسلیم کر لیں گے۔ میں بہانگ دہل آپ سے عرض کرتا ہوں کہ کانگریس "اسلام" "اہل اسلام" اور تمدن اسلام" دشمن ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ایسے زبردست عالی شان رئیس ہیں۔ یا رئیس بننا چاہتے ہیں جو اپنی غریب رعایا کی حالت سے بالکل بے خبر ہے۔ جناب مہربانی فرما کر اپنی کھال میں رہئے جس طرح آپ اپنی رائے کی مالک ہیں، اسی طرح ہر شخص مختار ہے۔ روایاتِ کہن یعنی اسلامی روایاتِ کہن کا آپ اپنی نئی تہذیب سے مقابلہ کر کے اپنی بالغ نظری کا ثبوت پیش کر رہے ہیں، حالانکہ نئی تہذیب اس قدر عریاں ہے کہ اب اس کے پرستار بھی دہائی دے رہے ہیں۔ دوست اگر تم اس جوشِ جنون میں کچھ بچا کر اپنے عشرت کدے سے نکل آؤ تو تمھیں معلوم ہو کہ برادرانِ وطن کا غریبوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہے، مگر اب تو تم نے اپنی قیمت بہت بڑھالی ہے۔ پچیس روپیہ فیس، سیکنڈ کلاس کا کرایہ۔ بہرحال مختصر یہ ہے کہ اس خط کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ آپ پر بھی صادق آتا ہے، اور اب آپ سمجھ لیجئے کہ وہ آپ نے اپنے لئے لکھا ہے۔ فقط

آپ کی رائے کو تسلیم نہ کرنے والا

مکرمی! یاد آوری کا شکریہ ---- سب سے پہلی توجہ کا مستحق ہے جناب کے مکتوبِ گرامی کا لفافہ جس کے چاروں گوشوں پر آپ نے ایک مصرعہ تحریر فرمایا ہے، جو اس وقت یاد نہیں، لیکن اس مصرعے میں مجھے مخاطب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تو خاک کا پتلا ہے، اس قدر مغرور نہ ہو۔

اجازت دیجئے کہ مداح المومنین کے طور پر میں آپ کے اس نصیحت آمیز، اور عبرت انگیز مصرعے پر مختصراً کچھ اظہارِ خیال کروں۔ آپ نے مجھے اس "مخفی حقیقت" سے آگاہ فرمایا ہے کہ میں "خاک کا پتلا" ہوں۔ اس اطلاع رسانی، یا کشفِ راز پر میں آپ کا دل سے شکرگزار ہوں۔ میں آج تک اپنے کو پیتل کا پتلا سمجھے ہوئے تھا، اب آپ کی عنایت سے معلوم ہوا کہ پیتل کا نہیں، میں "خاک" کا پتلا ہوں ----

کیا آپ براہِ کرم مجھے مطلع فرمائیں گے کہ آپ کس چیز کے پتلے ہیں؟ خاک کے، پیتل کے یا کسی اور دھات کے؟

اسی کے ساتھ ساتھ آپ نے مجھے نصیحت فرمائی ہے کہ او خاک کے پتلے مغرور نہ ہو۔ یعنی آپ کے نزدیک اگر میں پیتل، یا لوہے کا پتلا ہوتا تو مغرور

ہونے کا لائسنس مجھے دیا جاسکتا تھا جس کے یہ معنی ہیں کہ آپ خاک کو نہایت ہی حقیر عنصر سمجھتے ہیں — معلوم نہیں آپ نے خاک کو کس علمی تحقیقات، یا کس روحانی مکاشفے کی بنا پر اس قدر حقیر سمجھ رکھا ہے۔

اسلامی روایات کی رُو سے ہمارے جدِ امجد حضرۃ آدمؑ بھی "خاک کے پُتلے" تھے، اور اسی وجہ سے جب شیطان کو سجدۂ آدم کا حکم دیا گیا تو اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ (آدم) مٹی سے بنا ہے، اور میں آگ سے، میں اس سے اشرف ہوں، اور کوئی اشرف، ادنیٰ کو سجدہ نہیں کرسکتا۔

خاک کی حقارت کے متعلق آپ میں، اور ابلیس میں کس قدر وحدتِ خیال ہے۔ اس پر غور فرمایئے۔

اب رہی آپ کی یہ نصیحت کہ میں مغرور رہوں۔ سو میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ آپ مجھے کس بنا پر مغرور تصور فرماتے ہیں۔ جو چیز آپ کے مشاہدے میں کبھی نہیں آئی ہے، آپ اُسے تسلیم کیونکر کرسکتے ہیں، اور جب سرے سے کسی بات کے تسلیم کر لینے ہی کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے تو اُس بات کے باب میں پند و نصائح کا دروازہ کیونکر کھولا جاسکتا ہے؟

میرے مدراسی دوست، آپ کے اُس نصیحت آمیز و عبرت انگیز مصرعے سے مجھے وہ لطف حاصل ہوا جو صرف اُس وقت حاصل ہوتا ہے جب "شاہ صاحب" یا "سائیں جی" جہلا کو عذابِ قبر اور موت سے دھمکا دھمکا کر بجبر خیرات وصول فرماتے ہیں۔ پہلے تو نعرہ لگایا جاتا ہے ع

"خاک کا پتلا ہے تُو، کل خاک میں مل جائے گا"

"خاک کا پُتلا ہے تُو، کل خاک میں مل جائے گا" اور پھر "بابا مولا تیرا بھلا کرے" اور آخر میں "کچھ اللہ کے نام پر"

معاف فرمائیگا، آپ کا لفافہ دیکھتے ہی میں خط کا "مضمون" بھانپ گیا تھا، اور اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کے کاتب صاحب کس ذہنیت کے بزرگ ہیں، چنانچہ لفافہ چاک کرتے ہی جب اس "عرائض نویسانہ" فقرے "آپ کا دعویٰ باطل، فیصلہ بحقِ کاتب خطِ مدراس" پر نظر پڑی تو میرے اندازے کی پوری پوری تصدیق ہوگئی —— اور پھر جتنا جتنا میں آپ کے مکتوبِ گرامی کو پڑھتا گیا۔ میرے اندازے کی تصدیق پر تصدیق ہوتی چلی گئی۔

سب سے پہلے آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ نے مدراس کا خریدار کا خط شائع فرما کر اپنے خیالات ظاہر فرمائے ہیں، گویا کہ خط شائع کرکے آپ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ آپ سیاسیات کے ایسے ماہر ہیں کہ خط میں جو وجوہات بیان کئے گئے ہیں وہ سب لغو ہیں، اور آپ نے جو رائے قائم کی ہے وہ ضرور ہی ماننے کے قابل ہے۔"

میں اُس کے جواب میں آپ سے تو نہیں، قارئینِ "کلیم" کی خدمت میں درخواست کروں گا کہ وہ مہربانی فرما کر جنوری ۱۹۳۸ء کے "کلیم" کو ملاحظہ فرمائیں، جس میں دونوں خط شائع کئے گئے ہیں، اور رائے قائم فرمائیں کہ مندرجۂ بالا عبارت آرائی کس نوع کے منطقی کانٹے پر تولی جاسکتی ہے، اور اسے میرے جواب سے کیا ارضی یا آسمانی تعلق ہوسکتا ہے۔

میرے مدراسی شاتم دوست، اگر آپ بُرا نہ مانیں تو اس مندرجۂ بالا عبارت میں آپ نے جو دو علمی غلطیاں کی ہیں اُن سے بھی آپ کو آگاہ کردوں۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے "گویا کہ" حالانکہ "گویا" کے بعد کافِ بیانیہ کی ضرورت نہیں، اس کے بعد آپ نے تحریر فرمایا ہے "وجوہات" حالانکہ "وجہ" کی جمع "وجوہات" نہیں، بلکہ "وجوہ" ہے۔

اس کے بعد آپ مہربانی فرما کر تحریر فرماتے ہیں کہ "حضرت آپ مدہوش ہیں کانگریس کے نشے میں اور یہ نشہ بغیر ترشی کے نہیں اُتر سکتا" میں اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ اور عرض نہیں کروں گا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں، اور دھمکیاں دینا مردوں کا شیوہ نہیں۔

پھر آپ نے تحریر فرمایا ہے "وقت آرہا ہے انشاء اللہ تعالیٰ آپ جیسے منافق راہِ راست کو تسلیم کرلیں گے" اس جملے میں آپ نے پھر مجھے دھمکایا ہے، اور اُسی کے دوش بدوش، اسلام کے مقدس پیغمبرؐ کی روش کے خلاف جو حقیقی منافقوں کے واسطے بھی منافق کا لفظ استعمال نہیں فرماتے تھے، آپ نے بے دھڑک مجھے منافق کہدیا ہے —— آپ اسلام کے مدعی بھی ہیں، اور سنت سے اس طرح گریز فرماتے ہیں۔ کیا یہ عبرت و حیرت کا محل نہیں؟

آپ نے منافق کہہ کر مجھے سب سے ذلیل قسم کی گالی دی ہے، لیکن میں اس کے جواب میں آپ کی شان کے خلاف ایک حرف بھی نکالنا پسند نہیں کرتا، میں آپ کی نظر میں "ملحد" ہوں، اور آپ اپنی نظر میں "مومن" ہیں، ایک "ملحد" اور ایک "مومن" کے معیارِ اخلاق کا یہ بین فرق عصرِ حاضر

کے "الحاد" و "ایمان" کا ایک نہایت درخشاں نمونہ ہے۔

کاش آپ کو محسوس ہو سکتا ـــــ کاش آپ غور فرما سکتے۔

اس کے بعد آپ مجھ سے "بہ بانگِ دُہل" "عرض" فرماتے ہیں کہ "کانگرس اسلام۔ اہلِ اسلام، اور تمدّنِ اسلام کی دشمن ہے" میں اس کے متعلق صرف اس قدر عرض کروں گا کہ کانگریس ایک خالص سیاسی جماعت ہے، اسے کفر و اسلام سے کوئی واسطہ نہیں، اور نہ ہو ہی سکتا ہے ـــــ پھر بھی چونکہ آپ دعوے کرتے ہیں کہ کانگریس دشمنِ اسلام ہے، اس لئے بارِ ثبوت آپ کے ذمّے ہے۔

اگر آپ بہ دلائلِ قوی کانگریس کی اسلام دشمنی ثابت فرما دیں گے تو کم سے کم میں تو ضرور ہی آپ کی سیاسی بیعت کر لوں گا۔

اس کے بعد آپ تحریر فرماتے ہیں "جناب مہربانی فرما کر اپنی کھال میں رہیئے" شاید یہ آپ کے صوبے کا کوئی محاورہ ہے، اور غالباً اُس طبقے کا محاورہ ہے جسے عُرفِ عام میں بازاری، یا سُوقی کہتے ہیں۔

کیا آپ کے سے تعلیم یافتہ، مُہذّب اور سوسائٹی کے طبقۂ اعلیٰ سے تعلّق رکھنے والے فرد کے واسطے یہ رکاکت ایک لمحے کے واسطے بھی جائز ہو سکتی ہے کہ وہ سُوقیانہ بول چال، اور بازاری بولی ٹھولی کو اپنی زبان پر جاری کرے؟

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جب کوئی طبقۂ اعلیٰ کا رُکن، بازاری بول چال کا ارتکاب کرتا ہے تو اُس کے متعلق سیرتِ انسانی کے نبّاضوں کو یہ رائے قائم کرنا پڑتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں شرفاء کے حلقے سے دُور، اور بازاری حلقے سے قریب رہنے کے باعث سیرت کی اُن حسرتناک اور ضدّی خامیوں میں مبتلا ہو چکا ہے، جن سے تا دمِ مرگ اُسے نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔

اِس کے بعد تو آپ نے اور بھی غضب کر دیا، اور بہت کُھل کر سامنے آ گئے، یعنی آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "دوست" اگر تم اس جوشِ جنوں میں کپڑے پھاڑ کر اپنے عشرت کدے سے نکل آؤ" معاذ اللہ، شرافت کی زبان پر اس قسم کے کلمے کیونکر چڑھ سکتے ہیں؟ حیران ہوں کہ آپ کے بارے میں کیا رائے قائم کروں ـــــ یہ آپ کے لہجے سے کس چیز کی بُو آ رہی ہے؟

اِس کے بعد آپ نے میری "فیس" اور میری قیمت کی گرانی پر طنز فرمایا ہے، جس کا جواب نہ دینا ہی انسانیت معلوم ہوتا ہے۔

اور سب سے آخر میں آپ نے یوں گوہر افشانی فرمائی ہے کہ "بہرحال مختصر یہ ہے کہ اُس خط کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ آپ ہی پر صادق آتا ہے، اور اب آپ سمجھ لیجئے کہ وہ آپ نے اپنے لئے لکھا ہے" آپ نے مجھے بچّوں کی لڑائی یاد دلا دی، آپ کا لب و لہجہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ اُس بچّے کا ہوتا ہے جو نزاعِ لفظی سے تنگ آ کر آخر کار اپنے حریف سے یہ کہنے لگتا ہے کہ تو نے جو کچھ مجھے کہا ہے اللہ کرے تجھی پر پلٹے۔

اب اپنے مکتوبِ گرامی کا تجزیہ چند سطروں میں سن لیجئے۔

مجھے "منافق" کہہ کر آپ نے اپنی غیر اسلامی ذہنیت کا ثبوت دیا ہے، "کھال میں رہیئے" اور "اگر تم..... نکل آؤ" لکھ کر آپ نے بازاریت و سوقیت کا مظاہرہ کیا ہے، اور "اب آپ سمجھ لیجئے کہ وہ آپ نے اپنے لئے لکھا ہے" تحریر فرما کر آپ نے ایک تھکے ہوئے غیظ آلود بچّے کی ذہنیت پیش فرمائی ہے۔

شرافت و بصیرت، اور قوّت و حیات کی قسم میں اِس بات پر سخت حیران ہوں کہ ایک اعلیٰ طبقے کے تعلیم یافتہ اور بالغ انسان کی ذات میں یہ "عیوبِ سہ گانہ" کیونکر اور کس صورت سے جمع ہو سکتے ہیں؟

آپ مُدعیٔ توحید بھی ہیں، اور آپ کے دعوائے توحید کی موجودگی میں یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ "توحید" کے آغوش میں عیوب کی یہ "تثلیث" پیدا ہوئی تو کیونکر!

میں یہ جواب انتقاماً تحریر نہیں کر رہا ہوں، کیونکہ انتقام میری شریعت میں حرام ہے، انتقام کو میں شرارت، جہالت اور حماقت کا مجموعہ سمجھتا ہوں، میرا اِس تمام خامہ فرسائی سے صرف اس قدر مدّعا ہے کہ آپ اپنے لہجے اور اپنے طرزِ بیان پر نظرِ ثانی فرمائیں، بے سمجھے بُوجھے کسی کو گالی دے بیٹھنے کی عادت کی قباحت پر ٹھنڈے دل سے غور کریں، اور مُقدمات کو غلط طور سے ترتیب دے کر غلط نتائج نکالنے کے رجحان کو ترک کرنے کی خوبیوں پر نگاہ کریں۔

آپ خود ہی غور فرمائیں کہ اگر میں آپ کے مکتوبِ گرامی کے جواب میں آپ کو بھی خدانخواستہ "منافق" یا "کافر" یا "غدّار" کے لفظ سے مخاطب کرتا تو آپ کے قلب کو کس قدر تکلیف پہونچتا ـــــ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جو شخص کسی کو گالی دیتا ہے، وہ گویا غیر ملفوظ طور سے اس کا اعلان کر دیتا ہے

کہ میں گالی کھانے پر آمادہ ہوں ؟

برادرِ من ، فرض کر لیجئے کہ آپ نے جو کچھ میرے متعلق لکھا ہے وہ سب درست ہے ، اور میں واقعی سخت گمراہ و منافق انسان ہوں ۔ لیکن اُن تمام عیوب کے باوجود ، جو میری ذات میں ہیں ، پھر بھی میں آپ کا بھائی ہوں ۔ کیا آپ اپنے بھائی کو گالیاں دینا پسند فرماتے ہیں ؟

اگر میں غلط راستے پر ہوں تو مجھے راہِ راست پر لائیے ، گالیوں سے نہیں ، محبّت سے ، سختی سے نہیں نرمی سے ، اور نفرت سے نہیں بلکہ دلجوئی و تالیفِ قلب سے ۔

آپ کے سامنے ایک ایسے شخص کی تابناک سیرت موجود ہے جس سے بہتر انسان پر آج تک آفتاب نہیں چمکا ہے ، یعنی صحرائے عرب کا لافانی فلسفی اور اسلام کا مقدس پیغمبرؐ —— وہ پیغمبر جس کی زبان اور جس کے ہات سے کسی کافر تک کو کبھی کوئی معمولی سا صدمہ بھی نہیں پہونچا ۔ جو دشمنوں کے واسطے دعائیں کرتا تھا ، اور خاطیوں کو معاف کر دیتا تھا ۔ اور جس کی مبارک ہستی صرف مسلمین کے واسطے نہیں ، بلکہ " عالمین " کے واسطے رحمت تھی —— آپ ایک ایسے سراپا رحمت ہیرو کے مقلّد ہوتے ہوئے یہ کیونکر گوارا فرما سکتے ہیں کہ آپ کے کسی خیال یا فعل سے کسی کے دل کو آزار پہونچے ؟

میرے بھائی ، اگر میرے کسی لفظ یا جملے سے آپ کو تکلیف پہونچی ہو تو میں دست بستہ معافی چاہتا ہوں ، میرا دل بغض و عناد سے پاک ہے ، میں نے جو کچھ لکھا ہے نیک نیتی سے لکھا ہے ،

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میرے خط کے بعض حصوں میں تلخی کا عنصر آگیا ہے ، مگر یقین فرمائیے کہ یہ عنصرِ تلخی ، ایک " سخن گسترانہ بات " کے علاوہ اور کوئی معنی نہیں رکھتا ، اور اسے " ترکِ محبّت " سے دُور کا بھی کوئی تعلق نہیں ۔

چونکہ تمام اعمال کی بنیاد ہوتی ہے نیّت پر ، اور میں جانتا ہوں کہ میری نیّت بخیر ہے ، اس لئے مجھے اس کا یقین ہے کہ آپ میرے اس جواب سے ہرگز کوئی بُرا اثر نہ لیں گے ۔

آخر میں آپ کی آگاہی ، اور اپنے ضمیر کی تسکین کی خاطر میں اِس قدر اور عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ کے لب و لہجے سے میرے شعورِ شائستگی کو جو صدمہ پہونچا ہے ، میں اُسے سچّے دل سے معاف کرتا ہوں ۔

آپ یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں نے معاف کر کے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے ، یا نعوذ باللہ آپ پر کوئی احسان کیا ہے ، بلکہ اِسے یوں سمجھئے کہ میں معاف کر دینے پر مجبور تھا —— ماحول و وراثت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے دردمند انسان کو معاف کر دینے کے سوا اور چارۂ کار ہی کیا ہے ؟

یقین فرمائیے اگر کوئی مجھ پر قاتلانہ حملہ بھی کرے ، اور اگر میں اتفاق یا سخت جانی سے بچ جاؤں ، تو اِس حالت میں بھی نہایت خندہ پیشانی سے اُسے معاف کر دوں گا ، اور معاف کر دینے کے بعد یہ خیال نہیں کروں گا کہ میں نے خاطی پر کوئی احسان کیا ہے ، یا یہ کہ میں نے کوئی معرکۂ اخلاقی سر فرمایا ہے ، بلکہ میں یہ سمجھوں گا ، اور میرا یہ سمجھنا قطعی درست ہوگا کہ میں نے مجبور انسانیت کے ساتھ انصاف کیا ہے ، اور انصاف سے زیادہ کچھ نہیں کیا ہے ۔

میں ہوں جناب کا نیاز مند

جوش

وہ جوش جو ہر ہدایت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کو روحِ انسانی کی سعادت سمجھتا ہے ۔

قطعہ

رہبروں کو دور سے پہچاننے کے واسطے
سعی کی جاتی ہے یوں وضع کی شب تاب میں
جس طرح انسان کی سیرت پرکھنے کے لئے
ٹھوکریں کھاتی ہیں نظریں ظاہری آداب میں

جوش

قطعہ

جھٹپٹے کے وقت کوندے کا لپکنا بار بار
ظلمتوں پر مارتا ہے جس طرح تھم تھم کے تیر
یونہی وحشت ناک عصیاں کی اندھیری رات میں
آدمی کے قلب کو رہ رہ کے ڈستا ہے ضمیر

جوش

وفاقِ ہند!

(سلسلہ "رفتارِ وقت")

قانونِ ہند ۳۵ء کی دستاویزِ عظمیٰ کا بابِ "وفاق" ماشاء اللہ اس سیاسی شہپارے کا "بیت الغزل" واقع ہوا ہے! — جسے برطانوی سیاست و تدبر کے ساز نواز اب مستقبلِ قریب میں اپنے فسوں گرانہ لہجۂ و آہنگ میں پڑھنا چاہتے ہیں، اور اپنی ایک ایک تان سے ذوق آشنایانِ موسیقیِ انگلستان پر وجد و رقص طاری کر دینا چاہتے ہیں! — لارڈ لوتھین اور لارڈ سیموئیل (عرشِ لندن کے تازہ نزیلانِ فرشِ ہندوستان!) اسی مجوزہ تماشائے قیصریت کے اسٹیج کے نصب کرنے، اور اس "متکلم و مترنم فلم" کے متوقع شاہدین و سامعین کے شمار و اشتیاق کی پیمائش کرنے کے لئے ہمارے ملک میں تشریف فرما ہوئے ہیں! ع

اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما!

لارڈ لوتھین" ادام اللہ تدبرہم" نے اک بیباک خطاب میں فرمایا کہ انھیں آج تک ایک ہندوستانی بھی ایسا نہیں ملا جو وفاق کے اصول کا مخالف ہو!

— صَدَقْتَ یا لارڈ صاحب! بس اسی طرح ہمیں بھی آج تک ایک برطانوی ایسا نہیں ملا جو مقبول اصولِ وفاق، اور مردود و رسوائے عالم نظامِ ہندوستانی وفاق کو، فرہنگِ سیاسی کے "مترادفات" سمجھتا ہو! ؎

مرحبا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

کیا لارڈ لوتھین کے جیب و دامن میں اس سے زیادہ نظر فریب کوئی سیاسی پھلجھڑیاں نہیں! — ہم حیران ہیں کہ ان طفل تسلیوں کے لچھے کے ساتھ جب ہمارے محوِ خوابِ خرگوش لارڈ صاحب بالقابہ، پنڈت جواہر لال نہرو اور پنڈت پنت ایسے سامری شکن جغادریوں سے ملاقی ہوئے ہوں گے تو کیسے چراغ پا ہوئے ہونگے! ؎

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ!

اگرچہ در پردہ ایسے ایسے عقابوں اور شہبازوں پر ڈورے ڈالنے کی ریشہ دوانیاں جاری ہیں، تاہم ان عیاوانِ شاطر کا پیامِ اطمینان یہ ہے کہ "ہم کسی سیاسی مشن کے سفیر بن کر نہیں آئے ہیں!" — اجی استغفراللہ! لیکن ع

تنکے ہیں بھلا کیسے یہ ریشِ مبارک میں!

"وفاق" برطانوی دسیسہ کاری کا وہ قاتل حربہ" نفاق و شقاق ہے جس پر ہماری نرم ترین شکوہ سنجی یہ ہو سکتی ہے کہ ؎

تو برائے "وصل" کردن آمدی؟
یا برائے "فصل" کردن آمدی!

دور بینانِ کانگریس مدت سے جانتے تھے کہ مغرور برطانوی ہندی دفتریت کا "آخری خطِ دفاع" دیسی ریاستیں ہوں گی! "ایوانِ والیانِ ہند" اس شاہانہ "سدِ سکندری" کا گویا سنگِ بنیاد تھا! یہ "خشتِ اول" بھی چناں راست نہ رکھی گئی! تاہم برطانوی "دولتِ مشترکۂ اقوام" کے خانوادۂ سلطانی کے قصر کا معمار اب اس "دیوارِ قہقہہ" کو تکمیل کے اوجِ ثریا "تک پہنچانے کے درپے ہے! مگر ؎

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہائے گل!

خوش فہم مدبرینِ انگلستان نے شاید سمجھا کہ کانگریس کی "ماہیٔ بے عقل" نام نہاد صوبجاتی آزادی کی شست کے چوگے کو مع کانٹے کے نگل گئی! پس اب وقت ہے کہ "فیڈریشن" کا "دامِ سخت" بھی جنبش میں لایا جائے، اور حریت کے "سوزِ دلِ پروانہ" کو خوگر "اصلاح" ذہنیت (Reformist mentality) کی "ہوس نگس" کے اندر سرد کر دیا جائے! ع

دلم بہ پاکیٔ دامانِ غنچہ می لرزد!

مگر برطانوی ماہرینِ سیاسیات و معاشیات کو معلوم ہونا چاہیے کہ "صوبجات" کا تجربہ "قانونِ ہند" کا آخری ثمر شیریں تھا، جس کے بعد اس شجرِ اصلاحات کو اور ہلانے سے جو پھل جھڑے گا اس پر اقتصیات کا "قانونِ تقلیل حاصل" عائد ہوگا! پھر جبر و تحکم کا استعمال، جانبازانِ ملک کے لئے انکا عین مطلوبہ پیامِ جنگ ہوگا! ع

عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا!

"فیڈریشن" عبارت ہے ہندو مسلم مسابقت کے منقضی المیعاد کھیل کے بعد، برطانوی ہندوستان اور ہندوستانی ہندوستان کے درمیان رقابت کے اک دورِ پرفتن کے افتتاح سے! ستم ظریفی یہ ہے کہ اس پنجہ کشی و کشتی کا نام رکھا گیا ہے "مصافحہ و معانقہ"! ع

خون میریزند و خونبہا میخواہند!

فیڈریشن کا نظام اپنے مجوزہ شرائط و ضوابط کی بلیغ زبانِ حال میں، اک قلعہ بندی ہے، اک طرف برطانوی شطرنجی شہ، والیانِ ریاست کے دقیانوسی استبداد، تعلقہ داران و زمینداران کی دہشت انگیزی، برطانوی سرمایہ داری و ہندوستانی مہاجنی کی گلوگیری، لنکاشائر و مانچسٹر اور بمبئی

و احمد آباد کی مشینی حرفت کی زنجیر افگنی، ـــــ اور دوسری طرف قومی بیداری و نشتر بازی، غلامانِ ریاستہائے ہند کی زنجیر جنبانی، ـــــ

ـــــ کاشتکاران و مزارعین کی جرأت نمائی و استقامت پیشگی، ہندوستانی محرومین و مقروضین کی قوتِ لایموت طلبی، جھونپڑیوں کی دستکاری کی بحالی و کاوشِ جانبری ـــــ کے درمیان !! ع

ہشدار کہ سیلابِ فنا درپیش است!

پھر پرنسیز اینڈ پراونسیز کے باہم یہ دیدنی "قرآن السعدین" اس قسم کی "سیاسی شادی" ہوگی جس میں دلہن خیر سے "برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن" کی تصویر جمال ہے، اور جنابِ نوشہ، چشمِ بد دور، ہیں اک نوّد سالہ پیرِ فرتوت کے پیکرِ جلال! ع

مبارک مبارک، سلامت سلامت!

لارڈ لوتھین "ازدواجِ سیاست" کی نکاح خوانی کے کتنے ہی خوش الحان قاضی کیوں نہوں، ۱۵ اور ۹۰ کے درمیان کی خلیج مہیب عملاً ناقابلِ پل بندی ہے! ے

نخواہم زمانے کہ ایں حورِ دیش
بیفتد بہ سرپنجۂ شستِ ریش!

ہمارا خیال ہے کہ اس مطلعے کو اتنا تاریک دیکھکر ہی شاید لارڈ لوتھین نے پریاگ کے "گنگا جمن کے سنگم" کے اک "سادھو" مہاراج سے دو دو شبد بول کر، اپنا غم غلط کرنا چاہا! سادھو جی پورے "اہلِ جنت" معلوم ہوتے ہیں! آپ نے روشن ترین بیسویں صدی کی مبارک ترین ہندوستانی تحریک "ہریجن" کو "کلجگ" کا سیاہ ترین فتنہ قرار دیا! ہمارے دیوتا سروپ سادھو جی پر اگر اتنی "بیخودی" نہ طاری ہوتی تو کلجگ کے سب سے کالے کلنک کے ٹیکے کی نشاندہی میں وہ اپنی اس غالی تاریک خیالی کے مقدم حق کو فراموش نہ کرجاتے! ے

فتنے سب سچ سہی قیامت کے
لیکن آگے تمہاری قامت کے؟!

لارڈ لوتھین کے ہم سیاحت لارڈ سیموئیل کا ورودِ مسعود بھی اک خاص مذاکرے کی بنا پر قابلِ ذکر ہے! مسٹر سی، وائی، چنتامنی نے لارڈ موصوف دیکھے از ارکانِ رکین "مسلکِ لبرلزم" کی موجودگی میں انگلستانی لبرلزم کی جو تعریف بیان فرمائی اس میں "شخصی ملکیت" کو اس مذہبِ سیاسی کا "اول کلمۂ طیب" بتایا! مگر یہ شاید ہندوستانی "لچھمی دیوی" ہی کے مندر کا سنگِ بنیاد تھا! چنانچہ لبرل لارڈ سیموئیل نے بقالِ فطرت چنتامنی جی کو فوراً لقمہ دیا، اور اس اہم حقیقت کو بے نقاب کیا کہ "انگلستان کا جدید العہد لبرلزم اس زر پرستانہ خودکامی کو اک لعنت یقین کرتا ہے! بجائے اس کے وہ تشکیل ہیئتِ اجتماعیہ میں معاشی توازن و مجلسی مساوات کا قائل ہے"! لارڈ موصوف نے مزید فرمایا کہ "لبرلزم کے عصری نظریئے کی رو سے امریکن پریزیڈنٹ روزویلٹ کا جہاد بخلافِ اکابرِ سرمایہ بھی "لبرلزم" ہی کا اک روشن فکر جلوہ ہے!"

یہ سب کچھ کیا ہے اگر سوشلزم و کمیونزم کی، زیرِ نقابِ حیلۂ شرعی، اک "بیعتِ رضوان" نہیں ہے؟! ـــــ سیاسیات و اقتصادیات کی دنیا میں سوشیلزم وہ مقبول و محبوب مشرب بنتا جاتا ہے جو "لیظہرہٗ علی الدین کلّہٖ" کا پرچم اڑانے والا ہے! اکابرِ برطانیہ پھر کس منہ سے "سوویٹ روس" پر تبرّیٰ کرتے ہیں؟! ع

منکرِ مے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن!

قطعہ

جیسے موٹر کی گریزاں روشنی سے راہ میں
نصف لمحے کے لئے ظلمت پہ چھا جاتا ہے نور
سرمدی آلام کے مارے ہوئے انسان کو
یونہیں چھو جاتی ہے دم بھر کے لئے موجِ سرور

(جوش ملیح آبادی)

۱۹۳۷ء کی سیاستِ عالم[1]

عبدالرحیم شبلی، بی، کام

زمانے کی چکّی تیزی سے گھُوم رہی ہے۔ گزشتہ سالوں کی طرح ۱۹۳۷ء بھی گزر گیا۔ لیکن اپنے پیچھے بعض ایسی یادداشتیں چھوڑ گیا ہے جو "وقت کی ریت" پر نہایت گہرا اثر ڈالیں گی۔

اس مضمون سے جہاں میرا مقصود ۱۹۳۷ء کے واقعاتِ عالم کا ملخص بیان کرنا ہے وہاں اِس سے میری یہ بھی غرض ہے کہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ سیاستِ عالم کس مرحلے تک پہونچ چکی ہے، تاکہ اُن کے لئے موجودہ خلفشار اور عالمی اضطراب کے عوامل کا تجزیہ کرنا آسان ہو۔

مخاصمتِ چین وجاپان

۱۹۳۷ء میں جاپان نے اپنے اِس پروگرام کو قریباً مکمل کر لیا کہ شمالی چین کے پانچ صوبوں یعنی چاہار، سوئی یوآن، شان سی، شان ٹنگ اور ہوپےئی کو نانکن کی حکومت سے آزاد کرکے یا تو براہِ راست اپنے قبضے میں کر لیا جائے اور یا اُن کو خود مختاری دے کر اپنی کٹ پتلی بنا لیا جائے۔

دراصل چین اور جاپان کی مخاصمت کوئی نئی نہیں ہے، سب سے پہلے ۱۸۹۴-۹۵ء میں جاپان نے کوریا کو متنازعہ فیہ علاقہ بنا کر چین پر ایک مکمل فتح حاصل کی۔ پھر ۱۹۳۱ء میں "ساؤتھ منچورین ریلوے" پر ایک بمبازی کو بہانہ بنا کر منچوریا میں اپنے اقدامات وسیع کئے۔ اور اب شمالی چین پر پورا تسلط جما لیا ہے۔

چین پر جاپان کے اس جارحانہ اقدام کی وجوہات تلاش کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔ جاپان کی آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے لیکن وسائلِ خوراک اُسی نسبت سے ترقی نہیں پاتے، اِس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ جاپان میں طریقۂ فلاحت ہندوستان کی طرح تاحال دقیانوسی ہے۔ اور اکتشافاتِ عصریہ سے بالکل روشناس نہیں ہوا، اور دوسرے یہ کہ جاپان کے لوگ ضرورت سے زیادہ قومیت پسند واقع ہوئے ہیں۔ اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ اُن کو کسی وقت "غیر ملکی چاول" کھانا پڑ جائیں، کوشش کی گئی تھی کہ میکسیکو وغیرہ کے چاول جاپان بھیجے جائیں، لیکن اُن کا خیر مقدم نہ کیا گیا۔

بہرحال جاپان کی آبادی ۱۸۶۸ء (آغاز عصرِ جدید) سے اس وقت تک سہ گنہ ہو چکی ہے، لیکن وسائلِ خوراک تاحال وہی ہیں، اِس وجہ سے جاپان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنی مملکت کو وسیع کرے، اور کوئی قریب ترین علاقہ اپنے ساتھ ملحق کرے تاکہ ایک طرف تو اُس کی بڑھتی ہوئی آبادی کی کھپت ہو جائے اور دوسری طرف اُس کو اپنی مصنوعات کے لیۓ ایک نفع بخش منڈی مل جائے۔

اسی خیال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جاپان کی یہ خواہش عرصے سے تھی کہ کسی طرح منچوریا کے علاقے پر قبضہ حاصل کر لیا جائے، یہ علاقہ زراعت کے

---

[1] اس مضمون کے لئے اگرچہ میں نے زیادہ تر انگریزی اخباروں اور امریکی اور برطانوی رسائل وجرائد پر انحصار رکھا ہے لیکن رسالہ جامعہ دہلی اور پرتاپ لاہور کے بعض نہایت قابلِ قدر شذرات بھی میری رہنمائی کے لئے کم مفید ثابت نہیں ہوئے۔ شبلی

لحاظ سے نہایت اُمید افزا ہے، ابھی تک اس میں صرف آٹھ کروڑ ایکڑ زمین زیر کاشت ہے، اور قریباً چھ کروڑ ایکڑ ایسے غیر مزروعہ موجود ہیں جن میں نہایت عمدہ کاشت ہو سکتی ہے،

اس علاقہ کی سب سے اہم پیداوار مٹر ہے جس کی مختلف اقسام تمام یورپ میں انسان اور حیوان کی خوراک اور چارے کے لئے مستعمل ہوئی ہیں، ۱۹۳۰ء میں چودہ کروڑ من غلہ یہاں پیدا ہوا۔ جو ہر چند کاشت کے لحاظ سے منچوریا کے زمیندار کا رہینِ منت ہے، لیکن اُس کی عمدگی اور مرفوعشگی کا باعث جاپان کی تجارتی اور کیمیاوی تدابیر تھیں۔

گیہوں، اُرد اور چاول اس جگہ کی دیگر زرعی پیداواریں ہیں، جو اگر کوشش کی جائے تو زیادہ مقدار میں کاشت کی جا سکتی ہیں، شمال میں ایک وسیع علاقہ ایسا ہے جو جنگل ہی جنگل ہے اور چوب کا بہترین مخزن ثابت ہو سکتا ہے،

دوسرے یہ علاقہ معدنیات کے لحاظ سے بھی بُرا نہیں، اس وقت جاپان اپنی تیل کی ضروریات ریاستہائے متحدہ امریکہ اور ڈچ ایسٹ انڈیز سے پورا کرتا ہے، اور مشینری وغیرہ بھی امریکہ اور برطانیہ سے منگواتا ہے، لیکن اگر وہ یہ تمام اشیا منچوریا اور شمالی چین سے حاصل کر سکے تو دولِ یورپ کے مقاطعہ کا اُسے ڈر باقی نہیں رہتا۔

اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ منچوریا اور شمالی چین کے ساتھ جاپان کی دلچسپی بجائے فوجی ہونے کے زیادہ تر تجارتی و صنعتی ہے، اگر آج ہندوستان اپنی روئی کی برآمد جاپان میں بند کر دے، یا آسٹریلیا سے وہاں ذرہ بھر بھی اُون نہ جائے یا ملایا ربڑ دینے سے انکار کر دے، یا امریکہ اقتصادی لحاظ سے قطع تعلق کرے تو جاپان بالکل بے دست و پا ہو جائے؛ اسی خطرے کے ازالہ کے لئے جاپان اپنی مملکت کو وسیع کرنا چاہتا ہے، تاکہ جہاں تک ممکن ہو سکے وہ کافی بالذات رہے۔

جاپان کے خطرے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے اور وہ ایشیا میں روسی طاقت کا ازسرِ نو اقتدار پذیر ہونا ہے، روس نے ۱۹۲۸ء میں ایک اقتصادی پنجسالہ پروگرام بنایا تھا، جس کی رُو سے وہ اپنے چیدہ چیدہ شعبہ جات ملکی کو یک دم بامِ رفعت تک پہونچانا چاہتا تھا، اور اس طرح اُس کی خواہش تھی کہ وہ نہ صرف اقتصادی طور پر خود مختار ہو جائے بلکہ اُس کے ذریعے وہ سیاسی اقتدار بھی حاصل کرے۔ یہ اسکیم ۱۹۳۲ء میں مکمل ہوئی، اور اربابِ سیاست کا خیال ہے کہ روس اب اس قدر مستحکم بنیادوں پر کھڑا ہو چکا ہے کہ اگر ساری دنیا بھی اُس کا مقابلہ کرنا چاہے تو اُس کو نقصان نہیں ہو سکتا۔ سب سے نزدیکی حکومت جس کو روس کی بڑھتی ہوئی طاقت کا خطرہ ہو سکتا ہے وہ جاپان ہے۔ روس نے بعد ازاں دوسرا پروگرام شروع کیا تھا، جو ۱۹۳۳ء کے آخر میں ختم ہوا ہے، اور جس کی حیرت انگیز ترقی جاپان کے لئے سوہانِ روح ثابت ہو رہی ہے، اُدھر روس نے ٹرانس سائبیرین ریلوے کی پٹری دوہری بنالی ہے، اس لئے جاپان کو ہر دم یہی فکر لگ رہی ہے کہ اگر روس کی تمام تجاویز مکمل ہو گئیں تو اُس کا کیا حشر ہوگا۔

مزید برآں جاپان کے ایک طبقے کا خیال ہے کہ جاپان کو مشرقِ بعید میں وہی امتیازات حاصل ہونا چاہیئے جو جنوبی امریکہ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کو حاصل ہیں، یعنی جس طرح دولِ یورپ نئی دنیا کے کسی علاقے پر بغیر متحدہ امریکہ کی رضامندی کے قابض نہیں ہو سکتا، اور نہ وہاں آراضی خرید سکتا ہے، اسی طرح حکومتِ جاپان کو بھی یہ اختیار مل جائے کہ وہ مشرقِ بعید کے کسی علاقے میں یورپی طاقت کو داخل نہ ہونے دے۔ شمالی چین کی فتح بھی اس اقتدار کو حاصل کرنے کی ایک تمہید ہے،

اُدھر چین کی طاقت دو جماعتوں میں بٹی ہوئی تھی جو اب ایک مشترک دشمن کے مقابلے میں محاذ قائم کر رہی ہیں۔ ایک چینی اشتراکی جماعت ہے، اور دوسری چیانگ کائی شک کی جماعت "کومن تانگ"۔ پہلے تو یہ دونوں جماعتیں ایک ہی تھیں اور سن یات سین نے چینی ہیئتِ اجتماعی کے لئے "جمہوریت، قومیت، اور اشتراکیت" کے جو اصولِ سہ گانہ مرتب کئے تھے وہ ان دونوں کا دستور العمل تھے، ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۷ء تک یہ دونوں عناصر ہم آہنگ رہے، لیکن ۲۷ء میں اُن کے ایک سربرآوردہ قائد چیانگ کائی شک نے شنگھائی کے ساہوکاروں سے ساز باز کر کے نانکن میں اپنی حکومت قائم کر لی، اور کمیونزم کو یکسر ختم کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ کمیونسٹ جماعت بہت کچھ دب گئی، مگر کچھ دن بعد پھر اُبھری، اور فوکیان اور کیانگ سی کے صوبوں میں اپنی سوویٹ حکومت قائم کر لی، اور اپنے زیر اثر کافی وسیع علاقہ کر لیا۔ حتیٰ کہ وہ نانکن کی حریف حکومت سمجھی جانے لگی۔

باوجود اِس رقابت کے جب ۱۹۳۱ء میں جاپان نے منچوریا پر یورش کی تو کمیونسٹ جماعت نے اتحادِ قومی پر آمادگی ظاہر کی۔ مگر نانکن کی حکومت اپنی قوت کو برابر اُن کی گوشمالی اور بردباری میں صرف کرتی رہی، یہ "سُرخ فوجیں" قومی عزت کی خاطر جاپان سے اپنے طور پر لڑتی رہیں، لیکن نانکن گورنمنٹ اُن کے منصوبوں کو خاک میں ملانے پر تُلی ہوئی تھی، چنانچہ ۱۹۳۲ء میں اُس نے کمیونسٹ سردار فانگ کو گرفتار کر کے قتل بھی کر دیا۔

بعد ازاں کمیونسٹوں نے نانکن گورنمنٹ پر جاپان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کے لئے بہت زور دیا۔ اور تقریباً تمام چینی نوجوان اور طالب علم بھی اس اتحاد کے پرزور حامی تھے، چیانگ کائی شیک نے طالب علموں کے مظاہروں کو بڑی سختی سے دبانے کی کوشش کی، لیکن اس سے غیر جانبدار لوگ اور بھی تحریک اتحاد کے حامی ہو گئے۔

آہستہ آہستہ یہ تحریک بہت پھیل گئی۔ اور جنرل کائی شک کے حامی۔ کومن ٹانگ بھی اُس کی موافقت میں نظر آنے لگے، اور بالآخر ۱۹۳۶ء میں جاپان کے خلاف سب ایک جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

جاپان کے کاروباری آدمی چین سے اُلجھنا نہ چاہتے تھے، اور اسی وجہ سے اُنھوں نے ۱۹۳۶ء کے ناگہانی انتخاب میں جنرل ہیاشی کی حکومت کو جو فوجی اقتدار کی نمائندہ تھی، شکست دیدی۔ لیکن پھر بھی نئی وزارت میں فوجی عنصر کافی با اثر رہا۔ اور چونکہ برطانیہ یورپی سیاست کے جھمیلوں میں پھنسا ہوا تھا اور امریکہ کے لئے اکیلے میدانِ جنگ میں کُودنا آسان نہ تھا، اِس لئے جاپان نے سوچا کہ شمالی چین پر قبضہ کرنے کا یہی بہترین وقت ہے

اُدھر اتفاق سے، ۷ جولائی ۱۹۳۷ء کو ایک معمولی سا حادثہ پیش آگیا، اور وہ یہ تھا کہ ہنکاؤ کی بین الاقوامی آبادی کے اندر تین جاپانی ملاحوں پر آٹھ مرتبہ گولیاں چلائی گئیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک جاپانی مر گیا اور دو زخمی ہوئے۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس کا فیصلہ مخالف ملک پر قبضہ کرنے اور دنیا کو جنگ کی خونریزیوں میں مبتلا کرنے سے ہی ہو سکتا تھا۔ لیکن ملوکیت پرستی اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے بہانے ہی ڈھونڈا کرتی ہے، چنانچہ جاپان جو پہلے ہی بھرا ہوا تھا اس حادثے کو اصل سبب بنا کر شمالی چین پر حملہ آور ہوا۔ اور ایک جاپانی فوج پی پنگ کے شمال مغرب کی طرف۔ ایک جنوب مغرب کی طرف اور ایک جنوب کی طرف بڑھی، مقصد یہ تھا کہ شمالی چین کے پانچ صوبوں پر جن کا مجموعی رقبہ چار لاکھ مربع میل اور آبادی ساڑھے سات کروڑ ہے اُس کا قبضہ ہو جائے۔ یہ علاقہ مندرجہ صفحہ... النقشہ سے واضح ہو سکتا ہے۔

اس جنگ کو روکنے کے لئے حسبِ معمول دیگر اقوام نے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کئے۔ لیکن "کفن دزدانِ چند" کی جمعیتہ سے زیادہ کی توقع کیسے ہو سکتی تھی، "نو دولِ تسعہ" کی کانفرنس کی گئی جس میں چند مدبر اکٹھے ہوئے ریزولیشنز پاس کئے گئے، لیکن نتیجہ وہی۔ ع

ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشید!

جاپان نے اِس کانفرنس کا مقاطعہ کیا اور اعلان کر دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی غیر ملکی مداخلت برداشت نہ کرے گا۔

آخر اُسے اپنے مقاصد میں کامیابی ہوئی، اور اس وقت اُس کے قبضہ میں شمالی چین کے پانچ صوبے آگئے ہیں۔ جو چین کی کل اراضی کا ۱/۵ حصہ ہیں، اس علاقہ میں چین کی ریلوں کا ۴۰ فیصدی، غیر آباد زمینوں کا ۸۵ فیصدی، لوہے کی کانوں کا ۸۰ فیصدی، جنگلوں کا ۳۷ فیصدی، اور تجارت کا ۴۰ فیصدی حصہ ہے، علاوہ ازیں اُس نے شمالی چین کا دارالخلافہ نانکن بھی فتح کر لیا ہے، اور ابھی معلوم نہیں کہ اُس کی گرسنگی ہوسناکی کہاں کہاں جا کر ختم ہو!

جاپان نے چین کے اردگرد کے جزیروں پر فوج بٹھا کر باہر سے آنے والی امداد کو روک دیا، جس کی وجہ سے چین جاپان کا زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکا۔

علاوہ ازیں جاپان نے شنگھائی کے بین الاقوامی علاقہ پر بھی تسلط جما لیا ہے، جس کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ شنگھائی کی بندرگاہ جو اس وقت دنیا میں تیسرے نمبر پر ہے جاپان کے ہاتھوں میں چلی جائے گی اور اور اس کے ساتھ ہی وہ محصولِ چنگی جو یہاں سے حاصل ہوا کرتا تھا اب جاپان کو ملے گا۔

انگریز پہلے تو خاموش تھے، لیکن اب چونکہ اُن کے مالی مفاد معرضِ خطر میں پڑ گئے، اس لئے اُنھوں نے بھی احتجاج میں حصہ لیا۔ دراصل بات یہ ہے کہ انگلستان نے چین کو کروڑوں پونڈ قرضے پر دیئے ہوئے ہیں، اور اُن کو

وصول کرنے کے لئے وہ جنگی کی رقم کا ۳۰ فیصدی حصہ لیا کرتا تھا، اب شنگھائی پر جاپانی قبضے کے صاف معنی یہ ہیں کہ جنگی کی رقم بجائے انگلستان کے جاپان کو جایا کرے گی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ انگلستان کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔

برطانوی سفیر نے اس باب میں پرزور احتجاج کیا۔ لیکن جاپان نے صاف کہہ دیا کہ اگر دوسرے ممالک شرافت سے ہماری بات نہ مانیں گے تو بین الاقوامی

رقبہ کے معاملے میں ہمیں زور آزمائی کرنا پڑے گی، جب یہ حالت ہو تو بیچارہ بوڑھا انگلستان کیا کر سکتا تھا؟

"چین و جاپان کی مخاصمت ۳۱ء کے دوران میں ایک اور اہم واقعہ یہ ہوا کہ اندرونی منگولیا میں ایک خودمختار حکومت قائم ہو گئی۔

منگولیا کا موجودہ علاقہ چنگیز خاں کی وسیع سلطنت کا بچا کھچا حصہ ہے اور جب سے چین پر منگولوں کا مختصر سا تسلط چودھویں صدی عیسوی میں ختم ہوا، اس پر ایک سناٹا سا چھا رہا ہے۔ خانہ بدوشوں کی سی زندگی ہے، مگر "مہذب دنیا" کی نظر اس جانگلو علاقہ پر بھی تھی۔ ایک طرف روس نے اگر اس کو ہڑپ کرنا چاہا تو دوسری طرف چین کے دندان آز اُس پر تھے، آخر کار جب ۱۹۱۹ء میں چین نے روس کو شکست دی تو اُس نے اپنے بہت سے آدمی اس علاقے میں لا بسائے، اور علی الخصوص اندرونی منگولیا کو چینی صوبوں میں اس ڈھب سے شامل کر لیا گیا کہ اُس کے باشندے سیاسی اقلیت بن کر رہ گئے۔ نیز چینی تاجروں نے یہاں سود پر روپیہ پھیلایا اور قرض کے جال میں غریب منگولوں کو پھانس لیا۔

چینی مظالم سے گھبرا کر منگولوں نے روس سے تعلقات بڑھائے،

روس اور چین کے درمیان منگولیا کے متعلق یہ کھینچ تان جاری تھی کہ ۱۹۰۵ء کی فتح کے بعد جاپان نے بھی وہاں اپنا حق جتانا شروع کر دیا۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ جاپان بیرونی منگولیا پر اور روس مغربی منچوریا پر قابض رہے، جب جاپان نے بعد ازاں اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانا شروع کئے۔

تو چین نے منگولیا کی آزادی میں متعدد بہ کمی واقع کرنا شروع کر دی، اور قبائلی علاقوں کو اپنے باضابطہ صوبوں میں ہضم کر لیا۔ لیکن چونکہ منگولیا کی آزادی سے جاپان کو بہت فائدہ پہنچ سکتا تھا، اس لئے وہ منگولوں کو آزادی حاصل کرنے کی برابر ترغیب دیتا رہا۔ بالآخر ۱۹۳۳ء میں موقع پاکر اندرونی منگولیا نے اعلان کر دیا کہ وہ جاپان کے زیر سایہ ایک "خود مختار ریاست" بن کر رہے گا۔ اِس سے جاپان کو کوئلہ، لوہا اور تیل حاصل کرنے میں آسانی ہوئی وہاں اِس سے اُس کو یہ فائدہ بھی ہوا کہ وہ چین کے بالکل سر پر پہنچ گیا، اور روس کی یورش سے پناہ لینے کے لئے ایک "درمیانی علاقہ" ہاتھ آگیا ہے۔

ہندوستان نے چین کے مظلوم ملک سے ہمدردی کی خاطر چاہا کہ جاپانی مال کا مقاطعہ کیا جائے، لیکن ہندوستانی روئی کے جوابی مقاطعہ کے خوف سے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔

دراصل مقاطعہ کی خاطر ضروری تھا کہ تمام ممالک اس پروگرام پر عمل کرتے، لیکن افسوس ہے کہ قومی خود غرضیوں نے اِس تجویز کو زیر عمل نہ لانے دیا۔ جاپان اپنی دولت کے سلسلے سر تا سر غیر ملکی تجارت پر انحصار رکھتا ہے۔ پس اگر اقوام عالم متحدہ طور پر جاپان کا تجارتی مقاطعہ کرتے تو اُس کو گھٹنوں کے بل گرانا چنداں مشکل نہ تھا۔

اسپین کی خانہ جنگی

اسپین میں پہلے شاہی حکومت تھی، لیکن جمہوریت پسندوں کے بے پناہ جذبہ کے تحت شاہ الفانسو کو تخت سے اُتر جانے پر مجبور کیا گیا اور ملک میں "لوگوں کی، لوگوں کے ذریعہ، لوگوں کے لئے" حکومت قائم کر دی گئی۔ لیکن جب سے اشتراکی پارٹی برسر اقتدار آئی ہے ملک میں ایک خونچکاں دور شروع ہوگیا ہے،

اشتراکی پارٹی نے مزدوروں کے اوقات کار کم کرنے اور اُجرتیں بڑھانے وغیرہ کے پروگرام پر عمل کیا، لیکن اِس کا چونکہ سرمایہ داروں کے منافع پر اثر ہوا، اس لئے وہ برافروختہ ہو گئے اور جنرل مولا اور جنرل فرانکو کی سرکردگی میں اُنھوں نے حکومت کے خلاف عَلَم بغاوت بلند کر دیا۔

اب چونکہ ایک طرف مزدور تھے اور دوسری طرف سرمایہ دار اس لئے فاشسٹ (اٹلی - جرمنی) اور سوشلسٹ (روس، فرانس) حکومتوں نے بھی اُن کی ہمدردی کرنا شروع کی، اور اپنے اپنے "والنٹیر" اسپین میں بھیج دئے۔ اور اس طرح پر یہ مبارزت محض "خانہ جنگی" نہ رہی، بلکہ "بین الاقوامی محاربہ" بن گیا۔

دراصل بات یہ ہے کہ اسپین میں بہت سی وہ چیزیں مل سکتی ہیں جو جنگ کے لئے ضروری ہیں، اور اِس مقدار میں مل سکتی ہیں کہ نہ اٹلی کو حبشہ میں نصیب ہوں گی۔ نہ جرمنی کو اپنی نوآبادیوں میں ملتی تھیں۔ مثلاً لوہا کثرت سے اویڈو کے قریب، وِنگو کے نواح میں اور باسک کے صوبہ میں دستیاب ہوتا ہے، صوبہ ہوئیلا میں یورپ کی سب سے اچھی تانبے کی کانیں ہیں، المدان میں پارہ ملتا ہے، اور اُس کے قریب ہی بہت اچھا سیسہ۔ اِن کے علاوہ بہت سی اور معدنیات اس جزیرہ نما میں حاصل ہوسکتی ہیں۔ نقشہ حسب ذیل ہے۔

۳۴ء میں جرمنی اور اٹلی کی ایک مشترکہ کمیٹی نے اِن ذخائر سے فائدہ اُٹھانے کا فیصلہ کیا تھا، اُن دونوں حکومت سرمایہ داروں کی تھی، چنانچہ اٹلی اور جرمنی کو خوب مراعات دی گئیں۔ حتیٰ کہ فیصلہ کیا گیا کہ اسپین میں جرمن آب دوزوں اور ہوائی جہازوں کے لئے کیمیاوی طریق سے تیل بنایا جائے۔ اور اُن کے مستقر بھی وہیں قائم کئے جائیں۔

لیکن آخر سیاسیات کا رُخ پلٹا اور اسپین میں انقلابی جماعت کو اقتدار حاصل ہوا، چونکہ جرمنی اور اٹلی کو خطرہ پیدا ہوا کہ اِس تبدیلی سے اُن کا پروگرام کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ اس لئے اُنھوں نے ملک میں بغاوت پھیلانے کی کوشش کی اور وہ بہت حد تک اِس میں کامیاب ہوئے،

چونکہ جرمنی کو اسپینی مراکش میں کچھ مراعات حاصل تھیں اس لئے جب جنرل فرینکو نے بغاوت کھڑی کی تو شروع ہی میں اعلان کر دیا کہ مراکش کی تمام کانوں پر ہمارا قبضہ ہے۔ پُرانی مراعات سب منسوخ کی جاتی ہیں، اور اشبیلیہ میں ایک اسپینی نام کی کمیٹی قائم کی جو درا صل جرمنی ہی تھی اور مراکش کی تمام کانوں کا اُسے اجارہ دیدیا، جرمنی نے ان کانوں سے بہت فائدہ اُٹھایا اور وہاں سے کچّا لوہا لے جا کر اُس نے اسپین کو دھڑا دھڑ اسلحہ مہیا کئے، اور خود بھی اسلحہ سازی میں ترقی کی۔

علاوہ ازیں جرمنی نے گلیسیا کے ٹین اور ویگو کے لوہے پر بھی اپنا حق جما لیا۔ اور ابھی ٹنگ سٹن اور ونا ڈیم کی کانوں پر نظر ہی تھی کہ اطالیہ کے رضا کار بھی اسپین پہونچے، اور اِن کانوں کے علاوہ بعض دیگر کانوں پر بھی قبضہ کر لیا۔

دیگر ممالک نے اسپین کے معاملے میں غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا اور وہاں رضا کاروں کی برآمد کو روکنے کے لئے ایک "عدم مداخلت کمیٹی" قائم کی جو اسپین کے سواحل کی نگرانی کرتی رہی اور جس نے اٹلی اور جرمنی کو مجبور کیا کہ وہ اپنے اپنے رضا کار واپس بلا لیں۔

پہلے پہل تو مسولینی نے عدم مداخلت کمیٹی کے فیصلہ کی پروا نہ کی۔ لیکن جب فرانس نے دھمکی دی کہ اگر مسولینی رضا کاروں کی واپسی کے مسئلہ کو آسان نہ بنا دے گا تو اُسے اپنی پیرینیز کی سرحد کھولنا پڑیگی، جس سے اسپین کی سرکار کو مالی اور مسلح امداد حاصل ہو سکے گی، اور جنرل فرینکو کی کامیابی معرضِ خطر میں پڑ جائے گی، تو اُس نے وعدہ کر لیا کہ وہ آئندہ اسپین میں کوئی رضا کار نہ بھیجے گا۔ اور اس فیصلے کے سوا اُس کے پاس کوئی چارہ بھی نہ تھا، کیونکہ اگر وہ فرانس کی دھمکی کی پروا نہ کرتا تو اسپین کی حکومت کو فرانسیسی امداد کا مقابلہ کرنے کے لئے اُسے باغیوں کو مالی امداد دینا پڑتی۔ لیکن اِس کے لئے اُس کے پاس گنجائش نہ تھی، حبش کی جنگ نے اُس کا پہلے ہی کچومر نکال دیا ہے، اور اب اُسے بجٹ میں پے در پے خسارے ہو رہے ہیں، گزشتہ سال (۳۶ء) اُس نے دس فیصدی نیا ٹیکس بھی لگایا تھا، اور گھاٹے کو پورا کرنے کے لئے دیگر ذرائع سوچے جا رہے ہیں، اندریں حالات مسولینی باغیوں کی امداد کیسے کر سکتا تھا، اور "نان انٹروِنشن کمیٹی" کے فیصلے کو ماننے کے سوا اُس کے پاس کیا چارہ تھا؟

عدم مداخلت کمیٹی نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ اسپین میں ایک کمیشن بھیجا جائے جو رضا کاروں کی صحیح تعداد معلوم کرے، مسولینی نے اس تجویز کو بھی تسلیم کر لیا۔ لیکن جنرل فرینکو نے اِس کو ماننے سے انکار کر دیا، مگر اس پر بھی دباؤ ڈالا گیا۔ اور مسولینی کی رضا مندی کے بعد وہ زیادہ دیر تک اِس تجویز کی مخالفت نہ کر سکا۔

عام خیال یہ ہے کہ دونوں کی مخالفت کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ جتنی جلدی ہو سکے اسپین کے زیادہ سے زیادہ علاقے پر قبضہ کر لیا جائے، چنانچہ اس مقصد میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

تا دمِ تحریر (وسط دسمبر ۳۷ء) یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اسپین میں غیر ملکی رضا کاروں کی صحیح تعداد کتنی ہے، لیکن جو کچھ اخباروں وغیرہ کی رپورٹوں سے ثابت ہو سکا ہے وہ یہ ہے کہ اِس وقت اسپین میں اطالیہ، جرمنی اور پرتگال کے سپاہی لڑ رہے ہیں، لیکن اُن کو کسی طور سے بھی "والنٹیر" یا رضا کار نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ وہ باقاعدہ طور پر فوجی ہیں، ہاں اصلی والنٹیر اگر آئے ہیں تو آئرلینڈ سے، وہ جنرل او ڈفی کے ماتحت لڑ رہے ہیں، اور اُن کی تعداد تین ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے، جرمنی کے قریبًا چالیس ہزار آدمی اسپین میں باغیوں کو امداد دے رہے ہیں، اطالیہ کی صحیح تعداد معلوم نہیں، لیکن روم کے ایک اخبار نے لکھا تھا کہ اس وقت اسپین میں اٹلی کے چالیس ہزار "والنٹیر" لڑ رہے ہیں،

گیوڈالجرا کے مقام پر لڑائی میں جو کاغذات ہاتھ آئے اُن سے

معلوم ہوتا ہے کہ فاشسٹ گرینڈ کونسل نے پچاس ہزار والنٹیر اسپین بھیجے، اخباروں کے نمائندوں کی رپورٹ ہے کہ اطالوی فوج کی تعداد دو لاکھ سے کم نہیں۔ حکومتِ اسپین کا یہ کہنا ہے کہ وہاں اس وقت کم از کم اسّی ہزار اطالوی سپاہی ہیں اس سے

اب ہم کو دیکھنا ہے کہ اسپین میں حکومت کی طرف سے کتنے غیر ملکی "رضا کار" لڑ رہے ہیں، باغیوں کے اعلان کے مطابق وہاں کم از کم اڑتیس ہزار غیر ملکی ہیں، لیکن "ٹائمز" کے نمائندہ نے کہا تھا کہ وہاں بیس اور پچیس ہزار کے درمیان اشخاص ہیں۔ فرانس کے سرحدی افسروں کا بیان ہے کہ جب سے اسپین کی خانہ جنگی شروع ہوئی ہے، وہاں سے بارہ ہزار والنٹیر گزرے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر فرض کر لیا جائے کہ تین چار ہزار آدمی بحری راستہ سے وہاں گئے اور دو ایک ہزار چھپ چھپا کر پہونچ گئے تو بھی یہ تعداد بیس ہزار سے زیادہ نہیں بنتی۔

اب سوال یہ ہے کہ ان غیر ملکی والنٹیروں کو واپس کیسے بلایا جائے؟ اس کا فیصلہ عدم مداخلت کمیٹی کا مجوزہ کمیشن ہی کرے گا۔ لیکن فی الحال جھگڑا اس بات پر ہے کہ آیا فریقین کے برابر برابر کے آدمی واپس کئے جائیں یا اگر باغیوں کے پانچ حامی واپس کئے جائیں تو سرکار کا صرف ایک، جرمنی اور اٹلی اول الذکر تجویز کے حامی ہیں، اور روس دوسری کا۔ اور در اصل سارے کے سارے غیر ملکی واپس بلانے کا صرف یہی طریق ہے کہ دوسری تجویز پر عمل کیا جائے،

پھر امداد کی دوسری صورتوں کو روکنے کا سوال ہے، اس کے فیصلے کے لئے بھی کمیشن کے فیصلے کا انتظار ہے۔

در اصل جب تک کمیشن کا فیصلہ صادر ہوگا اسپین کے تابوت میں آخری میخ گاڑی جا چکی ہوگی، دوِل عالم زیادہ تر باغیوں کی ہی حامی معلوم ہوتی ہے۔ جرمنی اور اٹلی نے تو جنرل فرینکو کی حکومت کو پہلے ہی منظور کر لیا تھا، اب انگلستان نے بھی فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ مفتوحہ علاقہ میں تجارتی سفیر مقرر کئے جائیں گے۔ جاپان اور دو تین چھوٹے چھوٹے یورپی ممالک نے بھی جنرل فرینکو کی حکومت کو منظور کر لیا ہے۔

بحرِ روم کا میدانِ کارزار

جب سے اطالیہ نے حبش کو فتح کیا ہے، اس کی بحیرۂ روم میں طاقت بڑھ گئی ہے، جو برطانیہ کے لئے سوہانِ روح ثابت ہو رہی ہے کیونکہ سمندر اس کے لئے شہ رگ کا حکم رکھتا ہے۔ مالٹا کا برطانوی مستعمرہ سسلی سے صرف ۶۵ میل دور ہے، اور اس فاصلے کو اطالیہ کے گولوں سے لدے ہوئے ہوائی جہاز صرف بیس منٹ میں طے کر سکتے ہیں۔ مالٹا کی بندرگاہ کا دہانہ بہت تنگ ہے۔ اس میں جہاز آسانی کے ساتھ آ جا نہیں سکتے۔ بندرگاہ کے اندر ان پر دشمن کا ہوائی بیڑہ بڑی آسانی سے حملہ آور ہو سکتا ہے چنانچہ جنگِ حبش کے موقع پر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ برطانیہ مالٹا میں اپنا بیڑہ نہیں رکھ سکتا۔ اسی لئے وہ اسکندریہ چلا گیا، جہاں وہ اطالوی ہوائی جہازوں کی پہونچ سے مقابلتاً باہر ہوگا۔

یہ خطرہ ابھی تک ذہن میں ہی تھا کہ بحیرۂ روم میں آنے جانے والے جہازوں پر حملے ہونے لگے۔ صرف برطانیہ کے کوئی تیس جہاز ان حملوں کا شکار ہوئے۔ فرانس اس بحری قزاقی سے گھبرا اٹھا، اور روس کا بھی ایک جہاز ترکی ساحل کے قریب ایک آب دوز کشتی کا نشانہ بن گیا، ترکی حکومت نے بیان کیا کہ کچھ دنوں سے ساحل کے آس پاس ایک آبدوز کشتی دیکھی جا رہی ہے لیکن اصل حملہ آور کا پتہ نہیں،

عدم مداخلت کانفرنس کی قراردادوں کی رو سے کسی مشکوک جہاز سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی اجازت نہ تھی، بلکہ اس کی اطلاع کانفرنس کو دینا پڑتی تھی۔

فرانس اور برطانیہ اپنے جہازوں کو خطرے میں دیکھ کر کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً ایک کانفرنس بلانے کی تجویز کی، جو نیون (سوئٹزرلینڈ) کے مقام پر ہوئی، اور نیون کانفرنس کے نام سے موسوم ہے، ابھی کانفرنس کے انعقاد کا انتظام ہو رہا تھا کہ روس کے ساتھ مندرجہ واقعہ پیش آیا، روس نے اطالیہ کو موردِ الزام ٹھہرایا، اطالیہ نے انکار کیا، روس نے اور زیادہ شد و مد سے الزام کو پیش کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اطالیہ ناراض ہو گیا، اور اپنے حلیف جرمنی سمیت کانفرنس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔

کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ سمندری راستوں کی نگرانی کی جائے اور جنگی جہازوں کو اس امر کی اجازت دی گئی کہ وہ حملے کا جواب حملے سے دیں، اٹلی علیحدہ رہا۔ صرف فرانس اور برطانیہ نے دیکھ بھال کا تمام بار اپنے ذمہ

لے لیا۔ اور فیصلہ کیا کہ اگر اٹلی شریک ہونا چاہے تو اُس کو ہر وقت اجازت ہے۔

بحیرۂ روم کا مسئلہ حل کرنے کے لئے برطانیہ سرعت کے ساتھ اپنے جنگی پروگرام کو مکمل کر رہا ہے۔ لیکن اس کے بالمقابل اطالیہ بھی غافل نہیں ہے ــــ وہ بھی اپنے بحری بیڑے کو دوگنا بلکہ تگنا کر چکا ہے۔

برطانیہ کو یہ بھی خیال ہے کہ اگر بفرضِ محال بحیرۂ روم سے اُس کا اقتدار اُٹھ گیا تو وہ افریقہ کے نیچے سے ہوکر پرانا بحری راستہ اختیار کر لے گا۔ اِس طرح اُس کا خیال ہے کہ خرچ بھی زیادہ نہ ہوگا۔ کیونکہ نہر سوئز کے محاصل جو اب دینا پڑتے ہیں، اُس راستہ پر دینا نہ پڑیں گے۔ دوسرے فاصلے کی کمی رفتار زیادہ کرکے پوری کی جاسکتی ہے، تیسرے جنگ کے زمانہ میں بیمہ کی جو رقم چڑھ جاتی ہے وہ بھی بچ جائے گی۔ الغرض برطانیہ جہاں بحیرۂ روم میں اپنا اقتدار برقرار رکھنے کی پوری کوشش کر رہا ہے، وہاں اُس کے ذہن میں مُتبادل راستے بھی ہیں۔

سیاسی ملاقاتیں

۱۹۳۷ء میں یورپ کے اکثر ممتاز سیاستداں اِدھر اُدھر باہمی باہمی ملاقاتوں پُراسرار گفتگوؤں اور مبہم اعلانات کرنے میں مصروف رہے، ان میں سے اہم ملاقاتیں ایک طرف مسولینی اور ہٹلر اور دوسری طرف لارڈ ہیلی فیکس اور ہٹلر کی تھیں۔

مسولینی اور ہٹلر پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے، کیونکہ ہٹلر جرمن ازم میں یقین رکھتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُن تمام ممالک کو جن میں جرمنی کے لوگ رہائش پذیر ہیں پرشیا کے سائے تلے لانا چاہتا ہے، لیکن مسولینی یہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتا۔ اِسی وجہ سے ہٹلر اور مسولینی کا آپس میں تیل اور آگ کا تعلق تھا، لیکن واقعات کے موجودہ رجحان نے اِن متخاصم ذہنیت کے مالک ڈکٹیٹروں میں اتحاد و یگانگت کی روح پیدا کر دی ہے اور اِسی وجہ سے ۱۹۳۴ء میں ہر ہٹلر مسولینی سے ملاقات کرنے کے لئے روما گیا، اور گزشتہ سال ستمبر میں مسولینی ہر ہٹلر سے ملنے آیا۔

ملاقات کی نوعیت کو پوشیدہ رکھا گیا ہے، لیکن کہا جاتا ہے کہ اس کے نتیجے میں روما اور برلن کے درمیان ایک معاہدہ قرار پایا ہے جس کی رُو سے یورپ میں بولشوزم کا قلع قمع کیا جائے گا، اور اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسپین اور فرانس کی اشتراکی حکومتیں صفحۂ یورپ سے ناپید کر دی جائیں گی۔ اور بہت جلد یہ ڈکٹیٹر روس کی بڑھتی ہوئی طاقت کے خلاف صف آرا ہو جائیں گے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ مسولینی، ہر ہٹلر سے انگریزوں کے خلاف امداد کا طالب تھا، لیکن ہر ہٹلر نے انکار کر دیا۔

بادی النظر میں یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ وہ جرمنی جس کی سلطنت کا بیشتر حصہ انگریزوں نے لے لیا اور تجارتی لحاظ سے بھی اُس کو نقصان پہونچا یا آج کس طرح انگریزوں کی حمایت پر کمربستہ ہوسکتا ہے، لیکن اگر ہم یہ جان لیں کہ جرمنی جس طرح بھی ہوسکے فرانس سے اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہتا ہے اور انگریز خود بھی فرانس کی روزافزوں ترقی سے خائف ہیں تو ہمیں یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی کہ انگریز آج کیوں جرمنی کو اپنے ساتھ ملانا چاہتے ہیں اور جرمنی کیوں اُن کی دوستی کا دم بھرتا ہے،

اسی عمل کے پیش نظر لارڈ ہیلی فکس (سابق لارڈ ارون وائسرائے ہند) نے ہر ہٹلر سے ملاقات کی، اگرچہ اس ملاقات کو بھی "ذاتی" اور "نجی" قرار دیا گیا، لیکن تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں، سمجھدار طبقہ جانتا ہے کہ اس ملاقات کے پس پشت بھی اینگلو جرمن اتحاد کا نظریہ تھا، جو فرانس کی طاقت کو دبانے کے لئے اب ضروری ہوگیا ہے۔

پھر یہ قیاس آرائی بھی کی جاتی ہے کہ جرمنی "معاہدۂ لوکارنو" کی بجائے ایک نیا معاہدہ چاہتا ہے، اور وہ بھی انگلستان کے ساتھ۔ دراصل جرمنی کا خیال ہے کہ بجائے اس کے کہ زیادہ ملکوں کے درمیان معاہدے ہوں بہتر ہے کہ صرف دو ملک آپس میں عہد و پیمان کر لیا کریں تاکہ نپٹنے میں آسانی رہے۔

مواعید و مواثیق

سیاسی ملاقاتوں کے علاوہ ۱۹۳۷ء میں بعض مواثیق و مواعید بھی کئے گئے جن میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۶ نومبر کو ہر وان ربن ٹراپ (جرمنی) کاؤنٹ کیانو (اطالیہ) اور مسٹر ہیروٹا (جاپان) کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ جس کا مقصد یہ تھا

کہ آئندہ یہ تینوں ممالک مل کر دنیا سے روسی کمیونزم کو ناپید کرنے کی کوشش کریں گے۔ دراصل اس مطلب کا ایک عہدنامہ ۱۹۳۶ء میں جاپان اور جرمنی کے درمیان ہوا تھا۔ لیکن اب اطالیہ نے بھی اس میں شامل ہونا منظور کر لیا ہے۔

جس دن یہ معاہدہ ہوا اُسی دن سائز گاڈا (اطالوی سفیر لندن) نے اطالیہ کے ایک اخبار میں لکھا تھا کہ اس معاہدہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بیس کروڑ آدمی اور بیس لاکھ ٹن کے بحری بیڑے موجود ہیں۔ ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تینوں ممالک پُرامن نہیں رہنا چاہتے، بلکہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے وہ گولے اور بارود کا استعمال بھی بُرا نہیں سمجھیں گے۔

ایک اور معاہدہ جرمنی اور پولینڈ کے درمیان ہوا، جس کی رو سے قرار پایا کہ وہ ایک دوسرے کے ملک کی اقلیتوں کے تمدن اور اخلاق کو کوئی نقصان نہ پہونچائیں گے۔ اس معاہدے کے ذریعہ جرمنی اپنے دو حریفوں۔ روس اور زیکوسلوواکیا۔ کے درمیان ایک دیوار کھڑی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کیونکہ پولینڈ کی ایک سرحد پر روس ہے اور دوسری پر زیکوسلوواکیا۔ اور بہت ممکن تھا کہ روس زیکوسلوواکیا سے جرمنی کے خلاف کوئی ساز باز کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن اب یہ امکان بھی جاتا رہا۔

جرمنی اور پولینڈ کے اتحاد کی تہ میں ایک اور راز بھی ہے اور وہ یہ کہ عہدنامہ ورسائی کی رُو سے جو نئی ریاستیں بنائی گئی تھیں اُن میں ایک پولینڈ بھی ہے۔ اب جہاں پولینڈ کے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اُن کی آزادی برقرار رہے وہاں فرانس کی بھی یہی مرضی تھی، اور اس سلسلے میں اُس کی کچھ مالی امداد بھی کرتا رہا۔ لیکن جب ہر ہٹلر برسر اقتدار آیا تو اُس نے تاوان دینا بند کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس پولینڈ کی مالی امداد نہ کر سکا۔ اس سے پولینڈ کے لوگ برافروختہ ہو گئے اور کچھ اُنھوں نے سوچا کہ ہٹلر کے مقابلہ میں فرانس کی دوستی اُنھیں مہنگی پڑے گی۔ چنانچہ اُنھوں نے فرانس کے متعلق اپنا نقطۂ نگاہ بدل لیا، اور ہٹلر سے معاہدہ کر لیا۔ اس وقت فرانس کے ساتھ اُن کا تجارتی معاہدہ ہے، لیکن وہ بھی برائے نام، کیونکہ ۱۹۳۴ء کے معاہدہ نے اُسے بھی ناکارہ کر دیا ہے۔

ایک معاہدہ اطالیہ اور یوگوسلاویا کے درمیان ہوا۔ اگرچہ اطالیہ کا یوگوسلاویا کے ساتھ وہی تعلق تھا جو جرمنی کا پولینڈ کے ساتھ۔ لیکن روس کے مقابلے میں اپنی قوت کو محفوظ کرنے اور وسطی یورپ میں اپنی سیاست کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنے کی غرض سے مسولینی کو یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا۔ دراصل مسولینی بحیرۂ ایڈریاٹک پر جو اطالیہ اور یوگوسلاویا کے درمیان ہی اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتا ہے، اسی غرض کے لئے اُس نے بعض بندرگاہوں پر قبضہ جمایا اور البانیہ کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا۔ اور اب اسی لئے یوگوسلاویا سے اُس نے ایک معاہدہ کیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ برطانیہ وسطی یوروپ میں اطالیہ کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ اور ریاست بلقان میں جرمنی کا بڑھتا ہوا اثر اُسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

وسطی یوروپ میں اقتدار بڑھانے کے لئے مسولینی کی نظر عربی ممالک پر بھی ہے۔ چنانچہ اُس نے یمن پر نگاہِ التفات ڈالنا شروع کر دی ہے، اور "اسلام نوازی" اور "مسلم پروری" کے ڈھونگ کے سایہ تلے اس سے پینگیں بڑھا رہا ہے۔

پیش آمدہ جنگ کے خوف سے اسلامی ممالک بھی آپس میں رشتۂ اتحاد جوڑ رہے ہیں، چنانچہ "معاہدۂ سعد آباد" اسی کا ایک شاخسانہ تھا۔ ترکی۔ افغانستان، ایران اور عراق نے آپس میں عہد کیا ہے کہ وہ سیاسی خطرات کے وقت ایک دوسرے کے دست راست ہوں گے۔ برطانیہ اس معاہدہ سے خوش ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مسلم ممالک اطالیہ کے نرغے میں نہ آئیں گے۔ بلکہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے برطانیہ کا ہی ساتھ دیں گے، اور یہی چیز ہے جس کی اُسے آجکل تلاش ہے۔

پھر جاپان نے بھی اطالیہ سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ حبش سے روئی لینے کی اجازت دے گا، اور اس کے بدلے میں وہ اُس کی ہر ممکن امداد کرے گا۔ وسط دسمبر میں اطالیہ نے یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ لیگ آف نیشنز کا مقاطعہ کیا جائے، اور پرتگال، بلغاریہ، البانیہ، جاپان اور جرمنی کی مدد سے ایک علیحدہ فیسطائی لیگ قائم کی جائے۔

تقسیم فلسطین

ہر ہٹلر نے بر سر اقتدار آتے ہی جرمنی سے یہودیوں کو نکالنا شروع کر دیا۔ اب اُن کو کہیں سر چھپانے کی جگہ درکار تھی۔ مجبوراً وہ اپنے پرانے وطن فلسطین کی طرف راغب ہوئے۔ کچھ استعمار پسند انگلستان نے اُن کی مدد کی۔ عرب پہلے ہی برطانوی انتداب سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ اُن کو دبانے کے لئے یہودیوں کو اُن پر مسلط کر دینے سے بہتر کوئی تجویز نہ تھی، لارڈ بالفور نے پہلے ہی اعلان کر دیا تھا کہ فلسطین یہودیوں کا گھر ہے، اور وہ یہاں آکر آباد ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہودی دھڑا دھڑ فلسطین میں آنے لگے، عربوں نے جب دیکھا کہ اُن کی قومیت پر کلہاڑا چل رہا ہے تو اُنھوں نے صدائے احتجاج بلند کی، معاملہ معرضِ تعویق میں ڈالنے کی غرض سے برطانیہ نے ایک شاہی کمیشن مقرر کر دیا جس کی وسط ۱۹۳۶ء میں پورے ایک سال بعد رپورٹ شائع ہوئی۔

اس رپورٹ کی رُو سے فلسطین کا زرخیز اور اہم ترین ساحلی علاقہ یہودیوں کو دیا گیا۔ عرب معمولی سے بنجر علاقہ کی طرف دھکیل دیے گئے اور بیت المقدس خود سفیر برطانیہ کی تحویل میں رہا۔

عربوں پر یہ کیا کم ستم تھا کہ اُن کے ملک کے اِس طرح سے حصّے بخرے کر دیے جائیں۔ لیکن غضب بالائے غضب یہ ہے کہ ساحل کا تمام عمدہ علاقہ ساری زرخیز زمینیں اور پھر خود قبلۂ اولیٰ بیت المقدس کا شہر اُن سے چھین لیا گیا۔ یہ ہے عرب کی اُن دفا کیشیوں کا صلہ جو اُنھوں نے اپنوں کو چھوڑ کر غیروں سے روا رکھیں۔ خود شاہی کمیشن کا اعتراف ہے کہ "جنگ عظیم میں اتحادیوں کی کامیابی کو عرب اپنی مکمل آزادی سمجھے ہوئے تھے، اور یہی ولولہ اُن کو جنگ میں ہمت دلا رہا تھا۔"

اور حق یہ ہے کہ برطانیہ نے سر ہنری میکموہن کے ذریعہ شریف حسین سے یہ پختہ معاہدہ کیا تھا کہ جنگ کے بعد عربی ممالک کی جس میں نجد و حجاز، عراق و شام شامل تھے آزادی تسلیم کر لی جائے گی۔ فلسطین ترکی حکومت میں شامل تھا اس لئے لازماً اس کے معنی یہ تھے کہ فلسطین بھی آزاد ہوگا۔ لیکن افسوس کہ استعمار پسندوں کی پرانی سیاست کام آئی اور معاہدات حوالۂ طاقِ نسیاں کر دیے گئے۔

شریف حسین کو جزیرۂ عرب کی مکمل آزادی کا یقین دلانے کے بعد برطانیہ اور فرانس کے درمیان کچھ عہد و پیمان ہوئے، اور اُنھوں نے شمالی عرب یعنی شام و عراق کا علاقہ خفیہ خفیہ اپنے درمیان تقسیم کرا لیا۔ بیت المقدس کے متعلق طے ہوا کہ وہ ترکی حکومت سے علیحدہ کر کے آپس میں سے کسی ایک (یعنی فرانس، برطانیہ یا روس) کو دے دیا جائے۔

۱۹۱۷ء تک کسی کو اِس معاہدہ کی اور خصوصاً حصہ دوم کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ لیکن آخر گھر کے بھیدی روس نے لنکا ڈھا دیا۔

اِنہی دنوں یعنی نومبر ۱۹۱۷ء میں برطانیہ نے یہودیوں سے بات چیت شروع کی، اور اِس کا نتیجہ اعلانِ بالفور کی شکل میں رونما ہوا جس میں فلسطین کو یہودیوں کا "قومی گھر" تسلیم کیا گیا اور وعدہ کیا کہ انگریز اُن کو وہاں آباد ہونے میں ہر ممکن امداد دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی فلسطین کی غیر یہود آبادی کو یہ یقین دلایا گیا کہ اُن کے "مذہبی اور معاشری حقوق بالکل محفوظ ہوں گے۔"

یہودی آبادیاں
ریلیں

مسٹر لائڈ جارج نے بھی جو اُس وقت برطانیہ کے وزیر اعظم تھے، اب کمیشن کے روبرو تسلیم کیا کہ یہودی رہنماؤں نے برطانیہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اتحادی فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن بنانے میں خاطر خواہ مدد کریں تو وہ اپنی تمام تر کوشش اتحادیوں کی حمایت میں صرف کریں گے۔"

بہر حال اگر فلسطین کی موجودہ تقسیم کی گئی ہے تو وہ برطانیہ کے اُن مواعید و مواثیق کی بنا پر ہے جو جنگِ عظیم کے دوران میں یہودیوں سے کئے گئے۔ لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا وجہ ہے کہ انگریزوں نے یہودیوں کے معاہدات تو پورے کر دیئے لیکن عربوں کے مواثیق کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا تو اس کی وجہ ہم سوائے اِس کے کچھ نہیں بتا سکتے کہ ملوکیت خواہی کا یہی تقاضا تھا۔

دراصل فلسطین کا ساحل بحیرۂ روم کی ایک زبردست دیوار ہے جس سے برطانیہ کسی صورت میں بھی دست کش نہیں ہو سکتا۔ حیفہ یہاں کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے، اور روز بروز اس کی اہمیت بڑھ رہی ہے، عراق سے تیل کے پائپ کی جو لائن فلسطین سے گزرتی ہے اُس کا مخرج بھی یہیں ہے، اور یہ فلسطین کی ریلوں کا مرکز بھی ہے۔ علاوہ ازیں برطانیہ نے ایک ہوائی مستقر تو لُدّ میں بنا رکھا ہے اور دوسرا حیفہ کی سرزمین پر قائم کیا جائے گا۔

الغرض فلسطین کی عسکری سیاسی اور اقتصادی اہمیت ایسی ہے کہ برطانیہ اُس سے اپنا انتداب ہرگز اُٹھانے کے لئے تیار نہ ہوگا، اور علی الخصوص اب جبکہ بحیرۂ روم میں اُس کے اقتدار کو ضعف پہونچ رہا ہے فلسطین کا ساحل اُس کی اُمیدوں کا آخری سہارا ہوگا۔

شاہی کمیشن کی رپورٹ سے عربوں میں قدرتاً ہیجان پیدا ہوا۔ اور وہ پہلے سے بھی زیادہ یہودیوں اور انگریزوں کا مقابلہ کرنے لگے، حتیٰ کہ مسٹر اینڈریوز بھی اُن کے حملے سے محفوظ نہ رہ سکے، لیکن برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ عربوں کی "اشتعال انگیزی" کو نہایت سختی سے دبا دیا جائے، چنانچہ گورہ فوج نے اپنی طاقت استعمال کی۔ تمام فلسطین پر فوجی قبضہ ہو گیا مجلس اعلیٰ توڑ دی گئی، اور اُس کے ارکان قید و بند کی نذر ہوئے، ہر رہ گذر کی جامہ تلاشی لی جانے لگی، جس کے قبضہ سے آتشیں ہتھیار نکلتا اُس کو فوراً حوالۂ دار کر دیا جاتا، اسی کشمکش میں مفتیٔ فلسطین کو بھاگنا پڑا۔ وہ فرانس میں پناہ گزین ہوا تو برطانیہ کے اشارہ پر نظر بند کر دیا گیا۔

ایک طرف فلسطین میں قتل و غارت کا بازار گرم ہے تو دوسری طرف جزیرۂ عرب، شرق اردن، شام اور عراق میں برطانیہ کی اس حکمت عملی کے خلاف احتجاج کیا جا رہا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ برطانیہ کب تک گولہ و بارود کے ذریعہ عربوں کو شاہی کمیشن کا فیصلہ ماننے پر اصرار کرتی ہے۔

معاہدۂ مصر و برطانیہ اور اُسکے بعد

۱۹۳۷ء میں مانٹرو کانفرنس کے فیصلہ کے مطابق غیر اقوام کو مصر میں جو مراعات حاصل تھیں وہ منسوخ کر دی گئیں۔ انگریزوں سے ایک معاہدہ ہوا جس کی رُو سے وہ نہر سوئز پر کم از کم بیس برس تک مع اپنی فوج کے مسلط رہیں گے اور مصر کو جمعیتہ الاقوام کا ایک باقاعدہ رکن تسلیم کر لیا گیا۔ اس تغیر کو کما حقہ، ذہن نشین کرنے کے لئے ہمیں مصر کی تاریخ مراعات کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔

مراعاتی نظام کی ابتدا ترکی خلفا کے عہد میں ہوئی جنھوں نے مخصوص عیسائی حکومتوں کو اپنے ملک میں بعض داخلی آزادیاں نوازش فرمائیں، پہلے تو یہ نوازشیں صرف تجارت تک محدود تھیں، لیکن جب عثمانی سلطنت کمزور ہو گئی تو اِن حقوق کی نوعیت بدل گئی۔ ترکوں کی ہر شکست کے بعد ہر فاتح قوم مراعات میں اپنے لئے ایک نئی دفعہ کا اضافہ کر دیتی تھی، اور حکومت کو اُسے مجبوراً منظور کرنا پڑتا۔

بعد کو یہ حقوق صرف تجارتی نہ رہے بلکہ عدالتی اُمور پر بھی حاوی ہو گئے۔ غیر ملکی لوگ اپنے مقدمات کے فیصلے کے لئے علیحدہ علیحدہ عدالتوں کا مطالبہ کرنے لگے، اور اُن کی پشت پر اُن کی حکومتیں ہوتی تھیں۔ اگر کوئی عثمانی حکومت کا فرد کسی غیر ملکی پر ہاتھ بھی اُٹھاتا تو اُس کی حکومت کے بیڑے باب عالی پر دباؤ ڈالنے کے لئے آپہونچتے تھے۔ اِس کے علاوہ عثمانی حکومت غیر ملکیوں کی رضامندی کے بغیر نہ تو کوئی نئی اقتصادی پالیسی اختیار کر سکتی اور نہ کوئی ریل گاڑی تک بنا سکتی تھی۔

جنگِ عظیم کے بعد خود ترکیہ میں تو یہ مراعات منسوخ کر دی گئیں لیکن چونکہ مصر اب ترکیہ سے علیحدہ تھا، اس لئے برطانوی اقتدار کے طفیل میں نیل کا یہ "فیضان" بڑی فیاضی کے ساتھ جاری رہا۔ بلکہ ۱۹۳۱ء میں ایک معاہدہ کے ذریعہ اِن مراعات کی مدت غیر محدود عرصہ کے لئے بڑھا دی گئی۔

مصر میں ایک طبقہ اِن غیر ملکی ہتھکنڈوں کے خلاف تھا، لیکن فرمانروا

قوت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ آخر اتفاق سے حبش اور اطالیہ کی آپس میں چھڑ گئی۔ مصر نے اس نازک وقت سے فائدہ اُٹھایا۔ ملک میں ہڑتالیں ہوئیں۔ طلباء نے مدارس چھوڑ دیئے۔ گولی چلی، چند ایک مرے، نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے مصری جوشیلوں کو رام کرنے کی کوشش کی ۱۹۳۰ء سے قبل والا دستور بحال ہوگیا۔ وفد پارٹی برسرِ اقتدار آئی، برطانیہ سے معاہدہ ہوا۔ معاہدے کے بعد یورپی مراعات کا خاتمہ کر دیا گیا۔ برطانوی دخل اندازی بہت حد تک کمزور ہوگئی۔ اور مصر کو جمعیۃ اقوام کا ممبر بنا دیا گیا۔

معاہدہ مصر و برطانیہ کے روحِ رواں نحاس پاشا وفد پارٹی کے لیڈر ہیں۔ لیکن ملک کے اکثر لوگ (خصوصاً طلبہ) اُن سے برافروختہ ہیں کہ کیوں اُنھوں نے برطانیہ سے معاہدہ کیا۔ مکمل آزادی حاصل کیوں نہیں کی، چنانچہ وفد پارٹی کے خلاف شورش کر رہے ہیں۔ اوائل دسمبر میں نحاس پاشا پر سبز پوشوں نے جو معاہدہ کے خلاف ہیں حملہ بھی کیا تھا۔ اور عام خیال یہ ہے کہ وفد پارٹی اب زیادہ دیر تک برسرِ اقتدار نہیں رہ سکتی۔

شاہ فاروق جو اب مصر میں حکمراں ہیں عوام میں بہت ہر دلعزیز ہیں۔ نحاس پاشا کو اُن کی یہ ہر دلعزیزی ایک آنکھ نہیں بھاتی، شاید وہ مسولینی اور ہٹلر کی طرح ڈکٹیٹر بننا چاہتا ہے، لیکن بادشاہ اور عوام اُسے یہ اختیار دینے کے خلاف ہیں۔

الغرض مصر اگرچہ اب برطانیہ کا کٹ پُتلی نہیں رہا۔ لیکن آپس کے جھگڑوں سے غیر اقوام کو طعنہ زنی کا موقع دے رہا ہے

اُدھر مسولینی لبیا پر اپنی فوجیں اکٹھی کر رہا ہے۔ وادیٔ نیل پر قبضہ کرنے کی خواہش مسولینی کے دماغ میں اس قدر جاگزیں ہے کہ خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ مصر کا بھی کہیں وہی حشر نہ ہو جو آج سے ایک سال قبل حبش کا ہو چکا ہے اور اس طرح پر وہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک جائے۔

فرانسیسی نوآبادیات میں شورش

جب سے مسولینی نے حبش کو فتح کیا ہے شمالی افریقہ کے عربوں میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا ہے، اور وہ آزادی کے لئے ہات پاؤں مار رہے ہیں۔

فرانس کے شمالی افریقہ میں مراکش اور الجزائر دو مشہور مقبوضات ہیں۔ الجزائر پر اُس کا سو برس سے زیادہ عرصے سے قبضہ ہے۔ اس طویل مدت میں فرانس کی حکمتِ عملی یہ رہی ہے کہ اہلِ جزائر کو اپنی زبان، مذہب قومیت اور تمدن سے بیگانہ کر کے اُنھیں حقیقی معنوں میں فرانس کا غلام بنا دیا جائے۔

اس تجویز کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اُس نے عربی زبان کی ترویج و تدریس پر پابندیاں عائد کر دیں۔ نام نہاد "علماء" اور "صوفیا" کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ تاکہ "روشن خیال" نوجوان اپنے مسخ شدہ مذہب سے متنفر ہو جائیں اور نئی نسلیں مذہب سے عاری اور فرانسیسی تمدن کی دلدادہ بن کر نکلیں۔ جزائری عربوں کی قومیت کو فنا کرنے کے لئے یہ چال چلی کہ جو جزائری اپنی قومیت کو چھوڑ کر فرانسیسی قومیت اختیار کرتا اُس کے ساتھ خاص رعایتیں ملحوظ رکھی جاتیں، جس کے دوسرے معنی یہ ہوتے کہ اب وہ بجائے اسلامی شریعت کا پابند ہونے کے فرانسیسی قوانین کے ماتحت آگیا ہے۔ اور اس طرح پر فرانس کا خیال تھا کہ اسلامی ثقافت اور عربی تمدن بالکل نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں اہلِ جزائر کو فرانسیسی بنانے کے لئے عیسائی مشنریوں سے کام لیا جانے لگا۔ اور جہاں اسلام کی تبلیغ کو روک دیا گیا وہاں عیسائیت کی ترویج کی گئی۔

اگر معاملہ یہاں تک ہی رہتا تو شاید الجزائر میں آج اتنی بے اطمینانی نہ پھیلتی۔ لیکن اِس کے علاوہ فرانس نے ساحل کی زرخیز زمینیں عربوں سے چھین کر فرانسیسی آبادکاروں کو دے دیں۔ تجارت، صنعت و حرفت اور دولت آفرینی کے تمام ذرائع پر یہودی اور فرانسیسی قابض کر دیئے۔ اور جزائری ایک مزدور بن کر رہ گیا۔ اِن سب باتوں کا ردِ عمل ضروری تھا جواب "شورش" کی صورت میں رونما ہو رہا ہے۔

اسی طرح مراکش میں بھی ۱۹۰۴ء سے فرانسیسی اقتدار قائم ہے، وہاں اگرچہ "سلطانِ مراکش" نام کو باقی ہے۔ لیکن دراصل سب کچھ فرانسیسی ہائی کمشنر کے ہات میں ہے۔

جنگِ عظیم کے بعد اہلِ مراکش نے آزادی کے لئے کوشش کی۔ لیکن اُن کو آپس میں لڑا کر اِس تحریک کو سختی سے کچل دیا گیا۔

مراکش میں دو نسلوں کے مسلمان آباد ہیں، ایک تو عرب ہیں

جو زیادہ تر ساحلی علاقوں میں اقامت گزیں ہیں اور دوسرے بربر ہیں جو اندرونِ ملک اور پہاڑوں میں رہتے ہیں۔

عرب بیشتر تعلیم یافتہ ہیں، عربی اُن کی مادری زبان ہے۔ لیکن بربر عربی زبان اور اسلامی ثقافت سے ایک حد تک بیگانہ ہیں، فرانس نے بربروں کو عربوں کے خلاف اُکسایا اور اُنھیں عربی زبان، اور اسلامی تمدن سے بالکل علیحدہ کرنے کے لئے اُن میں "بربری قومیت" کا خیال پیدا کیا۔ اُن کی آبادی میں عربی زبان کی درسگاہیں بند کردی گئیں اور مسلمان واعظوں اور مدرسوں کو بربروں تک پہونچنے سے روک دیا گیا۔ اب تک بربر اسلامی شریعت کے تابع تھے، لیکن فرانس نے شرعی عدالتیں منسوخ کرکے فرانسیسی قانون نافذ کیا، اور جزائر کی طرح عیسائیوں کو ملک بھر میں پھیلا دیا۔

ان سب اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ مراکش میں بےچینی بڑھ گئی، ان "اصلاحات" کو نہ صرف عرب بُری نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ خود بربر بھی اُن کے خلاف ہیں۔

مراکش کی اس صورتِ حال نے اسپین کی خانہ جنگی کی وجہ سے اور بھی نازک صورت اختیار کرلی ہے۔ مراکشی عرب دیکھتے ہیں کہ اُن کے پڑوسی اسپینی مراکش کے باشندے فرانکو کی فوج میں دھڑا دھڑ بھرتی ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ ہنوز فرانسیسی غلامی کی زنجیروں میں مقید ہیں، اُدھر مسولینی عربوں پر خاص عنایات و نوازشات کی بارش کر رہا ہے جس سے مراکش کے عربوں کو اور زیادہ شہ ملی ہے۔ شمالی افریقہ کے عرب ہٹلر سے بھی متفق ہیں، کیونکہ وہ یہودیوں سے تنگ آئے ہوئے ہیں، اور ہٹلر کی یہود دشمنی زبانِ زدِ خلائق ہے۔

یہ ہلچل صرف مراکش اور الجزائر تک محدود نہیں، بلکہ اس کا اثر ٹیونس میں بھی ہے۔ وہاں کا مشہور رہنما عبدالعزیز الثعالبی ایک عرصے کی جلاوطنی کے بعد واپس ٹیونس پہونچ چکا ہے اور ملک کی مردہ تحریک میں از سرِ نو جان پڑگئی ہے۔

فرانسیسی حکومت نے ان جھگڑوں کا تصفیہ کرنے کے لئے ایک کانفرنس بلائی ہے۔

فرانس میں بادشاہت کے لئے بےچینی

نپولین کی گرفتاری کے بعد فرانس میں جمہوریت قائم ہوگئی تھی۔ مگر وہ چند ہی سال رہی، اُس کے بعد نپولین سوئم آیا۔ اُس نے تمام دنیا کو فتح کرکے نپولین اول کی طرزِ حکومت بحال کرنا چاہی۔ لیکن بدقسمتی سے اُن دنوں جرمنی میں بسمارک چانسلر تھا۔ جو نپولین سوئم سے کہیں زیادہ مدبر اور سیاست داں تھا۔ چنانچہ ۱۸۷۰ء میں نپولین سوئم کے خواب پریشان ہوگئے اور وہ انگلستان جاکر فوت ہوگیا۔

اس کے بعد حکومتِ جمہوری کا آغاز ہوا۔ جو آج تک قائم ہے، لیکن کبھی کبھی وہاں ایسے اشخاص پیدا ہو جاتے ہیں جو اپنے آپ کو نپولین کی اولاد کہتے ہیں۔ اور تخت وتاج واپس مانگتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں فرانس کے ڈیوک ڈی گائی نے اعلان کیا کہ وہ فرانس کے اصلی بادشاہ لوئی کے خاندان میں سے ہے۔ اس لئے تخت وتاج اُسے واپس ملنا چاہئے۔

علاوہ ازیں فرانس میں آج کل عام بےچینی بہت بڑھ رہی ہے۔ اس کی وجوہ سیاسی اور اقتصادی دونوں ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں سٹیوسکی کے غبن کا واقعہ ہوا جس میں کئی وزرا بھی شامل تھے۔ آخر جب سازش کا انکشاف ہوا تو وزارت کو مستعفی ہونا پڑا۔ اُس وقت فرانس میں مسٹر باٹیمپس وزیر اعظم تھے۔ پہلے تو اُنھوں نے اِس معاملہ کو دبانے کی کوشش کی۔ مگر یہ اتنا اہم تھا کہ دب نہ سکا۔ چنانچہ دوسری وزارت آئی۔ لیکن فاشسٹوں نے اس موقعہ کو ہات سے نہ جانے دیا، اور جی بھر کر سرکار کے خلاف پروپیگنڈا کیا۔ بدقسمتی سے وہ حکومت پر قابض نہ ہوسکے۔ اُس وقت سے لے کر حزب الاختلاف اور حزب المطابقین میں خوب لے دے ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی حالات نے بھی اپنا اثر کیا اور ان دونوں پارٹیوں کے اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔

آج یہ حالت ہے کہ ایک سوشلسٹ حکومت برسرِ اقتدار ہے، مگر فاشسٹ برابر اُس کو ناکام بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس سال ایک سازش کا جو فاشسٹوں کی طرف سے کی جا رہی تھی انکشاف ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے لئے کئی ماہ سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ غیر ملکی امداد

بھی مہیا ہوتی نظر آتی ہے۔ اس سلسلہ میں کئی جگہ تلاشیاں ہوئیں اور بم، پستول، مشین گن وغیرہ بہت سا جنگ کا سامان برآمد ہوا ہے۔ ایک نقشہ مسٹر بلم سابق وزیر اعظم کے گھر کا بھی دستیاب ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ملی تھیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ سازش ایک وسیع پیمانے پر مرتب کی گئی تھی۔

اس سازش میں حصہ لینے والوں کو لیگولارڈز یا (نقاب پوش)

کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بہت سی گرفتاریاں ہوئیں، جن میں منجملہ دیگر ملزمین کے فاشسٹوں کا لیڈر کرنل ڈی لاک بھی تھا۔ اس شخص نے فرانس میں بعض خفیہ سوسائیٹیاں بنائیں جن میں سے

اور

مشہور ہیں۔ ان کا کام بادشاہت کو واپس لانے کی کوشش کرنا ہے۔

فرانس میں مخالفین اشتراکیت کی بہت سی انجمنیں ہیں۔ لیکن باوجود کوشش کے یہ اب تک مجتمع نہیں ہو سکیں۔ ورنہ شاید اُن کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی۔

جرمنی کا نوآبادیات کے لئے مطالبہ

جرمنی کئی سال سے زمانۂ جنگ کی چھینی ہوئی نوآبادیات کی واپسی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ لیکن جس شد و مد سے اُس نے یہ معاملہ ۳۶ء میں اٹھایا اُس کی مثال شاید کسی پہلے سال میں نہ مل سکے گی۔

آج سے پانچ سال قبل جرمنی کے سابق چانسلر وان پاپن نے کہا تھا کہ معاہدۂ ورسائی پر بہر صورت نظر ثانی کی جائے گی۔ اور اس میں یہ ترمیم ضرور ہوگی کہ جرمنی کی نوآبادیات واپس کی جائیں۔

اس کے دو سال بعد ہر ہٹلر نے کہنا شروع کیا کہ عالمگیر امن کے لئے ضروری ہے کہ جرمنی کی نوآبادیات واپس کی جائیں۔ اُس وقت کسی نے بھی خیال نہ کیا کہ معاملہ کس حد تک پہونچنے والا ہے۔ لیکن ہر ہٹلر اور اُس کے رفقا کی تقاریر کا موجودہ رجحان اقوام عالم کے لئے یقیناً فکر انگیز ہے۔

۳۶ء میں ہر ہٹلر نے ایک تقریر کی جس میں صاف طور پر کہہ دیا کہ ہم اپنی نوآبادیات کی واپسی کا مطالبہ کبھی بند نہیں کر سکتے۔ ہم اُسے ہر سال بلند سے بلند تر آواز میں پیش کرتے رہیں گے۔ حتیٰ کہ دول عالم اُس کو سننے پر مجبور ہو جائیں۔ پھر اُس نے کہا " ایک سال کے بعد لوگ ہماری بات سننے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ دو سال کے بعد ہماری بات پر غور کرنے لگ جائیں گے۔ تین سال کے بعد وہ یہ بھی سوچنے لگ جائیں گے کہ اس مطالبہ کو کیسے پورا کیا جائے "

جو لوگ ہر ہٹلر کی طبیعت کو سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہر ہٹلر خالی باتیں بنانے والا نہیں بلکہ وہ نہایت عملی آدمی ہے، اُس نے اپنے ملک میں خاص اسی غرض کے لئے ایک محکمہ بنایا ہے، جس کا انچارج برطانیہ کا جرمن سفیر وان ربن ٹراپ ہوگا۔ اس محکمہ کا مقصد صرف نوآبادیات کی واپسی ہوگا۔ اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہر ہٹلر یا مسولینی اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے کیا ذریعہ اختیار کیا کرتے ہیں۔

اس وقت کئی ممالک میں جو جرمنی کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں، اٹلی اور جاپان تو پہلے ہی اُس کے ہم آہنگ ہیں۔ فرانس کے فاشسٹ بھی اُس کے مطالبہ سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ بلجیم کی ڈیگرل پارٹی اُس کے ساتھ ہوگی، پرتگال، آدھا اسپین اور پولینڈ کا کافی حصہ اُسے امداد دیگا۔ اب افریقہ میں بھی اُس کے حامی پیدا ہو رہے ہیں۔ مثلاً ساؤتھ افریقہ کی حکومت کے وزیر مسٹر ڈی والٹر نے اس مطلب کا ایک اعلان بھی کیا تھا۔ پس جب بہت سے ممالک اور لوگ جرمنی کی پشت پر ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنا مطالبہ نہایت زور سے پیش نہ کرے۔

سنا جاتا ہے کہ لارڈ ہیلی فیکس نے ہر ہٹلر سے ملاقات کے وقت انگلستان کی طرف سے کہا کہ اگر جرمنی دس سال تک اپنی نوآبادیات کا مطالبہ نہ کرے تو اُس کے عوض انگلستان اسے مرکزی یورپ میں اپنی پہلی مملکتیں مانگنے میں کوئی رکاوٹ حایل نہ کرے گا۔ اس سے فرانس اور مرکزی یورپ میں قدرتاً تشویش بڑھ گئی، فرانس کے دو وزرا انگلستان گئے اور برطانوی وزرا سے ملاقی ہوئے۔ ملاقات کے بعد اعلان کیا گیا کہ دونوں ممالک کے مفاد یکساں ہیں۔ جس سے غلط فہمی بہت حد تک دور ہو گئی۔

بلجیم کی غیر جانبداری

۱۳ اکتوبر ۳۷ء کو ہر ہٹلر نے بلجیم سے یہ وعدہ کیا کہ وہ آئندہ اُس کی غیر جانبداری کی قدر کرے گا۔ بلکہ اگر کسی اور ملک نے اس پر حملہ کیا تو

وہ اُس کی مخالفت کرے گا۔

سیاسیاتِ یورپ میں بلجیم کی حیثیت کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا چاہئے کہ یہ ملک فرانس اور جرمنی کے درمیان واقع ہے۔ بدیں وجہ جب کبھی بھی فرانس اور جرمنی کے درمیان جھگڑا اُٹھتا ہے تو اس کا نقصان بلجیم کو ضرور پہونچتا ہے۔

بلجیم کوئلے۔ لوہے اور فولاد کا مشہور مخزن ہے۔ علاوہ ازیں یہاں سکہ۔ شیشہ۔ جست اور روئی بھی کافی مل جاتی ہے۔

یہ اُس کی اس اہمیت کا ہی نتیجہ ہے کہ دنیا کی اکثر بڑی بڑی لڑائیاں اس کے میدانوں میں لڑی گئیں۔ چنانچہ واٹرلو۔ بوومنس۔ کورٹرائی۔ بلین ہیم، اور پیرس کی جنگیں اسی جگہ پر ہوئی تھیں۔ پس اگر بلجیم کو ہندوستان کا پانی پت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

۱۸۳۹ء کے صلحنامہ کے مطابق بلجیم کو آزادی حاصل ہوئی۔ وہاں کے رہنے والوں نے اپنی نازک پوزیشن کو جانچ لیا، اور اُنھیں محسوس ہوگیا کہ وہ دو زبردست ملکوں کے درمیان ہیں۔ اس لئے خیر اسی میں ہے کہ وہ غیر جانبدار رہیں۔ اسی نظریہ کے مطابق ۱۹۱۴ء تک وہ کسی جنگ میں شریک نہ ہوئے۔

چونکہ بلجیم کے انگلستان وغیرہ کے ساتھ معاہدات تھے کہ وہ اُسکی غیر جانبداری کی قدر کریں گے، اس لئے جنگِ عظیم کے موقع پر انگلستان نے فرانس اور جرمنی سے قول مانگا کہ وہ بلجیم پر چڑھائی نہ کریں گے۔ فرانس نے تو جھٹ وعدہ کر دیا۔ لیکن جرمنی نے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ اُس کی اصل غرض بلجیم کے راستے فرانس پر حملہ کرنا تھا۔ جب موقعہ آیا تو بلجیم نے جرمن فوجوں کو اپنے ملک میں سے گزرنے کی اجازت نہ دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی نے بلجیم پر دھاوا بولدیا۔ اور اُس کی حفاظت کے لئے انگلستان بھی جرمنی کے خلاف ہوگیا۔

جنگ کے بعد بلجیم نے پھر اپنی غیر جانبداری کے لئے دیگر ممالک سے اقرار لیا۔ لیکن جب سے ہر ہٹلر برسرِ اقتدار آیا ہے بلجیم کے خطرات اور بھی بڑھ گئے ہیں، اسی لئے اس نے ہر ہٹلر سے اپنی غیر جانبداری کی قدر کرنے کا معاہدہ کروانا چاہا اور وہ اس مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہوا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہر ہٹلر ایسا ڈکٹیٹر اپنے وعدہ پر قائم رہے گا؟

بلجیم میں اس وقت جمہوری حکومت ہے، اور نومبر سے پہلے اُس کا وزیرِاعظم مسٹر وینزی لینڈ تھا۔ اس جمہوریت میں ایک فاشسٹی پارٹی بھی ہے جس کا لیڈر ڈیگرل ہے۔ یہ وینزی لینڈ کا سخت دشمن ہے، اور ہر وقت اُس کو گرانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ یہاں تک نوبت آئی کہ مسٹر وینزی لینڈ نے اُس کے ساتھ ایک آخری فیصلہ کرنے کا ارادہ کرلیا۔ چنانچہ انتخابات ہوئے۔ جس میں ڈیگرل کو بری طرح شکست ہوئی۔ لیکن ڈیگرل نے ہمت نہ ہاری۔ اور وینزی لینڈ پر یہ الزام لگایا کہ وہ اپنی وزارت کے ایام میں نیشنل بنک سے ۲۳۰۰ پونڈ سالانہ حاصل کرتا رہا ہے۔ پارلیمنٹ میں عدم اعتماد کی تحریک پیش ہوئی۔ لیکن ڈیگرل کو صرف ۴۳ ووٹ ملے، اور وینزی لینڈ کو ۱۳۴۔

اگرچہ وینزی لینڈ کو بھاری اعتماد حاصل ہوا۔ لیکن اُس نے ایسے ذمہ دار عہدہ پر قائم رہنا مناسب نہ سمجھا۔ چنانچہ اُس نے اپنا استعفیٰ داخل کردیا۔

استعفے کے بعد بلجیم کے بادشاہ لیوپولڈ نے وین ڈر ویلڈ کو دعوت دی کہ وہ وزارت مرتب کرے۔ لیکن اُس نے انکار کردیا۔ پھر ہینزی ڈی مان کو جو ایک اشتراکی ہے اور گزشتہ وزارت میں وزیر مالیات رہ چکا ہے، یہ عہدہ دیا گیا۔ لیکن لیبروں نے اُس کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کردیا جس کی وجہ سے اُس کی وزارت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ بعدازاں یہ کام ہیولبرٹ پائرلاٹ وزیر زراعت کے سپرد کیا گیا۔ لیکن وہ بھی ناکام رہا۔ لہٰذا تجویز کی گئی کہ ایک مشترکہ وزارت قائم ہو لیکن یہ بھی نہ ہوسکا۔ بعدازاں مسٹر سپاک کو جو برسلز کانفرنس کا صدر تھا وزیرِاعظم بنایا گیا لیکن اُسے بھی کامیابی نہ ہوئی۔

اس کے بعد شاہ لیوپولڈ نے سوچا کہ بہتر ہوگا اگر چند دن تک اس مسئلہ کو نہ چھیڑا جائے تاکہ لوگ اطمینان سے اس پر غور کرسکیں۔ چنانچہ وہ پانچ روز کے لئے انگلستان چلا گیا۔ وہاں سے واپس آکر اُس نے سابق لبرل وزیر مسٹر پال جانسن کو ترتیب وزارت کا کام سپرد کیا۔ لیکن وہ بھی اپنی چند دن کی کوشش کے بعد ہار تھک کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ اشتراکیوں نے اُس کی مخالفت کی۔

ان حالات سے ظاہر ہے کہ بلجیم میں خانہ جنگی ہو رہی ہے۔ وینزیلینڈ

ایک ہر دلعزیز آدمی تھا۔ لیکن وہ اپنے وقار کی خاطر مستعفی ہو چکا ہے۔

ڈیگرل کا خیال ہے کہ وہ خود وزیر اعظم بنے گا۔ کیونکہ غالباً وہ جرمنی کی شہ پر ناچ رہا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کیا اشتراکی فرانس کے "فرنٹ پاپولر" کی امداد حاصل نہ کر سکیں گے؟

اسٹیلن کی ٹراٹسکی دشمنی

۳۷ء میں ہم ہر روز اخباروں میں پڑھتے رہے ہیں کہ روس میں آج اتنے آدمیوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا، اور آج اتنے آدمی پھانسی کے تختے پر لٹکا دئے گئے۔

بات دراصل یوں ہے کہ روس کا موجودہ ڈکٹیٹر جوزف اسٹیلن لینن کے دست راست ٹراٹسکی کے سخت خلاف ہو چکا ہے۔ اور ملک میں جو کوئی بھی اس کا حامی نظر آتا ہے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے،

کہتے ہیں مرنے سے پہلے لینن نے اپنی بیوی کروپسکایا سے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ میری وفات کے بعد اسٹیلن کو روس کا ڈکٹیٹر نہ بننے دینا۔ اسٹیلن اس وقت کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری تھا، جب اسے اس بات کا علم ہوا تو اس نے کروپسکایا کو کسی طرح ورغلا کر تمام کاغذات چھین لئے۔ اور لینن کی وفات کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس کے حامیوں کو چن چن کر اپنے ملک سے باہر نکالنا شروع کر دیا۔ ٹراٹسکی اس کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ علاوہ ذاتی عناد کے ان کے درمیان اصولی اختلاف بھی تھا۔ چنانچہ جب اسٹیلن برسر اقتدار آیا تو اس نے ٹراٹسکی کو نہ صرف غدار قرار دیا بلکہ جلا وطن بھی کر دیا۔ اس کے تمام اصولوں کو خلاف قانون قرار دے دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ٹراٹسکی کے حامی بھی روس میں زندہ نہیں رہ سکتے۔

ٹراٹسکی کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ روس کا انقلاب زیادہ تر اسی شخص کا مرہونِ منت ہے۔ چنانچہ اس کے حامی بھی کم نہ تھے۔ لیکن اسٹیلن نے ان کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر باہر نکال دیا اور فوراً تختہ دار پر چڑھا دیا۔

اسٹیلن اور ٹراٹسکی کے درمیان اصولی اختلاف یہ ہے کہ یہ چاہتا ہے کہ انقلاب عالمگیر ہو اور تمام ممالک بیک وقت اشتمالیت پسند بنا دئے جائیں۔ لیکن وہ پہلے روس کو کمیونزم کا مکمل نمونہ بنانا چاہتا ہے اور اس مقصد کے وہ تعمیری پروگرام کا حامی ہے۔ چنانچہ اس نے پانچ سالہ اقتصادی پروگرام اسی غرض کے بنائے ہیں۔

روس میں "موجودہ دور دہشت" کے خلاف عام بے چینی پھیل رہی ہے اور لوگ آمریت سے اکتا گئے ہیں۔ ان کا مطالبہ از سر نو شہنشاہیت قائم کرنے کا ہے۔ اور کوئی بعید نہیں کہ کسی وقت موجودہ حکومت کو عامۃ الناس کے اسی مطالبہ کے سامنے جھکنا ہی پڑے۔

آئرلینڈ کا نیا دستور

آئرلینڈ مدت سے اپنی آزادی کے لئے کوشاں ہے۔ بدیں وجہ وہاں کے واقعات ہندوستان کے لئے علی الخصوص وجۂ دلچسپی ہیں۔

جولائی ۳۷ء میں آئرلینڈ کے عام انتخابات ہوئے۔ ڈی ولیرا اور ان کی گذشتہ وزارت کے اکثر اراکین پھر منتخب ہو گئے۔ لیکن افسوس یہ رہا کہ ڈی ولیرا کی سیاسی جماعت "فیانا فیل" کو اتنی اکثریت حاصل نہ ہو سکی کہ وہ بغیر کسی دوسری جماعت کی امداد کے حکومت کا کاروبار چلا سکے۔

کل ۱۳۸ نشستیں تھیں، جن میں سے ۶۹ ڈی ولیرا کی پارٹی کو ملیں، اور باقی ۶۹ دیگر پارٹیوں کو۔ ڈی ولیرا کو اپنی وزارت قائم کرنے کے لئے کسی دوسری جماعت کے نمائندے کو ساتھ ملانا ضروری تھا۔ اور ایسی جماعت حسب معمول مزدور پارٹی ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن حسرت یہ ہی کہ پارٹی کو سیاسیات سے قطعاً کوئی شغف نہیں ہے، بدیں وجہ شاید ڈی ولیرا کی پارٹی زیادہ دیر تک برسر اقتدار نہ رہ سکے۔ اور دوبارہ چناؤ لڑنا پڑے۔

عام انتخابات کے ساتھ ساتھ آئرلینڈ میں نئے دستور اساسی پر قوم کی رائے حاصل کی گئی تھی۔ اور قوم نے بڑی بھاری اکثریت کے ساتھ اسے منظور کیا۔

اس دستور کا سب سے بڑا خاصہ یہ ہے کہ اس میں بادشاہ یا سلطنت برطانیہ کا نام تک نہیں لیا گیا۔ اس دستور کی اہم دفعات کا خلاصہ یہ ہے۔

ملک کا نام EIVE ہوگا۔ ریاست کا حاکم اعلیٰ "صدر" کہلائیگا۔

اُسے قوم براہِ راست سات برس کے لئے منتخب کیا کرے گی۔ یہ صدر ڈیل DEIL یعنی دارالمندوبین کے اجلاس طلب کرے گا۔ اُسے برخواست کرسکے گا۔ قوانین پر دستخط کرنے، سزاؤں کا معاف یا کم کرنا نیشنل آرمی کی اعلیٰ کمان اپنے ہات میں رکھنا وغیرہ بھی اُس کے فرائض ہوں گے۔

ڈیل کا انتخاب متناسب نمائندگی کے اصول پر براہِ راست ہوگا۔ ہر عاقل بالغ کو حقِ رائے دہندگی حاصل ہوگا۔ سینٹ (یا ایوانِ اعلیٰ کے ساٹھ رکن ہوں گے وغیرہ ذالک۔

ہندوستان میں آئینِ جدید کا تجزیہ

۱۹۳۷ء میں غیر ممالک میں اور بھی بہت کچھ ہوا۔ لیکن چونکہ وہ بین الاقوامی اہمیت یا عام دلچسپی کا نہیں ہے، اس لئے ہم اُسے چھوڑتے ہیں اور اپنے دیس کی طرف آتے ہیں۔

اپریل ۱۹۳۷ء سے ہندوستان میں نیا دستورِ اساسی نافذ کردیا گیا۔ چونکہ انتخابات میں کانگریسی کثیر تعداد میں کامیاب ہوکر آئے تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوا کہ آیا اُنھیں وزارتیں قبول کرنا چاہئیں یا نہیں۔

اشتراکیت پسندوں کا خیال تھا کہ عہدے قبول کرنے سے ہم امپیریلِ مشنیری کے کل پرزے بن جائیں گے۔ اور اسی طرح پر گورنمنٹ سے ہماری جنگ کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔

دوسری طرف اعتدال پسند یہ کہتے تھے کہ بالکل نہ ہونے سے کچھ تو بہتر ہے۔ ہمیں اپنے دیس کی خدمت کا جس قدر بھی موقع مل سکے اُس سے فائدہ اُٹھانا چاہئے۔ نیز اگر ہم عہدے قبول کرلیں گے تو عوام کو کانگریس کی طرف زیادہ مائل کرسکیں گے۔ اور آئندہ ہمیں آئینِ جدید کے شعبۂ فیڈریشن کو مسترد کرنے میں آسانی رہے گی۔

بہرحال اس جھگڑے کے تصفیہ کے لئے کانگریس کا ایک خاص اجلاس بمقام دہلی منعقد ہوا۔ اور بہت کچھ لے دے کے بعد مہاتما گاندھی کا یہ اصول منظور ہوا کہ عہدے صرف اُسی صورت میں قبول کئے جائیں۔ اگر گورنر کانگریسی وزرار کے لائحۂ عمل میں "عدمِ مداخلت" کا یقین دلا دیں۔

گورنروں نے ایسا کرنے سے انکار کردیا۔ لیکن آخر وائسرائے ہند نے کچھ گول مول سی تقریر کی۔ اور کچھ مہاتما گاندھی جھکے۔ اور آخرکار عہدے قبول کر لئے گئے۔

جدید دستورِ اساسی کے پہلے تین ماہ میں چونکہ کانگریسیوں نے عہدے قبول نہ کئے تھے۔ اس لئے رجعت پسندوں کی عارضی وزارتیں قائم کی گئیں۔ جنھوں نے کانگریسی پروگرام کی نقلیں اُتارنا چاہیں۔ لیکن "قومیت پسندی" کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب میں اُن کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اور جب کانگریسیوں نے قبولِ وزارت کا فیصلہ کرلیا تو اُنھیں مستعفی ہونا پڑا۔

پہلے کانگریسی منسٹری صرف چھ صوبجات میں بن سکی۔ لیکن بالآخر صوبہ سرحد میں بھی قائم ہوگئی۔ گویا ۱۹۳۷ء میں کانگریس سات صوبجات میں برسرِ اقتدار رہی۔

کانگریسی وزارتوں کے سامنے بہت سا کام پڑا ہے۔ جس کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے میں ہی اُن کی کامیابی یا ناکامی کا راز مضمر ہے۔ مثلاً بیکاری کو دُور کرنا۔ تعلیم پھیلانا۔ شہری حقوق کی حفاظت۔ قیدیوں اور نظربندوں کی رہائی۔ رعایا اور راعی کے درمیان بہتر تعلقات۔ گاؤں اور شہر کے درمیان بہتر حمل و رسل کے ذرائع۔ زمینداروں اور کسانوں کا بوجھ ہلکا کرنا۔ دیہات سدھار۔ ترکِ مسکرات۔ اور صنعتی، تجارتی و زرعی ترقی کے وسائل سوچنا، وغیرہ

ظاہر ہے کہ ان سب کاموں کے لئے کثیر مقدار میں روپیہ درکار ہے۔ لیکن زرگری اور محاصل وغیرہ کے شعبہ جات، مرکزی گورنمنٹ کے ہات میں ہیں۔ اسی طرح فوج اور بڑے بڑے افسروں کی تنخواہوں میں کاٹ کرکے جو بچت ہوسکتی تھی وہ بھی کانگریسی وزیروں کے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر وہ قرضہ اُٹھائیں تو اُس کے لئے بھی اوّل تو واپسی کا طریق مدنظر رکھنا ہوگا اور دوسرے اس باب میں بھی گورنر اور گورنر جنرل کی خوشنودی شرط ہے۔

اس بیکسی اور بےبسی کے باوجود کانگریسی وزرار نے بہت کچھ کیا ہے اور اُس کی قدر نہ کرنا محض تعصب داری ہے۔ مثلاً کانگریسی صوبجات میں سیاسی قیدیوں اور نظربندوں کو رہا کردیا گیا ہے۔ اخباروں اور تقریروں پر سے پابندیاں اُٹھالی گئی ہیں۔ ابتدائی تعلیم اکثر جگہ لازمی کردی گئی ہے۔ ترکِ منشیات کے قوانین پاس ہو رہے ہیں۔ آنریری مجسٹریٹوں

کے عہدے اُڑا دیئے گئے ہیں۔ وزراء اور اراکین اسمبلی کی تنخواہوں اور معاوضوں میں گرانقدر کمی واقع کی گئی ہے۔ اور اُن کا شعار سادگی اور خوش اخلاقی قرار پایا ہے، مزید برآں پولیس کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ پبلک کے ساتھ مخدومانہ کی بجائے خادمانہ سلوک کر دیں۔ نیز صنعتی، زراعتی اور بیکاری کو دور کرنے کا پروگرام زیر عمل لایا جا رہا ہے جس کو پنپنے کے لئے ظاہر ہے کہ ابھی ایک عرصہ درکار ہوگا۔

الغرض کانگرسی صوبجات میں کافی کچھ ہو چکا ہے اور بہت کچھ کے لئے تجاویز زیر غور ہیں۔ اُن کی حالت کم ازکم پنجاب، بنگال اور سندھ ایسے رجعت پسند صوبوں سے بہتر ہے۔ جہاں ابھی وزارتوں کا نشۂ اقتدار غالب ہے کہ وزراء ملک اور عامۃ الناس کی طرف توجہ نہیں کر سکے۔

آئین جدید کے نفاذ کے بعد ایک اور ضروری مسئلہ جو عوام کے سامنے لایا گیا ہے یہ ہے کہ آیا مسلمانوں کو کانگرس کے ساتھ اتحادِ عمل کرنا چاہیئے یا مسلم لیگ کے ساتھ۔

یہ تو ایک "رائے" کا سوال ہے۔ اس لئے اس مضمون میں اس پر بحث نہیں ہو سکتی۔ بہر حال اسلامیانِ ہند کے سامنے یہ مسئلہ بار بار رکھا جا رہا ہے۔ اور ستم ظریفی یہ کہ "مولویوں" سے بھی اس کے متعلق فتوے پوچھے جا رہے ہیں کہ شاید بھول چوک کر کہیں کانگرس اور مسلم لیگ کا قرآن مجید اور احادیث و تفاسیر میں ذکر آیا ہو!

اکتوبر میں مسلم لیگ کا ایک سالانہ اجلاس مسٹر جناح کی زیر صدارت لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا جس میں ایک تو نصب العین تبدیل کیا گیا، اور دوسرے وفاق کی سخت مخالفت کی گئی۔

دونوں عندیئے اپنی ذات میں نہایت خوب تھے، لیکن کانگرس میں شمولیت کے راستے میں کیا چیز مانع ہے، اس کا جواب اربابِ مسلم لیگ نے سوائے اظہارِ ذاتی پرخاش اور عناد کے تا حال کچھ نہیں دیا۔ زیادہ سے زیادہ "مسلمانوں کے حقوق" کے تحفظ اور دفاع کا خیال ہے۔ لیکن یہ بات ابھی قابلِ تصفیہ ہے کہ کانگرس کی اکثریت اگر بالفرض محال "اسلامی حقوق" پر چھاپہ مار بھی دے تو مسلم لیگ علیحدہ رہ کر اُنھیں محفوظ کیسے رکھ سکیگی؟

مسلمانوں کے رہبر

وہ آتے ہیں مسلمانوں کے رہبر
جنوں پروردۂ علم فرنگی
اُسی منزل پہ یہ پیدا ہوئے ہیں
امارت جن کی ہے رایاتِ حق ہے
سمجھئے معنئ توحید اِن سے
ذرا کہوائیے حق بات اِن سے
کبھی انگریز کی خدمت میں عرضی
نہ نکلیں عمر بھر کوٹھی سے اپنی
یہی ہیں رہبرانِ قومِ حیدرؓ

نہ طاقت ہے نہ ہمت ہے نہ ایماں
سیاست زادۂ سرمایہ داراں
جہاں ٹکرائے ہیں انجیل و قرآں
سیاست جن کی ہے آیاتِ فرقاں
ذرا پڑھوائیے دو حرف قرآں
کریں گے تازہ یہ آئینِ سلماںؓ!
کبھی ہندو سے ہیں دست و گریباں
جو دیکھیں خواب میں بھی تیغ عریاں
یہی ہیں پیروِ فاروقِؓ ذیشاں

یہی ہیں گر مسلمانوں کے رہبر
ہے کافر جو رہے اب بھی مسلماں

میکش اکبر آبادی

گاندھی ازم اور سوشیلزم

پنڈت جواہر لال نہرو

گاندھی جی ایک عجیب مجموعۂ اضداد ہیں، اور میرا خیال ہے کہ سب بڑی شخصیتیں کسی حد تک ایسی ہی ہوتی ہیں، سالہا سال سے میں اس الجھن میں ہوں کہ آخر اس تمام محبت اور تعلق کے باوجود جو اُنھیں غریبوں کے ساتھ ہے وہ کیوں ایسے نظام کی حمایت کرتے ہیں جو خود ہی لوگوں کو مفلس بناتا ہے اور پھر اُنھیں کچلتا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ عدم تشدد کی اس قدر جوش و خروش سے تلقین کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ ایک ایسے سیاسی اور معاشری نظام کے حامی ہیں جس کی بنیاد جبر و تشدد پر ہے۔ لیکن شاید یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ اس نظام کے حامی ہیں۔ اصل میں وہ ایک قسم کے نراجی فلسفے کے قائل ہیں، لیکن چونکہ نراجی ریاست کا قیام ابھی بہت دُور ہے اور اس کا آسانی سے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے وہ چار و ناچار موجودہ نظام کو قبول کرتے ہیں۔ میرے خیال میں سماجی نظام کو تشدد کے ذریعے سے بدلنے پر اُنھیں جو اعتراض ہے وہ محض وسائل تک محدود نہیں ہے۔ اس لئے کہ وسائل سے قطع نظر کرکے اس نظام کو بدلنے کا ایک ایسا نصب العین مقرر کیا جا سکتا ہے جو مستقبل قریب میں حاصل ہو سکے۔

کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو اشتراکی کہتے ہیں۔ لیکن وہ اس لفظ کو ایک خاص معنی میں استعمال کرتے ہیں جو اُنھیں کے ذہن میں ہیں، اور اُن کی اشتراکیت کو سوسائٹی کے اس معاشی نظام سے کوئی تعلق نہیں، جو بالعموم اشتراکیت کے نام سے مشہور ہے، اُن کی تقلید میں بہت سے ممتاز کانگریسیوں نے بھی اس لفظ کا استعمال شروع کر دیا ہے، اور اس سے اُن کی مُراد ایک قسم کی انسانی ہمدردی ہے سیاسی اصطلاحوں کا یہ مبہم استعمال انھیں حضرات کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ بہت بڑے بڑے آدمی اُن کے سامنے برطانیہ کی نیشنل گورنمنٹ[1] کے وزیر اعظم کی مثال موجود ہے، میں جانتا ہوں گاندھی جی اس موضوع سے ناواقف نہیں ہیں۔ اُنھوں نے معاشیات، اشتراکیت، بلکہ مارکس کے فلسفے پر بھی متعدد کتابیں پڑھی ہیں، اور اس پر دوسروں سے بحث اور تبادلۂ خیال کر چکے ہیں۔ لیکن میرا روز بروز یہ خیال ہوتا جاتا ہے کہ اہم معاملات میں عقل و دماغ بجائے خود ہماری کچھ زیادہ رہنمائی نہیں کر سکتے۔ ولیم جیمس نے لکھا ہے "اگر تمہارا دل نہ چاہے تو یقیناً تمہارا دماغ تمہیں کبھی قائل نہیں کر سکتا"۔ جذبات ہمارے تصورِ زندگی پر حاوی ہیں اور دماغ پر حکومت کرتے ہیں، ہماری گفتگو خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی یا معاشی، اصل میں جذبات اور وجدان پر مبنی ہوتی ہے، جیسا کہ

۱؎ اپنے ایک پیام میں، جو قدامت پسند اور اتحادی پارٹی کی متحدہ انجمن کو جس کا جلسہ جنوری [illegible] میں اڈنبرگ میں ہوا بھیجا گیا تھا۔ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ فرماتے ہیں "زمانے کی مشکلات ہر قوم کو متحد ہونے اور ایک مرکز پر جمع ہونے پر مجبور کر رہی ہیں۔ یہی حقیقی اشتراکیت ہے۔ یہی حقیقی قومیت بھی ہے۔ بلکہ یہی حقیقی انفرادیت بھی ہے۔"

شوپنہار نے کہا ہے "انسان جو ارادہ کرے وہ کرسکتا ہے ۔ مگر ارادہ اُس کے اختیار میں نہیں ":

جنوبی افریقہ کے ابتدائی دَور میں گاندھی جی کے خیالات میں ایک عظیم الشان تبدیلی واقع ہوئی جس نے اُنھیں بیحد متاثر کیا اور اُن کا سارا تصورِ زندگی بدل دیا ۔ اس وقت سے اُن کے خیالات ایک خاص بنیاد پر قایم ہوگئے ہیں ، اور اُن کا دماغ نئی باتوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے ۔ جو لوگ نئی تجویزیں پیش کرتے ہیں اُن کی باتوں کو وہ بہت صبر وسکون اور توجہ سے سنتے ہیں ۔ لیکن اس دلچسپی کے باوجود جو وہ اخلاقاً ظاہر کرتے ہیں ، کہنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے جس کے دل کا دروازہ بند ہے ، وہ اس مضبوطی سے بعض خیالات پر قائم ہیں کہ ان کے علاوہ اور تمام باتیں اُن کو غیر اہم معلوم ہوتی ہیں ۔ دوسرے ضمنی معاملات پر زور دینے سے اس بڑے کام میں خلل پڑتا ہے جو اُن کے پیشِ نظر ہے ۔ جب انسان ایک بنیادی خیال پر رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے مسائل خود بخود ہم آہنگ ہو جائیں گے ، اگر مقدمات صحیح ہیں تو نتیجہ یقیناً صحیح ہوگا ۔

یہ میرے نزدیک اُن کے خیالات کی اصل بنیاد ہے ، وہ اشتراکیت خصوصاً مارکسیت کو شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ اس لئے کہ یہ تحریکیں تشدد سے وابستہ ہیں "طبقوں کی جنگ" کے الفاظ ہی سے اُن کو تشدد اور لڑائی کی بُو آتی ہے ۔ اور اس لئے اُنھیں اِس سے نفرت ہے ، وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ عام لوگوں کا معیارِ زندگی ایک مقررہ حد سے بڑھنے پائے ۔ اس لئے کہ بلند معیارِ زندگی اور فرصت سے اندیشہ ہے کہ لوگ عیش پرستی اور گناہ میں مبتلا ہو جائیں گے ۔ یہی کیا کم بُرا ہے کہ تھوڑے سے خوش حال لوگ عیش پرست بن گئے ہیں ۔ یہ اور بھی بُرا ہوگا ، کہ اُن کی تعداد میں اضافہ کیا جائے ۔ ۱۹۲۶ء میں اُنھوں نے ایک خط لکھا تھا جس سے اس قسم کے نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں ۔ یہ ایک خط کا جواب تھا جو کوئلے کی بڑی ہڑتال کے زمانے میں اُن کے پاس انگلستان سے خط آیا تھا ۔ لکھنے والے نے لکھا تھا کہ اس معاملے میں مزدوروں کو شکست ہوگی کیونکہ اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے ۔ اور اُنھیں چاہیئے کہ ضبطِ تولید کا طریقہ استعمال کرکے اپنی تعداد کو کم کریں ۔ گاندھی جی نے اپنے جواب کے سلسلے میں لکھا تھا کہ "آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر کانوں کے مالک حق پر نہ ہونے کے باوجود جیت جائیں تو اس کا سبب یہ نہیں ہوگا کہ مزدوروں کے حد سے زیادہ اولاد ہوتی ہے ۔ بلکہ یہ کہ مزدور کسی چیز میں بھی ضبطِ نفس سے کام نہیں لیتے ۔ اگر مزدوروں کے اولاد نہ ہوتی تو اُن کے لئے ترقی کا کوئی محرک نہ رہتا ۔ اور وہ مزدوری بڑھانے کے لئے کوئی ایسی دلیل نہ پیش کرسکتے جس کا ثبوت آسان ہو ۔ کیا اُن کے لئے شراب پینا ۔ جوا کھیلنا ۔ تمباکو پینا ضروری ہے ؟ یہ کوئی جواب نہیں کہ کانوں کے مالک بھی یہی سب حرکتیں کرتے ہیں ، اور پھر بھی غالب رہتے ہیں ۔ اگر مزدور سرمایہ داروں سے بہتر ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے تو اُنھیں دنیا کی ہمدردی چاہنے کا کیا حق ہے ! یہی کہ سرمایہ داروں کی تعداد میں اور اضافہ ہو ۔ اور سرمایہ داری کو اور قوت حاصل ہو جائے ! ہم سے کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کی حمایت کرو ، اس لئے کہ جب اس کا دور دورہ ہوگا تو دنیا کی حالت بہتر ہو جائے گی ۔ یہ نہ ہو کہ ہم اُنھیں برائیوں کو جو سرمایہ دار اور سرمایہ داری کی طرف منسوب کی جاتی ہیں بہت بڑے پیمانے پر پیدا کر دیں "[1]

جب میں اس کو پڑھ رہا تھا تو فاقہ کش انگریز کان کنوں ، اُن کی بیویوں اور بچوں کے اُترے ہوئے چہرے میری آنکھوں میں پھر گئے ۔ جن کو میں نے ۱۹۲۶ء کی گرمیوں میں بے بسی کی حالت میں ایک ایسے خوفناک نظام کا مقابلہ کرتے دیکھا تھا جو اُنھیں کچلے ڈالتا تھا ۔ گاندھی کے بیان کردہ واقعات بھی صحیح نہیں ہیں ۔ اس لئے کہ کان کن مزدوری میں اضافے کا مطالبہ نہیں کر رہے تھے ۔ بلکہ اس لئے لڑ رہے تھے کہ اُن کی مزدوری کم کر دی گئی تھی ۔ اور وہ کام کرنے سے ہٹا دئے گئے تھے ۔ بہر حال اس وقت ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں اور نہ اس سے غرض ہے کہ کان کن مزدور ضبطِ تولید کے طریقے استعمال کریں یا نہ کریں ۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ صنعتی جھگڑوں کو حل کرنے کے لئے یہ ایک غیر معمولی تجویز ہے ۔

میں نے گاندھی جی کے جواب سے یہ ٹکڑا اس لئے نقل کیا ہے کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ مزدوروں کے مسائل اور اُن کے معیارِ زندگی کو بڑھانے کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر کیا ہے ۔ یہ نقطۂ نظر اشتراکیت بلکہ سرمایہ داری

---

[1] ضبطِ نفس اور نفس پرستی مصنفہ ایم کے گاندھی سے یہ ٹکڑا نقل کیا گیا ہے ۔

کے نقطۂ نظر سے بھی کوسوں دور ہے۔ یہ اگر کہا جائے کہ سائنس اور صنعتی تنظیم آج ہر شخص کے کھانے پینے، رہنے سہنے کا معقول بندوبست کرسکتی ہے، اور اُن کے معیارِ زندگی کو بہت بلند کرسکتی ہے، بشرطیکہ مستقل حقوق رکھنے والے اس میں مداخلت نہ کریں، تو اُس سے اُنھیں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ لوگوں کے معیارِ زندگی کو ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کے قائل ہی نہیں۔ چنانچہ اشتراکیت سے جو امیدیں ہیں وہ اُن کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتیں۔ بلکہ اُن کے نزدیک سرمایہ داری پھر بھی ایک حد تک قابلِ برداشت ہے۔ اس لئے کہ وہ عیش پرستی کے گناہ کو ایک چھوٹے سے دائرے میں محدود رکھتی ہے۔ انھیں ان دونوں میں سے ایک بھی پسند نہیں۔ لیکن فی الحال وہ سرمایہ داری سے نبھا رہے ہیں، اس لئے کہ یہ اُتنی بُری نہیں۔ اور پھر یہ ایک امرِ واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ممکن ہے کہ میں یہ خیالات اُن کی طرف منسوب کرنے میں غلطی کرتا ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اُن کے ذہن کا عام رجحان یہی ہے۔ اور اُن کی تقریر و تحریر میں بھی جو اُلجھن اور پیچیدگی نظر آتی ہے اس کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ اُن کے خیال کی بنیاد ہی دوسری ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ لوگ روز افزوں آرام و آسائش اور فرصت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیں، بلکہ اُن کی تعلیم یہ ہے کہ ہم اپنی اخلاقی زندگی کو سدھارنے کی فکر کریں۔ بُری عادتوں کو ترک کریں، خواہشات کو کم کرتے رہیں۔ اور اس طریقے سے اپنی انفرادی اور روحانی اصلاح کریں۔ اور جو لوگ عوام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اُن کا کام یہ نہیں ہے کہ اُن کی مادّی زندگی کی سطح کو بلند کریں۔ بلکہ خود اُن کی سطح پر اُتر آئیں۔ اور مساوی حیثیت سے اُن کے ساتھ میل جول پیدا کریں۔ اگر ایسا کیا گیا تو لازمی طور پر عام لوگوں کی سطحِ زندگی کسی قدر بلند ہو جائے گی۔ یہی گاندھی جی کے نزدیک حقیقی جمہوریت ہے۔ اُس بیان میں جو اُنھوں نے، اردسمبر سنہ ۱۹۳۸ء کو شائع کیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ "بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میری مخالفت کرنا بے کار ہے۔ اس لئے کہ میرے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ میرے جیسے پیدائشی جمہوریت پسند کے لئے یہ انکشاف باعثِ شرم ہے، اگر وہ شخص جس نے اپنے آپ کو غریب سے غریب لوگوں میں کھپا دیا ہے، جس کی یہ آرزو ہے کہ اُنھیں کی سی زندگی بسر کرے اور اسی کے ساتھ پوری کوشش کرتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس کی سطح پر پہونچ جائے، جمہوریت پسندی کا دعویٰ کرسکتا ہے تو میں یہ دعویٰ کرتا ہوں":

اس استدلال سے غالباً موجودہ زمانے کا کوئی جمہوریت پسند یا سرمایہ دار یا اشتراکی اتفاق نہیں کرے گا۔ بجز اس کے کہ یہ بات معیوب اور نامناسب ہے کہ ہم عام لوگوں سے اپنا رشتہ بالکل منقطع کرلیں، اور اپنے تعیشات اور بلند تر معیارِ زندگی کی نمائش ان بے شمار آدمیوں کے سامنے کریں، جو ادنیٰ سے ادنیٰ ضرورت کی چیزوں کے بھی محتاج ہیں۔ البتہ ایک ایسا شخص جو قدیم مذہبی نقطۂ نظر رکھتا ہے شاید کسی حد تک اس سے متفق ہو اس لئے کہ یہ دونوں اپنے جذبات کے اعتبار سے ماضی سے وابستہ ہیں، اور ہر چیز کو ماضی کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اُنھیں اس کی زیادہ فکر ہے کہ کیا ہو چکا ہے، بہ نسبت اس کے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے، ان لوگوں میں جو نفسیاتی حیثیت سے ماضی سے وابستہ ہیں، اور اُن میں جو مستقبل پر نظر رکھتے ہیں زمین آسمان کا فرق ہے، قدیم زمانے میں عام لوگوں کی معاشی سطح کو بلند کرنے کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ غریبوں کا وجود لازمی تھا۔ مٹھی بھر دولت مند آدمی اُس زمانے میں سماج کے رُوحِ رواں تھے، اور اُن کا ہونا نظامِ دولت آفرینی کے لئے ضروری تھا۔ اس لئے اخلاقی معلموں، مصلحوں اور اہلِ دل نے اُن کے وجود کو جائز رکھا لیکن اسی کے ساتھ اُنھیں یہ تلقین کرتے رہے کہ اُن کے حاجتمند بھائیوں کا بھی اُن پر کچھ حق ہے، وہ غریبوں کے امانت دار ہیں، اُنھیں خیرات کرنا چاہئے چنانچہ خیرات کا شمار ان بڑی نیکیوں میں ہونے لگا جن کی مذہب نے تاکید کی ہے، گاندھی جی بھی ہمیشہ اس نظریئے پر زور دیتے ہیں کہ راجہ مہاراجہ بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار غریبوں کے امانتدار ہیں، اُن سے پہلے بہت سے مذہبی آدمی بھی کہتے آئے ہیں۔ پاپائے اعظم نے یہ اعلان کیا ہے "امیروں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ خدا کی طرف سے خدمتِ خلق پر مامور ہیں۔ اور اس کی دولت کے خازن اور قاسم ہیں اور خود حضرت مسیح نے غریبوں کی قسمت اُن کے سپرد کی ہے" ہندو دھرم اور اسلام کا عام عقیدہ بھی یہی ہے۔ یہ دونوں امیروں کو خیرات کی تاکید کرتے ہیں جس کی تعمیل میں یہ حضرات مندر، مسجد، دھرم شالے بنواتے ہیں، اپنی وافر دولت

میں سے تانبے کے پیسے اور چاندی کے روپے غریبوں کو خیرات کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے نیک اور دین دار ہیں۔

دنیائے قدیم کے مذہبی نقطۂ نظر کی ایک نمایاں مثال پاپائے اعظم لیوسیزدہم کا مشہور فرمان "ریرم نوارم" ہے، جو مئی ۱۸۹۱ء میں جاری کیا گیا تھا۔ وہ جدید صنعتی حالات کا استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں "غرض مصیبت سہنا اور تکلیف اُٹھانا نوعِ انسانی کی قسمت میں لکھا ہے، انسان چاہے جتنی کوشش کرے۔ کوئی طاقت اور کوئی تدبیر انسانی زندگی کو اس درد و الم سے نجات دلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جو اُسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے، جو لوگ اس کے خلاف دعویٰ کرتے ہیں اور مصیبت زدوں کو یہ اُمید دلاتے ہیں کہ اُنھیں رنج و الم سے نجات مل جائے گی، اور دائمی راحت و عشرت نصیب ہوگی۔ دھوکا دے رہے ہیں، اور سبز باغ دکھا رہے ہیں، اور اُن کے یہ جھوٹے وعدے اور زیادہ ابتری پیدا کر دیں گے۔ انسان کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ دنیا کو اُس کی اصلی حالت میں دیکھے، اور ان مصیبتوں کا علاج کہیں اور تلاش کرے۔"

آگے چل کر بتایا جاتا ہے کہ یہ کہیں اور کا اشارہ کدھر ہے۔ "اس دنیا کو نہ تو ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور نہ اُس کی صحیح قدر کر سکتے ہیں۔ جب تک اس زندگی کا لحاظ نہ رکھیں جو آنے والی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی۔ جس حقیقتِ عظمیٰ کا سبق خود فطرت ہمیں دیتی ہے وہی عیسائی مذہب کا عظیم الشان عقیدہ ہے جس پر مذہب کی بنیاد قائم ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہماری اصلی زندگی اُس وقت شروع ہوگی جب موجودہ زندگی ختم ہو جائے گی۔ خدا نے ہمیں اس دنیا کی آنی جانی چیزوں کے لئے نہیں پیدا کیا ہے بلکہ اُن آسمانی چیزوں کے لئے جو ہمیشہ رہنے والی ہیں، اُس نے اِس دنیا کو ہمارے لئے عارضی جلا وطنی کی جگہ بنایا ہے، نہ کہ ہمارا حقیقی وطن، روپیہ پیسہ اور دوسری چیزیں، جنھیں لوگ اچھا اور پسندیدہ سمجھتے ہیں، خواہ ہمارے پاس افراط سے ہوں یا بالکل نہ ہوں، جہاں تک ہماری ابدی راحت و مسرت کا تعلق ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں ......"

یہ مذہبی طرزِ خیال اُس قدیم زمانے سے وابستہ ہے جب موجودہ مصیبتوں سے نجات پانے کا صرف یہی ایک راستہ تھا کہ آنے والی زندگی کا سہارا ڈھونڈھا جائے۔ لیکن باوجود اس کے کہ حالات بدل گئے، اور انسان کی مادّی خوش حالی کی سطح اتنی بلند ہو گئی جو زمانۂ قدیم میں انسان کے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتی تھی، لیکن ماضی کے خیالات اب بھی ہم پر مسلّط ہیں، البتہ اب زیادہ زور چند مبہم روحانی قدروں پر دیا جاتا ہے۔ جن کے جانچنے کا کوئی پیمانہ نہیں۔ کیتھولک عیسائی ہمیشہ بارہویں اور تیرہویں صدی کے خیال میں مگن رہتے ہیں۔ (یہ وہی زمانہ ہے جسے لوگ عہدِ ظلمہ کہتے ہیں۔) اور اُسے عیسائیت کا عہدِ زرّیں سمجھتے ہیں۔ جب اولیا کا دور دورہ تھا۔ عیسائی فرمانروا صلیبی لڑائیاں لڑنے کو جایا کرتے تھے۔ اور گوتھک طرز کے بڑے بڑے گرجے تعمیر ہو رہے تھے۔ اُن کے خیال میں یہ زمانہ "سچی عیسائی جمہوریت کا تھا۔ جو پیشہ وروں کی انجمنوں کے ماتحت ترقی کے اس درجے پر پہونچ گئی تھی جس پر نہ صرف اس سے پہلے کبھی پہونچ سکی اور نہ اس کے بعد"۔ مسلمان بڑی حسرت سے ابتدائی عہدِ خلافت کی "اسلامی جمہوریت" اور اس دور کی حیرت انگیز فتوحات کو یاد کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندو بھی ویدوں کے عہد اور رامائن اور مہابھارت کے زمانے کی دُھن میں رہتے ہیں اور "رام راج" کا خواب دیکھا کرتے ہیں۔ مگر تاریخ ہمیں یہی بتلاتی ہے کہ اس عہدِ ماضی میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد انتہائی مصیبت کی حالت میں زندگی بسر کرتی تھی، اور اُسے پیٹ بھر کھانا اور زندگی کی ادنیٰ ترین ضروریات بھی میسر نہ تھیں۔ ممکن ہے کہ چھوٹے سے حکمراں طبقہ کو، فرصت اور فراغت حاصل ہو۔ لیکن جہاں تک زندگی کا لطف اُٹھانے سے اور لوگوں کا تعلق ہے یہ تصور کرنا دشوار ہے کہ وہ سوائے قوتِ لایموت کی جد و جہد میں لگے رہنے کے اور بھی کچھ کر سکتے تھے۔ اُس شخص کے لئے جو بھوکوں مر رہا ہو کسی قسم کی تمدنی اور روحانی ترقی ممکن نہیں۔ اُسے تو بس ایک ہی فکر ہوگی۔ کہ کسی طرح کھانے کو روٹی مل جائے۔

صنعتی دور اپنے ساتھ بہت سی بُرائیاں لایا ہے۔ جن پر فوراً ہماری نظر پڑتی ہے۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مجموعی طور پر دنیا میں خصوصاً ان حصوں میں جہاں صنعت کو سب سے زیادہ فروغ ہوا ہے اُس نے مادی خوش حالی کی ایک ایسی بنیاد قائم کر دی ہے، جس سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے لئے، تمدنی اور روحانی ترقی آسان ہو گئی ہے۔ ہندوستان اور دوسرے محکوم ملکوں میں ہمیں اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے اس لئے

کہیں صنعتی ترقی سے فائدے کی جگہ نقصان پہونچا ہے۔ ہمیں تو صنعتی نظام نے خوب لوٹا ہے، اور ہر لحاظ سے یعنی مادی اعتبار سے بھی۔ اور اس سے زیادہ تمدنی اور روحانی اعتبار سے ہماری حالت پہلے سے بھی بدتر کردی ہے۔ لیکن قصور صنعتی نظام کا نہیں بلکہ بدیسی حکومت کا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں نام نہاد مغربیت نے اِس وقت تو نظامِ جاگیرداری کو اور مستحکم کر دیا ہے، اور ہماری دشواریوں کو حل کرنے کے بجائے انھیں اور زیادہ شدید بنا دیا ہے۔

لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے اور اس سے متاثر ہو کر ہمیں آج کل کی دنیا کے دیکھنے اور سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیئے۔ موجودہ حالات میں امیروں کا وجود سماج کے نظامِ دولت آفرینی کے لئے ضروری اور مناسب نہیں رہا۔ امرا کا طبقہ بالکل بیکار ہے۔ اور اکثر اس کی وجہ سے رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح مذہبی پیشواؤں کا یہ پُرانا مشغلہ بھی اب بالکل بے معنی ہوگیا ہے کہ امیروں کو خیرات کی تلقین کی جائے۔ اور غریبوں کو قناعت کی، صبر و شکر کی، کفایت شعاری اور نیک چلنی کی۔ انسان کے وسائل اور ذرائع اس قدر وسیع ہو گئے ہیں کہ وہ دنیا کے مسائل سے اچھی طرح نبٹ سکتا ہے۔ امیروں میں سے بہت سے لوگ صریحی طور پر طفیلی بن گئے ہیں اور ایک طفیلی طبقے کا وجود نہ صرف ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے، بلکہ اس کی وجہ سے وسائلِ دولت ضائع ہوتے ہیں۔ یہ طبقہ اور وہ نظام جو اسے پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے، کام کو اور دولت آفرینی کو روکتا ہے۔ اور دو طرح سے بیکاری کو بڑھاتا ہے، یعنی ایک تو اُن لوگوں کی ہمت افزائی کرتا ہے جو اوروں کی محنت پر بسر کرتے ہیں، دوسرے بہت سے مزدوروں کو کام سے محروم رکھتا ہے۔ اور فاقہ کرنے پر مجبور کرتا ہے، خود گاندھی جی نے کچھ عرصہ گزرا لکھا تھا "ان لوگوں کے سامنے جو بھوکوں مرتے ہیں اور بے کار ہیں، خدا صرف ایک ہی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے، یعنی کام کی اور روٹی کی شکل میں۔ خدا نے انسان کو اس لئے پیدا کیا تھا کہ محنت کر کے روٹی کمائے اور یہ کہا تھا کہ جو لوگ بغیر محنت کے کھاتے ہیں وہ چور ہیں۔"

دنیائے جدید کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے لئے اُس وقت کے قدیم طریقوں اور اصولوں سے کام لینا جب ان مسائل ہی کا وجود نہ تھا اور ان کا ذکر دقیانوسی الفاظ میں کرنا محض اُلجھن پیدا کرتا ہے، اور اور اس سے کوئی فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا۔ خود ذاتی ملکیت کا تخیل جو بعض لوگوں کے نزدیک دنیا کے بنیادی تخیلات میں ہے، ہمیشہ تبدیل ہوتا رہا ہے، ایک زمانے میں غلام بھی املاک میں شامل تھے، اور یہی حال عورتوں اور بچوں کا تھا، اس کے علاوہ جاگیردار ہر دلہن کی شبِ عروسی کا، سڑکوں، مندروں، کشتیوں، پُلوں، مفادِ عامہ کی چیزوں کا، زمین اور ہوا کا مالک تھا۔ جا لوز آج بھی پالنے والوں کی ملک سمجھے جاتے ہیں۔ حالانکہ بعض ملکوں میں ملکیت کے حقوق قانوناً محدود کر دئے گئے ہیں، جنگ کے زمانے میں برابر حقوقِ ملکیت میں دست اندازی کی جاتی ہے۔ املاک روز بروز غیر مرئی صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ مثلاً کمپنی کے حصے، اعتبار وغیرہ، جیسے جیسے ملکیت کا تصور تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ حکومت کی مداخلت بڑھتی جاتی ہے، رائے عامہ برابر جائداد والوں کے لامحدود حقوق کو محدود کرنے کا مطالبہ کرتی رہتی ہے، اور قانون اس مطالبے کو پورا کرتا رہتا ہے۔ طرح طرح کے بڑے بڑے محصول لگائے جاتے ہیں، جنھیں ایک طرح کی ضبطی سمجھنا چاہیئے۔ اور اس طرح مفادِ عامہ کی خاطر حقوقِ ملکیت کم ہوتے جاتے ہیں۔ مفادِ عامہ کا خیال پبلک پالیسی کی بنیاد بنتا جاتا ہے۔ اور کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ مفادِ عامہ کے خلاف کوئی کام کرے۔ خواہ اُس کی غرض اپنے حقوقِ ملکیت کا تحفظ ہو، اور پُرانے زمانے میں تو اکثر لوگ حقوقِ ملکیت سے محروم بلکہ خود دوسروں کی ملکیت تھے۔ آج بھی یہ حقوق صرف تھوڑے لوگوں کو حاصل ہیں، ہم "مستقل حقوق" کا ذکر بہت سُنتے آئے ہیں۔ لیکن آج کل ایک نیا "مستقل حق" اور تسلیم کر لیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہر مرد اور ہر عورت کو یہ حق ہے کہ زندہ رہے، محنت کرے۔ اور اپنی محنت کا پھل پائے۔ ان نئے نظریوں کی رو سے املاک اور سرمائے معدوم نہیں ہو جاتے۔ بلکہ بہت سے لوگوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں، اور اُن کے چند اشخاص کے ہاتھ میں جمع ہو جانے سے اُن اشخاص کو دوسروں پر جو اقتدار حاصل ہو گیا تھا اُسے سماج اُن سے واپس لے لیتی ہے،

گاندھی جی کے پیشِ نظر افراد کی باطنی، اخلاقی اور روحانی اصلاح ہے۔ اور اس کے ذریعے سے وہ خارجی ماحول کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں، اُنکی تعلیم یہ ہے کہ لوگ بُری عادتوں اور لذّتوں کو ترک کریں۔ اور پاکباز بن جائیں۔ وہ اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ مجامعت اور شراب اور تمباکو کے استعمال سے پرہیز کیا جائے۔ ممکن ہے اس بارے میں اختلافِ رائے ہو کر

ان میں کون چیز زیادہ بری ہے اور کون کم۔ کیا اس میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے کہ انفرادی نقطۂ نظر سے بھی، اور اس سے زیادہ سماجی نقطۂ نظر سے ان ذاتی کمزوریوں سے بدرجہا بدتر، لالچ، خود غرضی، زرپرستی، افراد کا ذاتی نفع کے لئے جھگڑنا، طبقوں اور جماعتوں کی وحشیانہ کش مکش، ایک طبقے کا دوسرے کو بے دردی سے لوٹنا اور کچلنا، قوموں کی ہولناک لڑائیاں ہیں، ظاہر ہے کہ گاندھی جی ان تمام ذلت آفریں جھگڑوں سے اور ہر قسم کے تشدد سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن کیا یہ چیزیں آج کل کی زبردست سماج کی فطرت میں داخل نہیں ہیں جس کا قانون یہ ہے کہ زبردست کمزور کو ستائے، اور جس کا عمل اس پرانے مقولے پر ہے "جس میں طاقت ہو وہ چھین لے۔ اور جو رکھ سکے وہ رکھے" نفع کی خواہش آج کل لازمی طور پر لڑائی جھگڑا پیدا کرتی ہے۔ اور سارا نظام انسان کی غارتگرانہ جبلتوں کی سرپرستی کرتا ہے، اور اُسے اُن سے کام لینے کا پورا پورا موقع دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بعض پسندیدہ جذبات کو بھی اُبھارتا ہے، لیکن اس سے کہیں زیادہ انسان کے کمینے جذبات کو وہ تقویت دیتا ہے، کامیابی کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ دوسروں کو نیچے گرا کر اُن کی جگہ لے لی جائے، جب ہماری سماج ایسے ارادوں اور حوصلوں کی ہمت افزائی کرتی ہے، ہمارے بہترین آدمی اُن کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔ تو کیا گاندھی جی یہ اُمید کر سکتے ہیں کہ اس ماحول میں انسان کی اخلاقی تکمیل کا مقصد حاصل کرلیں گے؟ وہ لوگوں میں خدمت کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چند افراد کو متاثر کرنے میں اُنھیں ضرور کامیابی ہوگی۔ لیکن جب تک سماج ان لوگوں کو جو دوسروں کو لوٹ کر ترقی کرتے ہیں کامیابی کا نمونہ بنا کر پیش کرے گی۔ اور ذاتی نفع کی خواہش کو عمل کا محرک قرار دے گی۔ اُس وقت تک بہت بڑی اکثریت اسی راہ پر چلتی رہے گی۔

لیکن یہ مسئلہ محض اخلاق اور فلسفۂ اخلاق کا نہیں ہے۔ بلکہ آج کل کے عملی اور ضروری مسائل میں سے ہے، دنیا سخت مشکل میں گرفتار ہے، اور اس مشکل کو کسی نہ کسی طرح حل کرنا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ڈکنس کے مکابر کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں، کہ کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا اور نہ منفیانہ طرز اختیار کرنے سے کام چل سکتا ہے کہ سرمایہ داری، اشتراکیت، اور اشتمالیت وغیرہ کے خراب پہلوؤں کی نکتہ چینی کرتے رہیں۔ اور اس دھندلی سی امید کا سہارا لیں کہ کوئی بہترین درمیانی طریقہ خود بخود نکل آئے گا۔ جس میں ماضی اور حال کے سب طریقوں کی خوبیاں جمع ہوں گی۔ ضرورت اس کی ہے کہ مرض کی تشخیص کی جائے۔ علاج تجویز کیا جائے۔ اور اسے عمل میں لانے کی کوشش کی جائے۔ بالکل یقینی بات ہے کہ قومی اور بین الاقوامی حیثیت سے ہم موجودہ حالت پر قائم نہیں رہ سکتے۔ یا تو ہمیں پیچھے ہٹنا ہے یا آگے بڑھنا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو پیچھے ہٹنے کا تو اب کوئی سوال ہی نہیں ہے،

بلکہ گاندھی جی کی اکثر کارروائیوں سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہمیں اُس محدود قومی معیشت کی طرف واپس لے جانا چاہتے ہیں جس میں نہ صرف قوم اور قوموں سے بلکہ ہر گاؤں اور گاؤں سے معاشی حیثیت سے بے نیاز ہو۔ بس قدیم زمانے کی سماج میں ہر گاؤں ایک مستقل معاشی حیثیت رکھتا تھا، اپنا کھانا کپڑا اور دوسری ضرورت کی چیزیں خود ہی پیدا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں معیارِ زندگی بہت ہی پست ہوتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی یہ حالت صرف عارضی طور پر چاہتے ہیں۔ کیونکہ مستقل طور پر تو یہ چل ہی نہیں سکتی۔ بعض ملکوں کی بڑی بڑی آبادیوں کا اس صورت میں زندہ رہنا دشوار ہو جائے گا۔ اور وہ یہ ہرگز گوارا نہ کریں گی کہ عسرت اور فاقے کی زندگی کی طرف لوٹیں۔ ممکن ہے کہ ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں جہاں ہمارا موجودہ معیارِ زندگی بیحد پست ہے۔ دیہی صنعتوں کی ترقی سے عام لوگوں کی حالت کسی قدر بہتر ہو جائے۔ لیکن اور ملکوں کی طرح ہم بھی دنیا کے دوسرے ملکوں سے وابستہ ہیں اور میرے خیال میں اُن سے قطع تعلق کرنا بالکل ناممکن ہے۔ اس لئے ہمیں ان مسائل پر ساری دنیا کے نقطۂ نظر سے محدود قومی معیشت کا کوئی سوال ہی نہیں، اور میں تو ذاتی طور پر اُسے ہر پہلو سے ناپسند کرتا ہوں۔

پھر پھر کر ہم اسی چیز پر پہونچ جاتے ہیں جس کے سوا اس مسئلے کا اور کوئی حل نہیں۔ یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام۔ پہلے قومی دائرے کے اندر اور پھر ساری دنیا میں۔ جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفادِ عامہ کے لحاظ سے کی جائے۔ یہ انقلاب کس طریقے سے ہونا چاہئے۔ یہ ایک جداگانہ سوال ہے۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس چیز میں ایک پوری قوم بلکہ نوعِ انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے نہیں روکی جاسکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس تبدیلی کے مخالف

دنیا کا سب سے بڑا زمین کا کیڑہ جو دریائے یاس کی وادی میں پایا گیا ہے۔ اسکی لمبائی بارہ فٹ ہے۔

ہیں۔ اگر سیاسی یا سماجی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو اُن کو مٹا دینا چاہیئے۔ ان چیزوں کی خاطر ایسے مفید اور پسندیدہ مقصد کو قربان کرنا بہت بڑی غداری ہوگی۔ ممکن ہے کہ دنیا کے عام واقعات کسی حد تک اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے میں، یا اس کی رفتار کو تیز کرنے میں مدد دیں، لیکن جب تک ملک کے لوگوں کی بہت بڑی اکثریت راضی نہ ہو جائے یہ انقلاب مشکل ہی سے ہو سکے گا۔ اس لئے اُن لوگوں کو سمجھا کر اپنا ہم خیال بنانا ہے۔ ایک چھوٹی سی جماعت کی سازش اور تشدد سے کام نہیں چل سکتا۔ ظاہر ہے کہ ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے، کہ ان لوگوں کو بھی اپنا ہم خیال بنالیں۔ جو موجودہ نظام سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مگر یہ بہت بعید از قیاس ہے کہ ہم ان میں سے کچھ زیادہ لوگوں کو قائل کر سکیں گے،

کھادی کی تحریک، یعنی ہاتھ سے کاتنا اور بننا جس سے گاندھی جی کو خاص شوق ہے، ایک ایسی چیز ہے جو دولت آفرینی کے انفرادی طریقے کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اور ہمیں قبل صنعتی عہد کی طرف واپس لے جاتی ہے۔ اور ہمیں قبل صنعتی عہد کی طرف واپس لے جاتی ہے، آج کل کے کسی اہم مسئلہ کو ان طریقوں سے حل کرنا ممکن نہیں ہے، بلکہ ان سے ایک ایسی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے جو ترقی کی صحیح راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ پھر بھی میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ایک وقتی اور عارضی تدبیر کی حیثیت سے اس تحریک سے بہت فائدہ پہنچا ہے، آئندہ بھی اس وقت تک پہنچا رہیگا۔ جب تک خود حکومت زرعی اور صنعتی مسائل کا کوئی معقول حل نہ تلاش کرے گی، جو وسیع پیمانے پر سارے ملک میں جاری کیا جاسکے۔ ہندوستان میں اس وقت لاکھوں کروروں بے روزگار ہیں، جن کا کوئی ریکارڈ نہیں، اور اس سے بھی زیادہ کثرت سے وہ لوگ ہیں جو دیہاتی علاقوں میں سال کے ایک حصے میں بیکار رہتے ہیں، حکومت نے بے روزگاری کو دور کرنے یا بے روزگاروں کی مدد کرنے کی کوئی کوشش اب تک شروع نہیں کی ہے، اس لئے معاشی حیثیت سے کھادی کی تحریک نے ان لوگوں کی تھوڑی بہت مدد کی جو بالکل بے روزگار ہیں، یا جو کچھ عرصے بیکار رہا کرتے ہیں، چونکہ یہ ترقی خود اپنی کوشش سے ہوئی ہے، اس لئے ان لوگوں کی خودداری بڑھ گئی، اور ان میں خود اعتمادی کا احساس پیدا ہو گیا ہے، مگر اصل میں جو نمایاں تبدیلی ان لوگوں میں پیدا ہوئی ہے، وہ نفسیاتی تبدیلی ہے، کھادی نے کسی حد تک اس فصل کو دور کیا جو شہر اور دیہات میں پیدا ہو گیا تھا، اس نے اوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں کو کسانوں سے قریب تر کر دیا۔ اس لباس کا پہننے والوں اور دیکھنے والوں پر بہت گہرا نفسیاتی اثر پڑتا ہے، اوسط طبقے میں کھادی کے رواج سے سادگی آ گئی ہے، نمود و نمائش اور بدمذاقی کم ہو گئی ہے، اور عام لوگوں سے میل جول کا احساس پیدا ہو گیا ہے، اوسط طبقے کے لوگ اب نہ تو لباس کے معاملے میں امیروں کی نقالی کی کوشش کرتے ہیں، اور نہ سستی پوشاک پہننے میں ذلت اور شرم محسوس کرتے ہیں، بلکہ سچ پوچھئے تو یہ لوگ کھادی کے لباس کو خاصا باوقار سمجھتے ہیں، اور اُن لوگوں کے مقابلے میں جو اب بھی ریشم اور ساٹن پہن کر اتراتے ہیں، اپنی فوقیت کا احساس رکھتے ہیں۔ غریب سے غریب لوگوں میں بھی یہ خودداری اور وقار کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ کھادی پہننے والوں کے بڑے مجمعوں میں یہ پہچاننا مشکل ہو گیا ہے کہ کون غریب ہے اور کون امیر، اور اس سے برادری کے جذبے کو ترقی ہوئی۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ عام لوگوں تک پہونچنے میں کانگریس کو کھادی سے بڑی مدد ملی۔ اس کو لوگ قومی آزادی کی وردی سمجھنے لگے۔

ملوں کے مالکوں کے اس رجحان کو بھی کہ اپنے مال کی قیمت بڑھاتے چلے جائیں۔ کھادی ہی نے روکا ورنہ پہلے اُن کی روک تھام صرف بدیسی اور خصوصاً لنکاشائر کے مقابلے کی وجہ سے ہوا کرتی تھی۔ اور جب کبھی یہ مقابلہ بند ہوا مثلاً جنگ عظیم کے زمانے میں تو کپڑے کی قیمتیں ہندوستان بھر میں غیر معمولی طور پر بڑھ گئیں، اور ہندوستانی ملوں نے کروروں روپیہ کمایا۔ سودیشی کی تحریک اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک سے آگے چل کر ان ملوں کو بڑی مدد ملی، لیکن کھادی کی تحریک کا یہ اثر ہوا ہے کہ قیمتیں اب اتنی زیادہ نہیں بڑھ سکتیں۔ ان ملوں نے (اور جاپان نے بھی) کھادی کی ہر دلعزیزی سے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ اس قسم کا موٹا کپڑا تیار کیا کہ اس میں اور ہاتھ کے کتے اور ہاتھ کے بنے کپڑے میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ اگر اب کوئی غیر معمولی صورت پیدا ہو جائے، مثلاً جنگ چھڑ جائے، جس سے بدیسی کپڑے کی درآمد بند ہو جائے تو غالباً ہندوستان کے ملوں کے مالک خریداروں کو اتنا نہیں لوٹ سکیں گے جتنا کہ ۱۹۱۴ء سے کئی سال تک لوٹتے رہے، کھادی کی تحریک اس کو روکے گی۔ اور کھادی کی تنظیم میں اتنی گنجائش

ہے کہ تھوڑی سی مدت کے اندر بہت پھیل جائے۔

ان تمام فوائد کے باوجود جو اس وقت ہندوستان کو کھادی کی تحریک سے حاصل ہیں میرے خیال میں یہ محض عارضی چیز ہے۔ ممکن ہے کہ بعد میں بھی ایک ضمنی تحریک کی حیثیت سے باقی رہے، تاکہ اس مدت میں جو ایک اعلیٰ معاشی نظام کے اختیار کرنے میں لگ جائے گی، اس سے کام چلتا رہے، لیکن آئندہ ہماری اصل کوشش یہ ہوگی کہ زراعتی نظام کی ازسرِ نو تنظیم کی جائے۔ اور صنعت کو ترقی دی جائے، اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ آراضی کے نظام میں دفع الوقتی کے لئے چھوٹی موٹی تبدیلیاں کی جائیں، اور طرح طرح کے کمیشن مقرر ہوں، جن پر لاکھوں روپیہ صرف ہو اور وہ کچھ اوپری چیزوں کی اصلاح کر دیں۔ ہمارا نظامِ آراضی بیکھتے ہی دیکھتے بیٹھ رہا ہے اور موجودہ صورت میں دولت کی پیدائش اور تقسیم بڑے پیمانے پر معقول طریقے سے کام کرنے میں حائل ہے، جدید عہد کے حالات کے لحاظ سے بغیر اس بنیادی تبدیلی کے کام نہیں چل سکتا چھوٹی چھوٹی زمینیں اسامیوں کو بانٹنے کا طریقہ ختم کر دیا جائے۔ اور اس کی جگہ منظم طور پر امدادِ باہمی کے اصول کے مطابق اجتماعی کاشت شروع کی جائے تاکہ کم محنت سے زیادہ پیداوار ہو سکے۔ زراعت ہماری ساری آبادی کبھی نہیں کھپا سکتی۔ بڑے پیمانے پر کاشت کرنے سے (جیسا کہ گاندھی جی کو اندیشہ ہے) زراعت کا کام کرنے والوں کی تعداد کم ہو جائے گی، باقی لوگوں میں سے شاید چھوٹی گھریلو صنعتوں میں کھپ جائیں۔ مگر ان کی بہت بڑی تعداد کو بڑے پیمانے کی اشتراکی صنعتوں اور سماجی خدمت کے کاموں میں لگانا پڑے گا۔

یقیناً بعض علاقوں کو کھادی کی تحریک سے تھوڑی بہت مدد ملی ہے لیکن اسی کامیابی میں جو اس کو حاصل ہوئی ہے خطرے کا بھی عنصر موجود ہے، یعنی یہ تحریک ایک زوال پذیر نظامِ آراضی کو سہارا دے رہی ہے، اور اسی حد تک ایک بہتر نظام کے قیام میں تاخیر پیدا کر رہی ہے۔ اس کا اثر اتنا زیادہ نہیں کہ اس سے کوئی نمایاں فرق پیدا ہو۔ لیکن یہ رجحان اس میں بہرحال موجود ہے۔ کسانوں یا کاشتکار زمینداروں کو زمین کی پیداوار کا جو حصہ ملتا ہے، وہ اس کے لئے بھی کافی نہیں کہ جس پست ترین سطح پر وہ پہونچ گئے ہیں اُسی پر قائم رہ سکیں۔ اس لئے اُن کو اپنی قلیل آمدنی میں اضافے کی اور صورتیں تلاش کرنی پڑتی ہیں، ورنہ لگان یا مالگذاری کی ادائگی کے لئے اور قرض لینا پڑتا ہے، اگر انفرادی طور پر بعض کاشتکاروں کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے تو اس سے زمیندار یا حکومت کو اپنا مطالبہ وصول کرنے میں مدد ملتی ہے۔ جو شاید معمولی حالت میں نہ وصول ہو سکتا۔ اگر یہ اوپر کی آمدنی کچھ زیادہ ہو تو لگان اتنا ہی اور بڑھا دیا جاتا ہے۔ موجودہ نظام کے ماتحت کاشتکاروں کی زائد محنت اور کفایت شعاری کی کوشش سے اصل فائدہ زمین کے مالک ہی کو پہنچتا ہے، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ہنری جارج نے اپنی کتاب "ترقی اور غربت" میں اس مسئلے پر بھی بحث کی ہے اور بہت سی مثالیں دی ہیں۔ جو زیادہ تر آئرستان کی ہیں۔

دیہی صنعتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی جو کوشش گاندھی جی کر رہے ہیں وہ اصل میں کھادی کے پروگرام ہی کی توسیع ہے۔ اس سے فوری طور پر ضرور فائدہ ہوگا جس میں سے کچھ کم و بیش مستقل ہوگا۔ مگر زیادہ تر محض وقتی۔ اس سے دیہاتیوں کی موجودہ تکلیفوں میں کچھ کمی ہو جائے گی اور ہماری تہذیب کے بعض خوشنما نمونے، جو مٹ رہے تھے، محفوظ ہو جائیں گے۔ لیکن جہاں تک کہ اس کا مقصد کلوں کی اور صنعتی نظام کی مخالفت ہے۔ اس میں یہ تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ گاندھی جی نے حال میں "ہریجن" میں دیہی صنعتوں پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں "کلوں کو رواج دینا اُس وقت مفید ہوتا ہے جب کام بہت ہو، اور کرنے والے تھوڑے ہوں۔ لیکن جب ضرورت سے زیادہ آدمی کام کرنے کے لئے موجود ہوں، جیسا کہ ہندوستان میں ہے، تو یہ چیز مضر ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہیں ہے کہ لاکھوں کروروں آدمیوں کے لئے جو دیہات میں رہتے ہیں، فرصت کا وقت نکالا جائے، سوال یہ ہے کہ اُن کے خالی وقت کو جو سال میں چھ مہینے سے کم نہیں کس طرح کام میں لگایا جائے"۔ یہ اعتراض کچھ فرق کے ساتھ ان تمام ملکوں پر وارد ہوتا ہے جو بے روزگاری میں مبتلا ہیں۔ لیکن اصل میں وقت کام کی کمی کا نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ منافع حاصل کرنے کے موجودہ نظام کے ماتحت آجروں کو کام میں خاطر خواہ نفع نہیں ہوتا۔ کثرت سے ایسے کام موجود ہیں جو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ آؤ اور ہمیں کرو۔ مثلاً سڑکوں اور مکانوں کی تعمیر، آبپاشی کی اسکیم، حفظانِ صحت، طبی وسائل، صنعت و حرفت اور برقی قوت کی ترقی۔ سماجی اور تمدنی خدمات۔ تعلیم اور اُن بیسیوں ضروری اشیا

کی فراہمی، جس کی لوگوں کو سخت ضرورت ہے۔ ہمارے یہ کروڑوں آدمی آئندہ پچاس سال تک سخت محنت کرتے رہیں۔ تب بھی کام ختم نہ ہوگا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کام کی محرک نفع کی خواہش نہیں بلکہ سماجی ترقی کی خواہش ہو۔ اور سماج کی تنظیم مفادِ عامہ کو پیش نظر رکھ کر کی جائے۔ روس کی سوویٹ یونین میں اور جا ہے جو نقائص ہوں۔ لیکن وہاں بے روزگاری بالکل نہیں ہے، ہمارے یہاں لوگ کام نہ ہونے کی وجہ سے بے کار نہیں ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے کہ اُن کے لئے کام کرنے کی اور تمدنی اصلاح و ترقی کی کوئی سہولتیں فراہم نہیں کی جاتیں۔ اگر بچوں سے کام لینا بند کر دیا جائے ایک معقول عمر تک لازمی تعلیم کا بندوبست ہو جائے تو لڑکے مزدوروں اور بے روزگاروں کے زمرے سے خارج ہو جائیں گے۔ اور مزدوروں کی منڈی کئی کروڑ آدمیوں کے بوجھ سے ہلکی ہو جائے گی۔

گاندھی جی نے اس بات کی کوشش کسی قدر کامیابی کے ساتھ کی ہے کہ چرخے اور تکلی میں اصلاح اور ترمیم کی جائے اور اُن کی قوت پیداوار بڑھائی جائے، یہ بھی تو اوزار اور کل کو ترقی دینے کی کوشش ہے۔ اور اگر یہ ترقی اسی طرح جاری رہی (بہت ممکن ہے گھریلو صنعتوں میں بھی بجلی کی قوت سے کام لیا جانے لگے۔) تو منافع کی خواہش پھر نمودار ہو جائے۔ اور اس کی وجہ سے وہی چیز پیدا ہوگی جس کو ضرورت سے زیادہ پیداوار اور بے روزگاری کہتے ہیں۔ اگر دیہی صنعتوں میں جدید صنعتی طریقوں سے کام نہ لیا گیا تو وہ اُن ضروری مادی اور تمدنی اشیاء کو بھی تیار نہیں کر سکتیں، جو ہمیں اس وقت درکار ہیں۔ اور پھر وہ کلوں کے ساتھ مقابلہ کیوں کر کریں گی؟ کیا ہندوستان میں بڑی بڑی کلوں کے رواج کو روکنا مفید ہے۔ اور فرض کیجئے کہ مفید ہو تو کیا یہ ممکن بھی ہے؟ گاندھی جی نے بار بار یہ کہا ہے کہ وہ سرے سے کلوں کے مخالف نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے لئے ان کا استعمال موزوں نہیں۔ پھر میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا بنیادی صنعتیں مثلاً لوہے اور فولاد کی صنعت یا اس سے کم درجے کی صنعتیں جو پہلے سے موجود ہیں مٹائی جا سکتی ہیں؟ یہ بات صریحی طور پر ناممکن ہے، جب ہمارے یہاں ریلیں، پل، نقل و حمل کے وسائل وغیرہ موجود ہیں۔ تو یا تو ہم یہ چیزیں خود پیدا کریں یا دوسروں کے محتاج رہیں۔ اس کے علاوہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ملک کی حفاظت اور مدافعت کے وسائل ہمارے پاس ہوں تو ہمیں نہ صرف بنیادی صنعتوں کی بلکہ ایک نہایت ترقی یافتہ صنعتی نظام کی ضرورت ہے۔ آج کوئی ملک جو صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ نہیں ہے۔ نہ حقیقی معنوں میں آزاد ہے۔ اور نہ بیرونی حملے کی مدافعت کر سکتا ہے، اب مشکل یہ ہے کہ ایک بنیادی صنعت کی مدد اور تکمیل کے لئے دوسری بنیادی صنعتیں درکار ہیں، اور پھر کلیں بنانے کی صنعت ضروری ہو جاتی ہے۔ جب یہ بنیادی صنعتیں قائم ہو جائیں تو پھر لازمی طور پر دوسری صنعتیں بھی پھیل جاتی ہیں۔ غرض یہ سلسلہ کسی طرح روکا نہیں جا سکتا۔ اس لئے کہ نہ صرف ہماری مادی اور تمدنی ترقی بلکہ ہماری آزادی کا بھی اسی پر انحصار ہے، جوں جوں بڑے پیمانے کی صنعت پھیلتی جائے گی چھوٹی چھوٹی دیہاتی صنعتوں کو اس کا مقابلہ کرنا دشوار ہوتا جائے گا۔ اشتراکی نظام میں تو اُن کے لئے پھر بھی کچھ موقع ہے۔ مگر نظام سرمایہ داری میں اُن کی مطلق گنجائش نہیں۔ اشتراکی ریاست میں بھی وہ گھریلو صنعتوں کی حیثیت سے باقی رہ سکتی ہیں، جن میں وہ چیزیں تیار ہوتی ہیں جو بڑے پیمانے پر تیار نہ کی جا سکیں۔

کانگریس کے بعض لیڈر صنعت کی ترقی سے خوف زدہ ہیں، ان کا خیال ہے کہ صنعتی ممالک کی تمام موجودہ مشکلات اور پریشانیاں بڑے پیمانے پر مال تیار کرنے کی وجہ سے ہیں۔ لیکن یہ صورت حال کے متعلق ایک عجیب غلط فہمی[ف] ہے۔ اگر عام لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس میں کیا برائی ہے، کہ وہ کافی مقدار میں تیار کی جائے؟ کیا لوگ اس کو ترجیح دیں گے کہ خواہ اُن کی ضرورت پوری نہ ہو۔ لیکن بڑے پیمانے پر چیزیں تیار نہ کی جائیں؟ واقعہ یہ ہے کہ دولت آفرینی کے طریقے میں کوئی خرابی نہیں بلکہ تقسیم دولت کا موجودہ نظام بہت ناقص اور مہمل ہے، ایک اور مشکل جس کا دیہی صنعت کے حامیوں کو سامنا کرنا ہے یہ ہے کہ ہماری زراعت دنیا کی منڈی کی پابند ہے۔ کسان اس پر مجبور ہے کہ انہی چیزوں کی کاشت کرے جن کی بازار میں مانگ ہے، اور وہی قیمتیں

ف۔ ۲۰ جنوری ۳۸ء کو سردار ولبھ بھائی پٹیل نے احمد آباد میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "حقیقی اشتراکیت دیہاتی صنعتوں کی ترقی پر موقوف ہے۔ ہم اپنے ملک میں وہ ابتری پیدا کرنا نہیں چاہتے جو مغربی ملکوں میں بڑے پیمانے کی پیداوار کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے"

رکھے جو اور ملکوں میں ہیں قیمتیں گھٹتی بڑھتی ہیں۔ اور اس کا اپنا مقررہ لگان یا مالگذاری نقد کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے کسی نہ کسی طرح اس کو یہ روپیہ فراہم کرنا پڑتا ہے یا کم سے کم وہ اس کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ اس لئے وہ ایسی چیز بوتا ہے جو اس کے نزدیک زیادہ سے زیادہ قیمت میں فروخت ہوگی۔ وہ ان چیزوں کی کاشت نہیں کرسکتا جن کی اس کو خود ضرورت ہے۔ تاکہ وہ اور اُس کے بال بچے کم سے کم کھانے کے معاملے میں دوسرے کے محتاج نہ رہیں۔

حال میں اجناسِ خوردنی اور دوسری چیزوں کی زرعی قیمتیں یکبارگی گر جانے کی وجہ سے لاکھوں کسانوں کو خصوصاً صوبہ متحدہ اور بہار میں مجبوراً گنّے کی کاشت کرنی پڑی۔ باہر کی شکر پر محصول لگ جانے کی وجہ سے شکر کے کارخانے برساتی مینڈکوں کی طرح پیدا ہوگئے، اور گنّے کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ لیکن بہت جلد رسد طلب سے کہیں زیادہ ہوگئی، کارخانوں کے مالکوں نے بڑی بے رحمی سے کسانوں کو لوٹنا شروع کردیا، اور گنّے کی قیمت گر گئی۔

ان تمام امور اور ان کے علاوہ اور بہت سی باتوں کی وجہ سے نہ یہ مناسب ہے اور نہ ممکن ہے کہ ہمارے زرعی اور صنعتی مسائل محدود ملکی مصلحتوں کے مطابق حل کئے جاسکیں، اور یہی صورت ہماری قومی زندگی کے ہر پہلو کی ہے۔ ہم مبہم اور جذبات انگیز فقروں میں پناہ نہیں لے سکتے، بلکہ ہمیں زندگی کے واقعات کا سامنا کرنا ہے اور اِن سے اور اُن سے مطابقت پیدا کرنا ہے، تاکہ ہم تاریخ کی بساط کے شاطر بنیں۔ اس کے مہرے بن کر نہ رہ جائیں۔ پھر مجھے اُس مجموعۂ اضداد یعنی گاندھی جی کا خیال آجاتا ہے[1]، باوجود اپنی تیز فہمی اور مظلوموں کے جوشِ حمایت کے وہ کیوں اس زوال پذیر نظام کی حمایت کرتے ہیں۔ جو موجودہ مصیبت اور اسراف کا ذمہ دار ہے، یہ صحیح ہے کہ وہ اس مصیبت سے نجات پانے کی راہ ڈھونڈھ رہے ہیں۔ لیکن کیا ماضی کی راہ قطعاً مسدود نہیں ہوچکی ہے؟ ایک طرف تو وہ راہ کی تلاش میں مصروف ہیں اور دوسری طرف پُرانے نظام کے بچے کھچے آثار جو ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ مثلاً دیسی ریاستیں، بڑی بڑی زمینداریاں اور تعلقہ داریاں اور موجودہ سرمایہ داری کا نظام۔ ان سب پر اپنا دستِ شفقت رکھے ہوئے ہیں۔ کیا "امانتداری" کے اِس نظریئے کو عقل تسلیم کرسکتی ہے کہ ایک فرد کو غیر محدود دولت اور اختیارات دے دئے جائیں۔ اور پھر اسی سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اس کو مفادِ عامہ کے لئے استعمال کرے گا؟ کیا ہم میں سے بہتر سے بہتر لوگ بھی اخلاقی تکمیل کے اِس درجے پر پہونچ گئے ہیں کہ ان پر اس طریقے سے اعتماد کیا جاسکے؟ افلاطون کے فلسفی بادشاہ بھی مشکل ہی سے اس بوجھ کو اُٹھانے کے اہل ثابت ہوتے۔ اِس کے علاوہ کیا دوسروں کے لئے یہ اچھا ہوگا کہ یہ شفیق مافوق الانسان اِن پر مسلط کر دئے جائیں، لیکن دنیا میں نہ تو کوئی مافوق الانسان ہے نہ کوئی فلسفی بادشاہ، یہاں تو ناقص انسان بستے ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے ذاتی مفاد میں اور اُن کے خیالات کے پھیلنے میں ساری قوم کا بھلا ہے، اِس خیال کی بدولت خاندانی شرافت اور دولت کا اقتدار ہمیشہ کے لئے قائم ہو جاتا ہے، جس کے نتائج ہر طرح مہلک ثابت ہوتے ہیں۔

میں پھر یہ کہوں گا کہ اس وقت میں اس مسئلے پر غور نہیں کر رہا ہوں کہ سماجی نظام کی تبدیلی کس طرح عمل میں آئے، اور اُس کی راہ میں جو رُکاوٹیں ہیں وہ کیونکر دُور کی جائیں۔ جبر سے یا خیالات پر اثر ڈالنے کے ذریعے سے تشدد سے یا عدم تشدد سے، اس پہلو سے میں بعد میں بحث کروں گا۔ بہرحال تبدیلی کی ضرورت کو تسلیم کرلینا چاہئیے، اور اس کو صاف الفاظ میں بیان کردینا چاہئیے۔ جب تک سیاسی اور ذہنی رہنما اِس بات کو وضاحت کے ساتھ نہیں سمجھتے اور صاف صاف بیان

---

[1] سنہ ۱۹۳۱ء میں لندن کی گول میز کانفرنس کے جلسے میں گاندھی جی نے فرمایا تھا: "سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کانگریس اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے ہندوستان کے کروروں بے زبان نیم فاقہ کش غریبوں کی نمائندہ ہے، جو ملک کے طول و عرض میں سات لاکھ گاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چاہے وہ برطانوی ہند کے ہوں یا "ہندی ہند" کے۔ جن جن گروہوں کی اغراض کانگریس کے نزدیک قابلِ حمایت ہیں۔ ان میں سب پر مقدم اُن بے زبانوں کی فلاح ہے۔ اکثر یہ اغراض ایک دوسرے سے ٹکراتی نظر آتی ہیں۔ اگر سچ مچ ایسا ہو کہ مختلف گروہوں کی اغراض ٹکرا جائیں تو میں بے دھڑک کہتا ہوں کہ کانگریس ہر گروہ کی اغراض کو ان کروروں بے زبانوں کی فلاح پر قربان کردے گی"۔

نہیں کرتے۔ اس وقت تک وہ یہ توقع کیسے کرسکتے ہیں کہ کسی شخص کو اپنا ہم خیال بنا سکیں گے۔ یا لوگوں میں وہ ذہنیت پیدا کرسکیں گے جس کی ضرورت ہے، اس میں شک نہیں کہ واقعات خود سب سے بہتر معلّم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان واقعات کی صحیح اہمیت کو ظاہر کرنا ہے اور اُن سے مناسب کام لینا ہے تو اس کی ضرورت ہے کہ ہم خود اُنھیں سمجھیں اور دوسروں کو سمجھائیں۔

کبھی کبھی میرے احباب اور رفقا میری باتوں سے چڑ کر پوچھتے ہیں کہ کیا آپ نے کبھی کوئی کریم النفس رئیس، مخیّر زمیندار، نیک نیت اور بامروت سرمایہ دار اب تک نہیں دیکھا؟ بیشک میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں، بلکہ میں خود اُس طبقے سے ہوں جو زمینداروں اور دولتمندوں سے میل جول رکھتا ہے۔ میں خود ایک نمونے کا "بورژوا"[۱] ہوں۔ اسی ماحول میں میری تربیت ہوئی، اور اسی کے خیالات نے ابتدا میں مجھے متاثر کیا۔ بعض اشتمالیوں نے مجھے "پیتی بورژوا"[۲] کہا تھا، اور بالکل ٹھیک کہا تھا، غالباً اب وہ مجھے "اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والا بورژوا" کہیں گے۔ لیکن یہاں اس سے کچھ بحث نہیں کہ میں کیا ہوں۔ یہ بالکل مہمل بات ہے کہ قومی، بین الاقوامی، معاشی اور سماجی مسائل پر غور کرتے وقت افراد کی ذاتی حیثیت کو اہمیت دی جائے، وہی احباب جو مجھ پر اعتراض کرتے ہیں برابر یہ دعویٰ کرتے رہتے ہیں کہ ہمارا جھگڑا گناہ سے ہے نہ کہ گنہگار سے، میں اتنا بڑا دعویٰ نہیں کرسکتا، میں تو یہ کہتا ہوں کہ میرا جھگڑا ایک نظام سے ہے نہ کہ افراد سے۔ مگر ہر نظام بڑی حد تک افراد اور جماعتوں سے وابستہ ہوتا ہے، اور جو شخص نظام کو بدلنا چاہتا ہے اُسے اُن افراد اور جماعتوں سے لڑنا ہے یا اُنھیں ہم خیال بنانا ہے، اگر کوئی نظام اب ہمارے لئے مفید نہیں رہا اور ترقی کی راہ میں حایل ہے تو وہ سٹ کر رہے گا۔ اور جو طبقے اور جماعتیں اس سے وابستہ ہیں اُن کو بھی اپنی کایا پلٹ کرنی پڑے گی۔ اس عملِ تغیر میں جہاں تک ہوسکے تکلیف کے عنصر کو کم کرنا چاہئیے۔ لیکن بدقسمتی سے صورت ہی ایسی ہے کہ لوگوں کو تکلیف پہنچانا اور معاملات کا درہم برہم ہونا ناگزیر ہے۔ بہر حال یہ تو ہم کر نہیں سکتے کہ اتنی بڑی بُرائی کو اس ڈر سے برداشت کرتے رہیں کہ کہیں چھوٹی چھوٹی بُرائیاں نہ اُٹھ کھڑی ہوں، یہ برائیاں تو پیدا ہوتی ہی ہیں اور اُن کا روکنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔

---

[۱] اوسط طبقے کا شہری

[۲] نیچے اوسط طبقے کا شہری

دُعا

جنوں فتنہ ساماں و بیباک دے — الٰہی گریبانِ صد چاک دے

یہ دشت و جبل تنگ و تاریک ہیں — اُنھیں وسعتِ ہفت افلاک دے

مجھے ماہ و انجم کا ہمراز کر — نظامِ محبت کا ادراک دے

جو سو پردوں میں حُسن کو دیکھ لے — نظر پاک دے اور بیباک دے

ہر اک صید کو یہ سعادت کہاں

جسے چاہے وہ عیشِ فتراک دے

مجید ملک

سرمایہ داروں سے خطاب

اے غلام عیش و عشرت سود خواری تا بکے
اے کرم ناآشنا سرمایہ داری تا بکے

آگئی تجھمیں بتا کیونکر درندوں کی یہ خُو
لگ گیا ہے تیرے مُنہ مظلوم انساں کا لہو

دیکھ غافل بند ہونے ہی کو ہے بابِ حیات
زندگی محبوب ہے تو سیکھ آدابِ حیات

نغمہائے کیف بھر دے ظلم پرور ساز میں
لوچ پیدا کر خدا کے واسطے آواز میں

کچھ غریبوں کی بھی حالت کا تجھے احساس ہے
فاقہ کش اہلِ وطن کا بھی تجھے کچھ پاس ہے

چین سے سوتا ہے تُو بستر پہ چادر تان کر
یہ ہے کس عالم میں تجھ کو کیا بھلا اس کی خبر

اِس کی عُسرت نے بنایا ہے تجھے سرمایہ دار
تو زمینداری کا مالک اور یہ مفلس کاشتکار

کوششیں کرتا ہے کیا کیا دانے دانے کے لئے
ہر نفس روتا ہے دم بھر مُسکرانے کے لئے

یہ ہے وہ سلطان جو مٹی سے لیتا ہے خراج
کھیت اس کا مُلک ہے اس کا خزانہ ہے اناج

اس نے دامن کو زمیں کے موتیوں سے بھر دیا
تخم ریزی کرکے قدرت کے حوالے کر دیا

ایک تُو ہے نشۂ فرعونیت میں چُور ہے
ایک یہ بھائی ترا عسرت زدہ مزدور ہے

تو ہے دولتمند اور یہ مُفلس و نادار ہے
صاحبِ عزت ہے تو اور یہ ذلیل و خوار ہے

تیرے ارمانوں کے گلشن میں بہار آیا کرے
اس کی کشتِ آرزو کیا یوں ہی مُرجھایا کرے

اس کی آنکھوں میں ہیں آنسو تیرے ہونٹوں پر ہنسی
تیرے چہرے پر مسرت، اس کے رخ پر بیکسی

وہ ترا رنگیں محل اور اس کا یہ چھپر کا گھر
تیرا قصرِ پُر تکلف اِس کا بوسیدہ کھنڈر

سرنگوں عُسرت سے یہ، دولت پہ تو مغرور ہے
یہ مصیبت آشنا تو رنج و غم سے دُور ہے

تیرے گھر میں روشنی بجلی کی آتی ہے نظر
کام تاریکی میں دیتا ہے اُسے داغِ جگر

کھا رہا ہے مست ہو کر تو پہاڑوں کی ہوا
مر رہا ہے ایک مفلس دیکھ بے آب و غذا

پاک صورت ہے تو کیا سیرت اگر ناپاک ہے
تُف ہے اس جینے پہ ایسی زندگی پر خاک ہے

محسن اعظم گڈھی

تلاشِ معاش

پھول چند

جب دیہات میں کوئی ذریعۂ معاش نہ نکلا تو رفیق نے بزرگوں کی رائے سے مجبور ہو کر شہر کا رُخ کرنے کا ارادہ کیا۔ بیوی کی جُدائی شاق گزر رہی تھی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ لوگوں کے طعنے سننے کی تاب نہ رہی تھی۔ آخر ایک صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ گاؤں کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسٹیشن اُس کے گھر سے کوئی تین میل کے فاصلے پر تھا۔ راستے میں اُسے کئی ہم وطن ملے۔ اور ہر ایک نے اُس سے "کہاں؟" کا سوال کیا۔ جس کے جواب میں وہ کبھی تو چُپ رہ جاتا اور کبھی "قسمت آزمانے" کہہ کر جلدی سے آگے بڑھ جاتا۔ اُس کے چہرے پر حسرت برس رہی تھی۔ اور اُس کا دل ڈوب رہا تھا۔ اس کے باوجود اُسے اُمید کی ایک موہوم سی کرن دکھائی دے جاتی۔ وہ سوچتا کہ تھوڑی کوشش سے مجھکو کسی کارخانے میں جگہ مل جائے گی۔ اور چند مہینوں کے بعد میں گھر والوں کو منہ دکھانے کے قابل ہو جاؤں گا۔ یہی خیال تھا جس کے سہارے اُس کے قدم اُٹھتے چلے جا رہے تھے۔

اُس کا دماغ اُس کے مستقبل پر روشنی ڈال رہا تھا۔ اس کے پَیر اس کو اسٹیشن سے قریب تر کئے چلے جا رہے تھے۔ آخرکار اس کے خیالات کو منتشر ہو جانا پڑا۔ وہ ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر کھڑا ہو گیا۔ گاڑی ابھی نہیں آئی تھی۔ ٹکٹ بابو رجسٹر پر سر جھکائے کچھ لکھ رہے تھے۔ اس کی جھلک دیکھ کر اُن کی نظریں اوپر اُٹھیں: وہ مرعوب نہ ہوئے۔ دس منٹ انتظار کرانے کے بعد وہ کھڑکی تک آئے ——— کہاں جاؤ گے؟ ——— "کانپور" ——— ڈیڑھ روپیہ ——— رفیق نے ایک پُرحسرت نظر ڈال کر دام بڑھا دئے ——— کاش اس کا یہ قرض جلد ادا ہو جاتا۔ اس نے طے کر لیا کہ اپنی مزدوری کے پہلے تین روپوں میں سے چچا کا قرض ادا کر دے گا۔

گاڑی آنے میں ابھی دیر تھی۔ وہ بنچ پر بیٹھ کر پھر خیالات میں غرق ہو گیا۔ رات کو انہیں خیالات نے اُسے دیر تک جگائے رکھا تھا اس وقت وہی اُسے تھپکیاں دے کر سو جانے پر مائل کرنے لگے۔ اسٹیشن کا سکون مدد کر رہا تھا۔ آخر اُس نے آنکھیں بند کیں اور بیٹھے ہی بیٹھے ایک جھپکی لینے لگا۔

اس کے کانوں میں گھنٹی کی آواز پہونچی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ گاڑی آ رہی تھی وہ کھڑا ہو کر ٹہلنے لگا۔ دُور! بہت دُور!! پٹریوں پر انجن اُس نے ایک قوی ہیکل دیو کی طرح تیزی سے آتا دکھائی دیا۔

گاڑی رُکی۔ وہ ایک ڈبے میں داخل ہو گیا۔ ڈبے کے اکثر مسافر بنچوں پر آنکھیں بند کئے دراز تھے، کون جانتا ہے کہ وہ سوتے تھے یا جاگ رہے تھے، کیونکہ یہ وقت سونے کا تو تھا نہیں۔ گرمیوں کا زمانہ! سات بجے دیر ہو چکی تھی۔ سورج کی کرنیں بہتوں کو گرم کر رہی تھیں۔ ڈبہ بھی گرم ہو چلا تھا۔ خدا جانے یہ مسافر کیوں زیادہ سے زیادہ جگہ اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے تھے...۔ اُسے جب کوئی جگہ نہ ملی تو مجبوراً کھڑا رہا۔ بعض آدمی تو ضرورت سے چوگنی جگہ لیں اور ایک کو کھڑے رہنے کی تکلیف گوارا کرنی پڑے ..... یہ ادل تو کسی

نے سوچا نہیں اور اگر سوچا بھی ہو تو صرف سوچا ہی۔

گاڑی چلی۔ دیر تک وہ کھڑکی سے جھانکتا رہا۔ پُرانی یادیں امڈی چلی آرہی تھیں ——— "اگر میں کبھی واپس نہ آسکا" ——— یہ خیال پیدا ہوتے ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اتنے میں کسی نے اُسے مخاطب کرکے کہا "بھیا کھڑے کیوں ہو۔ آؤ بیٹھ جاؤ" اس نے دیکھا تو پاس ہی بیٹھا ہوا ایک بڈھا اس کے لئے جگہ خالی کر رہا تھا۔ اُس نے آنسو روکے، اور اُس کے پاس بیٹھ گیا۔

"کہاں جاؤگے بابو" بڈھے نے سوال کیا،

"کانپور" یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر چپ رہا جیسے بڈھے کی طرف سے کسی سوال کا منتظر ہو۔ بڈھا چپ رہا تو اُس نے کہا "اور تم؟ بابا"

"بھیا ہمیں تو فتحپور اترنا ہے" بڈھا یہ کہہ کر اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا "ارے بابو یہ آنسو کیسے؟ کیا گھر چھوڑتے بُرا معلوم ہوتا ہے؟ بھگوان تم کو جلد واپس لائیں۔ میں بھی جب پہلے پہل نوکری کرنے نکلا تو بڑا دکھ معلوم ہوا۔ گھر والی کو روتا دیکھ کر میں بھی رو دیا۔ پر جی کڑا کرکے گھر سے نکل پڑا۔ دو سال بعد کوئی دو سو روپے کما کر لوٹا۔ گاؤں والے دیکھ کر نہال ہوگئے۔ گھر والی تو مارے خوشی کے رو پڑی۔ تب سے کھیتی باڑی کرتا ہوں۔ بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ کرپا ہے بھگوان کی آنند سے دن بیت رہے ہیں۔ کانپور کیا نوکری کرنے جا رہے ہو؟

"ہاں بابا"

"محنت اور صبر سے کام کروگے تو انت میں آنند ہی آنند رہے گا۔ پہلے بڑے دکھ جھیلنے پڑیں گے۔ وہاں کوئی گھر دوار ہے یا بس پرماتما ہی کے سہارے جا رہے ہو؟

"کوئی نہیں۔ بس اللہ مالک ہے"

"تو میں بتاؤں کسی مسجد میں ٹھہرنا۔ وہاں کے ملا کی کچھ خدمت کرتے رہنا۔ پڑ رہنے بھر کی جگہ دیدیں گے"

یہ سوال رفیق کے لئے کہ میں اپنی راتیں کہاں بسر کروں گا، بہت ٹیڑھا تھا، اپنے بوڑھے ہم سفر کی رائے اُسے بہت پسند آئی، وہ اُچھل پڑا۔ اس نے شکریہ ادا کرنا چاہا۔ مگر الفاظ نہ نکلے، زبان نے ساتھ نہ دیا۔ کچھ کہنا چاہتا مگر اٹک اٹک کر رُک جاتا۔ بڑی کوششوں کے بعد اس کے منہ سے صرف اتنا نکل سکا "یہ تو ٹھیک ہے"

وہ دیر تک چپ رہا۔ بڈھا کچھ سوچ رہا تھا، اور وہ بھی، وہ اب پہلے کی طرح نااُمید نہ تھا۔ اُس کا دل اُمنگوں سے بھر گیا تھا۔ اُس کے دماغ نے اس کے سامنے خیالی تصویریں پیش کرنی شروع کردیں۔ پہلی تصویر میں اُس نے اپنے آپ کو دیکھا کہ مغرب کی نماز کے بعد ایک مسجد میں بیٹھا وظیفہ پڑھ رہا ہے۔ لوگ ایک ایک کرکے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مسجد نمازیوں سے خالی ہوجاتی ہے۔ وظیفہ جلدی سے ختم کرکے وہ پیش نماز صاحب کے قریب پہونچتا ہے۔ اُن کو سلام کرکے کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے، جو وہ بخوشی دے دیتے ہیں۔ وہ اُن سے کہتا ہے کہ قبلہ میں یہاں تلاش معاش کے سلسلے میں دور دراز کا سفر طے کرکے آیا ہوں۔ میرے لئے جائے قیام کا کوئی بندوبست نہیں۔ میری مالی حالت بہت ابتر ہے۔ اگر جناب اجازت دیں تو اس مسجد میں قیام کروں۔ جناب کی وقتاً فوقتاً خدمت کرتا رہوں گا، اور آپ کا احسان کبھی نہ بھولوں گا۔

وہ اُسے بہت خندہ پیشانی سے اجازت دیدیتے ہیں۔ رات کا کھانا بھی اپنے ہی ساتھ کھلاتے ہیں۔ صبح ہوتی ہے اور وہ مسجد سے نماز پڑھکر برآمد ہوتا ہے۔

دوسری تصویر جو اُس کی آنکھوں کے سامنے پیش ہوتی ہے ایک مِل کی ہے کہ وہاں وہ ایک بھیڑ میں کھڑا ہے۔ بھیڑ کم ہوتی ہے اور خود کو ایک کوٹ پتلون پہنے ہندوستانی "صاحب" کے سامنے پاتا ہے، اُن سے وہ کسی مزدور کی جگہ کی درخواست کرتا ہے، اور وہ بخوشی قبول کی جاتی ہے۔ شام کو اُسے دن بھر کی مزدوری ملتی ہے۔ وہ شاداں و فرحاں مسجد میں پہونچ کر مولوی صاحب کے آگے سرِ عقیدت جھکا دیتا ہے۔ وہ تحسین و آفرین کہہ کر اُس کا دل بڑھاتے ہیں۔

وہ آنکھیں بند کرکے اسی طرح کے خیالات کی خوابوں میں تشکیل کرنے لگا یہاں تک کہ فتحپور کے اسٹیشن پر اس کا ہمدرد بڈھا بغیر اس کے شانے ہلائے اُسے خیرباد کہہ گیا۔ اس کی آنکھیں پھر بھی نہ کھلیں۔ غنودگی زیادہ طاری ہوئی اور وہ بڈھے کی خالی کی ہوئی جگہ پر قابض ہوگیا۔ اب تک وہ بیٹھ کر سو رہا تھا، اب کچھ لیٹ کر اور کچھ بیٹھ کر سونے لگا۔ گاڑی چلدی۔ وہ اب بھی سو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کو کبھی کبھی کھل جانا پڑتا، پھر بھی اُسے سونے میں مزا آرہا تھا۔

ایک چھوٹے اسٹیشن پر گاڑی رُکی۔ اس کی نیند میں ایک آواز خلل انداز ہوئی، کوئی کہہ رہا تھا ––– مولی صاحب اُٹھیئے۔ سونے کا وقت نہیں ––– اُس نے آنکھیں کھولیں تو ایک موٹے سے کالے "صاحب" کو کھڑا پایا۔ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ اُن کے لئے جگہ خالی کی، اور خود ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ "صاحب" کے لئے اتنی جگہ کافی نہ ہوئی، وہ کھسکتے گئے اور وہ دبکتا گیا۔ دو آدمیوں کی اس قدر مختصر جگہ کی اتنی نامناسب تقسیم دیکھ کر ایک تیسرے مسافر نے رفیق کو اپنے پاس جگہ دے دی۔ گو وہ کافی نہ ہوئی پھر بھی غنیمت تھی۔ وہ حیران تھا کہ یہ ہیں تو "صاحب" مگر تیسرے درجے میں بیٹھے رہے ہیں! سوچتے سوچتے اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ "بھیٹے صاحب" ایسے ہی "صاحبوں" کا خطاب ہے۔ معلوم نہیں اُس کا خیال کہاں تک درست تھا۔

اب تک تو وہ سو رہا تھا، اب اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے، منزلِ مقصود کے لئے اُس کا دل بے چین ہونے لگا۔ وقت کاٹنے کے لئے اُس نے قدرتی مناظر سے لطف اُٹھانے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ زمین بنجر اور سوکھی پڑی تھی۔ آسمان پر ابر کا ایک لکہ بھی نہ تھا، لطف آتا تو کس چیز کے دیکھنے میں۔

بے صبری بڑھتی جاتی تھی، وہ جلد از جلد کانپور کے اسٹیشن کی شکل دیکھنا چاہتا تھا۔ جب کبھی گاڑی کی رفتار کم ہوتی تو وہ ڈرتے ہوئے سر نکال کر دیکھنے لگتا۔ گاڑی کسی چھوٹے اسٹیشن پر رُک جاتی۔ اُسے بہت جھنجھلاہٹ معلوم ہوتی۔ کانپور پہونچنے کے لئے وہ اپنے کسی ہم سفر سے کم بے تاب نہ تھا۔

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ مسافروں میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ "کانپور آگیا" "کانپور آگیا"۔ رفیق نے محسوس کیا کہ اس کا دل دھڑک رہا ہے۔ اس نے اپنے سینے پر ہات رکھا۔ دھڑکن تیز ہوگئی، گاڑی اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ پلیٹ فارم سامنے آیا۔ اور گاڑی رُک بھی گئی۔ اُس کا دل اب بھی دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ سب اُترنے والے اُتر گئے۔ وہ مبہوت سا بیٹھا تھا۔ آخر اُس کے بغل والے نے کہا "تم کو نہیں اُترنا ہے؟

"ہاں" اس نے چونک کر جواب دیا "جاتا ہوں"

ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے وہ نیچے اُترا، اور جانے والوں کے ساتھ ہولیا۔ دروازے پر پہونچ کر باوجود اوروں کو ٹکٹ دیتا دیکھ کر وہ ٹکٹ دینا بھولا جا رہا تھا۔ ٹکٹ کلکٹر نے جب ہات پکڑ کر "ٹکٹ؟" کہا تب اُسے ہوش آیا اور اس نے جیبیں ٹٹولنا شروع کیں۔ جس قدر جلد نکالنے کی کوشش کرتا اتنی ہی دیر ہوتی۔ کئی بار ٹکٹ ہات میں آ آ کر چھوٹ گیا۔ بہت پریشان ہونے کے بعد ٹکٹ دے کر پیچھا چھڑایا۔

اسٹیشن سے باہر نکل کر وہ ایک طرف کو چل دیا۔

بغیر کسی ارادے کے وہ دیر تک چلتا رہا۔ دوکانوں پر باوجود دوپہر کی تیز گرمی کے اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ اُس نے ان سر بفلک عمارتوں، ان دوکانوں اور اُن خریداروں میں خدا جانے کیا عجیب بات دیکھی کہ اپنے مقصد کو بھول کر دیر تک بازار میں چکر لگاتا رہا۔

دفعتاً اس کے کانوں میں اذان کی آواز آئی۔ اس نے نظر اُٹھا کر دیکھا کچھ دور پر ایک مسجد تھی۔ ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔ نماز کے ساتھ ہی اُسے اپنے بوڑھے ہم سفر کا خیال آیا۔ مسجد میں داخل ہوگیا۔

مسجد کچھ اَپ ٹو ڈیٹ قسم کی تھی، وضو کے لئے نل لگے ہوئے تھے۔ وضو کر کے وہ ایک بجلی کے پنکھے کے نیچے آ بیٹھا۔ کچھ دیر ہوا کھائی، سنتیں پڑھیں، فرض میں شریک ہوا۔ نماز ختم کر کے ایک بزرگ کا بتایا ہوا وظیفہ صرف وقت گزارنے کے لئے پڑھنا شروع کر دیا۔

جب دو ایک نمازیوں اور پیش نماز صاحب کے علاوہ سب چلے گئے تب اُس نے اپنا وظیفہ ختم کیا۔ مولوی صاحب کا وظیفہ ابھی جاری تھا، وہ انتظار کرنے لگا۔

بہت دیر ہوگئی، مگر مولوی صاحب مصلے سے نہ اُٹھنا تھے نہ اُٹھے، جب انتظار کی تاب نہ رہی تو اُٹھ کر باہر چلا۔ "مغرب کی نماز کے بعد ممکن ہے اُن کو جلد فرصت ہو جائے"۔ اس نے سوچا "بہتر ہوگا کہ اسی وقت کہوں"۔

شام تک شہر کی سیر کرتا رہا۔ یہاں تک کہ مغرب کا وقت آگیا، عصر کا وقت اسی سیر سپاٹے میں جاتا رہا۔ مغرب کا وقت بھی نہ چلا جائے یہ سوچ کر اُس نے دن کی مسجد تو تلاش نہ کی، بلکہ ایک رہ گذر سے قریب کی مسجد کا پتہ پوچھ کر وہاں پہونچ گیا۔ وقت ہو چکا تھا۔

نماز پڑھ چکا تو یہاں بھی انتظار کا منہ دیکھنا پڑا۔ مگر زیادہ دیر نہ لگی، مولوی صاحب مصلے سے اُٹھے ہی تھے کہ قریب بیٹھے ہوئے دو

آدمیوں نے گفتگو شروع کر دی۔ وہ سمجھا کوئی مسئلہ مسئلہ پوچھ رہے ہوں گے جلد ہی چلے جائیں گے۔ یہ سوچ کر وہ بیٹھا رہا۔ مگر وہ دیر تک نہ ہٹے۔ یہ دیکھ کر وہ آگے کھسک کر قریب بیٹھے۔ مولوی صاحب نے چونک کر کہا "کہئے آپ کو کوئی ضروری کام ہے؟" وہ سٹ پٹا گیا۔ "مجھے!۔۔۔۔۔ ضروری کام" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا "تو نہیں۔۔۔۔۔ یونہی کچھ عرض کرنا تھا"

"فرمایئے!۔۔۔۔۔ جلدی بولئے۔ فرصت کم ہے"

اس نے ڈرتے ڈرتے کہنا شروع کیا "مسافر ہوں، اس شہر میں نوکری کی تلاش میں آیا ہوں۔۔۔۔"

"چاہتے کیا ہیں آپ؟" مولوی صاحب کے ہمنشینوں میں سے ایک نے کہا۔

"رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو رات کی رات (؟) مسجد میں پڑ رہوں"

"چہ خوش! مسجد کوئی مسافر خانہ تو ہے نہیں۔ کسی سرائے میں تشریف لے جایئے"

اس جواب کی اُسے کبھی خواب میں بھی امید نہ تھی۔ یہ سُنکر جیسے اس پر بجلی گر پڑی۔ خانۂ خدا میں اور ایک رات کی پناہ نہ ملے! وہ کچھ نہ کہہ سکا، اس کا منہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا اور نظریں ان تینوں پر جم گئیں۔ وہ اپنی جگہ سے ہلنے کے قابل بھی نہ رہا۔

ایک وہ شخص جو اب تک خاموش تھا اس کی یہ حالت دیکھ کر بولا "آپ کوئی دوسرا انتظام کریں"

"بہتر" کہہ کر وہ اُٹھا اور "سلام علیکم" کہہ کر باہر نکلنے لگا تو کانوں میں آواز آئی "ہُنہ! مسافر!!"

ان الفاظ نے مجروح کے زخموں پر نمک پاشی کی۔ اور دل چکنا چور ہو کر آنکھوں سے بہ نکلا۔ دنیا اس کے حق میں کس قدر ظالم تھی۔ جہاں وہ اتنی اُمیدیں لے کر آیا تھا۔ وہاں کی پہلی ہی منزل نے اُس کے قدم اُکھاڑ دئے۔ ۔۔۔۔۔ "آہ یہ مولوی جو رات بھر چارپائی پر تن کے آرام سے سوئے گا۔ مجھے زمین پر پڑ رہنے کی بھی اجازت نہ دے سکتا تھا۔۔۔۔۔ اُچکا سمجھا۔۔۔۔۔ بدمعاش سمجھا۔۔۔۔۔ دنیا والے کتنے بدگمان ہیں۔۔۔۔۔ مسجد میں سوا بدھنوں کے اور رہے ہی کیا جس کی چوری کا ڈر ہو۔۔۔۔۔ یہ ہیں دین کے کھمبے!۔۔۔۔۔ ایک مسلمان کو اپنے گھر میں پناہ دینا تو درگذر خدا کے گھر میں بھی پناہ لینے سے محروم رکھتے ہیں۔ اگر کہیں غلطی سے کوئی ان کے گھر پر چلا جاتا تو شاید جوتوں یا ڈنڈوں سے خاطر کرتے۔۔۔۔۔ خدا غارت کرے اِن موذیوں کو"

اُسے اپنے ارد گرد کی ساری چیزیں اپنے خلاف نظر آ رہی تھیں۔ ساری دنیا اُسے دشمن معلوم ہو رہی تھی۔ سڑک پر چلتے چلتے لڑکھڑاتا تو سڑک بنانے والوں کو کوستا۔ کسی کھمبے سے ٹکرا جاتا تو اُسے گھونسے مارتا۔ اس کی حالت بالکل چڑچڑے بچوں کی سی ہو رہی تھی۔ اگر کوئی قسمت کا مارا اس وقت اس سے ہمدردی کا اظہار کرتا۔ تو وہ اُسی پر برس پڑتا۔ اسی وقت اُس نے سوچا کہ یہ ساری آفت اس بڈھے کی رائے کی لائی ہوئی ہے۔ کچھ بُرا بھلا بھی اُسے کہا مگر معاً خیال آیا کہ اُس نے تو میری بھلائی ہی کے لئے کہا تھا اِس میں اُس کی کیا خطا تھی۔ اسے اپنی یہ حرکت بہت بُری معلوم ہوئی، اپنے اوپر لعنتیں بھیجیں۔

اِنھیں خیالات میں محو وہ دیر تک چلتا رہا۔ جب بازاروں سے نکل کر وہ ذرا تاریک حصوں میں پہنچا تب اُسے ہوش آیا۔ سوچنے لگا اب کیا کروں۔ سامنے اک پارک تھا۔ خیال آیا کیوں نہ اسی میں لیٹ رہوں، بجائے اس مُلا کی باتیں سنیں۔ یہ بات پہلے ہی دماغ میں کیوں نہ آئی۔

پارک کی ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس بہت آرام دہ معلوم ہوئی۔ لیٹ گیا، کچھ دیر تک لیٹا رہا۔ خیال آیا کچھ کھایا نہیں۔ بھوک معلوم ہونے لگی۔ اُٹھا تو ہر طرف ہُو کا عالم تھا کسی آدمی کی شکل نہ دکھائی دی۔ کچھ گھبراہٹ معلوم ہوئی۔ آبادی کی طرف چلا۔ تھوڑی دور گیا تھا کہ خیال آیا۔ اگر اس وقت کھانے کو کچھ نہ ملا اور سونے کو کوئی جگہ نہ ملی تو رات بھر یونہی مارا مارا پھروں گا۔ بہتر ہے کھانا نہ کھاؤں۔ یہیں سو رہوں۔ پیسے بھی بچ رہیں گے، واپس آ کر پھر لیٹ رہا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ تھکا تو تھا ہی۔ جلد نیند آ گئی۔

صبح جب سورج نے ستایا، اور دھوپ ناقابلِ برداشت ہو چلی تو مجبوراً آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا۔ کچھ دُور چل کر ایک نل پر منہ ہاتھ دھویا۔ ایک آدمی سے مِل کا راستہ پوچھ کر اُدھر چل پڑا۔

بھُولتا، بھٹکتا، لوگوں سے پوچھتا، آخر کار مِل تک پہونچ ہی گیا۔ اتنی اونچی اور مضبوط دیواریں، اور اتنی عظیم الشان عمارت اس نے

پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ دیر تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ لوگ آتے ہیں اور ایک طرف کو چلے جاتے ہیں۔ قیافہ کہتا ہے کہ یہ مزدور ہیں، اور اسی کارخانے میں کام کرتے ہیں۔ اس نے ان سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن زبان نے ساتھ نہ دیا۔ دیر تک یوں ہی کھڑا رہا۔ اتنے میں ایک سمع خراش سیٹی بجنے لگی۔ غالباً اسی کارخانے میں۔ اس نے لوگوں کو جلدی جلدی بڑھتے ہوئے دیکھا۔ شاید یہ کام پر پہونچ جانے کی سیٹی تھی۔

اس نے دیکھا کہ موقعہ نکلا جا رہا ہے۔ ہمت کرکے اوروں کے ساتھ ہو لیا۔ ایک دروازہ دکھائی دیا کہ جانے والے اسی پر کھڑے تھے۔ قریب پہونچ کر اُس نے دیکھا کہ ایک شخص کھڑا ہر آدمی سے ایک ٹکٹ طلب کرتا ہے۔ اور اُسے لے کر اُسے اندر جانے دیتا ہے۔ مجبوراً وہ رُک گیا جب سب اندر داخل ہو چکے تو اس سے پوچھا۔ کیا ہمیں یہاں نوکری مل سکتی ہے؟

"مزدوری کیجئے گا؟"

"جو بھی ملے"

چوکیدار نے اپنے ساتھی سے کہا "انھیں بابو جی کے پاس پہنچا دو"

ساتھی نے سوچا کہ پتہ بتا دینا بہتر ہے۔ اور بولا "ادھر چلے جایئے۔ وہاں دفتر ہے، بابو اسی میں بیٹھے ہیں"

وہ بتائے ہوئے راستے پر ہو لیا۔ دفتر کے سامنے پہونچ کر کھڑا ہو گیا۔ بابو ـــ جن کی خیالی تصویر اس نے ایک ہندوستانی "صاحب" کی بنائی تھی۔ بشکلِ "پنڈت" دھوتی باندھے کرسی پر بیٹھے تھے، اُسے دیکھ کر بولے "کیا چاہیئے؟"

"نوکری کی تلاش میں آیا ہوں"

"معاف کیجئے آپ کے لائق ہمارے پاس کوئی کام نہیں" یہ کہہ کر وہ کچھ لکھنے لگے۔

رفیق حیرت سے اُن کا منہ تک رہا تھا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے۔ کچھ کہنے کے لئے لب ہلے ہی تھے کہ "پنڈت نما بابو" نے اُسے گھورا ـــ جیسے پولیس والا کسی مشتبہ ملزم کو ـــ اور وہ سر جھکائے جدھر سے آیا تھا اُسی طرف چلا گیا ـــ

اور شام کو اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ گنگا میں ڈوب کر ایک نوجوان نے خودکشی کر لی۔

یادِ دوست

زمیں سے آسماں تک ظلمتوں کی حکمرانی ہے
لٹیں شانوں پہ ڈالے لیلیٔ شب کی جوانی ہے
فضائے دہر میں تاریکیاں کروٹ بدلتی ہیں
ہوائے تُند میں خاموشیاں پیہم مچلتی ہیں
سیہ ناگن کے آگے گُل چراغِ بزمِ عالم ہے
تجلّی کواکب سربسر مصروفِ ماتم ہے
ہر اک برگ و شجر پر سنسناہٹ کا تسلّط ہے
صدائیں جھینگروں کی جھنجھناہٹ کا تسلّط ہے
بساطِ آب و گِل پر اک جمودِ کیف طاری ہے
جہاں میں نیند کی دیوی کا فیضِ عام جاری ہے
مگر تو ہے کہ ایسے میں بھی مجھکو یاد آتا ہے
سرور و کیف بن کر میرے دل پر چھائے جاتا ہے

مری بزمِ تخیل میں تری تصویر رقصاں ہے
مری تاریک دُنیا تیرے جلوؤں سے فروزاں ہے

ساحر قدوائی ایڈیٹر شاہد بریلی

تلقینِ قفس

ہم قفس رو نہ بہت شکوۂ صیاد نہ کر
آبروئے جوہرِ ضبط کی برباد نہ کر

میں سمجھتا ہوں کہ تو عیشِ گلستاں سے ہے دور
تجھ کو اس قیدِ بلا سے ہے رہائی منظور

پچھلی آزادیوں کا دھیان جب آتا ہے تجھے
ہجرِ احبابِ چمن سخت ستاتا ہے تجھے

چہچہے یاد جب آتے ہیں گلستاں کے تجھے
خواب آتے ہیں نظر سنبل و ریحاں کے تجھے

تھا کبھی پھولوں کے جھرمٹ میں نشیمن تیرا
اور اب خانۂ صیاد ہے مسکن تیرا

شاخِ گل پر کبھی کٹتی تھی جوانی تیری
اب ہے محبوسِ قفس زمزمہ خوانی تیری

سب یہ سچ، سب یہ بجا، سب یہ سہی، سب یہ درست
پھر بھی بیکار ہے اس طرح سے رہنا ترا سست

ہم نے مانا کہ قفس تیرے لئے ہے جنجال
پھر بھی جو امن یہاں ہے وہ ہے گلشن میں محال

زندگی خاک تری باغ میں ہوتی تھی بسر
نت نیا رنج، نیا غم تھا تجھے آٹھ پہر

روز پڑتا تھا تجھے اک نہ اک افتاد سے کام
جورِ گلچیں سے، کبھی فطرتِ صیاد سے کام

خوفِ شاہیں سے نکلتی تھی نہ آواز تری
ہر گھڑی تاک میں تھا چنگلِ شہباز تری

کسی گوشے میں لگائے تھا کوئی جال کہیں
کوئی بیٹھا تھا کترنے کو پر و بال کہیں

آشیانہ تھا ترا وقف اجڑنے کے لئے
جسمِ نازک پہ ترے تیر تھے پڑنے کے لئے

کبھی صرصر کبھی آندھی سے تھا پالا تجھکو
کوئی جز برق نہ تھا پوچھنے والا تجھکو

پیٹ کی فکر میں عالم تھا پریشانی کا
کبھی دانے کا تھا خلجان کبھی پانی کا

رات دن کام تھا محنت سے مشقت سے تجھے
کوئی مطلب ہی نہ تھا عیشِ فراغت سے تجھے

غور کر غور کہ یہ بھی کوئی آزادی ہے
مجھے حیرت ہے کہ تو کس لئے فریادی ہے

اب یہاں دیکھ کہ ہے کس قدر آرام سے تو
مطمئن کلفتِ صیاد و غمِ دام سے تو

نہ یہاں برق کا کھٹکا نہ خزاں کی کاہش
چین سے گوشۂ عزلت میں ہے بے رنج و خلش

باد و باراں کے مصائب کی تجھے فکر نہیں
صرصر و خار کے آلام کا یاں ذکر نہیں

نہ یہاں جال کا دھڑکا ہے نہ شہباز کا ڈر
نہ یہاں تیر و کمان و قدر اندازوں کا ڈر

دانے دانے کے لئے اب نہیں زحمت تجھکو
بن گیا ہے قفس اک آیۂ رحمت تجھکو

نہ مشقت ہے نہ محنت ہے نہ حیرانی ہے
پھر بھی نالاں ہے جو تو یہ تری نادانی ہے

شکر کر میری طرح کاٹ دے آرام سے دن
ورنہ گزریں گے بہت کلفت و آلام سے دن

مداح (احمق) پھپھوندوی

افسانے کی تشکیل

مولینا امداد صابری

تشکیل: افسانۂ تعمیر کی جزئیات متعین کرنے کا نام ہے۔ افسانے کے حُسن اور پختگی کا جتنا دار و مدار پلاٹ کی عمدگی پر ہے اتنا ہی تشکیل کی خوبی پر بھی ہے۔ جس طرح پلاٹ میں معمولی سی خامی رہ جانے پر تمام افسانہ خراب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تشکیل میں نقص باقی رہ جائے تو افسانے کے اجزا کی مناسب اور اس کے وقار میں فرق آجاتا ہے۔ خاکہ تیار کرنا اگر ایک فنِ جمیل ہے تو خاکے میں جزئیات آرائی کرنا بھی ایک آرٹ ہے۔ تشکیل افسانہ کے خاکے میں جزئیات کی جگہ متعین کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اس میں افسانہ کی جزوی باتوں کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ موسم۔ کمرے کے دروازے۔ کھڑکیاں وغیرہ بہت ہی معمولی معمولی چیزیں تشکیل کے وقت زیرِ غور آتی ہیں۔ تشکیل کو لسِ آخر یا عملِ جبلا سمجھنا درست نہیں بلکہ لکھنے سے قبل افسانے کے پلاٹ میں جن معمولی معمولی باتوں کو دخل کرنا ضروری ہوتا ہے اُن کے تعین کو تشکیل کہا جاتا ہے، ہر جزوی بات کے وجود کے جواز میں وجہ ڈھونڈی جاتی ہے۔ ہر فقرہ، ہر حادثہ یا ہر وقوعہ، ہر کردار، ہر بیان۔ ہر قول کے متعلق یہ دیکھا جاتا ہے کہ آیا وحدت تاثر سے ہم آہنگ ہے؟ اور آیا اُس کو وہ مناسب جگہ مل گئی ہے یا نہیں، جہاں وہ زیادہ سے زیادہ موثر ثابت ہوگا۔ اجزا اس طرح ملائے جاتے ہیں کہ افسانہ کی عمارت میں بھدا پن پیدا نہیں ہونے پاتا ہر جزو اتنا ضروری اور برمحل معلوم ہونے لگتا ہے کہ اگر اُسے اس کی جگہ سے ہٹایا جائے تو افسانے میں کسی بات کی کمی نظر آنے لگے۔ تشکیل میں معاون واقعات کے تاثر کا خیال رکھا جاتا ہے۔ کرداروں کی مناسبت، افسانہ کے اجزا کے تناسب، واقعات کے مناصب و مدارج، اور "زاویہ بیان" سب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

عملِ تشکیل کے دوران میں افسانہ نگار کو یہ امر ہر وقت اپنے سامنے رکھنا پڑتا ہے کہ "افسانے کا مقصدِ اعلیٰ، کم سے کم ذرائع سے واحد تاثر پیدا کرنا ہے"۔ اس اصول کے پیشِ نظر وہ ہر اس جزوی چیز کو جو پلاٹ میں شامل کی جاتی ہے۔ پہلے خوب اچھی طرح بنظرِ امتحان دیکھتا ہے کہ آیا یہ افسانے کے لئے ضروری ہے یا نہیں؟ آیا اس سے افسانے میں کوئی حقیقی اضافہ ہوتا ہے یا نہیں؟ اور آیا اس جگہ کے لئے بالکل مناسب رہے گا یا نہیں جو اس کے واسطے افسانے کے پلاٹ میں نکالی گئی ہے۔

ہم نے اوپر "کم سے کم ذرائع" کی ترکیب استعمال کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ افسانہ نگار افسانے میں کم سے کم ضروری کردار رکھے۔ کم سے کم واقعات دکھائے اور کم سے کم وقت اور زیادہ سے زیادہ محدود جگہ میں افسانہ تیار کردے۔ اگر دو کرداروں سے کام چل سکتا ہے تو تین کردار استعمال کرنا بے ضرورت ہے۔ اگر تاثر کی تخلیق کے لئے صرف ایک وقوعہ درکار ہے تو افسانہ نگار کو اسی ایک وقوعہ تک رہنا چاہیئے۔ اگر ایک ہی مقام پر افسانہ تمام ہو سکتا ہے تو اُسے کئی مقامات پر پھیلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر حالات، کردار، واقعات وغیرہ میں زیادہ سے

زیادہ کفایت شعاری برتتے وقت ایک بات فراموش نہیں ہونی چاہیئے۔ وہ بات یہ ہے کہ افسانہ کی غایت زیادہ سے زیادہ موثر طریق پر پڑھنے کے لئے ذہن نشین ہو جانی چاہیئے اگر تاثیر کے حصول کے لئے کفایت شعاری سے دست بردار ہونا پڑتا ہے تو افسانہ نگار کو چاہیئے کہ بے تکلف اس سے دست کش ہو جائے۔ تشکیل کے معاملہ میں ایک بڑا اہم حل طلب مسئلہ افسانہ نگار کے سامنے یہ ہوتا ہے کہ حصولِ تاثیر اور کفایتی ذرائع کے درمیان توازن کیونکر قائم کیا جائے۔

ہر افسانہ میں چند کردار ایسے ضرور ہوتے ہیں جو پلاٹ کی حرکت کے لئے ضروری نہیں ہوتے، مگر تشکیل کے لئے ضروری عناصر کا حکم رکھتے ہیں انھیں معاون کردار کہتے ہیں کیونکہ ان سے پلاٹ کو نشو و نما دے کر افسانے کو تکمیل تک پہنچانے میں مدد ملتی ہے، اکثر انھیں تقابل کی غرض سے پیش کیا جاتا ہے تاکہ مرکزی کردار کی بعض اچھی یا بری خصوصیات اور بھی اجاگر ہو جائیں ——

اگر مرکزی کردار غیر معمولی کیرکٹر کا مالک ہوتا ہے تو امدادی کردار عام رجحانات کے حامل دکھائے جاتے ہیں تاکہ مرکزی کردار کی غیر معمولیت اور بھی زیادہ نظر آئے۔ اگر مرکزی کردار کے کیرکٹر میں بدخصالی زیادہ ہوتی ہے تو اس کے مقابل نیک امدادی کردار رکھ کر اس کی طینت کی خرابی کو اور بھی چمکا دیا جاتا ہے۔

بعض اوقات ایک کردار کو دوسرے کردار کی فضائے بعید یا اس کے پس منظر اپنے مقابل کے کردار کی خصوصیات کو اگر وہ روشن ہیں تو روشن تر اور اگر تاریک ہیں تو تاریک تر کرکے دکھاتے ہیں۔ کبھی اس پس منظر کے مقابل ایک کردار کو صرف نما پا جاتا ہے، یوں بلند ترین روشنیاں اور عمیق ترین تاریکیاں پڑھنے والے کے سامنے لائی جاتی ہیں۔

تاہم کرداروں کا تنہا مصرف تقابل ہی نہیں ہے یہ اصول کہ زیادہ سے زیادہ کفایتی ذرائع برتے جائیں، اس امر کا مقتضی ہوتا ہے کہ وہ اور طریقوں سے بھی ایک دوسرے سے اس طرح [illegible] جائیں جیسے کپڑے کے تار ایک دوسرے سے چسپاں کر دئے جاتے ہیں، کیونکہ ان کی پیوستگی سے افسانہ کی تشکیل کا عمل تکمیل پذیر ہوتا ہے۔

بعض اوقات معاون کرداروں میں انفرادیت بالکل نہیں ہوتی، وہ صرف پس منظر کا کام دینے یا فضا پیدا کرنے کے واسطے پیدا کئے جاتے ہیں ایسی صورتوں میں ان کی تخلیق اور تعمیر پر کوئی خاص توجہ صرف نہیں ہوتی۔ یا تو ان کی ایک ہلکی سی جھلک دکھا دی جاتی ہے، یا صرف اوپری طور سے تذکرہ کر دیا جاتا ہے یا اُن کا ایک ہلکا سا عکس دکھا دیا جاتا ہے۔ بعض افسانوں میں اضافی کردار صرف جزئیات کی تکمیل کے لئے لائے جاتے ہیں۔ کبھی ایک کہانی بیان کرنے والے کی ضرورت ہوتی ہے جس کا خود کہانی کے واقعات میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ غرض صدہا طریقوں سے امدادی کرداروں سے کام لیا جاتا ہے۔ ہر افسانہ کی جداگانہ ضروریات ہوتی ہیں۔

بعض اوقات افسانے میں ایک معاون کردار کا اس لئے بھی اضافہ کر دیتے ہیں کہ اس سے نفسِ مضمون کو تقویت پہنچتی ہے، مثلاً مرکزی رابعہ کی خصلتوں کو واضح تر کرنے کے لئے مولٰنا نیاز فتحپوری نے "شہیدِ آزادی" میں حیدر رضا کا کردار پیش کیا ہے۔

کرداروں کا واقعات سے قریبی تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے اب ہمیں افسانے کے وقوعات کی طرف توجہ کا رُخ پھیرنا چاہیئے۔ افسانے کا یہ اصول ہے کہ ہر جزو کسی نہ کسی طرح افسانے کے عمل اور اس کی حرکت کو آگے بڑھاتا ہے اور افسانے کو اُس کے متعینہ انجام سے قریب تر کر دیتا ہے۔ اس سے ایسی جزئیات مہیا ہوتی ہیں جن سے افسانہ مکمل ہوتا ہے۔ انہی جزئیات کے صحیح انتخاب اور مناسب استعمال پر بڑی حد تک افسانہ کے تاثر کا دارومدار ہوتا ہے۔

وقوعات کے تین مصرف ہیں۔ مثال سے کسی چیز کو واضح تر کرنا عمل میں تیزی پیدا کرنا، اور جذبات کی اُکساہٹ کا سامان مہیا کرنا۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک افسانہ میں وقوعات کا ایک مصرف ظاہر ہو۔ ہر کہانی میں عمل اور جذبات ایک ساتھ نمودار ہو سکتے ہیں۔ اس لئے عمل کے وقوعات اور جذباتی وقوعات اکثر پہلو بہ پہلو یا ایک دوسرے سے وابستہ دیکھے جاتے ہیں۔

مثالی وقوعات بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں اور وہ افسانہ کے لئے بنیادی طور پر ضروری بھی نہیں ہوتے وقوعاتِ عمل البتہ افسانے کے لئے "جان" کا حکم رکھتے ہیں۔ جذباتی وقوعات کو اس طرح ترتیب

دینے سے کہ وہ وقوعات کے درمیان آجائے۔ افسانہ کے مضمحل کن تسلسل کو توڑا جاسکتا ہے۔ یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اس طرح بار بار دلچسپی کو اُکسانے اور مدہم کر دینے سے آیا افسانے کے وحدتِ تاثر کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا —— ؟

ایک معمولی سی مثال سے اس سوال کا تشفی بخش جواب دیا جاسکتا ہے۔ فرض کرو ایک شخص پہاڑ پر چڑھ رہا ہے۔ وہ منظر جو پہاڑ کی چوٹی سے نظر آسکتا ہے اس کو اُسی وقت نظر آئے گا جب وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہونچ جائے گا۔ مگر اس دوران میں بھی تو جب وہ اوپر کی طرف گامزن ہے جہاں تہاں اُسے ایسی چیزیں نظر آئیں گی جو اُس کی نظروں کے لئے "جنتِ نظارہ" ثابت ہوں گی، بالکل یہی صورت افسانہ کی ہے۔ جذبات کی ہر تازہ اُکساہٹ زاویہ نظر کو وسعت دیتی ہے۔ مگر حالات کا پورا نظارہ افسانہ کے نقطۂ عروج پر پہنچنے کے بعد ہی نصیب ہوتا ہے، عمل کے لحاظ سے افسانہ برابر اپنے ارتقائی منازل طے کرتا رہتا ہے۔ اتمام منازل نقطۂ عروج ہی پر ہوتا ہے۔ درمیانی نازک لمحات شاہراہِ ارتقا پر سنگہائے راہ بن جاتے ہیں۔ ہر نازک لمحہ اپنے پیشرو کی بہ نسبت کسی قدر بلند تر سطح پر ہوتا ہے۔

افسانے کے ان نازک لمحات کے درمیان دلچسپی میں کوئی کمی واقع نہیں ہونی چاہیئے، کیونکہ (تلازمہ قائم رکھتے ہوئے) یہ ضروری نہیں کہ ہر بار کسی بلندی پر پہنچنے سے قبل ایک شخص کسی وادی میں اُترے۔

دوسرے ٹائپ کا وقوعہ یعنی مثالی وقوعہ بھی ذہن ہی سے اپیل کرتا ہے۔ تصریحی مثالوں سے افسانہ کی چمک دمک بڑھ جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مثالی وقوعات سے صرف افسانہ کے واقعات کی گہرائی تک پڑھنے والے کے ذہن کو لیجانا مقصود ہوتا ہے۔ واقعات کو مجسم کرکے وہ انھیں زیادہ واضح شکل دیدیتے ہیں۔ اکثر اس طرح کسی کردار کی بھی تشریح کر دی جاتی ہے۔ کبھی کبھی افسانہ کے موضوع پر بھی مثالی وقوعات سے نئی روشنی پڑ جاتی ہے۔ ان کے ذریعے پڑھنے والا موضوع تک بالکل ایک نئے راستے سے پہنچتا ہے۔ اس طرح ایک اضافی واقعہ کے علم میں آجانے سے تاثیر و اثر میں بیحد اضافہ ہو جاتا ہے۔

جذباتی وقوعات بلا واسطہ افسانہ کے عمل کو ترقی دیتے ہیں۔ وہ افسانہ کی فضا بناتے ہیں۔ اُسے ایک مخصوص رنگ دیتے ہیں اور پڑھنے والے میں جذبۂ ہمدردی برانگیختہ کرتے ہیں۔ اُن سے کیفیات کی تخلیق بھی کی جاتی ہے۔ کبھی کبھی ان سے کہانی میں فوری مزاج کی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر ان وقوعات کا مصرف کچھ بھی ہو اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ جہاں تک وحدتِ تاثر کا تعلق ہے یہ اسے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائیں۔ ہرچند جذباتی وقوعات تنہا بھی وجود پذیر ہوسکتے ہیں۔ مگر عموناً وہ عمل یا مثال کے وقوعات سے منسلک کر دئے جاتے ہیں۔

افسانے کی تشکیل کے دوران میں یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ عمل کردار اور فضا کو مناسب اثر بخشا جائے۔ مگر اس میں شدت نہو۔ کسی وقوعہ کے بیان، یا کسی کردار کی تصویر کھینچنے میں بہت سی جزوی اور غیر اہم تفصیلات دی جاسکتی ہیں۔ اُن کا مصرف صرف یہی ہوتا ہے کہ تاثیر میں گہرائی پیدا ہو، مولانا نیاز فتحپوری نے "داستانِ حسن و عشق کے خونی ورق" میں جو تھیو فائل گائتر سے ماخوذ ہے قلو بطرہ کا کردار پیش کرتے وقت درجنوں جزوی اور غیر اہم تفصیلات پیش کی ہیں اسی طرح قلو بطرہ کے محل کی فضا بڑی مرصع پیش کی ہے، شاید اس سے مصنف کی غرض قلو بطرہ کا شاہانہ پس منظر پیش کرتا ہے۔ برخلاف اس کے "رادھا" میں کردار نگاری کو بہت کم گنجائش دی گئی ہے، یہاں عمل پر زیادہ زور ہے اور جس حد تک ضروری ہے کردار کی تصویر بھی عمل کی جھانکیوں میں ہی سے دکھائی گئی ہے۔ کبھی کبھی نمایاں کردار یا عمل اور بھی زیادہ نمایاں بنانے کا یہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے کہ افسانہ نگار صرف چند تصریحی الفاظ لکھ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ عین اُس وقت جب پڑھنے والا تفصیلات کا متوقع ہو، بیانی اختصار سے پڑھنے والے کی توجہ فوراً کردار یا عمل پر مرکوز ہو جاتی ہے۔

تخلیقِ اثر کے لئے بعض اور ذرائع بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا محفلِ سماع میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی کو کسی خاص شعر یا مصرع پر وجد آجاتا ہے تو موسیقار اُسی کو بار بار دوھراتے ہیں، اور اس کے اثر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، ہر بار جب پسندیدہ شعر یا مصرع دوہرایا جاتا ہے صاحبِ وجد کے دل و جگر میں ہوک سی اُٹھتی ہے۔ بعض افسانوں میں بھی یہی ٹکنک استعمال کیا جاتا ہے۔ امریکن افسانہ نگار ایڈگر ایلن پو، جو افسانہ نگاری کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے اس ترکیب کا بڑا دلدادہ اور بہت خوگر تھا۔ مختلف افسانوں میں یہ ترکیب مختلف طریقوں سے استعمال کی جاتی ہے بعض دفعہ نفسِ موضوع پر زور دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات وہی اشارات

آغاز افسانہ میں رکھ دیئے جاتے ہیں۔ جن پر آگے چل کر افسانہ کے نقطۂ عروج کی بنا رکھی جاتی ہے یا جو افسانہ کی غائت کے آئینہ داری کرتے ہیں، بعض افسانوں میں ایک دو فقرے بار بار دوہرائے جاتے ہیں۔ غرض ڈھنگ کچھ بھی ہو۔ ترکیب یہ ہوتی ہے کہ اثرات زیادہ عمیق ہوتے چلے جائیں ——— نیاز کے افسانہ "ایک شاعر کا انجام" (جمالستان) میں اشارات اتنے واضح اور نمایاں نہیں ہیں۔ مگر موجود ضرور ہیں ———

افزائش اثر کے سلسلہ میں جب ان پر زور دیا جاتا ہے جو اس کے مستحق ہیں تو ان وقوعات کی باقاعدہ ترتیب کی طرف بھی توجہ کی جاتی ہے، جو افسانہ کے لئے ضروری ہیں۔ یہ کام غامرشعار ہے۔ بعض لوگوں کی رائے کسی افسانہ کے واقعات اسی ترتیب سے بیان کر دینا جس ترتیب سے وہ وقوع پذیر ہوئے ہیں شاذ ہی ممکن ہے۔ وہ اس کی دلیل دیتے ہیں کہ اس صورت میں افسانہ بہت پیچھے سے شروع کرنا پڑے گا اور بہت سی غیر اہم تفصیلات کو بھی راہ دینی ہوگی اور افسانہ کی حرکت بھی بہت سست رہے گی۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ افسانہ کے واقعات بجنسہ اسی طرح سے بیان کر دینے چاہئیں جس طرح وہ وقوع پذیر ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ افسانہ میں جو ضروری مداخلتیں ممکن ہیں اس طرح ان کا دفعیہ ہوجائیگا۔

یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ ان دونوں آرار میں کونسی درست ہے اور کونسی غلط۔ غائر نظر ڈالنے سے البتہ اتنا پتہ چلتا ہے کہ اپنی اپنی جگہ یہ دونوں فریق صحیح ہیں۔ اصل میں معاملے کا بہت کچھ انحصار خود افسانے پر ہے، اور بہت کچھ افسانہ نگار کے سلیقہ پر۔ یہ مسلم ہے کہ وہ افسانہ نگار جو اپنے کام کی پوری مہارت رکھتا ہے افسانہ کو بے مطلب تفصیلات سے گرانبار نہیں کرے گا۔ تاہم ہر افسانہ میں چند تفریحی فقرے ضرور رکھنے پڑتے ہیں، اور وہ ضروری بھی ہوتے ہیں۔ تاہم افسانہ کے آغاز سے پہلے جو کچھ گزر چکا ہے اس تمام کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اس بات کی چنداں ضرورت ہے کہ افسانہ کے آغاز ہی میں ان سب سابقہ واقعات کا انبار لگا دیا جائے واقعات افسانہ میں جابجا منتشر کئے جا سکتے ہیں، اور اس طرح منتشر کئے جا سکتے ہیں کہ ترتیب کی باقاعدگی کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے۔ یہ طرز عمل یقیناً دماغی پھوہڑپن پر دلالت کرتا ہے کہ کسی ایک مرحلہ تک واقعات بیان کرنے کے بعد افسانہ نگار پھر ماضی کی طرف پلٹ پڑے اور کہنے لگے "یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اب سے چار ماہ قبل جب اسلم کالج سے تازہ تازہ نکلا تھا.......... وغیرہ وغیرہ اس قسم کے واقعات کسی مکالمہ میں یا ایسے موقعہ پر جب کردار غرق فکر ہو بآسانی ظاہر کئے جا سکتے ہیں۔

قدرتاً کام اس وقت ذرا دشوار ہو جاتا ہے، جب گزشتہ واقعات کے متعلق یا کردار کے تعارف کے طور پر کافی طوال طویل بیان کے مرحلہ سے گزرنا ہو، مظہر انصاری کے افسانہ "ملاپ کا فرشتہ" میں مصنف کو سلیمہ اور اس کے شوہر صادق کے بگاڑ کی تفصیلات ابتدا میں بتانی ضروری تھیں، اور اس کے سلسلہ میں لاپرواہ اور ضدی کیرکٹر پر بھی روشنی ڈالنی تھی، تاکہ آگے چل کر جو زبردست انقلاب اس کی حالت میں پیدا ہونے والا ہے، اس کا تاثر اپنی جگہ خوب گہرا ہوجائے۔ سیدھا سادھا راستہ یہ تھا کہ افسانہ نگار سلیمہ اور اُس کے شوہر کے بگاڑ کی تفصیلات ہی سے افسانہ شروع کر دیتا۔ مگر یہ راستہ مصنف کے ذہنی پھوہڑپن پر دلالت کرتا ہے۔ اس نے ایک زیادہ سلیقہ مندانہ اور فن کارانہ طریقہ اختیار کیا۔ سلیمہ اور اس کی سہیلی کی گفتگو سے افسانہ کا آغاز کیا ہے؟ (واضح ہو کہ سہیلیوں کی سیکھ، ماننے کے معاملہ ہی پر میاں بیوی میں اَن بَن ہے) سلیمہ سہیلی کے ساتھ کہیں جانے کے لئے تیاری کر رہی ہے، اور پوچھتی ہے "بس یا اور کچھ اور بھی پہن لوں"۔ سہیلی جواب دیتی ہے "خالی اہرن اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ بُندے اور پہن لو" اور اُس کے بعد (یعنی ایک جھلک دکھانے کے بعد) فوراً میاں بیوی کے اس بگاڑ کی تفصیل شروع کر دی جاتی ہے جو افسانہ شروع ہونے سے پہلے وقوع پذیر ہو چکی ہے۔

افسانہ سے پہلے ہی گزشتہ واقعات کو ظاہر کرنے کے اور بھی متعدد طریقے ہیں اکثر مرکزی کردار اپنے آپ سے گفتگو کرنے لگتا ہے اور اپنے گزشتہ زندگی کی تمام ضروری تفصیلات پیش کر دیتا ہے۔ کبھی مکالموں میں گزشتہ حالات بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ ان صورتوں میں گزشتہ واقعات افسانہ کی حرکت کو روکتے نہیں بلکہ اس کی رفتار میں اضافہ کرتے ہیں۔

ایک دشواری اور ہے جو اس سلسلہ میں اکثر پیش آتی ہے۔ وہ واقعات جو بیک وقت وقوع پذیر ہوئے ہیں اُنھیں کس ترتیب سے بیان کیا جائے؟ ایسے

صورتوں میں ترتیب وقوع توڑ دی جاتی ہے اور افسانہ نگار اپنے اوپر انھیں ترتیب دیتا ہے۔ کسی واقعہ کو جو ترتیب وقوع کے لحاظ سے آگے ہونا چاہیے تھا پیچھے کر دیتا ہے اور کسی کو جو پیچھے دکھانا چاہتا ہے آگے لے آتا ہے۔ تاہم اکثر و بیشتر افسانوں میں ترتیبِ وقوع کے مطابق واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔

اکثر افسانوں کو ابواب میں تقسیم کر دیا جاتا ہے یا تو ایک طویل سطر کھینچ کر یا ایک حصہ کو دوسرے حصے سے جدا کر دیتے ہیں یا نقطے یا پھول وغیرہ درمیان میں لا کر فاصلہ پیدا کر دیا جاتا ہے یا (۱) (۲) (۳) وغیرہ سے فرق ڈال دیتے ہیں۔ ہر چند بعض مستند افسانہ نگاروں کے افسانوں میں اس وضع کی تقسیم نظر آتی ہے۔ مگر فنی اعتبار سے اس تقسیم کی معقولیت کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ اس صورت میں جب منظر میں کمل تبدیلی یا سلسلہ خیالات میں کمل انقطاع ہو اس قسم کی تقسیم قابلِ درگذر ہے۔ ایسی جگہوں پر فرق ڈالنے سے افسانہ کی "مجموعیت" پر برا اثر نہیں پڑتا۔ برخلاف اس کے اگر اس تقسیم سے مقصود صرف مختلف زمانوں کو جدا جدا کر کے دکھانا ہو تو ظاہر ہے کہ اس سے افسانہ کی حرکت پر برا اثر پڑتا ہے اور اس وقت یہ تقسیم نہ صرف بیکار بلکہ خلاف قاعدہ بھی ہوتی ہے۔

مختلف زمانوں کے وقفوں کا عام طور پر ایک فقرے یا چند الفاظ سے بخوبی ظاہر کیا جا سکتا ہے اور اکثر افسانوں میں اس کی بھی حاجت نہیں ہوتی کیونکہ وقفوں کا فرق ظاہر کرنا ضروری ہی نہیں معلوم ہوتا۔ اگر کوئی افسانہ ابواب پر تقسیم ہوئے بغیر ہی تعمیر ہو سکتا ہے تو اُسے ابواب میں تقسیم کرنا سخت غلطی ہے بلکہ دیکھا تو یہ گیا ہے کہ جن کہانیوں میں وقفہ ظاہر ضرور معلوم نظر آتا ہے وہ بھی ایسا کرنے سے باعتبار حرکت کمزور پڑ جاتی ہیں۔ کیونکہ وہ پڑھنے والے کے ذہن کو "دم لینے" پر مائل کرتی ہیں۔ اگر افسانہ خود تیز رفتار واقعات کا فاصلہ طے کرنے پر مصر نہیں ہے تو وہ پڑھنے میں گھبراہٹ کیوں مچائیں یوں افسانہ پارہ پارہ ہو جاتا ہے اور جو افسانہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پڑھا جائے وہ وحدتِ تاثر کا حامل نہیں ہو سکتا اور نہ پڑھنے والے کے ذہن پر واحد تاثر مرتسم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اگر افسانہ نگار کے سامنے یہ بھی ایک حل طلب سوال ہوا کرتا ہے کہ افسانہ کو کیا شکل دی جائے یعنی کس قسم کا "بیانی زاویہ" لیا جائے۔ فہم اور سلیقہ اس منزل میں بہترین رہنما ہوتے ہیں۔ عموماً ذیل کے "بیانی زاویوں" میں سے کوئی ایک زاویہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

(۱) ایک ایسا شخص جس کا افسانہ سے قریب یا دور کا تعلق نہیں ہے افسانہ بیان کرتا ہے، یہ ڈھنگ بہت قدیم سے مروج ہے۔ اس میں چند خامیاں ضرور ہیں۔ یعنی بعض اوقات بیان اور اصلیت کے معاملہ میں افسانہ میں گنجلک آ جاتی ہے مگر اس ڈھنگ سے پڑھنے والوں کو ایک بڑی آسانی یہ رہتی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں وہ سب کچھ دیکھ لیتے ہیں جو مختلف مقامات پر اور مختلف اوقات میں ہو رہا ہے اس ڈھنگ سے وہ دلوں میں چھپے ہوئے خیالات اور پوشیدہ رجحانات سے بھی باخبر ہو جاتے ہیں، اور کسی صورتِ حال یا کردار کا تجزیہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس بیانی زاویہ سے یہ آسان ہو جاتا ہے کہ ہر کردار کو بے لاگ اور غیر جانبدارانہ طور پر پیش کیا جا سکے۔ پڑھنے والا اس زاویہ سے بیان کئے ہوئے افسانوں میں اپنی تمام توجہ واقعات پر مرکوز کر دیتا ہے، اور بیان کرنے کے وجود کو بالکل فراموش کر جاتا ہے۔ بعض افسانوں کے لئے یہ غیر جانبدارانہ زاویہ بیان ناگزیر اور لابدی ہوتا ہے، وہ اس ڈھنگ کے سوا اور کسی ڈھنگ سے بیان ہی نہیں کئے جا سکتے۔

(۲) کوئی ایسا شخص افسانہ بیان کرتا ہے جو خود واقعات میں حصہ وار رہ چکا ہے یا جس نے افسانے کو وقوع پذیر ہوتے دیکھا ہے، اس ڈھنگ سے واقعات کے بیان میں بہت صفائی پیدا ہو جاتی ہے، یہ فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے کہ ہم ان لوگوں کی زبان سے کسی واقعہ کو سننا زیادہ پسند کرتے ہیں جو یا تو حادثہ میں شریک تھے یا اس وقت جبکہ حادثہ وقوع پذیر ہوا ہو وہاں موجود تھے۔ اس صورت میں افسانہ بیان کرنے والا ہمارے ایک واقف کار کی سی حیثیت حاصل کر لیتا ہے اور افسانہ اصل معلوم ہونے لگتا ہے بالخصوص ایڈ ویںچر (
کے افسانہ مرکزی کرداروں کی زبان سے بیان کر ڈالے جاتے ہیں تو بہت ہی زیادہ لبریز اصلیت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ البتہ ان صورتوں میں جب ایڈ وینچر کا انجام خزینہ ہو یا ایڈ وینچر کا انجام ہیرو کی موت پر ہوتا ہو۔ یہ ڈھنگ بیکار ہو جاتا ہے۔

افسانۂ عمل میں یہ ڈھنگ زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے، مگر افسانۂ کردار کے لئے یہ بہت غیر موزوں اور نامناسب ثابت ہوتا ہے

چونکہ مرکزی کردار اپنی ذاتی صفات اور خصوصیات کو خود اپنی ہی زبان سے واضح کرتا ہوا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا، اور جب ایک کردار اپنی گفتگو اور اپنے عمل سے ظاہر ہو افسانہ بے لطف رہتا ہے۔ اس لئے اگر افسانہ کرداروں بیان کا یہ ڈھنگ اختیار بھی کیا جاتا ہے تو اس طرح مرکزی کرداروں کی جگہ معاون کردار کی زبان سے افسانہ بیان کرایا جاتا ہے۔ اس طرح کردار نگاری کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے اور واقعات کی وضاحت کا بھی۔

(۳) بعض اوقات ان لوگوں سے جو افسانہ کے واقعات میں حصہ دار رہے ہیں خطوط کے ذریعے افسانہ بیان کرایا جاتا ہے یا ڈائری میں واقعات کے اندراج سے افسانہ تعمیر کیا جاتا ہے۔ یہ طریق بہت کم استعمال ہوتا دیکھا گیا ہے، اور اس کا استعمال بہت دشوار بھی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ خطوط میں عموماً جہاں تہاں کی درجنوں باتیں ہوتی ہیں اگر مخاطب اور صاحبِ مکتوب میں بے تکلفی ہے یا دوسرے لفظوں میں فنی احتساب اُن کی اس وضع کی آزادی سلب کر لیتا ہے۔ ان خطوط میں کوئی ایسی بات درج نہیں ہو سکتی جو کسی نہ کسی اعتبار سے افسانے کا جز بننے کی صلاحیت نہ رکھتی ہو، اور پھر اس پابندی کے ساتھ ہی خطوط میں اصلیت کی جھلک بھی ہونی چاہئیے۔ خطوط کے ذریعے افسانہ بیان کرنے میں ایک مزید دشواری یہ ہے کہ افسانے کی تدریجی ترقی اور دلچسپی قائم رکھنی مشکل ہوتی ہے۔ اگر کل خطوط ایک ہی شخص نے لکھے ہیں تو ہر خط میں یہ بھی ظاہر کیا جانا ضروری ہوتا ہے کہ گذشتہ خط کا مخاطب نے کیا جواب دیا۔

ڈائری کا یہ طریقہ بھی اسی قسم کی مشکلات کا حامل ہے۔ خطوط تو بہر حال کسی نہ کسی مخاطب کو خطاب کر کے لکھے جاتے ہیں۔ اس لئے ان میں ضرور کچھ نہ کچھ دلچسپی ہوتی ہے۔ مگر ڈائری کا طریق اس لحاظ سے اور بھی زیادہ غیر دلچسپ ہوتا ہے، کیونکہ تنہا ایک ہی شخص ڈائری لکھتا ہے، اور جو کچھ لکھتا ہے کسی کو خطاب کر کے نہیں لکھتا۔

(۴) ایسی صورت میں جب افسانہ بیان کرنے والے نے افسانہ کسی دوسرے سے سنا ہو تو وہ افسانہ در افسانہ ہو جاتا ہے۔ پہلے دو تین پیروں میں ایک قسم کا بیانیہ تعارف ہوتا ہے اور پھر یہ دکھایا جاتا ہے کہ ایک شخص (عام طور پر بہت اصرار کے بعد) ایک کہانی شروع کرتا ہے جو اس نے اپنی جگہ کسی سے سن رکھی ہے یا جس کے واقعات اس کی موجودگی میں وقوع پذیر ہوئے ہیں یا جس میں وہ خود بھی بطور معاون کردار یا مرکزی کردار شریک رہا ہے یہ طریق اور بھی کئی طریق سے استعمال ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ طریقِ بیان بہت ہی قدیم ہے، اطالوی زبان میں "بوکاسیو" کے درجنوں افسانے اس طریق پر ہیں۔ انگریزی زبان میں "چاسر" نے اس طریق کو کئی کئی طرح استعمال کیا ہے۔ ہماری اردو زبان میں "میرامن دہلوی" نے چہار درویش اسی پیرائے میں لکھا ہے۔

یہ کہنا ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ افسانہ کا کمال یہ ہے کہ پڑھنے والا اُسے اصل سمجھے۔ تشکیل کی تمام جزئیات کو اس طرح آراستہ کرنا چاہئیے کہ وہ مبنی بر اصلیت معلوم ہوں۔ اثر اسی وقت ہوتا ہے جب یہ پڑھنے والا افسانے کو اس قدر اصل سمجھنے لگے کہ اُسے شبہ ہو جائے کہ یا تو یہ واقعہ کہیں ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے۔ اگر پڑھنے والے کو افسانہ پڑھتے وقت یہ محسوس ہونے لگے کہ اُسے "ابلہ فریبی" کا شکار بنایا جا رہا ہے تو وہ متنفر ہو کر افسانہ ہاتھ سے رکھدے گا۔ بعض اوقات اپنی دلچسپی کی بنا پر دیو پری کے افسانے بھی اصل معلوم ہونے لگتے ہیں، اُن میں بعض خصوصیات ایسی ہوتی ہیں کہ قوتِ متخیلہ ان لوٹ ہو جاتی ہے، اور بندو ڑ غلاموں کی طرح اُن کی رفتار کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہے۔ پختہ عمر کے لوگ طبعاً دیو پری کے افسانوں میں اتنی دلچسپی نہیں پاتے جتنے بچے۔ اس کی ایک صریح وجہ ہے، ٹھوس حقیقتوں کی سنگین دنیا سے تادیر تعلق رکھنے کی وجہ سے پختہ عمر کے لوگوں کی قوتِ متخیلہ کند ہو جاتی ہے۔ خیالی دنیاؤں میں پہنچ جانے کی قوت اُن میں نہیں رہتی۔ انھیں دیوؤں کی لڑائیوں۔ اژدہوں کے مارے جانے، اور دیوزادوں کے زیر کئے جانے میں چنداں لطف نہیں آتا۔ کیونکہ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس حقیقی دنیا کے دیوؤں کا جن سے دن رات واسطہ پڑتا ہے اسی دنیا کے آدمیوں کے ہاتھوں مارا جانا ہمارے لئے زیادہ مفید اور باعثِ دلچسپی ہے۔ پختہ عمروں کے مرد اور عورتیں دونوں اپنی اس قابلیت پر فخر کرتے ہیں کہ وہ غلط اور صحیح میں تمیز کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں کہ ایک ہوائی قالین آیا اور وہ شہزادے کو اُڑا کر پریوں کی حسین سرزمین کی طرف لے گیا، اُنھیں مجہول اور بے معنی معلوم ہوتی ہیں، جب تک اُنھیں یہ خیال رہے گا کہ افسانہ خیالی واقعات پر مبنی

ہے اور اس کا سنگین حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اس دلچسپی کے ساتھ کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ (اور یہ بھی اس وقت جب وہ پڑھنے پر آمادہ ہوں) چنانچہ حقیقت پسند افسانہ نگار صرف انہی واقعات پر اپنے افسانوں کی بنیادیں رکھتے ہیں جو نہ صرف حقیقی معلوم ہوں بلکہ کسی بحث کے حقیقی تسلیم بھی کرلئے جائیں۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ افسانہ ہو بہو زندگی کا چربہ ہونا چاہئے جا بکدست سنگتراش جس طرح اپنے تخیل سے پتھر کے ایک ٹکڑے کو ایک دل کش اور حسین مورت میں تبدیل کر دیتا ہے، اسی طرح ایک ماہر فن افسانہ نگار ایک حقیقی واقعہ کو زبان اور خیال کے رنگ دے کر کچھ بنا دیتا ہے وہ واقعات کو حقائق کے ہجوم میں سے جدا کرکے ان پر اپنے تخیل کا جادو کرتا ہے اور دیکھتے دیکھتے یہی سنگین، بے برگ و گیاہ اور خشک واقعات سچائی اور حسن کے ایک دل آویز مرقع کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔

کبھی کسی شخص کے کیرکٹر کے کسی قابل غور پہلو کو اہمیت دے کر اتنا بلند کر دیا جاتا ہے کہ پڑھنے والا ایک لمحہ کے لئے گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اتنی سی غیر اہم خصوصیت کردار کو بھی اس قدر سبق آموز بنایا جا سکتا ہے۔ کبھی کسی ایک واقعہ کو اس کے جزدی علائق سے علیحدہ کرکے کچھ اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ جو لوگ اس پر غور کرتے ہیں۔ ان کے دلوں پر چوٹ سی لگتی ہے۔ غرض کسی چیز کو دبایا جاتا ہے کسی کو ابھارا جاتا ہے اور حقیقی واقعات کو حقیقی رکھتے ہوئے بھی ایسا بنا سنوار کر پڑھنے والوں کے آگے پیش کر دیا جاتا ہے کہ انھیں افسانہ نگار کی ژرف نگاہ اور علوئے تخیل کا معترف ہونا پڑتا ہے۔

مگر یاد رہے کہ حقائق پر تخیل کا ضرورت سے زیادہ گہرا رنگ چڑھانے سے ان کے اثر میں کمی ہو جاتی ہے۔ حقائق اپنی سچائی کے اعتبار سے اول آخر حقائق ہی رہتے ہیں۔ مگر وہ موثر نہیں ہوتے۔ انھیں تاثیر کا حامل بنانے کے لئے ضرورت ہوتی ہے کہ اُن کا رشتہ و پیوند کسی ایک چیز سے لگایا جائے جو عام انسانی تجربہ سے ڈانڈے ملائے ہوئے ہو وہ کوئی ایسی چیز ہونی چاہئے جس سے عام انسان واقفیت رکھتے ہوں۔

افسانہ میں اصلیت کی جھلک پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ افسانہ نگار خود کو وقوعات اور طول طویل بیان کا پابند کرے۔ ایسی جزئیات بھی جو افسانہ میں جا بجا منتشر کر دی گئی ہوں موثر ہوتی ہوں۔ جائے وقوع اور وقت کے جزدی اشارات سے بھی افسانہ میں اصلیت کی جھلک پیدا ہوتی ہے۔ کردار کے منہ میں بھی ایسے فقرے رکھے جا سکتے ہیں۔ جو افسانہ کو واقعیت کا رنگ دیدیں۔ حقیقی واقعات یا ہنگامی سانحات کی طرف کبھی کبھار ہلکا سا اشارہ کر دینے سے بھی اصلیت جھلکنے لگتی ہے۔

ہُو

نہ میکشوں کا وہ گلشن رہا، نہ لالہ رہا — نہ زاہدوں کا وہ زُہدِ ہزار سالہ رہا

نہ کوئی دفترِ آداب کار رہا نسخہ — نہ کوئی مُصحفِ انداز کا رسالہ رہا

نہ سوز و ساز کا قائم رہا مقولہ کوئی — نہ علم و عقل کا باقی کوئی مقالہ رہا

نہ اہلِ عیش کے وہ دلفریب لحن رہے — نہ اہلِ درد کا وہ جانگداز نالہ رہا

حریمِ کیف میں تاریخِ رفتگاں بن کر
رہا تو حضرتِ ساقی کا اک پیالہ رہا

جوش ملیح آبادی

اے نیند بس اب آجا

مفلس کی کمائی ہے، قیدی کی رہائی ہے　　کچھ وصل نہیں ظالم۔ یہ شامِ جدائی ہے
اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا

جلتی ہیں مری آنکھیں، پلکیں ہیں شرر گویا　　اُٹھتا ہے دھواں دل سے، ہے آنچ نظر گویا
اے نیند بس اب آجا۔ اے نیند بس اب آجا

یکساں ہے کرم تیرا۔ جب سارے زمانے پر　　پھر کیوں اُتر آئی ہے۔ اک میرے ستانے پر
اے نیند بس اب آجا۔ اے نیند بس اب آجا

ہر سانس کے پہلو میں، پیکاں ہے کھٹکتا ہے　　ہر لحظہ کھٹکتا ہے۔ ہر آن کھٹکتا ہے
اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا

حرماں کا یہ عالم ہے، خاک اُڑتی ہے سینے میں　　جینا ہے جو نام اس کا، کیا لطف ہے جینے میں
اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا

تکلیف ذرا فرما، احسان ترا ہوگا　　ہوں بند مری آنکھیں۔ افسانہ سنا ایسا
اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا

تو بالش و بستر لے، میں خاک پہ سوؤں گا　　آرام تجھے دوں گا، انعام تجھے دوں گا
اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا

ہے میرے شبستاں میں، خاموشی و تاریکی　　ساماں ہے راحت کا، اور سیج ہے پھولوں کی
اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا

اب بھی جو نہیں آتی، آ، تجھ کو دکھادوں گا　　ہے عکس مرے دل میں، جس چاند کے ٹکڑے کا
اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا

آرام کا دشمن ہے، اور جانِ تمنا ہے　　میں جس کا ستایا ہوں، دل جس نے ستایا ہے
اے نیند بس اب آجا، اے نیند بس اب آجا

آثر لکھنوی

پیامِ اقبال اور کشاف

رازی

جون۔ جولائی ۳۷ء کے کلیم میں جنابِ کشاف" کا ایک مضمون بعنوان "اقبال اور پیامِ اقبال" شائع ہوا ہے۔ جس میں انھوں نے علامہ اقبال کے خلاف یہ جرمِ عظیم عاید کیا ہے کہ انھوں نے اپنے شاہینِ تخیل کو وطن پرستی کے قفس سے نکال کر عالمگیر انسانیت کی فضائے بسیط میں بال کشا ہونے کی اجازت کیوں دی ہے۔ صاحبِ مضمون نے واوین کی کثرت سے جس طنز آمیز لب و لہجہ اور طعن و تشنیع کی بھرمار سے جس رکاکت کا ثبوت دیا ہے، وہ کسی طرح بھی اس متین موضوع کے شایانِ شان نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحبِ فنِ تنقید نگاری کے مبادیات سے بھی ناآشنا ہیں۔ اور ان میں ہنوز نفسِ موضوع اور ذاتی جذبات کو الگ الگ رکھنے کی صلاحیت بھی پیدا نہیں ہوئی۔ اس لحاظ سے تو یہ مضمون چنداں التفات کے قابل نہ تھا، لیکن چونکہ انھوں نے مسئلہ ایسا چھیڑا ہے جو آج اسلامی نقطۂ نگاہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ جنابِ کشاف نہیں، تو کم از کم کلیم کے حلقہ میں جن لوگوں کی بصیرت تعصب کی نذر نہیں ہو چکی اُن کے سامنے حقیقت بے نقاب کر کے رکھدی جائے۔ تاکہ سعید روحیں اس قسم کی ابلہ فریبیوں کے شکار ہونے سے بچ سکیں۔ چونکہ جنابِ کشاف کا مضمون علامہ اقبال کی شاعری کے متعلق نہیں بلکہ اس پیغام کے متعلق ہے جو وہ ملتِ اسلامیہ کے نام دے رہے ہیں اس لئے اس مضمون کے جواب میں بھی علامہ موصوف کی شاعری نہیں بلکہ ان کے پیغام سے ہی بحث کی جائیگی،

اس ضمن میں چونکہ بعض واقعات کا ذکر ضروری ہوگا، اور واقعات میں نام لینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان مقامات میں کسی شخص کی ذاتی مخالفت مقصود نہیں، موافقت ہے تو اصولی، اور مخالفت ہے تو اصولی۔

جنابِ کشاف کو شکایت ہے کہ" اسلام کی وابستگی سے اُن کے (علامہ اقبال کے) مشرب میں مزید وسیع دامانی پیدا ہونی چاہئے تھی، اور برادرانِ وطن کی طرف سے بجائے شکایت ہائے رنگین کے پُر جوش تر خراجِ تحسین وصول ہونے کے اسباب پیدا ہونے زیبا تھے"۔ لیکن گذارش یہ ہے کہ علامہ (یا ایک مسلمان) کی یہ وسیع دامانی ہی تو برادرانِ وطن کے لئے شکایت ہائے رنگین کا باعث بنتی ہے۔ آپ جب تک اپنی نگاہوں کو بھارت ماتا کے مندر کی چار دیواری تک مقید رکھئے۔ جب تک آپ اس کنوئیں کے مینڈک بنے رہئے، برادرانِ وطن آپ سے راضی، آپ کے خدا سے راضی۔ لیکن جونہی آپ نے نگاہوں کو وسعت دی اور اس کنوئیں کے باہر خدا کی مخلوق کو بھی انسانیت کا درجہ دیا۔ یہ منہ بسور کے بیٹھ گئے، اور اس میں دراصل اُن کا قصور بھی نہیں، جو قوم نوعِ انسانی کو چار ورنوں میں تقسیم کر چکی ہو اور ان چار ورنوں کے باہر کے انسان اُن کے نزدیک ملیچھ ہوں، جو قوم اپنے ملک کی چار دیواری کو ہی اقصائے عالم کے حدود ثغور سمجھتی ہو، جس قوم کو اپنے ملک سے باہر ایک انسان بھی ایسا نہ ملے جو زبان۔ مذہب۔ تہذیب، تمدن۔ معاشرت میں ان سے مماثلت رکھتا ہو۔ اس قوم میں وسعتِ نظر پیدا کیسے ہو سکتی

اور چونکہ وہ خود ایسے تنگ نظر واقع ہوئے ہیں اس لئے وہ اپنی لوگوں سے خوش ہوتے ہیں جو خود ان جیسے تنگ نظر ہوں۔ اقبال یا ہر وہ مسلمان جس کی نگاہ کے سامنے قرآن ہو۔ ان حضرات سے خراجِ تحسین کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ وہ قرآن جو اُسے یہ پیغام دے کہ "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"۔ اور جو فطرت کی عالمگیر وحدت کو یوں بے نقاب دیکھے کہ "لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں"۔ باقی رہا یہ کہ اقبال نے وہ طریقِ عمل کیوں نہ اختیار کیا جس سے برادرانِ وطن کی تحسین حاصل ہوتی، تو معاف بفرمائیے۔ ایسے طرزِ عمل کی اقبال (یا کسی سچے مسلمان) سے توقع نہ کیجیے کہ وہ برادرانِ وطن، یا دنیا میں کسی انسان کی مدح و تحسین کی خاطر ایمان فروشی کر دے۔

برو ایں دام راہِ پیشِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

جنابِ کشاف پھر فرماتے ہیں کہ اقبال نے اپنی اس وسیع المشربی کو اپنے داعیات کا رنگ دے کر اسلام کے نام سے پیش کر دیا۔ مجھے علم نہیں کہ کشاف صاحب مسلمان ہیں یا غیر مسلم۔ جس انداز سے اُنھوں نے اولیاءِ عظام اور انبیاءِ کرام (علیہم السلام) کے نام لکھے ہیں اس سے تو وہ مسلمان ہی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان ہیں تو اسلام سے اس قدر ناواقفیت موجبِ تاسف ہے۔ اُنھیں اتنا بھی علم نہیں کہ جو پیغام علامہ اقبال دے رہے ہیں وہ یکسر قرآن کی تفسیر ہے۔ ان کے اپنے داعیاتِ قلب اور ذہنی رجحانات نہیں ہیں۔ اس کے متعلق ذرا وضاحت سے آخر میں عرض کیا جائے گا۔

پھر فرماتے ہیں کہ اقبال نے جو کہا ہے کہ "ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے + جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے" وہ یورپ کی جارحانہ قوم پرستی کو تو ایسا کہہ سکتے ہیں جس کا صحیح نام قیصریت اور جہانگیری ہے، ہندوستان کی قوم پرستی کے خلاف انھیں ہرگز ایسا نہیں کہنا چاہئے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جس قوم کے منصوبے یہ ہوں کہ ہندوستان کی نو کروڑ آبادی کو یا تو ان کے اندر جذب ہو کر رہنا ہوگا یا کہیں ہجرت کر جانا ہوگا۔ جو اس قدر کثیر آبادی کے مخصوص تمدن، کلچر (ثقافت) تہذیب کو یکسر مٹا دینے کا تہیہ کر چکی ہو۔ جو قوم ایک اچھی خاصی رائج الوقت زبان کو محض اس لئے بدل دینے پر مصر ہو کہ وہ زبان قرآن کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اور جس کے لئے تحریکِ آزادی کا قائدِ اعظم۔ پورا نیہ سوراج وغیرہ کے منصوبے چھوڑ کر محض اس بات کو اپنا نصب العینِ حیات بنالے کہ اردو کی جگہ ہندی۔ ہندوستانی، ملک کی زبان ہو جائے، پھر جس قوم کے قلوب کا ترجمان مسلمانوں کے تمدن۔۔۔۔۔ ثقافت کے متعلق اس قسم کے حقارت آمیز الفاظ استعمال کرے کہ یہ "پھندنے دار ٹوپی اور کھڑے پاجامے" کے سوا اور ہے ہی کیا، تو فرمائیے کہ اس قوم کا استیلاء جارحانہ قوم پرستی یا قیصریت نہیں تو اور کیا ہے۔ ذرا ان اہنسا کے پجاریوں کے بازوؤں میں قوت آجانے دیجئے، پھر دیکھئے کہ یہ قوم پرستی کیسا بہروپ بدلتی ہے۔

پھر اقبال کے خلاف یہ سنگین جرم عائد ہوتا ہے کہ وہ یہ آرزو کیوں رکھتا ہے کہ میں حجاز میں مروں۔

بس یہ ہے اصل سبب اقبال کے خلاف بغض و عناد کا۔ ان کو یہ گلہ نہیں کہ اقبال کو ہندوستان سے محبت کیوں نہیں۔ بلکہ یہ احساس چین نہیں لینے دیتا کہ اُسے حجاز سے محبت کیوں ہے۔ اقبال کے خلاف "حُبِّ علیؑ نہیں بلکہ بغضِ معاویہ" کام کر رہا ہے۔ اقبال حجاز میں مرنا چاہتا ہے کہ اس کے نزدیک حجاز ہی وہ خطۂ زمین ہے جہاں کسی کو نوعِ انسانی کی چیرہ دستیوں سے پناہ مل سکتی ہے اور جہاں کی خاک کے ذرّوں میں آسودہ ہونے سے اضطراب و تپش میں سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ باقی رہا یہ کہ "اس خاکِ پاک (ہندوستان) میں اتنے اتنے بڑے اکابرِ اسلام استراحت فرما رہے ہیں" تو فرصت کے وقت کبھی اُن بزرگانِ اسلام کے حالات پڑھئے اور دیکھئے کہ انھیں خاکِ حجاز سے کس درجہ عشق تھا۔ باقی رہا دل کا معاملہ، سو یہاں پہنچکر مجھے پھر شبہ ہونے لگا کہ جناب کشاف شاید غیر مسلم ہیں، کیونکہ یہ باور کرنے کے لئے دل مانتا ہی نہیں کہ اقبال کے خلاف لاکھ اعتراض کئے جاتے۔ لیکن ایک مسلمان اُن کے اس جذبہ کی تحقیر کس طرح کر سکتا ہے کہ "آرزو دارم کہ میرم در حجاز" جس شخص کو دشتِ حجاز سے اس قدر نفرت ہو۔ خدا نہ کرے کہ وہ پردہ اُٹھ جانے کے بعد مسلمان نظر آئے۔ اقبال اور ان کے ساتھ ہر ایک مسلمان کا قلب ریگستانِ عرب کے ذرّوں سے وابستہ ہے، اور یہ محض جذباتی چیز نہیں بلکہ عقلاً بھی یہی ہونا چاہئے، کہ جو قوم اپنے مرکز سے چھوٹ جاتی ہے، فنا ہو جاتی ہے۔

اور پھر کیا میں جناب کشاف سے پوچھ سکتا ہوں کہ بھارت ماتا کا مندر بنانے کے لئے بنارس ہی کیوں تجویز کیا گیا ہے؛ بمبئی یا پشاور میں یہ مندر کیوں نہ تعمیر ہوا۔ یہ ہندوستان کی متحدہ قومیت کا دیوی دوارہ ویدوں کے استھان میں جا کر کیوں بنا۔ یہ سب کچھ جناب کشاف کے نزدیک عین ایمان، اور دشت حجاز سے محبت کفر——

میری نگاہ شوق پر اس درجہ سختیاں
اپنی نگاہ شوخ کی کچھ بھی سزا نہیں

پھر فرماتے ہیں کہ "ہاں یہ وہی حب وطن تھا جو محمد عربی کی زبان پر من الایمان تھا"۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ "حب الوطن من الایمان" حدیث کی کونسی کتاب میں آیا ہے۔ جائیے اور اپنے ساتھ تمام وطن پرست علماء کو بھی ملا لیجئے اور پھر ثابت کیجئے کہ یہ کوئی حدیث ہے فاتوا برهانکم ان کنتم صادقین، جس شخص کی مذہبی واقفیت کا یہ حال ہو کہ وہ ایک عربی کے جملے کو حدیث سمجھ بیٹھے، اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ تا مرد سخن نگفتہ باشد۔۔۔۔۔۔۔ ہاں، ایک بات جناب کشاف نے البتہ پتہ کی کہی۔ فرماتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے شب ہجرت میں فرمایا تھا کہ "اے مکہ مجھے تو بڑا عزیز تھا۔ لیکن کیا کروں تیرے فرزند مجھے تیرے دامن میں رہنے نہیں دیتے" اقبال کو کب ہندوستان عزیز نہیں۔ وہی ہندوستان جس کے متعلق وہ ۱۹۰۶ء میں نہیں۔ بلکہ ۱۹۳۷ء میں کہتا ہے کہ۔

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز — اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشم مہ و پروین ہے اسی خاک سے روشن — یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب

لیکن بایں ہمہ اگر وہ آج ہندوستان کی خاک کے بجائے دشت حجاز میں پناہ ڈھونڈھتے ہیں تو یہی کہتے ہوئے کہ "اے بھارت ماتا مجھے تو بہت عزیز ہے، لیکن تیرے سورما سپوت یہاں کسی ملیکش کو دیکھنا گوارا نہیں کرتے"۔ اگر جناب کشاف واقعات کو اپنی رنگین عینک سے نہ دیکھتے تو اس واقعۂ ہجرت میں، جسے وہ وطن پرستی کی تائید میں پیش کر رہے ہیں۔ وطن اور دین کی صحیح صحیح پوزیشن نظر آجاتی۔ واقعۂ ہجرت ہی نے تو بتایا ہے کہ اگر کبھی تمہارے دین اور وطن میں آویزش ہو جائے۔ اگر وطن کی سنہری زنجیریں تمہارے دین کی آزادی چھیننے پر آمادہ ہوں، تو اس وقت اگر تم اپنے دین، یعنی اپنے مخصوص تمدن و مخصوص تہذیب کے تحفظ کا یارا نہ رکھتے ہو تو بجائے اس کے کہ وہاں یہ کہہ کر کہ ہمارا کوئی مخصوص تمدن، کوئی مخصوص تہذیب نہیں۔ یہ کہہ کر کہ ہاں حضور! جیسا آپ فرماتے ہیں ہم پہلے ہندی اور اور بعد میں مسلمان ہیں۔ ذلت کی زندگی بسر مت کرو۔ اس وقت قرآن تم پر فرض کر دیتا ہے کہ ایسے وطن کی خاک کو پائے استحقار سے ٹھکرا کے اللہ کی وسیع زمین میں نکل جاؤ کہ ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست۔ اگر کشاف صاحب کے سامنے کہیں "تلاش حق" کی بجائے قرآن کریم ہوتا تو اُن کو نظر آجاتا کہ اس وقت جب کہ قرآن کریم نے ہجرت کا حکم دے رکھا تھا جب مسلمان نے اُس وطن مالوف کو نہ چھوڑا اُس کے متعلق کیسی کیسی سخت وعیدیں آگئیں، مسلمانوں کو کس طرح حکم دیا گیا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ تمہارا کوئی واسطہ نہیں جن پر شاید وطن کی محبت دین کی عزت کے مقابلہ میں غالب آگئی ہے۔ یہ ہے جناب کشاف! قرآن کریم کی تعلیم۔ اب خود فرمائیے کہ اس تعلیم کے حامل جناب نبی اکرمؐ۔ کیا یہ ارشاد فرما سکتے تھے کہ "حب الوطن من الایمان"؟

اس کے بعد ارشاد ہے کہ "اقبال کو یہ نہ سمجھو کہ وہ ایک بے خطر شاعر ہے، نہیں، وہ ایک عظیم الشان خطرہ ہے"۔

اس میں شبہ نہیں کہ اقبال (یعنی وہ پیغام جو اقبال مسلمانوں کو دے رہا ہے، اور جسے دوسرے لفظوں میں قرآن کہا جاتا ہے) ایک عظیم الشان خطرہ ہے۔ آج ہی خطرہ نہیں، ازل سے خطرہ چلا آرہا ہے، اور ابد تک خطرہ رہے گا۔ لیکن یہ خطرہ ہمیشہ کسی بولہب و بوجہل کے لئے ہے کسی صدیقؓ و فاروقؓ کے لئے تو کوئی خطرہ نہیں۔ پتہ نہیں جناب کشاف یہ خطرے کی گھنٹی کن کی طرف سے بجا رہے ہیں۔ ذرا کھل کر بات کیوں نہیں کرتے۔ اقبال واقعی ایک بڑا خطرہ ہے، ایسا خطرہ جیسا دربار فرعون کے ساحروں کے لئے عصائے کلیم خطرہ تھا، یا جیسے بتکدۂ نمرود کے لئے تیشۂ خلیل خطرہ تھا۔

پھر اپنے دعوے کے ثبوت میں کشاف صاحب فرماتے ہیں کہ دیکھو یہ اتنا خطرناک ساحر ہے کہ مولانا محمد علی مرحوم جیسے قوم پرست کا ایمان زندگی کے آخری لمحوں میں چھین کر لے گیا۔ اور آج مسٹر محمد علی جناح کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے بھی اپنے پیچھے لگا لیا۔ غنیمت ہے کہ آپ نے اتنا تو مان لیا کہ اقبال جو یہ کہتا ہے کہ۔

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور، اے ہمت مردانہ

وہ کالجوں کے بیکار لونڈوں کو اشتراکیت کی مزعومہ جنت کے چھلاوے دکھا کر پیچھے نہیں لگاتا۔ شیر کبھی چوہوں کا شکار نہیں کرتا۔[۲]

پھر ارشاد ہے کہ " اقبال میں ایک غالی قسم کا ثقافتی تعصب پایا جاتا ہے ؛ یعنی وہ اگر اسلام، مسلم، ملوتِ اسلامیہ، اسلامی تمدن وغیرہ پر لکھتا ہے تو جذبۂ تعصب کے ماتحت لکھتا ہے۔ کون سمجھائے کہ حضور! تعصب اور عصبیت میں بڑا فرق ہے۔ اقبال جو کچھ لکھتا ہے اسلامی عصبیت کے ماتحت لکھتا ہے جو عینِ اسلام ہے، روحِ اسلام ہے، ایک قابلِ فخر جذبہ ہے۔

تعصب اسے کہتے ہیں کہ جس میں عدل کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جائے اور دوسرے پر ظلم روا رکھا جائے۔ اور جو اقبال قرآن میں یہ کچھ پڑھتا ہے کہ :-

لا یجرمنکم شنآن قوم الا تعدلو۔ اعدلو　｛ کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم عدل کو ہاتھ سے چھوڑ دو۔ ہمیشہ عدل کرو

وہ تعصب کے کبھی قریب بھی آسکتا ہے۔[۳]

اس کے بعد کشاف صاحب ذرا کھل کھیلے ہیں، اور اپنے اصلی رنگ میں آنا شروع کیا ہے۔ فرماتے ہیں " شاعر مکلف ہے کہ دو چیزوں میں سے ایک کو ضرور خیر باد کہہ دے۔ یا اپنے مذہب کو یا اپنے مسلک شاعری کو، دونوں سے وابستہ رہنا خلوص و منافقت کا ایک نہایت غیر شاعرانہ نیز ایک نہایت غیر دیندارانہ معجون مرکب ہوگا "

اب بات ہوئی نا ٹھیک۔ اب پتہ چلا نا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی شاعری جو مذہب کی قیمت پر خریدی جائے جناب کشاف اور اُن کے ہم نواؤں کو مبارک، جنھیں پتہ ہی نہیں کہ مذہب کہتے کس کو ہیں۔ اقبال نے تو دنیا کو دکھا دیا کہ ایک مسلمان جب روحِ اسلام کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے تو کس طرح ادب، شعر، فلسفہ، حکمت، سیاست، اس کے پاؤں چومتی ہے۔[۴]

اس کے بعد پھر ایک دلچسپ بحث آتی ہے، جس میں نہایت بلند آہنگی کے ساتھ اعلان ہوتا ہے کہ اقبال جب ملّتِ اسلامیہ کو تحفظ کا پیغام دیتا ہے تو وہ دوسروں کی قوتوں سے ڈرتا ہے۔ وہ جب اپنے کلچر کو الگ رکھنے کی تجویزیں کرتا ہے تو اس لئے کہ اُسے خوف ہے کہ وہ دوسروں سے مل کر یہ کمزور کلچر فنا ہو جائے گا اگر وہ اپنے اسلامی کلچر کو مضبوط سمجھتا تو پھر ایسے اختلاط سے ڈرتا کیوں!

جناب کا ناصحانہ مشورہ سر آنکھوں پر۔ غالب ایسے ہی موقعہ کے لئے کہہ گیا ہے کہ ؎

ہوئے تم دوست جس کے اسکا دشمن آسماں کیوں ہو

بندہ نواز! اقبال اپنے تمدن، کلچر، مذہب کو اس لئے الگ نہیں رکھنا چاہتا کہ اُسے ڈر ہے کہ یہ مقابلہ میں آکر بچھڑ جائے گا۔ بقار للاصلح کے قانون کے ماتحت طاقتور سے دب کر فنا ہو جائے گا۔ وہ تو اس تمدن کو خدا کا آخری پیغام قرار دیتا ہے کہ جب تک اس کا خدا زندہ ہے یہ تمدن بھی زندہ رہے گا۔ وہ تو اس تمدن کو سخت سے سخت چٹان کے ساتھ ٹکرا دینے کے لئے تیار ہے۔ نہیں! وہ تو زندگی ہی اس ٹکرا دینے میں سمجھتا ہے، اس کی تعلیم تو یہ ہے کہ

میارا بزم بر ساحل کہ آں جا　　نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز　　حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

لیکن اُسے ڈر اس بات کا ہے کہ جو سینے آج اس تمدن و تہذیب کے حامل ہیں اُن کے قلوب میں وہ جذبۂ ایمان نہیں ہے جو اس تمدن کی حفاظت کے لئے سر کٹانے کے لئے اُنھیں تیار کردے۔ تہذیب و تمدن کی حفاظت ان کے حاملین کی قوتِ ایمانی کے مطابق ہوا کرتی ہے۔ وہ ڈرتا اس لئے ہے کہ اس تہذیب و تمدن کا مدعی روٹی کے ٹکڑے کے عوض شہرت کے چند نعروں کے عوض، برادرانِ وطن کی تحسین و مدح کی خاطر، اپنی اس متاعِ گراں بہا کو بلا دریغ بیچتا جا رہا ہے۔ وہ اس لئے ڈرتا ہے۔ نہ کہ اپنی متاع کے کمزور و کاسد ہونے کی وجہ سے ڈرتا ہے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ " پھر اگر ہم میں کچھ جان ہے تو دوسروں کے ساتھ گھلنے ملنے نقصان دہ نہیں ہوسکتا " بالکل بجا ارشاد ہے۔ لیکن رونا تو اسی کا ہے کہ ہم میں وہ جان نہیں رہی جس سے اس تمدن کی حفاظت کر سکیں۔ جان ہوتی تو " پہلے ہندی بعد میں مسلمان " کا ہندو نواز نعرہ بلند کیوں ہوتا۔ جان ہوتی تو اچھا بھلا سلام علیکم چھوڑ کر یہ ہاتھ باندھ کر ڈنڈوت کیوں کیا جاتا۔ اقبال بھی جان پیدا کرنا چاہتا ہے، اور جب تک جان پیدا نہیں ہوتی خطرہ کی آگ میں کودنے سے روکتا ہے۔ دل میں خلیل کا سا ایمان پیدا کیجئے پھر دیکھئے یہی اقبال آپ کو نمرود کی آگ میں اپنے ہاتھوں دھکیل دیتا ہے یا نہیں۔[۵]

بالکل بجا کہ آج کثیر تعداد ہندو " ترجمان القرآن " کو اپنے محبوب و محترم

مطالعے کی چیز بنائے ہوئے ہیں ۔"

لیکن میں پوچھتا ہوں کہ ۱۹۱۲ء کا الہلال بھی تو اسی ابوالکلام کا لکھا ہوا ہے کسی ہندو کے گھر سے اس کا بھی تو کوئی پرچہ نکال کر بتائیے۔ "ترجمان القرآن" کو ہندو محض پڑھتے ہی نہیں بلکہ اس کے اقتباسات کے ترجمے بھی اپنی زبان میں شائع کرتے ہیں۔ اگر آپ نے بات چھیڑ دی ہے تو آئیے یہ داستان بھی سنتے جائیے کہ یہ کس جذبے کے ماتحت ہوتا ہے۔ مولانا آزاد نے اپنے "ترجمان القرآن" میں سارا زور اس بات کے ثابت کرنے میں صرف کر دیا ہے کہ نجات و سعادت محض اسلام کے ساتھ ہی وابستہ نہیں بلکہ ہر ایک مذہب کا پرستار خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی سے ایسے ہی نجات حاصل کر سکتا ہے جیسے کوئی دوسرے مذہب والا۔ ترجمان القرآن جلد اول کی اشاعت کے تھوڑے عرصے بعد مہاتما گاندھی جی نے دہلی کے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ہال میں لکچر دیا اور اس میں فرمایا کہ میں ایک عرصے سے خیال کرتا تھا کہ اسلام نجات کو محض اپنے تک ہی محدود نہیں رکھتا ہوگا، بلکہ دوسرے مذاہب کے اتباع میں بھی نجات کا قائل ہوگا۔ لیکن مجھے اس خیال کی تائید نہ ملتی تھی اب جو مولانا آزاد نے "ترجمان القرآن" لکھا تو اس سے میرے خیال کی زبردست تائید ہوگئی۔ چنانچہ ہم نے اُن کی اس کتاب کے ضروری حصوں کا ترجمہ گجراتی میں بھی شائع کیا ہے۔" اور اس کہنے کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان جب غیر مذاہب میں تبلیغ اسلام کرتا ہے تو اس بنا پر کرتا ہے کہ آؤ تمہیں نجات کا راستہ بتائیں۔ حالانکہ نجات تمام مذاہب میں یکساں ملتی ہے۔ لہٰذا مسلمان کی تبلیغ محض ایک آڑ ہے۔ ورنہ وہ در اصل اس بہانے اپنی تعداد بڑھانا چاہتا ہے، اور یہ یکسر سیاسی غرض ہے۔

اب سمجھے آپ کہ مولانا آزاد کے ترجمان القرآن کو کیوں ہندو اپنے محبوب و محترم مطالعے کی چیز بنائے ہوئے ہیں۔ اس سے وہ ثابت یہ کرتے ہیں کہ مسلمان تبلیغ میں مذہب کی آڑ لیتا ہے، ورنہ اس کا مقصد محض سیاسی ہے۔ ہندو اگر اپنا تمام زور اس بات میں صرف کر دیں کہ کسی طرح اچھوت اقوام مردم شماری کے رجسٹر میں اپنا نام ہندوؤں کے خانے میں لکھوائیں تو یہ تمام مساعی مذہب اور انسانیت کی ہمدردی کہلائیں۔ اور اگر مسلمان دوسروں کو صراطِ مستقیم کی طرف لانا چاہے تو یکسر سیاسی غرض قرار دی جائے۔ یہ ہیں آپ کی وطنیت و قومیت کے مظاہرے[۱۱] ۔

آپ کو خالد بن ولیدؓ کا یہ قول تو یاد رہا کہ اگر میرے گھوڑے کے سم ذرا درست ہوتے تو پھر اور تماشا دکھاتا۔ لیکن یہ واقعہ آپ کو کیوں یاد رہنے لگا تھا کہ جب یہی خالدؓ حضرت عمرؓ کے سامنے شامیوں کے لباس میں آئے تو اتنے عظیم الشان فاتح اعظم، بطل حریت کے علو مرتبت کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے کہدیا کہ خالد ابھی سے اپنے شعائر ملت کو ترک کر کے غیروں کی وضع قطع اختیار کر لی۔ اور اُس وقت تک ان سے بات نہیں کی جب تک وہ عربی لباس میں سامنے نہیں آئے۔ کیا خیال ہے آپ کا کہ اس "پھندنے دار ٹوپی، اور کھڑے پاجامے" کے تسخر کا، کہ جسے آپ کے قوم پرست ایسے فخر سے اُچھالتے پھرتے ہیں، حضرت عمرؓ کی بارگاہ سے کیا جواب ملتا! یا اگر خالدؓ "گاندھی ٹوپی پہنے، ہاتھ باندھ کر نمسکار کرتے ہوئے سامنے آتے تو ان سے کیا سلوک ہوتا؟"[۱۲]

اس کے بعد اقبال پر اعتراض ہے کہ وہ کیمونزم کا مخالف کیوں ہے حالانکہ یہ وہ نظریہ ہے جس کے "زیرِ عاطفت فرشِ زمین پر پہلی جنتِ ارضی قائم ہوئی"۔

اشتراکیت دنیا میں ایک عرصے سے موجود تھی، کسی قوم پرست مسلمان کو خیال تک نہ آیا کہ اس جنتِ ارضی، اس فردوسِ گم گشتہ سے جہنم زار ہند کو متعارف ہی کرا دیں، لیکن اب جو صدر کانگریس بیکار نوجوانوں کے بہلانے کا ایک کھلونہ روس سے لے آئے تو یہ حضرات بھی لگے اشتراکیت کا گیت گانے۔ اقبال کو اشتراکیت پر اعتراض یہ ہے کہ "برمساواتِ شکم دارد اساس"۔ اس کے جواب میں جناب کشاف کی تحقیق انیق سنئے اور جی بھر کر داد دیجئے، فرماتے ہیں کہ اگر یہی طعن ہے تو یہ تو "بمراحل سنگین تر صورت میں جناب صدیق اکبرؓ کے مسلک پر پڑتا ہے"۔ کیوں کہ اُنھوں نے زکوٰۃ نہ دینے والوں کے خلاف جہاد کیا تھا۔

کہتے ہیں کہ عقل کی کوئی نہ کوئی آخری حد ضرور ہوتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جہالت کی کوئی آخری حد نہیں ہو سکتی۔ اور جناب صدیق اکبرؓ کے اس عمل سے اشتراکیت کی سند لانا اس کی زندہ دلیل ہے۔ فرماتے ہیں کہ "وہاں سارا نظام اسلام ہی زکوٰۃ ـــــ شکم ـــــ پر معلق تھا"۔ زکوٰۃ اور شکم کو مرادف سمجھنا یا تو اس بات کا آئینہ دار ہے کہ جناب کشاف اقبال کے "مساواتِ شکم" کے ٹکڑے کو سمجھے ہی نہیں، یا انھیں پتہ ہی نہیں کہ زکوٰۃ

کیا ہوتی ہے۔ ورنہ زکواۃ کو مساوات شکم کہنا اگر قرآن کا مضحکہ اُڑانا نہیں تو اور کیا ہے۔ حضور! زکوٰۃ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص کی جائداد اور اموال کو اس کی ذاتی ملکیت سمجھا جائے۔ اور اس ملکیت میں اختلاف مدارج کو جائز رکھا جائے اور اس کے بعد ان مالکانِ جائداد و اموال سے زرِ زکوٰۃ بطور ٹیکس وصول کیا جائے۔ یہ ہے اسلامی نظریۂ زکوٰۃ۔ بھلا فرمایئے کہ اس کو روس کی اشتراکیت یعنی "مساوات شکم" سے کیا تعلق ہے؟

اب آیئے آپ کو ایک جھلک اس اقبال کی دکھاؤں جس کے خلاف جناب کشاف نے اس قدر زہر اُگلا ہے۔ کشاف صاحب ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے مداحوں میں سے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ تحریک وہ ہے جس کے متعلق ابھی تک یہی فیصلہ نہیں ہو سکا کہ اس کا بالآخر نصب العین کیا ہے۔ آج تک کوئی شخص سوراج کے معنی بھی متعین نہیں کر سکا۔ اس کے برعکس اقبال کو دیکھئے کہ کس قدر واضح الفاظ میں غلامی کی لعنت کے خلاف جہاد کرتا ہے۔

اقبال سب سے بڑا شکوہ جو خدا سے کرتا ہے وہ یہ ہے، ع

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

پھر وہ محکوم و آزاد کا فرق کس قدر دلنشین لیکن پُرزور الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال	کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت	محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منوّر	محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

وہ ایسے مذہب اور ایسے مدعیانِ مذہب کو جو مسلمانوں کو غلامی پر رضامند بناتے ہیں، دور سے سلام کرتے ہیں، وہ لوگ جو

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

دوسری جگہ لکھتے ہیں

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں قوموں کو غلامی کے طریق

دیکھئے وہ کس حسرت و تاسف سے یہ گلہ کرتے ہیں کہ

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھکو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

وہ محکوم کے الہام کو بھی درست نہیں سمجھتے۔

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

حتیٰ کہ

ہو اگر قوتِ فرعون کی دریردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی

اب ظاہر ہے کہ جب علامہ اقبال آزادی کا ایسا کھلا کھلا درس دے رہے ہیں تو وہ ہندوستان کو کیسے غلام دیکھ سکتے ہیں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مسلمان آزاد ہو جائیں اور ہندوستان غلام رہے۔ لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہندوستان آزاد ہو جائے اور مسلمان غلام کا غلام رہے، اور جو تیور برادرانِ وطن کے ہمارے سامنے ہیں اُن سے یہ شبہ یقین کی حد تک پہونچ رہا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان کے آقا کا نام بدل جائے۔ اور اس جدید غلامی میں اس کی یہ حالت ہو جائے کہ اپنے مخصوص تمدن و مذہب کی الگ حیثیت بھی قائم نہ رکھ سکے۔ علامہ اقبال یہ نہیں دیکھ سکتے۔ وہ ایسی آزادی کے تخیل کو دامِ فریب سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ وہ آج بھی برملا کہتے ہیں کہ

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

وہ ہندوستان میں صرف سجدے کی آزادی نہیں چاہتے، بلکہ اسلام کی آزادی چاہتے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ اسلام کی آزادی اس روش سے تو حاصل نہیں ہو سکتی جس پر آپ کی قومیت پرستی۔ تحریک آزادی کے علمبرداروں کے جلو میں پیچھے چلی جا رہی ہے؟

یہ تو تھا جناب کشاف کی غلط فہمیوں کا ازالہ! لیکن میں تو اس قصے کو بہت مختصر کر دینا چاہتا ہوں۔ میں نے جہاں جہاں اقبال لکھا ہے اُس سے مفہوم پیامِ اقبال ہے، اور میرے نزدیک یہی پیامِ اسلام ہے! تو اب مسئلۂ مابہ النزاع یہ رہا کہ آیا اسلام، یعنی قرآن، موجودہ قومیت پرستی اور اشتراکیت کا مؤید ہے یا مخالف! اس کیلئے میں جناب کشاف

کو، اور اُن کے ساتھ اُن کے تمام مسلمان قوم پرست حضرات کو کھلا کھلا چیلنج دیتا ہوں کہ ان میں سے کوئی بھی آگے بڑھے، اور قرآن کریم سے یہ ثابت کر دکھائے کہ یہ دونوں تحریکیں، یا انہیں سے کوئی ایک، قرآن کریم کے مطابق ہے؟ اور میں ثابت کروں گا کہ یہ دونوں تحریکیں یکسر قرآن کریم کے مخالف ہیں! اک مسلمان کے لئے قرآن سے بڑھ کر اور کوئی حجت نہیں ہو سکتی اور اگر آپ حضرات قرآن کے مطابق فیصلے کے لئے تیار نہیں ہیں تو پھر سمجھ لیجئے کہ آپ کو مسلمان کہلانے کا کس حد تک حق پہنچتا ہے؟ دو لفظوں میں بات ختم ہو جائیگی، اور خود پتہ چل جائے گا کہ کون راستی پر ہے اور کون فریب میں مبتلا ہے؟ ورنہ یوں اقبال کا نام لے لیکر ملت اسلامیہ کا مضحکہ اُڑانا کہاں کا اسلام ہے؟ میں منتظر ہوں کہ وطنیت کے حامیوں میں سے کون یہ چیلنج قبول کرتا ہے؟ "وادعوا شهداء كم من دون الله ان كنتم صادقين؛"

استدراک منجانب "کشاف"

جناب "رازی" کا منقولۂ بالا مضمون کسی قدر تاخیر کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس اثناء میں بہت سے دوسرے مضامین تھے جن کا حق اشاعت ازروئے ترتیب وصول مقدم تھا! خود ہم اقبال پر اپنی تنقید کو انہی ناگزیر مداخلتوں کی وجہ سے جاری نہ رکھ سکے، اگرچہ زیر بحث افتتاحی قسط میں اُس کے آئندہ اجزاء کے بہ تسلسل نکالنے کا وعدہ کیا گیا تھا! اب جب کہ خود ہم کو بھی اِس موضوع کی طرف بازگشت کرنے کی غالباً فرصت ملنے والی ہے۔ ہم حضرتِ رازی" کے مضمون کو اشاعت کیلئے "رہا" (release) کرکے اپنے اِس متروک مذاکرے کا دوبارہ آغاز کرنا چاہتے ہیں! زیرِ استدراک مضمون کے متن میں جابجا نمبر لگا دئے گئے ہیں، اور اُنہی کے حوالے سے ہم "رازی" صاحب کے شکوک کا دفعیہ، —— یا بالقصد غلط تعبیری اور کج فہمی کا ازالہ! —— کرتے ہیں:

(۱) یہ کس درجہ قابلِ رحم بات ہے کہ کشاف کے اعتراضات کا جواب بجز اِس کے ممکن ہی نہیں ہے کہ آپ اُس کے نقطۂ نظر کو پہلے درہم برہم کرلیں، اور پھر اِس متغیر شدہ خیال کو ہدفِ مضحکہ بنائیں! ہم نے کہیں نہ اقبال کے "شاہینِ تخیل" ایسی کوئی "بے پرکی" اُڑائی ہے نہ اُن کے "بالِ جبریل" کی کسی "کائنات پیمائی" کی شکایت کی ہے! ہماری عرض و معروض تو صرف اِتنی تھی کہ:

تیرے لب پر ہے حدیثِ شام و مصر و روم و چین
لیکن اپنے ہی وطن کے نام سے واقف نہیں!
کون کہتا ہے زمین و آسماں تیرا نہیں   سب جہاں تیرا اگر ہندوستاں تیرا نہیں؟

یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ "وادین" طنز و طعن کے "تیر و سنان" کیونکر بن جا سکتے ہیں! البتہ اپنی ہی ریشِ مبارک کے "تنکوں" کی خلش کے لئے تو اپنا ہی مرہونِ منت ہونا چاہیئے! —— ہاں کشاف کسی ایسے "فنِ تنقید نگاری" سے یقیناً آشنا نہیں جس کا کلمۂ اول "يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ" ہو!

جنابِ "رازی" اپنے مقالے کی شانِ امتیاز کے متعلق فرماتے ہیں کہ اُس میں "موافقت ہے تو اُصولی، اور مخالفت ہے تو اصولی"! ——

غالبًا یہ اُسی مُلّایانہ خودستائی کی آواز ہے کہ "البغض فی اللہ والحب فی اللہ" —— کیوں نہو! اِن پاکبازانِ تقوی و طہارت کے بُغض کے لئے بھی خدا ہی ذمہ وار ہے! مبارک ہو ان بزرگوں کو اپنا "بُغض للہی"!

(۲) "بھارت ماتا" کے کلۂ محبت و عقیدت کا طعن بیہودہ ہے! آپ کی "ارضِ مقدس" اور "بیت المقدس" اِسی حُبِ دینی و وطنی کے "عربی جامے" نہیں ہیں تو کیا ہیں؟ پھر "کنوئیں کے مینڈکوں" کی آپ کے ہاں بھی کمی نہیں! لسان العصر کہتے ہیں:

حالِ دنیا سے بے خبر ہیں آپ   گو تقدس مآب بیشک ہیں!
"شیخ جی" پر یہ قول صادق ہے   "چاہِ زمزم" کے آپ "مینڈک" ہیں!

اقوام کی عام بیماریوں کو کسی ایک قوم سے وابستہ کردینا خود اک بیماری ہے! —— "لا یسخر قوم من قوم، عسی ان یکون خیر منھم!"

علامہ اقبال کی ستارہ شناسی، افلاک و سموات کی حدود و ثغور پیمائی، قلبِ ذرہ کی "سرجری" وغیرہ وغیرہ پر اگر ہماری زبان نہ کھلوائی جائے تو اچھا ہے! —— أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ، وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ؟

(۳) جنابِ "رازی" کو باوجود "صاحب الاسرار" ہونے کے معلوم نہیں کہ کشاف "مسلمان ہیں یا غیر مسلم؟ ——— لیکن ہو تو کیونکر ہو؟ اس کے لئے ضرورت تھی کشاف کے نام کے اعلان کی، اور اُس کی ترکیب ہجا میں "عربی" یا کم از کم "فارسی" الفاظ کی! بیسویں صدی کا مسلمان تو "نام" سے پہچانا جاتا ہے، نہ "کام" سے! حضرتِ "رازی" کو یہ رمز کون "غیر مسلم" بتا سکتا ہے کہ "مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِلَّا اَسْمَاءً سَمَّیْتُمُوْھَا اَنْتُمْ وَ آبَاءُکُمْ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطَانٍ"!!

(۴) جنابِ "رازی" کی اگر ان ساری روایتوں اور تعبیروں کو قابلِ اعتماد فرض بھی کر لیا جائے تب بھی غالب اور فیصلہ کُن سُوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ہندوؤں کی "تخویف" ہے یا مسلمانوں کی "خوف زدگی"! جذب کر لینے یا ہجرت کر جانے کا مطالبہ کرنے کا معاملہ اس قدر مکروہ و شنیع نہیں جس قدر کہ جذب ہو جانے یا ہجرت پر مجبور ہونے کا اندیشہ شرمناک ہے! ———

رازآشنایانِ "حقیقت کا اسلام، اور ایسا لرزہ براندام؟! ———

آپ جوابًا ہندوؤں کو اِس سے خوفناک تر چیلنج کر سکتے ہیں، لیکن مردی و مردانگی آپ کو اپنی ہی قلب و سینہ سے بہم پہنچانی پڑے گی! ؎

گر خداداری، ز غم آزاد شو | از خیالِ بیش و کم آزاد شو!
ہر کہ رمزِ "مصطفٰے" فہمیدہ است | شرک را در خوف مضمر دیدہ است!

(۵) "رازی" صاحب افسوس ہے کہ بالکل طفلانہ جذبات اور "دین الحجاز" کی رَو میں بہہ گئے! خانہ سازِ "رمز و راز" کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا! اچھا فرمائیے جناب، کیا یہ "خاکِ حجاز" ہی نہ تھی جس کی افتادِ بد یہ تھی کہ:

"ابلجی" در دشتِ خویش از راہ رفت | از دمِ او سوزِ الا اللہ رفت!

پھر کیا یہ "کفر زارِ خاکِ تتار" ہی نہ تھی جس کی ایمان پروری کا یہ ماجرا تھا کہ ؎

حرم رُسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے!
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے!

؎ غیرِ ہندوستان کُشِ عشقِ حجاز سے کس کو پرخاش ہو سکتی ہے؟ خود "محبوبِ عرب" کی "الفتِ ہند" کیا ہم کو فراموش ہی ہو گئی؟! ؎

"میرِ عرب" کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے | میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے!

حجاز و حرمین کی عقیدت میں "حاجیانہ "رطب اللسانی"، ہمیں خوف ہے کہ بڑا ارزاں اسلام ہے ؎

حاجی بَرہِ کعبہ رواں، کیں رہِ دین است
خوش میرود، اما رہِ مقصود نہ این است!

"ویدوں کے استھان" پر کیا طعن ہے، جبکہ آپ کے ہاں بھی "ارض القرآن" والا ایسا ہی اک کلمۂ سحر موجود ہے! "کشاف" اقبال کی آرزوئے شہادت فی الحجاز کے ساتھ اتنی غیر ہمدردی کرنا نہیں چاہتا تھی کہ خود اقبال مدفونیتِ ہند کو "تا قیامت زنجیریٔ بت خانہ" سے تعبیر کر کے بے شمار اولیاء و انبیائے آسودۂ خاکِ ہند کی ارواحِ جلیل کی ناقابلِ برداشت بے ادبی کا مرتکب ہوتا ہے! شاید ہم "رازی" صاحب کو یہ بات نہیں سمجھا سکتے کہ کوئی خاکِ لحد کسی میت کی "شفیع" نہیں ہو سکتی، بلکہ خود مدفن، مدفونوں کے تقدس سے مقدس ہوا کرتے ہیں! ؎

بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشتِ خُم رکھ دیں
جہاں ساغر ٹپک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے!

"رازی" پر کشاف کے ایمان و اسلام کے بارے میں بار بار "ظن المومنین خیرا" کی کیفیت کا نزول ہوتا ہے! کس کو خبر ہے کہ جس دن رازی صاحب کشاف کے اسلام پر ایمان لائیں گے خود کشاف اپنے ایمان سے مشکوک ہو جائے گا!!

کرتے ہیں "فقیہہ" اگر مذمت تیری | کر شکر کہ ثابت ہوئی عصمت تیری
پر مدح کریں وہ گر نصیبِ اعدا! | رکھ یاد کہ حالت نہیں اچھی تیری!

(۶) یہاں حضرتِ "رازی" نے اک "محدث" کی قبا اوڑھ لی ہے! ہمیں اس نزاعِ لفظی میں کوئی اصرار نہیں کہ "حب الوطن من الایمان" کوئی حدیثِ نبوی ہے یا نہیں، تاہم اتنا ضرور ہے کہ جنابِ "رازی" اگر اس معاملے میں کوئی ثقہ راوی ہیں تو ہمارے اِس تسامح میں بعض اکابرِ علم و ادب تک شریک ہیں! مُسدسِ حالی کا یہ شعر قابلِ حوالہ ہے کہ ؎

یہ تھا تھا گویا کہ حصہ انھیں کا
کہ "حب الوطن" ہے "نشان مومنیں کا"

تاہم جب آنحضرتؐ کی زبانِ صدق کئے کو وطن "عزیز" فرماتی ہے تو خود یہی کیا کم معنی خیز ہے؟! خود "رازی" صاحب اِس کو "اک پتے کی بات" کہتے ہیں!

کیا بقولِ اقبال "وطن کا صنمِ کبیر" حبیبِ خدا کو "بہت ہی محبوب" ہو سکتا تھا؟!
ہمارا خیال ہے کہ "حب الوطن من الایمان" اسی حقیقت کا اک دوسرا پیرایۂ اظہار ہے! جب اسلام میں "ہمسائے" کے حقوق کی وسیع دامانی و دور رسی کا یہ حال ہے کہ بروایتِ صحابۂ کرام "ہمسائے" کے مثل رکنِ خاندان" وراثت میں شریک کر دیے جانے کی توقع تنزیلِ شریعت کے دوران میں کی جا رہی تھی، تو وسیع وطن کی ہمسائگیٔ کبریٰ کے، خالص اسلامی مقتضیات کیا کچھ کم نہ ہونے چاہئیں؟! آخر یہ اسلامی ثقافت کی فضا ہی تو تھی جس میں "حب الوطن من الایمان" کا مقولہ خود رو پیدا ہو گیا! ایسے اہم و مقدم معاملے کو ملّایانہ "روایت و درایت" کے پھاک میں پھنسا دینا حضرتِ "رازی" ہی کی طرح کے کسی "غیر محرم مقیم حرم" کا "شغلِ جدل" ہو سکتا ہے! ؎

ازخطیب و دیلمی گفتارِ او
با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ او! (اقبال)

پھر سرزمینِ وطن میں اگر کچھ خطرات ہوں بھی تو خود یہ خطرات قابلِ احتراز ہونے چاہئیں، نہ کہ خود "وطنِ مالوف" مستوجبِ پرہیز ہو جائے! اس اندیشہ، والفت میں اک توازن ملحوظ رہنے کی ضرورت ہے، ایسا نہیں ہو سکتا کہ ادھر پردیس میں پتا کھڑکا، اور آمادۂ ہجرت مسلمان اپنے اہل و عیال کو چھوڑ دیوار پھاند، "مہاجر فی سبیل اللہ" ہو گیا: نظامِ اسلام کا ادارۂ ہجرت ایسے ہولِ دل کا مسلکِ ترک و فرار نہیں: مہماتِ مسائلِ دینی سے ایسا طفلانہ لعب "رازیوں" ہی کے لئے اک وجہ تفریح ہو سکتا ہے، کسی مردِ مسلمان کے لئے قابلِ فخر نہیں! ؎

گردن بنہ گر خصم بود رستمِ زال!
منت منہ گر دوست بود حاتمِ طے!

ہم اس سے انکار کرتے ہیں کہ خدانخواستہ ہندوستان میں اسلام کو ایسا کوئی لرزہ بر انداز خطرہ درپیش ہے! "رازی" صاحب کو اسلام کے خطرے اور دور افتادۂ اسلام مسلمانوں کی ذاتی بزدلی میں فرق کرنا چاہیے! اگر آٹھ کروڑ مسلمانانِ ہند، معدودے چند ہندو مسلم فسادات سے ایسے وحشت زدہ ہوں گے کہ رسیاں تڑا تڑا کے ایران و ترکستان میں جا کر دم لیں گے، اور متحرک لاشے بنے ہوئے فلسطین و حجاز میں ایک ایک "گوشۂ قبر" مانگنے لگیں گے تو خوف ہے کہ ساری ارضِ مقدس اور جزیرۃ العرب ان "بھگوڑوں" کو پناہ دینے سے اپنا دامن تنگ پائیں گے! عرب و شام و فلسطین آج سر سے کفن باندھے ہوئے مجاہدینِ اسلام کی لالہ زار جہادگاہیں ہیں، وہ جنابِ رازی کی سرکردگی میں ہندوستان سے فرار کرنے والی ہندی مسلمانوں کی "فوجِ ظفر موج" کا خیر مقدم کرنے سے اپنے کو معذور پائیں گے! اللہ اللہ مسلمان مہاجرین کے "عساکرِ قاہرہ" کا جلوسِ شجاعت مانوس! ؎

جو میداں سے بھاگوں بصد احتشام!
تو رستم ہو آ کر مقابل نہ سام!

پھر اس ذہنی خیرگی اور قلبی دہشت زدگی میں یہ حقیقت فراموش نہ ہو کہ ہجرت، اسلام میں غایت درجہ فوق العادت "ایمرجنسی اسٹیٹ" کا اک چارۂ کار ہے، اپنے ہولِ دل کے تقاضے کی کوئی دینی تفریح نہیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، با صد ہزار دلِ ناخواستہ، وطنِ عزیز کو تحریکِ ہجرت کے سلسلے میں خیرباد کہہ دینے کا فقہی استنباط اگر یہی ہے کہ یہ وطن "متروک" ہونے کے ساتھ ساتھ "مردود" بھی ہو گیا، تو داعیٔ اسلام کو تو مکۂ معظمہ کے علاوہ خانۂ کعبہ بھی چھوڑنا پڑا تھا، اب اسی بے پناہ تفقہ فی الدین کے تحت اگر یہ مسئلہ بھی استخراج کیا جائے تو کونسا منطق مانع ہے کہ وطن کے قیام کے تکلیف دہ ہونے کی صورت میں "بیت اللہ" کو بھی دور سے سلام اک سنتِ پیغمبرِ اسلام ہے! —— کیا جنابِ رازی اک مسلمان سے یہ بھی سعادت انجام دلوا کر، علامہ اقبال کی زبان میں اسے یہ دعوتِ حقہ دیں گے کہ ع

دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی؟!

"رازی" بن جانے اور "راز آشنائے حقائقِ اسلامی" ہونے میں بڑا فرق ہے! ؎

رازِ درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس
کیں حال نیست "رازیٔ" عالی مقام را!

(۷) "رازی" صاحب یہاں اقبال کے پیام کا "طبل بلند بانگ" بڑے زور سے پیٹتے ہیں! معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت خاتم النبیین کے الہامی اسم "احمد" (مذکورِ صحفِ سابقہ) پر جناب مرزا صاحب قادیانی نے ڈاکا ڈالا، اسی طرح مولینا جلال الدین رومیؒ کی مثنویٔ معنوی کے لقب

"قرآن در زبانِ پہلوی" ـــــــ پر پرستارانِ اقبال دستبرد کرنا چاہتے ہیں، اور اِس جامۂ بزرگ کو اقبال کی "اسرارِ خودی" و "رموزِ بیخودی" کی "قامتِ کہتر" پر چسپاں کرنا چاہتے ہیں! ـــــــ ہم اِن "گواہانِ چست" کو کچھ "مدعیٔ سُست" کا "اقبال و اعتراف" بھی سُنانا چاہتے ہیں! ملّا جلال اور ڈاکٹر اقبال کے تقابل پر خود اقبال کا اعلان گوشگذار فرمائیے:

باز بر خوانم زفیضِ "پیرِ روم" دفترِ سربستہ، اسرارِ علوم
جانِ اُو از شعلہا سرمایہ دار من فروغِ یک نفس مثلِ شرار!

بااینہمہ جنابِ "رازی" کے ادعا میں اقبال کے منہ پر یہ شعر بھی کھٹکتا ہے کہ ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ!

اقبال کے "عصائے کلیم" اور "تیشۂ خلیل" کو "رازی" صاحب اگر اقبال ہی کی زبان سے سُن لیتے تو اچھا تھا! اقبال شاید اپنے انہی "تحسین گوئے ناشناس" سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری، تو قتیلِ شیوۂ آذری
مرا عیش غم، مرا شہد سم، مری بود ہمنفسِ عدم
ترا دل حرم، گروِ عجم، ترا دین خریدۂ کافری!

یہ دل و دماغ، بوجہل و بولہب کے لئے بھلا کیا خطرے کا باعث ہوسکتا ہے! اور اُس کے اندر حضرات صدیق رضؓ و فاروقؓ کی خوش نظری کے لئے کون سی ادائے جمال و شانِ جلال موجود ہے؟! ع

جامی! چہ لاف میزنی از پاک دامنی؟!

جنابِ "رازی" کی "گومگو" کو اب شاید معلوم ہوا ہوگا کہ "کشاف" کیسی "دانشگاف" گفتگو کرنے کا اہل ہے، اگر اُسے "پورت کندہ گوئی" کی خطرناک تحدی کی جائے!! ع

آں نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشت من!

"اشتراکیت کی مزعومہ جنت" اور "کالجوں کے بیکار لونڈوں" کے بدمذاق و ارزاں طعن ممکن کیا، واقعہ ہے کہ "کالج کے کبھی کے نکالے ہوئے پیرانِ نابالغ" کو پروپگنڈا بازانہ قلم فرسائی کی فتوحات کی "جنتِ نقد" بخشنے میں بڑے فاتحکار ثابت ہوئے ہوں۔ لیکن "مطمئن شکم اور گلفشاں زبانیں" اب زیادہ دن اپنے لئے یہ کامجوئیاں مقدر نہیں رکھتیں! ؎

ہے تو کچھ اُکھڑا ہوا بزمِ حریفاں کا رنگ
اب یہ شراب و کباب دیکھئے کب تک رہے!

(۸) تعصب ہو یا "عصبیت" اک شاعرِ بشریت اور اک "ترجمان القرآن" کو ہر دو سے بالا و برتر ہونا چاہئیے ہمارے "امام رازی" صاحب مناسب ہو کہ اس حدیثِ نبوی کی تفسیر فرمائیں کہ "لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا إِلَى الْعَصَبِيَّة"!!

علامۂ اقبال کی زبان پر آیاتِ قرآن کی مسلسل تلاوت کے مفروضہ فیضان کو "رازی" صاحب نے کچھ ایسے لہجۂ ادعا میں بیان کیا ہے کہ گویا اُن کی زود اعتقادی حضرتِ اقبال کے متعلق ہمیں یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ "كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنْ"! الغرض عصبیت، اور اسلامی؟! قرآن میں بجائے اس کے "حمیۃ الجاہلیۃ" کی ترکیب آئی ہے!

(۹) "کشاف ہمیشہ سے کھلا ہوا" ہے، پردہ داری و رازداری اگر ہوگی تو "رازی" میں! ہاں کوئی شاعری کو "مذہب کی قیمت میں" نہ خریدے، لیکن مذہب بھی شاعری کی قیمت میں خریدا نہیں جاسکتا! اقبال کا موقف یہاں ایسا پایا جاتا ہے کہ "مذبذبین بین ذٰلك! لا الٰی هٰؤُلاءِ ولا الٰی هٰؤُلاءِ"! ـــــــ پھر عہدِ جدید کی ارتقا یافتہ شاعری تو عین وسیع المشرب دین الفطرۃ، اسلام، ہی کی ہمصفیر واقع ہوئی ہے! سچ یہ کہ اقبال جب دوسروں کو مایوس کرتا ہے "تو شعر و اسلام" کی غلط تعبیری پہلے کرتا ہے! آخر ٹیگور بیک وقت ایک بین الاقوامی شاعر اور ہندو مذہب کی "وشوا بھارتی" (حکمتِ آفاق) کا عالمگیر مفسر کس طرح ہے؟ اعلیٰ شاعری اور اک دینِ حق کا پیام ہم آہنگ ہو جاتے ہیں! "اِنَّ من الشعر لحكمة وان من البيان لسحرا"!

(۱۰) "رازی" صاحب اس "سرِ مخفی" کو فاش کرتے ہیں کہ "جب تک خدائے اسلام زندہ ہے، تمدنِ اسلام پائندہ رہے گا"! تاہم چند ہی سطروں کے بعد "فقدانِ حافظہ" عارضِ حال ہوتا ہے کہ فرماتے ہیں کہ تہذیب و تمدن کی حفاظت اُن کے حاملین کی قوتِ ایمان کے مطابق ہوا کرتی ہے! ـــــــ ہمارا مشورہ ہے کہ پہلے "رازی" صاحب، بمعیت علامۂ اقبال اسلام کی بقا کے فریضے کو خدا اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرنے کے

کسی ریاضیاتی اُصولِ تناسب کو متعین فرمالیں! بصورتِ ابہامِ حقوق و فرائض، ممکن ہے خدا اِس ذمہ داری کو مسلمانوں کو تفویض فرمائے، اور مسلمان "بمجوائے" عطائے تو بہ لقائے تو"، اِس عطیۂ الٰہی کو "بنامِ اللہ جلّ شانہٗ" واپس "ہبہ" کردیں! ـــــ ہمیں مرزا غالب مرحوم کا وہ واقعہ یاد آرہا ہے کہ جب وہ ایک دفعہ ریاست رامپور گئے تو تین چار روز تک تو نواب صاحب نے التفات نہ فرمایا، اور اُس کے بعد شاہانہ شکار کے لئے خیمہ و خرگاہ تیار ہونے شروع ہوئے! نواب صاحب نے روانگی کے وقت میرزا صاحب سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ" اچھا میرزا صاحب! فی امان اللہ! سپرد بخدا!" ـــــ غریب غالب کی زبان نے اِس ستم ظریفی کی یوں داد دی: "جو حضور کی مرضی! مگر خدا نے تو مجھے آپ کے حوالے کیا تھا، آپ اُلٹا مجھے خدا کے حوالے فرماتے ہیں!" ع

گدا، بر ند کہ ایں بندہ را خدائے نیست!

"جذبۂ ایمان سے ویران" اسلامی سینوں کے علی الرغم" ثقافتِ اسلامی" عجائب خانوں اور قبرستانوں میں اِسی شان سے "زندہ و پائندہ" رہ سکتی ہے کہ "مسلمانان در گور و مسلمانی در کتاب!" ـــــ پھر یہ معما سمجھ میں نہ آیا کہ ہندوستان کے "فرزندانِ توحید" کی تجدیدِ ایمان کی رسمِ سعید میں ہندو کس طرح حائل ہیں؟! ؎

"رازیؔ" از دستِ غیر نالہ کند

"سعدیؔ" از دستِ خویشتن فریاد!

(۱۱) "رازی" صاحب چیلنج فرماتے ہیں کہ" ۱۹۱۲؁ء کا الہلال بھی تو کسی ہندو کے گھر سے نکال دیجئے!" ـــــ ہم نہایت ناچار و مغموم ہوکر جواب دیتے ہیں کہ "جب "رازی" صاحب نے پہلے ہی سے ۲۵ کرور ہنود ہندوستان کے ایک ایک گھر کی "خانہ تلاشی" لے لی ہے، اور الہلال کے دَورِ اوّل کا اک پُرزہ کہیں نہ پایا تو اب ہمیں اِس جستجوئے مکرر کی بیہودہ زحمت میں کیوں ڈالتے ہیں؟! مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ اِس عظیم الشان کمیشنِ تحقیقات میں جو حکومتِ ہند کی سی۔ آئی۔ ڈی۔ نے شاید "رازی" صاحب ہی کی سرکردگی میں انجام دیا، ہم آپ سے وہ "مصدقہ سرٹیفکٹ خانہ تلاشی" طلب کر بیٹھیں! "فاتوا برھانکم، ان کنتم صادقین"!

ـــــ واللہ، یہ اسلام کی کتنی بڑی بدبختی ہے کہ دہا تما گاندھی کو اُس کی کسی وسیع المشربی کا انکشاف و اعتراف ہو! اور مولانا ابوالکلام کی تفسیر القرآن کے اجزاء کا ترجمہ و اشاعت گجراتی زبان و علاقے میں کیا جائے! اگر دنیا محض "خدا پرستی و نیک عملی کی زندگی" پر قانع ہو جائے گی تو پھر میر غلام بھیک "نیرنگ" و غیرہم کے شغلِ تبلیغ کے لئے کیا رہ جائے گا؟ کیسی مصیبت ہے کہ اب لوگ "صرف خدا کے پرستار اور نیکوکار" ہوا کریں گے، اور "مسلمان" نہوں گے؟! اللہ اللہ! "ربانیت اور عملِ صالح" میں ایک طرف، اور "رازی" و "نیرنگ کے" اسلام" میں دوسری طرف، کتنا لا علاج "تضاد" واقع ہوا ہے؟! "رازی" صاحب! "خدا پرستی و نیک عملی" پر مستزاد آپ کونسی پُراسرار "ناگفتہ بہ" چیز بصیغۂ راز اپنے "دار التبلیغوں" میں "سینہ بہ سینہ" اِن نو مسلموں کو تلقین فرمائیں گے جس کا ذکر ابوالکلام کی تفسیرِ اسلام میں نہیں ہے ـــــ کیا ہم اِس پر اتنے فقرے کا اضافہ کریں کہ" ولو کرہ المومنون"؟

(۱۲) چشمِ ما روشن و دلِ ما شاد! آپ مسلمانوں کو "خالد بن الولید" بننے دیجئے، آپ کی پھندنے دار ٹوپی" اور آپ کے ٹخنے پاجامے کے تحفظ کی ضمانت ہم کرتے ہیں! بشرطیکہ آپ اِسی پر مصر ہیں کہ:

جو کھلونا مجھے دکھلایا تھا لوں گی تو وہی!

(۱۳) ہم نے بارہا یہ تماشا دیکھا ہے کہ جو خوش عقیدہ بزرگ اقبال کے "قرآنِ زبانِ پہلوی و ہندی" پر مٹے ہوئے ہیں، وہی اُس کی اہم ترین "سورتوں اور آیتوں" سے بے خبر ہیں! آئیے اِس ساری نزاع میں قولِ فیصل اقبال ہی کی ایک نظم کو بنائیں! "ضربِ کلیم" کے اس "صدمے" کو "رازی" جگر تھام کے سہیں۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم ــ بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ افکار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور ــ فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر ــ کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں ــ اللہ کرے تجھکو عطا جدتِ کردار
جو حرفِ "قل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک ــ اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

آپ نے دیکھا "مساواتِ شکم" کا جو کلمۂ تنقیص اقبال نے کارل مارکس کی "شریعتِ معاشی" کے متعلق اپنی "شاعرانہ معراج" کی روایت ـــــ جاوید نامہ ـــــ میں استعمال کیا تھا اُس کا خمیازہ کتنے مغلوبانہ اعتراف سے کھینچنا پڑا؟! ؎ اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را!

شریعت میں ۲½ فیصد کی شرح زکوٰۃ اس قدر ایمان کی تکمیل کا معیار نہیں جس قدر کہ کفر سے بچنے کا کمترین حیلہ ہے! یہ گویا ۲۰ فیصد "پاسنگ مارکس" کا تھرڈ کلاس ہے، ۹۰،۸۰ فیصد والا "آنرز اسکور" نہیں! چالیس روپیہ میں ایک روپیہ "اضعف الایمان" کی بس اک "اشک شوئی" ہے، معاشی مقام سبقت و عزیمت کے نشاندہ، حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و علیؓ و عبدالرحمٰن بن عوفؓ و ابوذر غفاریؓ کے ہی تاریخی "اسوہ ہائے حسنہ" ہیں! ادنیٰ ترین مذاہب میں بھی خودکامانہ "شخصی ملکیتہ" اک ننگ سمجھی گئی ہے! دینی نظاماتِ معاشی میں کم از کم "امانت داری" کا تصور پایا جاتا ہے! آج "مساجد و منادر و کنائس" یکساں اِس کے منکر ہیں، اور اشتراکیت اِسی بین الادیانی فتنۂ "ارتداد" کا عین قدرتی ردِّ عمل ہے! اپنے مرشد، اقبال ہی کی زبانی اسی "المیہ" کو سُنیئے:

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب — در جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب! انقلاب اے انقلاب!

شیخِ شہر از رشتۂ تسبیح "صد مومن بدام" — ہندوانِ سادہ دل را برہمن زنّار تاب

انقلاب! انقلاب اے انقلاب!

در کلیسا ابنِ مریمؑ را بہ "دار" آویختند — مصطفےٰؐ از کعبہ ہجرۃ کردہ باام الکتاب

انقلاب! انقلاب اے انقلاب!

(۱۴) ممکن ہے انڈین نیشنل کانگریس نے کوئی شاعرانہ "فلسفۂ انقلاب" نہ تراشا ہو، لیکن اُس کا نصف قرن سے زیادہ کا مجاہدۂ آزادی و قربانی، بدون کسی سیاسی و معاشی و مجلسی نظریئے کی اساس کے نہیں ہو سکتا! باقی رہی یہ بات کہ کانگریس نے اتنی "سخن فروشی" نہیں کی جتنی کہ اک "شکم سیر، بُور ژوا" شاعر کے لئے ممکن ہے تو اِس راز کا حل شاید جنابِ "رازی" کو اک سچے قرآنی شاعر (حمید الدین فراہیؒ) کے اس شعر میں مل سکے: ؎

خروش و جوش کہ بینی بہ وعظِ مفتیٔ شہر

ز مستی است کہ در لقمہائے اوقاف است!

ہندوستان کے جہادِ آزادی کو بالفعل تو "خونِ سُرخ" کی ضرورت ہے، قبل اس کے کہ اُس "سیاہ روشنائی" کے رشحات کا وقت آئے جو "ہندوستانی انقلاب" کا مستقبل کا مفصل لائحۂ عمل معرضِ تحریر میں لائے! ؎

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ "وعظ" ست

بر "دار" تواں گفت، بہ "منبر" نتواں گفت!

ہم حیران ہیں کہ غلامی کی سیاسی زندگی کے سایۂ تاریک میں کوئی مِلت یا اُمت اپنی حقیقی، آزاد، تخلیقی "کلچر" کا خواب بھی کس طرح دیکھ سکتی ہے؟! ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں "سجدے" کی اجازت

"نادان" سمجھتا ہے کہ اسلام ہے "آزاد"!

ثقافت و تمدن کا کیا ذکر، غلام کی تو "وحی و الہام" بھی اک "قابلِ استغفار" وسوسۂ شیطانی ہے! ؎

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے

غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز!

اقبال کے "کھُلے کھُلے درسِ آزادی" کی "چھُپی چھُپی اخلاقی زبونی" خود اُنہی کی زبانی سنیئے ؎

اقبال بڑا اُپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے

"گفتار" کا وہ غازی تو بنا، "کردار" کا غازی بن نہ سکا

(۱۵) "رازی" صاحب کے ہاں "چیلنجوں" کی کوئی کمی نظر نہیں آتی! "دماغی نابالغی" کی یہ چیخ پکار بہت بدنام ہے! اگر "آزادی" "قوم پرستی"، اور "اشتراکیت" قرآن سے ناقابلِ اثبات ہیں، تو غالباً "قرآن"؛ "غلامی و ملت فروشی، سرمایہ داریت اور قارونیت" کا پیامبر و علم بردار ہوگا! ——— بلاشبہ قرآن سے بڑھکر کوئی حجت نہیں۔ لیکن یہ امر ابھی تصدیق طلب ہے کہ آیا واقعی حضرتِ "رازی" چودھویں صدی کے "قرآنِ ناطق" واقع ہوئے ہیں؟! "رازی" صاحب پوچھتے ہیں کہ "آپ کو مسلمان کہلانے کا کس حد تک حق پہنچتا ہے؟!" ——— غرض یہ ہے کہ جس دن سے مسلمانیت کے انتساب کا حق جنابِ "رازی" "دامت ظلہم" کو پہونچا، ہم خود بطیبِ خاطر اس تسمیہ و حق سے دستبردار ہوگئے! ؎

سخن کوتہ مرا ہم دل بہ تقویٰ مائل است اما

ز ننگِ "زاہد" اُفتادم بکافر ماجرا اینہا!

(کشاف)

ہندوستانی قومیت

نعمان شاغل بھوپالی

اقوامِ عالم کے زوال و عروج کی تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ ارتقار سیاسی نام ہے اتحادِ قومی کا۔ یعنی جب تک عوام کی فرسودہ ذہنیتوں کو بدل کر ان میں سیاسی شعور نہ پیدا کیا جائے، قومیت کی روح پھونک کر ان کے سینوں کو نہ گرمایا جائے، انقلاب کے دروازے کھٹکھٹائے نہیں جاتے، اور نہ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ سکتی ہیں۔

جنگِ آزادی کی راہ میں ہندوستان کی مجلسِ قومی (کانگریس) کی لازوال قربانیاں اور عوام سے براہِ راست رابطۂ اتحاد پیدا کرنے کی ان تھک کوششیں اس وقت عوام کے جمود و غفلت کو دور کرکے ملک میں بیداری کی فضا ہموار کرچکی ہیں، لیکن فرقہ پرستی ہندوستانی قومیت کی راہ کا بھاری پتھر بنی ہوئی ہے۔ ہندوستان کا موجودہ دَور صرف عوام کے سیاسی شعور کی بیداری کا دور ہے، جس میں اطمینان بخش مرکزیت نہیں پائی جاتی۔ لیکن مستقبل اپنے آغوش میں ایک ایسے زرّیں عہد کی پرورش کر رہا ہے، جو "قومیت" کا عنوان پائے گا۔ کیونکہ موسم کی تبدیلی بتلا رہی ہے کہ افتراق و انتشار کی یہ بدلیاں بھی بہت جلد چھٹ جانے والی ہیں، اور قومی اتحاد و یگانگی کے آفتاب کی ضیا پاش کرنیں نمودار ہو کر آزادی کے خوش انجام انقلاب کا دامن جگمگا دینے والی ہیں۔

اس صحبت میں ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے موانع ہیں جو ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں حائل ہو رہے ہیں؟ لیکن یہ بحث یہاں سے شروع نہیں ہوتی بلکہ اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے سے قبل ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "قوم کس طرح بنتی ہے؟ اور قومیت کیا ہے؟" لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ مختصر طریقہ پر پہلے اس کو سمجھ لیا جائے۔

اجزائے قومیت

بعض علمائے سیاست کا خیال ہے کہ، قیامِ قومیت کے لئے چند اجزار بہت ضروری ہیں، مثلاً وحدتِ زبان۔ وحدتِ نسل، اور وحدتِ مذہب وغیرہ، لیکن دنیا کی موجودہ "تاریخِ قومیت" کا جواب اس کے برعکس ہے۔ یعنی ان تمام باتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جو تعمیرِ قومیت کے لئے لازمی اور اساسی کہی جاسکے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اور اسی قسم کے تمام امور کسی گروہ یا ملک کے لئے قیامِ قومیت میں زیادہ سے زیادہ معاون ہو جائیں۔ لیکن حقیقت و اصلیت سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔

کیا متمدن دنیا میں کوئی ایک جگہ بھی ایسی ہے جہاں صرف ایک نسل کے لوگ آباد ہوں؟ ان کی زبان ایک ہو؟ اور مذہب وغیرہ بھی ایک ہی رکھتے ہوں؟ اور کیا ایسے ہی مختلف اجزار کے ساتھ قریب قریب تمام ممالک "قوم" نہیں بن چکے ہیں؟ اگر کہیں زبان ایک ہے تو مذہب میں اختلاف ہے، کہیں مذہب ایک ہے تو زبانیں ایک سے زیادہ ہیں اور کسی جگہ یہ دونوں باتیں ہیں تو نسل ایک نہیں ہے۔

مصر، یورپ وغیرہ میں مختلف مذاہب کے پیرو مل کر اپنی قومیت بنا چکے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ میں زبان انگریزی استعمال کی جاتی ہے، حالانکہ دونوں الگ الگ دو قومیں ہیں، اور نسل و مذہب کے مختلف اجزا سے مرکب ہیں۔ پھر سوئیٹزر لینڈ میں جرمن، فرنچ اور رُوس تین زبانیں بولی جاتی ہیں، اور نسل بھی ایک نہیں ہے۔ لیکن کیا اس بنا پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ سوئیٹزر لینڈ کے باشندے ایک قوم نہیں ہیں؟ اسی طرح یوگوسلاویکیا، کناڈا اور مشرقی یورپ وغیرہ میں متعدد جگہ اختلافِ نسل و مذہب پایا جاتا ہے۔ جدید ترکی قومیت کی زبان ایک ہے، اور مذہب و نسل ایک سے زیادہ ہیں۔ مگر کیا یہ اختلافات اُن کی قومیت کا راستہ روکے ہوئے ہیں؟ معلوم ہوا کہ یہ تمام امور جزوی اور فروعی ہیں، اور حقیقت و اصلیت ان کے علاوہ کچھ اور ہی ہے۔

اصلیت و حقیقت

پھر وہ اصلیت کیا ہے جس کے بغیر کسی جگہ کا کوئی گروہ "قوم" نہیں بن سکتا؟ وہ اہم اور بنیادی اصلیت اتحادِ خیال اور اشتراکِ مقصد ہے۔ جس کو واضح الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ کسی ملک کے لوگوں کا ایک دوسرے کو ہم قوم سمجھنا اور سیاسی مقاصد میں ایک ہوجانا ہی قوم بنجاتا ہے، خواہ وہ مذہب، زبان اور نسل وغیرہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہی کیوں نہوں؟

یہ وحدتِ قومی زیادہ تر اُس وقت اُبھرتی ہے جب ملک کے تمام باشندوں کے لئے خطرہ مشترک ہو، کیونکہ یہ اصول ہے کہ جب سیلاب آتا ہے یا کوئی اور بلا نازل ہوتی ہے تو جنگل کے تمام جانور اس کے دفعیہ اور اپنی پناہ کے لئے تمام درندگی و بہیمت کو بھول کر ایک ہوجاتے ہیں، اسی طرح جب کسی ملک کے لئے خطرہ مشترک ہو تو اس کے دفاع کی خاطر تمام داخلی نزاعات ختم ہوجاتے ہیں، ملک کا انتشار و اختلاف سمٹ کر ایک مرکز پر آجاتا ہے۔ سیاسی مفاد و قومی نصب العین میں اشتراک و اتحاد پیدا ہوجاتا ہے۔ اور کل افراد اپنے کو قوم کا ایک جزو سمجھنے لگ جاتے ہیں، پھر ایک مرتبہ وحدتِ قومی کے نشے سے سرشار ہو کر کسی قیمت پر اس مضبوط رسی کو توڑنا گوارا نہیں کرتے، زبان و مذہب وغیرہ میں اختلاف برتتے ہوئے بھی قومیت کا رشتہ سب سے زیادہ مقدس رشتہ سمجھا جانے لگتا ہے، اور یہی چیز آگے چل کر ان کی سیاسی، اقتصادی و معاشرتی ترقیوں کے لئے سنگِ میل بنتی جاتی ہے۔

جرمنی اور امریکہ کی قومیتیں

انیسویں صدی عیسوی سے پہلے جرمن قوم کیا تھی؟ تمام ملک چھوٹی چھوٹی متعدد ریاستوں میں منقسم تھا، جن میں کوئی وحدتِ قومی نہیں پائی جاتی تھی، اور آپس میں جنگ بھی رہتی تھی۔ ان ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقتور ریاست پرشیا تھی، جرمن قوم کی ترقی کا مؤسس اول پرنس بسمارک اس انتشار کو اجتماع میں بدل دینے کا سب سے زیادہ آرزومند تھا۔ ان مختلف گروہوں کو ایک مرکز پر لانے کا خواب ایک مدت سے دیکھ رہا تھا، اس کی دوربین نظروں کے سامنے آنے والی ہلاکت و تباہی پوری عریانیوں کے ساتھ کھڑی تھی، اور وہ جانتا تھا کہ ملک کا یہ انتشار و داخلی نزاع جرمنی کو کمزور کرکے کسی دوسری طاقتور قوم کو ان پر مسلط کردے گا۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ یہ مختلف کڑیاں کسی تیز بھٹی میں تپ کر ایک مضبوط زنجیر بن جائیں، اور اس کے نزدیک جرمنی کے اس داخلی اتحاد و تنظیم کی صحیح تعبیر جنگ تھی، چنانچہ اس نے مختلف طریقوں سے فرانس کو بھڑکا کر جنگ کے امکانات پیدا کرلئے اور ۱۸۷۰ء میں پوری جرمن قوم کے لئے جنگ کا مشترک خطرہ سامنے آگیا، جس کے دفعیہ کے لئے پورا ملک ایک اشتراکِ خیال و وحدتِ مقصد کے زیر اثر تنظیم کی ایک صف میں آگیا، جرمنی کے نظامِ اجتماعی و ارتقاء مدنی میں آج جو اتحادِ قومیت نظر آرہا ہے وہ نتیجہ ہے اسی ۱۸۷۰ء کی جنگ کا جو صرف واہمۂ سیاست بسمارک کی پیدا کردہ تھی، امریکہ نے جب تک اپنی قومیت کا جھنڈا بلند نہیں کیا، کسی طرح برطانوی غلامی سے نجات نہیں پائی، لیکن جب اُس نے قومیت کا ہتھیار سنبھالا تو غلامی کی تمام کڑیاں ایک ایک کرکے کاٹ کر رکھ دیں۔

تعمیرِ قومیت کی دو بنیادیں

غرض قومیت، دفاع و حفاظت کا دوسرا نام ہے، جو اکثر دو صورتوں

میں وجود میں آتی ہے، یا تو خطرۂ جنگ کے دفعیہ کے لئے اور یا اجنبی حکمرانوں کے پنجۂ استبداد سے رہائی پانے کے لئے جس کی بہترین مثال جرمنی، امریکہ، فرانس، اٹلی اور یونائیٹڈ وغیرہ ہیں، بغیر قوم بنائے کسی ملک نے نہ تو ترقی کی ہے اور نہ غلامی سے نجات پائی ہے ۔ اور تخلیق قومیت کے لئے نہ کسی طرح کی فلسفیانہ موشگافی کی ضرورت ہے ۔ نہ قومیت کی نفسیاتی تحلیل کی، بلکہ غلامی کی ذلت اور پستی کے ادبار کا احساس ہی تعمیرِ قومیت کا سنگِ بنیاد بن جاتا ہے ۔

ہندوستانی غلامیت اور قومیت

ہندوستان غلام ہے اور جب کسی ملک کی غلامی پر ایک طویل مدت گزر جاتی ہے تو لوگوں کے دلوں سے احساسِ قومیت فنا ہو جاتا ہے ۔ اور علمبردارانِ حریت کے لئے احساسِ قومی کی بیداری میں سخت مشکلات ہو جاتی ہیں، کیونکہ ملک کے باشندے فرقہ پرستی کی لعنت میں مبتلا ہو کر پنجۂ استبداد کی گیرائی کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بناتے رہتے ہیں، بالواسطہ معاونت کے خوگر ہو جاتے ہیں ۔

"اجنبی اقتدار اپنے مقبوضات کے لئے سب کچھ گوارا کر سکتا ہے لیکن اُس کو کسی عنوان برداشت نہیں کر سکتا کہ غلاموں میں قومیت کے عناصر تشکیل پائیں ۔ چنانچہ مختلف طریقوں سے ملک کے داخلی اتحاد پر کاری ضربیں لگائی جاتی ہیں، جس سے فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں، اور قومیت، جو ملک کے لئے بمنزلۂ ریڑھ کی ہڈی کے ہے، ہر جگہ سر پٹیتی رہ جاتی ہے ۔ اجنبی اقتدار کے زہر سے غلاموں کی ذہنیت اس درجہ مسموم ہو جاتی ہے کہ وہ فرقہ پرستی کو ہی اپنی بقاءِ حیات کا ضامن سمجھنے لگتے ہیں، اپنے سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، مذہبی اور تمدنی غرض تمام مسائلِ حیات کا تصفیہ فرقہ وارانہ اصول پر کرنے لگتے ہیں، اور ملک و قوم کی یہی تخریب، قوائے استبداد کی تعمیر بن جاتی ہے ۔

غلام ذہنیت اتحادِ قومی کے مفاد سے تو منکر نہیں ہوتی، لیکن اپنے لئے یہی چیز اس کو سب سے زیادہ ناممکن نظر آتی ہے، اس کو جب بھولا ہوا سبق یاد دلایا جائے تو وہ خود بخود اپنے لئے بعید از قیاس مشکلات گھڑ کر خوفزدہ ہو جاتی ہے" وطنیت" "قومیت" "داخلی اتحاد" "قومی اتفاق" یہ تمام الفاظ محکوم فرقہ پرستوں کو سفید کاغذ پر چھپے ہوئے بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں، لیکن اُن کی دنیائے عمل میں ان الفاظ کی کوئی قیمت نہیں رہتی، گویا قومیت کا راگ ان کے نزدیک ایک قسم کی رومانی شاعری ہوتا ہے جس سے صرف تفریحِ طبع اور گرمیٔ محفل کا کام لیا جا سکتا ہے ۔ پھر ان خود غرض سیاسی رہنماؤں، ریاکار اخلاقی مصلحوں اور جاہل مذہبی مسند نشینوں کی اس شوم نصیبی اور اخلاقی موت پر تو ماتم کی بھی کوئی گنجائش نہیں رہتی جبکہ وہ "تشکیلِ قومیت" کو "اصولِ انسانیت" "قواعدِ اخلاق" اور "تعلیمِ مذہب" کے بھی خلاف بتلا کر اس پر بحث و عمل کو "انسانی" "اخلاقی" اور "مذہبی جرم" قرار دیتے ہیں ۔

ہندوستان بھی برطانوی اقتدار کے زیر اثر، افتراق و انتشار کے ایسے ہی دَور سے گزر رہا ہے ۔ مجلسِ قومی کی سعیٔ قیامِ قومیت کو، غلامانہ ذہنیت ہندوستانی حالات کے منافی خیال کرتی ہے ۔ کیونکہ اس سرزمین پر آرین منگول، افغان، عرب وغیرہ مختلف نسل کے لوگ آباد ہیں، مختلف معاشرتیں ہیں، متعدد مذاہب ہیں اور اُردو، ہندی، گجراتی، بنگالی، سندھی، پنجابی وغیرہ لاتعداد زبانیں بولی جاتی ہیں، حالانکہ میں اوپر بتلا چکا ہوں کہ دنیا کے اندر ان میں سے کوئی ایک چیز کسی حیثیت سے بھی، تعمیرِ قومیت میں حائل نہیں ہوتی، اس موقعہ پر یہ بات بھی سمجھنے کے قابل ہے کہ روس بھی مذہب و معاشرت اور زبان و نسل کی بوقلمونی کے لحاظ سے ہندوستان ہی کا نمونہ ہے، کیونکہ وہاں اسلام، عیسویت، بدھ مت وغیرہ مذاہب ہیں ۔ منگولین چینی، عربی روسی وغیرہ نسلیں آباد ہیں، اور عربی، روسی، فارسی، ترکی، چینی وغیرہ زبانیں بولی جاتی ہیں ۔ جب یہ تمام اختلافات روس میں قومیت کے اجزاء بن سکتے ہیں تو ہندوستان میں اجزاءِ قومیت کیوں نہیں بن سکتے ؟

مذہبی تعصب

پھر وہ کونسی رکاوٹ ہے جو ہندی قومیت کو اُبھرنے سے روکتی ہے ؟ ادنیٰ تدبر سے یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ وہ سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستان کا "مذہبی تعصب" ہے ! میں نفسِ مذہب پر حملہ نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری مراد مذہبی تعصب و تنگ نظری سے ہے، یہاں کے باشندوں

پر غلط طریقے پر مذہبی رنگ بہت چھایا ہوا ہے اور جیسا کہ یہاں کے بعض قوم پرست علماءِ سیاست کا خیال ہے: اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستانی عوام کی ذہنی تربیت اب تک بجائے قومی اور سیاسی بنیادوں کے ہر فرقے کے متعصب و تنگ نظر مذہبی پیشواؤں کے زیر اثر ہوتی رہی ہے، اور وہ ہر چیز کو اسی عینک کے دھندلے شیشوں کی مدد سے دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں، خلافت اور سنگٹھن، تبلیغ اور شدھی، گائے اور باجہ، مسجد و مندر، اذان و ناقوس، اس قسم کی تحریکیں خالص مذہبی ہونے کے باعث عوام کے تعصب و "جوشِ مذہبی" کو جس قدر جلد برانگیختہ کر دیتی ہیں اس جوش و دلچسپی کا عشر عشیر بھی قومی تحریکوں میں نظر نہیں آتا۔ "اسلامیت" "ہندویت" "مسلم کلچر" "ہندو تہذیب" "اردو زبان" "ہندی زبان" یہ اور اسی قسم کے تمام مسائل جو اس وقت ہندوستان میں قیامِ قومیت کے اہم موانع سمجھے جا رہے ہیں، درحقیقت بالکل فروعی و غیر اہم ہیں، اور اصل محرک صرف مذہبی تعصب ہے، جس کے زیرِ اثر یہ تمام سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ زبان کا مسئلہ جو اس وقت سب سے اہم بنا ہوا ہے اور جس سے ہندوستانی قومیت پر کاری ضرب لگ رہی ہے، یہ بھی بآسانی طے ہو سکتا ہے، اگر مذہبی عصبیت کا پردہ چاک کر دیا جائے۔

جاہ پسند و فرقہ پرست لیڈروں اور تنگ نظر و متعصب مذہبی پیشواؤں نے اپنے اقتدار کے تحفظ کی خاطر عوام کو مختلف حلقوں میں تقسیم کرکے ہر گروہ کو دوسرے سے بیگانہ ہی نہیں بنایا، بلکہ بیگانگت کے علاوہ مذہب کے نام پر ان کے مابین نفرت و عداوت کی خلیج بھی حائل کر دی ہے، حالانکہ تعصب و تنگ نظری اور نفرت و عداوت کو روحِ مذہب سے کوئی واسطہ نہیں، اور کوئی مذہب بجز وسیع القلبی، خدمتِ خلق، اور تہذیبِ نفس کے، وحشت و بہیمیت، درندگی و خونخواری کی تعلیم نہیں دیتا۔

جب مختلف مذہبی فرقوں کا سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، ہر طرح کا مفاد ایک ہی سرزمین سے وابستہ ہے تو ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ مذہبی رواداری کے علاوہ ان میں قومی اور وطنی ارتباط کے رشتے کو بھی بہت زیادہ اہمیت و استواری حاصل ہوتی، لیکن واحسرتا! کہ یہاں نہ مذہبی رواداری ہے، نہ قومی و وطنی ارتباط کا علاقہ۔

اسلامیانِ ہند اور وقت کی ضرورت

سب سے زیادہ حیرت و تعجب تو اسلامیانِ ہند پر ہے، جن کے مذہب نے نہ صرف اہلِ وطن سے حسنِ سلوک اور حبِ وطن کی بار بار تاکید کی ہے بلکہ انسانیت اور وطنیت کا وہ بلند ترین نصب العین پیش کیا ہے جو دنیا کے تمام مذاہب و اقوام کے لئے تقلید و عمل کا نمونہ ہے۔ ایک سچے مسلمان کے لئے بہ حیثیت انسان ہونے کے تمام کرۂ ارضی وطن ہے اور دنیا کے تمام باشندے اُس کے اہلِ وطن، لیکن انسانیت و اخلاق کا یہی سب سے بڑا علمبردار جب سرزمینِ ہند پر نمودار ہوتا ہے تو بجز نماز و روزہ کے انسانیت حبِ وطن اور بین الاقوامی اخلاق کے تمام مذہبی اصول فراموش کر دیتا ہے، جو مذہب کے غایتِ اصلی اور ایمان کی بنیادیں ہیں۔ افسوس! ہندی مسلمان نے چند رسوم کے ادا کرنے کے بعد "مسلمان" ہونا تو جان لیا، لیکن "انسان" ہونا نہیں جانا۔ حالانکہ اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ "اسلامیت" و "انسانیت" دو جداگانہ چیزیں نہیں ہیں، اسلام دنیا کو چند رسوم کا پابند بنانے کے لئے نہیں آیا، بلکہ انسان بنا دینے کے لئے آیا تھا۔

مذہبی تنگ نظری و عصبیت نے ہر جگہ قومیت کی راہ میں روڑے اٹکائے ہیں، ٹرکی جب تک تنگ نظر ملاؤں اور جاہل صوفیوں کے ہاتھوں میں کھیلتا رہا اس کی قومیت کے رخنے بڑھتے گئے، ہر اصلاح و تجدد کے خلاف بغاوت کی جاتی رہی۔ ہندی قومیت بھی فی الحال اسی جہل و عصبیت کا شکار ہو رہی ہے اور ٹرکی کی طرح ہندوستان کو بھی اب خود ساختہ و جاہل مذہبی رہنماؤں کے اقتدار کو جلد از جلد ختم کر دینے کے لئے ایک مصطفیٰ کمال کی ضرورت ہے تاکہ مذہبی تعصب و تنگ نظری کی اس چٹان کو کاری ضرب سے پاش پاش کرکے قومیت کو ابھرنے کا موقعہ دیا جائے، جس کے بعد انقلاب اور آزادی کی منزل کچھ زیادہ دور نہیں رہ جاتی۔

اطلاع

چونکہ رسالہ کلیم ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہو جاتا ہے۔ اس لئے پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع ۱۰ تاریخ تک بھیجدینی چاہیئے ورنہ بعد میں تعمیل نہیں کی جائیگی۔ منیجر

آج کچھ کھایا نہیں

شام آئی، واں کھُلے بابِ حرم دربائے دَیر
نکلے یاں افسردہ طبعانِ معیشت بہرِ سیر

تازگی سے رُوح کی کلفت بدلنے کے لئے
نکلے مستانِ مَتوّل بھی ٹہلنے کے لئے

جانفزا برسات، بادِ سرد اٹھلائی ہوئی
ہر طرف منظر پہ اک رومانیت چھائی ہوئی

آسمانِ نیلگوں پر کالی کالی بدلیاں
رقص کرتی پھر رہی تھیں کارواں در کارواں

بخششِ موسم سے تھی نمناک بادِ برشگال
دل سے دھلتے جارہے تھے کلفت و رنج و ملال

گُلرخانِ سیمبر تھے موٹروں میں یوں رواں
جیسے اُڑتی پھر رہی ہوں بوستاں میں تتلیاں

اہلِ زر تھے قیمتی ملبوس میں لپٹے ہوئے
چشم و ابرو میں غرورِ دولت و عزت لئے

ہوٹلوں میں ہر طرف اک شورِ ناو نوش تھا
ذرہ ذرہ سرخوشی میں میکدہ بر دوش تھا

الغرض ہر شے میں تھی اک دلکشی اک زندگی
تھی زمیں سے آسماں تک تازگی ہی تازگی

ناگہاں اک ناتواں مزدور آیا سامنے
زندگی کے قلب کا ناسور آیا سامنے

ملگجے کپڑے شکستہ ولولے، چہرہ اداس
لب پہ خشکی قلب میں اندوہ آنکھوں میں ہراس

دست و پا شل، چشم و ابرو ضعف میں ڈوبے ہوئے
جارہا تھا اپنے سر پر ٹوکرا رکھے ہوئے

دفعتاً کانپا، رُکا، ٹھہرا، ٹھہر کر گر پڑا
ضعف کا مارا زمیں پر آہ بھر کر گر پڑا

سر میں چوٹ آئی، لہو زخموں سے جاری ہوگیا
بیکسی کا ایک عالم دل پہ طاری ہوگیا

یہ تماشا دیکھنے دو چار بے فکرے بڑھے
اُس کی حالت پر خیال آرائیاں کرنے لگے

کوئی یہ کہنے لگا یہ ہے شرابی کی سزا
مل گیا حد سے سوا پینے کا بالآخر مزا

کوئی کہتا تھا کہ شاید یہ ہے مرگی کا اثر
کوئی کہتا تھا اسے شاید کم آتا ہے نظر

چند لمحوں تک وہ بیہوشی کے عالم میں رہا
رفتہ رفتہ پھر ہوئے ہوش و حواس اُسکے بجا

"یہ ہوا کیا؟" ایک نے پوچھا جو بیٹھا تھا قریں
وہ نقاہت سے یہ بولا "آج کچھ کھایا نہیں"

رضا نقوی

گستاخ شیطان

وجاہت علی سندیلوی بی اے

صبح کا سہانا وقت تھا، رات کی گرمی سے دیر تک جاگی ہوئی، دنیا ابھی خاموش تھی اور سورج کی پہلی کرنیں شرماتی لجاتی ہر بلندی کی پیشانی چوم رہی تھیں۔ نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر مولوی ابن القدوس صاحب اپنے مکان کے کشادہ صحن میں ایک قالین پوش چوکی پر گاؤ تکیہ کا سہارا لئے حُقّے کے میٹھے میٹھے کش کھینچ رہے تھے، اپنے معبود کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے بعد وہ ایک عجب سکون و کیف سے سرشار تھے۔ اس وقت دنیا کی ہر فکر سے بے نیاز وہ اپنے سینے میں کچھ ایسی ٹھنڈک محسوس کر رہے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں دل کے عوض ایک برف کا ڈھیلا دھڑک رہا ہے، حقے کے میٹھے میٹھے خوشگوار کش مولوی صاحب کی آنکھیں بند کئے دیتے اور وہ کچھ ایسا لطف محسوس کرتے گویا جنت میں حوریں اُن کے ہاتھ پیر اور سر دبا رہی ہیں۔

آہٹ ہوئی۔ مولوی صاحب نے سر جو اُٹھایا تو ایک بڈھا سفید ڈاڑھی والا معتقد جس کے معصوم چہرے سے خشوع و خضوع کی شعاعیں نکل رہی تھیں، نہایت مودبانہ ایک روپیہ نذر لئے ہوئے کھڑا تھا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے" کہہ کر مولوی صاحب نے ازراہِ غُربا پروری نذر قبول کر لی۔ اور روپے کو تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ معتقد نے مولوی صاحب کے ہاتھ پیر چُومے اور اُن کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا۔

مولوی صاحب۔ کیوں کیسے آئے کیا کام ہے تمہارا۔

معتقد۔ حضور میں بہت ہی گنہگار ہوں، اور بہت ہی غریب آدمی ہوں، آپ دعا کریں۔

مولوی صاحب۔ انشاء اللہ۔

معتقد۔ حضور اب تو فاقے کرتے کرتے جان پر بن آئی ہے، اب آپ ہی کچھ زور لگا دیں۔

مولوی صاحب۔ (ہاتھ اُٹھا کر) رازق تم پر اپنے رزق کے دروازے کھول دے۔

معتقد۔ حضور میں نے خود خدا سے بجد دعا مانگی، بہت نذر و نیاز کی، لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

مولوی صاحب۔ واسطے کی ضرورت ہے۔ اُس معبودِ حقیقی کی بارگاہِ عالی تک ہر کہ ومہ کی تھوڑی ہی رسائی ہے (بارگاہ کی عظمت و جلالت کے خیال سے مولوی صاحب کو ایک جھرجھری معلوم ہوئی) جل جلالہٗ!

معتقد۔ میں نے سمجھا کہ شاید خدا صرف امیروں کی دعا سنتا ہے جو پلاؤ زردے پر نذر و نیاز دلا سکیں۔ جو اپنی دعاؤں کی قبولیت کے لئے بزرگوں کے وسیلے حاصل کر سکیں۔

مولوی صاحب۔ (تیز ہو کر) خاموش، یہ کیا کفر بکتے ہو۔ خدا تو ہر ایک کے لئے ہے، خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔

معتقد۔ پھر وہ غریبوں کی سنتا کیوں نہیں؟

مولوی صاحب۔ دیکھو تم دائرۂ ایمان سے خارج ہوئے جا رہے ہو، اُس کی مشیت میں چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ اُس نے ہر ایک کی جدا جدا

تقدیر بنائی ہے، اور اُسے ہر ایک کا جدا جدا امتحان مقصود ہے۔

معتقد۔ تو پھر جو کچھ تقدیر میں ہے وہ پلٹ نہیں سکتا۔

مولوی صاحب۔ (جوشِ عقیدت سے اپنی داڑھی پکڑ کر) نہیں کبھی نہیں۔

معتقد۔ تو پھر آپ لوگ دعائیں کیوں مانگتے ہیں۔

مولوی صاحب۔ (خفا ہو کر) تم جاہل ہو اسے سمجھ نہیں سکتے!

معتقد۔ انسان وہی کرتا ہے جو اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے؟

مولوی صاحب۔ بیشک خدا تعالیٰ کی مرضی کے بغیر ایک پتہ تک ہل نہیں سکتا۔

معتقد۔ تو پھر یہ ہمارے گناہ پہلے ہی سے ہماری قسمت میں لکھے ہوتے ہیں۔

مولوی صاحب۔ بیشک

معتقد۔ اور جو کچھ ہماری قسمت میں لکھا ہوا ہے اگر وہ ہم نہ کرتے تو ہم خدا کی حکم عدولی کرتے۔

مولوی صاحب۔ حکم عدولی کے کیا معنی۔ خدا کے حکم بغیر ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔

معتقد۔ پھر ہمارے گناہوں کی سزا کس کو ملے گی؟

مولوی صاحب۔ تم کو اور کس کو؟

معتقد۔ میں نے تو جتنے گناہ کئے ہمیشہ مجبور و ناچار ہو کر کئے۔

مولوی صاحب۔ (خفا ہو کر) چپ رہو تم۔ بڑے آئے وہاں سے مجبور و ناچار ہو کر گناہ کرنے والے۔

معتقد۔ پھر آخر کیا فاقے کرتے کرتے مر جائیں، مذہب روٹی دیگا۔

مولوی صاحب۔ روٹی خدا دیتا ہے۔ صبر کرو، شکر کرو۔ ہر حال میں اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم رکھو۔ ہر بات میں اُس کی مشیت پر قانع رہو۔

معتقد۔ (غصے میں) مرے کو سب ہی مارتے ہیں۔ مذہب غریبوں کو یہی سکھاتا ہے کہ بس صبر کرو، شکر کرو۔ مذہب امیروں کو کیا سکھاتا ہے؟

مولوی صاحب۔ یہی کہ صبر کرو، شکر کرو۔ غریبوں سے ہمدردی کرو۔

معتقد۔ تو بس مذہب امیروں کے لئے ہے، جو صبر شکر کر سکتے ہیں۔

مولوی صاحب۔ لعنت اللہ، کیا بکتے ہو تم۔ مذہب تمام خلق اللہ کے لئے ہے۔

معتقد۔ غریب کا مذہب تو روٹی ہے، آپ کے قانون میں چوری ناجائز اور بھوکے کے قانون میں چوری جائز ہے، آپ کے قانون میں صبر و شکر اور بھوکے کے قانون میں چھین جھپٹ۔

مولوی صاحب۔ مذہب سب کے لئے ایک ہے۔

معتقد۔ اور یہی اس کی کمزوری ہے۔

مولوی صاحب۔ (خفا ہو کر) دور ہو تم شیطان۔ بہکانے چلے ہو مجھ کو، تدبر و تفکر شیطانی مشغلے ہیں، جن سے مذہب کی طرف سے شک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ ور غلاتے ہیں!

معتقد (طنز سے) جی نہیں آپ تقلید و تعصب سے اپنی مذہبی بنیادیں مضبوط کرتے رہئے!

معتقد نے بڑے خطرناک طریقے سے مولوی صاحب کی ڈاڑھی کو گھورا۔ مولوی صاحب کچھ سمجھ گئے اور فوراً چیخ اٹھے۔ آنکھ کھل گئی، سارے صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی، حقہ جل چکا تھا۔ مولوی صاحب آنکھ ملتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"کمبخت شیطان ورغلانے چلا تھا ہمیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے باپ دادا کے مذہب پر قائم رہا۔"

مولوی صاحب نے احتیاطاً تکیہ اُٹھا کر دیکھا کہ شاید نذر کا روپیہ اُس کے نیچے ہو، لیکن وہ گستاخ شیطان اپنے ساتھ ہی لیتا چلا گیا تھا۔

دیکھی نہ آپ نے بے ایمانی!!

قطعہ

بوندیوں کا سلسلہ ہے اور ہلکا ابر ہے
پڑ رہی ہیں اس طرح [illegible] گاہ گاہ
وقت گریہ جس طرح مکتوب غم لکھتے ہوئے
آنسوؤں کے چھینٹے [illegible]

(راجن)

طوائف سے خطاب

اے طوائف! اے حسین رازِ طلسم رنگ و بو
کس قدر بیزار ہے اپنی نسائیت سے تو

ہیں گنہ کی لذتیں تیرے لب مے نوش میں
سیکڑوں فتنے مچلتے ہیں تری آغوش میں

تو کہ ہے تاریک دھبہ دامنِ آفاق پر
برق بن کر کوندتی ہے خرمنِ اخلاق پر

معصیت کے ولولے پنہاں اداؤں میں تری
بیوفائی کی جفاکاری وفاؤں میں تری

بے حجابانہ کبھی تو جلوہ گر ہے بام پر
برق ہنس ہنس کر گراتی ہے دلِ ناکام پر

اور کبھی تاریک خلوت میں نظر افروز ہے
جس جگہ ہے تو غرض اک برقِ عالم سوز ہے

دل کو دامِ گیسوئے پیچاں میں کس لیتی ہے تو
بے وفا ناگن گلے مِل مِل کے ڈس لیتی ہے تو

یہ تری ناز آفرینی قہر کی تمہید ہے
شام جس کی شامِ غم ہے، تو وہ صبحِ عید ہے

قابلِ لعنت ہے تیرا غم بھی تیرا عیش بھی
نوش میں اپنے چھپا رکھے ہیں تو نے نیش بھی

شاہکارِ ابلیس کی صنعت کا تیری ہست و بود
عالمِ انسانیت کو ننگ ہے تیرا وجود

او جہنم کی حسیں دیوی نظر پرور چڑیل
نوجوانی سیکڑوں کی مٹ گئی تیرے طفیل

راج ہے ظلم و ستمگاری کا تیرے دیس میں
موت کی رہبر ہے گویا زندگی کے بھیس میں

بیچتی ہے تو سرِ بازار اپنی زندگی
زندگی، یعنی شباب و شوق کی تابندگی

زلفِ مشکیں کی سیاہی، عارضِ زیبا کا نور
قد کی رعنائی لبوں کا رس، محبت کا سرور

آنکھ کی مستی، مژہ کی تیغ، ابرو کی کمال
جسمِ نازک کی لچک، کیف آفریں انگڑائیاں

ہمکناری کی تمنا، خود نمائی کی ترنگ
کمسنی کی شوخیاں، اٹھتی جوانی کی امنگ

بیچتی ہے اپنا جوبن، بیچتی ہے اپنا راز
اپنی فطرت کی بلندی، اپنے دل کا سوز و ساز

جذبۂ انسانیت کی عصمت و پاکیزگی
اور نسائیت کا جوہر روح کی دوشیزگی

تیری فطرت خود ہی تجھ سے برسرِ پیکار ہے
رحم کر اپنی طبیعت پر کہ وہ بیزار ہے

یکتا حقانی امروہوی

رفتارِ وقت

ادارۂ کلیم

کانگریس اور لیگ!

نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان بہتر تعلقات کی بحالی کی پھر اک سلسلہ جنبانی ہوئی ہے، حسبِ معمولِ سابق، اس مرتبہ بھی پیامِ صلح کے ابلاغ کا سہرا پنڈت جواہر لال نہرو ہی کے سر ہے؛ نزاع پسند و جدل شیوہ مسٹر جناح کو یہ فتح، اور عالی ظرف و آشتی طلب نہرو کو یہ شکست، مبارک ہو! ع

بیا کہ ما سپر انداختیم گر جنگ است!

جواہر لال ماشاء اللہ رزم کا جری قلب مردِ میدان ہے، اور بزم کی دل گداختہ شمعِ محفل! ؎

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر　　شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا!

الغرض ملک و وطن کی بین الملل کشیدہ تعلقات کی فضا میں چنگاریوں کے ساتھ اگر کچھ کلیاں بھی چٹکیں تو وہ بھی "لعل و جواہر" ہی کے پنجۂ مرجان کی گلریزی سے! ع

حلِ ایں عقدہ ہم از روئے نگار آخر شد!

نواب صاحب چھتاری اور نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب اور متعدد دیگر اکابرِ مسلم لیگ نے کانگریس پریسیڈنٹ کی اس "شاخِ زیتون" کو اُسی طرح قبول کیا جیسا کہ "هل جزاء الاحسان الا الاحسان" کا شیریں تقاضا تھا! ع

رہا نیدی مرا از شرِ لیگی　　چو ہیودی بیاپے جامِ مے را!

لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ ہر دو موصوف الصدر نواب صاحبان مسلم لیگ کی سیاسیات کے نہ مخفی گوشوں سے واقف ہیں نہ لیگ پریزیڈنٹ کے "وکیلانہ" ہتھکنڈوں میں رواں! چنانچہ اول الذکر بزرگوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کے پیامِ محبت و اخوت کا جواب اُس کی قدرتی صدائے بازگشت کی صورت میں دیدیا، اور مسٹر جناح کے "فنِ گریز" سے کام نہ لیا جس کا اک شاہکار خود "پیرِ مغاں" نے اپنے بیانِ کج مج زباں میں پیش کیا ہے! ع

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی!

چنانچہ مسٹر جناح نے سراسیمہ ہو کر سب سے پہلے اک مہلت کی ضرورت کا اعلان کیا، اور دوسرے بمبئی پہونچ جانیکی اک شرطِ ماقبل کا! کیا سچ مچ ہم ایسے ہی بہادر واقع ہوئے ہیں کہ اگر ناگہانی طور پر ہم سے کوئی ہمارے مطالبات پوچھ بیٹھے تو ہم اپنے حواس بجا کرنے کے لئے اک پورے ہفتہ عشرے کا وقت مانگیں، اور اک "صحتِ نفس و ثباتِ عقل" جواب دینے کے لئے پہلے اپنے گھر پہونچ جانا ضروری قرار دیں؟! کیا مسٹر جناح اپنے مشہور ہندوستانی ۱۴ نکات اسی طرح بھول گئے جس طرح کہ پریزیڈنٹ ولسن اپنے شہرۂ آفاق "Fourteen points" نذرِ قصرِ وارسائی کر چکے تھے؟! ہم لیگ پریزیڈنٹ اور بمبئی کے رجز خوانِ کارزارِ عدالت و کچہری کو اُن کی حاضر دماغی اور بدیہہ گوئی پر مبارکباد دیتے ہیں! ع

پسینا پوچھئے اپنی جبیں سے!

کیا آل انڈیا مسلم لیگ کا سالارِ کارواں اور اسلامی ہندوستان کے سیاسی و ثقافتی مستقبل کا محافظ و صورتگر اُس مضحکہ خیز و قابلِ رحم خود فراموشی کی نظیر واقع ہوا ہے جس کا انگریزی پیرایۂ اظہار یہ پایا جاتا ہے کہ "وہ خود نہیں جانتا کہ وہ۔۔۔ کیا چاہتا ہے!"——حضرتِ جناح کے لئے اب شاید یہ مقامِ فنا و خود فراموشی کچھ زیادہ دور نہیں کہ ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی!

قربان جایئے مسٹر محمد علی جناح کے اس قول کے کہ "کانگریس ہی بتائے کہ وہ مسلمانوں کو کیا دینا چاہتی ہے؟" گویا خود ہمارا کوئی مطالبہ یا تقاضا نہیں جو کچھ ہے آپ کے عطیہ و داد کا معاملہ ہے! بالفاظِ دیگر راضی برضا سائلین کے حقے کا تعین معطی کی فیاضی کا "ظرف" ہے! کیا یہی ہے حشر زبوں مسلمانانِ ہند کے اُن عظیم الشان و بلند بانگ مطالبات و تحفظات کا، جن کی تکرار و تشہیر سے سارا برِ اعظمِ ہند گونج رہا ہے، اور جن کے درد سے مسٹر جناح کا سینۂ اسلام آئینہ اک ملتہب آتشکدہ بنا رہا ہے؟! ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا!

کہا جا سکتا ہے کہ خود پنڈت نہرو وارباب کانگریس کے لئے بھی تو مسلم لیگ کے مطالبات وشکایات اسی طرح اظہر من الشمس ہو سکتے تھے؟" لیکن اُدھر سے تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ نیشنل کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدۂ کراچی ۱۹۳۱ء میں ان سب چیزوں کی، مع شے زائد کے، اپنے مشہور ومعروف "اعلانِ حقوقِ اساسی" میں تسلیم وضمانت کر دی ہے۔ — جس کے بعد بقول پنڈت جواہر لال نہرو کے اک شخص یہ سمجھنے سے اپنے کو قاصر و عاجز پاتا ہے کہ اب کیا رہ گیا ہے۔ جس کے بارے میں اک "جدید میثاق" کی گفتگو ہے؟! — لطف یہ ہے کہ پنڈت نہرو کی طرح غضبناک وغمناک، تشنہ و گرسنہ مسٹر جناح کے لئے بھی آخر کار یہ اک رازِ سربستہ ہی ثابت ہوا کہ لیگی مسلمان کیا چاہتے ہیں! — اور جس پر وہ مہاتما گاندھی سے اپنے حافظے کے تازہ کئے جانے کے لئے استمداد کرتے ہیں! — بڑا مزہ ہو اگر گاندھی جی، مسٹر جناح کے دماغ کی "لوحِ سادہ" کے سامنے اپنا کبھی کا "بلینک چیک" پیش کر دیں! غریب جناح کو اس پرکالۂ آفت جواہر نے آخر کس شش و پنج میں گرفتار کر دیا؟

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے — کوئی تبلاؤ، کہ ہم بتلائیں کیا؟!

تاہم کانگریس پریزیڈنٹ کا یہی اصرار ہے کہ "ہاں مسٹر! بتائیے کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟" جناح بالآخر اک دُور کی کوڑی لاتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ "اگرچہ کانگریس کے بظاہر مُسکن قلب بیانات مجھ پر پوشیدہ نہیں، لیکن میں اس موقف کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ کانگریس کو وہ شہ نشین حاصل ہو گئی ہے کہ وہ اس قسم کے ترحم خسروانہ کے سے اعلانات کو اقلیتوں کے سامنے اُن کے لئے "منشور ہائے آزادی" کی شان سے پیش کر سکے!" — کیا ہی دوگونہ رنج وعذاب ہے! بیوقار وآبرو باختہ ہندو مہاسبھا کا کوئی حقیر و ناچیز رکن اگر کبھی کوئی گزشتر کی نوع کا متعصبانہ کلمہ کہہ دیتا ہے تو بمجرد ان چند بیہودہ و دُور از کار حروف کے تلفظ کے اسلامی ہندوستان کا سارا نہیب مستقبل متزلزل ہو جاتا ہے! لیکن جب مُلک ووطن کی عظیم ترین سیاسی ترجمان، اور پورے سات صوبجات سلطنتِ ہند کی فرمانروا قومی جماعت انتہائی ممکن متانت واحساسِ اہمیت کے ساتھ اک ہمہ گیر اعلانِ حقوقِ شہریانِ کانگریسی ہندوستان کرتی ہے تو وہ اک پرِ پشہ کے برابر وقعت نہیں رکھتا! — گویا تم بحیثیت دشمن کے ہولناک تو ہو، لیکن بطور دوست کے پشت پناہ قطعاً نہیں! ع

حیران ہوں مریضِ مسلماں کو کیا ہوا!

مشکل یہ ہے کہ بصورت معاہدہ کانگریس ہی قوم ہند کی طرف سے مجوزہ صلحنامہ پر دستخط ثبت کرے گی، لیکن اگر مسٹر جناح "ہارایٹ لائکے دار العدلِ قانون میں" ایسی ہی "مردود الشہادت" واقع ہوئی ہے تو اُس کا اک تحریری میثاق بھی کس کام آئے گا؟! — ابھی تک مسٹر جناح یہی فرمایا کرتے تھے کہ برطانوی حکومت اور کانگریسی جماعت کے علاوہ مسلم لیگ بھی سیاسیاتِ ہند کا اک عنصر ہے، لیکن شاید اُن کی "لا رپورٹ" کی تازہ ترین "نظیر" یہ ہے کہ مسلم لیگ کو "ہیچ مادیگرے" نظر نہیں آتا! — اللہ اللہ، لمن الملک الیوم؟! للہ الواحد القہار!

کانگریس پریزیڈنٹ اس قسم کی "باخود گرفتاریوں" اور "رجز خوانیوں اور بلند بانگ لبل نوازیوں" پر بجز اس کے کیا کہہ سکتا ہے کہ ع

رَو تو خوش باش کہ ما گوش بہ احمق ندہیم!

مسٹر جناح نے تاناشاہی کانوں سے پنڈت جواہر لال کے پیامِ الفت کی سماعت کی ہے! پنڈت جی کے الفاظ آغازِ خطاب ہی میں یہ ہیں کہ "ہم اقلیتوں کے قلوب میں نفوذِ اعتماد کی خاطر حدودِ عدل سے متجاوز بھی ہو جانے کے لئے تیار ہیں!" — تاہم جناح کو نہرو کی اس جگرداری ودلداری کی مطلق قدر نہیں ہوتی، بجائے اس کے وہ پنڈت کے متعلق "توبۂ وانابت" کی گفتگو کر کے اک تسقیانہ لذتِ نفس حاصل کرنے کے درپے نظر آتے ہیں! ہم بمبئی کے ان حضرتِ "ذوالجناح" کے کرشمۂ مقلب القلوبی پر ایمان لاتے ہیں، لیکن ان "سرپرستانِ اتقا واصلاح" سے بادب پوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر ع

توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند؟

پنڈت نہرو نے اک نہایت دردمندانہ "شکوۂ رنگین" کیا تھا کہ "مسٹر جناح کی روش میں اور جو چاہے ہو، لیکن کوئی دوستانہ ادا تو نہیں ہے!" — عربدہ جو جناح کو دیکھئے کہ اتنی سی بات پر تنک گئے! فرماتے ہیں کہ "یہ کلمہ کہکر کانگریس پریزیڈنٹ نے اپنے سارے بیان کو خراب کر لیا!" — اللہ اللہ یہ نازک مزاجی اور زود رنجی! ہم پنڈت جی کو مشورہ دیں گے کہ وہ جلد جلد اس شعر کی تکرار کریں کہ:

از شکوہ بس کنم کہ دلِ یار نازک است — خوئے کرشمہ نازک ولب یار نازک است!

مسٹر جناح کو پنڈت جواہر لال کا پیامِ مصالحت ومفاہمت سنتے ہی اپنا گھر یاد آیا، — گویا اُن کو یہ گلبانگِ بزم اک اعلانِ جنگ کی طرح مسموع ہوئی!

مگر خیر پنڈت نہرو نے اپنے ہول زدہ حریف کے "تا بخانہ باید و رسانید" کا اہتمام محبت بھی قبول کیا! لیکن بمبئی پہنچکر بھی جناب جناح کے ہوش و حواس بجا نہوئے! یہ سمجھوتے کے "چیلنج" کا پہلا جواب جو اُنھوں نے دیا اُس کی غایت یہ معلوم ہوتی ہے کہ معاملہ صاف صاف گفتگو کے کھُلے میدان سے سازشی راز و نیاز کے مخفی گوشوں میں منتقل ہو جائے! مسٹر جناح کا فرمودہ ہے کہ ہندو مسلم مسئلے کی عصمت اخبارات و جرائد کے کوچۂ و بازار میں رُسوا کی جانے کی چیز نہیں، جناح کی پردہ نشینی اور جواہر کی میدان داری میں کتنا تفاوتِ راہ واقع ہوا ہے! ؎

بنازِ حسن کہ بند د نقاب در خلوت　　　　به رازِ عشق کہ آید برہنہ در بازار!

بزم خاص کی اِس سینہ بہ سینہ گفت و شنید کے آخر معنی کیا ہیں؟ یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ مسٹر جناح انگریزی کی اِس اخلاقی مثل سے واقف ہوں گے کہ "کوئی ایسا کام نہ کرو جسے تم چھپانا چاہو"! —— ہانڈی کُلیا میں گڑ پھوڑنا" مردانِ بیباک کا شیوہ نہیں! کیا مسٹر جناح کو یہ اندیشہ عارضِ حال ہے کہ اگر مذاکراتِ صلح، سرِ میدان ہوئے تو مسلم پبلک اِس بات کے احتساب کا موقع پائے گی کہ مسٹر جناح عامۂ مسلمین کے کیا مطالبات و مقاصد پیش کرتے ہیں، اور کسمپرسِ غربائے ملت کے حقوق کی وکالت سے کس طرح عہدہ بر آ ہوتے ہیں! ظاہر ہے کہ اِن محرومانِ ازلی کے لئے کاونسل کی نشستوں، اعلیٰ سرکاری مناصب کی تقسیموں، صوبجاتی وزارتوں کی شرکتوں کے قضیہہائے نامرغنیہ کوئی درمانِ درد نہیں ہیں، لیکن اُن کے جو مطلوبات و ضروریات ہیں وہ خواہ قوم کی دولت و ریاست کے لئے جانستان ہیں —— پھر عین یہ وہی چیزیں ہیں کہ نیشنل کانگریس جن کی علمبردار ہے! اب مبغوض و مطعون ہندو کانگریسیوں کی طرف سے عام ہندوستانی خلق اللہ کی سیاسی و معاشی نجات کی حرف و حکایت کا چھیڑنا، اور جناح و چھتاری کی بارگاہوں سے وزارتوں کی داد و ستد کے مول تول ہونا، ایسے عبرت انگیز ماجرے ہوں گے جن کا بے نقاب تماشا مُسلم عوام پر شدید ترین خطرات سے لبریز ہوگا! پس یہ امر ناگزیر ہے کہ پبلک پلیٹ فارم کے گرجنے والے، اسلامی حقوق کے وکلائے مُطلق، اپنے شرمناک رازہائے درونِ پردہ پر اک گہری نقاب پڑی رکھنا پسند کریں! ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند　　　　چوں بہ خلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند!

پس کیا تعجب ہے کہ جب پنڈت نہرو نے "رازہائے سینہ گداز" کے حامل جناح "اینڈکو" کو للکارا کہ "بولو! کیا مانگتے ہو؟" تو اُن کی لکنت زدہ زبانیں اک پُر اسرار تخلیہ طلب کرنے لگیں! ؎

عقل بہانہ جو سپر انگند و رم گرفت　　　　در عرصۂ کہ عشق علم کرد رایتے!

مہاتما گاندھی کی طرف سے تجاویز پیش کئے جانے کا استحسان، جس کی اثر آفرینی مسٹر جناح نے کی ہے، یہ بھی اک دلچسپ مافی الضمیر کی غماز نظر آتی ہے! کیا یہ گاندھی جی کے ہاتھ سے اُن کا موعودہ "بلینک چیک" ہتھیانے کی اک آسان پسند آرزو ہے؟! ع

بر تمناہائے عرفی خندہ می آید مرا!

بہر حال مسٹر جناح کے "نقاطِ چہار دگانہ" کا سارا ضخیم دفتر اک "لوحِ سادہ" بن کر رہ گیا ہے! اُنھیں مُطلق یاد نہیں رہا، کہ وہ کیا چاہتے ہیں، وہ ہر "راہگیر" سے چاہتے ہیں کہ اُن کا حافظہ تازہ کر دے! بالآخر وہ گاندھی جی سے اپنی آرزو وابستہ کرتے ہیں، اور بے تکلف کہتے ہیں کہ ؎

دست بکشا جانبِ زنبیلِ ما　　　　مرحبا بر قوتِ بازوئے تو!

مسٹر جناح کی ایک شکایت واللہ کہ بڑی قابل ہمدردی ہے! یعنی صوبجاتی حکومتوں کی کانگریسی وزارتوں میں مُسلم لیگی اُمراء و عمائد کا نہ لیا جانا! جہاں جہاں ارکانِ لیگ وزراء بنائے گئے ہیں وہاں "فقہائے لیگ" کے فتوے کی رُو سے اُنھیں اک "سیاسی ارتداد" پر مجبور کیا گیا ہے! "میثاقِ کانگریس" پر دستخط کرنے کی یہی تعبیر حکمائے لیگ کرتے ہیں! لیکن کانگریسی کابینہائے وزارت کا تعمیری و اصلاحی و تخلیقی پروگرام، خدمتِ خلق کا مبارک عنوان رکھتا ہے! اگر اس کی تائید اور تعاون بھی کوئی سیاسی معصیت ہے تو اہلِ کانگریس کو لازاباں و راجگانِ مسلم لیگ کی پاک دامانیوں کی مطلق ضرورت نہیں! ع

ازآں گناہ کہ نفعے رسد بغیر چہ باک؟!

سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ امر شرمناک ہونا چاہئیے کہ وہ "کانگریس چیلنج" کو قبول کرنے کے معاملے میں کسی ترغیب و تلقین کے ضرورتمند ہوں! کانگریسی حکومتوں کا لائحہ عملِ خدمتِ خلق، اک "ضالۃ المومن" (گمشدہ متاعِ مُومن) ہے، جس پر اُسے بیک نظر لبیک کہنی چاہئیے! کیا اصلاحِ دیہات، تعمیرِ شوارع، چاہ کنی، دستگیریٔ قرضداران، پُشت پناہیٔ کاشتکاران، تعلیم بالغان، انسدادِ مُسکرات وغیرہ وغیرہ ایسی ناشدنی ضلالتیں ہیں جن کے ساتھ وابستۂ ہمدردی و امداد رسانی ہونا، ناقابلِ بخشش الحاد ہے؟! گویا اک مُسلم لیگی

رُکنِ اسمبلی کا یہ اک اَلمناک حشر ہے کہ وہ ایسے مقاصدِ شوُمہ دکار و بارِ لغوش میں اک فریق بنے؟! ع

ببیں کہ از کہ بُریدی و باکہ پیوستی ؟!

ارکان و اعیانِ مسلم لیگ، اور عوام کا لانعام سے یہ ذلت آفرین ہم رشتگی ؟! عامتہ الناس کی خدمت ہم کریں گے تو سینکڑوں روپیہ ماہوار کرائے کی کوٹھیوں اور لاکھوں روپے کے مصارفِ تعمیر سے بنے ہوئے قصور و محلات کے حرَمًا آمنًا کے اندر داد عیش دے کر "ثقافتِ اسلامی" کے نمونوں کی بقا کا اہتمام کون کرے گا ؟ ! ؎

تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست! بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی!

عوام ؟ — استغفر اللہ ! اِن کو کون اشراف منہ لگا سکتا ہے ؟ ! پھر بتایئے کہ کانگرسی مغویوں کی یہ گمراہ گری کیوں کر معاف کی جاسکتی ہے کہ مسلمان عوام الناس میں بیداری و حقوق طلبی کی تحریک کا پرچم کھول چکے ہیں ؟ ! یہ ناشدنی کمینے جب جاگ جائیں گے تو جناح و محمود آباد کے صیدِ زبوں کیسے رہیں گے ؟ ! پس کانگرس کا نو افتتاح "شعبۂ رابطۂ عامۂ مسلمین" اکابرِ لیگ کے لئے اک سازِ موت، بلکہ اک "نفخِ صور" سے کم نہیں ! لہٰذا اِس شعبے کا اقفال، مسلم لیگ کے ساتھ فتحِ بابِ گفت و شنید کی اک شرطِ عظیم ہے ! علمبردارِ عوام کانگرس اپنے درد و سوز کو شکم سیر و خلش ناآشنا اربابِ لیگ کے سامنے بجز اس رجزِ اقبال کے اور کن کلمات میں بے نقاب کر سکتی ہے :

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب ‍ ‍ ‍ از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب!

انقلاب ! انقلاب اے انقلاب !!

حکومت پرست اصحابِ لیگ کو وزارتوں میں داخل ہونے کا کتنا شوق ہے، اور ع

آں ہم سعیٔ غمزۂ مردم شکارِ دوست !

تاہم کانگرسی جماعتِ وزرار کے ساتھ اک جدید ہندوستان کی تعمیر کا سنگِ بنیاد رکھنے کے کام میں ہاتھ بٹانا کم سے کم اقتضائے آئین و شرافت تھا جس کی توقع شرکائے مسلم لیگ سے کی جاسکتی تھی۔ مگر نہیں، یہ بزرگ نواب صاحب چھتاری اور نواب محمد یوسف بالقابہ بن کر قصرِ وزارت میں "سریر آرائے حکومت" ہونا چاہتے ہیں ؟ یا بد مذاق پنڈت پنت اور رہبانِ مزاج راجہ گوپال چاریر کی طرح "عرشِ وزارت" پر بھی جارانہ بیگار کی ازلی بدبختی کی رُسوائی پیش کرنا چاہتے ہیں !! ؎

ماپرتوِ آفتابِ حُسنِ ازلیم ‍ ‍ ‍ فرزندِ ایم آدم و حوا را !

ایسیٔ خارج از آہنگ صدا" بن کر یہ حضرات کانگرسی "سازِ وزارت" کے پردوں میں گھسنا چاہتے ہیں ! تاکہ موجودہ فضائے ملک کی گلبانگِ سعادت کو اک سامعہ خراش شورشِ تخریب میں منتقل کر دیں ! — لیکن ع

مباد ایں جمع را یا رب غم از بادِ پریشانی :

پنڈت نہرو نے مسٹر جناح کے بے سروپا بیان پر فرمایا کہ "لیگ پریزیڈنٹ کا موقف ناقابلِ فہم ہے !" — لیکن اس مشکل آفرینی کے لئے پنڈت جی کو اپنا ہی ممنونِ ذوق ہونا چاہیئے ! سوال یہ ہے کہ آخر ہر چیز قرینِ عقل اور مطابقِ منطق کیوں ہو ؟ ! فرقہ پرست ذہنیت، اختلالِ دماغی کی بدترین قسم ہے ! دراصل اِن لوگوں کے دل بدنیت ہوتے ہیں ! اس بداندیشی کو نبھانے کے لئے اُنھیں اپنے دماغ کو لامحالہ نامعقول بنانا پڑتا ہے ! ؎

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل ‍ ‍ ‍ لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے !

تاہم یاد رہے کہ فرقہ پرست، فرقہ پرست بھی نہیں ہوا کرتے ! بقول پنڈت جواہر لال کے "مخلصانہ فرقہ پرستی کی تسکین ممکن ہے ! بلکہ فرقہ پرستی کے منتشر اجزا کو ہم آہنگ و مطمئن کر کے ہم اک مربوط و مضبوط قومیت کا پیکر ڈھال سکتے ہیں"۔ — لیکن ہیہات کہ متعارف فرقہ پرستی اتنی ہی بُرائی پر قانع نہیں، حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ ہمارے متعارف فرقہ پرست دراصل "خود پرست" واقع ہوئے ہیں ! جب رازِ درونِ پردہ یہ ہے تو آپ اُن کی آڑی ترچھی چالوں کو کیسے سمجھ سکتے ہیں ؟ ! وہ ملت پروری کی عبا و قبا پہنکر ہمارے سامنے آتے ہیں، اور ہم اس بہروپ سے دھوکا کھا کر اُن کے نقاب کی پُرفریب بافت ہی کو اُن کے روئے زیبا کے اصلی خط و خال فرض کر لیتے ہیں ! لیکن پھر سوائے اِس برائے نام نمائش کے کوئی دوسری چیز اُن کے اِدعا سے مطابقت نہیں کرتی، اور ہم اِن بہروپیوں کے ایک ایک سوانگ پر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں ! اُن کے سانپ کے سے بیٹے ہماری گرفتِ ذہن میں آتے ہی نہیں ! اُن کا ایک ایک قول و فعل اک چیستانِ جانستان ہے ! ؎

بلائے جاں ہے غالبؔ اُسکی ہر بات ‍ ‍ ‍ عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا !

ہمیں معلوم ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس نے مسلمانوں اور وطن کی تمام دوسری اقلیتوں کے حقوق و مصالح کی بیش از بیش ضمانت اپنے "منشورِ حقوق" میں کر دی ہے۔ مگر یہ تو اِن جماعتوں کی دادرسی ہوئی، اِن جماعتوں کے

خود ساختہ لیڈروں کو کیا ملا؟! ـــــ جب تک آپ اِن "دلالوں" کو اُن کی "دستوری" نہ دیں گے وہ یہ سودا نہ بننے دیں گے! پولٹیکل خانقاہوں کے بھی مُلّا ہوتے ہیں، اور وہ بھی اتنے ہی خود غرض و بیدرد ہوتے ہیں جتنے کہ مسجد کے مُلّا، ـــــ جنھیں صرف اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے، مردہ جنت میں جائے کہ دوزخ میں!"

"راجندر جناح میثاق" کی طرف، اک ممکن و مستحسن اساسِ مفاہمت کی حیثیت سے، دعوت دئے جانے پر مسٹر محمد علی جناح نے جو ارشاد فرمایا وہ بھی "عدالتی منلق" کا اک دلچسپ نمونہ ہے! جنابِ "قانون پناہی" فرماتے ہیں کہ "یہ اک بہتانِ عظیم ہے کہ میں نے کبھی اِس مجوزہ معاہدے کو قبول کیا! میں نے اُس کے شرائط کو مسلم لیگ کے سامنے پیش کر دینے کا صرف وعدہ کیا تھا، بشرطیکہ دوسری طرف وکلائے کانگریس عام ہندوؤں اور سکھوں کو اُسے منظور کر لینے کے لئے ہموار کر لیں، جو وہ نہ کر سکے!"

یہ کتنی سر دمہر اور گریز آمیز گفتگو ہے! جو لوگ اہم ترین و نازک ترین مہماتِ قوم و وطن کے ساتھ یہ سلوک روا رکھ سکتے ہیں، اُن سے اِن مشکلات میں کسی دستگیری کے بہم پہنچنے کی آرزو ہم نے وابستہ کی ہے؟! ؎

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید　　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے!

خدا شاہد ہے کہ یہ مقدسین اپنے اعماقِ قلب میں اِس اُلٹے وظیفے کا وِرد کیا کرتے ہیں کہ "خدا نہ کرے کہ فریقِ مقابل کبھی آمادۂ صلح ہو!" ـــــ اِس سے مسلمانوں کا کام تو ہو جائے گا، لیکن ہمارا؟! مقدمے کا "راضی نامہ" اک نزاع پیشہ اور نکمّی خوانِ فیس وکیل کے لئے حکمِ "سزائے موت" سے کم نہیں! حضرتِ جوشؔ نے چند ہی روز اُدھر بہرہ "اشارات" میں لکھا تھا کہ "اگر کانگریس کے اربابِ حل و عقد نے کبھی امتحاناً ہی اِن "لیگیوں" سے کہہ دیا کہ جو ممکن مطالبات و تحفظات چاہے لے لیجئے، اور پورا اطمینانِ دل حاصل کر کے مشترک میدانِ جنگِ آزادی میں ہمارے دوش بدوش اُتر آئے تو آخر الذکر بزرگ نہ بغلیں جھانکنے لگیں تو میرا ذمہ!" ـــــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "مردانِ لیگ" کی آزمائش کا وہی روزِ بد آگیا! پنڈت جواہر لال لاکھ کہا کریں کہ "ہم مسلمانانِ ہند کی اقلیت کے قلوب میں اعتماد نفوذ کرنے کے لئے حدودِ عدل سے بھی آگے جانے کے لئے تیار ہیں" لیکن لیڈران کو اِس سے کیا؟! اُن کے لئے اول الذکر وعدہ" اتنا خوش آئند نہیں جتنی کہ ثانی الذکر "وعید" (دربارۂ شرکتِ متحدہ محاذ بخلافِ برٹش امپیریلزم!) وحشت خیز ہے! ؎

وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو اے شیخ　　　ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے!

نواب صاحب محمود آباد و نواب صاحب چھتاری، اور برطانوی قیصریت کی صفِ مخالفین میں آ سا دگی؟! ؎

منع کرتا ہے مجھے یار کے گھر جانے کو؟　　　ناصحا آگ لگے اِس ترے سمجھانے کو!

چنانچہ کانگریس پریزیڈنٹ کے آخری ممکن اتمامِ حجت کی پیش بندی بھی یار لوگوں نے جلدی جلدی کر لی۔ حضرت "ظفر الملۃ" کی تیغ ذوالفقار ــ اخبار زمیندار ـــــ لکھتا ہے کہ "مسٹر جناح کے سارے "نقاطِ چہار دگانہ" پر بھی اگر مُہرِ تصدیق و توثیق ثبت کر دی جائے تب بھی مسلمانوں کے درد کا درماں نہیں ہوتا! ـــــ جب تک کہ ہندوؤں کے دلوں میں اُن کی بدخواہی موجود ہے، اور اُن کی زبانوں پر "بندے ماترم" کا نعرہ!"

آپ سمجھے؟ اب یہ موذی مرض، مالیخولیائی وہم کی زبونی تک متجاوز ہو رہا ہے، جس کی دوا، مشہور طبی مقولے کے مطابق "افلاطون کے دار الشفا میں بھی نہیں!" ـــــ اللہ اللہ اِن فرزندانِ حیدرؓ و جگر گوشگانِ خالدؓ کا ہولِ دل! اِدھر کسی کانگریسی نے حالتِ کیف میں آکر "بندے ماترم" (سلام علیٰ ام الہند!) کی گلبانگِ محبت و عقیدتِ فرزندی بلند کی، اور ان اخلافِ محمود غزنوی و نادر شاہ افشار نے ایران و توران میں جا کر دم لیا! ـــــ ذرا شرم کرو اے مسلمانانِ ہند! ؎

جس باپ کے بیٹے ہو بڑا نام ہے اُس کا
کہلاتے ہو دنیا میں تم "اسلام" کے فرزند!

ہمیں خوف ہے کہ اب چند ہی دن جاتے ہیں کہ "مسلم ثقافت" کے یہ امانت دارانِ اہلِ کانگریس سے یہ فرمائش کریں گے کہ للہ ہمیں استنجا و آبدست لوا دیا کیجئے، اس لئے کہ مہاسبھائی ہندوؤں نے جو یکسر مسلم کُش و اسلام سوز فضا پیدا کر رکھی ہے اُس میں ہم علمبردارانِ تمدنِ اسلامی کے نازک دست و بازو کے لئے اِن شعارِ شریعت کا بلا امداد انجام دینا دشوار ہو رہا ہے! ؎

تُف بہ جمعیتِ تو، تُف بہ پریشانیٔ تو!
اُف کند غیر تبسم بہ مسلمانیٔ تو!

(ا۔اسخ)

بیرونِ ہند!

(۱) رومانیہ، یورپ میں فاسسٹ مشربِ سیاست کا تازہ مُرید بنا ہے، اور اپنے عقدِ بعیت کے ساتھ ہی، اِس سلسلۂ عالیہ کے شجرۂ خبیثہ کے سارے اغلال و سلاسل اس کے اندرونی نظم و نسق کے ایک ایک شعبے اور سر رشتے کو پا بزنجیر کر رہے ہیں! "فاسزم" کا خروج، جدید العہد سیاسیاتِ عالم میں قومی زندگی کی ایک خاص منزل سے گزرنے کی موڑ کی افتادِ بد ہے! جمہوریت جب تک امراء و خواص کی بہتر تنظیم و تعلیم اور عامۃ الناس کی پسماندگی و خود فراموشی کے نتیجے میں، اول الذکر طائفۂ شریفہ کی "خاندانی جاگیر" بنی رہی، وہ اس جمہوریت سے، تقریباً ملوکیت و امارت ہی کی طرح، لطف بھی اُٹھاتے رہے، اور "سیاسی فیاضی" کی نیک نامی سے بھی بہرہ ور رہے! گویا ؎

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا!

تاہم بالآخر عوام پرسے پردۂ غفلت اُٹھنا تھا! لیکن اِس لمحے کے ظہور کے یہ معنی تھے کہ اہلِ دولت و ریاست کے تخت و تاج، نیز اُن کی تاخت و تاراج یہ دونوں خُدائیاں بیک گردشِ ایام تہ و بالا ہو جائیں! اس ہیبت انگیز انقلاب کی وہ بآسانی تاب نہ لاسکتے تھے! وہ گویا اپنی جان بچانے کی سنگینی سے دوچار تھے، اور گھبرا کر ہر ممکن تدبیر، جائز و ناجائز، پر اُتر آئے، سارے نظامِ نیابتی کا تعطل، پارلیمان و بلدیات کا عزل، تمامی شہری آزادی کی منبطی وغیرہ وغیرہ وہ تعدّیاں ہیں جو خوگرِ حکومت و لذت طبقۂ خواص اس مرحلۂ نازک پر عامۂ قوم پر توڑ دیتا ہے! —— اور یہی ہے شانِ نزولِ فاسزم کی! رومانیہ کو فاسزم کے یہ سارے عطیات و برکات آناً فاناً مل گئے ہیں،

گر نستانی بستم می رسد!

لیکن واضح رہے کہ فاسزم، خواص و امراء کی قوت کی کوئی نمائش نہیں ہے، اُنکی کمزوری کی غمازی ہے! اس مصنوعی نظامِ قہر و جبر کے یہ معنی ہیں کہ ملک کے جمہور کے آزاد ووٹ کے ایوانِ عدل سے یہ لوگ معزول ہو چکے ہیں! اور اب سیاسیاتِ ملکی سے خارج البلد ہوتے ہوئے، سرحدِ ملک پر، دوبارہ دراندازی کے لئے دھینگا مُشتی کر رہے ہیں! مگر یہ سینہ زوری کب تک؟ سارے ملک کو میدانِ جنگ میں تبدیل کر دینا، اور سالہا سال تک زمانۂ امن کے پُرسکون نظم و نسق کو اک دَورِ مارشل لا میں منقلب کر دینا —— اِس عذاب کی تاب خود فاسسٹ ڈکٹیٹروں کے آہنی اعصاب بھی کب تک لاسکیں گے؟ ؎

گرم تا کے بماند ایں بازار؟!

"فاسزم" عبارت ہے دیوِ استبداد کی اُس آخری پاکوبی سے جس کے بعد ہی وہ ہاتھ پاؤں چھوڑ دے گا۔ اور عصائے حکومت علمبردارانِ جمہوریتِ معاشی کے سپرد کر دے گا! ؎

خوش بُود کہ ایں آمد و خوش بود کہ آں رفت!

(۲) **فلسطین**:- اس ملک پر برطانوی سیاست کی دسیسہ کاری اک اور افسون پڑھنے کی قسمت آزمائی کر رہی ہے، سابقہ مامور کردہ کمیشن کی بلند بانگ روئداد کے تقویمِ پارینہ ہو جانے کے بعد، خیر سے اک اور کمیشن مزید مطالعۂ حالات اور بہتر "تدبیرِ امر" کے لئے بھیجا گیا ہے! کیوں نہو! قیصریت کا کُلچہ مکر و فریب کہیں خالی ہوسکتا ہے! —— تاہم یاد رہے کہ نوخیز و آتش ریز "مجاہدین" ارضِ صلاح الدین" جھوٹ کی اس پوٹ کو بھی اپنی بے پناہ سنگینوں سے پارہ پارہ کر کے رہیں گے، اور فلسطین کے مسئلے کا آخری حل یہی ہو گا کہ برطانوی "علمبرداری" اور یہودی "دراندازی" بیک بینی و دوگوش اس ارضِ مقدس سے رخصت ہو جائیں، نکہ اُن کا کمیشن پر کمیشن، مہمان ناخواندہ کی طرح، اِس خاکِ پاک پر نازل ہوتا رہے! ؎

مرا بخیر تو اُمید نیست، شر مرساں!

(۳) **چین و جاپان**:- چین اگر جاپان کے سیلابِ عسکریت کو روک نہیں سکا ہے، تو جاپان کے لئے بھی یہ ممکن نہیں ہوا ہے کہ وہ عظیم چین کے پیکرِ مہیب کو بیک لُقمہ نگل جائے، اور بیک گردشِ معدہ اُسے ہضم و جزوِ جسم بنالے! یہ معرکہ بہ تمام آثارِ ظاہر اک طولانی آویزش بنتا نظر آتا ہے! چین نے اپنی وسیع دامانی کے ساتھ، اپنے دست و باز کی بھی تھوڑی صلابت کا ثبوت دیا ہے۔ ماضی قریب کے متعدد میدانوں میں اُس نے نہ صرف خاصی استقامت پیش کی ہے بلکہ بعض مفتوحہ مقامات و استحکامات کی بازیافت کا کارنامۂ نادر بھی انجام دیا ہے، جاپان اس قضیۂ نامرضیہ کی بلائے بیدرماں کو محسوس کر رہا ہے، وہ اس جنگ کو کم از کم ۳۹ء کے اختتام تک طوالت پذیر ہوتا دیکھتا ہے! پھر جنگ

کے ایک ایک شب و روز کا بارِ مصارف جیسا کمر شکن بننے والا ہے اُس کا اندازہ کچھ اس بات سے کیجئے کہ تازہ جاپانی میزانیہ میں صرف مطالباتِ جنگ کی مد گزشتہ سالوں کے پورے پورے بجٹ کی میزانِ کل کے برابر واقع ہوئی ہے! ع

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا !

ایک چیز اس ڈرامے میں اسٹیج کی نئی تعمیر و ترتیب کی پیامبر بن کر آئی ہے! چین کے جدید عارضی مستقر حکومت، چیون کیونگ سے، براہِ چینی ترکستان، روسی علاقہ ملحقہ تک ۲ لہ ہزار میل طویل اک اہم ریلوے لائن تمام ممکن سرعت و عجلت کے ساتھ تعمیر ہونی تجویز ہوئی ہے! یہ گویا "الیسٹرن چائینز ریلوے" کا نعم البدل ہوگی، اور موت و حیات کے اس معرکے میں چین کی نا درپشت پناہ ثابت ہوگی! بہر حال چین کا پیامِ رزم و بزم جاپان کو یہ ہے: ؎

اگر صلح خواہی، نخواہیم جنگ
وگر جنگ جوئی، نہ بینی درنگ (ا-ا-خ)

شاعر

محبت کی نظر ہوں میں، حدیثِ معتبر ہوں میں
فغاں ہوں میں اثر ہوں میں، اثر مجھ سے فغاں مجھ سے

سکوتِ شامِ صحرا میں، تلاطم زارِ دریا میں
لیا کرتی ہے فطرت ہر جگہ، کارِ زباں مجھ سے

میں اک شوریدہ سر ہوں، مست ہے روحِ ازل مجھ میں
میں اک بےچین دل ہوں، تیز ہے نبضِ جہاں مجھ سے

مری جادو بیانی آنکھ کے جادو جگاتی ہے
نگاہِ نازِ جاناں سیکھتی ہے شوخیاں مجھ سے

سکھاتا ہوں مزاجِ عشق کو آئینِ خودداری
متاعِ دل ہے بازارِ محبت میں گراں مجھ سے

میں اک آتشکدہ ہوں، زندگی کے سوزِ پنہاں کا
ہوا جب تیز چلتی ہے تو اُٹھتا ہے دھواں مجھ سے

میں اک بانگِ درائے کارواں ہوں یعنی شاعر ہوں
بہت پیچھے رہا کرتا ہے، میرا کارواں مجھ سے

بتائیدِ نظر ہوں، ترجمانِ حالِ دل طرزی
زباندانِ محبت، مانگ لیں میری زباں مجھ سے

محمود طرزی، کلکتہ

یہ نظر کس کے لئے ہے؟

اے نرگسِ جاناں! یہ نظر کس کے لئے ہے؟
یہ شعلہ، یہ بجلی، یہ شرر کس کے لئے ہے؟

اے زہرہ جبینوں کے لئے پیکِ ہزیمت!
پیغامبرِ فتح و ظفر کس کے لئے ہے؟

اے تجھ کو بلے عمر مری شامِ بلا کی
یہ زلفِ رسا تابہ کمر کس کے لئے ہے؟

اے سایۂ کاکل میں جھمکتے ہوئے عارض
ظلمات میں یہ آبِ خضر کس کے لئے ہے؟

اے قامتِ بالا و بلند، اے قدِ موزوں
یہ سرو، یہ شاخِ گلِ تر کس کے لئے ہے؟

اے دیدۂ مے پرور و اے نرگسِ مخمور!
چھلکا ہوا یہ ساغرِ زر کس کے لئے ہے؟

اے عارضِ ناشستہ و رُوئے عرق آلود!
یہ شہد، یہ شبنم، یہ شکر کس کے لئے ہے؟

اے تجھ پہ فدا چشمکِ خورشیدِ جہاں تاب
رُخ پر یہ تبسم کا اثر کس کے لئے ہے؟

اے زانوئے کونین کی دیرینہ تمنّا!
قرباں تری زلفوں کے یہ سر کس کے لئے ہے؟

اے حسنِ رُخِ روشن و اے جلوۂ کاکل!
یہ ہوش ربا شام و سحر کس کے لئے ہے؟

اے تیرے قدم پر سرِ خوبانِ سرافراز
یہ ناز، یہ دزدیدہ نظر کس کے لئے ہے؟

اے گیسوئے آشفتہ و اے کاکلِ برہم
یہ عمرِ مسیحا و خضر کس کے لئے ہے؟

اے خود سے اُلجھتی ہوئی بدمست جوانی
ہر سانس میں یوں زیر و زبر کس کے لئے ہے؟

اے شوخ! کبھی جوش سے اِس نظم کی ضد پر
یہ پوچھ کہ تو خاک بسر کس کے لئے ہے؟

جوش ملیح آبادی

دو دوائیں جنکا دنیا میں جواب نہیں
جل جلان
خارش خشک وتر۔ داد۔ گنج۔ پھوڑے۔ پھنسی۔ گرمی دانے۔ جھائیں۔ کیل۔ مہاسے۔ سوزاک۔ آتشک۔ گٹھیا وجع المفاصل۔ برص۔ اور جذام۔ غرض فساد خون سے پیدا ہونے والی تمام بیماریوں کے لئے نہایت مفید ہے۔ قیمت شیشی ۱۲ قرص پندرہ آنے
جمیلان
جریان کیلئے اس سے بہتر کوئی دوا نہیں۔ جریان کی طرف فوراً توجہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ رفتہ رفتہ یہ مرض بہت کمزور کر دیتا ہے اور تمام اعضائے رئیسہ بیکار ہو جاتے ہیں۔ جریان نیا ہو یا پرانا جمیلان ہر حالت میں اکسیر ثابت ہوئی ہے قیمت شیشی ۳۲ قرص چار روپے آٹھ آنے
نوجیون
مسیح الملک حکیم اجمل خان صاحب مرحوم کا خاص عطیہ
طاقت اور تندرستی کیلئے ہر اکسیر سے بڑھکر
جاڑے کا موسم ضایع نہ کیجئے
طلاء زود اثر
یہ طلاء ان لوگوں کیلئے ہے جن میں سستی اور جوش کی کمی پائی جاتی ہے اس کے استعمال سے پہلی رات میں اثر ظاہر ہوتا ہے مسلسل استعمال سے کمزوری سستی۔ رگ اور پٹھوں کی خرابیاں دور ہو جاتی ہیں۔ نہایت مفید چیز ہے قیمت شیشی ایک ماشہ بارہ آنے۔
طلاء عجیب
ان لوگوں کیلئے جو اپنے ہاتھوں اپنی مٹی خراب کر چکے ہیں اور غلط کاریوں نے انھیں کسی قابل نہیں رکھا ہے۔ طلاء عجیب نئی زندگی کا حکم رکھتا ہے عضو کی کجی۔ لاغری کمزوری اور کوتاہی دور ہو جاتی ہے۔ اور رگوں سے مادہ فاسد خارج ہو کر از سر نو طاقت حاصل ہوتی ہے قیمت شیشی ۷ ماشہ چار روپے
نوجیون باہ اور مردانہ قوت کے لئے ایسی عجیب ثابت ہوئی ہے کہ دنیا کی کوئی مقوی دوا اس کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ اسکی چند خوراکیں قیامت برپا کر دیتی ہیں۔ اور انسان اپنے اندر وہ طاقت وہ جوش اور وہ ہمت محسوس کرتا ہے جو اس کے خیال میں بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ بیحد ممسک اور بیحد مقوی ہے۔ اور وقت پر پشیمانی سے بچا لیتی ہے۔ بکثرت خون پیدا کرتی ہے۔ تمام اعضاء کو طاقت دیتی ہے۔ ایک شیشی ایک سال تک اثر رکھتی ہے۔
ان خوبیوں کے مقابلہ میں قیمت بہت کم ہے یعنی
۴۰ قرص کی قیمت
سات روپے آٹھ آنے
نوٹ:۔ پہلے ایک قرص صبح دودھ کے ساتھ کھائیں جب عادت ہو جائے تو روزانہ دو قرص استعمال کریں۔
حب ممسک مشکی
یہ گولیاں وقت پر پشیمانی سے بچا لیتی ہیں۔ سرعت کی شکایت بالکل دور ہو جاتی ہے۔ تمام مضر صحت اثرات سے پاک ہیں۔ انکی بدولت ان لوگوں کی جوانی کمزوری کی وجہ سے آمادہ خودکشی تھی وقت پر کامیابی حاصل کی۔ قیمت شیشی ۱۲ گولی ایک روپیہ
قرص عجیب
آج تک دنیا میں کثرت احتلام کی اس سے بہتر دوا دریافت نہیں ہوئی۔ عرصہ دراز کی شکایت چند خوراکوں میں جاتی رہتی ہے۔ رقت وسرعت بھی رفع کرتی ہے۔ ایسی حکمی دوا ہے کہ سو فی صدی کامیاب ہوتی ہے قیمت شیشی ۱۲ قرص بارہ آنے۔
ملنے کا پتہ
منیجر ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس ۲۲ دہلی

ہز مجسٹی فاروق شاہ مصر کی شادی

بنام قوت و حیات

کلیم دہلی

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا

قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم
بہروں کو سُنائے جا ترانہ اپنا

منظور شدہ
ڈائرکٹران تعلیم
ریاستہائے میسور، پٹیالہ وحیدرآباد دکن

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے
سہ ماہی چندہ، دو روپے
قیمت فی پرچہ، نو آنے

جلد ۵ — نمبر ۳

فہرست مضامین بابتہ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۸ء

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ کلیم دریا گنج نمبر ۴ جسے

اشارات

جماعت ہائے خوف

انسان قرائن و علامات سے اُن باتوں کا پتا چلا لیتا ہے جو اُس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتی ہیں۔

تفکّر کے معنی ہی یہی ہیں کہ دو یا دو سے زائد اُمورِ معلوم کو اس طور سے مُرتّب کر لیا جائے کہ تیسری غیر معلوم چیز کا علم خود بخود حاصل ہو جائے۔

جب ہم کسی کے دروازے پر راکھ کا ایک بہت بڑا انبار دیکھتے ہیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ یا تو اُس شخص کے وہاں کوئی دعوت تھی، یا لنگر جاری کیا گیا تھا، یا وہ ایک بہت بڑے خاندان کی روزی کا کفیل ہے۔

اِسی طرح جب ہم کسی مقام پر گھونسوں اور چوہوں کا ہجوم دیکھتے ہیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ کہیں قریب ہی کوئی غلّے کا گودام ضرور موجود ہو گا۔ یا جس وقت ہم کہیں مچھّروں وغیرہ کی کثرت دیکھتے ہیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ وہ مقام گندہ اور مرطوب ہو گا۔

یا جب ہم پولیس کے ایک دستے یا آگ بجھانے والے انجن کو بسرعتِ تمام کسی طرف جاتے دیکھتے ہیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ کسی جگہ بد امنی، اور آتش زدگی کا فتنہ ضرور برپا ہو گیا ہے۔

اسی طرح جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کسی مقام پر نوابوں رائے بہادروں، بہادروں، سروں اور رائٹ آنریبلوں کا اجتماع ہو رہا ہے اک سیاسیات میں عنقریب کوئی نہ کوئی وطن فروشی و برادر کُشی کا نیا فتنہ برپا کیا جانے والا ہے۔

بعینہٖ یہی حال "ہندو مہاسبھا" اور "مُسلم لیگ" کا ہے ——— اِن دونوں جماعتوں میں جن میں حکومت نواز طبقہ کا رواں در کارواں داخل ہو رہا ہے، حکمرانی کے حقوق حاصل ہیں، نوابوں اور رائٹ آنریبلوں کو ——— اور اِن دونوں جماعتوں کی رُوحِ رواں ہیں، وہ حضرات جو مُلک کی مجموعی قوّت کو توڑ کر خود اُبھرنا چاہتے ہیں،

یہ دونوں جماعتیں "مذہب" اور "تمدّن" کا نام لیکر ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے خوف و نفرت کے جذبات مشتعل کرتی رہتی ہیں ———

خدا جانے ہم ہندوستانیوں کی عقلوں کو کس کی نظر کھا گئی ہے کہ ہم موٹی موٹی باتیں بھی نہیں سمجھتے۔

یہ بات دس ہزار باتیوں اور بیس ہزار مشائخ اور پانڈوں سے زیادہ موٹی ہے کہ ہندوستان کی خطاب یافتہ جماعت اگر دنیا میں کسی سر زمین سے محبت نہیں کر سکتی ہے تو وہ وطن اور صرف وطن کی سر زمین ہے۔

اور یہ حقیقت دس ہزار آفتابوں اور بیس ہزار ماہتابوں سے زیادہ روشن ہے کہ کوئی راعی، اپنی رعیت کے کسی فرد کو اُس وقت تک خطاب نہیں دے سکتا جب تک کہ خورد بینی مطالعے کے بعد اُسے حق الیقین کی حد تک اس کا علم نہیں ہو جاتا کہ جس شخص کو خطاب دیا جا رہا ہے وہ شخص پیدائشی وطن فروش، اور مادر زاد غدار ہے، اور اِس حد تک وطن فروش و

مُدیر

غدّار ہے کہ حکومت کے ایک ادنیٰ سے اشارے پر اپنی تمام قوم، اپنے تمام خاندان، اور اپنے تمام بال بچوں کو تہ تیغ کر کے بھی پچھتا نہیں سکتا، اور پچھتانا تو بڑی بات ہے وہ حکومت پر تمام گھر بار قربان کر کے فخر محسوس کر سکتا ہے ——— اور کیا آپ کو معلوم نہیں کہ "ہندو مہاسبھا" اور "مسلم لیگ" میں انھیں خطاب یافتہ "شرفا" کو اقتدار حاصل ہے؟ اور کیا آپ اِن کمشنروں اور گورنروں کے لاڈلوں، اِن ڈپٹی کمشنروں اور ڈپٹی کلکٹروں کے چہیتوں، اِن تحصیلداروں اور تھانیداروں کے جگر گوشوں، اور اِن ہیڈ کانسٹبلوں اور چپراسیوں کی آنکھوں کے تاروں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ اغراض کے بندے، یہ تن آسانیوں کے غلام، اور یہ موٹروں، مسہریوں میں کروٹیں بدلنے والے گوشت کے سانس لیتے ہوئے سڑے لوتھڑے اپنے ملک کے واسطے کوئی قربانی کر سکیں گے، اور آزادی کی جنگ میں آپ کا ہاتھ بٹانے کا خواب تک دیکھ سکیں گے؟

اگر آپ کے دل میں اِن خطاب یافتہ حضرات اور ان خطاب یافتہ حضرات کی بنائی ہوئی "ہندو سبھا" اور "مسلم لیگ" کی طرف سے ادنیٰ سا بھی حسنِ ظن موجود ہے تو میں آپ کو مژدہ سناتا ہوں کہ مندرجۂ ذیل دو باتوں میں سے ایک تو ضرور ہی آپ کے اندر موجود ہے، یعنی یا تو آپ کے دل میں کھوٹ ہے، یا آپ کی عقل میں فتور ہے۔

اگر نصیبِ دشمناں آپ کے دل میں کھوٹ ہے، تو میں بیچارہ کیا حیثیت رکھتا ہوں، اگر آسمانوں سے بھی آوازیں آنے لگیں گی کہ "ہندو مہاسبھا" اور "مسلم لیگ" ایک سراب و فریب ہے، پھر بھی آپ نہیں مانیں گے، روحِ غدّاری کی قسم کہ پھر بھی آپ نہیں مانیں گے ———

اور اگر آپ کی عقل میں فتور ہے، لیکن کامل فتور نہیں ہے تو میں آپ سے مایوس نہیں ہوں ——— کیونکہ اِن دونوں جماعتوں کا فریب اتنا کھلا ہوا ہے، اور اِن دونوں جماعتوں کے مداری اِس درجہ برہنہ ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے آج نہیں تو کل ضرور ہی اتفاق فرمائیں گے۔

لگے ہاتھوں ایک جلوس کا حال سُن لیجیے، جس کے دیکھنے کا ایک ہفتہ ہوا کہ مجھے شرف حاصل ہوا تھا ——— یہ جلوس چونکہ لیگ کے "قائدِ اعظم" اور لیگی مسلمانوں کے "فخرِ ملت" حضرۃ جناح کا تھا ——— اِسی وجہ سے میں اِس موقع پر اس کا تذکرہ نامناسب نہیں سمجھتا ہوں۔

میں یُو، پی کے ایک شہر میں رات کے وقت پہونچا، جہاں یہ معلوم ہوا کہ کل مسٹر جناح کا جلوس نکلنے والا ہے، چنانچہ صبح ہوتے ہی میں اُس سڑک پر پہونچ گیا، جدھر سے جلوس نکلنے والا تھا۔

وہاں پہونچ کر سب سے پہلے تو میں نے یہ دیکھا کہ ہندوؤں کی دوکانیں بند ہیں، اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہندوؤں نے محض اس خوف سے دوکانیں نہیں کھولی ہیں کہ کہیں اربابِ جلوس اُن پر حملہ کر کے اُن کی دوکانیں نہ لُوٹ لیں، اِس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہندو مسلمان سے، اور مسلمان ہندو سے کس درجہ خوفزدہ بنا دیا گیا ہے ———

ظاہر ہے کہ آدمی جس سے ڈرجاتا ہے، اُس سے محبت نہیں کرسکتا، اور اِسی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے سبھائیوں اور لیگیوں نے ہندوؤں کو مسلمانوں سے اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے دہشت زدہ بنا دیا ہے تاکہ اُن کے درمیان محبت کے پیدا ہونے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے ———

میں ابھی اِس مسئلے پر غور ہی کر رہا تھا کہ ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان سے پکار کر کہا کہ آج جواہر لال اور رنجیقہ مر گیا ہے، اُن کی لاشیں تھوڑی دیر میں گزرنے والی ہیں۔

یہ سُنکر مجھے جس قدر صدمہ ہوا اُس کی شرح نہیں کرسکتا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ لیگ نے مسلمانوں کے پاک نُطفوں کو کس قدر جی بھر کے مکدّر بنا دیا ہے، اور ایک جوانمرد اور بہادر قوم کو زیادہ بہادر بنانے کے عوض، اُنھیں بیکس عورتوں کی طرح بُرا بھلا کہنے اور کوسنے کی عادت میں کس چالاکی کے ساتھ مبتلا کر دیا ہے۔

اس حقیقت سے آپ مجھ سے کہیں زیادہ واقف ہوں گے کہ کوسنے والے کی ذہنیت کیا ہوتی ہے، اور کوسنے والا طاقت سے کس درجہ محروم ہوا کرتا ہے۔ اور کوستا وُہی ہے جو اپنے میں شدّت کے ساتھ بیچارگی و ناطاقتی محسوس کرتا ہے ——— بہادر آدمی تلوار کے ذریعے سے دشمن کا کام تمام کر دیتا ہے، اور بزدل چونکہ تلوار پکڑ نہیں سکتا، اِس لئے کوس کوس کر ہی اپنا جی ٹھنڈا کر لیتا ہے۔

خدارا حضرۃِ اقبال کو خبر دو کہ مسلم لیگ نے اُن کے "شاہین بچے" کو اب اس قدر بزدل بنا دیا ہے کہ "زاغ" پر حملہ کرنے کے عوض، اب اُسے بددعائیں دینے لگا ہے، حالانکہ شکار اُس کی سب سے بڑی عبادت ہے۔

کرشن بھگوان کا واسطہ کہ جنابِ مونجے کو کوئی اطلاع دو کہ نہاسبھا نے اُن کی ذریت
سیواجی کو اِس قدر بزدل بنا دیا ہے کہ اب وہ آلِ اورنگ زیب کے خوف سے
دوکانیں نہیں کھول سکتی ہے۔ حالانکہ دوکانداری اُس کا سب سے بڑا ایمان ہے۔

جب کسی مُلک میں انقلاب ہونے والا ہوتا ہے تو تاریخ ہمیں بتاتی ہے
کہ اُس موقعے پر وہاں انقلاب کی آخری ضرب سے پہلے ایک جماعت رُونما
ہوتی ہے، جس کے اعمال واقوال ایسے ہوتے ہیں کہ بجا طور سے اُسے جماعتِ
خوف" کا لقب دیا جاسکتا ہے۔ اور جیسا کہ انقلابِ فرانس کے موقعے پر ہوچکا
ہے، اس "جماعتِ خوف" کا لے دے کے صرف یہی کام ہوتا ہے کہ وہ لوگوں
کو انقلاب کے نتائج سے ڈراتی، اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے خوف
دلا کر پھوٹ ڈال دیا کرتی ہے ـــــ چنانچہ بحمد اللہ کہ ہمارے
دورِ انقلاب میں بھی "سبھا" اور "لیگ" دو "جماعتہائے خوف" پیدا ہوچکی
ہیں، جن کا یہ واحد فریضہ ہے کہ وہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے، اور مسلمانوں
کو ہندوؤں سے ڈراتی رہیں ـــــ اور ایک دوسرے کو تاقیامت
متحد نہ ہونے دیں۔ تاکہ غلامی کی عمر، دراز سے دراز تر ہوتی چلی جائے،

ہاں تو میں جلوس کا ذکر کر رہا تھا ـــــ کوئی دس یا گیارہ
بجے مسٹر جناح کا جلوس جن کی پُشت پر برہنہ تلواروں کا پہرا تھا، چورا ہے پر
آکر رکا، جہاں متعدد انجمنوں نے اُن کی خدمت میں ایڈریس پڑھ کر سُنائے۔

ہر ایڈریس میں مسٹر جناح کا شکریہ ادا کیا گیا تھا کہ اُنھوں نے عین
اُس وقت جب کہ برادرانِ وطن ہمیں ہضم کر جانے والے تھے، ہم کو موت
کے پنجے سے چھڑا لیا۔

مسلمانوں کی سی برق و آتش سے کھیلنے والی سُورما قوم اور یہ کہے کہ
مجھے ہندو نگل جانے والا تھا! اور اُس کے ساتھ شکریہ ادا کرے مسٹر جناح
کا کہ اُنھوں نے اُسے موت کے جبڑے کے اندر سے کھینچ لیا!

مسلمان، اور مسلمان کو موت سے بچا لینے والے کون؟ مسٹر جناح!!

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

اس کے بعد مسٹر جناح، جو "خان بہادروں" اور "خان صاحبوں" کے
حلقے میں کمر تک ڈوبے ہوئے تھے۔ تقریر کے لئے کھڑے ہوئے، اور عبرت
کے کانوں سے یہ خبر سُنی جائے گی کہ "قائدِ اعظم" کی زبانِ مبارک جو پہلا
لفظ نکلا وہ "خان بہادر" تھا، یعنی اُنھوں نے اپنی عزت افزائی کے سلسلے
میں ایک "خان بہادر" کا سب سے پہلے شکریہ ادا کیا، اور اُس کے بعد فرمایا
"مسلمان بھائیو!"

یہ ترتیب بہت اچھی تھی، یعنی "خان بہادر" پہلے اور "مسلمان بھائیو" بعد
کو ـــــ کیونکہ لیگ جس اسلام کی حفاظت کے لئے کھڑی ہوئی ہے، وہ اسلام
"خان بہادروں" ہی کے ذریعے سے اُس تک پہونچا ہے ـــــ

اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ یہ لیگ والا اسلام جو "خان بہادروں" کی
وساطت سے لیگ تک پہونچا ہے، اِن "خان بہادروں" پر کہاں سے
نازل ہوا ہے؟

مدینۂ منورہ سے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ پھر کہاں سے؟ وہائٹ ہال سے!!

لیکن پریشان و مایوس ہونے کے عوض، "ہندو سبھا" اور "مسلم لیگ"
کو دیکھ کر ہمیں خوش ہونا چاہیئے۔ کیونکہ، جیسا کہ اُوپر عرض کیا جاچکا ہے،
ہر دَورِ انقلاب میں ایک "جماعتِ خوف" کا رُونما ہونا ایک طرف تو ایک
لازمی اور قدرتی امر ہے، اور دوسری طرف اِس بات کی روشن دلیل ہے
کہ اب انقلاب کی کمانی پُورے طور سے کُھلنے کے قریب آچکی ہے۔

ہر دَورِ انقلاب میں جب اغیار کا اقتدار اپنی بقا کی تمام تدبیروں
سے مایوس ہو کر گھبراہٹ کے عالم میں ہات پاؤں مارنا شروع کرتا ہے تو
اُس کی اِس حرکتِ مذبوحی سے ایسے افراد اور ایسی انجمنیں پیدا ہوجاتی
ہیں جو اغیار کے قدم جمانے کی خاطر مُلک کے طول و عرض میں اپنے اپنے
مذہب و تمدن کی آڑ پکڑ کر باہمی خوف و نفرت پیدا کردینے کو سلطنت
کی سب سے بڑی نمک حلالی اور خدا کی سب سے بڑی عبادت سمجھتی ہیں،
لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسی جماعتیں دیر تک زندہ نہیں رہا کرتیں
ـــــ اِن کی اُچھل کُود آنی و فانی ہوا کرتی ہے۔ یہ تھوڑی دیر اپنا قدرتی
پارٹ ادا کرکے ہمیشہ کے لئے فنا ہوجاتی ہیں،

دوستو! گھبراؤ نہیں، یہ جماعتیں ہمارے سیاسی اُفق پر ایک پل بھر
رہنے والا غبار ہیں ـــــ اِس وقت ہندوستان کی دُنیائے
سیاست میں رات کے تین بج چکے ہیں ـــــ تاریکیاں ایڑی چوٹی
کا زور لگا رہی ہیں کہ نُور کو فضا میں داخل نہ ہونے دیں ـــــ مگر آفتابِ
آزادی ہے کہ اُبھرتا ہی چلا آرہا ہے، اور تاریکیوں کے چہرے فق ہوتے
چلے جا رہے ہیں۔

افسوس ہے ہمارے بزرگوں پر کہ وہ سیاسی رات کے بارہ بجے ہی دُنیا سے رُخصت ہو گئے اور خوش قسمت ہیں ہم، کہ ہماری رات ڈھل چکی ہے، اور سحری کا کانٹا رات کے تین بجا کر آگے کی طرف گزر چکا ہے ——— اور بھیگی ہوئی رات کی دبے پاؤں چلنے والی خنک ہوائیں گنگنا رہی ہیں کہ:-

مژدہ اے دل کہ مسیحا نفسے می آید
کہ ز انفاسِ خوشش بوئے کسے می آید

شامِ رخصت

تجھ سے رُخصت کی وہ شام اشک افشاں ہائے ہائے
وہ اُداسی، وہ فضائے گریہ ساماں ہائے ہائے

وہ مرے سینے میں سیلِ آب و آتش، الاماں
وہ ترے چہرے پہ موجِ برق و باراں، ہائے ہائے

وہ مرا عشقِ گُل افشاں، رشتہ برپا حیف حیف
وہ ترا حُسنِ جواں، سر در گریباں، ہائے ہائے

وہ تپِ غم سے مری آنکھوں میں سُرخی، الغیاث
وہ پسینے سے ترے رُخ پر چراغاں، ہائے ہائے

وہ مرے اطوار میں اندازِ سیلِ بے پناہ
وہ تری آواز میں آثارِ طوفاں، ہائے ہائے

وہ جدائی کی ہوا کے تُند جھونکے، وائے غم
وہ جوانی کا چراغِ زیرِ داماں، ہائے ہائے

اِس طرف اُلجھی ہوئی موجِ حیاتِ یک نفس
اُس طرف بکھرے ہوئے گیسوئے تاباں، ہائے ہائے

اِس طرف تاریکیٔ شامِ مریضانِ کہن
اُس طرف اندوہِ صُبحِ سوگواراں، ہائے ہائے

یاں چمکنے ہی پہ برقِ نالۂ درد آفریں
واں برسنے ہی پر ابرِ چشمِ حیراں، ہائے ہائے

ہائے ہر اک تارِ نظر، زنجیرِ پائے عافیت　　واں ہر اک موجِ نفس، دیوارِ زنداں، ہائے ہائے

یاں لبوں پر جُنبشِ آہِ تُنک جاں، وانصیب　　واں مژہ میں لرزشِ اشکِ گریزاں، ہائے ہائے

حسرتِ دیدار، یاں ہر آن بیتاب و شدید　　فُرصتِ نظّارہ، واں پیہم پرافشاں، ہائے ہائے

یاں لرزتا ساغرو رِعزم و ہمّت، الحذر　　واں جھجکتی سی نگاہِ فتنہ ساماں، ہائے ہائے

یاں کفِ پا چوم لینے کی بِچھی سی آرزو　　واں بَغل گیری کا سَرا پا سا ارماں، ہائے ہائے

میں سراپا سازِ عشرت، اور رہینِ بزمِ غم　　تو مجسّم نازکی، اور بارِ حِرماں، ہائے ہائے

تمتماتے ولولوں کی آگ، اور تیرا جگر　　سنسناتی آنچ، اور تیرا گُلستاں، ہائے ہائے

کاکلوں کی چھاؤں میں اور رُوئے رنگیں، الاماں　　ظُلمتوں کے دام میں، اور آبِ حیواں، ہائے ہائے

وہ مری نظروں میں کچُھ کہنے کی حسرت، وائے شوق　　وہ تری آنکھوں میں کچھ سُننے کا ارماں، ہائے ہائے

اللہ اللہ آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کہنا ترا　　"جوشؔ! میرا دل ہوا جاتا ہے ویراں"، ہائے ہائے

اے فُغاں برلب ترنُّم، اے خزاں برکف بہار!
جوشؔ تیرے دل کی ویرانی کے قرباں، ہائے ہائے

جوشؔ ملیح آبادی

اُٹھا ساغر، کہ انساں کشتۂ آلام ہے ساقی
یہ بربط ہے، یہ مے، آگے خدا کا نام ہے ساقی

نہ جانے نوعِ انساں کیوں اجل سے خوف کھاتی ہے
اجل کہتے ہیں جس کو زحمتِ یک گام ہے ساقی

حقیقت کیا سمجھ میں آسکے اشیائے عالم کی
فقط اک شکل ہے ساقی، فقط اک نام ہے ساقی

سناؤں سازِ حکمت کے ترانے کس توقع پر
کہ اب تک نوعِ انساں بندۂ اوہام ہے ساقی

صداقت آج بھی پوشیدہ ہے اولادِ آدم سے
دروغِ مصلحت آمیز اب بھی عام ہے ساقی

اُدھر یہ قول، ہم نے شرح کر دی ہے حقائق کی
اِدھر اب تک وہی ابہام کا ابہام ہے ساقی

اُدھر "تکمیلِ دیں" کا ہو چکا ہے دعوئ محکم
اِدھر ایماں تھا جیسا خام، اب تک خام ہے ساقی

اُدھر شدّت کے ساتھ اعلان ہے "اتمامِ نعمت" کا
اِدھر ہر سانس اب تک زہر کا اک جام ہے ساقی

کہا جاتا ہے مجھ سے زندگی انعامِ قدرت ہے
سزا کیا ہوگی اُس کی جس کا یہ انعام ہے ساقی

شکایت کیا کسی خوں ریز چنگیز و ہلاکو کی
خود اپنا دل ہی جب خوں ریز و خوں آشام ہے ساقی

عمل کا رشتہ ہے جب دستِ احول و وراثت میں
تو پھر کیوں آدمیت موردِ الزام ہے ساقی

جسے کہتے ہیں عُرفِ عام میں تخلیقِ انسانی　　یہ کس آغاز کی سعیٔ زبُوں انجام ہے ساقی

وہاں بخشا گیا ہے میرے دل کو ذوقِ آزادی　　جہاں موجِ ہوا تک مُرغِ زیرِ دام ہے ساقی

تبسّم اک بڑی دولت ہے، میں بھی اس کا قایل ہوں　　مگر یہ آنسوؤں کا ایک شیریں نام ہے ساقی

جسے اربابِ مذہب بادۂ توحید کہتے ہیں　　وہ آبِ صاف بھی افشردۂ اصنام ہے ساقی

خروشِ گریہ ہی حاصل نہیں غمہائے پنہاں کا　　یہاں تو ساز کے پردے میں بھی کُہرام ہے ساقی

لڑکپن ضد میں روتا تھا، جوانی دل کو روتی ہے　　نہ جب آرام تھا ساقی، نہ اب آرام ہے ساقی

تمنّائیں جگاتی ہیں، ناکامی سُلاتی ہے　　نہ اپنی صُبح ہے ساقی، نہ اپنی شام ہے ساقی

بڑی دریا دلی کے ساتھ ہر خوں ریز طاقت کو　　مشیّت کی طرف سے اِذنِ قتلِ عام ہے ساقی

یہ کس کی مُہرِ ہیبت ثبت ہے گیتی کے سینے پر　　کہ ہر ذرّہ ازل سے لرزہ براندام ہے ساقی

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوشؔ کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظؔ و خیّامؔ ہے ساقی

جوشؔ ملیح آبادی

مذہب اور اُس کے اجتماعی اور انفرادی اثرات

ناظر

مذہب کا تعلق جہاں تک اخلاق سے ہے وہ بالکل انفرادی شے ہے لیکن محض اخلاقیات کا نام مذہب نہیں ہے۔ علاوہ اخلاق کے مذہب میں مخصوص معتقدات اور رسومات بھی شامل ہیں۔ ان معتقدات اور رسومات کے متعلق ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔ سردست ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان معتقدات اور رسومات کی مختلف لوگوں میں یکسانیت اُن کی اجتماعی قوت کا باعث سمجھی جاتی ہے، کیونکہ مذہب کی یکسانیت اتحاد اور اشتراکِ مقاصد کی ایک صورت ہوتی ہے۔ یعنی مذہب مشترکہ مقاصد کی ایسی تشکیل ہے، جو تمام ملکی اور نسلی امتیازات سے بالاتر ہوتی ہے اور مذہبی برادری کا دائرہ وسیع اور ہمہ گیر ہوتا ہے (خصوصاً تبلیغی مذاہب کی صورت میں) اور اس لحاظ سے خیالی طور پر یہ دائرہ مادی تعصبات سے بری ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مذہب ہمارے کلچر کا جزوِ اعظم ہے۔ چنانچہ مذہب کا فنا ہونا ہماری قومی زندگی کی فنا کے مرادف خیال کیا جاتا ہے۔ اور اہلِ مذہب کا خیال ہے کہ ہماری اجتماعی قوت کا انحطاط مذہب کے انحطاط کا نتیجہ ہے۔ ہم آج اسی خیال کو تنقیدی نظر سے جانچنا چاہتے۔ قومی زندگی کے انحطاط اور ضعف کا سبب زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ افراد میں اجتماعی مقاصد کے لئے ایثار اور قربانی کا جذبہ فنا ہو جاتا ہے، جس کی وجہ مذہبی بے اعتنائی نہیں ہوتی، کیونکہ مذہب کا تعلق زیادہ تر معتقدات اور عبادات سے سمجھا جاتا ہے۔

مذہب خالص منقولی شے ہے، اس میں شیرازہ بندی کی قوت یا صلاحیت اسی وقت تک ہے جب تک لوگوں کی خیالی آزادی کو مقید رکھا جا سکے۔ مذہب کی مرکزیت کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی روایتی صورت کو بجنسہٖ قائم رکھا جائے، اور معقولات کو دخل نہ دیا جائے۔ اس کے تمام خلافِ عقل توہمات پر ایمان کامل ہو، اور اس لئے ضروری ہے کہ مذہب کی پشت پر حکومت بھی ہو، جب مذہب کے ساتھ حکومت باقی نہیں رہتی تو مذہب میں پراگندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ مذہب میں اصلاح کے نام سے رخنے پڑنے لگتے ہیں اور ہر شخص اپنے اپنے خیالات کے مطابق بلا روک ٹوک نئے نئے فرقے پیدا کرتا رہتا ہے۔

یہ کہنا غلط ہے کہ مذہب کی پابندی ہوتے ہوئے حکومت ہاتھ سے نہیں جا سکتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کا سبب ہمیشہ مذہبی ترقی یا انحطاط نہیں ہوتا۔ اور اگر بالفرض حکومت مذہب کا ساتھ دیتی بھی رہے، تب بھی آزادیٔ رائے کو کب تک مسلوب رکھا جا سکتا ہے۔ آمد و رفت کے ذرائع کی توسیع، دوسری قوموں کے ساتھ میل جول، دنیا میں علوم و فنون کی ترقی، یہ سب ایسی چیزیں ہیں کہ بتدریج ذہن و فکر کو روایات کے بار سے سبکدوش کرتی رہتی ہیں۔ اور منقولیت کا طلسم بالآخر ٹوٹ کر

رہتا ہے۔ اور مذہب کی اجتماعی قوت اس کی منقولیت ہی میں مضمر ہے، انسان کو خیالی آزادی ملی اور مذہب میں تفرقہ پڑا۔ پھر مذہب بجائے لوگوں کو متحد کرنے اور ایک مرکز پر لانے کے انتشار اور فساد کا باعث ہو جاتا ہے، اور اس کی اجتماعی حیثیت فنا ہو جاتی ہے۔

ہم ابھی کہہ چکے ہیں کہ مذہب مخصوص معتقدات اور رسومات سے عبارت ہے۔ ان معتقدات میں سب سے اہم اور بنیادی عقیدہ خدا کا ہے، دوسرے حیات بعد الممات کا عقیدہ اور عقبیٰ کی سزا اور جزا۔ ان عقائد کے ماتحت مختلف قسم کی عبادتیں اور رسومات ہیں۔

ہم سب سے پہلے معتقدات کو لیتے ہیں۔ پہلا عقیدہ خدا کا ہے۔ یعنی ایک ایسی عظیم الشان اور فوق العادت ہستی کا وجود جو کائنات سے ماوری ہے۔ ایسی ہستی کے اثبات کا مسئلہ ہنوز عقدۂ لاینحل ہے، کہا جاتا ہے کہ سائنس کے ذریعہ اس کا ثبوت بہم پہنچانا عبث ہے، کیونکہ سائنس عالم ظاہری ہی سے سروکار رکھتی ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا عالم باطنی جو حواس اور ادراک سے ماورا ہو، اس کا وجود سوائے ایک مفروضہ شے کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ جو ذرائع فطرت نے ادراک کے عطا کئے ہیں اور اُن کی وساطت سے جو کچھ ہم معلوم کر سکتے ہیں اس کے علاوہ کسی چیز کا فرض کرنا اگر باطنیت ہے تو باطنیت محض ایک واہمہ ہے۔

ظاہر اور باطن کا امتیاز غلط فہمیوں کا موجب رہا ہے۔ سائنس ہر اُس چیز سے سروکار رکھتی ہے جس کی اثر اندازی کا کسی طرح سے اندازہ ہو سکے، اور یہی وجود کے معنی ہیں۔ سائنس وجود کی ظاہری اور باطنی کیفیات کی تحقیق کرتی ہے۔ چنانچہ ذرہ کی اندرونی ساخت کا جو اُس نے حال میں پتا لگایا ہے وہ یقیناً اس کی باطنی تحقیقات ہی ہے۔ مثلاً ذرہ میں مراکز اور اُن کے گرد برق پاروں کی مختلف فاصلوں پر گردش اور اس میں خلا کا ہونا وغیرہ وغیرہ۔ اگر باطنیت سے مطلب ایسی شے ہے جس کا ادراک حواس کے ذریعہ نہیں بلکہ عقل کے ذریعہ ہو، تو ظاہر ہے کہ جو کچھ بھی اس ترقی یافتہ زمانے میں سائنس کے ذریعے علمی انکشافات ہوئے ہیں وہ سب عقل ہی کی رہبری کا نتیجہ ہیں ورنہ محض حواس کے ذریعے جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے وہ وہی ہے جو قدیم زمانے کے لوگوں کو معلوم تھا اور آج بھی بے علم لوگوں کا علم حواس ہی تک محدود ہے، ہمارے نزدیک ظاہری اور باطنی کا سب سے بڑا فرق یہی ہے۔ ایک اور مثال سائنس کے باطنی تعلق کی علم النفس ہے۔ یعنی دماغ کے ظاہری افعال کے باطنی پہلو۔ غرض تجربہ اور مشاہدہ موجودات کے علم کے لئے ناگزیر ہے، اور اگر کوئی ایسا وجود ہے جو عالم محسوس سے ماورا ہے تو اُس کے وجود ہونے کا معیار کم از کم انسان کے علم و فہم سے بالاتر ہے، جس کو بجا طور پر ناقابلِ علم کہا گیا ہے،

سائنس کسی بات میں قطعیت کی مدعی نہیں ہے۔ اور جس طرح کسی بات کا قطعی انکار غیر سائنٹیفک چیز ہے۔ اسی طرح بغیر کافی ثبوت کے اس کو تسلیم کر لینا بھی ویسا ہی غیر معقول مسلک ہے۔ جو سائنس کی نظر میں ایک نا روا تحکم سے کم نہیں۔

ایک قدیم اور عامیانہ طریقۂ استدلال اس باب میں یہ چلا آ رہا ہے کہ مصنوعی چیزوں میں سے کسی شے کی مثال دے کر یہ سمجھایا جاتا ہے کہ جس طرح لازمی طور پر اس کا کوئی صانع ہے، اسی طرح کائنات کا بھی کوئی صانع ضروری ہے۔ لیکن مصنوعات کی مثال قدرتی چیزوں پر منطبق نہیں ہوتی۔ یہ دونوں طرح کی چیزیں جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے۔ اپنے مفہوم میں بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ متضاد ہیں، اور اس لئے جو بات ایک کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ ضروری نہیں کہ دوسری کے متعلق بھی صادق آئے، مصنوعی چیزوں میں بنائے جانے کا مفہوم اور تصور لازمی طور پر موجود ہوتا ہے۔ قدرتی چیزوں کو مصنوعی مان لینا گویا عین اُسی بات کو فرض کر لینا ہے، جو معرضِ بحث میں ہے۔ صنعت میں محض صورت گری ہوتی ہے۔ مادۂ مطلق نہیں بنایا جاتا۔ یہ بھی مسلم ہے کہ کوئی چیز دراصل فنا نہیں ہوتی۔ صرف اس کی صورت و شکل تبدیل ہو جاتی ہے۔ یعنی اُس کی مخصوص افادیت زائل ہو جاتی ہے۔ اس لئے اصلِ کائنات حادث نہیں ہے۔ اور اس لحاظ سے خالق کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کسی چیز کی توجیہہ اگر فوق العادت ہستی یا قوت کی مداخلت کے ذریعے کی جائے تو عقلِ سلیم اُس کو باور نہیں کرتی۔ قدرتی چیزوں کی توجیہہ قدرت ہی کے ذریعے ہونی چاہیے، مثلاً درخت سے سیب ٹوٹ کر زمین پر گرتا ہے۔ اگر اس کی توجیہہ یہ کی جائے کہ اُس کو دیو یا پری توڑ کر زمین پر پھینک دیتے ہیں تو یہ عقلِ سلیم کے نزدیک قابلِ قبول نہیں۔ البتہ اگر کششِ ثقل کے ذریعے اس کی توجیہہ کی جائے تو اطمینان ہو جاتا ہے۔ قدرتی چیزوں کے متعلق یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ فلاں چیز کیونکر

ہوتی ہے یہ نہیں پوچھا جاتا کہ اس کو کون کرتا ہے۔ کشش ثقل یا کہربائی یا برقی قوت کے متعلق یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ ان کو کس نے بنایا یا پیدا کیا۔ یہ سوال مصنوعات ہی کے متعلق پیدا ہوتا ہے، جو چیز فنا نہیں ہوتی اُس کے پیدا ہونے کا بھی سوال نہیں ہوتا۔ وہ خود بخود ہے، جس طرح خدا کے ماننے والے خدا کے متعلق کہتے ہیں۔

غرض زیادہ سے زیادہ جو بات خدا کے وجود کے متعلق کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک عالمگیر قوت کائنات میں کام کر رہی ہے جو اصلِ کائنات ہے، اور اسی کا نام خدا ہے۔ مگر اس صورت میں اس کا کائنات سے علیحدہ یا ماورا ہونا متصور نہیں ہوسکتا۔ کہا جاسکتا ہے کہ قوت کائنات میں شامل ہے۔ مگر وہ ذات جس کی قوت ہے، کائنات سے ماورا ہے۔ مگر ذات سے مراد ایسا وجود ہے، جو صفات یا کیفیات کا محل یا قوت کا ماخذ ہو۔ یعنی کوئی (Concrete) چیز ہو جو عارضی یا مستقل طور پر از خود قائم رہ سکے۔ دوسرے الفاظ میں ذات لازمی طور پر کوئی مادی چیز ہونی چاہئے، کیونکہ ذات اور صفات کا اصلی فرق مادی اور غیر مادی کا ہوتا ہے۔ بعض لوگ روح کو بھی محل قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ بات خود متنازعہ فیہ ہے کہ روح کوئی علیحدہ وجود ہے یا نہیں جس کی بحث ابھی آگے آنے والی ہے، اور جو چیز متنازعہ فیہ ہو اس کو مثال کے طور پر یا دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ غرض ذات کے تصور میں مادہ کا عنصر ہونا ضروری ہے۔ اور وہ کائنات سے ماوری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے میں مختلف قوتّوں کو جن مختلف ذاتوں سے منسوب کیا جاتا تھا، وہ دیوتا مختلف مادّی پیکر رکھتے تھے۔ کسی کے متعدد سر ہوتے تھے، اور کسی کے بےشمار ہاتھ پاؤں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ چیز چاہے دوسرے نقطۂ نظر سے کتنی ہی مضحکہ خیز معلوم ہو مگر اس میں خیالی مطابقت ضرور تھی۔ ذات کا ایسا تصوّر جو غیر مادّی ہو اس عام تخیل کے منافی ہے۔ جو ذات کے تصور پر مجبور کرتا ہے صفات کے لئے ذات کو اسی لئے ماننے کی ضرورت ہوتی ہے کہ صفات غیر مادّی ہونے کی وجہ سے از خود قائم نہیں ہیں، اور ایک مادّی وجود کو بطور محل کے چاہتی ہیں، اور اگر ذات بھی کوئی ایسی ہی غیر مادّی چیز ہو تو ذات کا اقتضا پورا نہیں ہوتا۔ پھر صفات کے درجے سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ چنانچہ قوت کو کسی ذات سے منسوب کرنے کا تخیل اور اس کی شخصیت کا تصور بہت قدیم ہے، جو کئی ہزار دیوتاؤں کی صورت میں ابتک چلا آرہا ہے، اور سب سے بڑے ایک دیوتا کا تصور بھی اسی ذہنیت کی ارتقائی صورت ہے۔

اس زمانے میں جب کہ علمی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ قوت اور مادہ دو علیحدہ علیحدہ اور غیر جنس چیزیں نہیں ہیں۔ جیسا کہ پہلے خیال کیا جاتا تھا بلکہ وہ ایک دوسرے میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ تو ایسی صورت میں قوت کے محل کے لئے کسی ذات کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ قوت خود اپنا محل آپ ہے، بہر حال کائنات سے ماورا خدا کا تصور بے معنی ہے۔

خدائی تصور کی ابتدا انسان کے اس دَور سے ہوئی جب کہ ذہنِ انسانی عالم طفولیت میں تھا۔ وہ فطرت کے عظیم الشان مظاہر کی توجیہہ نہ کرسکتا تھا سوائے اس کے کہ ان کو فوق العادت ہستی سے منسوب کرے۔ ہیبتناک جنگل، پہاڑ اور دریا اس کو مرعوب کرتے تھے، اور اس کی بیچارگی اور عجز کا اعتراف پرستش کی صورت اختیار کرتا تھا۔ چنانچہ آج تک بھی قدیم مذاہب میں درخت، پتھر اور دریا کی پوجا ہوتی ہے۔ فطرت کے یہ ہولناک مناظر گرم ممالک میں عام تھے۔ اس لئے مذہب کا چرچا ان ہی ممالک میں زیادہ رہا۔ مذہب کا توہم پرستی کے ساتھ تعلق ہونے کا مزید ثبوت یہ ہے کہ آجتک بھی جہاں جہالت زیادہ اور علم کی روشنی کم ہے، وہاں مذہب کا دَور دَورہ زیادہ ہے۔ مذہب ایک ظلمی چیز ہے اور ظلمی چیزوں کو تاریکی میں زیادہ فروغ ہوتا ہے، کیونکہ تصورات کے لئے اس حالت میں زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔

دوسرا عقیدہ حیات بعد الممات کا ہے۔ اس عقیدے کا انحصار بھی اس مفروضہ پر ہے کہ رُوح جسم سے کوئی علیحدہ چیز ہے جو عارضی طور پر جسم سے مل جاتی ہے اور اس کے فنا ہو جانے پر خود باقی رہتی ہے، لیکن جس چیز کو رُوح یا حیات کہا جاتا ہے۔ وہ جسم ہی کی ایک مخصوص امتزاجی کیفیت یا حالت کا نام ہے جو خاص حالات میں رونما ہوتی ہے۔ یہ طبعی چیز ہے، چنانچہ وہ مادی اثرات سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً تازی ہوا۔ عمدہ غذا وغیرہ سے وہ خوش ہوتی ہے اور برعکس چیزوں سے وہ منغّض ہوتی ہے۔ رُوح کا مزاج جب خراب ہوجاتا ہے تو ادویات سے اس کی اصلاح کی جاتی ہے۔

حیات کی مخصوص شان جو اس کو غیر ذی روح چیزوں سے ممتاز کرتی ہے نمو یا بالیدگی ہے، اور کون نہیں جانتا کہ بالیدگی کے لئے غذا درکار ہے، چنانچہ مسلسل فاقہ کشی کی حالت میں روح ختم ہو جاتی ہے۔

اگر روح کوئی فرضی چیز نہیں ہے اور وہ وہی چیز ہے جو اجسام میں پائی جاتی ہے، تو روح کا جسم سے علیحدہ تصور مہمل ہے۔ جس طرح کیفیات غیر مادی ہونے کی وجہ سے اپنے وجود کے لئے ایک محل چاہتی ہیں۔ جس طرح صفات کے لئے ذات کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح روح کے لئے جسم کا ہونا ضروری ہے۔ جان کے ساتھ جاندار کا تصور لازمی ہے۔ اگر کہا جائے کہ رُوح محض زندگی کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ اس سے کچھ زیادہ چیز ہے تو وہ زیادہ چیز نفس یا ذہن کا عنصر ہے، جو دماغ کی مخصوص ساخت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ موجودہ بحث میں رُوح سے مراد وہ شے ہے جو جاندار کو بے جان سے متمیز کرتی ہے، جو انسان، حیوان اور نباتات میں مشترک ہے، اور یہ لازمی طور پر طبعی چیز ہے، یعنی ایک امتزاجی کیفیت جو جسم ہی سے متعلق ہوتی ہے، اگر جسم کے تلوار سے بیک آن ٹکڑے کر دئے جائیں تو وہ بھی منقسم ہو جاتی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ متفرق ٹکڑے اپنی اپنی جگہ پھڑکتے ہیں۔ روح کا رونما ہونا اور زائل ہو جانا طبعی نظام کی صلاحیت یا تخریب کا نتیجہ ہے۔

اگر وہ جسم سے کوئی علیحدہ چیز ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ دو ایسی چیزوں میں یگانگت اور اتفاق۔ اتحاد اور اتصال کیونکر ہو سکتا ہے، جو مختلف الجنس ہوں، جو بنیادی اور اساسی طور پر مختلف ہوں۔ جن میں کوئی شے اصلاً جزو مشترک نہ ہو۔ بلکہ بعد المشرقین ہو۔ کیا کوئی ایسی مثال اس دنیا میں موجود ہے جہاں دو چیزوں کا اختلاف اصلی اور حقیقی ہو اور اُن میں اتحاد یا اتصال پایا جائے۔ جو چیزیں بھی مثال کے طور پر پیش کی جا سکیں گی، ان میں یہ بات ضرور مشترک ہوگی کہ وہ مادی ہیں۔

بے جان مادے اور جاندار اجسام کی قدیم تفریق یا organic اور (in-or-ganic) کی حد فاصل جدید علمی تحقیقات کی رُو سے زائل ہو چکی ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ مادہ اور حیات ایک ہی چیز کی ارتقائی منزلیں ہیں، اور نہ صرف یہ بلکہ اغلب ہے کہ نفس بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے، یعنی انسانی زندگی نباتی زندگی اور حیوانی زندگی کے سلسلے کی ترقی یافتہ صورت ہے، اس کے قوائے عقلی اس کے مادی دماغ کی مخصوص ساخت اور ترکیب کا نتیجہ ہیں، اور یہ دماغ خود حیوانی دماغ کا ارتقا ہے، اور یہ تمام سلسلہ قرین قیاس بھی ہے، ورنہ کائنات کی ہدایت کے لئے بے شمار مختلف چیزیں ماننی پڑیں گی، اور اس کثرت و ہجوم سے عقلِ سلیم گریز کرتی ہے۔ اس خاص مسئلے کے متعلق ہم کلیم کی دسمبر کی اشاعت میں "مسئلہ جبر و اختیار" کے تحت میں مفصل بحث کر چکے ہیں، جس کا اعادہ یہاں ضروری نہیں معلوم ہوتا۔

تیسرا عقیدہ عاقبت کی سزا اور جزا کا ہے۔ یہ حیات بعد الممات کے عقیدے کے ساتھ وابستہ ہے، اس لئے اس کی علیحدہ بحث کی ضرورت نہیں۔ مگر بعض مذاہب میں سزا اور جزا کے عقیدے کی توجیہہ تناسخ کے ذریعے کی گئی ہے، اور یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس پر خاموشی سے گزر جانا ایک ناگوار کوتاہی ہے۔ تناسخ کے بموجب ہر انسان کو متعدد بار جنم لینا پڑتا ہے اور بے شمار زندگیوں میں سے گزرنا ہوتا ہے، اور ہر آئندہ زندگی کی نوعیت گزشتہ زندگی کے اعمال کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ گویا ہر ایک آتما اپنے کرموں کی سزا اور جزا بھگتنے کے لئے متعدد جسم اور دنیادی زندگی اختیار کرتی رہتی ہے، تا آنکہ نجات حاصل ہو جائے۔

اس نظریئے کی واقعیت ہمیشہ تشنۂ ثبوت رہے گی۔ کیونکہ عام طور پر انسانوں کو اپنی گذشتہ زندگیوں کی یاد مطلق باقی نہیں رہتی۔ شاذ و نادر جو کبھی کوئی مثال اس قسم کی سننے میں آتی ہے تو وہ نہ تو قطعی طور پر قابلِ وثوق اور نہ اس مسئلہ کی حمایت کے لئے کافی۔ کیونکہ ایک دو آدمیوں کو نہیں بلکہ تمام انسانوں کو بلا استثنا گزشتہ زندگی کی یاد ہونی چاہیے خصوصاً جب کہ نفس یا روح فنا نہیں ہوتی، یہ کہنا کہ چند در چند وجہات سے ہر انتقال کے بعد گزشتہ یاد باقی نہیں رہتی، ایک ایسا عذر ہے، جس کو خوش عقیدگی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ اس سے مسئلہ کی صداقت میں فرق نہیں آتا تو ہم کہتے ہیں کہ آخر اس صداقت کا اور ثبوت ہی کیا ہے، بظاہر یہ مسئلہ بنی نوع انسان کی طبعی عدم مساوات کی اخلاقی توجیہہ کے طور پر اختراع کیا گیا ہے، کیونکہ انصافاً فطرت کی یہ عدم مساوات ناروا ہے۔ مگر اول تو طبعی قوانین کے عمل کی اخلاقی توجیہہ تلاش کرنا مذہبی تعصب ہے۔ دوسرے خود اس توجیہہ میں بھی ناانصافی باقی رہتی ہے۔ کیونکہ کسی کو ایسے اعمال کی سزا دینا جن کے ارتکاب کا

اُسے مطلق علم نہیں، نہ تو اخلاقاً اور انصافاً روا ہے اور نہ اس کا کوئی فائدہ۔ کیونکہ ہم اپنے گناہ کی نوعیت سے مطلع ہی نہیں ہوتے۔ یہ کہنا کہ لاعلمی کی بنا پر اعمال کے لازمی نتائج سے بچ نہیں سکتے، سراسر ہٹ دھرمی ہے، کیونکہ جس چیز کو ثابت کرنے کی ضرورت ہے اُسی کو فرض کیا جا رہا ہے۔ سوال اصل میں اعمال کے کرنے یا نہ کرنے کا ہے، ان کے نتائج کا نہیں ہے۔ تناسخ کے مسئلہ میں جو اندھی مکافات مضمر ہے وہ فطرت کے طبعی قوانین کے عمل کے مقابلے میں کوئی بہتر حل پیش نہیں کرتی، اور اس لئے طبعی قوانین کے ہوتے ہوئے اس نئے قانون کے اختراع کی کیا ضرورت ہے، جب کہ ہماری دشواری بدستور باقی رہتی ہے۔

عقائد کے بعد مذہب میں عبادات کا درجہ ہے، عبادت کا تعلق خدا کے بنیادی عقیدے سے ہے اور اس عقیدے کے بطلان کی صورت میں عبادت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عبادت بہرحال اچھی چیز ہے۔ اگر خدا نہیں ہے تو ہمارا اس سے کیا حرج ہے، اور اگر خدا ہے تو یہ چیز آئندہ زندگی میں کام آنے والی ہے، اور اس لئے اس کے نہ کرنے سے کرنا بہتر ہے۔ لیکن یہ بھی ایک روائتی خوش عقیدگی ہے، ورنہ یہ ظاہر ہے کہ اگر خدا ہے بھی تو ہماری عبادت سے اس کو کوئی نفع نہیں پہنچتا۔

اہل مذہب میں عام طور پر یہ عقیدہ ہے کہ خدا ہماری عبادت اور قربانی سے راضی ہوتا ہے ورنہ اس کا قہر نازل ہوتا ہے۔ ہم دعاؤں کے ذریعے ہونے والی باتوں کو روک سکتے ہیں، اور عبادت کے ذریعہ خدا کو راضی کر کے اپنی کار براری کر سکتے ہیں۔ گویا عبادت ایک قسم کی خوشامد ہے۔ اور قربانی ایک قسم کی رشوت، جس کے ذریعے خدا کو بہلایا اور پھسلایا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان چیزوں میں اگر کوئی مفاد متصور تھا تو اس کا تعلق انسان ہی سے تھا، یعنی عبادت سے فروتنی پیدا ہو، اور قربانی سے ایثار کا جذبہ پرورش پائے، اور ان اخلاقی صفات سے ابنائے جنس کو فائدہ پہنچے۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ نتائج کے لحاظ سے بجائے فائدے کے اکثر اور بیشتر نقصان پہنچا ہے۔ عبادت کرنے والوں میں بجائے رواداری کے ابنائے جنس کے ساتھ تعصب پایا جاتا ہے، اور جو شخص جس قدر مذہبی جوش رکھتا ہے اس میں اُسی قدر تنگ نظری دیکھنے میں آتی ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ عبادت کے طریقوں میں خفیف سے اختلافات پر آپس میں کٹ مرنا عام بات ہے۔

اس کے علاوہ مذہبی ذہنیت کے آدمیوں میں آزادیٔ فکر مفقود ہوتی ہے یورپ میں جب تک حکومت میں کلیسا کا اقتدار رہا، ترقی نصیب نہیں ہوئی، ہر ایک علمی تحقیق جو بائیبل کی تعلیم سے اختلاف رکھتی تھی گردن زدنی تھی۔ علوم و فنون کی ترقی کے لئے آزادیٔ خیال لازمی شے ہے۔ مگر مذہب اس کو ایک خاص نقطۂ نظر سے ہٹنے نہیں دیتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ مذہب کو کماحقہٗ قائم رکھنے کے لئے حکومت درکار رہے، اور اگرچہ اس طرح اس کی مرکزیت قائم رہتی ہے اور اجتماعی قوت ضائع نہیں ہونے پاتی۔ مگر حکومت کے فنا ہوتے ہی اجتماعیت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ جس اجتماعیت کی بنیاد لوگوں کی آزادیٔ رائے کو سلب کر کے رکھی جائے وہ کب تک قائم رہے گی۔ ہمارا مقصد اس تمام بحث سے یہ بتانا تھا کہ مذہب کے دونوں پہلو یعنی اجتماعی قوت اور انفرادی اصلاح یا اخلاقی حالت قابل اطمینان نہیں۔ نہ اس کی مرکزیت موثر اور دیرپا ہے، نہ اس کے ماتحت انسانی اخلاق صحیح معنوں میں اخلاق کہلانے کا مستحق ہے۔

اشتراک مقاصد کی بنیاد کسی ایسے اصول پر ہونی چاہئے جو کسی حالت میں شکست نہ ہوسکے۔ اور ایسی چیز کسی گروہ کی اقتصادی ضروریات ہیں، مگر ظاہر ہے کہ مذہب کو اقتصادیات سے ازلی مخالفت ہے، مختلف مذہبی توہمات ہمیشہ اقتصادی ترقی کی راہ میں رُکاوٹ بنے رہے۔ اقتصادیات کا تعلق انسان کی مادی ضرورتوں سے ہے اور مذہب کا تعلق (بنام نہاد) روحانی ضرورتوں سے، جن کی تشریح کی جا چکی ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ مذہب ابتدائی طور پر جن ممالک میں شروع ہوا، وہاں قدرت کی فیاضی سے پیٹ اور تن کی ضروریات اور زندگی کی عام کشمکش شدید نہ تھی۔ مثلاً ہندوستان میں گنگا اور جمنا کا علاقہ اپنی سرسبزی و شادابی کے باعث جنت نشان تھا، اور یہی مذہب کا گہوارہ تھا۔ جن ممالک میں زندگی کی کشمکش زیادہ ہے وہاں مذہب برائے نام ہے۔

مذہب کی حمایت میں اس کی انفرادی حیثیت کے متعلق ایک بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ حکومت کے قوانین اور ضابطے انسان کی پرائیویٹ زندگی کی اصلاح سے ہمیشہ قاصر رہے ہیں۔ یعنی اس کی اخلاق کی درستی کا ذمہ نہیں لے سکتے، اور اس لئے تہذیب اخلاق کا ذریعہ مذہب ہی ہوسکتا ہے اس کے

معنی یہ ہیں کہ جب تک دنیاوی حکومت اور سیاست کے علاوہ ہر جگہ حاضر و ناظر معبود، اور اس کے سامنے آئندہ زندگی میں اپنے خفیف ترین اعمال بلکہ نیتوں اور ارادوں کی جوابدہی اور اس کی عقوبت پر اعتقاد نہو۔ انسان کی پرائیویٹ زندگی کو درست نہیں کیا جاسکتا۔ ہم کہتے ہیں کہ بیشک انسان کے ابتدائی دور اور قرون وسطیٰ میں مذہب کی اہمیت اور اس کی خدمات و کارکردگی کا اعتراف ناگزیر ہے اور قدرت کے ارتقائی عمل نے اسی واسطے مذہب کو اس وقت رونما کیا۔ اس زمانے کے لوگوں کا ان باتوں پر صدق دل سے اعتقاد بھی تھا اور اُن کو ایسے محرکات کی ضرورت بھی تھی۔ لیکن جہاں جہاں انسان پر انفرادی حیثیت سے وہ دور گزر چکا اور تہذیب و تمدن جب اس درجہ پر پہنچ گیا جہاں نیکی کا ارتکاب یا بدی سے اجتناب کے لئے تحریص یا تخویف کے محرکات سے انسان بے نیاز ہو جائے۔ اور نیکی کو نیکی کی خاطر اختیار کیا جائے اور بدی سے انسان کی مہذب فطرت خود بخود متنفر ہو، اور مدنیت کے بڑھ جانے سے انفرادی اعمال کی اچھائی اور برائی کا معیار اُن کی سوشل اہمیت کی بنا پر قرار پائے تو ایسے دور میں مذہب قدرتاً ماضی کی ایک یادگار اور سلف کا تبرک بن کر رہ جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنا کام کرچکتا ہے، اور اس کا دور ختم ہو لیتا ہے۔

یہ واضح رہے کہ کسی دور میں کسی جماعت کے تمام افراد کی حالت تہذیب کے لحاظ سے مساوی درجہ کی نہیں ہوتی۔ اس لئے مذہب کی ضرورت یا عدم ضرورت کا سوال اجتماعی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ انفرادی ہونا چاہیئے۔ تمام افراد کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی کوشش کرنا ایک خبط ہے۔ مذہب کو اجتماعی سرگرمیوں کے لئے مرکز بنانا کوئی مستحکم اور محفوظ پالیسی نہیں ہے، جب زندگی کی کشمکش زیادہ شدید ہو تو مذہب کا وعظ کہنا ایک بے وقت کی راگنی ہے۔ اگر کہا جائے کہ مذہب خاص طور پر ایسے ہی وقت کام آنے والی چیز ہے، وہ عسرت اور تنگی مصائب اور آلام کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرنے کے قابل بناتا ہے اور مادی یا دنیاوی احتیاج کو حقیر اور عارضی سمجھ کر اس کی طرف سے استغنا پیدا کرکے ایک اعلیٰ اور مستقل روحانی نعم البدل کے لئے راضی کرکے دنیا اور اس کی آسائشوں کو ٹھکرانے کے قابل بنا دیتا ہے۔ لیکن سوال اس حالت کے برداشت کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ اس کو رفع کرنے اور بہتر بنانے کا ہے، اور مذہب جیسا کہ بتایا جاچکا ہے دنیاوی امور سے دلچسپی اور سروکار نہیں رکھتا، بلکہ رکاوٹ ہی پیدا کرتا ہے۔ اس کے بیشمار ممنوعات و نواہی، اس کے توہمات اور سب سے زیادہ اس کا آزادیٔ فکر و خیال کو مقید رکھنا یہ سب چیزیں اقتصادی ترقی کی راہ میں حائل ہیں آزادیٔ فکر کے بغیر علوم و فنون کی ترقی معلوم، یورپ میں صنعت و حرفت کی ترقی مشینوں کے دور سے شروع ہوئی۔ اور مشینوں کا دور ان علوم و فنون کا نتیجہ تھا جو نشاۃ الثانیہ سے شروع ہوا جب کہ کلیسا کی گرفت سے آزادی ملی۔ آج بھی دنیا میں وہ ممالک جہاں مذہبیت زیادہ ہے، یعنی اقتصادی، سیاسی اور تمام دیگر مقاصد پر مذہب مقدم سمجھا جاتا ہے، وہاں جہالت زیادہ ہے اور صنعتی ترقی مفقود ہے، ایسے ممالک عموماً زراعت پیشہ ہیں یا (pastoral pursuits) یعنی مویشی پالنے کا شغل رکھتے ہیں، اُن کی تجارت بھی خام اشیا ہی تک محدود ہوتی ہے۔ وہ صنعتی ممالک کے لئے ایک لقمہ ہیں اور جو تھوڑی بہت دولت پیدا کرسکتے ہیں، وہ دیگر ممالک کی نذر کردیتے ہیں، مگر اس مفلسی میں بھی اپنے مذہب کے خیال میں مگن ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود جو کہی جاچکی ہیں ہندوستان جیسے ملک میں ہم مذہب کو ترک کرنے کی صلاح نہیں دیتے، کیونکہ مذہب یہاں کی آب و ہوا میں ہے اور علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے لحاظ سے یہ ملک بہت پیچھے ہے۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مذہب کو اجتماعی حیثیت نہ دی جائے، اس کو خالص انفرادی یا شخصی چیز سمجھنا چاہیئے۔ اس طرح اس کی پبلک حیثیت رفع ہو کر خالص پرائیویٹ یا نجی حیثیت باقی رہیگی، اور اس حیثیت میں بھی جہاں تک ہوسکے اس کے عبادت اور پرستش کے پہلو پر زیادہ زور نہ دیا جائے، بلکہ تہذیب اخلاق کے پہلو پر زور دیا جائے جو کام کی چیز ہے، اگرچہ خیالی طور پر عبادت گذاری تہذیب اخلاق کے منافی نہیں ہے بلکہ اس کی مدد و معاون ہے، اور شاید اخلاق ہی کے استحکام کے لئے مصلحتاً عبادت پر ابتداءً زور دیا گیا ہو، اور عبادت کو قائم کرنے کے لئے حیات بعد الممات اور آخرت کی سزا اور جزا اور ایک بزرگ و برتر ہستی کے سامنے جوابدہی کے عقائد کی تعلیم دی گئی ہو، لیکن اول تو جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ان چیزوں کی کوئی عقلی اساس " (rational basis) نہیں۔ دوسرے یہ کہ عقائد و عبادت کے

ہندی اُردو کے سوال کا محدود نظریہ

اور شمالی ہند کی اصلی زبان

(جو ترقی پسند اردو ہندی کی دوسری کانفرنس منعقدہ الٰہ آباد میں ۱۴ نومبر ۱۹۳۸ء کو پڑھا گیا)

تمام ہندوستان میں چند سال سے ایک ایسی تڑپ پیدا ہوئی ہے جس کی مثال پچھلے سو سال میں نہیں ملتی۔ ملک کی یہ تڑپ چونکہ غیر ملکی استعمار سے نکلنے کے لئے ہے، اس لئے ہندوستان کی تاریخ میں یہ دور اپنی مثال آپ ہے، ایک طرف آزادی خواہوں کی ولولہ انگیز کوششیں ہیں کہ ملک کو آزاد کرائیں، دوسری طرف غیر ملکی استعمار اور اُس کے لاتعداد حلیف ہیں، جو ایسی ہر ممکن رکاوٹ پیدا کرنا چاہتے ہیں، جس سے آزادی خواہوں کو اپنے مقصد میں ناکامی ہو، اور وہ ایسے مختلف فیہ مسائل پیدا کرتے ہیں جس میں لوگ اُلجھ کر رہ جائیں۔ کہیں حقوق کے تصفیے کا سوال ہے، کہیں مذہبی تحفظ کا غل ہے، انہی مختلف سوالات میں سے ایک سوال کچھ عرصے سے زبان کے متعلق چھڑ گیا ہے، کہ ملک کی زبان اردو ہوگی یا ہندی! رفع شر کے طور پر زبان کے لئے ایک مشترکہ نام یعنی ہندوستانی اختیار کیا گیا۔ لیکن مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ بہت سے رجعت پسندوں کو ہندی ادب کی ہستی خطرے میں نظر آئی اور نعرہ لگایا گیا کہ ہندوستانی کے معنی ہی ہندی کے ہیں۔ جس پر اردو زبان کے بہی خواہ ایک ساتھ چلا اُٹھے کہ "اردو زبان کو فنا کرنے کی یہ سازش ہے"۔ اور پھر ہندی اور اردو کی بحث چھڑ گئی، جس کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس بحث اور اُس کے ہنگامے میں بڑے بڑے مستند وطن پرست بہتے ہوئے صاف صاف نظر آئے۔

زبان کے مسئلے پر آج تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور گو یہ مضمون بھی خالصتاً مسئلۂ زبان پر ہی ہے۔ لیکن اس مضمون میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ زبان کا مسئلہ عوام کا مسئلہ ہے، خواص کا نہیں ہے، اور وہ ادبی زبانیں جو اردو اور ہندی کہلاتی ہیں شاید ہی کبھی انہیں سے کوئی زبان عوام کی زبان بن سکے۔ لیکن اس وقت تک دونوں نہیں ہیں، بلکہ عوام کی زبان وہ زبان ہے جو دریائے ستلج اور دریائے نربدا کے درمیانی ملک کے اُن دیہات میں بولی جاتی ہے جو صوبہ جات پنجاب آگرہ و اودھ، متوسط بہار اور راجپوتانہ میں واقع ہیں، اور یہ وہ زبان ہے جو اپنے متصلہ علاقوں کی زبانوں یعنی گجراتی، پنجابی اور مرہٹی سے بھی بالکل غیر مانوس نہیں ہے، چونکہ اس کے بولنے والے زیادہ تر دیہات میں ہی رہتے ہیں، اس لئے اُسے شمالی ہند کی دیہاتی زبان کہنا چاہیئے، گو شہروں کے رہنے والے اُسے گنواری یا "گنوردا" کہتے ہیں۔

اس زبان کی طرف اگرچہ آج تک کسی نے بھول کر بھی توجہ نہیں کی ہے، لیکن وہ از خود ادبی شان آہستہ آہستہ پیدا کرتی رہی ہے، ہزاروں کتابیں اس زبان میں لکھی گئی ہیں، جن میں دیہاتی گیت، منظوم قصے، بھجن وغیرہ

ہیں، یہ کتابیں زیادہ تعداد میں دیوناگری خط میں چھپی ہیں، فارسی رسم الخط میں بھی چھپی ہیں، مگر نسبتاً کم۔ اب تک دیہاتی شاعری زیادہ تر مذہبی قصوں قومی سُورماؤں کی داستانوں اور عشق و محبت کے قصص تک محدود تھی لیکن جب سے سیاسیات نے دیہات کا رُخ کیا ہے، دیہاتی گیتوں اور بھجنوں نے بھی انقلابی اثرات کو قبول کیا ہے، روزمرّہ کی تکلیف وہ زندگی میں تبدیلی کی آرزو جدید دیہاتی شاعری میں صاف صاف جھلکتی نظر آتی ہے، بالخصوص وہ بارہ ماسے، قومی آلہا، اور بھجن جو گزشتہ انتخابات میں دیہات میں بنائے گئے، اُن کو سُنکر ہمیں بے اختیار یہ کہنا پڑتا ہے کہ دیہاتی شاعری جس انداز سے آگے بڑھ رہی ہے وہ نہ کبھی اُردو کو نصیب ہوا، اور نہ ہندی کو۔

دیہاتی زبان کی مطبوعہ کتابوں کا جہاں تک تعلق ہے، وہ سب کی سب سوائے چند کے شاعروں کے کلام یا سانگ وغیرہ کی صورت میں ملتی ہیں اور نثر کا حصہ کلیتہً بمنزلہ صفر کے ہے، لیکن یہ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ جس قدر دیہات کے باشندوں میں نئی زندگی پیدا ہو رہی ہے، اس کمی کا احساس کیا جا رہا ہے اور اگر ہم ملک کے حالات اور مقتضیات کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ یہ "گنوار" زبان قطعی ایک روشن مستقبل کی مالک ہونے والی ہے،

اس زبان کی سب سے نمایاں خصوصیت جو اُس کے روشن مستقبل کی طرف اشارہ کر رہی ہے یہ ہے کہ اس میں تمام وہ فارسی اور عربی الفاظ مستعمل ہوتے ہیں، جن کو ہندی ادیب جان بُوجھکر ترک کر رہے ہیں، اور اسی طرح تمام وہ ہندی الفاظ بھی بکثرت ملتے ہیں جن کو میرؔ و حالیؔ کی جانشینی کے مُدعی اکثر اردو زبان سے خارج کر چکے ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اس استدلال کے ثبوت میں ہم ذیل میں چند نمونے پیش کریں۔

منقول از قصّہ نہال دے

راج کنور نہال دے اپنی ماں سے چمپا باغ میں جاکر جھولنے کی اجازت لیتی ہے۔

دِن تیجوں[1] کا آیا اُس دِنا[2]   محلوں میں بولی کنور نہال
بابا آج تیجوں کا رُوج[3] ہے   میں تو جھولن جاؤں گی چمپے باگ[4]

ماتا بولے بیٹی سے کیسا کہے   مری ایک سُنے نا بیٹی رہی بات
جھولہ پڑ رہا مہارے[5] محل میں   گھر جھولو لاڈو راج کنوار
اُوآ بلائے سب سکھین کو   تم مِل کر لاڈو گاؤ ملہار
باہر بیٹی جھولن مت ناجائیو   مہارے دشمن لگ رہے بے شمار
لے جائے توئے[6] مہاری[7] نیچی ہووے   تیرے پتا کی پاگ میں پڑ جائے کھاک[8]
بہت سمجھائی کنور مانی نہیں   ماتا نے دینا حکم سنائے

پہنچنا چمپے باغ میں

چار گھڑی کے بھائی بیچ میں   کوئی چمپے باغ میں پہنچی جائے
چمن باغ دیکھو کھِل رہا   اس میں پھول کھلے ہیں بے شمار
جوئی، چمپا، موتیا، موگرا   گل شبو گل لالوں[9] پر کھلی بہار
جب تو مالن کو بلائے کنور نہال دے   مری ایک سُنے نا مالن بات
جھول نکال دے بہنا مری ریشمی   بی بی جھولہ پیڑ پہ دیجے ڈال
چاروں طرف باگ میں جھولا پڑ گئے   جب جھولن لگیں چھتیسوں جات
کوئی گادے اپنے بھائی بیر کو   کوئی بارہ ماسہ کی جھنکار
کوئی کامن[10] جلتی ٹھمری گائے رہی   کوئی گاوے پیارے میگھ ملہار
ایک اور[11] جھولیں سینے[12] باسنی   کوئی ایک لگ جھولیں گوجر جاٹ[13]
ایک لگ جھولیں کا ستہ کھتری   کوئی ایک لگ جھولیں چھتیسوں جات[14]
بیچ بیچ[15] جھولا کنور نہال کا   کوئی اودا جھوٹا رہی لگائے
طرح طرح کی بالی[15] پنچھی بولتی   کامن کوئیل سی رہیں جھنکار
یہ بار رکھا[16] بھائی اب یہاں رہا   سُلطان کا اب تم سنو حوال[17]
مِرگا[18] چھپ گیا لوٹ پڑا سلطان سنگھ   کیلہ گڈھ کو لینی سُرت[19] لگائے
جب جا پہنچا چمپے باغ میں   گھوڑا سلطان نے دیا بڑھائے
دروازے پے گیا بیٹا رجپوت کا   پھاٹک دینا بند دکھائے
ایڑ لگا دی نر سلطان نے   گھوڑے نے کودی اچاٹ[20] دیوار
اُٹھی اندھیاری بادلی[21]   بھائی گرجن لاگا جب آسماں
آندھی سا آیا مینہ جھمک پڑا   ننھی پڑن لگی پھوار
گھور اندھیرا ہو گیا چمپے باگ میں   بجے دن کی رہے دِن کی ہو گئی رات

[1] ایک ہندو تہوار [2] دن [3] روز [4] باغ [5] ہمارے [6] تجھے [7] ہماری [8] خاک [9] گل لالہ [10] ... [11] سینہ [12] طرف [13] ذات [14] بیچوں بیچ [15] راگنی، گانے [16] ...
تفصیل ... [illegible] ... اُدھر ... صاف ...

پہلے برسیں ننھی ننھی بوندیاں　　پھر برسن لاگا گو لا دھار
سب رہی سکھیاں واں سے بھاگ گئیں　　سب نے لینی جھول اُتار
اِک ناسٹیری چھپے باغ میں　　واں اِکلی رہ گئی کنور نہال
گھوڑے سے اُترا بٹیا رجپوت کا　　اور رانی نہال پہ پہنچا جائے
دیکھو سرمائی کنور نہال وے　　جب سر پر رکھدینی پچھرنگی ڈھال
گھونگٹ گھولے سبز کمان سے　　ہنس ہنس کے پُوچھن لاگے بات
مت گھبرادے گوری اِکلی باغ میں　　کہوں پیاری میں یہ دھرم کی بات
کس راجا کی ہو تم پُتری　　پیاری ہم کو دیجے بھید بتائے
کئے بیاہی کئے کنواری ہو تم بھلا　　تب لوٹ کے بولی کنور نہال
کنواری ہوں موہے مت چھیڑ لیو　　مرے تن سے مت نا لگیو ہات
اتنی سُنکر کنور کیا کہے　　مری ایک سنو نا کامن بات
اتنی بڑی تو کنوارھی کیوں رہی　　پیاری سچ سچ دیجو حال بتائے
کے تیرا پتا کنگال ہے　　ہنس کے تہارے اوچھی ان سال
کیا کہیں بٹ تم کو لاگ گیا　　رانی سچ سچ موہے دینو تبلائے

(ماخوذ از آلہا مصنفہ منٹرو لال ساکن ضلع میرٹھ)

بچھراج اور گجراجہ کی لڑائی

جہاں پر ڈیرے پڑے چندیلے کے واں گجراجہ ٹھیرا جائے
ہماری راجہ گڈھ کا لسو کا جس کی کوئی برابر نائے
اِنگھے فوج پڑی موہبہ کی اُنگھے پڑے بھنگیلے رائے
بولا راجا کالسو والا اور بچھراج سے کہا سنائے
کون دیس کے تم راجا ہو اپنا حال دیو بتلائے
بچھراج بولا راجا سے اب تم سنو بھنگیلے رائے
گڑھ مہبے کا راجہ بھئی جس کا نام چندیلے رائے
اِتنی بات سُنی راجہ نے سُرخی گئی بدن میں چھائے
بولا راجہ جب للکارا ہاتھ میں لی تلوار سنبھال
نگر مہبہ اِک بستی ہے جہاں گُجراں کرے پرمال
کب سے راجا ہوا چندیلہ کب سے ہو گیا گدی دار
نوکر ہے راجا جے چند کا دو چار پلٹن کا سردار
کھائے کھائے ٹکڑے گڈھ قنوج کے وہ آپے میں نہیں سمائے
پڑے برابر وہ راجہ کے دہشت کرے ہماری نائے

راجہ پرمال کی بہادری

بولا راجہ بچھراج سے اب تم سنو بنا پھل رائے
ہماری راجہ ہے کالسو کا تم پروار نہ جھیلا جائے
ہاتھ بئی میں ناحق ڈالا سوتے ناگ کو دیا جگائے
ظلم گجارے گنگا پر اب رہا ٹھکانا نائے
تھوڑا لشکر ہے مہبے کا اور دشمن کا بہت سوائے
گجراجہ کی چپیٹوں میں زندہ ایک بچیگا نائے
اتنی سُنکر چندیلے سے بچھراج نے کہا پکار
دھرم نہیں ہے رجپوتوں کا جو لڑنے سے کریں انکار
سیس بنا رہے گا کندھے پر لوہا کرتا رہے سہائے
کھیت چھوڑ کر نہیں بھاگوں گا چاہے جان رہے یا جائے
کھانڈا لے لیا اندر والا جس پر چھ اُنگل کی دھار
چھوڑا اسرا جُندہ گائی کا دونوں ہاتھ لئیں تلوار
واں سے چل کر رن میں آیا ادھر چھتری کا سنو بیان
جہاں پہ ہاتھی گج راجہ کا بچھراج وہاں پہونچا آن
ایڑھ لگائی جب گھوڑے کو اور ہاتھی سے دیا بلائے
پچھلی ٹاپ رہیں دھرتی میں دو ہودے پر پہونچیں جائے

(ماخوذ از سوانگ چھبیلی بھٹیاری مصنفہ نتھو داس میرانپور (مظفرنگر)

جواب رنگا چار

دوہا

اکبر شاہ دہلی بسے تخت بڑا گل جائے　　اس کے دھورے باد لی جہاں اک چنچل رہتی نار

---

۱ لی ۲ شرمائی ۳ رکھدی ۴ کیا؟ ۵ مجھے ۶ لگائیو ۷ تہاری ۸ ادھر ۹ ادھر ۱۰ سُرخی ۱۱ گزران، گزارہ ۱۲ کھا کھا کر ۱۳ ظلم ۱۴ گزارد ۱۵ سر ۱۶ حفاظت ۱۷ زندگانی ۱۸ گلزار ۱۹ قریب ۲۰ عورت حسینہ

چوبولہ

جہاں چنچل اک رہتی نار، جات بھٹیاری، نام چھبیلی
جوبن میں سرشار، نار کی دونوں آنکھ کٹیلی
جمن[1] شہزادہ اُس نے موہا، بولی بول رسیلی
ہر دم پاس راکھتی اپنے نہیں جانے دیتی دہلی

ٹکتالی

کھبر[3] حجرت[5] پہ آئی، سبھی دھلی دکھوائی
پایا نہ جمن شہزادہ، اہلکار سردار بلا کر کیا تکاوہ

جواب نائی کا

دوہا

کھلت[7] سنہرے مل گئے دہن میری سرکار
تیگ[8] دیگ رہیو فتح سدا حکم گلجبار

چوبولہ

سدا حکم گلجبار، پھلے گی پوتوں پنسالی[9]
حاکم ہو سردار دوار پر پڑیو روز بدھائی[10]
سلطنت ہزاروں کوس میں تیری رہیو تیغ سوائی
دُھر درگاہ تک راج رہے یوں کہتا سمن نائی

(ماخوذ از سوانگ پورن مل مصنفہ رام لعل ساکن نواح دہلی)

سوال پنڈت کا دربان سے

دوہا

ہم پنڈت رہے دیس کے دیکھا شہر استھان[11] کس راجہ کا راج ہے سن تو ڈیوڑھی بان
کس رانی کے محل ہیں ہم کو نام بتانا گرہ مہورت گھڑی لا بچھ کچھ یہاں سے پانا

جواب دربان کا پنڈت سے

سیالکوٹ یہ شہر ہے، سن سالبا[12] کا راج ان اولا دے[13] کے محل ہیں سن بیر مہاراج

دوہا

سنو بیر مہاراج رہے ڈیوڑھی پر پہرا بن رانی کے حکم کام نہیں بھتیر[14] تیرا

میں اب آؤں پوچھ ذرا اتنے رہ ٹھیرا باندی لوں بلوائے حال سب کہدوں تیرا

جواب رنگاچار کا

دوہا

رانی چڑھ محلن میں دیکھن لگی بہار اتنے میں پورن آ گیا گھوڑے پر اسوار

چوبولہ

گھوڑے پر اسوار دیکھ رانی مرجھائی ہو کے گری بیہوش، گری دھرتی پے آئی
اُڑ گیا سارا رنگ جردی[15] چہرے کے چھائی ہو کے بےچین تبھی باندی کو بلوائی

جواب رانی کا باندی سے

دوہا

باندی تو سن لیجئے کون ہے یہ اسوار ذرا مت نا کرے دیر تو جلدی لا ڈ پکار

چوبولہ

جلدی لا ڈپکار ذرا مت دیر لگاوے راجہ ہے یہ کون مرے من صورت بھاوے
بن دیکھے نہیں چین جیا مرا للچاوے باندی مت دیر کرے بلا کر کیوں نہیں لاوے

(ماخوذ از سانگ نل دمن مصنفہ علی بخش ساکن ٹڈاوڑ ریاست الور)

جواب راجہ کا رانی سے

چوبولہ

بھوجن بھگوت نے دیا کہ مچھری ندی پر پائی
رانی تجھے ترسی دیکھ اس مالک نے بھجوائی
تم ان دونوں بھون لو میں نہا کر آ جاؤں یہیں
چلو صبر کرو من سوچ کے ہمارے ایک ایک بٹ آئی

شیر

دکھیا سنو دمن دلجان لگا لے پرمیشر سے دھیان

جواب رانی کا

چوبولہ

ایک ایک بٹ آوتی[20] تو کروں بھون کے تیار
ندی پہ مردہ جل رہا سو دُھک رہی انگار
کیا کروں ای میں بھون لوں میں بنا آگ لاجاؤ میں ان کو بھونتی تم جلدی آ جاؤ سردار

---

[1] ذات [2] شہزادہ زمن [3] خبر [4] حضرت [5] تقاضہ [6] خلوت [7] تیغ [8] نسل [9] شادمانی [10] خوشی [11] جگہ [12] نام راجہ کا [13] نام رانی کا [14] بھائی [15] ڈیوڑھی دروازہ محل [16] اندر [17] زردی [18] پڑا حصہ [20] آتی ہے یا آئی ہے

راگنی رانی کے مچھلی بھونے کی

مچھلی خاصا بھونے رہی　　ارچ[۱] دکھیا کی سُنیو ری
مچھلی بھوننے چلی نہ کوئی میرے ساتھ
نا جانوں کیسے بھُنے پت[۲] پرمیشر کے ہاتھ
مچھلی خاصا بھونے رہی　　ارج دکھیا کی سنیو ری
مچھلی گیری[۳] آگ میں میں نے مرگھٹ کے پاس
پڑی چتا میں بھن رہی تو مجھے نہ کھان[۴] کی آس
مچھلی خاصا بھونے رہی　　ارج دکھیا کی سنیو ری

چو بولہ جنگل کے راجہ کا

ست گھبرائے من میں ہم پوچھت[۵] ترے من کی بات　　نا کھوٹی بات بچاروں تو سن لے ہماری بات
تو چل میرے شہر میں میں کہتا سچی بات　　کون تمہارا نام ہے کون تمہاری جات

ٹیر[۶]

پیاری ہم جنگل کے راؤ[۷]، دکھیا اپنا درد بتاؤ

جواب رانی کا

چو بولہ

جات پات مٹی میں مل رہا نہیں جڑ[۸] مول　　میں امبر[۹] لگی دھرتی جیلی گیو گسیاں[۱۰] بھول
اس جنگل بیابان میں ڈولوں ڈانواڈول　　وارث میرا ہے نہیں تو ہوں دھرتی کی ڈھول

ٹیر

میری سن پردیسی بات، کیسے چلوں تمہارے ساتھ

(ماخوذ از سات پالی[۱۲] ایک گنڈاسا[۱۳])

جواب کوئی کا

دوہا

ایک ہریانے دیس میں بڑا ہے جبری[۱۴] بول
سات پالیوں کا پیار تھا، چلے گھر سے ڈانگر[۱۵] کھول

چو بولہ

چلے گھر سے ڈانگر[۱۶] کھول جنگل میں اودھم مچاتے
آتے جاتے مانس چھیڑیں نہیں وہ وحشت کھاتے
جو کوئی پکڑے اُن کو جا، نہیں ہاتھ کسی کے آتے
چھیڑ کریں ہیں مرد بیر[۱۷] سے راگ عشق کے گاتے

ٹکتال

ایب[۱۸] سنیو ان کا رانا[۱۹]، چلا گھر سے اپنے ایک گنڈاسا

جواب گنڈاسے کا

لئی[۲۰] ورانتی ہاتھ میں کرچ کی پینی[۲۱] دھار　　شیشہ آگے دھر لیا سپر کر لیا سنگھار

ٹیک

حبب چلی کھیت سے[۲۲] نار تھی جوبن[۲۳] میں متوالی
جس کا سارا بدن ہالرہا[۲۴]، ڈانڈے ہنسلی بالی جھالرا
پھر ہوئی پہن[۲۵] کے تیار، سیاہی انکھیاں میں گھالی[۲۶]
تھی جوبن میں متوالی
جو کوئی اس کی طرف لکھاوے[۲۷]، عاشق بن مارا مرجاوے
حبب نکلی گھر سے باہر ناگنی جوں بمی سے چالی
تھی جوبن میں متوالی
حبب چالی تھی بن ٹھن کے، بیڈھب پیر دھرے گن گن کے
کر رہے آپس میں تکرار، بھیٹ[۲۸] گئے رستے میں پالی
تھی جوبن میں متوالی
پالین[۲۹] نے آگا گھیر لیا رے، کیوں ہم سے منہ پھیر لیا رے
ایک بڑ[۳۰] نے دھا وا بول دیا رے، سینکڑوں جانے[۳۱] لگی
حبب چلی کھیت سے نار تھی جوبن میں متوالی

جواب پالیوں کا

دوہا

آسا کر کے آگئے چاہے جیا یا گیر[۳۲] جاہے دھوپ　　بیشک چالی جائے تیں[۳۳] ایک دکھا[۳۴] کر روپ

---

۱ عرض ۲ عزت ۳ ڈالی ۴ کھانے ۵ پوچھتے ہیں ۶ راجہ یا سردار ۷ بنیاد ۸ آسمان ۹ زمین ۱۰ شوہر، مالک ۱۱ بےچین، بےراہ ۱۲ گڈریہ، گوالیا، چرواہا ۱۳ مراد حسینہ، تنا ۱۴ حسن ۱۵ نہر کا ۱۶ مویشی ۱۷ آدمی ۱۸ عورت ۱۹ اب ۲۰ جھگڑا، ٹنٹا ۲۱ لی ۲۲ تیز ۲۳ ہل رہا ۲۴ یاد و بند ۲۵ جھوم ۲۶ پہن کر ۲۷ ڈالی ۲۸ لگائی ۲۹ دیکھے ۳۰ ٹکرا گئے ۳۱ مل گئے ۳۲ جمع پالی کی، گوالیے ۳۳ ساتھی ۳۴ ڈال ۳۵ تو ۳۶ دفعہ

ٹیک

تری نرم کلائی ہے، اری گال گورے انگلی چرماں

بتا کس جات کی پیتری، ہم نے توں لاگے ستھری

نار نا عمر میں اتری، رے لگا تنے برس پندرہواں

گال گورے انگلی چرماں

ترے پہ عاشق ہو رہے، اوٹ ہم پالی چھوڑ کے

ہاتھ تیرے گورے گورے، رے انکھیاں میں گھال لیا تیں سرماں

گال گورے انگلی چرماں

نار دیکھی جب تیں آتی نے، ارے ڈھاٹ مت ایب چھاتی نے

مار دیا جا نجن نجر پاتی نے، تیرے لہنگے کے پھول کترواں

گال گورے انگلی چرماں

جواب گنڈاسے کا

دوہا

پرناری ہوں سیّں بری مت ان سے کر لیو پیار

عشق برا اس جگت میں چھوٹ جیاں سیّں گھر بار

ٹیک

مت کریئے بات پنواڑے

گنڈاسا:- ہووے بری عشق کی مار، مت کرو میرے سے تم پیار

سوں پینی میں دھار کٹارے کی

مت کریئے بات پنواڑے کی

پالی:- میں مر جیا نگا گل گھوٹ، کرلے منہ اوپر کی اوٹ

تیں ماری سے چوٹ دگاڑے کی

مت کریئے بات پنواڑے کی

گنڈاسا:- مت کرو میرے سے میل، عشق ہوتا ہے برا کھیل

سوں کچیا بیل سنگھاڑے کی

مت کریئے بات پنواڑے کی

(ماخوذ از سانگ سیلونت مصنفہ عیسیٰ خاں ساکن فرخ نگر، ضلع گوڑگانوہ)

دوہا

مالک تجھے مناؤں دھرکے تیرا دھیان راؤرسالو گڈھ بیتی ان کا کروں بیان

مالک میں تجھے دھاوتا تو ہی نرنجن کار سیلا کی میں لیلا کتھوں مہتا جوسا ہوکار ہے

کارج میرے ساریو نیامری بنجدھار ہے تو ہی کرے گا پار تو کرتا رسرجن ہار ہے

راگنی

منا کے سرجن، ساردا، تجھکو دھاروں جی

ہر دے آن بسیرا دے بھائی، بھر دنگل میں تجھے منائی، تو ہی آخ مرے من بھائی

من کی سنکٹ کاٹ چرن میں سیس نواؤں جی

جس نے تیرا سمرن کینا، جبھی بہنچکر پر جا دینا، میں نے آکر آسرہ تیرا لینا

کارج دیجو سار، سدا تیرے گن گاؤں جی

ہر ساحر کو تیرا سہارا، عیسیٰ خاں نے بچن اچارا، کھلے سانگ بھرپور ہمارا

فرخ نگر میں بیٹھ بھوانی تجھے مناؤں جی

بھجن

اٹھ گیا باغن کا مالی کون کرے رکھوالی

چھوڑ بگیچہ گیا من مالی، نا جانوں کس دیس باغ خاک میں مل گیا، نا چلی کسی کی پیش

وہ تو نا توڑن دیتا ڈالی، کون کرے رکھوالی گیا باغن کا مالی

جلا کیوڑہ، موتیا جب سے گیا وہ ملوک بن رکھوالی سن مالی کے گئے روکھ سب سوکھ

چنبیلی کا یا بہت دکھوں نے پالی کون کرے رکھوالی گیا باغ کا مالی

مندرجۂ بالا نمونوں کے پیش کرنے سے ہمارا ایک مقصد تو وہی ہے کہ اس زبان میں فارسی عربی و ہندی کے الفاظ بہت کثرت سے ہیں، یہ اور بات ہے کہ تلفظ سے اُن کی شکلیں بدل جائیں، جیسے پنجاب کے ادیب اپنے کلام اور مضامین وغیرہ میں وہ عربی و فارسی الفاظ اسی طرح لکھدیں جس طرح وہ بولتے ہیں تو بعینہٖ اسی طرح اُن کی شکلیں بھی بدلی نظر آئیں گی اس صورت میں اُنھیں تعلق کو "تعلاک" اور محفل کو "مافل" لکھنا پڑے گا۔

---

[۱] ہے [۲] نرم، نازک [۳] بیٹی [۴] تو [۵] بے وقوف [۶] لڑکے [۷] سرمہ [۸] آتی ہوئی [۹] چھاتی کو [۱۰] نجر (نظر) پاتی (تحریر) [۱۱] پرائی عورت [۱۲] ہوتی ہیں [۱۳] جاتے ہیں [۱۴]
ف: [۱۵] مرجاؤں گا [۱۶] گلا [۱۷] آڑا پردہ [۱۸] ہے [۱۹] دونالی [۲۰] ہوں [۲۱] کچی [۲۲] سنبھالیو، پورے کیجو [۲۳] وہم نکال کر شبہ دور کرکے، گندگی ہٹاکر [۲۴] قدم [۲۵] جھکاؤں۔
[۲۶] نتیجہ دیا [۲۷] سہارا [۲۸] لیا [۲۹] سش [۳۰] نگرانی [۳۱] باغیچہ [۳۲] خوبصورت، حسین [۳۳] درخت۔

اور بھوپال والے "یہاں" کو "ہیاں" حیدرآباد والے "قیہ" کو "خیمہ" لکھیں گے، اسی طرح باغ کو "باگ" شمار کو "شمار" عاشق کو "عاشک" دیہات والے بولتے ہیں، صرف فرق یہ ہے کہ وہ جو بولتے ہیں وہی لکھتے بھی ہیں، اور دوسرے ایسا نہیں کرتے۔ پہر نوع اُن الفاظ کی کثرت جو برج بھاشا میں مل کر اس کو اُردو زبان کہلواتے ہیں، اس دیہاتی میں بھی اسی طرح ہے، جس طرح روزمرّہ کی بولی جانے والی زبان اردو میں ہے۔

آزادیٔ وطن کے تصور کو عام اور راسخ کرنے کے لئے ہمارے ملک میں آج بڑی جدوجہد ہو رہی ہے، اور تمام اہل الرائے اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ جب تک ہندوستان کے دیہات اس جدوجہد میں سرگرم حصہ نہ لیں گے۔ ملک میں جس انقلاب کے برپا کرنے کے وہ آرزومند ہیں نہ ہو سکے گا۔ نیز یہ کہ وہ اس جدوجہد میں اس وقت تک حصہ نہ لیں گے جب تک وہ ہندوستان کے ملکی استعمار اور اس کے اقتصادی و سماجی مسائل کو نہ سمجھ لیں گے اور اُن کی حقیقت سے پوری طرح آشنا نہ ہو جائیں گے۔ اس لئے انقلاب پسند، مصلحین، اور ہر قسم کے ترقی پسند خیالات کے لوگ، مجبور ہیں اور آئندہ اور زیادہ مجبور ہوں گے کہ دیہاتوں میں پہونچ کر اِن مسائل، اور اِن مسائل سے سیدھا سادہ دیہات کا تعلق ان پر واضح کیا جائے، اُس وقت اُن کو یہ حقیقت معلوم ہو گی کہ دیہات والے جو زبان بولتے ہیں، اس کو وہ نہیں جانتے یا بہت کم سمجھتے ہیں، لیکن وہ خود جو زبان بولتے اور لکھتے ہیں خواہ وہ اردو ہو یا ہندی، اس کو اہلِ دیہات سمجھنے سے قاصر ہیں، اس کا علاج ہو سکتا ہے کہ وہ یہ بتائیں کہ تمام شمالی ہند کے دیہاتیوں کو ہندی یا اردو پڑھنا اور سمجھنا سکھانے کا پہلے کام کیا جائے، تاکہ وہ ہمارے ادیبوں کی زبان سمجھ لیں، لیکن ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں اس علاج سے جلد کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ ممکن ہے اور سو دو سو سال کی کوشش کے بعد ہم اس کوشش میں کامیاب ہو سکیں۔ مگر اوّل تو یہ اندیشہ ہے کہ اس وقت تک ہماری موجودہ ادبی زبانیں یعنی اردو و ہندی کہاں تک ادرنا قابلِ فہم بن چکی ہوں گی، دوسرے ملک کے جو اقتصادی اور سیاسی حالات آج کل ہیں، ------------- اُن کا یہ اقتضا بالکل نہیں ہے کہ یہ ملک اور سو بلکہ پچاس برس بھی غیر ملکی استعمار کے پنجے میں جکڑا رہ سکے۔ منظم انقلاب، یا غیر منظم بغاوتیں اور خانہ جنگیاں، موجودہ حالات کا لازمی نتیجہ صاف صاف یہی نکلتا نظر آ رہا ہے۔ انقلاب جو لوگ ملک میں برپا کریں گے اور اُن کے دل اور بادل دیہات سے اُمنڈیں گے اُن کی زبان یہی دیہاتی ہو گی، اور یہی دیہاتی اردو اور ہندی کے وقت ضائع کرنے والے نیز ملک میں فتنے برپا کرنے والے مہمل مباحث کا خاتمہ کر دے گی۔

جہاں تک ہندی زبان کا تعلق ہے ہم اِس کام کو کسی دوسرے اپنے ہندی ادیب بھائی کے لئے چھوڑتے ہوئے اردو کے متعلق یہ غور کرنا اور جانچنا چاہتے ہیں کہ میر و حالی کی زبان سے دیہاتی زبان کو کس قدر قربت یا دوری حاصل ہے، اس بات کی جانچ کے لئے مندرجۂ ذیل میر کے اشعار ضرور ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے ۔۔۔ یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

جھکی کچھ کہ دل میں چبھی کبھی، ہلی ٹک کہ دل میں کھبی کبھی
یہ جو لاگ پلکوں میں اٹکی ہے، نہ چھری میں ہے نہ کٹار میں

گئے دن ٹکٹکی کے باندھنے کے ۔۔۔ اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

میں نہ آتا تھا باغ میں اُس بن ۔۔۔ مجھکو بلبل پکار لائی ہے

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا

ہو گئی شہر شہر رسوائی ۔۔۔ اے مری موت تو بھلی آئی

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے ۔۔۔ پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اُجاڑ کر

یونہی میر شب بھر جو روتا رہے گا ۔۔۔ تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

حالی کے مشہور زمانہ مسدس کے چند بند بھی یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

بُرے اُن پہ وقت آکے پڑنے لگے اب ۔۔۔ وہ دنیا میں بس کر اُجڑنے لگے اب
بھرے اُن کے میلے اُجڑنے لگے اب ۔۔۔ بنے تھے وہ جیسے بگڑنے لگے اب
[illegible] کھیتیاں جل گئیں لہلہا کر
گھٹا کھل گئی ایک عالم پہ چھا کر

ملے کوئی ٹیلا اگر ایسا اونچا — کہ آتی ہو واں سے نظر ساری دنیا
چڑھے اس پہ پھر اک خردمند دانا — کہ قدرت کے دنگل کا دیکھے تماشا

تو قوموں میں فرق اس قدر پائے گا وہ
کہ عالم کو زیر و زبر پائے گا وہ

وہ دیکھے گا ہر سو ہزاروں چمن واں — بہت تازہ تر صورت باغ رضواں
بہت اُن سے کمتر پہ سرسبز خنداں — بہت خشک اور بے تراوت نگہباں

نہیں لائے گو برگ و بار اُن کے پودے
نظر آتے ہیں ہونہار اُن کے پودے

پھر اک باغ دیکھے گا اجڑا سراسر — جہاں خاک اُڑتی ہے ہر سو برابر
نہیں تازگی کا کہیں نام جن پر — ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جن کی جل کر

نہیں پھول پھل جن میں آنے کے قابل
ہوئے رُوکھ جس کے جلانے کے قابل

جہاں آگ کا کام کرتا ہے باراں — جہاں آ کے دیتا ہے رُو ابرِ نیساں
تر و دسے جو اور ہوتا ہے ویراں — نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں

یہ آواز پیہم وہاں آ رہی ہے
کہ اسلام کا باغِ ویراں یہی ہے

اگر کان دھر کر سنیں اہلِ عبرت — تو سیلوں سے لے تابہ کشمیر و تبت
زمیں، رُوکھ، بن، پھول، ریت اور پربت — یہ فریاد سب کر رہے ہیں بحسرت

کہ کل فخر تھا جن سے اہلِ جہاں کو
لگا اُن سے عیب آج ہندوستاں کو

گڈریے کا وہ حکم بردار کُتا — کہ بھیڑوں کی ہر دم ہے رکھوال کرتا
جو ریوڑ میں ہوتا ہے پتے کا کھڑکا — تو وہ شیر کی طرح پھرتا ہے بھپرا

جو انصاف کیجیے تو ہے ہم سے بہتر
کہ غافل نہیں فرض سے اپنے دم بھر

ایک غزل کے یہ دو شعر بھی سنئے:۔

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں
علم و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

یقیناً ان اشعار سے ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ دیہاتی شاعری کے پہلے بیان کئے ہوئے نمونوں اور میرؔ و حالیؔ کے اشعار میں زبان کے لحاظ سے صرف اس قدر فرق ہے کہ جو ایک دیہاتی اور شہری کی روزمرہ میں آج بھی ہے، لیکن وہ ایسا فرق نہیں جس سے کوئی یہ کہہ سکے کہ یہ دو مختلف زبانوں کا کلام ہے۔ مگر کیا اقبالؔ اور دوسرے شعرا کے کلام کو دیہاتی زبان سے وہی نسبت باقی رہ گئی ہے جو میرؔ و حالیؔ کے کلام کو ہے۔ چنانچہ چند اشعار حضرتِ اقبالؔ کے بھی ملاحظہ ہوں۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
تجھے کیا بتائیے ہم نشیں سہیں موت میں جو مزا ملا
نہ ملا مسیح و خضر کو بھی وہ نشاطِ عمرِ دراز میں

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دُکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے — تصدق جس پہ حیرت خانۂ سیناؔ و فارابیؔ
فضائے عشق میں تعمیر کی اُس نے نوا ایسی — میسر جن سے آنکھوں کو ہیں اب تک اشک عنابی
فغانِ نیم شب شاعر کی بار گوش ہوتی ہے — گراں ہے شب پرستوں کو سحر کی آسماں تابی
دکھاتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر — جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب
کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ ازل — چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب

حضرتِ اقبالؔ کے ان اشعار سے ہم فوراً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ شاعر کوشش کر رہا ہے کہ عام فہم سلیس زبان میں اظہار خیال کر کے خود عوام کی زبان کو شستہ اور پاکیزہ بنانے کے بجائے طبقۂ خواص کی زبان کو بھی (جو عوام سے بالکل دُور ایک علیحدہ طبقہ بن گیا ہے) عوام کی زبان سے دور کیا جائے، لیکن یہ کوششیں ہرگز خوش آئند نہیں ہیں، وہ وقت بہت جلد آئے گا جب عوام و خواص میں اقتصادی یک رنگی کے سبب معاشرتی برتری اور تفوق کا خاتمہ ہو جائے گا، تو اس وقت طبقۂ خواص کی وہ سب یادگاریں بھی فنا ہو جائیں گی جو عوام سے اُن کو دور کئے ہوئے ہیں۔

ہمارے ادب خواہ وہ اردو کے ہوں یا ہندی کے اس سے انکار نہیں کرسکتے کہ اُن کا پیدا کردہ ادب بڑی حد تک ماضی میں بادشاہوں راجاؤں اور غیر ملکی استعمار کے مقرر کردہ عہدہ داروں کی چوکھٹوں پر سجدے کرتا رہا ہے اور زمانہ حال میں بھی وہ بہت بڑی حد تک اِنہی کا خادم ہے۔ لیکن شہنشاہی اور سرمایہ داری نظام کی قوت فوراً کم ہونی شروع ہوجاتی ہے جب عوام میں سیاسی قوت پیدا ہونا اور بڑھنا شروع ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کے عوام میں قوت پیدا ہونی شروع ہوگئی ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جبکہ وہ اپنے کمال کو پہونچے گی، اور شہنشاہیت اور اُس کے سارے خوشہ چین حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیں گے۔

اِس لئے اگر ہمیں اپنے ادب سے محبت ہے تو ہمیں لامحالہ اپنے ادب کو عوام سے قریب لانا چاہیئے جس کا میرے خیال میں صحیح طریقہ یہی ہے کہ ہم اِس دیہاتی زبان کو اچھی طرح پڑھیں سمجھیں اور خود سہل زبان میں لکھیں جب اِس ادب کا تعلق عوام کے مسائلِ زندگی سے ہوگا تو کوئی وجہ نہیں کہ دیہاتی زبان میں خود بخود ایسی سلاست اور شُستگی پیدا ہو جس سے اس کا بھدّاپن دور ہو جائے۔ اور ہمارے اردو ہندی کے جنگ آزما حریفوں کا جھگڑا بھی نہ نپٹ جائے۔

یہ بھی تو ہمارے اردو ہندی ادیب ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ جو ادب اُنھوں نے پیدا کیا ہے وہ صرف ہندوستان کے ۱۰ء۲ فیصدی متمدن انسانوں ہی کے لئے ہے۔ اور پھر اس ادب میں جس فلسفے پر بار بار خیال آرائی کی جاتی ہے، وہ ممکن ہے کہ کوئی باطنی حقیقت ہو۔ لیکن اس زندگی کی ظاہری حقیقتوں سے اس کا دور بھی واسطہ نہیں ہے، مثلاً تصوف وغیرہ اور پھر اِن کے متعلق استعارے اور تشبیہیں سبھی اُن خیالی مفروضات یا آنے والی زندگی کے حقائق کی اولادیں ہیں،

ظاہر ہے کہ ۹۷ فیصدی اُن عوام کا جن کو ۲۴ گھنٹے بھوک مفلسی، بیماری اور مشقت کے متعلق فکر کرنے اور سوچنے میں گزرتی ہے، آنے والی زندگی جنت، دوزخ، لوک، پرلوک کے متعلق سوچنے کے لئے ایک لمحہ بھی فرصت کا نہیں ملتا۔ اُن کا اس ادب سے قطع نظر زبان کی اجنبیت کے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوسکتا۔ البتہ یہ ادب نمائندہ ہے اُن انسانوں کا جو عوام سے دُور معلق آسمانوں میں آج تک رہے ہیں، اور ہمیشہ رہنا چاہتے ہیں، انھیں دیہات میں دُکھ بھری زندگی گزارنے والی اور موجودہ تمدن کی چکی کے پاٹوں میں پس جانے والی مخلوق کی زندگی سے کسی قسم کا ہمدردانہ تعلق نہیں ہے۔ اسی لئے ہمارا ادب زندگی کی حقیقتوں سے دُور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا، جب وہ کسی آتے جاتے کی زبان سے وہ مصائب جو دیہاتی اور مزدور شہری آبادی میں گزرتے ہیں سُن لیتے ہیں، تو وہ اب اپنے ادب کی شان کو قائم رکھتے ہوئے اُسے اپنے ادب میں داخل کرنا چاہیئے یعنی نظم یا فسانے کی صورت میں اُس کو لکھتے ہیں، اور اس طرح جس ادب کی بنیاد ہی تصنع اور فرضی باتوں یا حیات مابعدِ ممات کے فلسفے پر رکھی گئی ہیں اُس میں ڈھالنا چاہتے ہیں، مگر نہیں ڈھال پاتے۔

بہت ممکن ہے کہ ہمارے اکثر ادیب کہیں کہ سہل نگاری اُن کے بس کی بات نہیں ہے اوّل تو عادتاً دوسرے اس لئے کہ اُن کے اعلیٰ خیالات کو ادا کرنے کے لئے دیہاتی سے ملتی جلتی سہل زبان میں گنجائش ہی نہیں ہے، اور اُن کی بلند خیالی کے لئے یہ زمین و آسمان بالکل تنگ ہیں۔ لیکن یہ دونوں اعتراض قطعاً جاہلانہ ہیں، وہ ذرا ظفر کا مندرجۂ ذیل بھجن کا مطالعہ کریں۔

یہ دنیا ہے اوگھٹ گھاٹی پگ نہ بہت پھیلاؤ جی
اتنے ہی پھیلاؤ کہ جس کے دُکھ سے دُکھ نا پاؤ جی
اِس دنیا کے جتنے دھندے، سگرے گورکھ دھندے ہیں
اُن کے پھندے جانہ پڑو تم یا میں من نہ اُلجھاؤ جی
جس کارج کا کرنا کٹھن تم من میں اپنے جانتے ہو
اُس کی دیا سے سہج وہ سمجھو اِتنا نا گھبراؤ جی
شُدھ بُدھ دی کرتار نے تم کو سوچ سمجھ کر کرنا کچھ
ایسی کرنی مت کرنا جو کر کر پھر پچھتاؤ جی
کہئے بھولا نہ اُس کو ظفرؔ جو صبح کا بھولا سانجھ کو آئے
چھوڑ کے سب رے جھگڑے اپنا رب سے دھیان لگاؤ جی

اگر بہادر شاہ بادشاہ کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اس زبان میں شعر کہہ سکیں جن کی روزمرّہ اُس سے قطعاً مختلف تھی۔ نیز اُس زمانے کے مسلمانوں کی زبان پر آج سے کہیں زیادہ فارسی اور عربی زبان اور تخیل کا اثر تھا اور پھر اُنھوں نے ملکی زبان میں شعر کہنے کی کوشش کی اور بہت حد تک

اس میں کامیابی ہوئی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ آج اس سے بہتر زبان میں شعر نہ کہا جا سکے جس میں فارسی عربی الفاظ کی بھی آمیزش ہو۔

اب رہا یہ سوال کہ دیہاتی زبان سے ملتی جلتی صاف زبان میں بلند پردازی کی گنجائش نہیں۔ اس کا جواب ہم چند دیہاتی زبان کے بلند خیال شعرا کے مندرجۂ ذیل کلام سے دیتے ہیں۔

شہنشاہ اکبر کے عہد کا میواتی شاعر سعد اللہ جو موضع آکیڑہ ضلع گوڑگانوہ کا باشندہ ہے۔ اپنے ممدوح چاکت مل میو کے جود و کرم کی کس انداز میں ستائش کرتا ہے۔

دوہا

اِندر کی اور چاکت مل کی نت نت کیجے آس
اِندر برسے چار مہینے چاکت مل برسے بارہ ماس

شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں دو مخیر ہیں اِندر بارش کا دیوتا اور دوسرا چاکت مل جن سے ہر دم اُمید رکھنی چاہیئے۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ اِندر صرف چار مہینے برستا ہے اور چاکت مل کی بارشِ جود و کرم بارہ مہینے رہتی ہے۔

عیوَض میو ضلع گوڑگانوہ کا دوسرا میواتی شاعر ہے جس نے ڈھولا کو نظم کیا ہے۔ ڈھولا جی نل کے بیٹے کی شادی پیدائش سے پہلے ہی پنگل دیس کے راجہ کی لڑکی مارو سے ہو چکی تھی مگر ابھی گونا (یعنی وداع) کی نوبت نہ آئی تھی کہ ایک مالی کی لڑکی ریوے سے عشق ہوا اور بڑی خوشامدوں اور قول و قرار کے بعد شادی بھی ہوئی۔ ریوے کے عشق میں مدتوں ڈھولا جی اپنی اصلی مانگ کو بھولے رہے۔ آخر جب دھیان آیا تو ریوے سے چھپ کر پنگل دیس کی راہ لی۔ ریوے جو خود ڈھولا جی پر فریفتہ تھی ڈھولا جی کے تعاقب میں اُن کے اونٹ کے نقش پا پر روانہ ہوئی، شدت کی گرمی نے آخر ہمت پست کر دی، اب شاعر اُس کے مُنہ سے یہ دوہا کہلواتا ہے۔

دوہا

ٹیروُں تو سُن سے نہیں، روؤں تو لاج بھی مردل
پیا پیارے کے کھوج کی میں چُن چُن گو دہی بھر ول

یعنی چلاؤں تو وہ سُن نہیں سکتے۔ روؤں تو شرم آتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ پیا پیارے کے نقش پا کی مٹی سے ہی چُن چُن کر گود بھر لوں۔"

اس کے بعد جذبۂ شوق پھر ہمت بندھاتا ہے، اور وہ پھر چل پڑتی ہے اور آخر کار اس کا مطلوب چھونکڑ کے درخت کے نیچے اُسے سوتا ہوا پایا جاتا ہے۔ چھونکڑ کا درخت ریگستانی علاقوں میں ببول سے ملتا جلتا ہوتا ہے جو کال میں بہت پھلتا ہے، اب ریوے چھونکڑے سے مخاطب ہو کر ایک دوہا کہتی ہے۔

دوہا

جنگل کے رے چھونکڑا تری جڑ جا ئیو پاتال
تو نیچے ڈھولا ملا، تو پھلیو کال دو کال

"یعنی اے جنگل کے چھونکڑ تیری جڑیں پاتال تک جائیں نصیب ہوں تیرے نیچے ڈھولا جی مل گئے۔ خدا تجھے ہمیشہ قحط و بے قحط پھلنا پھولنا نصیب کرے"

میوات کا تیسرا شاعر لکھے موضع کیرا کا ضلع گوڑگانوہ کا رہنے والا ایک المیہ شاعر ہے۔ لیکن اس کا کلام بالکل ہمارے المیہ شعرا سے مختلف ہے۔ اپنے باپ اور بھائی کے مرنے کے بعد کہتا ہے۔

دوہا

بھائی مرے تو بَل گھٹے، پتا مرے پت جائے
مُندر سوتا جانیو رے لکھے جا دن مرجائے مائے

"یعنی اگر بھائی مرتا ہے تو خاندان کا زور ٹوٹ جاتا ہے، اور اگر باپ مرتا ہے تو خاندان کی آبرو کم ہو جاتی ہے، لیکن اے لکھے جس دن ماں مرجائے تو ساری دنیا سنسان سمجھیو۔"

بیٹا عالمِ سکرات میں ہے بے قرار باپ کس طرح اس کا اظہار کرتا ہے۔

دوہا

تختہ تو ڈھیلے ہوئے چو بخن لاگی کیل
گڈھ کے گھیرا ہو گئے رے لکھے کوئی پہر دوپہر کے ہے ڈھیل

کہتا ہے کہ "تختہ یعنی جسم تو ڈھیلا ہو چکا اور کیلیں ڈھیلی ہو کر بولنے لگی ہیں (یہ اشارہ سانس کی آواز کی طرف ہے) اے لکھے قلعہ گھر چکا ہے اور پہر دو پہر میں سر ہونے والا ہے۔"

آخر قلعہ سر ہو جاتا ہے۔

بجھی تو سیلی پڑی، ٹھنڈے پڑے انگار   اہرن میں کھڑکا نہیں جنے کدکے گئے لہار

کہتا ہے کہ "بھٹی یعنی جسم سرد ہو چکا، اور وہ آگ جو اُسے گرم رکھتی تھی بجھ چکی ہے۔ اہرن (یعنی نبض) میں اب کسی قسم کی کھٹ کھٹ کی آواز نہیں آرہی ہے۔ خدا جانے لوہار کتنے عرصے سے جاچکے ہیں۔"

حسنو کھتولی ضلع مظفر نگر کا شاعر جس کی کنڈلیاں بہت مشہور ہیں، دلّی آکر حقہ خریدتا ہے۔ جمناجی میں تازہ کرتا ہے، اب ذرا اُس کی واردات سُنئے،

دِلّی شہر سے حقّہ لینا پیسے دینے مُٹھّی بھر
جمناجی میں گوطا دینا حقّہ نیچا دو نوں ہِتر
آگ ڈھاک کے کوئلے بنائے لاٹ اُٹھی جے نیلو پھر
حسنو کہے کھدا مرا جانے اب کے حقّہ پھر بھی بھر

دوسری کُنڈلی سُنئیے۔

آدھی رات سُگر پر آئی یُو بھی بیتی جاتی ہے
حسنو کہے کھدا مرا جانے موت سبھی کو آنی ہے

برج کا شاعر گردھر کب رائے حُقّے کو بُرا سمجھتا ہے اس کی وجہ وہ بیان کرکے افسوس کرتا ہے کہ چھٹ نہیں سکتا۔

حُقّے سے حُرمت گئی تو نیم دھرم گئے چھوٹ
ناج بیچ تبا کو لینا گئی ہیئے کی پھوٹ
گئی ہیئے کی پھوٹ آگ کو گھر گھر ڈولے
جا گھر جاوے وہی نار رسبڑا کر بولے
کہیں گردھر کب رائے کرم کے رُکّا
جان جائے تو جائے جبھی چھوٹے حُکّا

یہی شاعر ایک اور کنڈلی میں بیان کرتا ہے، کہ خواہشات کی غلامی موت کی نشانی ہے۔

آگ لگی تن جوان میں تو دُوں لاگی بجھائے • دوں لاگی بجھائے تو جلے جیسے کانچ کی بھٹی
جوں مانس جل جائے رہے پنجر کی ٹٹی • کہیں گردھر کب رائے ارے نل میرے مِتا
وہ نل کیسے جیویں جن کو نِت بیاپے چنتا

کہتا ہے کہ "تن جوان (وہ درخت جس کی لکڑی آگ کو بہت جلد پکڑتی ہی) میں اگر آگ لگ جائے تو بجھا لوں، لیکن خواہشات کی آگ کس طرح بجھاؤں، جو گوشت پوست جل جانے کے بعد بھی رہتی ہے، اے میرے دوست وہ آدمی کیسے جیتے ہیں، جن کے دل میں ہر وقت خواہشات پیدا ہوتی رہتی ہیں۔"

موضع انکھیر نواح دہلی کا شاعر اننت لال مندرجۂ ذیل بھجن میں شاعرانہ استعارات سے کسانوں کے دردناک مصائب بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ پرمیشر کے متعلق یہ خیال کہ وہ ہماری اِن مصائب سے خلاصی کرے گا اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہمیں مایوسی ہر طرف سے ہو جاتی ہے، اور کسان اس وقت بھی مُشتبہ ہی رہتا ہے

بھجن

ٹیک۔ مرے ہم کیوں نا دکھیا دین کسان

جب چو طرفہ سے دکھ کے بادل ہمارے اوپر اُمنڈ رہے
کوئی ہوا نہیں جو اُنھیں ہٹا دے، اُمنڈ اُمنڈ کر گھمنڈ رہے
گرج گرج کر شور مچا ویں سن سن کر ہم ڈرن لگے
دکھ رُوپی اولوں کے بتّے سے بِنا موت ہم مرن لگے
جب کوئی نہیں سہارا دیکھے، دھیان ہری کا دھرن لگے
شاید رکھشا کرے ہمارے دین بندھو بھگوان
مریں ہم کیوں نا دکھیا مرے دین کسان

اس کلام سے جو مشتے از خروارے ہے، ہمارے ادیب اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سہل نگاری بلند خیالی کے لئے روک نہیں بن سکتی آخر میر و حالی کے لئے بھی تو وہ روک نہ بن سکی۔ ہمیں یہ مکرر عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو ادب طبقۂ خواص کے لئے مخصوص کیا جا رہا ہے اندیشہ ہے کہ اس کا حشر بھی وہی نہ ہو جو قصبات کے ڈوم ڈھاڑیوں کا ہوا ہے کہ آج جب دولت اُن کے ججمانوں کے ہاں سے رخصت ہو گئی ہے اور وہ غریب ہو گئے ہیں تو وہ بیچارے بھی بھیک مانگتے دربدر پھر رہے ہیں اور کوئی اُن کا پرسانِ حال نہیں۔

سید مُطلبی فریدآبادی

---

۱ غوطہ ۲ شعلہ ۳ جس طرح۔ مثال ۴ نیلوفر ۵ خدا ۶ ڈھلنے پر ۷ یہ بھی ۸ حُقّے ۹ پھرے ۱۰ ترا کر۔ گڑ گڑا کر ۱۱ بدنصیب۔

اے چاند!

اے چاند تیرا چہرہ کیسا اُتر رہا ہے؟ — تجھ پر بھی کوئی شاید بیداد کر رہا ہے
مانندِ تھکے مسافر، عازم ہے تو کہاں کا — سنسان راستوں سے تنہا گزر رہا ہے
نقشِ قدم نہیں ہے، یہ رنگِ ناتوانی! — ہے آفریں کہ پھر بھی گرمِ سفر رہا ہے
کرنیں نہیں ہیں تیری، ہیں آنسوؤں کی لڑیاں — بکھرا رہا ہے موتی اور دل بکھر رہا ہے
بے خواب تیری آنکھیں ہیں منتظر کسی کی — محوِ خبر رہا ہے گو بے خبر رہا ہے
خاموشیوں میں تیری گفتار کا ہے عالم — کس کا جمالِ رعنا پیشِ نظر رہا ہے
عاشق ہے تو بھی شاید میری طرح کسی پر — محزون و دل گرفتہ جو رات بھر رہا ہے

آ، تیرا غم بٹاؤں، مجھ سے نہ بدگماں ہو
میں تیرا راز داں ہوں، تو میرا رازداں ہو

تیرے دیار میں بھی کیا جرم ہے محبت — وہ جان کے ہیں دشمن جو دل کا مُدعا ہیں
معدوم ہے وہاں بھی کیا رسمِ دلنوازی — آزار کے ہیں درپے جتنے بھی دلرُبا ہیں
خواہش تو یہ کہ اُن سے کوئی کرے محبت — دل لے چکے تو ہر دم آمادۂ جفا ہیں
ابرو کا یہ اشارہ، ہم تیرے، تو ہمارا — آنکھیں نہ پھر ملائیں، اس درجہ بے وفا ہیں
یا شوخیاں کہ جن سے شوخی پناہ مانگے — یا مثلِ غنچہ یکسر اک پیکرِ حیا ہیں
دیکھو تو اُن کو دیکھو، چاہو تو اُن کو چاہو — خوش چشم و خوش ادا ہیں، پر قہر ہیں بلا ہیں
سمجھے ہوئے ہیں خوبی، عاشق کا دل دُکھانا — اس طرز اس ادا کے تیرے بھی آشنا ہیں

غم آشنائے دل ہے، سُن لے مرا فسانہ
دُکھ درد کی کہانی، بیداد کا فسانہ

اے چاند تیرا چہرہ کیسا اُتر رہا ہے!

آثر لکھنوی

شیطانی حکومت

م - ح

شیطانی دربار سجا ہوا تھا، یورپ و ایشیا، امریکہ و افریقہ، روم و شام، چین و ماچین، ہر جگہ، ہر ملک اور ہر خطے کے ابلیسوں اور طاغوتوں کے عمائد و اکابر، رؤسا و امرا، لیڈر اور گورنر کرسیٔ زرنگار پر بڑی رعونت و تجبّر سے متمکن تھے، کسی کا چہرہ ہاتھی کا سا تھا تو کسی کا سور کا سا اور کسی کا بھالو کا سا تھا تو کسی کا گدھے کا سا۔ مگر بایں شکل و صورت ہر ایک مرغِ زرّیں بنا تھا، اطلس و حریر زیبِ جسم، الماس و گہر زینتِ دست و گلو!

ان سے تھوڑی بلندی پر، مگر بالکل مقابل، حسین سے حسین مہ جبینوں کی قطار در قطار بیٹھی تھی، ہر ایک کی آنکھوں میں بلا کی لگاوٹ، ہر ایک کے لبوں پر سحور کن مسکراہٹ اور ہر ایک کی بوٹی بوٹی پھڑکتی ہوئی، غمزہ و ادا پس پشت کھڑی مروحہ جنبانی کر رہی تھیں، اور نفسانیت و بوالہوسی بغل میں ایستادہ عطر پاشی میں مشغول تھیں۔

نیچے بیٹھے ہوئے طاغوت انھیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے اور اشاروں ہی اشاروں میں جان نثاری کا یقین دلاتے تھے۔ مگر وہ ان کا ہیولیٰ دیکھکر کبھی طنز سے ہنستی، کبھی شوخی سے آنکھیں مارتی اور کبھی حقارت سے اپنا سیمیں ٹھینگا دکھا دیتی تھیں!

اِتنے میں بیچ میں سب سے بلندی پر رکھے ہوئے سونے کے مُرصّع تخت کے پیچھے کا زرتار پردہ ہلا۔ حاجب نے تین بار مینا کار رنگا رنگی فرش پر عصا مارا۔ پھر آواز دی "نگاہ روبرو! خداوندِ زمین و زماں حضور شاہِ عالیجاہ!" سارا مجمع سروقد تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا، پردہ ہٹا اور اَبُ الخبائث، شیطان تاجِ کیانی سر پر رکھے موتیوں میں گُندھی ہوئی ردا دوش پر ڈالے نمودار ہوا۔ طاغوت نظریں جھکائے، جُھکی ہوئی کمانوں کی طرح دُوہرے ہو گئے۔ چھپکلیاں، گھینگھرے، ساریاں، پائینچے اور گاؤں گھٹنوں کے پاس سے دونوں ہاتھوں کے سہارے پھیلا کر انڈے پر بیٹھنے والی مرغیوں کی طرح، زمیں دوز ہوئیں، اور شہنشاہ کے گردن ہلا کر سلام لینے پر سنبھل کر کھڑی ہو گئیں، اَبُ الخبائث نے تخت پر بیٹھے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے سب کو بیٹھ جانے کا حکم دیا، اور سب گردن جھکائے، اپنی اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔

طاغوتوں میں سے ایک جس کے چہرے بھر پر بال ہی بال تھے، مگر جس کی چندیا سیکڑوں برس کے مُردے کی کھوپڑی کی طرح سپید و صاف تھی، اُٹھکر کھڑا ہو گیا،

شہنشاہ نے پوچھا "وزیرِ اعظم، کیا تمام ممالک کے عمائد و اکابر و حکام آ گئے؟"

اُس نے دست بستہ عرض کی "جہاں پناہ! سب حاضر ہیں!"

شاہی حکم ہوا کہ ایک ایک کرکے رپورٹیں پیش کی جائیں۔

وزیر نے سب سے قریب والے ابلیس کی طرف دیکھا، اس نے اپنی جگہ سے علیحدہ ہو کر پہلے تو شہنشاہ کو ایک سجدۂ تعظیمی کیا، پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

لبِ خسروی کو جنبش ہوئی "کہو تمہارے ممالک کی کیا حالت ہے، لارڈ ڈیول!"

لارڈ ڈیول نے میمونی انداز سے گلا صاف کرکے کہا "جہاں پناہ! مجھے خوف ہے کہ جو خبریں سُنانے والا ہوں، اسے جہاں پناہ مسرت سے نہ سن سکیں گے"

ضلالت مآب کے چہرے پر ہلکی سی شکن پڑ گئی، سارے دربار کی ہر چیز پر سیاہی

سی دوڑ گئی، حکم ہوا "تم بیان کرو لارڈ ڈیول، اپنے عزور کی قسم میں ناخوش ہونگا"
لارڈ ڈیول نے عرض کیا، اور اُس کی لرزتی ہوئی آواز اس کے دل کی دھڑکن کا پتہ دے رہی تھی۔ "جہاں تباہ! ان ممالکِ محروسہ سرکاری میں جن کی نگرانی ضلالت مآب نے مجھے عطا فرمائی ہے، یعنی انگلستان و فرانس وسوئٹزرلینڈ وسویڈن و ڈنمارک میں ہمدردی و اخوت کا مادہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ کم ہوتی جاتی ہے، اور ان میں ایک خاص خواہش امان وسلامتی کی پیدا ہو گئی ہے، اُن کے جمہور کا یہ خیال ہوتا جا رہا ہے کہ صلح و آشتی ہی میں فلاح و بہبود ہے، چنانچہ یہ لچر اور لغو خیالات و رجحانات اس قدر تیزی سے پھیلتے جاتے ہیں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نوجوانوں کو اس طرح امنِ عامہ کا خواہشمند بناتے جا رہے ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضور کی وہ قسم جو ضلالت مآب نے اغوائے بنی آدم کے بارے میں ابد الآباد تک کے لئے کھائی تھی، آجکل کے زمانے میں کیونکر پوری کی جا سکے گی۔ عالیجاہا! آپ کا یہ گرگِ باراں دیدہ نمکخوار یہ عرض کرنے میں اپنی سبکی نہیں سمجھتا کہ فضا کی ناموافقت کی وجہ سے اُس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے!"

شیطان کا آتشیں چہرہ غصّے سے سیاہ ہو گیا، کمرے بھر میں تاریکی پھیل گئی اور ساری بھُتنیاں خوف سے بھنبھنانے لگیں، مہ جبینوں میں سے ایک صاعقہ کی طرح چمکی اور لارڈ ڈیول کے پاس شہابِ ثاقب کی طرح آکر گری۔ اُمّ الخبائث نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا، آنکھوں میں چمک، لبوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی، ہال میں روشنی پھیل گئی۔

وہ تعظیماً جھک کر بولی "عالیجاہ! لارڈ ڈیول واقعی بوڑھے ہوئے، اب یہ بچوں کی طرح ذرا ذرا سی باتوں سے ڈرنے لگے ہیں، اُن کے دماغ سے سوچنے کا مادہ اور سمجھنے کی صلاحیت بالکل اسی طرح غائب ہو گئی ہے، جس طرح سوڈا واٹر کی کھُلی ہوئی بوتل سے جھاگ کافور ہو جاتی ہے۔ مگر جہاں تباہ! میں فرانس میں موجود ہوں، اور جب تک وہ خطۂ مینو سواد میری نگرانی میں ہے میں اِس مُلک کے باشندوں کو کبھی بھی یکدل ہو کر کام نہ کرنے دونگی۔ ایک تو عیش و نشاط کا وہ بازار گرم رہے گا کہ وہاں کے مرد و عورت کبھی زندگی کے مسائل پر سنجیدگی سے غور ہی نہ کر سکیں گے، دوسرے ان کے جذبات ہمیشہ اتنے برانگیختہ رہیں گے کہ وہ آپس میں اتحاد و اتفاق کی فضا ہی نہیں پیدا کر سکیں گے! عالیجاہا! میں نے اب کچھ انتظام کر رکھا ہے کہ وہاں کے مدبرین لاکھ کوششیں کریں، مگر اُنکی کابینہ کی اوسط عمر تین چار ماہ سے زائد نہ ہو سکے گی! بھلا وہ لوگ جو آئے دن اپنی سلطنت کے سر پر طرح طرح کی ٹوپیاں پہناتے اور اُتارتے ہوں اُن سے مایوس ہو جانا کوئی عقلمندی ہے؟!"

ایک اور پری اپنی جگہ سے اُٹھکر تختِ شاہی کے سامنے اٹھلاتی ہوئی آئی اور بڑے دلربایانہ انداز سے بندگی کرکے بولی "عالیجاہ! خاص انگلستان کی نگرانی میرے ذمہ ہے۔ میں بھی اپنی بہن "عقل کی دیوی" کی رائے سے اتفاق کلّی رکھتی ہوں۔ فرانس تو فرانس، ہمیں انگلستان سے بھی مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ اس کے پاس ایک چوتھائی دنیا ہے، اور اس میں بہت سے ایسے حصّے شامل ہیں جہاں ہمارے ہی منشا کے مطابق حکومت ہوتی ہے! خود انگلستان میں قدامت پسندوں کا دور دورہ ہے، اور یہ جماعت کالے گورے مشرقی اور مغربی کے امتیازات سے باز نہیں رہ سکتی؛ اس لئے اس سے مایوس ہونا نہ تو قرینِ عقل ہے اور نہ نتیجۂ فہم و فراست! بس سرکارِ عالی اس سے سمجھ لیں کہ چار ہی دن ہوئے کہ اُنھوں نے اپنے محبوب ترین بادشاہ کو محض اس بنا پر تخت سے اُتار دیا کہ وہ ایک مطلّقہ سے شادی کرنا چاہتا تھا، جب تک اسی طرح کی قدامت پسندی انگلستان میں باقی ہے اُس وقت تک انگریز ہمارے پنجۂ فولادی سے نہیں نکل سکتا!"

شیطان مسکرا کر بولا "شاباش! مرحبا! تم دونوں نے تصویر کا دوسرا رُخ پیش کرکے ذرا اُمّید دلائی کہ مابدولت کے نمکخواروں میں اب بھی سُوجھ بُوجھ کے لوگ موجود ہیں۔ ورنہ تمہارے افسر لارڈ ڈیول نے تو بالکل مایوس ہی کر دیا تھا"

لیڈی تبلی ذی بب بولیں "جہاں تباہ! اسی لئے تو بہن "عقل کی دیوی" نے اُن کو بوڑھا کہا۔۔۔۔" لارڈ ڈیول پیچ و تاب کھا کر بات کاٹ کر بولا "ضلالت پناہ! یہ چھوکریاں معمولی سطحی باتوں پر جاتی ہیں، یہ صحیح نبّاضی نہیں کر سکتی ہیں! میں نے جہاں تباہ سے بالکل صحیح عرض کیا ہے کہ بڑا خطرہ ہے! حضور میں دو اُمور کی طرف سرکاری توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، ایک تو یہ کہ انگلستان میں وہ جماعت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے جو نو آبادیات ومقبوضات کو حکومت خود اختیاری دینا پسند کرتی ہے، چنانچہ عالی جاہ ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ ڈومینئین کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، کناڈا،

آسٹریلیا، نیوزیلینڈ اور افریقہ تو پہلے سے آزاد تھے، آئرلینڈ جہاں صدیوں سے ہمارے اصولوں پر حکومت ہوتی تھی، وہ بھی جمہوری سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا اور ہندوستان بھی اسی شاہراہ پر گامزن ہے!"

لیڈی بلیذی بب چمک کر طنز سے بولی جی بالکل سچ ہے! جیسے وہاں ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ کا وجود ہی نہیں!......"

لارڈ ڈیول نے جھڑک کر کہا "پھر وہی سطحی باتیں! یہاں جمہور کی ذہنیتوں کے بدلنے کا سوال ہے نہ کہ چند خود غرض اور خود ساختہ لیڈروں کے شور و شغب کا۔ جب تم ان باتوں میں فرق نہیں کرسکتیں تو بہتر ہوگا کہ تم شہنشاہ کے روبرو خاموش ہی رہنے کی کوشش کرو......"

لارڈ ڈیول کی اس ڈانٹ پر لیڈی بلیذی بب کی غزالی آنکھیں پُرآب ہوگئیں۔

شیطان کے چہرے پر شکنیں پڑیں، اور پھر تاریکی پھیلنے لگی، وہ گرج کر بولا "خاموش رہو لارڈ ڈیول! مابدولت کو مایوسی کی باتیں نہیں پسند ہیں۔ کیا تم یہ بھول گئے کہ مابدولت اکیلے پوری خدائی کا مقابلہ کرنے نکلے ہیں اور کبھی ہراساں نہیں ہوئے۔ ذرا سوچو تو تنہا مری ذات کے مقابلے پر کیسی کیسی طاقتیں ہیں۔ ملائکۂ ارض و سما اتنے کہ جنکی صحیح تعداد آدم کے خدا کو بھی شاید ہی یاد ہو!"

سارا مجمع مسکرادیا ـــــ پھر انبیاء، اولیا، اصفیا، اتقیاء، صلحا، و زہدا مگر مابدولت و اقبال نے جس کام میں ہاتھ ڈالا آج تک کبھی ناکامیاب نہیں ہوئے۔ نہ ایں جانب نے شکست مانی، نہ کبھی ہارے یا مایوس ہوئے! کان کھول کر سُن لو لارڈ ڈیول! خواہ فضا موافق ہو یا مخالف، مگر ان ممالک کو میری ہی خواہش کے مطابق اور میرے ہی اصولوں پر چلنا پڑے گا، ہاں اگر تم سے یہ کام نہیں سنبھلتا تو بہتر ہوگا کہ وزیر اعظم کے مشورے سے اُن ممالک کا چارج کسی اور کو دے دو۔ مگر مابدولت کے سامنے اِس طرح کی باتیں نہ کرو جن سے تمہارے چھوٹے سے دل کے دھڑکنے کی صدا آرہی ہو!"

سارے مجمع میں ایک اضطراب کی لہر دوڑگئی، اہرمن ہی خیر کرے! جب انگلستان و فرانس کی رپورٹ پر یہ غصہ ہے تو دیگر ممالک کے حالات و واقعات سننے کے بعد کیا کیفیت ہوگی، پھر اگر سب سے جہاں دیدہ، سب سے معتمد اور سب سے بااثر طاغوت کی بھرے دربار میں یہ رسوائی ہوئی تو وہ جو چھوٹے ہیں، جن کا مرتبہ نسبتہً کم ہے ان کی کیا گت بنے گی!

اسی حالتِ انتشار میں لارڈ ڈیول نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کمر میں لگی ہوئی تلوار کھول کر تخت کے سامنے رکھدی اور ہاتھ جوڑ کر کہا "ضلالت انتساب! ہمارا کام سچ اور صحیح حالات و واقعات کا گوش گزار کرنا ہے، نہ کہ سرکار کے سامنے اپنے کارنامے بیان کرنا! عقل نے ہمیشہ یہ رائے دی ہے کہ دشمن کو کبھی کمزور نہ سمجھو، تاکہ تم اُس کے مقابلے کے لئے بہتر سے بہتر طریقے پر تیار ہوسکو۔ اگر عالی جاہ یہ خیال فرماتے ہیں کہ صحیح حالات کا عرض کر دینا ہی کمزوری کی دلیل ہے تو لیڈی بلیذی بب کو میرے ممالک کا چارج دلوادیا جائے، میں واقعی بوڑھا ہوا، مجھے ہر لمحہ انسانی دنیا کے بہترین دماغوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اور میں سوچتے سوچتے تھک جایا کرتا ہوں، میرے لئے آدم کے خدا کی بنائی ہوئی جنت سے کہیں زیادہ اس میں راحت و مسرت کے سامان ہیں کہ میں اپنے آقا اور ولی نعمت کے قدموں سے لگا بیٹھا رہوں!"

شیطان پر آخری فقرے کے خلوص کا بڑا اثر ہوا، اس نے سوالیہ انداز سے وزیرِ پُرتدبیر کی طرف دیکھا، اس نے سر ہلایا۔

شیطان کھڑا ہوگیا۔ وہ خسروانہ تمکنت سے آہستہ آہستہ آگے بڑھا، اس نے جھک کر تلوار اُٹھائی، اُسے لارڈ ڈیول کو واپس دے کر وہ بولا۔

"میرے سب سے معتمد گورنر! میں تمہاری قابلیت، تمہاری جفاکشی اور تمہارے خلوص کا قائل ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ جو ممالک تمہیں سپرد ہیں ان کا انتظام و انصرام تم سے بہتر کوئی نہیں کرسکتا۔ میں خوش ہوں کہ تم نے وہاں کے سچے حالات سے مجھے آگاہ کردیا۔ اب ان خرابیوں کے دور کرنے کی صورتیں تم خود ہی سوچو اور خود ہی ان تدبیروں پر عمل پیرا ہو۔ مجھے تمہاری فراست سے اس امر کا یقین ہے کہ تمہاری تدبیریں کامیاب ہوں گی۔ اور ابھی صدیوں ان ممالک میں جیت ہماری ہی رہے گی!"

لارڈ ڈیول نے جھک کر جس ہاتھ سے تلوار ملی تھی اُس کو چوم لیا۔ پھر وہ بولا "میں ضلالت انتساب کے اس اعتماد کا حد درجہ ممنون ہوں اور حضور عالی کو یقین دلاتا ہوں کہ شیطانی قدرت میں جتنی تدبیریں، چالیں، عیاریاں اور مکاریاں ہیں میں اُن سے کام لینے سے اپنے ممالک میں باز نہ آؤں گا!"

شیطان مُسکرایا، اس نے گورنر کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھدیا، پھر لارڈ ڈیول پیچھے ہٹ کر اپنی کرسی پر اور شیطان اپنے تخت پر بیٹھ گیا۔

وزیر نے آواز دی "ہز اکسیلنسی کیپٹن فورسٹ!"

"عالی جاہ! سالِ رواں میں ممالکِ محروسہ اطالیہ، جرمنی و اسپین، میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جس سے ہمیں کسی قسم کی کوئی مایوسی ہو۔ اطالیہ میں آزادی معدوم ہے۔ حبشہ کے ساتھ بہیمانہ سلوک میں کوئی کمی نہیں، اور جب تک ہمارے دوست فیسٹوں کی حکومت ہے، ہر لمحہ ہمیں نئی طرح کی کامیابیوں کی اُمید ہے۔ اسپین کی خانہ جنگی اور خانماں بربادی پورے زور شور سے جاری ہے۔ نسلِ انسانی کے انقطاع اور انسانیت کے مٹانے کی کوششیں روز افزوں ہیں، خونِ انسانی سے برابر ہولی کھیلی جارہی ہے، اور ہماری ہر طرح سرخروئی ہے! اب رہا جرمنی تو وہاں کے باشندوں کے آپس کے اتحاد و اتفاق، نیز علم و عقل سے بڑا خطرہ تھا، مگر وہاں یہودی و آریہ کے سوال نے ہماری کامیابی کے بہت سے امکانات پیدا کر دئے، اور ہم نے ان مواقع سے خوب خوب فائدے اُٹھائے، چنانچہ تمام ایسے لوگوں کو جو اقلیمِ علم و ادب پر حکمرانی کر رہے تھے ملک سے جلا وطن کرا دیا، اور جرمنی کو ہمارے خاص ممالک اطالیہ اور جاپان کا حلیف بننے پر مجبور کر دیا، میں شاہِ جم جاہ کو اپنے ممالک کی طرف سے اطمینانِ کلی دلاتا ہوں، آدم کا خدا لاکھ چاہے مگر ابھی صدیوں تک ان ممالک کی ارواح ہماری ملکیتِ خاص رہیں گی!"

شیطان نے خوش ہو کر کہا "مرحبا! مرحبا! ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!"

وزیرِ اعظم نے پھر کھڑے ہو کر آواز دی "کامریڈ اسٹینسکی!"

ایک سوکھا سا عفریت جس کے چہرے کی قطع بالکل روسی بھالو سے ملتی تھی اُٹھکر کھڑا ہوا، اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا "جہاں تباہ مجھے خطرہ ہے کہ میری رپورٹ لارڈ ڈیول کی رپورٹ سے بھی زیادہ ناپسند کی جائیگی۔ میں عالی جاہ کی طرف سے ممالکِ روس، سائبیریا، ترکستان و بلقان وغیرہا میں نمائندہ ہوں۔ مگر سرکار والا تبار میں کوئی دل خوش کُن خبر گوشگزار کرنے سے معذور ہوں۔ سرکاری ملکت کے اس خطے کے سب سے بڑے حصے میں سرمایہ داری اور امارت کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اور انسانی دماغوں نے ہمیں شکست دینے کی ہر صورت اور ہر تدبیر اختیار کر لی ہے، مذہب ظاہری جو ہمارا سب سے مضبوط اور مستحکم قلعہ تھا اور جس کے اندر چھپ کر ہم نے آجتک بڑے سے بڑے دشمن کا مقابلہ کیا ہے وہ روس میں بالکل مسمار کر دیا گیا، ان میں آپس کی مروت، اخوت و خلوص روز افزوں ترقی پر ہے مساوات کا خیال اس قدر خطرناک طور پر پھیل گیا ہے کہ مجھے بھی اپنے نام سے شہزادے کا شاندار لقب نکال دینا پڑا اور اُس کی جگہ پر کامریڈ کا سا حقیر و ذلیل لفظ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر یہی حالات رہے تو مستقبل قریب میں یہ تمام ممالک ہمارے ہاتھ سے بالکل نکل جائیں گے.........."

شیطان نے گھبرا کر پوچھا "تو تم نے اُس کے انسداد کی کوئی تدبیر نہ کی؟"

کامریڈ نے کہا "جہاں تباہ! مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے میں کر رہا ہوں اور میں عالی جاہ کے سامنے اس کا اقرار کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنی اسکیموں میں کپتان فورسٹ سے بہت کچھ مدد مل رہی ہے" یہ کہتے کہتے وہ کپتان کی طرف دیکھ کر ذرا سا جھک گیا، کیپٹن نے بھی نصف قد سے کھڑے ہو کر اس تعظیم کا جواب دیا۔

کامریڈ نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا "مگر ضلالت انتساب! میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلے پر غور و فکر کے لئے کابینہ کا ایک خاص جلسہ حضور کی ذاتی صدارت میں جلد سے جلد منعقد کیا جائے۔ تاکہ تمام پہلوؤں پر بحث کر کے حریت و مساوات کی اس لہر کو روکنے کے لئے کوئی موثر اقدام کیا جا سکے۔"

شیطان نے وزیرِ اعظم کی طرف دیکھکر کہا "اچھا آج بارہ بجے کابینہ کا جلسہ بُلا لو۔"

وزیرِ اعظم تعظیماً جھکا اور اُس نے ایک کاغذ پر یہ حکم نوٹ کر لیا۔

پھر وزیرِ اعظم نے بآوازِ بلند پکارا "مسٹر ڈالر!"

ایک لمبا سوکھا سا عفریت کھڑا ہوا، اور اُس نے تخت کے سامنے تعظیماً جھکنے کے بعد کہنا شروع کیا "جہاں تباہ! کامریڈ اسٹینسکی کی رپورٹ کے بعد غالباً میری رپورٹ حضور کے لئے حد درجہ خوش کُن ہوگی، حضور کے اس ادنیٰ ترین خادم نے ممالکِ امریکہ کے دلوں پر اس طرح قبضہ کر رکھا ہے کہ چاہے دنیا کے سارے ممالک سرتابی و روگردانی کی جسارت کر بیٹھیں، مگر جو ممالک اس غلام کو سپرد کئے گئے ہیں ان کو اس طرح کی سرتابی کا خیال تک نہیں ہو سکتا۔ ہم نے ان ممالک کے ہر شعبۂ زندگی کو ہوسِ زر میں رنگ دیا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے آدمیوں سے لے کر بڑے سے بڑے قائدین تک ہر ایک میری ہی خدمت اور میری ہی محبت میں

سرشار ہے۔ کہنے کے لئے ان ممالک میں حریت وآزادی، اخوت ومساوات سب کچھ ہے۔ مگر میں سرکار کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ سب میری محبت کے تابع ہیں۔ اِس دعوے کے ثبوت میں صرف دو باتیں مثالاً پیش ہیں۔ ان ممالکِ محروسہ میں صرف دو شہروں کی عام زندگی پر غور کرنا کافی ہوگا۔ ایک تو شکاگو، دوسرے سین فرانسسکو۔ اگر ان دونوں شہروں کے واقعاتِ قتل کی فہرست تیار کی جائے تو یہ امر واضح ہو جائے گا، کہ حصولِ زر کی ہوس میں جتنے خون امریکہ کے ان دو معمولی شہروں میں ایک سال کے اندر کئے جاتے ہیں اتنے اِس مدت میں مشرق ومغرب کے اکثر پورے پورے ممالک میں نہیں واقع ہوتے۔ دوسری بات جو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرنے والا ہوں وہ ان ممالک کے حبشیوں کی حالت ہے، حضور سے پوشیدہ نہیں کہ ایک زمانہ میں ہمارے گروہ کا ایک بہت بڑا دشمن اس نام نہاد جمہوریت کا صدر ہو گیا تھا اور اس نے غلامی کے سے زرین مسلک کا خاتمہ کرنا چاہا، اول تو حضور کے اقبال سے ہم نے ایک خانہ جنگی کے ذریعہ اس مسئلہ کو اتنی طوالت دی کہ لاکھوں جانیں گئیں، اور پھر جب ہمیں شکست ہوگئی تو ہم نے سفید فاموں کے دلوں میں جذبۂ عناد وحقارت کو اس طرح مشتعل کیا کہ وہ ایک خفیہ انجمن "کلو کلو کلاں" کے نام سے قائم کرنے پر مجبور ہوئے۔ حضور کے خادم کو اس بات کا فخر ہے کہ وہ انجمن اب تک اپنی پوری طاقت کے ساتھ قائم ہے۔ گو حبشی غلام کے لفظ سے نہیں یاد کئے جاتے مگر حقیقت میں سفید فام قومیں اُنھیں غلاموں سے بدتر سمجھتی ہیں، اور "کلو کلو کلاں" والے ان سے بالکل اسی طرح کا سلوک کرتے ہیں جس طرح کا سلوک شکاری جنگلی جانور کے ساتھ کرتے ہیں، جہاں تباہ! میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔ مگر سرکار کو اس کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جب تک اس ناچیز کا سکہ ان ممالک والوں کے دلوں پر ہے اُس وقت تک آدم کے خدا کی ساری قوتیں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں!"

لارڈ ڈیول نے اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا "حضورِ عالی مجھے افسوس ہے کہ میرے دوست مسٹر ڈالر نے غالباً اس دربار کی فضا سے متاثر ہو کر تصویر کا صرف ایک ہی رُخ پیش کیا ہے وہ اس عام جذبۂ ہمدردی وانسانیت ومساوات کو نظر انداز کر گئے جو جدید امریکہ میں روز بڑھتا جاتا ہے اور جس سے اسی طرح کے خطرات پیدا ہوتے جاتے ہیں جن کا ذکر حقیر نے اپنے ممالک کے سلسلے میں کیا ہے"۔

مسٹر ڈالر کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ مگر قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دیں کامریڈ سٹینسکی اُٹھ کھڑا ہوا، اور کہنے لگا "عالی جاہ! مجھے ڈالر کے خیالات سے اتفاق ہے لارڈ ڈیول نے جس خطرے کا اظہار کیا ہے وہ یقینی امریکہ میں موجود ہے۔ مگر میرے لائق دوست مسٹر ڈالر نے اس طرح دلوں پر سکہ جما رکھا ہے کہ سارے جذبات اخوت ومساوات وحریت بجائے ہمیں نقصان پہنچانے کے خاص ہمارے آلۂ کار بن کر رہ گئے ہیں۔ اور حضور اس کا یقین رکھیں کہ مستقبل قریب میں ہی نہیں بلکہ مستقبل بعید میں بھی امریکہ کی ساری جنگیں محض تجارتی جنگیں ہونگی اور اس کا مقصد انسانیت کا فروغ نہ ہوگا۔ بلکہ صرف حصولِ زر اور اپنے لئے منڈیاں بنانا" کامریڈ اپنی جگہ پر مسکرا کر اور لارڈ ڈیول خجل اور منفعل ہو کر بیٹھ ہو گئے۔

مسٹر ڈالر نے جوش سے کہا "حضور! کامریڈ کی تقریر کے بعد مجھے کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ ممالکِ امریکہ میں سرکاری فتح کا ذمہ دار میں ہوں اور حضور کے اقبال سے ابھی صدیوں ہماری ہی فتح ہو کر رہے گی"!

شیطان نے خوش ہو کر کہا "شاباش! شاباش! مجھکو یہی جیتنے والے تیور پسند ہیں"۔

مسٹر ڈالر نے جھککر سلام کیا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

وزیر اعظم نے کھڑے ہو کر آواز دی "ہز اکسیلنسی معصیت پاشا!"

ایک عفریت اُٹھ کر کھڑا ہوا، جس کی صورت بالکل بلڈاگ کتے کی سی تھی، اُس نے تعظیم سے دُہرے ہو کر کہا "اَبُ الشیاطین! میں حضور کی پرورش سے مغربی ایشیا کا حاکم ہوں، سالِ رواں کی رپورٹ میں سوائے افسوسناک حادثات کے بیان کے اور میں کچھ نہیں پیش کر سکتا۔ میں بہت خائف ہوں کہ میں سوائے ایک خاص امید کی جھلک کے جس کا ذکر میں بعد میں کروں گا اور کوئی امید اپنے مقاصد کی تبلیغ کی نہیں پاتا ترکی میں مصطفےٰ کمال کی پالیسی، ایران میں رضا شاہ پہلوی کی پالیسی، مصر میں نحاس پاشا کی پالیسی ہمارے اقتدار کا سراسر خاتمہ کر رہی ہے، پھر یہ جو اسلامی ممالک میں اتحاد واتفاق کے میثاق ومعاہدے ہو گئے ہیں اُنھوں نے ہماری کارروائیوں پر ضرب کاری لگا دی ہے، اخوتِ اسلامیہ اور عام ہمدردی کا خیال بڑھتا جا رہا ہے، اکثر مذہبی پیشوا جو ہمارے خاص آلۂ کار رہے ہیں، روز بروز ان تمام ممالک میں شک کی نظروں سے دیکھے جانے

لگے ہیں اور حریت و آزادی کے نعروں نے ہماری آوازوں کو دبا دیا ہے ۔۔۔"

شیطان نے گرج کر پوچھا "ارے میاں کوئی اچھی خبر بھی سناؤ گے یا شروع سے آخر تک روتے ہی جاؤ گے!" پاشا سہم کر پیچھے ہٹ گیا، اس کے زرد چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگے، وہ کانپتی ہوئی آواز سے بولا "نہیں جہاں پناہ! امید کی ایک جھلک ضرور ہے، ابھی تک باوجود کوششوں کے یہ تمام ممالک یورپین ممالک کے اثر و نفوذ سے باہر نہیں ہیں، نہ تو مصر آزاد ہے، نہ حجاز آزاد ہے، نہ شرق اردن اور نہ عراق و یمن، ہر جگہ ہمارے آدمی کام کر رہے ہیں، اور لارڈ ڈیول اور کپتان فوسٹ کی مدد سے ہمیں اب تک بڑی بڑی امیدیں ہیں، مصر میں ابھی ہم نے نحاس پاشا کا تختہ اُلٹ دیا ہے، ہم نے فلسطین میں ایک ہنگامہ مچا رکھا ہے، انسان مچھر اور کھٹمل کی طرح مارے جا رہے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ اگر سرکاری اقبال ہمارے شاملِ حال رہا تو بہت ہی جلد ہم عرب کے ریگستانوں کو انسانی خون سے سینچ کر ایسا سرسبز و شاداب مزروعہ تیار کریں گے جس میں طاغوتیت و عفریتیت ہی کی کھیتی لہلہائے گی!"

شیطان بولا "خیر تم نے اشک شوئی کی صورت تو سوچی! تم اطمینان رکھو کہ مابدولت و اقبال کی پوری طاقت و قدرت تمہاری سرپرستی اور تمہاری اسکیم کو کامیابی کا جامہ پہنانے کے لئے موجود ہے!"

پاشا نے جھک کر سلام کیا، اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

وزیرِ اعظم نے آواز دی "مہابلی پنڈت راون جی!"

ایک دیو سیاہ کھڑا ہوا، چہرہ اس کا بالکل ہاتھی کا سا تھا، ہاتھ بالکل جاپانی کھلونوں کے سے اور پاؤں چینی عورتوں کے سے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور تختِ شاہی کے سامنے سجدہ میں گر پڑا، پھر اُٹھ کر چار زانو ہو کر بیٹھ گیا، منمنا کر بولا۔

"راون کے اَن داتا! ہماری رپورٹ سرکاری اقبال سے فتح ہی فتح کی ہے۔ ہمارے پوربی ایشیا میں سرکار ہی کا راج ہے، ہم نے چین میں آگ لگا رکھی ہے۔ روزانہ کئی ہزار آدمی مارے جاتے ہیں، جوان عورتیں، بیوہ اور چھوٹے بچے یتیم ہو رہے ہیں۔ اور یہ وہ لوگ کر رہے ہیں جن کا مذہب ہے "اہنسا پرمو دھرما" تبت میں آج تک سب سے بڑا لاما طے نہیں ہو سکا ہے، آپس کی رسہ کشی جاری ہے، اور ایشیا کا تاج ہندوستان تو خاص اپنا گھر ہے، وہاں کی سرکار تو ہماری اسکیم کی پابند ہی ہے۔ البتہ کچھ خطرہ ایک سُوکھے سے بنئے سے اور اُس کی ایک جماعت سے جس کو لوگ کانگریس کہتے ہیں، کسی حد تک ہو چلا تھا، مگر ہم نے اس کی توڑ میں چھوت اور اچھوت کا سوال پیدا کر دیا ہے، ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ کی سی دو متعصب جماعتیں کھڑی کر دیں، پھر ان کانگریسیوں کو بھی ایسا پھنسا دیا ہے کہ اُنھوں نے حکومت کے لالچ میں وزارتیں قبول کر لیں، اب وہ بھی کسی طرح بس ہی نہیں سکتے۔ پھر حضور کی دعا سے اس ملک کے اکثر ہندو پنڈت اور مسلمان مولوی ہمارے خاص آلۂ کار ہیں۔ جب کہئے مسجد کے سامنے باجہ بجانے اور بکرے کی جگہ گائے کی قربانی پر گھر جلا دیئے جائیں، عورتیں بے عصمت کر دی جائیں اور بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر اُنھیں پتھروں پر بالکل اسی طرح مار دیا جائے، جس طرح دھوبی اپنے پٹے پر کپڑے دھو دیتے ہیں، اَن داتا یقین رکھیں جب تک ہمارے دیش میں پنڈت اور مولوی موجود ہے اس وقت تک ہم کو آدم کا خدا زیر نہیں کر سکتا، ہم اُن میں آپس میں دوستی ہونے دیں گے اور نہ بھائی چارہ، وہ ہمیشہ ایک دوسرے کو کافر اور ملیچھ ہی سمجھیں گے! اور ہمیشہ بندگانِ حضور ہی کی جیت ہوگی!"

شیطان مارے خوشی کے تخت سے اُچھل پڑا۔ سارا محل اس طرح ہلنے لگا کہ جیسے زلزلہ آیا ہو ——— میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ مولوی صاحب مجھے جھنجھوڑ کر جگا رہے ہیں کہ "اُٹھو نماز پڑھو" ——— میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ" ——— اور وہ کمرے سے جلدی سے بھاگے۔ اور پائپ کے نیچے جا کر وضو کرنے لگے!

قطعہ

[illegible] مچھلیوں کی شوخیوں سے جس طرح
سطحِ تالاب پہ پڑتے ہیں حلقے بار بار
[illegible] دل کی لرزشیں پیہم مرے ہاتھوں پہ ہر نفس
[illegible]

[illegible]

جناب عطاء اللہ صاحب پالوی کا مضمون جو رباعیات خیام کے ترجموں کے متعلق کلیم کے اگست ۳۵ء نمبر میں شائع ہوا ہے میری نظر سے گذرا۔ مضمون کا خاص مقصد جناب آغا ظفر علی بیگ قزلباش شاعر دہلوی کے رباعیاتِ خیام کے اردو ترجمے کی تعریف ہے۔ جناب آغا شاعر کے ترجمے کی خوبیوں سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا اور یہ بھی ممکن ہے جیسا کہ جناب عطاء اللہ صاحب کا خیال ہے کہ وہ رباعیاتِ خیام کے سب سے بڑے مترجم کہے جانے کے مستحق ہوں کیونکہ ظاہر ہے کہ جتنا ہر اعتبار سے اچھا ترجمہ ایک فارسی شعر کا اردو زبان میں ہوسکتا ہے اُتنا اچھا کسی دوسری زبان میں نہیں ہوسکتا، لیکن ایسی حالت میں کہ جب دنیا کی تمام زبانوں میں متعدد ترجمے رباعیاتِ خیام کے ہوچکے ہیں بغیر کسی تحقیق کے جناب آغا شاعر کو رباعیاتِ خیام کا سب سے بڑا مترجم کہنا انصاف کی بات نہیں ہے۔ جناب عطاء اللہ صاحب نے شاید اتنا کافی سمجھا کہ اگر وہ فٹز جیرلڈ کے انگریزی ترجمے اور جناب کاشی پرساد کے اردو ترجمے کو گرا کر دکھا دیں تو جناب آغا شاعر کا سب سے بڑا مترجم ہونا ثابت ہوجائے گا۔ جناب کاشی پرساد کا اردو ترجمہ جس کے متعلق جناب عطاء اللہ صاحب کا خیال ہے کہ "وہ بہت مشہور رہے" میری نظر سے ابھی تک نہیں گزرا، لہٰذا کوئی رائے زنی نہیں کرسکتا، البتہ اُن کی دو رباعیاں جو جناب عطاء اللہ صاحب نے اپنے مضمون میں نقل کی ہیں اُن سے جناب کاشی پرساد کے ترجمے کے ناقص ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔

مدن مراری لال سکینہ

اب رہا فٹز جیرلڈ کا انگریزی ترجمہ اس کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جناب عطاء اللہ صاحب نے شاید بہت ہی سطحی نظر سے اس کو دیکھا ہے ورنہ وہ اس قدر سخت الفاظ کہ "جیرلڈ کا ترجمہ سب سے زیادہ مہمل اور ناقص ہے" استعمال نہ کرتے، حیرت تو یہ ہے کہ وہ جیرلڈ کے ترجمے کے مہمل ہونے کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ "جیرلڈ نے ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ خیام کے خیال کو اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے"۔ وہ شاید نہیں جانتے ہیں کہ ایک زبان کی تصنیف کے ترجمے دوسری زبان میں جو کامیاب ہوئے ہیں، وہ ترجمے کے اسی بڑے اصول کے ماتحت کہ مترجم مصنف کے خیال کو اپنی زبان میں ادا کرے، اور یہ اصول اس وقت تو بالکل ناگزیر ہوتا ہے جب مترجم کو ایک غیر زبان کے شعر کو اپنی زبان کے شعر میں ترجمہ کرنا منظور رہتا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ فارسی زبان کے شعر کا ترجمہ صرف اردو زبان ہی کے شعر میں ایسا ہوسکتا ہے کہ وہ لفظی بھی ہو اور اصل شعر کے اثر کو بھی قائم رکھے۔ اس لفظی ترجمے کے سخت اصول کو دوسری زبانوں کے مترجمین پر عائد کرنا غلطی ہے، جناب عطاء اللہ صاحب کا یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہے کہ "یہی وجہ ہے کہ یورپ نے خیام کو خوش آمدید کہا، ورنہ اگر صحیح معنی میں ترجمہ ہوتا تو شاید اُسے وہ مقبولیت نہ حاصل ہوتی جو اس وقت ہے"، مگر اُن کے کہنے کا انداز یہ ہے کہ گویا فٹز جیرلڈ نے خیام کے ساتھ بڑی بے انصافی کی جو اس کو ایک مانوس شکل میں اپنے وطن والوں کے سامنے پیش کر دیا، اگر جناب عطاء اللہ صاحب کا یہ خیال کہ فٹز جیرلڈ نے خیام

کو ایک بگڑی ہوئی شکل میں پیش کیا ہے تو مجھے اُن سے اتفاق نہیں ہے،
اس وقت میرے سامنے مسٹر وینکٹیش مادھو داتار ڈپٹی فائننشل سکرٹری ایچ
ای ایچ نظام گورنمنٹ کا مرہٹی زبان میں ترجمۂ رباعیاتِ خیام کا موجود ہے،
اس میں مترجم نے خیام کو خالص ہندی لباس میں پیش کیا ہے۔ مثلاً جہاں خیام
دنیا والوں کو اے دوست سے خطاب کرتا ہے وہاں مترجم خیام کی بات کو
کرشن کے مُنہ سے اُدھو کو سُناتا ہے، جناب عطار اللہ صاحب شاید
اس قسم کے ترجمے سے تو نفرت ہی کریں گے۔ کیونکہ داتار صاحب فیٹز جیرلڈ
سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھ گئے ہیں، میرے خیال میں اِن دونوں مترجمین
نے اپنی اپنی زبان کے لئے بڑی خدمت کی ہے، اُنھوں نے ترجمے کی غرض
کو سمجھ کر کام کیا ہے۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر جناب عطار اللہ صاحب کا یہ خیال
بھی تو غلط ہے کہ "جیرلڈ کی ایک رباعی بھی ایسی نہیں ملے گی جسے خیام کی
رباعی کا صحیح ترجمہ کہا جاسکے": انگلستان کے مشہور محقق ایڈورڈ ہیرن
ایلن نے فٹز جیرلڈ کی رباعیوں کا خیام کی رباعیوں سے مقابلہ کرکے یہ بات
ملے کی ہے کہ "فیٹز جیرلڈ کی ۱۰۱ رباعیوں میں سے ۴۹ رباعیاں خیام کی
رُباعیوں کا لفظی ترجمہ ہیں، ۴۴ رباعیاں ایسی ہیں جن میں خیام کی ایک
سے زیادہ رباعیوں کا مفہوم شامل ہے۔ ۲ رباعیاں خیام کی اُن رباعیوں
سے متاثر ہوکر کہی گئی ہیں جو صرف نکلسن کے ایڈیشن میں موجود ہیں ۲
رباعیوں میں خیام کی جھلک پائی جاتی ہے، ۲ رباعیاں عطار کی رباعیوں
کا ترجمہ ہیں، اور ۲ رباعیاں خیام کی رباعیوں سے متاثر ہوکر کہی گئی
ہیں، مگر حافظ کا رنگ غالب ہے۔

جناب عطار اللہ صاحب ایک رباعی کے متعلق جس کا ترجمہ فٹزجیرلڈ
نے کیا ہے لکھتے ہیں کہ "جیرلڈ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ رباعی خیام کی نہیں،
بلکہ کچھ الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ مولانا رومؔ کی رباعیات میں پائی جاتی
ہے" ہم یہ نہیں کہتے کہ اس رباعی کا مولانا رومؔ کی طرف منسوب ہونا ممکن
ہے۔ مگر جناب عطار اللہ صاحب کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ فٹزجیرلڈ
نے اپنے ترجمے کے واسطے ایک قدیم رباعیاتِ خیام کے نسخے کی مدد لی
تھی، جس کی تاریخِ کتابت ۸۶۵ھ ہے، اور جو ایک مدت سے آکسفورڈ
کی بوڈلین لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس نسخے میں یہ رباعی نمبر ۱۲۱ پر
پائی جاتی ہے، اس کے علاوہ یہ رباعی دو اور رباعیاتِ خیام کے قدیم
نسخوں میں موجود ہے، جو پیرس کے کتب خانے میں محفوظ ہیں، اس کے
علاوہ ایک بات یہ بھی قابلِ غور ہے کہ خیام کی کسی رباعی کا کسی دوسرے
شاعر کی رباعیوں میں مخلوط پایا جانا ہی محض اس امر کی کافی دلیل کس
طرح ہوسکتی ہے کہ وہ خیام کی رباعی نہیں ہے؟!

سرود و رقص

غضب ہے آج بھی اپنے یہ مفتیانِ جلیل — سرود و رقص کو مسلم پہ کر رہے ہیں حرام
خبر نہیں ہے بچاروں کو اس حقیقت کی — علومِ دیں میں ہیں ہرچند وہ بلند مقام
یہ چیزیں شرع میں جائز نہ تھیں مگر اس وقت — جہاں میں جبکہ مسلماں کو تھے ہزاروں کام
کبھی تھی قلعہ کشائی کبھی صف آرائی — کبھی تھا غور طلبِ صلح و آشتی کا پیام
کبھی تھی کام روائی کبھی تھی عدل گری — کبھی تھی فکر مداوائے خاطرِ ایتام
ولیکن اب کہ وہ مردِ جہاں کشا و عظیم — ہے انقلابِ زمانہ سے دشمنوں کا غلام

سرود و رقص سے دل کو اگر نہ بہلائے
تو کاٹے کیسے غلامی کے تلخ و سست ایام؟

شہید ابن علی

پشیمانی

وجاہت سندیلوی، بی اے

جاڑوں کی شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی تھی۔ سامنے چمن میں درختوں پر عجیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بڑھتی ہوئی سیاہی میں وہ پھیلتے معلوم ہوتے۔ کھلی ہوئی کھڑکی میں طلعت ایک سبز چادر اوڑھے کھڑی ہوئی تھی۔ کمرے میں بجلی کی روشنی حسن کے اس شاہکار کے قدم چوم رہی تھی، اور کمرے کی بہت سی قیمتی اور خوبصورت اشیا اور سامان چمکا چمکا کر اس کو بطور نذرِ عقیدت پیش کر رہی تھی، طلعت تنہا تھی، اور اپنے خیالات میں غلطاں!

وہ سوچ رہی تھی، گنجان باغیچے کی بڑھتی ہوئی تاریکی زیادہ سیاہ تھی. یا وہ تاریکی۔۔۔۔۔۔ جو اس کے سینے میں مخفی تھی!!! آج نسیم کیا کہہ رہی تھی، وہی پان والی کا قصہ، کیا اُسے معلوم ہے۔ نہیں۔۔۔۔۔۔ شاید۔۔۔۔۔ وہ مجھے بنا رہی تھی؛ امی نے مجھے کیوں گھُرکی دی۔ وہ پہلے تو کبھی اس طرح بات بات پر خفا نہ ہوتی تھیں؟ لیکن انھیں کیا معلوم، کسی کو کیا معلوم؟ یہ میرا خوف ہے، میں بہاور بنوں گی، میرے راز سے کوئی نہیں واقف؟ کوئی کیوں واقف ہونے لگا؛ کیا اُس نے کسی سے کہدیا؟ کیا یہ ممکن ہے؟ نہیں نہیں ایسا نہیں ہوسکتا یہ راز صرف میرے ہی سینے میں محفوظ رہے گا! اگر وہ خود کسی سے کہدے؟ تو کیا میں انکار نہیں کرسکتی؟ لیکن ایسا نہیں ہوسکتا۔ آسمان پھٹ پڑے، زمین شق ہو جائے، سمندر اُمنڈ پڑیں، لیکن ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ میرا ہے، بالکل میرا! اس کا کاروبار دو مہینے میں ختم ہو جائے گا۔ پھر وہ میرے پاس آجائے گا۔ آجائیگا! آجائیگا! آجائیگا! پھر میرا شباب اس کے آغوش میں مچلے گا! وہ میرا ہوگا میرا! ہم اندھی سوسائٹی کو دکھانے کے لئے شادی کرلیں گے بس پھر یہ چڑیل ہم لوگوں کی دوستی اور محبت کو اپنی منحوس تیکھی نگاہوں سے نہ دیکھ سکے گی، کیا ایسا نہ ہوگا؛ نہیں ضرور ہوگا ضرور، ابھی میری زندگی کے، جوانی کے، بہت سے چمکیلے دن اور سہانی راتیں باقی ہیں۔

طلعت نے اطمینان کی ایک سانس لی۔ اور انگڑائی لیتے ہوئے پاس ہی ایک صوفہ پر بیٹھ گئی، اُس نے اپنے ننھے سرخ ریشمی رومال سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھا اور آنکھیں پھاڑ کر ان کو روشن بنانے کی کوشش کی۔

اب مجھے کیا فکر ہے؛ کچھ نہیں، لیکن۔۔۔۔۔۔ میں پریشان کیوں ہوں۔ میرا دل دھڑکتا کیوں ہے۔ میں اس کی دھڑکن روکوں گی۔ میں قہقہہ لگاؤں گی، میں پیانو بجاؤں گی۔ میں گاؤں گی مجھے فکر کیا ہے؟ کیا میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے۔ کیا میں اپنی کمزوری پر نادم ہوں! شاید ہاں! لیکن! لیکن! اس رومانی چاندنی رات کی داستان تو میری کتابِ زندگی میں سنہرے الفاظ سے لکھی ہوئی ہے۔ شباب کے مست لمحات کی اُس یاد کو تو میں اب بھی اپنا سب سے زیادہ عزیز خزانہ سمجھتی ہوں، کیا میں ان۔۔۔۔۔۔ لمحات کو واپس حاصل کرنے کے لئے اپنا سب کچھ دینے کے لئے تیار نہیں۔ کیا میں نادم ہوں۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ کیا میرا ضمیر مجھکو ملامت کرتا ہے! ان فردوسی عیش کے لمحات کے لئے تو میرا دل مچلا جاتا ہے! پھر میں کیوں پریشان ہوں۔ پھر کیوں میرا دل دھڑکتا ہے! کیا گناہ کے خوف سے؟ کیا میں نے گناہ کیا؟ نہیں میں نے گناہ نہیں کیا! میں نے قربانی کی! میں نے کس کا گناہ کیا! میرے گناہ سے کسی کو کیا نقصان پہونچا؟ میں نے قربانی کی، قربانی اُس کے لئے! آہ کاش کریں اس کے لئے

اور بھی قربانی کرتی! گناہ سے میں نہیں ڈرتی، لیکن، لیکن، ہاں شاید میں اُس چڑیل سوسائٹی سے ڈرتی ہوں، اس کی کیسی کیسی معنی خیز اشتباہ آمیز نگاہیں مجھ پر پڑتی ہیں۔ کیا اُسے میرا راز معلوم ہے! میں اُسی سے ڈرتی ہوں، اُسی بدصورت چڑیل سے!!

آخر میں اس سے کیوں اس قدر ڈرتی ہوں، اپنے گناہ کے باعث! لیکن میرا گناہ ہی کیا ہے؟ کیا جیسا میں نے کیا ویسا سوسائٹی کی کوئی اور لڑکی نہ کرتی۔ وہ سہانی رات اور وہ تنہائی! وہ کتنا خوبصورت تھا۔ اس نے کیسے میرے منہ پر اپنا منہ رکھدیا، اور اپنے آغوش میں مجھے کھینچ لیا، کھینچ لیا، بھینچ لیا، اُف اُس کے گرم خوبصورت خوشبودار سینے سے میں کس اطمینان سے چمٹ گئی۔ میں نے ساری دنیا ٹھکرا دی، اور اپنا سب کچھ ان چند لمحاتِ عیش پر تج دیا..... پھر کیا ہوا؟ کوئی اور کیا کرتا! کیا دنیا کی کوئی عورت اس وقت اس کو ٹھکرا سکتی تھی!

ابا جان، دورے پر گئے تھے۔ امی اور سب نیچے تھیں، میں نے اپنا کوٹھا اندر سے بند کرلیا وہ پاس ہی کے دروازے سے باہر سے آگیا!

تنہائی، جوانی، چاندنی رات!!

گناہ! میں نے ہرگز گناہ نہیں کیا۔ میں ہرگز نادم نہیں، میں پھر وہی کرنے کو تیار ہوں۔ میرے پسینہ کیوں نکلتا ہے۔ میرے ہاتھ پیر کیوں ٹھنڈے ہونے لگتے ہیں۔ میں ڈرتی ہوں، اُس بُڈھی کھوسٹ بدصورت کوڑھی چڑیل سے جس کو سب سوسائٹی کہتے ہیں، جو صرف بنی ہی ہے اس لئے کہ کمزوروں کو ڈرائے دھمکائے، اور طاقتوروں سے عصمت فروشی کرے!!

عصمت! کیا میں عصمت فروش نہیں؟ عصمت ہے کیا؟ صرف کنوارا پن، یا خیالات کی پاکیزگی۔ میں کنواری نہیں رہی؟ لیکن کیا میں نے اپنی عصمت کھو دی، لیکن کیا میں نے سمجھ بوجھ کر ایسا کیا؟ یا میرے اللہ میں کیا کروں!

میرا دل کیوں گھبراتا ہے؟ میرا سینہ لرزتا کیوں ہے؟ میں کیوں نہ حلق پھاڑ پھاڑ کر سوسائٹی سے کہدوں، مجھے اُس سے محبت تھی، وہ میرے لئے دیوانہ تھا۔ ہم لوگوں نے اپنے آپ کو ایک دوسرے میں فنا کر دیا۔ ہماری جوانی دیوانی شادی کے ڈھکوسلے کا انتظار نہ کرسکی، ہم ایک ہوگئے ایک!! اور زندگی بھر ایک ہی رہیں گے، فسادی چڑیل سوسائٹی کو جو کچھ کرنا ہو کرلے! وہ میرا کیا کرسکتی ہے؟ کچھ نہیں۔ میں اس کی پُرحماقت انگشت نمائی سے کیوں جھینپوں۔ میں اُس کی کانا پُھوسی سے کیوں؟ کیوں؟ اپنا چہرہ زرد کرلوں۔ میں اُس کے بے معنی تمسخر سے کیوں مُنہ چھپاؤں۔ میرا دل کہتا ہے کہ میں نے ٹھیک کیا! اچھا کیا! خوب کیا! پھر میں کیوں چور بنوں، کیوں نہ ببانگِ دہل اعلان کردوں، میں نے ایسا کیا! اور خوب کیا، اچھا کیا! لیکن، لیکن میں جانتی ہوں میں ایسا نہیں کرسکتی۔ میں........ آہ! میں کیا کروں؟

چار ماہ گزر گئے!

وہ نہیں آیا! کیوں نہیں آیا؟ اُس نے لکھا ہے وہ جلد آئے گا، لیکن کب؟ آہ اُسے نہیں معلوم میں عنقریب ایک معصوم گنہگار کی ماں بننے والی ہوں۔ آہ پھر کیا ہوگا؟ سب مجھ سے پُوچھتے ہیں کہ میں اس قدر دُبلی کیوں ہوگئی ہوں۔ مغموم کیوں رہتی ہوں، نسیم پوچھتی تھی کہ میں نے پیٹ پر یہ کیا باندھ رکھا ہے! آہ جب اُن کو معلوم ہوگا تو پھر!! کیا ہوگا! بتاؤ! بتاؤ! میں کیا کروں گی!! طلعت چیخ اُٹھی۔

میں کیوں نہ کہدوں۔ سب سے کہدوں، چیخ چیخ کر کہدوں، کوٹھے پر چڑھکر کہدوں! لیکن کیا میں کہہ سکوں گی۔ آہ! یہ میرے گلے میں کیا گھُسا جاتا ہے۔ میرا دل کیوں تھرتھراتا ہے، میں کانپتی کیوں ہوں!!

"میں آخری دفعہ اُس کی تصویر تو سینے سے چمٹا لوں" یہ کہہ کر طلعت نے ایک تصویر اپنے سینے سے چمٹا لی، اُسے آنکھوں سے لگایا، اور ایک پُرجوش بوسہ دیا۔

اسٹول پر کھڑے ہو کر چھت سے لٹکا ہوا پھندا اُس نے اپنے گلے میں پہن لیا اور پیر سے اسٹول زمین پر گرا دیا۔

چند سکنڈ میں اس کا نازک خوبصورت جسم تڑپنے لگا۔ جوانی کی موت کی تڑپ اور حسین آنکھوں کا حیرت بھرا تبسم!!

طلعت کے دماغ میں آخری خیال یہ تھا "کاش کہ میں سوسائٹی سے نہ ڈرتی!!"

ضروری اطلاع

خط و کتابت کرتے وقت اپنا چیٹ نمبر خریداری ضرور لکھدیا کیجیے۔ (منیجر)

تعلیمِ دیہات[1]

محمد ضیاء الاسلام بی، ایس، سی، پی، سی، ایس

تعلیمِ دیہات کا مسئلہ ہماری ترقی کے نقطۂ نگاہ سے اتنا ضروری ہوگیا ہے اور روز بروز ہوتا جاتا ہے کہ اس پر ہر اس شخص کی توجہ ہونی چاہیئے جو دیہات میں اس تاریکی کو جو عام لوگوں پر طاری ہے دور کرنا چاہتا ہے اور اس طرح ہمارے دیہات کے بھائیوں کو قومی زندگی میں وہ حصہ دینا چاہتا ہے جس کے وہ مستحق ہیں، اور جو ملک کا قانون اُن کو دے چکا ہے، لیکن جس کو وہ شاید ابھی تک صحیح طور پر استعمال کرنا نہیں جانتے۔

آج کل معمولی گاؤں میں عموماً پرائمری درجہ چار تک کے اسکول ہیں، اور بڑے گاؤں میں مڈل اسکول ہیں جو ڈسٹرکٹ بورڈس کے زیرِ انتظام ہیں۔ ان مدرسوں میں، ہندی، اردو اور جغرافیہ پڑھایا جاتا ہے، کہیں کہیں ورزش اور کچھ کھیل مثلاً فٹ بال یا ہاکی بھی رائج ہیں۔ نیچر اسٹڈی بھی کسی کسی مدرسہ میں داخلِ نصاب ہے، تعلیم کتابوں کے ذریعہ دی جاتی ہے، جو تقریباً ہر سال بدلتی رہتی ہیں، اور جن کے چناؤ میں عموماً ذاتی اغراض و مقاصد اور ذاتی تعلقات بڑا حصہ رکھتے ہیں۔ دستکاری، زراعتی تعلیم اور فارمنگ وغیرہ ایک فیصدی اسکولوں میں بھی داخلِ نصاب نہیں ہیں، دیہات میں جو تعلیم عموماً دی جاتی ہے اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ زندگی کے شعبوں میں کار آمد نہیں ہوتی، اور نہ دیہاتی زندگی کے شعبۂ نصابِ تعلیم میں داخل ہیں۔ اس طرح جو خلیج درمیان میں حائل ہے وہ بہت وسیع اور خطرناک ہے پھر موجودہ تعلیم سے بچوں میں تعلیمی دلچسپی پیدا نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد درجہ چار تک بھی نہیں پہونچتی اور درمیان میں ہی مدرسہ چھوڑ کر گھر بیٹھ جاتی ہے۔ طرزِ تعلیم کے غیر دلچسپ ہونے کا دوسرا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اسکول سے نکلنے اور دیہاتی زندگی میں داخل ہونے کے بعد مدرسوں میں جو پڑھا لکھا تھا وہ رفتہ رفتہ دماغ سے زائل ہو جاتا ہے، اس کی ذمہ داری کچھ تو طرزِ تعلیم پر ہے اور کچھ ان ذرائع کے میسر نہ ہونے پر جن کی وجہ سے جو تعلیم مدرسوں میں ملتی ہے ان کی تکمیل گھر پر ہو سکے۔ گاؤں میں نہ کتب خانے ہیں نہ اخبار مل سکتے ہیں، اس لئے ان لوگوں کی دیہاتی زندگی اور تعلیم میں کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کم از کم ۲۰ فیصدی ایسے لوگ جنھوں نے درجہ چار بھی پاس کر لیا تھا دس بارہ سال بعد حساب تک نہیں لکھ سکتے اور اپنے لگان وغیرہ کا حساب بھی پٹواری یا اسکول کے ماسٹر صاحب سے لکھواتے ہیں۔

گاؤں کے مدرسوں کے استاد بدقسمتی سے بہت معمولی قابلیت کے ہوتے ہیں۔ اس میں ان بیچاروں کا تو کوئی قصور نہیں، لیکن ان کا اثر ہماری دیہاتی زندگی پر خاطر خواہ طور پر اچھا نہیں پڑتا، اُن کی دماغی نشو و نما اگر ہوتی بھی ہے تو بہت معمولی، ان میں عام طور پر نہ ولولہ ہوتا ہے نہ جوش۔ جس فضا میں وہ رہتے ہیں وہ اس کی ذمہ دار ہے، نہ ان میں قوتِ عمل ہوتی ہے نہ جولانیٔ خیال جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے گاؤں کے مدرسے جن میں زندگی کی تڑپ پائی جانی

[1] اس مضمون کا کچھ حصہ آل انڈیا ریڈیو دہلی اسٹیشن سے ۲ نومبر ۴۲ء کو نشر کیا گیا تھا۔

چاہیے ان میں نیم مُردہ دماغ ملتے ہیں۔ پچاس مدرسوں میں شاید ایک پُرجوش استاد مل سکے۔ ٹرینڈ استادوں کا اب نمبر بڑھ رہا ہے، لیکن ٹرینڈ استادوں میں بھی وہ بات نہیں پائی جاتی جو دیہاتی تعلیم کے لئے ضروری ہے یعنی جوشِ عمل اور تخیل۔ جو ٹریننگ ان کو ملتی ہے وہ ان کو کتابیں پڑھانے کے لئے شاید زیادہ موزوں کر دیتی ہو، ورنہ اس کے علاوہ اس کا کوئی اثر ان پر نہیں ہوتا۔

ہم تعلیمِ بالغان کی طرف تو کبھی متوجہ ہی نہیں ہوتے اور اگر ہوئے بھی تو مشکلات ایسی حائل رہیں کہ تعلیمِ بالغان کی کوئی اسکیم قابلِ عمل نہیں ہو سکی۔ دیہات میں لڑکیوں کی تعلیم پر کوئی توجہ دینا بھی بالکل غیر ضروری سمجھا جاتا ہے، لیکن ترقیٔ دیہات کی ہر اسکیم میں اس مسئلہ کو جو ممتاز حیثیت حاصل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ چھوٹی لڑکیاں بچوں کے ساتھ اسکول جاتی ہیں، لیکن تھوڑے ہی دنوں میں وہ مدرسہ چھوڑ دیتی ہیں، اور اس کے بعد ان کو تعلیم جاری رکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا۔

انتظامی معاملات میں بھی وہ ترتیب نہیں ہے جو ہونی چاہیئے۔ مثلاً استادوں کا تقرر ظاہر میں کسی خاص اصولوں پر ہو لیکن عموماً اس میں سفارش، ذاتی تعلقات اور مذہبی تعصب کو بہت دخل ہوتا ہے، استاد بھی لوکل بورڈوں کی سیاسیات کا شکار ہوتے رہتے ہیں اور پارٹیوں کے آلۂ کار بنائے جاتے ہیں۔ تبادلہ کی تلوار ان کے سر پر ہمیشہ لٹکتی رہتی ہے، جس کی وجہ سے نہ تو کوئی اسکیم پورے طور پر کارگر ہو سکتی ہے اور نہ اسکولوں میں ذاتی اثر جس کی مدرسوں میں ضرورت ہے، کام میں لایا جا سکتا ہے۔ پھر دیہاتی اسکولوں کی تعلیمی پالیسی عموماً ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو خود اس کی ضروریات سے ناواقف ہیں۔ اور جو لوگ اس سے واقف ہیں ان سے تعاونِ عمل کے خواہشمند نہیں۔ اس پالیسی کا جو نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے کہ تعلیم پر باوجود لاکھوں روپیہ صرف ہونے کے دیہات میں جو حالت دس سال قبل تھی اب بھی صورتِ حال اس سے زیادہ دل خوش کن نہیں ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کیا جائے کہ ترقی و اصلاحِ دیہات صحیح معنوں میں ہو سکے اور ہمارے بھائی جو دیہات میں رہتے ہیں اور ہمارے لئے اتنی محنت سے کاشتکاری جیسا صبر آزما کام کرتے ہیں ان کو بھی ہماری طرح معاملات سمجھنے اور ان کو حل کرنے میں رائے دینے کی صلاحیت پیدا ہو جائے، اور وہ بھی اپنی تعلیم سے اپنی زندگی کو بہتر اور زیادہ کارآمد بنا سکیں۔

اس کے لئے ہم کو طرزِ تعلیم میں تبدیلی کرنی لازمی ہے، نصابِ تعلیم میں تبدیلی ضروری ہے، اور استاد بدلنے بھی اتنے ہی ضروری ہیں جتنا طرزِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کی تبدیلی۔

پہلا قدم لڑکے لڑکیوں اور بالغوں کے لئے ایک ابتدائی تعلیم کا لازمی قرار دیا جانا ہے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ترقی دیہاتی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہو تو ہم کو بالغوں کو بھی تعلیم دینا اور اُن کو گاؤں کا کارآمد رکن بنانا لازمی ہے۔ اسی طرح لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم پر بھی زور دینا گویا ترقیٔ دیہات کے سلسلے میں ایک خاص خدمت انجام دینا ہے۔ لڑکے لڑکیوں اور بالغوں کے لئے ابتدائی تعلیم کو ضروری بنانے کے واسطے کافی ہمت کی ضرورت ہے، لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ ترقی و اصلاحِ دیہات کا کوئی پروگرام بغیر ابتدائی تعلیم کے جبریہ اور لازمی قرار دئے جانے کے ممکن ہی نہیں ہے، امید ہے کہ جو صوبے بھی گرام سدھار کو ایک زندہ اور کارآمد اسکیم کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں ان کو ہمت کرکے یہ کام کرنا بالکل ناگزیر ہے۔ ممکن ہے کہ لوگ اسباب کو ناپسند کریں، لیکن مخالفت اگر ہوگی تو وقتی ہوگی اور تھوڑے عرصے میں ختم ہو جائے گی۔ یہ کام جتنا بڑا اور عظیم الشان ہے اُس کو دیکھتے ہوئے ابتدائی جبریہ تعلیم کو کوئی دشوار یا دقت طلب امر نہیں سمجھنا چاہیئے۔

تعلیم ہندوستانی میں یا اُس زبان میں جو ملک کے علیحدہ علیحدہ حصوں میں بولی جاتی اور سمجھی جاتی ہو دئے جانے کے متعلق تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس موضوع پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ مادری زبان میں تعلیم ابتدائی دئے جانے کے خلاف شاید ہی کبھی کوئی آواز بلند کی گئی ہے۔ طرزِ تعلیم میں ــ Practical Direct methods کی بڑی کمی محسوس کی جاتی ہے، گرام سدھار کی تعلیمی اسکیم میں Practical اور Direct methods کے علاوہ کوئی اور طرز ہی استعمال نہیں کیا جانا چاہیئے۔ ہر سرکل میں اسکول کے ساتھ ایک چھوٹا سا فارم بیل اور گائے ہونے سے عملی تعلیم دی جا سکے گی، اور تعلیم کے عملی اور پریکٹیکل اصول کام میں لائے جا سکیں گے۔ جس سے تعلیم کی بنیادیں مضبوط اور پائدار ہو سکیں گی۔

بالغوں کے لئے چھ چھ ہفتہ کی سچا دیز خواندگی بنانا ماہرینِ تعلیم کا فرض ہے الہ آباد میں ایک صاحب، جن کا نام مسٹر اگروال ہے، اور پنجاب میں موگا میں

اور سی پی میں پیمپیریا میں اس قسم کی اسکیمیں وضع کی جارہی ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی مکمل لڑ ایسی اسکیم ایسی بن چکی ہے جو عام طور پر رائج ہوسکے، لیکن جو کام اب تک کیا جاچکا ہے وہ کافی امید افزا ہے، اب ہمارے ماہرینِ تعلیم کو بجائے علمی مضامین پر کتابیں لکھنے اور تعلیم کے پیچ در پیچ مسائل پر بحث کرنے کے چھ چھ ہفتہ کی ایسی اسکیمیں وضع کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اپنی تمام تر توجہ اس طرف مبذول کرنی چاہیئے۔ اگر ہمارے ماہرینِ تعلیم اس طرف توجہ کریں تو ایسی اسکیمیں بن سکتی ہیں جو دیہات میں ابتدائی تعلیم کی صورت میں بالغوں تک پہونچائی جائیں، تاکہ ان کو معمولی لکھنا پڑھنا اور حساب وغیرہ رکھنا آجائے۔ ایسی اسکیموں کی ضرورت اس لئے ہے کہ گاؤں کے بالغ مرد اور عورت تھوڑے ہی عرصہ میں اس قابل ہوجائیں کہ ان کو زراعتی معاملات کی تعلیم دی جاسکے۔

بالغوں کے مدرسوں میں تفریح اور تعلیم دونوں ہونے چاہئیں تاکہ بالغ مرد اور عورتیں آسانی سے ابتدائی تعلیم کے مراحل طے کرسکیں، ان کو مدرسہ جانا عذاب نہ معلوم ہو بلکہ شوق سے شام کو مدرسوں میں جاکر تعلیم بھی حاصل کرسکیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی تفریح بھی ہوتی رہے۔

یہ سوال باقی رہتا ہے کہ استاد کہاں سے ملیں گے، اور یہ سوال اپنی خاص نوعیت کی وجہ سے بہت ہی اہم ہے، اگر اسکیم صوبہ میں بھی رائج کی جائے تو ہزاروں استادوں کی ضرورت پڑے گی۔ آج کل تعلیم یافتہ طبقہ میں بیکاری پھیلی ہوئی ہے جس کی وجہ سے بہت لوگوں کو پریشانی ہے، اس اسکیم کے چلانے کے لئے استاد اس طبقہ سے لئے جائیں گے۔ اس سے بیکاری بھی کم ہوگی اور ترقئ دیہات کے لئے ہم گاؤں کو تیار بھی کرسکیں گے۔ کیونکہ جب تک گاؤں والے یہ نہ سمجھیں کہ گرام سدھار کی اسکیموں کا کیا مطلب ہے تب تک وہ ان پر عمل نہیں کریں گے اور اگر بادلِ ناخواستہ انھوں نے اس پر عمل کیا بھی تو وہ جوش اور ولولہ اس میں نہ ہوگا جس کے بغیر ترقئ دیہات کا کام ہو ہی نہیں سکتا۔

تعلیم یافتہ لوگوں کا دیہات کے مدرسوں میں کام کرنے سے ایک طرف تو گاؤں والوں کا حوصلہ بڑھے گا، وہ اس بات کو سمجھ سکیں گے کہ ان کے شہروں کا رہنے والا بھائی ان کے ساتھ دلی ہمدردی کرنا چاہتا ہے اور دوسری جانب تعلیم کا تمام ماحول بدل جائے گا۔ تعلیم یافتہ بیکار لوگوں کو اس اسکیم میں کام کرنے سے قربانی کرنی پڑے گی۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ اس سے دریغ نہیں کریں گے۔ گورنمنٹ ان لوگوں کو کچھ تنخواہ تو دے گی ہی، اس کے علاوہ گاؤں والوں سے بھی امداد کی ضرورت ہوگی۔ استادوں کو رہنے کے لئے مکان گاؤں والوں کو خوشی سے دینا چاہیئے۔ جہاں تک ممکن ہو گاؤں میں ایسے استاد بھیجے جائیں جو خود تو بالغوں اور لڑکوں کی تعلیم کی طرف توجہ دیں اور ان کی بیویاں عورتوں اور لڑکیوں کو پڑھائیں اس طرح روپیہ بھی کم خرچ ہوگا، اور اُستادوں کو آسانیاں بھی میسر آسکیں گی عورتوں کی تعلیم میں ضلع کے حکام کی تعلیم یافتہ بیویاں بہت کچھ حصہ لے سکتی ہیں، اسی طرح سیدھی سادی ہندوستانی میں لکھی ہوئی پُر اثر نظمیں شاعروں سے مدرسوں میں پڑھوائی جاسکتی ہیں، اور لوگوں میں اس طرح جوشِ عمل پھیلایا جاسکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہم کو استادوں کی زیادہ عزت کرنا ضروری ہے، اُستادوں کو نیچی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیئے، بلکہ اُن کا احترام کرنا چاہیئے، اور اس طرح ان کا رتبہ جس کے وہ ہماری قومی زندگی میں جائز طور پر حقدار ہیں ان کو دینا چاہیئے۔ اس سے بہتر طبقہ کے لوگ کام کرنے کے لئے آمادہ ہوں گے، اور اخلاق کی صحیح تعلیم اسکول کے علاوہ لوگوں کو اُن سے مل سکے گی۔ نصابِ تعلیم ایسا بنانا چاہیئے جس سے دیہاتی لوگوں کو فائدہ پہونچ سکے اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اچھے کاشتکار اور اچھے گاؤں والے بن سکیں۔ لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم ایک خاص عمر تک تو ساتھ ہی ہوسکتی ہے اور اس کے بعد علیحدہ علیحدہ۔

لڑکیوں کے اسکول میں ہندوستانی زبان، حساب، جغرافیہ پڑھانا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ دستکاری، صحت، صفائی، مویشیوں کی نگہداشت، تیمارداری، بیماراں اور علاج، کھاد اور کھیتی کے متعلق معلومات، ڈیری فارمنگ، فرسٹ ایڈ، قانون اراضی وغیرہ نصاب میں داخل ہونا چاہیئے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک دم لڑکوں پر اتنا بار ڈال دیا جائے۔ نصابِ تعلیم جب تیار کیا جائے تو ہمیں یہ تمام مضامین اور اس قسم کے دیگر مضامین جن سے گاؤں والوں کو فائدہ پہونچ سکے ضرور سکھانے چاہئیں۔ تاکہ اسکول سے فارغ ہوکر وہ کھیتی بہتر طریقہ سے کرسکیں، اور اس طرح زندگی اپنے باپ دادا سے بہتر اور زیادہ آرام سے گزار سکیں۔ لڑکوں کی عمر اور درجے کے مطابق یہ مضامین ان کو پڑھائے جائیں اور جوں جوں وہ بڑے درجے میں پہونچیں

جائیں زیادہ معلومات ان کو دی جاسکتی ہیں، لڑکیوں کی تعلیم میں کچھ تو اوپر کے مضامین اور ان کے علاوہ کچھ اور

Domestic Economy
Hygine
Domestic Science
First Aid
Maternity and Child-care.

بھی ہونے چاہئیں جس کی ضرورت پر کچھ لکھنا لاحاصل معلوم ہوتا ہے۔

Domestic Economy, Hygine,
Domestic Science, First Aid,
Maternity اور Child-Care.

بیس بیس گاؤں کو مرکز بناکر ہر مرکز پر ایک ایک ماہ رہ سکتے ہیں اور وہاں ان شعبوں میں تعلیم دے سکتے ہیں، اس کے علاوہ بالغوں کی تعلیم کا انتظام کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کا، ہم یہ تو چاہتے ہی ہیں کہ یہ لڑکے اور لڑکیاں مرد اور عورت ہو کر بہتر اور زیادہ کارآمد زندگی بسر کریں، لیکن اس کے ساتھ ہی ہم موجودہ پود کو بغیر پانی کے نہیں چھوڑ سکتے۔ تعلیم بالغان کے سائنٹفک اصولوں پر ہم کو کاربند ہونا ہے، اور ان سے فائدہ اٹھانا ہے، اول تو ایسی اسکیم تمام بالغ مردوں اور عورتوں کے مدرسہ میں عمل میں لائی جائیں اور اس کے بعد اوپر کا کورس آہستہ آہستہ ان کو پڑھایا جائے۔ یہ ایک دن کا کام نہیں ہے، لیکن طرز تعلیم کو زیادہ موثر اور دلچسپ بنانے سے لوگ خود بخود ان مدرسوں میں آئیں گے اور تعلیم حاصل کریں گے۔ بالغوں کے مدرسے رات کو ہونے چاہئیں اور ان میں ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر لگا کر دن بھر کی خبریں، موسم کا حال اور زراعت کے متعلق کارآمد باتیں ان کو بتلائی جانی چاہئیں جس سے ان کی عمومی تعلیم بھی ہوتی رہے گی اور ان کا دائرۂ معلومات وسیع ہوتا جائے گا۔

تعلیم دیہات کی اسکیم کو جتنا سستا بنایا جاسکے اتنا ہی اس سے زیادہ فائدہ ہوسکتا ہے۔ کچھ روپیہ تو گورنمنٹ سے ہمیشہ ملتا رہے گا اور کچھ روپیہ لوکل بورڈس سے، روپیہ ملنے کے یہ دو ذریعہ ہی ہیں، لیکن ان کے علاوہ ہم چاہتے ہیں کہ مغلوں کے زمانہ کا پرانا دستور جس سے مسجدوں اور مندروں کو زمینیں دی جاتی تھیں وہ دوبارہ رائج کردیا جائے اور ہر سرکل میں کچھ زمین بطور معافی اس سرکل کی تعلیم دیہات کے کام کے لئے دیدی جائے، اس کی تمام آمدنی سرکل کے مدرسوں میں تقسیم ہوجائے گی۔

اس کے علاوہ دستکاری کے مدرسوں کی بنائی ہوئی چیزیں گورنمنٹ کو لازمی طور پر خریدنی چاہئیں، اور یہ روپیہ مدرسوں میں تعلیم کے لئے دینا چاہئے، ان چیزوں کو بازاروں میں بیچنے کا کام گورنمنٹ ایجنسیاں کرسکتی ہیں، اور یہ کوئی مشکل امر معلوم نہیں ہوتا۔

یہ ایک مختصر سا خاکہ تعلیم دیہات کی اسکیم کا ہے جس پر عمل کرنے سے ہمارے گاؤں والے اپنی بھلائی اور برائی کی باتیں سمجھ سکتے ہیں، اور ایک بہتر زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ یہ کام آسان نہیں ہے، لیکن کرنے کے قابل ضرور ہے۔

والد کے انتقال پر لوگوں نے اسے ایک گرجا کا پادری مقرر کر دیا ستمبر ۱۸۳۳ء میں وینا سے اس کے دوست ہیلم کے موت کی خبر آئی، اس غمناک واقعہ سے اسے بڑی تکلیف ہوئی، جس سے وہ قریب دس سال تک بالکل خاموش رہا، لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ شاید اس کے شاعرانہ جذبات بالکل فنا ہو گئے، لیکن اس دلگداز واقعہ سے اس کے ذہنی قوت کی پرورش غم کے دامن میں برابر ہوتی رہی، اور اپنے خیالات کو قلمبند کرتا رہا، جس میں غم کے پر درد نغموں کے ساتھ مسرت اور امید کا بھی ترانہ حصہ لکھنا شروع کیا جو ۱۸۵۶ء میں شائع ہو کر ملک میں بہت زیادہ مقبول ہوا۔ اینک آرڈن ( )جو ٹینیسن کی سب سے زیادہ مقبول نظم ہے، ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی، جس کو اس نے صرف دو ہفتہ میں لکھا تھا، اس کی شہرت ملک میں اس قدر پھیلی کہ چاروں طرف سے لوگ اس کی ملاقات کو آتے ان لوگوں سے بچنے کے لئے اس نے ایک قطعہ زمین ۱۸۶۵ء میں بمقام ہمیر ( ) خرید لیا اور ایک مکان [illegible] ۱۸۷۰ء [illegible] گیٹ ( )

نوائے بیحسی

وہ بے دلی سی محبت میں دل پہ چھائی ہے
کہ شوقِ وصل، نہ اب کاہشِ جدائی ہے

نہ اب ملالِ ستم ہے نہ اب خیالِ کرم
خدا ہی جانے مرے دل میں کیا سمائی ہے

مذاقِ کوچہ نشینی نہ آستان بوسی
وہ ذوقِ دید نہ اب شوقِ جبہ سائی ہے

نہ وہ جنونِ محبت ہے اور نہ رسوائی
نہ اب وہ گریۂ پیہم نہ جگ ہنسائی ہے

کہاں وہ ذوقِ تصور کہاں وہ لطفِ خیال
دلِ خراب نے اب "یاد" بھی بھلائی ہے!

نہ آہِ نیم شبی ہے نہ گریۂ سحری
وہ دل کا ظلم، یہ آنکھوں کی بے وفائی ہے

اب اضطراب تمنا سے ہے سکون دل کو
سکون بن کے مرے دل کو موت آئی ہے!

مرے خیال میں توہین ہے جوانی کی
اگر کسی کی جوانی میں پارسائی ہے

گناہِ شوق کی توفیق دے خدائے عشق!
خدائے عشق! دہائی تری دہائی ہے!

نکال مجھ کو نہ اپنی خدائی سے باہر
اگر جہاں میں محبت تری خدائی ہے!

کچھ ایسے عالمِ بیگانگی میں ہوں بسمل
کہ جیسے جان بھی اپنی نہیں پرائی ہے!

بسمل سعیدی جوشی

الفریڈ لارڈ ٹینیسن

علیم الدین خاں اعظمی

(شیکسپیئر اور ملٹن کے (   ) نام سے ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ واقف ہے، لیکن ٹینیسن کے نام سے ابھی ہمارے کان زیادہ آشنا نہیں ہیں، ہندی میں تو اس کا مختصر سا تذکرہ موجود ہے، لیکن اُردو زبان میں ابھی اس کی کمی ہے، میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اُردو میں اس کا نام و نشان نہیں ہے، ہے لیکن دُھندلا، اس لئے میں اس مختصر سے مضمون میں ٹینیسن کی زندگی کا ایسا خاکہ کھینچنا چاہتا ہوں کہ ناظرین کے سامنے ایک تصویر آجائے)

الفریڈ لارڈ ٹینیسن، انیسویں صدی کا ممتاز انگریزی شاعر لنکون شائر کے ایک گاؤں سامرس بائی (   ) میں ۷ اگست ۱۸۰۹ء کو پیدا ہوا۔ اس کا تعلق ٹینیسن کے اس خاندان سے تھا جو ابتدا ہیں ڈینش (   ) تھے، اور انگلینڈ کے شمالی حصہ میں سکونت پذیر تھے۔ اس کا باپ ڈاکٹر جارج کلیٹن ٹینیسن (   ) سامرس بائی کا پادری تھا، اور اس کی ماں لوتھ (   ) کے پادری کی لڑکی تھی۔ ۱۸۱۶ء میں ٹینیسن لوتھ کے گرامر اسکول میں ابتدائی تعلیم کی غرض سے بھیج دیا گیا۔ لیکن تین سال کے بعد اسکول کی سخت زندگی سے تنگ آکر گھر واپس آیا اور اپنے والد بزرگوار سے جو روشن خیال اور تعلیم یافتہ آدمی تھے سات سال تک تعلیم حاصل کی۔ فروری ۱۸۲۸ء میں اس کا داخلہ ٹرنیٹی کالج (   ) کیمبرج میں ہو گیا، جہاں اس نے تین سال تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم سے اُسے خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ سکون اور مسرت کا جویا تھا، لیکن اُسے درس کی کتابوں میں نہ پاسکا۔ اس کی ذہانت سے ہر شخص کو یہی اُمید تھی کہ وہ یونیورسٹی کا ایک ہونہار طالب علم ہوگا، لیکن سوائے ایک سنہرے تمغے کے جو اس نے ٹمبکٹو (   ) پر نظم لکھنے میں یونیورسٹی کے چانسلر سے بطور انعام حاصل کیا تھا، اور کوئی امتیازی خصوصیت نہ حاصل کر سکا۔ لیکن اس کی زندگی کا قیمتی زیور اور اس کی شاعرانہ زندگی کے ساز کا درست کرنے والا اسی کیمبرج کی چہار دیواری میں ملا۔ اس کی تعلیم کا ماحصل آرتھر ہنری ہیلم (   ) کے دوستانہ تعلق ہی میں پنہاں تھا، ان کے دوستانہ تعلقات کو ابھی پانچ سال ہوئے تھے کہ ہیلم (   ) کو موت کی خاموش نیند سونا پڑا۔ اس سنہرے زمانے کے ختم ہوتے ہی ٹینیسن کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب آیا۔ اس کی رگ رگ سے پُر درد نغمے جاری ہوگئے۔ ان کے دوستانہ تعلقات کافی مضبوط تھے، اور ۱۸۲۹ء میں ٹینیسن کی چھوٹی بہن امیلی (   ) ہیلم سے منسوب ہو گئی۔ ۱۸۳۰ء میں دونوں نے یورپ کا سفر کیا، دوسرے ممالک کے تمدن، تہذیب اور قدرتی مناظر کا جو گہرا اثر ٹینیسن پر پڑا اس کی شاعری سے نمایاں ہے۔ فروری ۱۸۳۱ء میں اس کا باپ سخت بیمار پڑا اور ٹینیسن کو سفر سے واپس بلالیا، اسی سال ماہ مارچ میں اس کے والد کا انتقال ہو گیا اور ٹینیسن کو کیمبرج سے قطع تعلق کرنا پڑا۔

والد کے انتقال پر لوگوں نے اسے ایک گرجا کا پادری مقرر کردیا ستمبر ۱۸۳۳ء میں دینا سے اس کے دوست ہیلم کے موت کی خبر آئی، اس غمناک واقعہ سے اسے بڑی تکلیف ہوئی، جس سے وہ قریب دس سال تک بالکل خاموش رہا، لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ شاید اس کے شاعرانہ جذبات بالکل فنا ہوگئے، لیکن اس دلگداز واقعہ سے اس کے ذہنی قوت کی پرورش غم کے دامن میں برابر ہوتی رہی، اور اپنے خیالات کو قلمبند کرتا رہا، جس میں غم کے پردرد نغموں کے ساتھ مسرت اور امید کا بھی ترانہ موجود تھا، آنسوؤں کی وہ قیمتی لڑیاں جو اس نے "ماتم یار" میں پروئی تھیں، ۱۸۵۰ء میں "ان میموریم" کے نام سے انگریزی ادب کے حوالہ کیا، جو انگریزی شاعری میں صداقت اور محبت کا ایک مایۂ ناز شہپارہ ہے ۱۸۵۰ء صرف اس کی شاعرانہ زندگی کے لئے اہم نہ تھا، بلکہ اس کی شادی بھی اسی سال ہوئی تھی اور ورڈسورتھ (   ) کی موت پر ملک الشعرا کا سہرا بھی اسی کے سر رہا۔ ۱۸۵۱ء میں اس نے ٹیوکنہم میں سکونت اختیار کی اور ملک الشعراء کی حیثیت سے ملکی خدمت میں بھی حصہ لینے لگا۔ قوم پرستی اور حب الوطنی کے میٹھے راگ وہ ہمیشہ سناتا رہا۔ حب الوطنی پر اس نے جو نظمیں کہی ہیں اس میں ڈیوک آف ویلنگٹن کی موت پر جو نظم لکھی گئی اور ۱۸۵۲ء میں شائع ہوئی سب سے زیادہ ممتاز ہے۔

اسی زمانہ میں اس کی زندگی میں ایک نیا انقلاب ہوا اور وہ دنیاوی ہنگاموں سے گھبرانے لگا، پرسکون زندگی کی تلاش میں ماہ نومبر ۱۸۵۳ء میں فیرنگ فورڈ میں جو جزیرہ وائٹ پر واقع ہے چلا گیا، وہاں جانے سے اس کا یہ منشا نہ تھا کہ وہ دنیا سے قطع تعلق کرے اور اپنی قیمتی خدمتوں سے ملک اور ادب کو محروم کردے بلکہ اس کا یہ خیال تھا کہ تبدیل آب وہوا اور دیہات کی زندگی سے اس کے جذبات شگفتہ ہوں گے اور ملاقاتیوں سے چھٹکارا پاکر شاعری کی خوبصورت پھلواری کو محنت کے ساتھ رنگ برنگ کے پھولوں سے آراستہ کرسکے گا۔ ۱۸۵۵ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے اسے ڈاکٹری کی ڈگری دی، اور اسی سال ماؤڈ (   ) شائع ہوئی۔ ۱۸۵۹ء میں (   ) آئیڈلس آف دی کنگ کا پہلا حصہ لکھنا شروع کیا جو ۱۸۵۶ء میں شائع ہوکر ملک میں بہت زیادہ مقبول ہوا۔ اینک آرڈن (   ) جو ٹینیسن کی سب سے زیادہ مقبول نظم ہے، ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی، جس کو اس نے صرف دو ہفتہ میں لکھا تھا، اس کی شہرت ملک میں اس قدر پھیلی کہ چاروں طرف سے لوگ اس کی ملاقات کو آتے ان لوگوں سے بچنے کے لئے اس نے ایک قطعہ زمین ۱۸۶۸ء میں بمقام ہمیسر (   ) خرید لیا اور ایک مکان بنواکر موسم گرما میں وہاں رہا کرتا۔ ۱۸۷۰ء میں وہ گٹھیا کے مرض میں مبتلا ہوگیا اور اس کی صحت خراب ہوتی گئی۔ نئی نظموں کی ترتیب اور نئے بحور میں اشعار کہنے کی اس نے کافی کوشش کی، لیکن صحت اتنی خراب ہوچکی تھی کہ اس سے محنت نہ ہوسکتی تھی اور آخر کار ۶ اکتوبر ۱۸۹۲ء میں اس دارفانی سے رخصت ہوگیا۔

ٹینیسن کی اندرونی زندگی

لوگوں کا عام خیال ہے کہ شعرا کی زندگی عوام سے مختلف ہوتی ہے یعنی ان میں چند اخلاقی خامیاں، جنون، پریشانی، وحشت یا اس قسم کی لغو چیزیں ہوتی ہیں۔ کسی حد تک تو یہ خیال صحیح ہے لیکن ٹینیسن کی زندگی عوام کے اس خیال سے بالکل آزاد ہے، اس کی شاعری اس کی زندگی کا سچا آئینہ ہے، جس میں اس کے اندرونی جذبات کا صحیح عکس پڑتا ہے۔ ایک شخص کی بیرونی زندگی اتنی دلچسپ نہیں ہوتی جتنی کہ اس کی اندرونی زندگی کا مطالعہ ہوتا ہے، کیونکہ ایک انسان کا کیریکٹر اس کے تمام اوصاف اور خامیوں کا راز اس کے جذبات میں پنہاں ہوتا ہے ٹینیسن کی بیرونی اور اندرونی زندگی میں ایک خاص مطابقت ہے یا یوں تصور کیجئے کہ دو ساز ہیں جن میں سے ایک ہی قسم کا نغمہ نکلتا ہے، اس کی پوری زندگی میں صرف ایک مرتبہ اس مطابقت میں فرق نظر آتا ہے اور وہ لمحہ ہیلم کی موت ہے، اس کے علاوہ اس کی تمام عمر ایک سچے انسان کی صحیح تصویر ہے۔

اس کے اخلاق کی سب سے بڑی خوبی صداقت تھی، اس کی گفتگو اور عمل اس کے ضمیر کی سچی ترجمانی کرتے تھے، تصنع سے اسے سخت نفرت تھی، وہ بہت ہی باحس اور کم سخن آدمی تھا، اس کا دل بچوں کی طرح دنیا کی آلائشوں سے پاک تھا، اس کی طبیعت خلوت پسند تھی اور خاص خاص احباب سے

نہایت اخلاق سے ملتا تھا، اس کا دل بہت ہی نازک اور پر درد تھا، غیبت اور شکایت سے اسے سخت اُلجھن ہوتی تھی "زندگی" اور "انسان" سے اسے بڑی دلچسپی تھی اور وہ ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ انسان اپنی زندگی مسرت اور آرام سے گزار دے اپنی نظموں کے ذریعے سے خوبصورت زندگی کا نقشہ برابر پیش کرتا رہا۔

ہر انسان میں کسی نہ کسی قسم کی خامی ضرور ہوتی ہے ٹینیسن بھی انسان ہی تھا اس میں بھی چند خامیوں کا پایا جانا ضروری تھا، نقادوں سے وہ بہت خوفزدہ رہتا تھا، اکثر وہ متفکر اور غمزدہ رہتا، اس کے دل میں طرح طرح کے مبہم خیالات اُٹھتے جس سے وہ خود پریشان ہو جاتا، لیکن اس کے غم اور تفکر میں بھی اُمید کی جھلک رہتی۔

ٹینیسن اور مذہب

ٹینیسن کی زندگی، خیالات اور کارناموں پر سب سے زیادہ اثر مذہب کا پڑا، اس کی ہر نظم میں مذہب کا پرتو ضرور نظر آتا ہے اور اس لحاظ سے اُسے ایک مذہبی شاعر بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ کسی مذہبی اہبر یا پادری کی طرح مذہب کے دقیق مسائل پر لکچر دیتا تھا یا مذہبی جھگڑوں میں حصہ لیتا تھا بلکہ اس کی شاعری اور جذبات میں مذہب کا جوش اور عقیدت موجود تھی، یہ جوش اور عقیدت اس کی شاعری میں مضامین کے تابع ہوتے تھے، جس قسم کا مضمون ہوتا ویسا ہی مذہبی جوش یا رنگ رہتا۔ اس کی شاعری مذہبی جھگڑوں سے پاک ہے اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو اس کی شاعری کو ممتاز کر دیتی ہے۔ فنِ شاعری میں اگر معمولی جھگڑوں اور مذہبی تعصب سے کام لیا جائے تو وہ فن اور (　　　) آرٹ نہیں کہا جا سکتا۔ شاعری کا فن (　　　) محبت، صداقت، حُسن، مسرت، اور اُمید میں پنہاں ہوتا ہے نہ کہ مذہب کے معمولی جھگڑوں میں، صحیح معنوں میں ٹینیسن کسی خاص مذہب کا پیرو کار نہ تھا، لیکن خدا کا معتقد تھا اور خالق و مخلوق کے راز سے بھی واقف تھا۔

ٹینیسن کا سیاسی نقطۂ نظر

ہر شاعر اپنے زمانے کا مصوّر ہوتا ہے اور جو رنگ اس کے ماحول کا ہوتا ہے وہ خود اختیار کرتا ہے اور اپنے شاعرانہ انداز میں لوگوں کو سناتا ہے ٹینیسن اُنیسویں صدی کا شاعر تھا، جب کہ انگلینڈ میں طرح طرح کے انقلاب ہو رہے تھے، ٹینیسن کو بھی ملکی کاموں میں حصہ لینا پڑا لیکن وہ اپنی تعلیم کو عملی جامہ نہ پہنا تا بلکہ ملک کی ضرورت، آزادی، فلاحت، حب الوطنی اور عورتوں کے حقوق کو اپنی نظموں کے ذریعے سے لوگوں کو سناتا رہا۔ وہ ترقی کا خواہاں تھا لیکن انہیں اگر اس نے خود حصہ نہیں لیا تو بھی لوگوں کو ترقی کے راستے دکھلاتا رہا، اس کی حب الوطنی انگلینڈ کی بہادری اور ملکی فتوحات ہی تک محدود رہی، وہ ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ انگلینڈ کی فوج کافی مضبوط ہو اور دوسرے ملکوں کو فتح کر سکے۔ اس کو سلطنتِ جمہوریہ سے زیادہ دلچسپی نہ تھی، وہ ہمیشہ اُمراء کی سلطنت (　　　) کا خواہاں تھا۔ غربت کا نقشہ اس نے اپنی نظموں میں بہت کم کھینچا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے غریبوں کا زیادہ خیال نہیں کیا۔ عورتوں کے حقوق، ان کی تعلیم کا اس نے کافی چرچا کیا، جس کی شہادت نظم "شاہزادی" (　　　) سے ملتی ہے۔

ٹینیسن بحیثیت شاعر

ٹینیسن فطرت، حقیقت اور انسان کا سچا مترجم تھا اس کے خیالات اور تصور کی پاکیزگی قابلِ تحسین ہے۔ اس کی نکتہ شناس نگاہوں نے فطرت اور زندگی کا ہر پہلو سے گہرا مطالعہ کیا تھا، جس کی جھلک اُس کی شاعری میں نمایاں ہے، بچوں کی بھولی بھالی زندگی سے اسے بڑی دلچسپی تھی۔ اینک آرڈن (　　　) میں بچپن اور زندگی کے ہر زینہ کو اس تسلسل سے دکھلایا ہے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

اسلوبِ بیان

کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ دو طرح سے کیا جا سکتا ہے ایک تو اُس کے کلام کی ترتیب اور دوئم "مواد" مواد میں غیر فانی صداقت اور ترتیب میں موزونیت کا ہونا ضروری ہے، ٹینیسن میں یہ دونوں خوبیاں بیک وقت پائی جاتی ہیں، اس کے کلام میں محاورہ اور الفاظ کے ساتھ ساتھ واقعات اور جذبات کا پہلو بھی مدنظر رکھا گیا ہے، اگر وہ روزمرہ پر زیادہ زور دیتا ہے تو دوسری طرف انسان کی ہستی اور زمانہ کی نیرنگیوں کا بھی خیال ہے اس کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت "سادگی" تھی جو اس کے طرز اور مواد دونوں میں پائی جاتی ہے، دقیق اور مبہم موضوع سے وہ ہمیشہ پرہیز کرتا، تشبیہہ و استعارہ سے بھی کام لیتا ہے، لیکن اسی حد تک کہ موزونیت، صداقت

چینیوں نے پسپائی کے وقت نانکن کے جس پل کو اڑا دیا تھا۔ اسے بعجلت تمام درست کر کے جاپانی فوج شہر میں داخل ہو رہی ہے

اور سادگی قائم رہے اور حسنِ کلام کو نقصان نہ پہونچے، وہ اپنے کلام کو طرح طرح کے زیورات اور رنگ برنگ کے پھولوں سے مزین کرتا لیکن شوخی کے پہلو سے بالکل دُور رہتا تھا، اس کے کلام میں اتنی صفائی ہے کہ زندگی کے ہر پہلو پر غور کرتے ہوئے بھی کسی کو خیالات کے تسلسل سے بھٹکنا نہیں پڑتا۔ انسان اور فطرت کے معمولی جذبات کی بھی تصویر اس خوبی سے کھینچی ہے کہ گویا کسی معمولی چیز کو سمجھایا جاتا ہو آورد اور تصنع کا کہیں نام تک نہیں، قدرتی مناظر کے پیش کرنے میں اُسے ید طولیٰ حاصل تھا، اُس کی تحریر میں ایک خاص شان پائی جاتی ہے، جو ملٹن ( ) سے کسی طرح کم نہیں، اور یہ شان ایسی ہے جس سے اُس کے قلب کی صفائی، اُس کے کلام کی صداقت، اُس کے خیالات کی بلندی کا اظہار ہوتا ہے۔

بہادرو بڑھے چلو!

بہادرو بڑھے چلو　کبھی نہ پیچھے تم ہٹو　رہے یہ بات دھیان میں　نہ فرق آئے شان میں

وطن میں رہ کے قید ہو　چلو چلو بڑھے بڑھو　بڑے بنو جہان میں　کمی نہ آئے آن میں

بہادرو بڑھے چلو　بہادرو بڑھے چلو

وطن پر اپنی جان دو　وطن پر اپنی جان دو

بہادر اور مرد ہو　کمی نہ جہد میں کرو　نہ آنے پائے دل میں غم　خدا کا تم پہ ہے کرم

دکھا دو اپنے جوش کو　بگڑ گئے ہو اب بنو　کہ تم ہو اشرف الامم　صلہ میں پاؤ گے ارم

بہادرو بڑھے چلو　بہادرو بڑھے چلو

وطن پر اپنی جان دو　وطن پر اپنی جان دو

یہ نظمِ قوم ہے کھری　نہیں ہے محض شاعری

سکھاتا ہے بہادری　دکھا دو شانِ حیدری

بہادرو بڑھے چلو　وطن پر اپنی جان دو

قوم مچھلی شہری

دھوکا؟

محمد حسام الدین خاں غوری

مُنّی اس کا نام تھا، اس میں ایک ایسی کشش تھی جو دیکھنے والوں کو زبردستی اس کی طرف کھینچ لیتی تھی، ایک مرتبہ اس پر نظر پڑ جاتی تو بار بار دیکھنے کو جی چاہتا، اور بار بار دیکھکر بھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کس لحاظ سے حسین ہے، سانولا رنگ، کتابی چہرہ، دراز ناک، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن میں صدیوں کا غم پوشیدہ معلوم ہوتا تھا، پتلے ہونٹ، کشادہ پیشانی اور لاغر جسم جو شاید کبھی گداز ہوگا۔

اس پر قتل کا مقدمہ چلایا گیا تھا، لوگوں کا خیال ہے کہ مُنّی نے حالتِ جنون میں ڈاکٹر دینا ناتھ کے سینے میں چھرا بھونک کر اُنھیں ہلاک کر ڈالا۔

تین سال ہوتے ہیں کہ دینا ناتھ کا تبادلہ الہ آباد میں ہوا۔ وہ ایک کامیاب اور تجربہ کار ڈاکٹر تھے، انھوں نے اس قلیل مدت میں جو شہرت و ناموری حاصل کی وہ شاید ہی کسی ڈاکٹر کو نصیب ہوئی ہوگی۔ وہ غریبوں کے سچے ہمدرد شریف اور نیک نفس انسان تھے، مجھے بھی دو چار مرتبہ ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا، ان کی باتوں میں کچھ ایسی صداقت اور ملامت ہوتی جو مخاطب کے دل کو مسخر کر لیتی تھی، انھوں نے شادی نہیں کی تھی، اور یہ عجیب بات تھی کہ جب کوئی اُن سے شادی کا تذکرہ کرتا تو وہ نہایت افسردہ و ملول ہو جاتے تھے۔ گذشتہ وبا میں اُنھوں نے غریب کسانوں کا جس قدر دلچسپی کے ساتھ مفت علاج کیا تھا اس سے ہر شخص کو ان سے دلی عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔ شہر کا بچہ بچہ اُن کے نام سے واقف تھا، ان کی موت پر سارے شہر میں غم کی ایک لہر دوڑ گئی اور جب جنازہ نکلا تو کون بے درد تھا جس کی آنکھوں میں آنسو نہیں چمک رہے تھے۔ دینا ناتھ نہایت ہی رقیق القلب تھے، وہ کسی کی آنکھوں میں آنسو دیکھنے کی تاب نہ رکھتے تھے۔ آہ! آج ہزارہا غریب ان کے لئے رو رہے تھے، آنکھوں سے عقیدت و محبت کا دریا بہہ رہا تھا، لیکن دینا ناتھ کو اس کی پروا نہ تھی۔

دینا ناتھ کا قتل ایک معمّا تھا، سب حیران تھے، اور ان کے قتل کئے جانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی، پولیس کی تحقیقات میں صرف اتنا ثابت ہوا کہ دینا ناتھ کے قتل سے کوئی ایک ہفتہ پہلے مُنّی الہ آباد میں آئی۔ وہ دیوانوں کی طرح بہکی بہکی باتیں کیا کرتی تھی، اس کی معصوم اور دلکش صورت اور قابلِ رحم حالت پر لوگوں کو ترس آجاتا تھا، کوئی کھانا کھلا دیتا، کوئی پیسہ دو پیسہ دے دیتا، اسی طرح اس کی زندگی بسر ہو رہی تھی۔

دینا ناتھ کے قتل سے ایک دن پہلے زمیندار کی بیٹی پربھا کو اس کی حالت پر رحم آگیا اور اس نے مُنّی کی ساڑی جو تار تار ہو چکی تھی بدلوا دی، وہی نیلی ساڑی قید میں بھی اس کے جسم پر تھی، اس سے زیادہ کوئی بات معلوم نہ ہوئی، مُنّی کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ اس نے دینا ناتھ کو کیوں قتل کیا؟ یہ ساری باتیں کوئی نہیں جانتا تھا، گو اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ مُنّی دیوانی ہے۔ اور اس نے حالتِ دیوانگی میں یہ حرکت کی، لیکن تعجب ہے ڈاکٹروں نے عدالت میں بیان دیا کہ "اس کے حواس بالکل درست ہیں"۔

جب مُنّی کے مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی تو عدالت میں تماشائیوں کی کثرت سے تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ سارا شہر اُمنڈ آیا تھا۔ مُنّی عدالت میں لائی گئی۔ تماشائیوں نے اس کو حیرت سے دیکھا۔ وہی دلربا چہرہ تھا۔ لیکن اس سے کسی کو ہمدردی نہ تھی، اس کے معصوم دل کش چہرے میں دنیا ناتھ کا خون جھلک رہا تھا۔ لوگ اُس کی طرف دیکھکر نفرت سے منہ پھیر لیتے تھے اس پر آوازے کسے جا رہے تھے۔ ہر طرف سے لعنت و ملامت کی بوچھار ہو رہی تھی، لیکن مُنّی گویا بے حس تھی، اس نے عدالت کے روبرو اقبال جرم کرلیا۔ لیکن وجوہ کے متعلق کسی قسم کا بیان دینے سے صاف انکار کر دیا۔ شہادتیں پیش ہوئیں، کافی ثبوت موجود تھا۔ پھانسی کی سزا یقینی تھی۔ فیصلہ کے لئے تاریخ پیشی مقرر ہوئی، لوگ مُنّی کو پھانسی پر دیکھنے کے منتظر تھے۔ لیکن عدالت میں مُنّی کے طرزِ عمل اور ان حالات کی وجہ سے جو مقدمہ کی سماعت کے دوران میں ظاہر ہوئے مجھے اس سے خاص دلچسپی پیدا ہوگئی۔ میں نے اس سے ملنے کی اجازت حاصل کرلی پہلے تو اس نے میرے ساتھ بات چیت کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن بالآخر میرے اصرار پر اپنی داستانِ حیات سنانے پر راضی ہوگئی۔

"اچھا تو سنو" مُنّی نے کہنا شروع کیا "میرے پاپ کی کہانی! ......

میں سری نگر میں رہتی تھی، میرا شوہر مِل میں معمولی آسامی پر مامور تھا۔ ہم غریب تھے اور عسرت میں اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ مجھے اپنے شوہر سے محبت تھی۔ میں اُنھیں دیکھکر خوشی سے پھولی نہ سماتی، جی چاہتا کہ ایک پل کے لئے بھی ان کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دوں، ان کو خوش رکھنے کے لئے اپنی امکانی کوششیں صرف کردیتی۔ مختصر یہ کہ ان کو اپنے دل کے مندر کا دیوتا بنا کر پوجنے لگی۔ اسی طرح دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے زمانہ گزرتا گیا۔

لیکن یہ بات عجیب تھی کہ میں جس قدر اُنھیں پیار کرتی تھی، اسی قدر وہ مجھ سے دور رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ عرصہ تک میں نے اپنے دل کو اس بات سے تسلی دیتی رہی کہ آدمی ہر چیز اپنی خواہش کے مطابق حاصل نہیں کرسکتا پھر بھی اُن کی سرد مہری بعض وقت میرے لئے پریشان کُن ثابت ہوتی لیکن جب مجھے احساس ہوا کہ میں ایک بچے کی ماں بننے والی ہوں تو میں سب کچھ بھول گئی اور اس وقت کے خواب دیکھنے لگی جب بچہ گود میں ہوگا اور اُن کی طرف سے محبت کی جو کمی ہے وہ پوری کردے گا۔

لیل و نہار گزرتے رہے، میری امیدوں کی دنیا نہایت وسیع ہوگئی تھی بالآخر میرے یہاں لڑکا پیدا ہوا، اور میں کچھ عرصے تک مسرت و انبساط میں ڈوبی دنیا سے بے خبر رہی۔ اس عرصہ میں وہ گھر سے بالکل بے پروا ہوگئے تھے، اس لئے مجھے خود محنت مزدوری کرنی پڑتی تھی، مِل سے علیحدہ ہونے کے بعد ایک بدبخت آوارہ گرد کی طرح گلیوں میں گھومنا اور شراب پی کر سڑکوں پر سونا ان کا مشغلہ تھا۔ کبھی بھوکے بھٹکے گھر آتے تو شراب کے لئے مجھ ہی سے پیسے مانگتے، اگر کبھی میرے پاس ہوتے تو میں اُنھیں دیتی ورنہ مجبوراً انکار کرنا پڑتا، مجھے ان کی حالت پر رحم آتا تھا، وہ کبھی کبھی جب میں پیسے دینے سے انکار کردیتی تو مار پیٹ بھی کرتے تھے، یہ بات اب مجھے بالکل یاد نہیں رہی کہ کتنا زمانہ اس طرح گزرا۔

ہمارے پڑوس میں ایک ڈاکٹر صاحب بھی رہتے تھے ان کا نام معلوم نہیں کیا تھا۔ جوان اور خوبصورت تھے۔ ہر روز شام کو میرے گھر پر سے گزرتے، اس وقت میں مزدوری سے واپس آکر یا تو رات کا کھانا پکاتی رہتی یا بچّہ کو سلانے میں مصروف رہتی۔ وہ میری طرف ہمدردی کے انداز دیکھتے ہوئے گزر جاتے۔ دو تین مرتبہ میرے بچہ کو شاید اُنھوں نے مٹھائیاں بھی لادیں۔ لیکن چند روز بعد اُن کی نیت خراب ہوگئی۔ مجھے ان کا ایک خاص انداز میں دیکھنا اور مسکرانا زہر لگتا تھا۔ اس لئے میں نے اُن کی مٹھائیاں لینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد وہ میری طرف دیکھتے نہ تھے اور شاید ہی کبھی میرے گھر پر سے گزرے ہوں گے۔ بہر حال مجھے اُن کے اس طرزِ عمل سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

ایک مرتبہ میرے شوہر مسلسل تین مہینے لاپتہ رہے بالآخر ایک شب جب وہ گھر واپس آئے تو اُنھیں شدت کا بخار تھا، میرے خدا! ان کی صورت کس قدر ہیبت ناک ہوگئی تھی بیان نہیں کرسکتی۔ تین دن بیہوش رہے انھیں اس حالت میں چھوڑ کر میں مزدوری کو نہ جاسکتی تھی۔ تیسرے دن انکی حالت ذرا سنبھلی، اُنھوں نے روٹی مانگی۔ لیکن میرے پاس ایک پائی نہ تھی، آٹا کہاں سے لاتی، خود مجھے متواتر تین دن سے فاقہ کرنا پڑا تھا، آج بچہ بھی صبح سے دودھ کے لئے بلبلا رہا تھا، لیکن دودھ کہاں سے آتا؟

رات کو بچہ کی طبیعت یکایک خراب ہوگئی۔ وہ شدّتِ بخار میں کراہنے لگا، اس کا جسم آگ کی طرح تپ رہا تھا، اس کی یہ حالت دیکھکر میرے ہوش گم ہوگئے، کچھ سجھائی نہ دیتا تھا، کیا کروں کیا نہ کروں۔ میرے شوہر نے

پریشانی کو دیکھکر کہا،

"تم جاکر اپنے پڑوس کے ڈاکٹر کو بُلا لو، میں بچے کو سنبھالتا ہوں۔"

یہ سنکر میں ڈاکٹر کے پاس دوڑی گئی، اس وقت شاید رات کے دس بج چکے تھے، راستہ بالکل سنسان تھا، جب میں ڈاکٹر کے دروازے پر پہونچی تو ڈاکٹر صاحب برآمدے میں بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں کچھ کہے بغیر سیڑھیوں پر چڑھ گئی۔ میری آہٹ پاکر وہ چونکے اور پھر حیرت سے مجھے دیکھکر بولے "کیوں مُنّی! تم یہاں، اتنی رات گئے، کیا بات ہے؟"

میرا نام اُن کو کس طرح معلوم ہوا تھا، میں نہیں جانتی اور نہ اس وقت مجھے ان کی زبان سے اپنا نام سنکر کوئی تعجب ہوا۔ شاید میں نے اس پر غور ہی نہیں کیا، میں جواب دینا چاہتی تھی، لیکن آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔

"میرا بچہ ڈاکٹر صاحب میرا بچہ بیمار ہے، ذرا آپ چل کر دیکھئے" میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ تھوڑی دیر تک میری طرف دیکھکر کچھ سوچتے رہے۔ پھر اُٹھکر اندر کمرے میں چلے گئے اس وقت شاید مکان میں کوئی نہ تھا، وہ اکیلے تھے، وہ اپنے کمرے کے اندر ہی سے بولے۔

"ہاں تو مُنّی تمہارے بچّے کو کیا ہو گیا ہے"؟

"کچھ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب اس کا جسم کوئلہ کی طرح دھک رہا ہے۔"

میں نے غم سے تھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اچھا میں ابھی چلتا ہوں، آج سردی بہت ہے، تم ادھر اندر آجاؤ"

میں کمرے میں چلی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ میرا دل دھڑکنے لگا، اُن کی آنکھوں سے شہوانیت ٹپک رہی تھی۔ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی کہ ڈاکٹر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، اس وقت میری روح کانپ گئی، شدتِ خوف سے میرے حواس معطل ہو گئے، کچھ کہہ نہیں سکتی۔ اس کے بعد کیا واقعات پیش آئے اور میں کب تک ڈاکٹر کے کمرہ میں رہی کچھ یاد نہیں لیکن جب کمرے سے باہر نکل آئی تو معلوم ہوا کہ میں گناہ کی دنیا میں دھکیل دی گئی ہوں، ایک غریب عورت کے پاس اس کی عصمت ہی سب سے زیادہ قیمتی شے ہوتی ہے جس کے سہارے وہ زندہ رہتی ہے جب وہی اُس سے چھن جائے تو پھر اس کے پاس کیا رہ جاتا ہے۔ آہ اسی گناہ کی رات کو میری زندگی برباد ہو گئی۔

جس وقت میں کمرے سے باہر نکلی تو میرے شوہر بچہ کو لیئے دروازہ پر کھڑے تھے۔ ان کا سارا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اُنھوں نے مجھے دیکھکر کہا،

"اس وقت کیا کر رہی تھی مُنّی۔ ننھا بے ہوش ہو گیا تو میں گھبرا کر یہیں لے آیا ہوں۔"

میں چاہتی تھی کہ اپنے بچّہ کو گود میں لے لوں، لیکن ایسا معلوم ہوا کوئی پیچھے سے کھینچ رہا ہے اور کہہ رہا ہے "گنہگار عورت اس معصوم کو ہاتھ نہ لگا" میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی، اور میں دیوانوں کی طرح بھاگی، میں بھاگ رہی تھی اور میرے کانوں میں آوازیں آ رہی تھی "مُنّی! مُنّی!!" جیسے جیسے آواز آتی تھی میں اور زور سے بھاگتی جاتی تھی۔ اس کے بعد کچھ معلوم نہیں کیا ہوا۔ کہاں کہاں بھٹکتی پھری، لیکن جب یہاں پہونچی تو ایک دن وہی ڈاکٹر مجھے نظر آیا جس نے میری زندگی کو برباد کر ڈالا تھا، میرا خون کھولنے لگا اور میں نے اسی وقت قصائی کا چھرا لیکر ڈاکٹر کے سینے میں بھونک دیا، بس اس کے بعد جو کچھ ہونا تھا وہ ہوا اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔"

یہ کہتے ہوئے مُنّی کے چہرے پر ایک لمحہ کے لئے فاتحانہ مسرت کھیل گئی لیکن بہت جلد پھر افسردگی غالب آگئی۔

میں نے کہا "لیکن تمہارے لئے اپیل دائر کی جائے تو امید ہے کہ تم بچ جاؤگی۔"

مُنّی نے اعتراضاً کہا "لیکن قید میں سسک سسک کر مرنے سے پھانسی کے تختہ پر مرنا کہیں بہتر ہے۔"

مجھے اس کا کوئی جواب نہ سوجھا۔ مُنّی یکایک سر اُٹھا کر بولی۔

"صرف ایک بات مجھے دُکھ دے رہی ہے، ممکن ہے میری آنکھوں کو دھوکا ہوا ہو اور یہ ڈاکٹر جس کو میں نے قتل کیا، وہ ڈاکٹر نہ ہو جس نے میری زندگی برباد کر دی۔"

آزادی، حُرّیت و مساوات کا جذبہ پیدا کرتا ہے

"سعیِ نامشکور"

عطاءاللہ پالوی

ذیل کا مضمون کسی قدر سخن گسترانہ پہلو لئے ہوئے ہے، مگر اس سے میری
مراد حاشا وکلّا جناب رضا قاسم صاحب کی تنقیص نہیں بلکہ اس کے ذریعہ
محض یہ اصلاح مدنظر ہے کہ (۱) اردو زبان کے متقدر جرائد ورسائل
کو وہ مضامین نہ عنایت فرمائے جائیں جو ایک مرتبہ کسی دوسرے
رسالے میں شائع ہو چکے ہوں کیونکہ اس سے رسالے کی قدر وقیمت کم
ہو جانے کا اندیشہ ہے (۲) لفظ "مشکور" کو بمعنی "شکر گزار" یا کسی
"غلط العوام" لفظ کو صحیح ومستند تسلیم کرانے کی ضد کرکے زبان کو
مجروح نہ کیا جائے۔ عطاءاللہ پالوی

رسالہ "کلیم" (دہلی) کے "نومبر نمبر" میں مظفرپور کے مشہور اہلِ قلم جناب رضا قاسم صاحب مختار کا ایک مضمون بعنوان "تحقیقِ اصلاح" شائع ہوا ہے، جو اردو زبان سے متعلق ہونے کی وجہ سے خاص طور پر قابلِ ذکر اور لائقِ مطالعہ ہے۔ صاحبِ موصوف کا یہ مضمون سب سے پہلے رسالہ "ندیم" (گیا) کے اپریل نمبر ۱۹۳۵ء میں میری نظر سے گزرا تھا، اب اس مرتبہ "کلیم" میں شائع ہوا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض مفید مضامین ایسے ہوتے ہیں، جن کی افادی حیثیت یا غیر معمولی پسندیدگی اُسے کئی بار شائع کرنے کی دعوت دیتی ہے، اور وہ ہر مرتبہ شائع ہوکر کچھ نہ کچھ فائدہ بھی پہونچاتے ہیں، مگر جہاں تک میں نے غور کیا "تحقیقِ اصلاح" میں کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آئی جو اس کی مکرر اشاعت کو قابلِ تحسین قرار دے۔ بجز اس کے کہ صاحبِ موصوف لفظ "مشکور" کو "شکرگزار" کے معنی میں زبردستی تسلیم کراکر ایک "غلط العوام"[1] لفظ کو "غلط العام"[2] کی صف میں لاکر حضرتِ شوق نیموی کے اس قول پر مہرِ توثیق ثبت کرنا چاہتے ہیں کہ

"کسانیکہ غلط العام فصیح را در جواز غلط العوام آرند وفرقے در
ہر دو قسم نہ انگارند از بے خبری "غلط العام" و"غلط العوام" را متحد المعنیٰ
پندارند"

اس بات کا مزید ثبوت یہ ہے کہ آپ نے "تحقیقِ اصلاح" مطبوعہ ندیم (گیا) کے ختم ہوتے ہی ایک اعلان شائع فرمایا ہے جس میں فرماتے ہیں کہ

"جون، اکتوبر، نومبر ۱۹۳۱ء اور اگست ۱۹۳۲ء کے ندیم کی
ضرورت ہے، اگر کسی صاحب کے پاس یہ چاروں نسخے یا ان میں
کوئی بھی ہو اور اسے وہ برادرانہ طور پر یا قیمتاً دینا چاہیں تو مجھ کو
اطلاع دیں نہایت "مشکور" ہوں گا"

ہرکیف اُردو زبان میں لفظ "مشکور" کے بمعنی شکر گزار مستعمل ہونے کے متعلق حضرت رضا قاسم نے مختلف قسم کی بحثیں کی ہیں، سب سے پہلے رسالہ اردو

---

[1] "غلط العوام" اُس غلطی کو کہتے ہیں جو عوام اپنی جہالت وبے علمی کے سبب کرتے ہیں، اور اُن کی وہ بات قابلِ سند نہیں خیال کی جاتی، مثلاً "شاکر" کے معنی میں "مشکور" "زہریلے" کے معنی میں "مسموم" شبہ کرنے والے کے معنی میں "مشکوک" "سالک کے معنی میں "مسلوک" وغیرہ وغیرہ (عطاءاللہ)

[2] "غلط العام" اُس غلطی کو کہتے ہیں جو عام لوگ جان کرکے بھی کرتے ہیں یا بالفاظِ دیگر وہ غلطی جسے بالاتفاق تمام زباندانوں اور مستند ادیبوں نے اپنے کلام میں استعمال کیا ہو۔ مثلاً "ادائیگی" "خفگی" "ناراضگی" وغیرہ وغیرہ (عطاءاللہ)

بابت ماہ جنوری ۱۹۳۴ء کا ایک اقتباس پیش کرتے ہوئے ثبوت میں خاطر، تواضع، حقہ، قارورہ اور ریل وغیرہ کی مثالیں پیش کی ہیں، اور آتش مرحوم کی اُس بحث کو پیش کیا ہے جو "المضاعف" اور "بیگم" وغیرہ کے متعلق "آبِ حیات" سے نکل کر سینکڑوں جگہ نقل ہو چکی ہے، اور ان سب کے بعد مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی وہ عبارت نقل کی ہے جس میں مولانا مرحوم نے "شکرگزار" کی جگہ "مشکور" لکھکر لفظ "مشکور" پر بحث کرنے والوں کے لئے ایک شاہراہ تیار کر دی ہے، لہٰذا آئیے اِن دلائل کا تجزیہ کرکے دیکھا جائے کہ حضرت رضا قاسم کے دلائل کس حد تک درست ہیں۔

حضرت رضا قاسم صاحب کی بحث کے تین اجزا حسبِ ذیل ہیں، اور ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ان تینوں کا تجزیہ ہمیں کس نتیجے پر پہونچاتا ہے۔

(۱) اردو زبان میں اکثر و بیشتر ایسے الفاظ نظر آتے ہیں جو اپنی زبان سے علیحدہ ہوکر اُردو میں بالکل دوسرے معنوں میں مستعمل ہیں اور وہ صحیح تسلیم کئے جاتے ہیں۔

(۲) لفظ "مشکور" بھی اُن ہی الفاظ کی طرح اردو میں شکرگزار کے معنی میں مستعمل ہو گیا ہے، اس لئے اُسے غلط سمجھنا غلطی ہے۔

(۳) مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے اسے اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

پہلی بحث

اردو زبان نام ہے ایک ایسی زبان کا جو تمام زبانوں کے مختلف الفاظ سے مل کر بنی ہے۔ لیکن جب ہم دوسری زبانوں کی تحقیق کرتے ہیں تو اُن میں بھی غیر زبانوں کے بیشمار الفاظ ایسے ملتے ہیں جو مفہوم، تلفظ اور ہجا کے ساتھ ساتھ صورت شکل میں بھی بدل گئے ہیں۔ اس لئے اردو زبان میں بھی جو الفاظ دوسری زبانوں سے آئے ہیں، وہ یقیناً بدل گئے ہیں اور یہ بھی قطعی درست ہے کہ اکثر و بیشتر الفاظ محض غلط طریقے پر اردو میں مستعمل ہو گئے ہیں۔ مگر الفاظ الفاظ میں فرق ہے، چنانچہ خود مختار صاحب موصوف نے اپنے مضمون "ہماری زبان" میں "لطافتِ زبان" کے تحت فرمایا ہے کہ

"جن الفاظ کو خواہ وہ کسی زبان کے ہوں اُردو نے اپنا لیا ہے وہ صحیح مانے جاتے ہیں، اسی کا نام ٹکسالی زبان ہے جس کو پرکھنے کے لئے دہلی اور لکھنؤ کی زبان مستند مانی جاتی ہے۔"

ایسی صورت میں مختار صاحب موصوف کا صرف غلط الفاظ کی چند مثالیں پیش کرکے یہ کہنا کہ جس طرح وہ صحیح تسلیم کئے جاتے ہیں اُسی طرح ہر وہ غلط لفظ صحیح ہے جو اردو زبان میں رائج ہو گیا ہے، صحیح اور تشفی بخش نہیں ہے۔ صاحبِ موصوف نے تو صرف چار پانچ ہی مثالیں پیش کی ہیں، حالانکہ اردو زبان سے ہزاروں الفاظ ایسے پیش کئے جا سکتے ہیں جو اصل زبان سے علیحدہ ہوکر اُردو میں بالکل دوسرے معنوں میں مستعمل ہیں۔ مگر چونکہ اُن کا شمار "غلط العام" میں ہے لہٰذا وہ اُن الفاظ کے مقابلے میں نہیں پیش کئے جا سکتے جو "غلط العوام" کے تحت میں آتے ہیں۔ بلکہ بقول پروفیسر تاجور "فصحا اور مستند ادبا کا استعمال سندِ صحت و فصاحت ہے۔" جو لفظ ماہرینِ زبان کے لٹریچر میں استعمال ہوا ہے، وہ صحیح ہے اور جو لفظ استعمال نہیں ہوا وہ بہر حال غلط رہے گا چاہے اُس کی صحت میں آسمان و زمین کے قلابے ہی کیوں نہ ملا ڈالے جائیں۔

دوسری بحث

مختار صاحب موصوف کی دوسری بحث یہ ہے کہ لفظ "مشکور" بھی اور غلط الفاظ کی طرح اردو میں بمعنی "شکرگزار" استعمال ہوتا ہے لہٰذا وہ اس معنی میں اب عربی نہ رہا، بلکہ اُردو بن گیا اور وہ اس معنی میں صحیح ہے جو اردو زبان میں رائج ہو چکا ہے۔" پھر آگے چل کر عبد الاحد پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

"تعجب ہے کہ قابل اصلاح کار نے نہ معلوم کن اصولوں کی بنا پر لفظ مشکور کا استعمال زبانِ اردو میں احسانمند کے معنی پر غلط ٹھیرایا ہے۔"

لہٰذا بہتر ہوگا کہ اُن اصولوں کو بتانے کے عوض اردو زبان کے نامور شاعر و ادیب حضرت علامہ عیش امروہوی کا وہ قول نقل کر دوں جو رسالہ شاعر (آگرہ) کے دسمبر نمبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا ہے اور جس میں بتایا گیا ہے کہ لفظ "مشکور" کا استعمال "شکرگزار" اور "شاکر" کے معنوں میں کیوں اور کس طرح غلط ہے۔ وہو ہٰذا:-

"ایک صاحب جو ادب اردو میں نمایاں مرتبہ رکھتے ہیں انھوں نے ایک خط میں مشکور یعنی شکرگزار استعمال کیا، اس پر جناب

سیماب اکبرآبادی نے اعتراض کیا۔ اس اعتراض کے جواب میں انھوں نے وجوہ ذیل پیش فرمائے۔

(۱) مشکور بمعنی شکرگزار اردو زبان کا تصرف ہے۔ اس کے اصل معنی تو ہیں وہ جس کا شکر ادا کیا جائے۔ مگر اردو زبان میں اگر معنوی تغیر ہو گیا ہے جیسے:-

الف۔ تعویذ کہ عربی میں تو اس کے معنی کچھ اور ہیں مگر اردو میں قبر کا تعویذ اور یہی معنی پر مشتمل ہے۔

ب:- حقہ عربی میں ڈبے کے معنی پر ہے، اردو میں قلیان کو کہتے ہیں۔

ج۔ سرور عربی میں خوشی کے معنے میں ہے اردو میں نشے کے معنی میں

د۔ ریل انگریزی میں پڑی کو کہتے ہیں۔ اردو میں پٹری پر چلنے والی گاڑی کو۔

جس طرح ان تمام الفاظ میں اردو نے معنوی تغیر کر لیا ہے اسی طرح مشکور بمعنی شکرگزار کو بھی سمجھنا چاہیئے۔

(۲) ممنون و مرہون یہی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر مشکور سے بہت پہلے ارباب علم و اہلِ قلم نے ان کا استعمال فاعلی معنی میں کر لیا ہے اور اب کسی کو اس سے اجنبیت نہیں رہی۔

(۳) "خطوطِ شبلی" مرتبہ محمد امین صاحب زبیری مطبوعہ آگرہ خط نمبر ۸۳ میں ہے "آپ کی تکلیف فرمائی کا بہت مشکور ہوں"

غرض یہ تین[1] باتیں ہیں جن سے مشکور کو بمعنی شاکر اردو میں صحیح ٹھیرایا گیا ہے۔

میری[2] گذارش

نمبر دو میں ممنون اور مرہون کو یہ فرمانا کہ مشکور سے بھی پہلے اہل علم نے انھیں فاعلی معنی میں استعمال کیا ہے، بالکل بے بنیاد بات ہے، اگر کوئی ممنون کے معنی منت گزار سمجھ لے تو یہ اس کی سمجھ کی غلطی ہے۔ مرہون کے معنی بھی گرو کرنے والے کے آج تک کبھی اردو میں مستعمل نہیں ہوئے۔ لوگوں نے اسی غلط قیاس سے دھوکا کھایا کہ جب یوں کہنا صحیح ہے کہ میں آپ کا ممنون ہوں تو یوں کہنا بھی صحیح ہوگا کہ میں آپ کا مشکور ہوں۔ حالانکہ اول فقرے کے معنی ہیں "میں وہ ہوں جس پر آپ کا احسان ہے" اس میں معنوی مراد و مطلب صحیح رہتا ہے۔ مگر دوسرے میں معنی خلاف مراد ہو جاتے ہیں

تصرف کی بحث

اب یہ دیکھنا ہے کہ آیا لفظ مشکور بمعنے شکرگزار اردو زبان کا تصرف ہے؟ یعنی اُس کو اردو سمجھ لینا چاہیئے یا نہیں اور اس پر تصرف یافتہ ہونے کے شرائط کا انطباق ہوتا ہے یا نہیں، کیونکہ آئمہ لغت نے غلط اور متصرف فیہ کو پہچاننے کے لئے چند باتیں مقرر فرمائی ہیں تصرف یافتہ لفظ کی شناخت یہ ہے۔

(۱) کہ اُسے قبول عام حاصل ہو۔ یعنی عام لوگ بھی استعمال کرتے ہوں اور خاص لوگ بھی، کسی کو اس سے احتراز نہو۔ عام لوگوں سے مراد خواندہ اشخاص ہیں اور خاص لوگوں سے مراد صاحبانِ علم و فضل۔

(۲) اُس کی تغلیط منقول نہ ہو۔ یعنی کسی نے اس کو غلط نہ ٹھیرایا ہو۔ بہت سے اہلِ علم بھی کسی قاعدے سے ذہول، غفلت یا اور کسی فریب کھا جانے کی وجہ سے کسی لفظ کا اشتقاق غلط کر بیٹھتے ہیں، یا کسی لفظ کو اس کے معنے سے متجاوز کر کے استعمال کر لیتے ہیں۔ جیسے لفظ ثقاہت کہ ثقہ کو دیکھکر بنا لیا، اور اس بات سے ذہول ہو گیا کہ ثقہ عربی میں کوئی مادّہ نہیں ہے، ثقہ تو وثق کی ایک معلل ہئیت ہے۔ عرب "وثق" کے وزن کے لفظوں میں اول کی واؤ کو آخر میں ت بنا کر لگا دیتے ہیں ثقہ کو مادّہ سمجھکر ثقاہت مصدر گڑھنا ذہول کی وجہ سے ہے۔ علامہ شبلی بھی ثقاہت[3] لکھ گئے ہیں۔ بھول سے انھوں نے مشکور بھی لکھ

---

[1] ثبوت میں وہی سب مثالیں دی گئی ہیں جو حضرت رضا قاسم نے پیش کی ہیں۔ اس لئے عجیب و غریب مماثلت کہو جن سے بعض اوقات شبہ ہوتا ہے کہ کیا حضرت رضا قاسم صاحب ہی نے سیماب صاحب کو جواب دیا تھا؟ ممکن ہے کہ اور کوئی صاحب ہوں، اور یہ صرف اتفاق ہو (عطاءاللہ)

[2] "میری" سے مراد علامہ عیش ہیں۔ احتیاطاً عرض کیا گیا۔ (عطاءاللہ)

[3] اس میں شبہ نہیں کہ "ثقاہت" "ثقہ" سے بنایا گیا ہے اور از روئے قاعدہ غلط ہے مگر شبلی کے علاوہ بھی اکثر لوگوں نے لکھا ہے۔ مثلاً جگر مرادآبادی فرماتے ہیں۔ ع
عشق معصوم صفت حسن ثقاہت دشمن

دیا ہوگا جیسے کہ فارسی لفظ "پیشوا" جس کے معنی رہبر و رہنما کے ہیں۔ ذوق نے ان معنے سے اُسے تجاوز کر کے استقبال کے معنی پر استعمال کر لیا ہے

ع "پیشوا اپنے کو جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے" غرض کہ ذہول اور غفلت کی وجہ سے اگر کوئی کچھ لکھ جائے تو اُس کو خطا تصور کریں گے۔

(۳) جس لفظ کی تغلیط کی گئی ہو اور اُس زمانے کے فصحا و اُدبا نے خاموش رہ کر اُسے تسلیم کر لیا ہو، یا بعض نے قول سے بھی تائید کر دی ہو۔ تو اب اس لفظ کے غلط ہونے پر گویا اجماع ہو گیا وہ ہمیشہ غلط ہی رہے گا۔

لفظ مشکور پر یہ تینوں باتیں منطبق نہیں

(۱) اسے قبول عام حاصل نہیں، خواص اس سے ہمیشہ محترز رہے ہیں۔ مستند شعراء کے دواوین و تصانیف ان معنی میں استعمال کئے جانے سے خالی ہیں۔

(۲) اس کی تغلیط منقول ہے۔ اغلاط زبان پر جس قدر کتابیں لکھی گئیں سب میں اس کی تغلیط ہوئی۔ نور اللغات تک میں یہ تغلیط منقول ہے۔ گویا ہر زمانے کے لوگ بالاتفاق اسے غلط مانتے چلے آتے ہیں۔

(۳) جلال مرحوم کے زمانے میں ان کی طرف سے اس کی تغلیط کا اچھا اعلان ہوا۔ اُن کے تمام معاصرین نے اسے تسلیم کیا۔ نیز ان کے معاندین نے بھی جو ان کی جائز باتوں میں بیخ نکالنے لگے تھے، اس امر میں اُن کی تائید کی، ملاحظہ ہو، ازالۃ الاغلاط شوق نیموی، داغ، امیر، تسلیم وغیرہم اس زمانے کے اہل کمال و اہلِ زبان نے اسے غلط تسلیم کیا، کیونکہ جن کتابوں میں یہ بحثیں ہیں (دستور الفصحا وغیرہ) ان پر ان کی تقریظیں اور تاریخیں لکھی ہوئی ہیں۔ لہٰذا "مشکور" بمعنی "شکر گزار" کے غلط ہونے پر سب کی مہر ہے، اور اس زمانے کے تمام فصحائے زبانِ اردو کا اس کی تغلیط پر اجماع ہے۔ اب یہ لفظ تصرف یافتہ نہیں ٹھیر سکتا، اس کے بعد اگر کوئی اہلِ قلم لکھے گا تو اس کی بُھول چوک سمجھی جائیگی۔ قبر کا تعویذ، حقہ، سرور اور ریل کو میں اور آپ خاص و عام سب نئے معنوں میں بولتے ہیں۔ کسی کو بھی ان کے بولنے میں تامل و احتراز نہیں۔ کلامِ اساتذۂ اردو زبان میں بھی موجود ہیں، نہ کبھی ان کی تغلیط ہوئی، اسی لئے یہ جناب اردو لفظ بن گئے ہیں۔ "مشکور" کو ان سے کوئی نسبت نہیں، اس پر تصرف یافتہ لفظ کی شرطیں بھی پوری نہیں اُترتیں۔ بہر حال! میں نے زبان کو آشوب غلط سے بچانے کے لئے یہ چند سطریں عرض کر دی ہیں۔

یہ وہ خیالات ہیں جو اردو زبان کے ایک مستند ادیب اور شاعر نے ظاہر فرمائے ہیں، اور لطف یہ کہ یہ "چند سطریں" شائع ہوئی ہیں، اکبر آباد کے اُس جریدہ میں جس کے ایڈیٹر اُس وقت جناب سیماب اکبر آبادی (بقولِ حضرت تاجور نجیب آبادی "اردوئے مُعلّیٰ کے مالک") تھے۔ دہلی کا مستند رسالہ ساقی عرصے سے میرے پیشِ نظر ہے، اور اُس میں تمام مایۂ ناز دہلوی اصحاب کے مضامین نثر و نظم شائع ہوتے ہیں، مگر کسی دہلوی اہلِ قلم نے "مشکور" بمعنی "شکر گزار" استعمال نہیں کیا، البتہ ایک مرتبہ مسٹر پریم چند بیکنٹھ باشی نے ساقی میں لفظ "مشکور" بمعنی "شکر گزار" لکھا تھا۔ منشی پریم چند بلند پایہ افسانہ نگار کے لحاظ سے چاہے کچھ بھی ہوں مگر وہ نہ تو مستند اہلِ قلم کہے جا سکتے ہیں اور نہ اہلِ زبان۔ پھر بھی قرینہ غالب ہے کہ منشی صاحب موصوف نے بھی بھول ہی سے لکھا ہوگا، ورنہ "پریم چند" کے تقریباً سارے کارنامے میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ بجز ایک مرتبہ کے اور کبھی میں نے مشکور بمعنی شکر گزار نہیں دیکھا۔ لاہور اور لکھنؤ کے بھی رسالے میری نظر سے برابر گزرتے ہیں، مگر کسی جگہ لفظ "مشکور" بمعنی شکر گزار میری نظر سے نہیں گزرا۔ ایسی صورت میں بقولِ خود حضرت رضا قاسم صاحب کہ "دہلی اور لکھنؤ کی زبان مستند مانی جاتی ہے" لفظ مشکور کی صحت میں نہ لکھنؤ کی مثال ملتی ہے نہ دہلی کی، اور اس لئے خود ان کے الفاظ میں لفظ "مشکور" بالکل غیر مستند ہے۔

تیسری بحث

تیسری بحث یہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی نے اسے اسی معنی میں استعمال

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) اس کے علاوہ جناب خواجہ عبد المجید صاحب بی اے مولّفِ جامع اللغات نے بھی "ثقاہت" کی صحت کو مان لیا ہے، خیال آتا ہے کہ حضرت عبد الباری آسی نے بھی کسی جگہ "ثقاہت" لکھا ہے، ایسی صورت میں اگر "ثقاہت" کو صحیح نہ بھی باور کیا جائے تو بھی وہ اس قدر غلط نہیں ہے کہ اُسے "مشکور" کے سے غلط لفظ کے مقابلے میں پیش کیا جائے۔ (عطاء اللہ)

کیا ہے تو اس کے متعلق اوپر بھی بحث ہو چکی ہے۔ اس لئے مزید ضرورت نہیں۔ البتہ اس قدر ضرور کہنا ہے کہ مولانا موصوف کو بھول چوک سے سراسر پاک سمجھنا بڑی نادانی ہے۔ شبلی مرحوم نے اپنے ان ہی خطوط میں "اسکے" کو اکثر موقعوں پر "ابکی" لکھا ہے جو قطعاً غلط اور بر خلافِ اتفاقِ جمہور ہے۔ اس لئے "شکور" بھی اُس موقع پر یقیناً غلطی سے لکھا گیا۔ ورنہ سارے خطوط میں یہی ایک جگہ کی تخصیص کیوں ہے؟ بہر کیف آخر میں صرف اسی قدر کہنا ہے کہ "شکور" کو بمعنی "شکر گزار" صحیح تسلیم کرانے یا باور کرانے کی سعیٔ ناشکور اردو ادب کے لئے حد درجہ نقصان دہ ہے۔

یہی دنیا

عشق پیتا ہے جہاں خونابہ دل کے ایاغ
آنسوؤں کے تیل سے جلتا ہے الفت کا چراغ

جس جگہ لکھی گئی ہیں حسن کی تقدیر میں
اہلِ دولت کی غلامی، جھڑکیاں اور ذلتیں

جس جگہ روٹی کے ٹکڑے کو ترستے ہیں مدام
"سیم و زر کے دیوتاؤں" کے سیہ قسمت غلام

جس جگہ حق بات کہنے والے مردانِ خدا
موت کی پاتے ہیں شیدایانِ باطل سے سزا

گھورتے ہیں جس جگہ ظالم کٹاریں سونت کر
لفظ "آزادی" جو آتا ہے کسی کے ہونٹ پر

جس جگہ حُبِّ وطن کے جذبہ سے ہو کر طپاں
سُولی کی رسّی کو ہنسکر چومتے ہیں نوجواں

جس جگہ انسان ہے وہ پیکرِ بے عقل و ہوش
نوچ کر کھاتے ہیں جس کی بوٹیاں مذہب فروش

جس جگہ یوں جمع ہیں تہذیب کے پروردگار
جس طرح سڑتے ہوئے مردار پر مردار خوار

جس جگہ اُٹھتی ہے یوں مزدور کے دل سے فغاں
فیکٹری کی چمنیوں سے جس طرح نکلے دُھواں

جس جگہ سرما کی ٹھنڈی شب میں ٹھٹھرے ہونٹ سے
چُومتی ہے رو کے بیوہ گال سوتے لال کے

جس جگہ اشکوں سے تر رہتی ہیں معصوم انکھڑیاں
جس جگہ کانٹوں سے زخمی ہیں گلوں کی پنکھڑیاں

جس جگہ دہقاں کو رنجِ محنت و کوشش ملے
اور نوابوں کے کُتّوں کو حسیں پوشش ملے

تیرے شاعر کو یقیں آتا نہیں، ربّ العُلا!
جس پہ تو نازاں ہے اتنا وہ یہی دُنیا ہے کیا؟

مجید امجد، بی اے

دیوارِ چین پر ایک طائرانہ نظر

انوار اللہ غمگین ہشتنگری

دیوارِ چین دنیا کے سات عجائبات میں سے کیوں نہیں ہے ؟

یہ ایک سوال ہے جس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئیے ۔ بہتیرے مورخوں نے بال کی کھال نکال کر اِس رازِ سربستہ کے کھولنے کی کوشش کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ چونکہ اِس انتخاب کا سہرا عہدِ متوسطہ کے اُس گروہ کے سر ہے ۔ جو مغرب کے دامن میں پہلے تھے ، اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے دیس کی چیزوں پر دوسرے دیس کو ترجیح دینا انسانی خاصہ کے خلاف سمجھا ہوگا اور حقیقت یہ ہے کہ ہر فرد نوعِ انسان اپنے دیس کے خار کو بھی پرائے دیس کے گلزار پر ترجیح دینے میں دریغ نہیں کرتا ۔ ایک معقول وجہ اور بھی ہوسکتی ہے ممکن ہے کہ ان حضرات نے اپنے انتخاب کا معیار مشاہدہ پر رکھا ہو ۔ اور دُوری کی وجہ سے دیوارِ چین کا تذکرہ ہی بالکل چھوڑ دیا ہو ۔

الغرض یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ دیوارِ چین کی شان اور عظمت اس بات کی سُفارش کرتی ہے کہ اسے بھی دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا جاوے ، ورنہ اِس حقیقت سے انکار کرنا آفتاب پر خاک اُڑانے مصداق ہوگا ۔

چین بہت قدیم زمانے سے تہذیب کا گہوارہ رہ چکا ہے ، اِس کے دامن میں وہ صاحبقراں پیدا ہوئے ، جن کے سامنے بڑوں بڑوں کی دال نہیں گلی ، اِن میں سے ایک نامور تاجدار "شی ہنگٹی" گزرا ہے ، یہ چین کا وہ حکمراں ہے جس کے سر پر اولیت کا تاج رکھا گیا اور جس نے ایک ایسی عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی کہ دو ہزار برس کے دوران میں کوئی بھی اس کا ایک بال بیکا نہ کرسکا ۔ اُس کے شاندار دَور کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس کو شاہِ ہفت اقلیم و ہفت کشور کہیں تو بے جا نہ ہوگا ۔ سکندر اور دارا کو اُس کے در کا دربان ٹھیرائیں تو انصاف پروری سے بعید نہ ہوگا ۔ مورخین اِس شاہِ نامدار کی تعریف میں ایسے رطب اللسان ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ اُس کے شاندار دَور کا ذکر کئے بغیر دنیا کی تاریخ غیر مکمل رہ جاتی ، بلکہ اُس کی ناک ہی کٹ جاتی ۔

القصہ باوجود اِس شان و شوکت جاہ و منصب اور کر و فر کے اِس شاہِ بلند اختر کو یہ خیال دامنگیر ہوا ، کہ انسان آخر کہاں سے آیا کس لئے آیا اور اُس کا انجام کیا ہوگا ؟ اِن تصوّرات میں ہمہ تن محو ہوا ، آخر کار جب کچھ بن نہ آئی تو دنیا بھر کے منجموں کے جمع کرنے کا حکم دیا ، ایک جمِ غفیر نجومیوں کا حاضر دربار ہوا یہ مسئلہ اُن کے سامنے پیش کیا گیا ، کئی دن تک غور و خوض ہوتا رہا ۔ تاریخوں کا ورق ورق دیکھا گیا ۔ گزشتہ انسانوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا گیا ، اور آخر کار اس نتیجے پر پہونچے کہ دنیا ایک سراب ہے ، انسان فانی ہے ، اِس دنیائے دوں میں کوئی انسان کتنا ہی بلند اقبال کیوں نہ ہو ایک دن موت کا مزہ ضرور چکھے گا ۔ یہ سُنکر بادشاہ کے حواس باختہ ہوگئے اور بیساختہ پوچھنے لگا کہ میرا کیا حشر ہوگا ؟ تمام منجموں نے یک زبان ہوکر کہا کہ شاہِ عالی منزلت ! تیری موت قومِ ھُنو کے ہاتھوں ہوگی ۔ یہ اُس وقت چین کی شمالی سرحد پر رہتی تھی ۔

یہ سنتے ہی بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ شمالی سرحد کو قوم ہُنز سے خالی کرا یا جائے، اور اُن کے جو جو افراد ملکِ چین میں ملیں اُن کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔ ملکِ چین کے چاروں طرف حصار بندی کی جاوے تاکہ کسی بنی نوعِ انسان کو چین پر دھاوا کرنے کی جرأت نہ ہوسکے۔

فرمانِ شاہی بجالایا گیا۔ ہزاروں افراد قوم ھُنوکے بڑی بے دردی اور بے رحمی سے قتل کئے گئے۔ بڑے بڑے گھرانے ماتم کدے بن گئے۔ گلی کوچوں میں خون کے دریا بہنے لگے۔ ایک جان کو بچانے کے لئے نہ معلوم کتنی جانیں لی گئیں۔ جب قوم ہُنو کا ایک فرد بھی زندہ نہ بچا توفصیل کی تعمیر شروع ہوئی۔ ملکِ چین کی ۵٪ فیصدی آبادی نے اس کے بنوانے میں حصہ لیا، جنھوں نے انکار کیا، اُن کی ہڈیاں فصیل کے اندر چُن دی گئیں۔ خاندان برباد کئے گئے۔ اُن کے بچوں کو تہ تیغ کیا گیا۔ الغرض ایک کوہ پیکر دیوار تیار ہوئی، جس کی اینٹ اینٹ انسانوں کے خون پسینے سے جمی ہوئی ہے۔ جس کی بنیاد اَن گنت انسانوں کی خوابگاہ بن چکی ہے، ایک جان کو بچانے کیلئے لاتعداد جانوں کا خون کرنا کہاں کی انسانیت ہے۔ ایک کشت زار کو سرسبز کرانے کے لئے ہزاروں کا پامال کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ ایک نخلِ تمنا کو بارآور کرانے کے لئے ہزاروں کو بجلی کے نذر کرنا کہاں کی شرافت ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ دیوارِ مجسم مرقع ہے اُن انسانیت کش اور دلخراش واقعات کا جنھیں سن سن کر دنیا خون کے آنسو رو چکی ہے۔

یہ دیوار بحرِ چین کے قریب سے شروع ہو کر وسط ایشیا تک پہنچی ہے۔ اس کی کل لمبائی ڈیڑھ ہزار میل اونچائی بیس فٹ اور موٹائی اٹھارہ فٹ یعنی چھ گز ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے سو سو گز کے فاصلے پر ایک ایک برج بنایا گیا ہے، اس دیوار کی اونچائی نشیب و فراز، دریاؤں اور پہاڑوں پر یکساں رکھی گئی ہے۔

بادشاہ نے موت کے ڈر سے نہ صرف یہ کام کیا بلکہ اپنے بچاؤ کے لئے فوراً ایک عظیم الشان عمارت کے بنوانے کا حکم دیا۔ سات لاکھ مزدور روزانہ کام میں لگے رہے۔ چند دن کے اندر اندر ایک شاندار محل تیار ہوگیا۔ جس میں بے شمار کمرے تھے، بادشاہ روزانہ جدا جدا کمروں میں سکونت رکھتا۔ اس خیال سے کہ کسی طرح بھی موت کے فرشتے کو میری قیامگاہ کا پتہ نہ چلے۔

قسمت کا پلٹا دیکھئے کہ جب اُس کی موت کا وقت آتا ہے، تو خود اس کا بھائی دورانِ سفر میں اُس کو قتل کرتا ہے، وہ موت کا شکار ہوتا ہے۔ دیکھتا ہے مگر دنیا کی کوئی طاقت اس کو بچا نہیں سکتی۔ انسان کی زندگی کیا ہے، پانی کا ایک بلبلہ ہے۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا، اور غائب۔ سچ ہے اور بالکل سچ کہا ہے کہ "اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ"

بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ اُس نے اپنے والد کی موت پر وہ وہ کام کئے کہ اگر انھیں مجنونانہ انداز سے تعبیر کریں تو بیجا نہ ہوگا۔

بادشاہ مقتول نے اپنی موت سے پہلے زمین کے نیچے ایک بہت بڑا تہ خانہ بنایا تھا۔ عام ہیئت بالکل زمین کی طرح تھے۔ یعنی کہیں پہاڑ اور کہیں دریا بنائے تھے۔ چھت آسمان کی طرح بالکل نیلے رنگ کی بنائی تھی، اور اُس میں ایک ترکیب سے ستارے ٹنکے تھے۔ جن میں قدرتی ستاروں کی طرح چمک دمک موجود تھی۔ کہیں کہیں موم بتیاں نصب کی گئی تھیں۔ سنا ہے ان کی روشنی سو برس کے لئے کافی تھی۔

بادشاہ کے جانشین نے کافی مال و زر بادشاہ مرحوم کے ساتھ قبر میں دفن کیا، اور اپنے والد مرحوم کی روح کو خوش کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

ہاں ایک تعجب انگیز بات رہ گئی۔ وہ یہ کہ جب بھی کوئی آدمی اس تہ خانے کے اندر جاتا۔ اُس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ اس مصلحت سے کہ اس کا راز کسی پر افشا نہ ہو۔ یہ دیوارِ چین کی مختصر داستان تھی جو کہ آج دنیا کے لئے عبرت ہے۔

الطاف مشہدی کی شاعری پر ایک نظر

خلیق قریشی، منشی فاضل، لائلپور

شاعری فی الاصل " دل کا غم" دل کی زبان " سے بیان کرنے کا نام ہے۔
جسے قدرت اس قوت سے متصف کرے وہ "شاعر" کے نام سے پکارا جاتا ہے، اور چونکہ شاعر دل کی کیفیات کا ترجمان ہوتا ہے، اس لئے اُسے عام آدمیوں سے عزت وقار اور تعظیم کے مدارج میں مختص کر لیا جاتا ہے۔ کسی قوم کے تمدن، اخلاق اور ادب کے ارتقا میں شاعر کی مساعی کو بہت زیادہ دخل ہے، بلکہ بیشتر شاعر اس تعمیر کا معمار ہوتا ہے، اور اس کا کلام وہ بنیادیں ہیں جن پر قومیت کا عظیم الشان قصر تعمیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انہی اثرات کے زیرِ نظر حضرتِ جوش ملیح آبادی فرماتے ہیں کہ "شاعر اپنی صدی کی بہترین تصنیف ہے" شاعر کا کلام اپنے زمانے کا بہترین آئینہ ہوتا ہے جس میں دنیا اور واقعاتِ عالم کا انعکاس پوری آب وتاب سے چمکتا ہے، اور حقیقت بین آنکھ اُس آئینہ میں سے "تاریخِ عالم" اور "تعمیرِ آدم" کے مآخذ کا تجزیہ کرسکتی ہے۔

اس کے علاوہ شاعری بذاتِ خود تخیلات اور احساسات کی زبان ہوتی ہے۔ چنانچہ ہزلٹ کا مقولہ ہے کہ "شاعری تخیل وجذبات کی زبان ہے" بظاہر تو یہ ایک چھوٹا سا جملہ ہے۔ لیکن معنوی اعتبار سے اس کی جامعیت میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ چار لفظوں کا مجموعہ ایک ایسا بلیغ جملہ ہے جسے شاعری کی تشریح، پر حاوی سمجھنا چاہیئے، کیونکہ الفاظ جب جذبات اور تخیلات کے ترجمان بن کر شعر کی صورت میں شاعر کی زبان سے نکلتے ہیں، تو وہ واقعتہً سامع کے دل پر نقش ہو جاتے ہیں، اور یہی شاعری کی جامع تعریف ہے۔

ابتدائے آفرینش سے لے کر انسان اپنی گوناگوں قوتوں کی وجہ سے ممتاز اور ممیز رہا ہے۔ انسانی فکر کی بلندیٔ پرواز سے ہزارہا اختراعات کتمِ عدم سے عالمِ وجود میں آئیں۔ لاکھوں محیر العقول کارنامے انسانی دست وبازو کے مرہونِ احسان ہوئے اور کروڑوں ایجادات نے ذہنِ آدم کے لامحدود تفوق پر مہرِ تصدیق ثبت کی۔ علی الخصوص عہدِ حاضرہ، دماغِ انسانی، کی جولانیوں کا اکمل مرقع ہے۔ آج عناصر آدمی کے غلام ہیں، بے پر وبال انسان نہایت شان وشوکت سے ہوا میں پرواز کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ سمندروں کے سینوں کو چیرتا ہوا اُن کی اتھاہ گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے۔ دقتِ نظری اور بلوغ فکری کا یہ عالم ہے کہ بیلوں، پتیوں اور پھولوں کی ہیئتِ کیمیائی و ترکیبی معلوم کی جاتی ہے۔ مگر بالآخر ایک نقطہ ایسا آجاتا ہے جہاں سائنس اور فلسفہ کی کوششیں لاحاصل اور بے سود نظر آتی ہیں۔ ایک سائنسداں یہ دیکھ سکتا ہے کہ پھول کی تخلیق اور اُسکی تدریجی نشو ونما میں کون کون سی قوتیں کام کرتی ہیں؟ فلسفی مادہ اور ترکیبِ عالم پر سیر حاصل بحث کرسکتا ہے، لیکن گل کی نکہت اور بہارِ عالم کی دلآویزی کو محسوس کرنا یا اُس سے محظوظ ہونا یہ سائنسداں اور فلسفی کے بس کا روگ نہیں۔ اس منزل پر عقلِ انسانی، اور ادراکِ بشری کو رُک جانا ہوتا ہے، اس سے آگے لامکاں کی منزلوں میں قدرت کے اندرونِ دل میں جانے کے لئے، "شوقِ فضول وجرأتِ رندانہ" چاہیئے۔ جو شاعر میں مضمر ہوتی ہے۔ اگر سائنس اور فلسفہ ہمیں صفحۂ عالم کے نقوشِ ظاہری کو دیکھنے میں مدد دیتا ہے۔ تو شاعری

ہماری توجہ کو بزمِ عالم کی اصل خوبصورتی کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ چنانچہ ایک پتے کی رنگت، پھول کی نکہت اور نزاکت، پھل کی لطافت، حسین اور متبسم چہرہ کی ملاحت، یہ سب ایسی چیزیں ہیں، جو دماغ کی آنکھ سے نہیں بلکہ دل کی آنکھ سے دیکھی جاتی ہیں۔ یہی دنیا ہے، جہاں شاعر اور صرف شاعر پہنچ سکتا ہے، اور حقیقت یہ ہو کہ جہاں مباحثِ علمی۔ اور تحقیقِ فلسفہ و سائنس میں دماغ کی کامرانی ہے۔ وہاں "غم و الم، عشق و محبت، سرور و انبساط کے لطیف جذبات محض شاعری کے ذریعہ ظاہر ہو سکتے ہیں۔"

چنانچہ انہی امور کے ماتحت میں قائدِ شباب جناب الطافِ مشہدی کے کلام پر دو نظریوں کے تحت روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

الف :۔ شاعر کی تخئیلی اور جذباتی دنیا۔

ب :۔ شاعر کی قومی اور وطنی شاعری۔

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ شاعر جو کچھ کہتا ہے۔ واقعی جذبات سے متاثر ہو کر کہتا ہے۔ یا تقلید۔ اور تتبع ہی میں اپنا "فرض" پورا کر رہا ہے۔ دورِ حاضرہ میں "غزل" کے خلاف بہت کچھ کہا جاتا ہے، اور چونکہ قومی انحطاط انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔ اس لئے لوگ عموماً "جذباتی شاعر" کے نہیں بلکہ "عملی پیغمبر" کے منتظر ہیں۔ لیکن بایں‌ہمہ غزل ہی ایک ایسی چیز ہے، جو رُوحِ انسانی کے آخری اور خوابیدہ تاروں کو لرزا دیتی ہے، جو حسیاتِ لطیفہ کو بیدار کرتی ہے، جو دل کو برماتی ہے، اور روح کو تڑپاتی ہے، اس کے علاوہ اساتذہ اور متقدمین نے اِس میدان میں وہ وہ جولانیاں دکھائی ہیں کہ کسی نوجوان شاعر کا اس پامال زمین میں قدم رکھنا بظاہر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور نظر آتا ہے۔ مگر جو طبیعتیں فطرۃً بیدار اور حساس جذبات کی مالک ہوں وہ لازماً اس میدان میں رخشِ طبع کو دوڑاتی ہیں۔ چنانچہ ہمارے نوجوان شاعر حضرتِ الطاف مشہدی بھی غزلیں کہتے ہیں، اور اُن کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جذبات و احساسات کا ایک مواج دریا ہے جو شاعر کے قلم سے اشعار کی صورت میں بہے چلا جاتا ہے۔ شوخی بے ساختگی، عشق کی خودداریاں، جو ان عشق کے لوازم لابدی ہیں، جو الطاف صاحب کے کلام میں بدرجۂ اُتم موجود ہیں۔

شاعر حقیقت میں "بہت کچھ" ہی نہیں "سبھی کچھ" ہے، اور اپنی ان قوتوں کا اُسے احساس بھی ہے۔ چنانچہ الطاف صاحب کہتے ہیں ؎

نظر میں تڑپتے ہیں جلوے ہزاروں   میں چاہوں تو ہر کوہ کو طور کر دوں

اور ہماری دنیا وسیع تر سہی، لیکن شاعر کی نگاہیں نہ صرف اس دنیا کو محصور کئے ہوئے ہیں۔ بلکہ ایک علیحدہ عالم بنا رہی ہیں۔ مگر اُن کا تمام جوشِ عمل "اُن" تک محدود ہے۔ ان بلند بانگ دعاوی کے بعد منتہائے مقصود کو ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں ؎

بتا کر تہیں دل کی شانِ محبت   ابھی پیار کرنے پہ مجبور کر دوں!

محبت کی شان، اور اُس کے نتیجے میں یہ بے ساختہ "خود اعتمادی" شاعری کی منزل کو بہت رفیع کر رہی ہے، ہاں اُس شاعری کو جس کا عشق سطحی اور خاکی ہوتا تھا، ایک اور جگہ فرماتے ہیں، اور خوب فرماتے ہیں ؎

گرمیٔ بازارِ محشر ہے ہمارے جنگ میں   محفلِ عالم کو تڑپائیں گے اپنے رنگ میں

واقعی "شاعر" کی ہستی سے سبھی کچھ ممکن ہے۔ شاعر قوم کا دیدۂ بینا، اور زبانِ گویا ہے۔ قوم کا جسم تمام و کمال اُس کے قبضۂ اختیار میں ہے، محفلِ عالم کو جس طرح چاہے تڑپائے اس کے لئے جائز ہے۔

توبہ اور توبہ شکنی، اکثر و بیشتر شعرا کا موضوعِ کلام رہا ہے۔ اساتذہ سے لے کر مبتدیوں تک نے اور متقدمین کے عہد سے لے کر آج تک ہر اُس شخص نے جس پر "شاعر" ہونے کا الزام لگایا گیا، ضرور اِس مضمون پر طبع آزمائی کی، لیکن جس بے ساختگی اور لااُبالیانہ انداز سے الطاف صاحب نے اپنے اکثر اشعار میں اِس مضمون کو نبھایا ہے۔ وہ کچھ انھیں کا حصہ ہے، کہتے ہیں ؎

درِ پیرِ مغاں پر ڈھونڈتا ہوں   مری ٹوٹی ہوئی توبہ کہاں ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض شعرا نے اس مضمون میں کافی وسعتِ خیال اور ندرتِ فکر سے کام لیا ہے۔ لیکن جنابِ الطاف کا یہ شعر بھی واقعۃً پوری کیفیات کا حامل ہے، ٹوٹی ہوئی توبہ کو ڈھونڈھنا اور وہ بھی "درِ پیرِ مغاں پر" اس تجاہلِ شاعرانہ کے صدقے۔

ابتدا سے آج تک سنتے آئے ہیں کہ شاعر اپنے "اُن" سے بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں، اور بعض اوقات مواقع بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر جراٗتِ سخن سکوتِ مطلق اختیار کر جاتی ہے۔ اور پھر بیچارگی کا اعتراف کر دیتے ہیں بعض حضرات اس حقیقتِ نفس الامری کو پہلے ہی پا جاتے ہیں۔ چنانچہ میر تقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

کہتے تو ہو یہ کہتے وہ کہتے جو وہ آتا   سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

مگر الطاف اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے بھی اس بیچارگی کا اعتراف کرتے

ہوئے یہ یقین رکھتے ہیں کہ شاعر کی خاموشی نے وہ سب کچھ اُن سے کہدیا ہے جو کہا جانا چاہیئے تھا ۔ ؎

مجھے کہنا ہے جو کچھ اُن سے الطاف — وہ میری خامشی سے خود عیاں ہے

حُسن کو بے نقاب کرنے میں شاعروں کو بہت سی تکالیف اور مصائب کا خوف دامنگیر رہتا ہے ۔ بجلیاں چمکتی ہیں ۔ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں ، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں ، مگر الطاف کے تاثرات ان سب سے نرالے اور بے نظیر ہیں ۔ اُن کا محبوب اپنی بے حجابی میں دنیا بھر کی تباہی کا سامان نہیں رکھتا ، ہاں اُن کے لئے بہت کچھ رکھتا ہے ۔ کہتے ہیں ؎

حُسن کو بے نقاب کون کرے — دل کی دنیا خراب کون کرے

اہلِ نظر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شاعر کے احساسات کس قدر پاکیزہ اور نازک ہیں ۔ "دل کی دنیا خراب کون کرے" کس قدر صحیح اور واقعاتی کیفیات کا حامل مصرعہ ہے ۔

اور ایک دعا کی شان بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

دعائیں مضطرب ہیں عاشقِ مضطر کی آہوں میں
دعائیں کروٹیں لیتی ہیں شاعر کی نگاہوں میں

آہیں تو اکثر آسمان پر زلزلے بپا کرتی رہی ہیں ، لیکن شاعر کی نگاہوں میں دعاؤں کا کروٹیں لینا ندرتِ خیال کی انتہا ہے ۔

جفاؤں اور وفاؤں کی ماہیت پر شعرائے زمانہ نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں اور کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا ، جو تعریف سے بچا ہو ۔ لیکن ہمارے نوجوان شاعر نے بھی اپنے آزاد رنگ میں اُن کے متعلق ایک شعر کہا ہے ، اور حقیقت ہے کہ کافی کہدیا ہے ۔ ؎

اُن کی مغرور اداؤں کو جفا کہتا ہوں — اپنے گستاخ ارادوں کو وفا کہتا ہوں

اُن کی مغرور ادائیں ہی جفا ہیں ۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو ۔ مگر عشقِ جوان کی وفاؤں کو واقعی گستاخ ارادے کہنا چاہیئے ۔

ایک غزل کے چند اشعار ہیں ۔

وہ آئیں گے ، امید ہے ، بہرِ پرسش — نگاہوں میں اشکوں کی شمعیں جلا دیں
نہ جانے وہ کس راہ سے ہو کے نکلیں — دیارِ محبت میں سجدے بچھا دیں

ہر ایک شعر بجائے خود جامع اور مکمل ہے ۔ علی الخصوص پہلا شعر شاعر کی اُمید اور اُس پر بیکسی کا کتنا صحیح نقشہ ہے ۔ اسی طرح دوسرے شعر کی لطیف کیفیات کا اندازہ کچھ اہلِ دل ہی خوب لگا سکتے ہیں ۔ "دیارِ محبت میں سجدے بچھا دیں" بولتا ہوا مصرع ہے ۔ ؎

وفورِ درد سے جب ہچکیاں سی آنے لگیں — ہر ایک زخم کے لب پر مرا فسانہ تھا

داستانِ محبت کی ہمہ گیری اور رودادِ الفت کی عالم نمائی کا کیا دلفریب لیکن پُر اثر طریقہ ہے ۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے الطاف صاحب ماشاء اللہ ایک نوجوان شاعر ہیں ، اور غزل میں براہِ راست اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ اُن کے اشعار میں ہزار شوخی سہی ۔ لیکن محبت کی تقدیس سے نابلد نہیں ہیں ، اُنھیں اس امر کا خوب احساس ہے ، کہ محبت کی پاکیزگی اہم ترین چیز ہے ، اس پر اُنھیں فخر ہے ۔ اور بجا فخر ہے ، کہتے ہیں ؎

فرشتوں کی فطرت سے پاکیزہ تر ہے — تبسم کسی کا ہماری جوانی

اپنی جوانی اور کسی کے تبسم کی تعریف کتنی لطیف اور عدیم المثال جامعیت کی حامل ہے ۔ اسی غزل کا ایک اور شعر ہے ؎

زباں تھک گئی تو محبت کا قصہ — سنانا پڑا آنسوؤں کی زبانی

واقعی محبت کا قصہ ، زبان اور صرف زبان کی قوتِ بیانیہ کے بس کی بات نہیں ۔ یہ آنسوؤں کی زبان کے ذریعہ ہی اختتام پذیر ہو سکتا ہے ،

پسینہ آ گیا کالی گھٹاؤں کی جبینوں پر !
جواُن شانوں پہ لی زُلفوں نے متوالی سی انگڑائی

کالی گھٹاؤں ، اور زُلفوں ، کا تعلق مشہور اور عام ہے ، مگر اس عام خیال کے اظہار میں بھی جس ندرت اور ارفع تخیل کا اظہار الطاف صاحب نے فرمایا ہے ۔ وہ یقیناً قابلِ صد داد ہے ۔ شعر کیا ہے ۔ الفاظ میں جان بھر دی ہے ۔ "زُلفوں کی متوالی انگڑائی" ——— سبحان اللہ ۔ بے نظیر ٹکڑا ہے اور "کالی گھٹاؤں کی جبینوں پر پسینہ" اپنی خوبصورتیوں کا خود ہی بیان ہے ۔

کلام کی خوبصورتی میں تشبیہہ اور تمثیل کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔ ان سے شاعر کے علوِ تخیل اور عمیق احساس کا پتہ چلتا ہے ، چنانچہ متقدمین کے کلام میں التزاماً ان اصنافِ سخن کو جگہ دی گئی ہے ۔ بلکہ ہر ایک شاعر نے اس میدان میں اپنے ہمعصروں سے گوئے سبقت لے جانے کی کوشش کی ہے ۔ اور دَورِ حاضرہ میں چونکہ ادبِ اردو کے دامن میں ہر ایک خطے اور ہر ایک چمن کے گلہائے شگفتہ سما گئے ہیں ۔ جامِ مشرق میں بادۂ مغرب

بھی موجود ہے۔ لٹریچر کے اختلاط کی وجہ سے خیالات میں ہم آہنگی بھی پیدا ہوگئی ہے۔ اس لئے خیالات کے طریقِ اظہار میں وسعت اور طرزِ تحریر میں جدت متذکرہ امور کا لازمی نتیجہ ہیں۔ چنانچہ عہدِ حاضر کے شعرا کے کلام میں یہ رنگ نہایت نمایاں اور واضح ہے، اب تشبیہات کی دنیا اُنھیں فرسودہ اور کہنہ بناؤں پر آباد نہیں، بلکہ وسعتِ مطالعہ اور اختلاطِ خیالات کی وجہ سے اس چمن میں نئی نئی گلکاریاں کی جاتی ہیں۔ حضرتِ جوش ملیح آبادی۔ جگر مرادآبادی، فانی بدایونی ایسے حضرات کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید شاعری میں تشبیہات و تمثیلات نے بالکل نئے اور نہایت دلآویز طور سے جگہ حاصل کی ہے۔ جناب الطاف نے اس صنفِ سخن میں خوب طبع آزمائی کی ہے۔ اور ایسی ایسی نادر تشبیہیں پیدا کی ہیں کہ شاعر کی قوتِ مشاہدہ کا ہر صاحبِ ذوق کو اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر میں جناب الطاف کے کلام میں سے چند ایک قطعات پیش کرتا ہوں۔ اہلِ نظر اُن کے محاسن کو خود دیکھ لیں گے، میں نہیں چاہتا کہ مزید تشریح کی کوشش میں اُن کی اصل دلآویزی کے ضائع ہونے کا باعث بنوں۔ فرماتے ہیں۔ ؎

سایہ افگن ہے فضا پر آج دیوالی کی شب
جگمگاتے ہیں در و دیوار پر زریں چراغ
رات کے پچھلے پہر جیسے وطن کی یاد سے
مسکراتے ہیں کسی مہجور کے سینے کے داغ

~~~

گا رہی ہے ایک ٹیلے پر کوئی آتش نوا — زمزموں سے پڑ رہی ہیں یوں ہوا میں سلوٹیں
بستر ناکامِ الفت کو دفورِ درد سے — جس طرح کر دیں شکن آلود شب کو کروٹیں

~~~

آ رہی ہیں یادِ غربت میں وطن کی صحبتیں — گر رہے ہیں اشک میری آنکھ سے بے اختیار
دفعتاً جیسے ٹپک پڑتے ہیں چشمِ ابر سے — بجلیوں کے ہاتھ سے گوندھے ہوئے اشکوں کے ہار

دوشیزۂ صحرا کے نغموں سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں ؎

دلنشیں تانوں سے یوں معمور ہے ٹھنڈی ہوا
جیسے کچی نیند میں ہلکی سی بارش کی صدا

اب میں حضرتِ الطاف مشہدی کے کلام کے اُس مخصوص موضوع کی طرف آتا ہوں جس نے اُنھیں عصرِ حاضر کے دوسرے شعراء سے ممیز کیا ہے۔ آج اقصائے عالم میں سرمایہ اور مزدوری کی ایک حشر زا جنگ چھڑی ہوئی ہے، سرمایہ داروں نے ایک ایسا متحدہ محاذ قائم کر لیا ہے جو شب و روز بالواسطہ یا بلاواسطہ مشرق اور مغرب میں غریب اور مزدور کو تباہ و برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ آج دنیا کی ہر طاقت اپنی مخالف اور متحارب قوتوں کو پیس دینے کے لئے کاربیرا ہے ـــ گردشِ افلاک اب صرف ستم رسیدہ عشاق اور غمزدہ مہجوروں کے لئے ہی بلائے جان نہیں۔ بلکہ ہر وہ ہستی جو اپنے البقا اور احیا کے لئے سرگرمِ عمل نہیں، یقیناً زود یا بدیر اس چرخ کے نیچے مٹ جانے والی ہے۔ مغربی ممالک میں چونکہ یہ دونوں قوتیں یعنی سرمایہ داری اور مزدوری بالمقابل اور بلاواسطہ صف آرا تھیں۔ اس لئے اُنھیں جلدی اس اٹل صداقت اور روشن حقیقت کا احساس ہوگیا کہ اگر قومیت اور وطن کے لئے کوئی نئی اور عظیم الشان بنیاد رکھی جا سکتی ہے تو وہ لازماً ان دونوں ہستیوں میں سے ایک ہستی کی تباہ شدہ بنیادوں پر کھڑی کی جا سکے گی، چنانچہ متخاصم ہستیاں میدانِ عمل میں اُتر آئیں، اور اس کا نتیجہ وہ عالمگیر اقتصادی اور مجلسی جنگ ہے جس کے بے پناہ شعلوں سے آج ہر خطہ کے دامنِ امن کو اپنی لپیٹوں میں لے لیا ہے۔ ہندوستان محکوم ملک تھا اسے اپنی تباہی اور سرمایہ داری کی خوفناک تجاویز کا ایک مدت کے بعد علم ہوا، کیونکہ ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

مگر بالآخر ہندوستانِ مظلوم کے خوابیدہ قسمت اور خفتہ بخت انسانوں کو بھی اس تلخ حقیقت کا احساس ہوا کہ سرمایہ دارانہ نظامِ تمدن کا قیام محض غریبوں کی شکستہ ہڈیوں کی بنیادوں پر ہی ہو سکتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بے کس انسان نے فرطِ الم اور کثرتِ رنج سے دردناک چیخ ماری، اور ہندوستان بھر کے غربت کدوں سے الاماں، الاماں، کی صدائیں بلند ہونی شروع ہوگئیں، مزدور کے اس درد سے تلملانے والا کون شخص تھا، ہاں! یہ وہ انسان تھا، جس کے دل میں قدرت نے سارے جہاں کا درد" مضمر کیا ہوا ہے ـــ اور وہ شاعر ہے۔ شاعر کی دُوربیں اور حقیقت شناس نگاہوں پر سب سے پہلے یہ صداقت واضح ہوئی، اور اُس نے بیتاب ہو کر اپنے مظلوم لیکن بے حس بھائیوں کو جھنجھوڑنا شروع کیا چنانچہ نوجوان شعراء کا ایک طبقہ قدرت نے ایسا

پیدا کر دیا جس کے ہاتھوں شاید مزدور کی تباہ قسمت کا احیا خدائے تعالیٰ کو منظور ہے۔ ان شاعروں نے مزدوروں کی بے نوا زندگی کا تجزیہ کیا، اور دنیا کے سامنے اُن مناظر کو پیش کیا۔ اُن واقعات کا اعادہ کیا، جن کے ذریعے سے سرمایہ دار اپنی بے پناہ اور ہمہ گیر قوتوں سے غریبوں کی خانماں خراب بنیادوں پر اپنے محلوں کی تعمیر کر رہے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ یہ تمام شاعر سرست نوجوان ہی نہیں، بلکہ اُن میں سے اکثر و بیشتر شعرا رئیس ابنِ رئیس ہیں، اس ضمن میں اگر حضرتِ جوش ملیح آبادی کا اسم گرامی پیش کیا جا سکتا ہے تو پنجاب کے مایۂ ناز نوجوان شاعر حضرتِ الطاف مشہدی بھی خاندانی رئیس اور ایک مرفہ الحال سادات کنبہ کے رکن ہیں۔ بلند معاشرتی اور مجلسی حیثیت کے مالک ہیں۔ اس کے باوجود اُنھوں نے مزدور اور غریب کی زندگی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ کچھ اس درجہ حقائق پر مبنی ہے کہ شاعر کی قوتِ احساس اور مشاہدہ کی داد دینا پڑتی ہے۔

"شریکِ زندگی کے نام آخری پیغام" آپ کی ایک نظم ہے۔ ابتدا ہی میں بیمار شوہر کی غریب الوطنی اور بے چارگی کا نقشہ کچھ اس دردانگیز انداز سے کھینچتے ہیں کہ پڑھنے والا بے قرار ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اے شریکِ زندگی، اے واقفِ رنج و الم
آج وہ شوہر ترا غربت میں ہے وقفِ ستم
جس کے تلووں کو گلوں کی پتیاں زخمی کریں
ریشمی بستر کی جس کو سلوٹیں سونے نہ دیں
آج وہ بیکس زمانے کا گلہ کرتا ہوا
جا رہا ہے سوئے منزل سسکیاں بھرتا ہوا

اس کے بعد آپ بہارِ عالم کی خزاں انجامی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

تجھ کو تیری "کمسنی میں بیوگی" کا واسطہ
بیکسی کا واسطہ، بیچارگی کا واسطہ
حسن کی معصوم آہوں کی قسم دیتا ہوں میں
عشق کی پُر ہول راہوں کی قسم دیتا ہوں میں
بھول جانا مجھ کو بس یہ آخری پیغام ہے
اس حیاتِ چند روزہ کا یہی انجام ہے

یہ کتابِ ہستیٔ فانی کی اک تفسیر ہے
خواب جو دیکھا ہے میں نے اسکی یہ تعبیر ہے

شاعری اور مصوری ادبِ لطیف کی اہم ترین علمبردار ہیں۔ شاعر کا مقام نسبتہً بلند ہے، وہ الفاظ میں رنگ ہی نہیں، جان پیدا کرتا ہے، الفاظ کی ترکیب اور بندش ہی سے وہ کام لیتا ہے کہ دل و دماغ مناظر و مشاہد سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ حضرتِ الطاف کے کلام میں یہ خصوصیت ہے کہ واقعہ اور منظر کو اس دلآویز طور پر پیش کرتے ہیں کہ سننے والا بے اختیار ہو جاتا ہے، آپ کی ایک بڑی مشہور نظم "وصیت" ہے۔ نظم میں کیسے کہوں، اور اس کے علاوہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا، شاعرانہ لوازمات کے لحاظ سے ایک "اکمل نظم" ہے۔ واقعاتی اور عملی دنیا میں "کوسِ رحیل" جو پکار پکار کر اہلِ کارواں کو دعوت دے رہی ہے کہ زندگی اور اس کا حظ مسلسل حرکت اور پیہم عمل کا نام ہے۔ الطاف صاحب نے اس نظم میں سرمایہ دار کے عفریت منظر چہرہ سے اس طرح نقاب کشائی کی ہے کہ سرمایہ داری اپنی پوری نفرت آفریں اور کراہت خیز شکل میں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے، اس کے علاوہ مزدوری اور غربت، بے چارگی اور بے کسی کی ترجمانی کرنے کا حق بھی کامل طور پر ادا کیا ہے۔ نظم میں ایک مزدور کے گھر اُس کی تصویر کا نقشہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ؎

چشمِ عبرت! آ دکھاؤں میں تجھے وہ سرزمیں
چومتی ہے جس کی چوکھٹ کو فرشتوں کی جبیں
خشک ٹکڑا بھی جہاں مزدور کو حاصل نہیں
ہے لہو سے جس کے رنگیں اہلِ زر کی آستیں
آہ! یہ اُس شیر دل مزدور کی تصویر ہے
جس کے ہاتھوں رحمتوں کے باب کی زنجیر ہے

دنیائے عمل میں مزدور کی اس سے جامع تعریف کیا ہو سکتی ہے؟ "جس کے ہاتھوں رحمتوں کے باب کی زنجیر ہے"۔ اس کے بعد غریب الوطن مزدور کی بیوی کو بستر علالت پر دکھایا گیا ہے۔ ؎

موسمِ سرما کی شب سہمی ہوئی ہے کائنات
سو رہا ہے خامشی کی گود میں سازِ حیات
اک جمیلہ جس کا شوہر گھر سے کوسوں دور ہے
اپنے بیکس لاڈلوں کو دیکھ کر رنجور ہے
چہرہ افسردہ تنِ نازک علالت کا شکار
دم لبوں پر اور آنکھوں میں کسی کا انتظار
مشعلِ راہِ عدم ہیں سینۂ بریاں کے داغ
ہچکیوں پر آ رہا ہے زیست کا دھندلا چراغ

اس کے غم انگیز واقعات بیان کرتے ہوئے "مزدور جمیلہ کی وصیت" تحریر فرماتے ہیں جو اشعار کے پردے میں مظالم کی زندہ تفسیر ہے۔ جمیلہ کی زبان سے سرمایہ اور غربت کی روح فرسا باہم آویزی بیان کی گئی ہے، اور دلِ مزدور کی جس طرح ترجمانی کی گئی ہے وہ کچھ الطاف صاحب ہی کا حصہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اے ہوا اے تیرگی بخت، اے پرغم فضا
جب سنبھالیں ہوش یہ معصوم دل نامِ خدا
ان سے کہنا کر گئی ہے یہ وصیت ماں تمہیں
اہلِ دولت نے ملایا خاکِ ذلت میں ہمیں

زورِ بازو سے بدل دو گردشِ ایام کو
نوچ لو زرِ لعنت میں لپٹے ہوئے اصنام کو

کھینچ لو ان معصیت کاروں کی بینائی کا نور　　توڑ کر رکھ دو زر و دولت کے بندوں کا غرور
ٹھوکروں سے سیم و زر کے بُت ملا دو خاک میں　　تب مسرت کی چمک ہو دیدۂ نمناک میں
کہنے پائی تھی یہیں تک وہ کہ شمعِ زندگی　　موت کے سموم جھونکوں سے اُلجھ کر رہ گئی

بہت طویل نظم ہے۔ میں اسے یہیں ختم کرتا ہوں۔

شاعر فطرۃً آزاد ہے، اور مادرِ وطن کو آزاد دیکھنے کا آرزومند۔ اُس کی تلوار اُس کے نغمے ہیں۔ جو مردہ اجسام میں روحِ حیات پھونک دیتے ہیں۔ الطاف ہندی مزدور اور محکوم کو دعوت دیتے ہیں کہ ؎

ہوش میں آ! توڑ کر رکھ دے غلامی کی کمند　　ڈال آزادی کے میداں میں ترقی کا سمند
آ، بدل دیں اُٹھ کے ہندی کی غلامانہ روش　　آ کچل دیں زر کے بندوں کو کہ مٹ جائے خلش
آ، کہ سفاکانہ فطرت ہی کو کر دیں ختم آج
آ، کہ دنیا سے مٹا ڈالیں جفاؤں کا رواج

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

یہی ہوگا نتیجہ بے کسوں کی آہ و زاری کا　　کہ ٹکڑے ہو کے رہ جائے گا بُت سرمایہ داری کا

ماتمی جلوس دیکھتے ہیں۔ دل کے غم و اندوہ کے ساتھ ساتھ اُسوۂ حسین علیہ السلام پیشِ نظر ہے۔ مسلمانوں کی بے حسی اور ریاکاری کو دیکھ کر تڑپ اُٹھتے ہیں۔ برملا کہتے ہیں ؎

لب پر حسینؑ! طوقِ غلامی گلے کی زیب　　اسلامیو! خدا کو بھی دینے لگے فریب؟
مذہب تمہارا خام ہے، ایمان خام تر　　رونا تمہیں حرام ہے، ہنسنا حرام تر

"شاعری جزویست از پیغمبری" صحیح نہیں اتنی ہے۔ چنانچہ الطاف خود ایک نظم "تعارف" میں تحریر فرماتے ہیں۔ ؎

ہنسنے والے عظمتِ شاعر سے تو واقف نہیں: تیری آنکھوں میں جھجی یہ تمکنت ہے بالیقیں
میری تحریروں میں بجلی آگ کا طوفان ہے　　زر کے بندوں کے لئے جو موت کا سامان ہے
طور کا جوبن مرے افکار کی قندیل میں　　قدسیوں کا رقص میری محفلِ تخئیل میں!
معصیت زادے! تکبر کو ترے توڑوں گا میں　　ٹھوکروں سے سیم و زر کے بت کا سر پھوڑوں گا میں!

اس نوجوانی ہی میں، الطاف کے کلام کو مقبولیتِ عام کے بلند مدارج حاصل ہو چکے ہیں۔ چنانچہ مدت سے ملک کے ممتاز جرائد، شاہکار۔ زمانہ، کلیم معارف، رومان، ہمایوں، ادبِ لطیف میں اُن کا کلام ہمیشہ التزام سے شائع ہوتا ہے۔

مجھے علمِ عروض، اور اُس کے نظریات میں اپنی ہمایگی اور بیچارگی کا کماحقہ احساس ہے، اور معترف ہوں کہ جنابِ الطاف کا کلام میں نے تنقید کی اس روشنی میں دیکھنے سے پہلو تہی کی ہے۔ مگر یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جو پیغام پنجاب کا نوجوان شاعر اپنے اشعار میں ہمیں دے رہا ہے، اُس پر قومیت اور وطنیت کی بلندترین عمارات کو قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور وقت آنے والا ہے کہ الطاف کا کلام نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ ہوگا جس کی روشنی میں ملک اپنے پاکیزہ مقاصد اور منازلِ مقصود تک پہونچ سکے گا۔

انتظار

جس طرح اے حُسنِ خوبی نبضِ کاہ و روحِ کوہ　　روز و شب اک لرزشِ پیہم سے رہتے ہیں دوچار
کاہ کے دل میں مچلتا ہے بفکرِ رنگ و بُو　　تابشِ خورشید و موجِ بادوباراں کا شرار
کوہ میں فرطِ خوشی سے ناتراشیدہ صنم　　ڈھونڈتے ہیں بُت تراشوں کی نظر دیوانہ وار!
یُوں ہیں میرے مضمحل جوہر، مرے افسردہ عزم
تیرے ہلکے سے تبسّم کے لئے ہیں بے قرار!

جوشؔ

مرزا محمد اشرف تاتاری

معنون بہ نامِ نامی مخلص محب سید محمود علی طرزی

ستی مرکب ہے، ست اور آتی سے۔ ست سے مراد ساتھ اور آتی سے مراد یہ یا اس کی۔

گویا ستی ہونے والی یہ کہتی ہے کہ یہ میری محبت کا مرکز۔ میری زندگی کا ملجا و ماوا۔ میرے تخیل کا مسکن۔ صرف یہ رہا ہے اور یہ میرے ساتھ اور میں اس کے ساتھ ابدالآباد تک رہیں گے۔

"ستی سچی محبت کی یادگار ہے"

اس کے بعد زمانے نے اس کو خود غرضی سے جاری رکھا۔ عورت نرم دل اور محبت والی ہستی ہے۔ عورت کو اکثر سچی اور ناقابلِ برداشت محبت ہوا کرتی ہے۔

عورت کو قدرت نے جو مادہ سچی اور مستحکم محبت کا دیا ہے وہ مردوں میں کم پایا جاتا ہے۔

عورت محبت کی بھوکی۔ محبت کرنے والی۔ محبت کی غلام اور سب کچھ یہاں تک کہ خود اپنے کو محبت کی خاطر فنا کر دینے والی ہے۔

جب سے "ستی" کی رسم جاری ہوئی آج تک کبھی نہیں سنا کہ مرد بھی اپنی اُس لطیف ہستی کے ساتھ جسے وہ نہ صرف ہر چیز سے بلکہ خود اپنے سے اعلیٰ اور برتر کہتا رہا ہے۔ "ستی ہوا ہو"

محبت کے انتہائی شریف جذبے سے متاثر ہو کر بہت سی پاکبازانِ محبت نے اپنے کو اپنے محبوب کے ساتھ ختم کر دیا ہے۔ مگر۔ اس کے بعد اس شریف جذبے کو خود غرض مردوں نے رسم بنا لیا۔

اس رسم کی تکمیل کے ساتھ ایک طرف تو اپنی اور اپنے خاندان کی فرضی عزت وابستہ تھی، اور دوسری طرف مظلوم بیوہ سے نجات پانے کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔

اس رسم کو جبراً بھی ادا کرایا جاتا تھا۔ اگر ادا نہ کی جاتی تھی تو اُس مظلوم کو ایسی حالت۔ ایسی صورت۔ ایسی زندگی اور ایسی طرزِ معاشرت میں رکھا جاتا تھا کہ وہ اور اُس کی دیکھنے والیاں اُس زندگی پر موت کو ترجیح دیتی تھیں۔ شادی اور خوشی کے مواقع پر اُس کی شرکت تو کجا اُس کا نظر پڑ جانا تک منحوس خیال کیا جاتا تھا، ۲۴ گھنٹے صرف ایک وقت اُبلا ہوا کھانا اُس کو دیا جاتا تھا، کسی خوشی کا خیال کیسا، ہنسنا تک اُس کے واسطے ممنوع تھا، بال جو عورت کی محبوب زینت ہوتے ہیں۔ جڑ سے کاٹ دیئے جاتے تھے۔ موٹے جھوٹے معمولی ایک دو کپڑے سال بھر کے لئے اُس کو دیدیئے جاتے تھے کہ خود دھو کر پہن لیا کرے۔ کسی بچے کو اُس کے پاس جانے کی اجازت نہ ہوتی کہ ایسا نہ ہو کہ اُس کی بُری قسمت کا پرتو اس بچے کی آئندہ زندگی کو تباہ کر ڈالے۔

اس طرح اس کی دیکھنے والیاں اس زندگی سے خوف کھاتیں، اور وقت پر ستی ہو جانا بہتر جانتیں۔

الغرض ستی کا شریف جذبہ رفتہ رفتہ خالص محبت کے اظہار سے

کوسوں دور ہو گیا، اور خود غرضی کی شکار گاہ بن کر رہ گیا۔

شہنشاہِ اکبر نے اس رسم کو ایک حد تک روکا، اس کے بعد برٹش گورنمنٹ نے اس کو قانوناً بند کر دیا۔ اچھا کیا، اور بہت اچھا کیا۔ کیونکہ یہ فعل اب جذبۂ محبت کا فعل شاذ ہی رہ گیا تھا، ورنہ مجبوری کا فعل تھا۔ مگر اچھی چیز فنا نہیں ہو سکتی۔ اُس پر چاہے کتنا ہی گرد و غبار یا خود غرضی کی کیچڑ ڈال دی جاوے مگر کبھی نہ کبھی جب صحیح جذبات کا زور ہوتا ہے تو نمایاں ہو ہی جاتی ہے۔

کلکتہ میں ۲۰ یا ۲۱ مئی ۳۴ء کا واقعہ محبت کے دربار میں زرّیں کرسی پر ہمیشہ رونق افروز نظر آیا کرے گا۔ اس خیال سے کہ پسماندگان کے اخلاقی نقطۂ نظر سے اُن کے نام لینا مناسب نہیں، نام اور جگہ بدل کر واقعہ من و عن لکھا جاتا ہے۔ رامیش کی بیوی رام دیوی کا واقعہ بھلایا نہیں جا سکتا۔

رامیش چندر، ڈھاکے کا رہنے والا ایف اے پاس پولیس میں بھرتی ہو گیا، ۲۶ سال کی عمر تھی کہ راما (راما دیبی) سے جس کی عمر ۲۰ سال تھی شادی ہو گئی۔ راما کی تعلیم یوں تو زیادہ نہ تھی مگر گھر کے کام کاج خط پتّر لکھنے، اخبار، قصہ، کہانی کی کتابیں پڑھ لینے کے لئے کافی تھی، فسانہ اکثر پڑھتی، اُس میں سعدی اور حافظ کے اشعار کا ترجمہ پڑھا، ان کا چسکہ لگا اور بنگلے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اُن کے کلام کا ترجمہ پڑھتی اور لطف لیتی۔

شادی کے بارے میں اُس کا تخیل اُس زندگی کا تھا جس کی فضا میں اُس کا خیالی شوہر اُس کے خیالات کی ترجمانی کرے، جو خیالات اور جذبات اُس کی موجودگی اور عدم موجودگی میں پیدا ہوں وہ اُن کا ذکر کیا کرے۔ رامیش کا زمانہ ابتدائی زندگی میں ذرا عاشقانہ گزرا تھا، اُس کے دوستوں میں ہری شنکر، یعقوب علی اور رام لال خصوصیت رکھتے تھے، ان تینوں کی رنگین طبیعت نے رامیش کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا اور ان چاروں کی محبت کا اصلی رنگ جب یہ سب جمع ہوتے تب معلوم ہوتا۔

رامیش ایک فرم میں اُس وقت نوکر تھا اور ایک جگہ پڑھایا کرتا اس طرح اسّی روپیہ کے قریب کما لیتا، اور اس ظاہری محبت کی ٹیپ ٹاپ میں خرچ کر دیتا۔

رامیش کی قسمت اچھی تھی کہ وہ اپنی داشتہ پر ہر طرح اعتبار کرتا تھا اور اُس کو وفا کا پتلا اور خلوص کا مجسمہ جانتا تھا۔ مختصر یہ کہ ایک دن اُس نے جب وہ خلاف وقت کمرے پر چلا گیا، اور اپنے ایک دوست کے ساتھ اپنی داشتہ کو مصروفِ اختلاط دیکھ لیا۔ اُٹھتی جوانی، جوانی کا غرور۔ اس پر ہر طرح کا اعتبار، اس واقعے سے رامیش پر بہت اثر ہوا، اور عورتوں کی طرف سے بدظن ہو گیا۔

مگر اُس کے بعض مخلص احباب نے سمجھایا اور کہا کہ وہ اپنی بیوی سے محبت کرے۔ رامیش کا وہاں اُس کی امید کے خلاف خیر مقدم ہوا تو اُس کے احساسات میں حرکت ہوئی اور اُسے اب محسوس ہوا کہ اُس کی شریکِ زندگی اور اُس کے بد اخلاقی کے زمانے میں بھی اُس کی ایسی ہی منتظر رہتی تھی جیسی آج ہے۔ اُس کو یاد آیا کہ وہ اگر کبھی رات کو ۲ یا ۴ بجے گھر گیا ہے تو اُس کی بیوی نے ہنس کر اُس کا خیر مقدم کیا ہے، اور بغیر کسی طعن یا شکایت کے اُس کو آرام پہونچایا ہے۔

اُس کو اب خیال ہوا کہ اگر وہ ساری رات گھر سے باہر رہا ہے اور صبح کو خود نادم سا آیا ہے جب بھی اُس کی بیوی خندہ پیشانی سے پیش آئی ہے اور ہر ممکن خدمت کی ہے۔

ان خیالات کا اثر اُس پر روز بروز بڑھتا گیا، اگرچہ مردانہ تکبّر اور شوہرانہ برتری کا یقین اپنے قصور کے بعد بھی ندامت کی مشکل سے اجازت دیا کرتا ہے۔ مگر ایک دن جب وہ پلنگ پر لیٹا ہوا اپنے سلوک اور اس نیک بیوی کے برتاؤ پر غور کر رہا تھا کہ اُس کی بیوی آئی اور یہ کہہ کر کہ "آج آپ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں" پیر دبانے لگی۔

شریف جذبات کا جام لبریز ہو چکا تھا، اُس میں حرکت ہوئی اور چھلک گیا، اُٹھا اور بیوی کو برابر پلنگ پر بٹھایا اور روتی ہوئی آنکھوں سے اُس کو دیکھا، اور ہاتھ جوڑ کر کہا "میری محبت کی دیبی مجھے معاف کر دے۔"

راما: یہ آپ کیا کرتے ہیں، آپ نے میرا کیا قصور کیا، یہ تو میرے کرموں کا پھل تھا کہ اتنے دن اور رات مجھے آپ کے انتظار میں رہنا پڑا۔ آپ تو جو آج ہیں وہی پہلے بھی تھے۔

رامیش۔ نہیں میری دیبی نہیں، میں نے تم پر بہت ظلم کیا ہے۔ آج تمہارا صبر تمہاری محبت مجھے نادم کر رہے ہیں۔

راما۔ اس داسی کی بھی یہی آرزو ہے کہ آپ اپنے چرنوں میں رکھیں،

ہے پرمیشور نیری کریا کرم ان کے ہاتھوں ہو۔

رامیش۔ ایسا نہ کہو۔ تم کون ہو۔ مجھے اب خبر ہوئی گھر کے سونے کو میں نے مٹی میں ڈال رکھا تھا۔ اور نہیں پہچانا تھا۔ رامیش اب تمہارا ہے اور ہمیشہ تمہارا ہی رہے گا۔

راما۔ یہ میرے بھاگ۔ اس سے زیادہ اور کوئی نعمت میرے لئے نہیں ہوسکتی۔

غرض دونوں گلے مل گئے۔

راما کے یوں تو کئی بچے ہوئے۔ مگر زندہ کوئی نہ رہا۔

رامیش پولس میں نوکر ہوگیا تھا، اُس کا تبادلہ مظفرپور میں ہوگیا۔ جہاں کئی سال تک دونوں خوش وخرم رہے۔

رامیش کو ایک دفعہ سرکاری کام سے دور ایک دیہات میں جانا پڑا اور وہاں دس روز رہا۔ پانی وہاں کا بہت خراب تھا، رامیش بخار لے کر آیا، ضروری علاج کیا گیا۔ رامیش کو آرام تو ہوگیا مگر بخار آٹھویں دسویں آہی جاتا تھا۔ اس دوران میں پھر رامیش کو ایک رات دن جنگل میں رہنا پڑا۔ جہاں پانی میں بھیگ گیا، اور سردی لگ گئی۔ اور بخار پھر آنے لگا۔ اس مرتبہ ۲۲ روز برابر بخار رہا اور رامانے ہر ممکن خدمت کی۔ خدا خدا کرکے رامیش کو آرام ہوا اور رامانے کتھا کرائی اور برہمن کھلوائے۔

یوں دیکھنے میں تو رامیش اچھا تھا۔ مگر حرارت اُس کو آتی رہتی تھی اور مہینے میں ایک دو مرتبہ بخار بھی ہوجاتا تھا۔ کمزور بھی ہوگیا تھا، اور بھوک بھی کم ہوگئی تھی۔ مگر کام کی زیادتی کے سبب اُس کو فرصت نہیں ملتی تھی۔

آخر مجبور ہوکر رامیش نے چھٹی لی اور گھر جاکر علاج کیا اور بظاہر ہر طرح اچھا ہوگیا۔ اب رامیش کا تقرر میدنی پور کے قریب ایک قصبے میں ہوا۔ وہاں کی بھی آب وہوا خراب تھی۔ اگرچہ رامانے بہت احتیاط کی۔ اور پانی گرم کرکے پلاتی۔ مگر رامیش اچھا نہیں رہتا۔ اور کوئی نہ کوئی تکلیف محسوس کرتا رہتا تھا، اس طرح دو سال سے زیادہ ہوگئے اور رامیش کم وبیش بیمار ہی رہا کرتا تھا اور جب ذرا زیادہ محنت کام میں کرتا زیادہ بیمار پڑجاتا تھا۔

آخر مجبور ہوکر پھر چھٹی لی اور ڈھاکے جاکر علاج کیا۔ اگرچہ کم وبیش چار مہینے ہوگئے مگر آرام نہوا۔ اور کمزوری بہت زیادہ ہوگئی، سب کی صلاح سے رامیش اور راما اور رامیش کی ماں ایک بہن اور بھائی کلکتے گئے کہ وہاں جاکر علاج کریں۔

راما اگرچہ بیمار نہ تھی۔ مگر بالکل سفید ہوگئی تھی اور ہر لمحہ رامیش کے پاس رہتی۔ اور خدمت کرتی تھی۔

کلکتے میں اگرچہ دو ماہ مختلف علاج کئے۔ مگر مرض میں بجائے کمی زیادتی ہی ہوتی گئی۔

آخر ایک روز کلکتے کے بڑے ڈاکٹروں کو بلایا اور اُن سے مشورہ کیا۔ ڈاکٹروں نے بخوبی اور بغور معائنہ کیا۔ اور متفقاً یہ کہا کہ مریض کا ایک طرف کا پھیپھڑا گل گیا ہے اور دوسرا زخمی ہے۔ علاج کرو اور احتیاط رکھو۔ ممکن ہے کہ آرام ہوجاوے۔ اور ایک نسخہ تجویز کردیا جس کا استعمال کیا گیا، مگر مریض کو فائدہ نہوا۔

پھر ایک ماہ کے بعد دوبارہ اور دو بڑے ڈاکٹر بلائے گئے اور اُنھوں نے بخوبی دیکھ بھال کر مرض کو لاعلاج بتایا، اگرچہ اس کی احتیاط کی گئی کہ ڈاکٹروں کا فیصلہ راما کو نہ معلوم ہو۔ مگر کسی نہ کسی طرح اُس نے بھی سن لیا۔ راما کی حالت خود ہی گری ہوئی تھی اور وہ ہر وقت رامیش کی خدمت کرتی تھی۔ یہ سنکر اُس کی حالت اور بھی خراب ہوگئی۔

راما چند روز چپ چاپ رہی اور کھانا اور سونا اور کم ہوگیا۔ راما کو رات کے کسی حصے میں شوہر سے بات چیت کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

ایک شب جب سب سورہے تھے اور اُس روز رامیش ظاہرا بہت بہتر معلوم ہوتا تھا، بیوی میاں میں اس طرح گفتگو ہوئی۔

راما۔ اس وقت ہم سے چھوٹنے والے سنسار میں مجکو یہ وقت ملا ہے کہ میں تم سے دل کی باتیں کرلوں۔ میرے جسم اور جان کے مالک اس دنیا میں تمہارا میرا ساتھ تو جلد ختم ہوجاوے گا۔ پرمیشر سے ہم دونوں دعا کریں کہ اگلے جنم میں پھر آپ کو اور مجھکو ایک دوسرے سے ملا ہوا رکھے۔

رامیش۔ ہاں مجھے اپنی زندگی کی اب امید بہت کم ہے، میرے بعد میں جانتا ہوں کہ تم کو بہت تکلیف ہوگی۔

راما۔ راما کی زندگی تمہارے ساتھ وابستہ ہے۔ راما اُس وقت کے لئے زندہ نہوگی کہ آپ کو اپنے سامنے جاتے ہوئے دیکھے۔ راما کے مالک راما کی نظر میں فقط آپ ہیں۔ یقین کیجئے کہ راما میں یہ طاقت نہیں کہ اُس وقت کو اپنی نظر سے دیکھ سکے۔ جب آپ اُسے چھوڑ کر جارہے ہوں گے اور

آپ کی واپسی کی مجھے اُمید نہ ہوگی۔

رامیش۔ یہ سب دنیا کا معمول ہے۔ میں اگر تم سے پہلے جا رہا ہوں تو تم میرے بعد آؤ گی۔ میں تمہارا وہاں انتظار کروں گا۔

راما۔ نہیں۔ میرے پربھو۔ یہ نہیں ہوگا، بلکہ میں تم سے پہلے جاؤں گی، اور تمہارا وہاں انتظار کروں گی۔

رامیش۔ ایسا خیال کرنا گناہ ہے اور گناہ کرنے سے ہم دونوں بچھڑ جاویں گے۔

راما۔ پرمیشور دل کا حال جانتے ہیں۔ دل اُنھوں نے دیا ہے، اور اُس دل میں تمہارا دیا (چراغ) جلا دیا ہے، اُس کی روشنی میں میں زندہ ہوں۔ اگر وہ روشنی بجھ جاوے گی تو میں اندھی ہو جاؤں گی۔ تم کو نہیں دیکھ سکوں گی، اور جب تم کو نہیں دیکھ سکوں گی، میرا صبر، میرا قرار، میرے ہوش، میرے حواس کچھ نہ رہیں گے، اور اس طرح رہ کر سانس لینا یا نہ لینا میرے لئے دونوں برابر ہیں۔ میرا دل کمزور ہے۔ میں اتنے بڑے صدمے کی برداشت نہیں کر سکتی۔ (روتے ہوئے) پیارے۔ میرے دل۔ روح! میں نے جو تمہارے قصور کئے ہیں اُن کو معاف کر دیجئے تاکہ اُن کی سزا بھگتنے کے لئے تھوڑے دن بھی میں تم سے الگ نہ رہوں۔

رامیش۔ پیاری راما، یہ کیا کہہ رہی ہو۔

راما۔ پیارے وہی جو میرا دل کہلا رہا ہے۔

رامیش۔ پیاری راما۔ ایسی باتیں نہ کرو جس سے تم کو اور مجھکو تکلیف پہونچے۔

راما۔ آج باوجود آپ کے منع کرنے کے میں اُن جذبات کو جنھوں نے مجھ میں تلاطم برپا کر رکھا ہے، روک نہیں سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ میری اس گفتگو سے صدمہ پہونچے گا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اب کوئی صدمہ آپ کی زندگی پر اس موجودہ مرض سے زیادہ بُرا اثر نہیں کر سکتا۔ بس میرے پیارے اس سے پہلے کہ ہم دونوں اس دنیا میں ایک دوسرے سے الگ ہوں، میرے دل کے احساسات جو آج تک آپ کی محبت اور محبت بھرے برتاؤ سے پرورش پاتے رہے ہیں، اُن کو سنا لینے دو۔ میں نے آپ کو رنجیدہ کیا ہے، دکھ دیا ہے، تکلیف پہونچائی ہے، اور آپ نے اُن کو صبر سے برداشت کیا، اپنی لونڈی، اپنی داسی کی یہ آخری تھوڑی سی محبت بھری تکلیف بھی برداشت کرلو۔

رامیش۔ راما، میری راما، جو تجھے کہنا ہو کہہ لے، کہ تیری آواز محبت بھرے سورگ سے آئے ہوئے میٹھے میٹھے سُر ہوا کرتے ہیں۔ محبت کی دیبی، رامیش کی زندگی، میں بھی اس آخری منزل میں تیرے سُریلے نغموں کے سُننے کا مشتاق ہوں۔ کہو!

راما۔ تمہارے چرنوں میں پرنام کرنے سے پہلے، میں تمہارا سپنا دیکھا کرتی تھی۔ جب میں تنہائی کی راتوں میں اپنے ہونے والے مالک کا تصور کرتی تو مجھے یہ نظر آتا کہ ہرے بھرے جنگل میں جس میں، میں تنہا ہوں اور اپنے پریتم کا انتظار کر رہی ہوں پیچھے سے تم آجاتے اور مجھکو پکڑ کر ستاتے گدگداتے اور اپنی پریم بھری آواز سے مجھے بے چین کر دیا کرتے۔ میں جہاں جاتی تم ساتھ ساتھ رہتے، جہاں کہیں گڑھا یا اونچا نیچا راستہ پڑ جاتا تم مجھے پار کر دیا کرتے۔

تم مجھ سے کہا کرتے کہ میں دل کا گیت گاؤں۔ میں گاتی، تم میری آواز اور الفاظ سے متأثر ہوتے۔ کبھی خود روتے، کبھی مجھے بھی رُلاتے۔ تم جب اپنے کام پر چلے جاتے میں تمہیں دیکھا کرتی۔ دن دن بھر میں پریم کا رس پی پی کر گزار دیتی۔ اور جب تم آجاتے تو ہم تم ساتھ کھانا کھاتے۔ میں تمہارے غصے سے اس طرح ڈرتی جیسے کوئی دیوتاؤں کے جلال سے ڈرتا ہو۔ مگر نہیں، میری پریم کی دنیا! تم نے تو مجھ پر کبھی غصہ ہی نہیں کیا، جب میں تم کو غور سے دیکھتی تم میں اپنے کو دلہن بنے اور ہنستے ہوئے پاتی۔ میں دیکھتی تھی تم اوس ہرے بھرے باغ میں مجھ سے دُور ہو جاتے، اور جب مجھکو بلاتے تو میں دوڑ کر کبھی ٹھیر ٹھیر کر کبھی تیز کبھی آہستہ جاتی۔ تم مجھکو گلے سے لگا لیتے، اور میں اپنے کو تمہارے دل میں پاتی، کیسا اچھا دل۔ کیسے آرام کی جگہ۔ میں اُس نرم نرم بچھونے پر سرور بخش غنودگی میں پڑی رہتی، میں تم میں جذب ہو کر کبھی تم کو اپنے اندر پاتی۔

یہ سب امیدوں کے خواب تھے، میں جب ہوش میں آتی تو ڈرتی گھبراتی، کہ ایسا نہو کہ یہ خواب خواب ہی ہو کر رہ جاویں۔ مگر نہیں۔ میرے پریم جب تم مجھکو لینے آئے تو میرے لئے وہی تحفہ لائے جس کو میں خواب میں دیکھا کرتی تھی۔ تم نے آکر میری تخیل کی زندگی کو عملی بنا دیا۔ دو برس تک تم نے مجھے وہ پریم کے رس بھرے گھونٹ پلائے کہ مجھے ہر چیز میں پریم ہی پریم نظر آنے لگا۔ اور مجھے یہ یقین ہوگیا کہ ہم پریم کی شانت دنیا میں رہتے ہیں،

اور یہ دنیا کبھی بھی ختم ہونے والی نہیں۔ پریم کی دنیا جس میں میں رہتی تھی، مجھے میری ملکیت نظر آنے لگی، اور میں اپنے کو وہاں کی ملکہ جاننے لگی۔ پرماتما کو میرا غرور نہیں بھایا۔ اور مجھے آگاہ کرنے کو تم سے تھوڑے دن کو الگ کر دیا، آپ مجھکو بھول گئے۔ مگر میرے ہردے میں آپ بسے رہے، میں آپ کو اپنے پاس دیکھتی اور آپ سے باتیں کیا کرتی، پھر چونک جاتی اور یہ معلوم ہوتا کہ آپ مجھ سے اوجھل ہوگئے ہیں۔ میں روتی اور پرماتما سے آپ کے آجانے کی منتی کرتی۔ پیت کو من میں بسا کر جب پیتم دور رہا اُس کا مزہ بے چین لطف میں بھی مل گیا۔ میرے مالک جب پھر آپ اس لونڈی کے پاس آئے تو میں نے اپنے میں پہلے سے زیادہ پریم پایا، ہاں سچ ہے خوشی کا مزا رنج کے بعد، ملاپ کا مزا جدا رہنے کے بعد، پریم پریم سے الگ ہوکر پھر اپنے اصلی رنگ میں آجاتے ہیں، اور پھر مجھے سرور اور شانتی ملا کی۔

تمہاری بیماری کو میں بیماری نہیں سمجھی تھی، میں تو یہ جانتی رہی کہ پرماتما دیکھ رہے ہیں کہ میں تم سے کتنا پریم کرتی ہوں۔

جب کلکتے آنے لگے تو مجھے وہم اور وسواس نے ستانا شروع کیا، میرا دل کمزور ہوتا گیا۔ مجھے سانس لینے میں تکلیف ہونے لگی۔ میرے ہاتھ پیر مجھے جواب دینے لگے، اور ہر وقت مجھے خوف رہنے لگا۔ میں یہ کس سے کہتی، آپ کے علاج اور اُس کے نتیجے سے میں مایوس ہوتی گئی۔ میری ماں سپنے میں میرے پاس آئیں اور مجھے بہت تسلی دی اور کہا کہ بیٹا تو رنج نکر تو اور تیرا پتی ساتھ رہیں گے۔"

راما کی امید، میں اس سپنے سے اور گھبرائی اور کچھ نہ سمجھی کہ اب کے جو ڈاکٹر لوگ آئے اور جب جانے لگے تو دروازے کے پاس بھیا سے کہا کہ علاج بیکار ہے اور رامیش بہت سے بہت ایک ہفتے کا مہمان ہے جو مانگے سو دو۔ دوا ہم لکھدیتے ہیں یہ پلاتے رہنا۔

یہ سب میں نے دروازے کے برابر کی کوٹھری میں کھڑے ہوکر سنا۔ میں جانتی تھی کہ ڈاکٹروں سے دروازے کے پاس اصل اصل حال پوچھا کرتے ہیں۔ مجھسے سب نے چھپایا اور کہتے ہیں کہ اچھے ہو جائیں گے۔

میرے سوامی میری سب امیدیں اب ختم ہو گئی ہیں۔ آپ اُس بجھنے والے چراغ کی مانند ہیں جو مجھکو روشنی دے رہا ہے۔ میری زندگی کے چراغ تمہارا دیا (چراغ) بجھ جاوے گا۔ تم جو آج ایسے ہوشیار ہو، یہ مرض کا زور ہے اس کے بعد پھر تم نہیں سنبھلو گے، تمہارا یہ دیا بجھ کر میرے ہردے کو کال کوٹھری بنا دے گا۔ میری روشنی اب بھی کم ہو گئی ہے، اور کم ہو رہی ہے۔ میں اس کم روشنی میں بھی تم کو اپنے سے جدا ہوتے نہیں دیکھ سکوں گی، ماتا نے سچ کہا ہے کہ ہم دونوں ساتھ رہیں گے۔

راما نے اتنا کہا اور رامیش کے پیر پکڑ لئے اور کہا کہ اس اپنی داسی کے گناہ معاف کر دیجے کہ میں آپ سے دور نہ ہو جاؤں، اور پیر دبانے لگی۔

رامیش۔ راما، میری راما۔ میں ضرور مروں گا، اور ہم تم پرلوک میں بھی ساتھ رہیں گے، مگر آج تو میں اچھا ہوں۔ اگر اس طرح اچھا رہا تو جلدی ہم ڈھاکے چلے جائیں گے۔

راما۔ پرماتما کرے کہ آپ جلدی اچھے ہو جاویں۔ مگر ڈاکٹر لوگ بھی پرمیشر سے انسان کی زندگی کا علم لے کر آتے ہیں۔ سب نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے، اور مجھے جو کچھ کرنا ہے اب کر لوں۔ مجھے کرنا ہی کیا ہے، آج رات ان اندھی ہونے والی آنکھوں سے آپ کو جی بھر کے دیکھنا۔ اپنے گناہ اور قصور معاف کرانا، اس کے بعد آپ کا انتظار کرنا، میرے مالک کہو کہ اپنی اس داسی کے قصور معاف کر دئے؟

رامیش، قصور میں نے کئے یا میری راما تو نے، اچھا میں نے بھی کئے اور تو نے بھی۔ میں دل سے اپنے پرمیشر کے سامنے معاف کرتا ہوں اور تو بھی مجھے معاف کر دے۔

راما۔ ایسا نہ کہو، داسی کے مالک، لونڈی کے آقا، اس راما کے حاکم آپ نے جو بھی کیا درست کیا، آپ کو اُس کا حق تھا، آپ مالک تھے، آج بھی ہیں، اور آئندہ بھی ہوں گے، آپ کا کوئی فعل قصور یا شکایت نہیں ہو سکتا، ہاں مجھ داسی کی لغزش، قصور ہو وہ معاف کر دیجے۔

رامیش۔ میں جو بھی تھا یا ہوں اِس کا ذکر نہیں۔ تیری زندگی میں سِیا ہوا میں، اور میری زندگی میں سِی ہوئی تو راما۔ زبان سے کہہ کہ تو نے بھی معاف کیا۔

راما۔ میرے مالک۔ داسی حکم کی بندی ہے۔ آپ کا حکم ہے کہ میں کہوں کہ میں نے بھی معاف کیا، یہ آپ کے حکم، آپ کے اشارے، آپ کی مرضی کی منتظر، آپ کے پریم میں خوش راما، عرض کرتی ہے کہ میرے

سرتاج۔ میری خوشی کے سرچشمے۔ میرے پریم کے سُوتے "معاف کیا معاف کیا"

یہ کہہ کر راما رامیش سے لپٹ جاتی ہے، اور دونوں اس قدر روتے ہیں کہ غشی سی طاری ہو جاتی ہے۔ محبت، سچی محبت، سچے پریم کے جذبات دونوں کے ہونٹوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔

راما یہ کہتے ہوئی کہ میرے رام میں اپنے پریمی رام کا انتظار کرونگی، نیچے بیٹھ جاتی ہے۔

رامیش کی ماں آجاتی ہے اور دیکھتی ہے کہ رامیش کی آنکھیں سُرخ ہیں،

ماں۔ کیوں بیٹا، طبیعت کیسی ہے،

رامیش، اچھی تھی اور اچھی ہے۔

ماں۔ بہو! اب تو صبح ہو رہی ہے، رات بھر جاگی ہو، جاؤ تم بھی ذرا ہاتھ پیر سیدھے کر لو۔

ماتا۔ جو حکم، اُٹھی، رامیش کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا اور چلی گئی۔ دن معمولی طرح گزرتا رہا، دوپہر کا کھانا سب نے کھایا، اور رامیش بھی کل سے بہتر رہا۔

کھانے کے بعد راما آئی، رامیش کے سامنے کھڑی ہوئی، موقع پاکر ہاتھ جوڑے، آنسو آنکھوں سے گرے، اور لبوں سے بوسہ بہ پیغام دیا اور چلی گئی۔

ستی!

تھوڑی دیر کے بعد سامنے کی بند کوٹھری سے دھواں نکلتا نظر آیا۔ سب اوس طرف دوڑ پڑے، معلوم ہوا کہ دروازہ اندر سے بند ہے، دروازہ توڑا تو دیکھا کہ

راما نیم جان پڑی دم توڑ رہی ہے۔ کپڑے سب جل چکے ہیں۔ تیل جو بدن پر جا بجا رہ گیا تھا اب بھی جل رہا ہے۔

بس ایک کہرام مچ گیا، مرتی ہوئی راما کو کپڑا اُڑھایا اور اٹھا کر رامیش کے برابر کمرے میں لے جا رہے تھے کہ رامیش اُٹھ بیٹھا، اور اس ماتم کا سبب پوچھا، پہلے نہ بتایا، پھر مجبوراً بتانا پڑا۔ رامیش مصر ہوا کہ اُس کو ستی ہونے والی کے درشن کرا دو، جب نہ مانے تو ضد کی اور کہا کہ وہ خود گھسکتا ہوا جائے گا۔ مجبوراً دم توڑتی ہوئی راما کو اُس کے پلنگ کے سامنے لا کر رکھ دیا۔

"پریم بھری نگاہیں پریم سے مل گئیں، اور راما نے دم توڑ دیا"

رامیش نے مرنے والی کو غور سے دیکھا، رویا، ایک چیخ ماری، پلنگ پر اُچھلا، راما کے پاس گرا، عزیز و اقربا دوڑے۔

رامیش مر چکا تھا۔

یہ خبر بجلی کی طرح سارے کلکتے میں دوڑ گئی۔

رامیش پولیس سب انسپکٹر ایک نامعلوم ہستی جو کلکتے میں علاج کرانے آئی تھی، اُس کے دروازہ پر شہر کے معززین کا مجمع ہے۔

راما کی لاش کو پوسٹ مارٹم سے معاف کرا لیا گیا۔

ایک ارتھی پر دو لاشیں، ایک دوسرے کے پہلو میں ایک کاندھا دوسرے کے سامنے لئے جا رہی ہیں، جو سنتا ہے ساتھ ہو لیتا ہے۔

گھاٹ پر ہزاروں آدمیوں کا مجمع، سینکڑوں موٹریں، سینکڑوں گاڑیاں کھڑی ہیں۔

دریا کے کنارے صندل کی لکڑیوں میں جلتی ہوئی ارتھی دکھائی دے رہی ہے، جس پر ایک محبت کا شیدائی، دوسری پریم کی دیوانی، شعلوں اور دھویں میں ایک دوسرے سے لپٹے اُڑتے ہوئے دوسری دنیا میں چلے گئے!

نان و ایمان

نان کی مضراب سے ہے وجد میں سازِ حیات نان کی تنویر سے روشن ہے بزمِ کائنات

نان کی قوت سکھاتی ہے جوانی کو غرور نان سے انسان کو آتا ہے جینے کا شعور

نان دیتی ہے ہوا غیرت کی زریں آگ کو رَن کی جانب موڑتی ہے جرأتوں کی باگ کو

نان دیتی ہے سبق قوم و وطن کی چاہ کا نان دیتی ہے پتہ انسانیت کی راہ کا

نان کی صہبا سے ہوتا ہے جوانوں کو سرور مسکرا کر آگ کے دریا کو کرتے ہیں عبور

نان سینوں کو عطا کرتی ہے ایسی زندگی سنسناتی گولیوں کو جس سے ہو شرمندگی

نان سے ہوتی ہیں روشن مشعلیں ایثار کی نان دیتی ہے جوانوں کو خودی تلوار کی

نان ہی رُخ پھیرتی ہے گردشِ افلاک کا حادثاتِ زندگی کی جرأتِ بیباک کا

نان اعضا کو عطا کرتی ہے وہ رنگیں شباب ہو چٹانوں کی صلابت جس کے آگے آب آب

نان دیتی ہے جوانی کو وہ پُرشوکت وقار جس کے آگے دم بخود ہو جائے فطرت کا ستار

الغرض لازم ہے اتنی نان جینے کے لئے
جس قدر ملاح لازم اک سفینے کے لئے

اور ایماں نام ہے اُس قوتِ موہوم کا چھینتی ہے جو متاعِ زندگی معصوم کا!

جو بنا دیتی ہے انسانوں کو اس درجہ حقیر بیچتے ہیں سیم و زر کے چند ٹکڑوں پہ ضمیر

جو چھپا کر پیٹ کے بندوں کو اپنی آڑ میں رات دن رکھتی ہے مزدوروں کے خوں[1] کی تاڑ میں

جو بدل کر راہبر کا روپ دیتی ہے فریب بن کے بجلی پھونکتی ہے خرمنِ صبر و شکیب

جو پہن کر لیڈری کا معصیت آلودہ بھیس بیچتی ہے مغربی زردار کے ہاتھوں میں دیس!

پھانستی ہے جو غریبوں کو خدا کے نام پر پھینک کے الفاظ کے دانے بچھا کر دام پر

چھین لے جو نوجوانوں سے جوانی کا خمار سادہ لوحوں کو بنائے مولویت کا شکار!

سورماؤں سے کرے جو بزدلی کو ہمکنار جو جوانی کی اُمنگوں کو بنائے سوگوار

گردنوں کو جو جھکائے سیم و زر کے پاؤں میں خونِ دہقاں سے نہائے ڈاڑھیوں کی چھاؤں میں!

ایسے ایماں کو ہمارا دُور سے لاکھوں سلام
ہو رہی ہو جس سے اپنی زندگانی تک حرام!

ف ــــ
الطاف مشہدی

[1] مزدور کی کمائی

رفتارِ وقت

خطبۂ صدارت صدر کانگریس

بابو سبھاش چندر بوس کا پریذیڈنشل، بنگالی ذہانت وادبیت، جوانانہ جوش وولولہ، یامردانہ عظمت واستقامت، مجتہدانہ فکر وبصیرت، سیاسی وسیع المشربی وبالغ نظری، "نظربندانہ زودِ سحر" وپختگیٔ نظر، بلاکشانہ دعوتِ ابتلاء واستقبالِ آزمائش، کا اک دلنواز آمیزہ ہے! ہم اس تاریخی نطقِ سیاسی کا ملخص وماحصل، صفحاتِ کلیم پر وطن کے جہادِ آزادی کے آئندہ مورخ کے لئے ثبت کئے دیتے ہیں،

سبھاش بابو نے اپنے انتخاب کو ملک کے نوجوان طبقے کی خدمات کو اک خراجِ تحسین کی پیشکش سے تعبیر کیا، اور دعا کی کہ کاش وہ اس منصبِ بلند کے سنگین وسخت گیر متقضیات سے عہدہ برآ ہوسکیں! اُنھوں نے آغازِ گفتگو شریمتی سروپ رانی نہرو، سر جگدیش چندر بوس، ڈاکٹر سرت چندر چٹرجی، اور شریمتی ہرچند رنا کُلہ منشی (شہید مقاطعہ جوعی) کی وفات حسرت آیات پر قوم کی طرف سے اظہار رووتعزیت کیا۔ متحرالذکر فرزندِ وطن کے متعلق صدر کانگریس کا یہ جملہ کتنا بصیرت افروز اور رقت آور تھا کہ وہ کیسی رحمت مآب حکومت ہے جس کے سایۂ عاطفت میں اس سرزمین کے بہترین دل ودماغ موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں؟!"

اس کے بعد اس "نوجوان ومثلِ پیران پختہ کار" خطیب نے رومتہ الکبریٰ، خلافتِ عظمیٰ عثمانیہ، سلطنتِ مغلیہ، مملکتِ موریا کے عبرت انگیز عروج وغروب کا اک نظارۂ طاہرہ پیش کیا، اور "لایزال ولم یزل" ہونے کا زعمِ باطل رکھنے والی "برٹش ایمپائر" اور اُس کے مداحوں اور مفتونوں کو اک صدائے غفلت شکن رسیدگی! بہ پیرایۂ: ؎

بس کن زکبر وناز کہ دیدست روزگار چینِ قبائے قیصر وتختِ کلاہِ کے!

مقرر نے اب مخصوص طور پر نام نہاد "برطانوی دولتِ مشترکۂ اقوام" کی ساخت بافت کی طرف اپنی نظرِ جائزہ مرکوز کی۔ اُنھوں نے اُس پر

ادارہ

"جہان مِتی کے گھنے" کی پھبتی چُست کی، اور بتایا کہ وہ اس درجہ اک اجتماعِ ضدین واقع ہوئی ہے، نیز اُس کے گرد مشکلات وخطرات کا اک ایسا جانستان حلقہ محاصرہ زن ہے کہ اُس نے مستقبل قریب میں اس "مثیلِ روما ئے عظمیٰ" کے سقوط و انقراض کو اک "تقدیرِ مبرم" بنا دیا ہے! نجات کی تنہا ممکن سبیل یہی ہے کہ برطانیہ اپنے اندرونِ خانہ "سوشیلسٹ" بنجائے، اور سواحلِ انگلستان سے باہر کی وسیع تر حدودِ سلطنت میں "اقوامِ آزاد کا اک رضاکارانہ وفاق" بن جائے! اس صورت میں انگلستان کے طبقہائے امارت وسرمایہ وحرفت کو اپنی فرعونیت وقارونیت کو خیرباد کہنی پڑے گی! سوال یہ ہے کہ "خداوندانِ لندن" اس "ذبحِ عظیم" کی تاب لاسکیں گے؟! ؎

ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے مومن، غمِ مآل کا آغاز دیکھنا!

"پھوٹ ڈالو اور راج کرو" کے سامراجی حربے کے استعمال میں برطانوی قیصریت نے تاریخی طور پر اک عدیم النظیر یدطولیٰ کا ثبوت دیا ہے! تاہم جو موجودہ نقشہ بساطِ شطرنجِ سیاست کا ہے، اُس کی بنا پر اب منظریہ پیش نظر ہے کہ ؎

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا!

ہندوستان میں ہندو ومسلمان، فلسطین میں عرب ویہودی، مصر میں فاروق ووفد، اسپین میں سلیمنکا ومیڈرڈ، یوروپ میں فرانس وجرمنی، مشرقِ بعید میں چین وجاپان، ہندوستانی وفاق میں والیانِ ریاست وعلمبردارانِ کانگریس کی متقابل ومتضادم جماعتوں کے درمیان انتخاب اس کے لئے اک دوگونہ رنج وعذاب بن گیا ہے! اس ہمہ گیر عقدۂ لاینحل کا حل اک معجزہ سے کم ہوگا! بصورتِ دیگر وہ "ہیبِ مملکت گرد بن کر ہوا میں اُڑ جلئے گی جس پر ماشاء اللہ آفتاب غروب نہیں ہوتا"!

آئرلینڈ، بحرالروم، مصر، فلسطین، ہندوستان اور بحیرۂ چین سلطنتِ برطانیہ کے خطرے کے نقاط ہیں! آج قدیم انگلستان کی "مالکہ بحر" کو جدید اٹلی کے "سلیمانِ ہوا" نے اک اندیشۂ غرقابی سے لرزہ براندام کر رکھا ہے!

برطانیہ عظمیٰ کا طلسمِ قوت و ہیبت اک قصۂ ماضی بن رہا ہے !

ہمارا وطن ہندوستان بھی اپنی فرہبیٔ تن اور اپنی ناپید اکنار ۳۵ کروڑ سے بھی متجاوز آبادی سے اپنے ہی لئے اک کمرشکن بارِ عظیم بنا ہوا ہے ! تاہم اگر اِس صحرائے لق و دق کے بیرون از شمار منتشر ذرّے آپس میں متصل و متحد ہو جائیں تو وہ اک بے پناہ "ہمالہ" بنجا سکتا ہے ! انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا ! برطانوی ہندوستان اور "ہندوستانی ہندوستان" کی مصنوعی حدِ فاصل ہمارے سیلابِ عزم سے جلد منہدم ہو جائے گی ! اور ع

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک !

"اقلیتوں کے مسئلے" کا نیشنل کانگریس نے قرار واقعی حل کر دیا ہے، کراچی کا "اعلانِ حقوق" اک شایانِ اعتماد و اطمینان "منشورِ آزادی" ہے ! "فرقہ دارانہ تقسیم نامۂ حقوق" کو کانگریس ہنگامی طور پر گوارا کرتی ہے، لیکن خالص قومی و جمہوری خطوط پر، جملہ فرقہائے متعلقہ کی رائے و رضا سے، وہ اِس داخلی وطنی قضیے کے اک جامع و مانع حل کے لئے برابر کوشاں رہے گی ! مسلمانوں کے معلومہ مسئلے کو اس کی نظر میں قرار واقعی اہمیت حاصل ہے ! بہر حال کانگریس کی طرف سے کسی وطنی اقلیت کے دل میں کوئی واہمۂ خوف نہ رہنا چاہیئے ! بعدِ حصولِ آزادی، مُلک میں جس سوشیلسٹ نظامِ حکومت کا بر روئے کار آنا اغلب نظر آتا ہے، وہ مظلوم و مفلوک الحال اقلیتوں کے لئے اک نعمتِ غیر مترقبہ ہوگا ! اچھوتوں کی مقہوریت اور سوختہ بختی بھی مستقبل قریب میں اک فراموش شدہ خوابِ خوفناک بن جانے والی ہے ! ع

کر و صبر آتا ہے اچھا زمانہ !

معرکۂ حریت کا یہ مخلوط طریقۂ جنگ قرینِ مصلحت معلوم ہوتا ہے کہ حصارِ دفتریت سے الگ رہ کر اک آر پار لڑائی لڑی جائے، اور ساتھ ہی وقتاً فوقتاً قلعۂ حکومت پر عارضی دخل پا پا کر عوام کی، انقلاب کے لئے تربیت و تقویت کی جاتی رہے !

"برطانوی تعلق" کے متعلق یہ ہے کہ ایک دفعہ تو ہماری ضرباتِ حریت طلبی سے یہ ایسا کٹے گا کہ تسمہ لگا نہ رہے گا ! لیکن پھر جب مغرورِ انگلستان کا تنقیۂ دماغ ہو جائے گا تو ہم آئرلینڈ کی طرح اُسے دعوتِ مصالحت و مساوات دیں گے ! سہ

اگر جنگ جوئی، نہ بینی درنگ وگر صلح خواہی، نخواہیم جنگ !

کانگریس ہندوستان کی موجودہ و مستقبل کی سیاسی، تنظیمی، تعمیری، اور مستقل نظم و نسق کی تاریخ کا اک دائم و قائم ادارہ رہے گی ! وہ امریکن کانگریس کا مثنیٰ بنے گی ! تاہم وہ سوویٹ روس کی بالشویک ڈکٹیٹرشپ کی صورت نہ اختیار کرے گی ! اُس کی مسلمہ جمہوریت پسندی اور پارٹیانہ رواداری اِس نشو و نما کے خلاف کافی ضمانت ہوگی۔ بعدِ فتحِ جنگِ آزادی ملک کی ملکیت و حکومت کا بار اُسی کے دوش پر پڑے گا ! وہ صوبوں اور مختلف تمدنی خطوں کی مقامی آزادی اور معلومہ مذہبی فرقوں کے شخصی قانون و آزادیٔ ضمیر کی کافی گنجائش و حاشیۂ حفاظت رکھ کر، اک مضبوط و مربوط مرکزی حکومت قائم کرے گی، ملک کی بیرونی مدافعت کا قرار واقعی بندوبست کرے گی، اک عام روح پرور قومی نظامِ تعلیم کے قیام اور اک مشترک رسم الخط کے اجرا سے، اور ہوائی جہاز، ٹیلیفون، ریڈیو، فلم، اور ٹیلیویژن کے یکسانیت آور آلات و وسائل کی تمام ممکن خدمات سے فائدہ اُٹھا کر سارے ہندوستان کو اک متحد، متفق، یکرنگ، ہم آہنگ، "بنیانٌ مرصوص" میں منقلب کر دیا جائے گا۔

قومی زبان کے متعلق سُبھاش بابو نے فرمایا کہ متعارف "ہندوستانی" نے وطن کی "لسانِ عمومی" کا منصب حاصل کر لیا ہے، اردو اور ہندی اِسی نطقِ قومی کے دو لب و لہجے ہیں، اور فارسی خط اور ناگری اکچھر اُس کے دو مختلف الوضع پیراہن ! تاہم اگر اُردو اور ہندی دونوں کو خیرباد کہہ کر لاطینی رسم الخط کو اختیار کر لیا جائے تو بین الاقوامی بشری تعلیم و تعلم، مبادلۂ خیالات، اور اِک مشترک آفاقی تمدن و ثقافت کی نشو و نما کا وہ بڑا بے بدل آلہ ہوگا ! ترکی کا اقدام اس بارے میں بڑا مجتہدانہ اور دلیرانہ ہے، اور وہ ہم سے داد و تقلید دونوں کا طالب ہے ! لاطینی کی اجنبیت کا عُذر بڑا خود فراموشانہ تسلیم کرنا پڑے گا، اس لئے کہ موجودہ جہالتِ عام کی صورت میں ملک کی جمِّ غفیر آبادی کا سوادِ اعظم خود اردو اور ہندی سے بھی عملاً اُتنا ہی ناواقف ہے جتنا کہ لاطینی سے ناآشنا ! اور اک جدید رسم الخط کی موزونیت و افادیت کا معیار اِنہی عوام الناس کی آسانی یا دشواری ہے۔

ہندوستانِ "جنت نشان" کی آبادی اک بحرِ زخار و دریائے مواج

واقع ہوئی ہے؛ اور ہر ۱۰ سال کے بعد اِس انسانی اوقیانوس میں ۳ کرور نفوس کے اضافے کی "مد" کی موج اُٹھتی رہتی ہے!! مادرِ ہند کی بد نام خواری (و بیماری) کے ساتھ ساتھ یہ "برخورداری" اِک ناقابلِ رشک برکت ہے!

ملک میں مروجہ زمینداری کا نظام فرسودہ، بعداز وقت، اور مصیبت آفرین ہے! زمین اصولاً بچگانِ زمین و خدامِ زمین (کاشتکاروں) کو تفویض کردینا چاہیئے، اور کھیتی باڑی کو ہَل بَیل سے گلوخلاص کراکے علمی و حکمیاتی اصول و وسائل کے سپرد ہو جانا چاہیئے!

وسیع تر اور عمیق تر اقتصادی مسئلۂ ملک کا حل یہ ہونا چاہیئے کہ اِک اعلیٰ فنی کمیشنِ تحقیقات کی قرار واقعی تفتیش و کاوش کے بعد، اِک آل انڈیا اساس پر، قومی حکومت کے اِک ارتقاپسند محکمۂ زراعت و فلاحت و حرفت کی سربراہی میں، اِک مہم تعمیر و پیداوار کا عَلَم کھولا جائے! یہ جامع و تخلیقی اسکیم روس کی پنجسالہ اور دہ سالہ تجویزوں کے نہج پر ہونی چاہیئے۔ اِس میں مقامی اور ذیلی اور وقتی طور پر دیہاتی حرفتوں کے احیاء اور اُن سے استفادے کی کافی گنجائش ہوگی۔ البتہ مستقبل کا مستقل منصوبہ بند نظامِ حرفت "بِگ مشین" ہی کے محور پر اور اُسی کی کارفرمائی سے قائم ہوسکے گا، اور سرانجام پاسکے گا!

کانگریسی سررشتہائے نظم و نسق کو "پولیس اسٹیٹ" کے شرمناک تصور اور تعامل سے بالاتر ہونا چاہیئے! "سرکاری حکام" حقیقی مفہوم میں "پبلک خدام" بنیں!

نیشنل کانگریس کی "مجلسِ عاملہ" اِس وقت کے جاری معرکۂ آزادی کا "جنگی اسٹاف" ہے، اور مستقبل کے ہندوستان کی وطنی حکومت کی "عمارتِ وزارت"! اُسے اپنے ہر اقدام او رمنصوبے میں اپنا یہی منصبِ جلیل مدِّ نظر رکھنا چاہیئے! ڈی ولیرا کی سالبقہ متوازی حکومت کی مرکزی تنظیم اور متصرفی "وفد پارٹی" کی "جمعیتہ تنفیذیہ" کی نظیریں ہمارے لئے شمعِ راہ ہونی چاہئیں!

مجوزۂ "فیڈریشن" کو کانگریس اِک یکسر قاطع و ناطق انداز میں مسترد کرچکی ہے! کانگریسی نصب العین میں اُس کا نعم البدل "نمائندہ اسمبلی" ہے! صوبجاتی حکومتوں میں قبولِ مناصب، غنیم کے بعض مورچوں پر قبضہ کرلینے کی قبیل سے تھا، لیکن آئینِ ہند کا بابِ وفاق اِک "بابِ نفاق" ثابت ہوگا! یہ "پرنسیز اور پراونسیز" کو باہم دست و گریباں کرنے کا اِک منصوبۂ مشئومہ ہے، وہ ذمہ داری کا اِک شمہ بھی نہیں رکھتا، وہ ہندوستان کے دو حصوں کے درمیان اِک داخلی مدنی جنگ "کو چھیڑنے کا فتنۂ بیدار ہوگا، اور برطانوی قیصریت و سرمایہ داریت و حرفت و تجارت کے دامِ سخت کو گلوگیر تر کرنے کی ریشہ دوانی! اُس میں والیانِ ریاست کو اُن کے حصۂ رسدی حق سے کہیں زیادہ، از ۳۳ تا ۴۰ فیصد کی متحد و ہم آہنگ نیابت ــــــ عملاً اِک حاکمانہ و آمرانہ اکثریت! ــــــ دی گئی ہے! برطانوی مصالحِ سیاسی اور منافعِ تجارتی پوری طرح قلعہ بند ہیں! اور ہندوستان کی ہر حرکتِ آزادی اور معاشی تعمیر کی ہر جنبش پر اِک قدغن عائد! وہ مرکز کے موجود الوقت آئین سے بھی زیادہ تنگدامن ہے، اور تمام و کمال اِک قدمِ معکوس ہے!

سلطنتِ ہند کا فوجی بجٹ عملاً ۷۵ سے لے کر ۸۰ فیصد حصۂ خزانۂ عامرہ پر حاوی ہے! ریلوے اتھارٹی اور ریزرو بنک کے نام سے چند اور محفوظ مالی قلعے ہیں جو وفاقی اقتدار سے خارج کر دئے گئے ہیں! حکومت خود اختیاری کا قلب، مالیات واقع ہوا ہے۔ "فیڈریشن" نے اپنے مجوزہ آئین کے سینے سے یہی قلب نکال لیا ہے! "وفاق" کی جو "تدابیر امر" کی گئی ہے اُس میں تقسیمِ حقوق کا وہ فیاضانہ اصول صَرف کیا گیا ہے جو کبھی اَساس بنا تھا، اِس "خانگی بٹوارے" کا کہ ؎

ازصحنِ خانہ تا بلبِ بام از آنِ من　　وز سقفِ خانہ تابہ ثُریا از آنِ تو!

آئندہ تربیتِ سیاسی و تنظیمِ جماعتی کے متعلق جدید صدرِ کانگریس نے یہ قیمتی مشورہ دیا ہے کہ عام پبلک، مزدوروں، اور کسانوں کے دَل بادَل جلسوں کے اہتمام و انتظام کے لئے تربیت یافتہ والنٹیروں کا اِک زبردست لشکر نا کیمپ ہونا چاہیئے، خود قومی رہناؤں کی بر آورد کے لئے مستعد دل و دماغ اور دست و بازو کے ہونہار نوجوان بھی، اگر موزوں سالکانِ طریق کے سامنے زانوئے ادب تہ کریں، تب بھی اِک اہم قومی ضرورت کی فراہمی عمل میں آئے گی!

مزدوروں اور کسانوں وغیرہ کی جماعتیں اگر نیشنل کانگریس کے عظیم، حاوی برکُل آرگنائزیشن کے زیرِ سایہ لیلی جائیں تو بہت مبارک اور قرینِ مصلحت ہوگا۔ اِنھیں کانگریس کے اقتصادی دست و بازو ہونا چاہیئے، درآنحالیکہ کانگریس اِن سارے اعضاء و جوارح کے لئے اِک مشترک وسطی و معز بن جائے، بہرحال موجودہ برخود غلط "حریف" جلد از جلد باہم حلیف"

بن جائیں! روسی تاریخ کا سبق غایت درجہ قیمتی ہے: ۱۹۱۷ء کے اکتوبر والے ثانوی انقلاب" کو مزدوروں، کاشتکاروں، اور سپاہیوں کے متحدہ محاذ" نے ہی ممکن بنایا تھا!!

ہمارے بین الاقوامی تعلقات بیحد اہم اور نتیجہ خیز ثابت ہوسکتے ہیں! مصر کی موجودہ آزادی، احرار مصر کی صرف اُس نظر بازی و دیدہ دری کا عطیہ ہے جس سے اُنھوں نے بحرالروم کی برطانوی ایطالوی کشیدگی کو بھانپا، اور ایک گولی چلائے بغیر موجودہ انگریزی مصری معاہدے کی فتوحات حاصل کیں! اہل آئرلینڈ کا یہ مُدبّرانہ مقولہ مشہور ہے کہ "انگلستان کی ایک سنگین مشکل آئرستان کا اک زرّیں موقع ہے"!

جائز پروپیگنڈا بھی نہایت ضروری ہے۔ ممالک غیر میں ہندوستان کے ہمدردوں، ہواخواہ اخباروں، ہندوستانی طالب علموں اور تاجروں، ہندوستانی تاریخ و تمدن کی ترجمان ہندوستانی فلموں اور ہندوستانی آرٹ کی نمائشوں کے ذریعے بین الاقوامی دُنیا کی تعلیم یافتہ رائے عامہ میں اک انقلاب پیدا کیا جاسکتا ہے، یہ اِس دروغ کو بھی بے فروغ کردے گا کہ "ہندوستانی لوگ نیم وحشیوں کی اک منتشر قوم ہیں، اور انگریزوں کا وہاں قیام ازبس ضروری ہے"! ـــــ بیرونِ ہند ہمارا اولین حلقۂ آشنائی وشناسائی افغانستان، ایران، چین، نیپال، برما، اور سیلون ہونا چاہئیے، دُور تر ممالک میں یورپ و امریکہ کے بعد دکھنی و جنوبی امریکہ بھی خاص توجہ کے مستحق ہیں! خود انگلستان کی جدید نسل اور طالب علموں کا طبقہ عموماً ہندوستان کے صفدار کی سی شان رکھتا ہے!

ہمارے سیاسی اسیروں کا معاملہ اک بے پناہ اپیل اپنے اندر رکھتا ہے! پُرارمان شباب اور تروتازہ رعنائی کے کتنے گل سرسبد ہیں جو تازیست بند یخانوں کی رُوح کش تاریکیوں کے لئے وقف ہوگئے! جو لوگ رہا ہوئے ہیں اُن کی حالت بھی کم حسرت ناک نہیں، وہ تپ دق کی گرفت میں پھنسے ہوئے اپنے زندانوں سے نکلے ہیں، جن کا خیر مقدم اُن کے عزیز واقارب نے دل گداز آنسوؤں سے کیا ہے! کیا ہم اُنھیں یہ شکوہ رنگیں کرنے کا موقع دیں گے کہ ؎

مری تربت پہ سب روئے، نہ رویا اک وہ سنگیں دل
قیامت ہے کہ دو آنسو نہ چشمِ یار میں آئے!

دوستو! آل انڈیا نیشنل کانگریس ہی ہمارا آخری ملجا وماویٰ ہے، کانگریس کے اندر دایاں بازو اور بایاں بازو ہوسکتا ہے، لیکن قوم کے سارے حریت طلب جنگجو عناصر کا وہ تاریخی طور پر "قلب لشکر" رہی ہے! آج حالات کا اک ناگہانی پلٹا اپنے چشم و ابرو سے اُسے پھر میدانِ کارزار کی طرف دعوت دے رہا ہے! مادرِ وطن کا کوئی غیور فرزند و دُختر اِس لمحۂ نازک میں اُس سے یقیناً بیوفائی کا مجرم نہ بنے گا! ہماری جنگ ہندوستان کی آزادی ہی کے لئے نہیں ہے، ہمارے جہاد کا مقصود اعلیٰ تمامی بشریت کی حریت وسعادت ہے! ــــ بندے ماترم!!"

چین

جاپانی حملے نے اپنی عنان توجہ اب "جنوبی چین" کی طرف موڑی ہے! اس خطے کا سیاسی و حیاتی مرکز کینٹن ہے: اہل کینٹن چینی تجارت کے سربراہکار ہیں، اپنے سواحل پر مشرق و مغرب کی بحری و سیاسی طاقتوں کے اختلاط سے وہ سیاسیات کی دسیسہ کاریوں سے خوب آشنا ہوگئے ہیں! اِن میں جنگی قابلیت و استقامت کی بھی معتد بہ تربیت ہوئی ہے!

جدید العہد چین کے دل و دماغ کا سینہ وسر کینٹن ہی واقع ہوا ہے! سن یات سین (چین کا گاندھی!) کو ولادت کینٹن ہی کی خاک پاک نے بخشی! ۱۹۱۱ء کے انقلاب چین کا پرچم اسی جگہ سے بلند کیا گیا! پھر کینٹن ہی مارشل چیانگ کائی شیک کے عساکر کا مستقر بنا، جب کہ اُنھوں نے جنوبی چین پر یلغار کی اور وسطی چین میں بمقام نانکنگ اپنا پایۂ تخت قائم کیا، کینٹن اک کم و بیش آزاد ریاست کا دارالصدر رہا ہے، اور آج تک سن یات سین کی سکونت گاہ تحریک جمہوریت و مساوات و قومیت کے باقیات الصالحات کی تبرک گاہ سمجھا جاتا ہے، اب جاپان اسی کینٹن کو اپنے جنگی عزائم کا مطمح نظر بنا کر گویا چینی سیاسی زندگی کے آخری سرچشمے کو خشک کردینا چاہتا ہے۔ امریکہ و برطانیہ و فرانس یا دم بخود ہیں، یا دور از کار ٹائیں ٹائیں کر رہے ہیں! (ا-ا-خ)

یوروپ

یورپ میں جو سیاسی صورت حال پیدا ہوگئی ہے وہ پوست کندہ

زبان میں یوں ہے کہ برِاعظم کی گرسنہ قومیں وہیں کی "شکم سیر سلطنتوں" سے "خوانِ لیغما" پر اپنا حصہ مانگ رہی ہیں! جرمنی ۱۹۱۴ء میں اسی یورپین جوع الارض کے اک شدید دَورے کے پڑنے پر اُٹھ کھڑا ہوا تھا! مگر سوئے اتفاق سے وہاں لینے کے دینے پڑ گئے! جنگِ عظیم میں شکست کی ضرب سے سنبھلنے کے بعد اب وہ اپنے معدے کے عمیق خلا کو اک درندگانہ بلانوشی سے پُر کرنا چاہتا ہے، اور اگر ایک طرف انگلستان سے اپنی ضبط شدہ نوآبادیات کا طالب ہے تو دوسری طرف وسطی یورپ و مغربی روس کے خطوں پر دندانِ آز تیز کئے ہوئے ہے! "جدید اٹلی" اِس "گرسنگیٔ زمین" کا دوسرا مریض ہے! مگر وہ سردست حبش کا بڑا شکار مارنے کے بعد اپنے شکم کے اندر عموماً سکون پا رہا ہے، اور اسپین کی خانہ جنگی کی اشتعال دہی سے صرف چاشنی اور چٹنی کی سی تفریح بعد طعام حاصل کر رہا ہے! لیکن جرمنی ہنوز اک بسو دوست افشانی و پاکوبی سے اپنے کو تھکا تا رہا ہے! نتیجہ یہ ہے کہ اب اُس کا جنون نقطۂ بحران کو پہنچ گیا ہے! اب اُس نے آسٹریا پر دست درازی کرکے شاید اپنی مرکوزِ خاطر مُہِم "بزن و بگیر" کا آغاز کر دیا ہے! اٹلی بدستور اُس کا پُشت پناہ ہے! اور بوقتِ ضرورت اُس کی گیرودار میں اُس کا ہاتھ بٹانے کے لئے تیار! ہٹلر و مسولینی کے شیر و پلنگ نے فیلِ برطانیہ کو لرزہ براندام کر رکھا ہے، اور مسٹر ایڈن، انگریزی وزیرِ خارجہ کا تازہ ترین ڈرامائی استعفیٰ اِسی خطرناک ماحول کی اک افتاد ہے! ہٹلر کی تلخ ترنوائیاں اور تیز تر حدی خوانیاں "المضاعف" ہیں! اور سُست رگ اور پروٹیسٹ باز انگلستان سے بزبانِ حال خطاب کرتے ہوئے کہہ رہی ہیں کہ ؎

مجھے اے عندلیبِ نوحہ گر! تو دیکھتی کیا ہے؟
بڑی مُدّت میں سیکھا ہے فغاں نے باا‌ثر ہونا!

(ا-ا-خ)

میرا فرض

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو میں مسلمانوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، مسجدوں، مدرسوں، یتیم خانوں کے لئے آئے دن چندہ اور امداد طلب کی جاتی ہے جس میں حسبِ منشاء استطاعت حضرات دل کھول کر اپنی فیاضی کا ثبوت بھی دیتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر اس معاملہ میں شکایت اور شک کا اظہار بھی ہوتا ہے اگرچہ اہلِ کرم اِس معاملہ میں زیادہ حُسنِ ظن رکھتے ہیں پھر بھی شکایات کہیں کہیں بجا طور پر ثابت ہوتی ہیں۔

میری آبائی بستی موضع "صالح پور رنیجہ" میں بے علم اور اسلامیات سے ناآشنا لوگ ایک مدت سے جہاں مفلسی و تنگدستی کے شکار ہیں وہاں بے علمی نے بھی ان پر تسلط جما لیا ہے۔ بے علمی اور مسائلِ اسلامی سے ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ وہاں کے باشندوں میں یہ خام خیالی جمی ہوئی تھی کہ اپنے بچوں کو پڑھانا لکھانا بڑی بد شگونی ہے، یہاں جو پڑھتا ہے وہ سرسبز نہیں ہوتا یہ جاہلانہ خیال ابھی تک وہاں کے اکثر لوگوں میں باقی ہے۔ اس بنا پر میں جبکہ کسبِ معاش کی غرض سے اپنے وطن سے دور رنگون (برما) میں پڑا ہوں، اپنے ہمسایوں اور اہلِ وطن کے لئے علمی خدمت کیسے کر سکتا ہوں پھر میری اتنی حیثیت نہیں کہ میں وطن والوں کی تعلیم کا ذاتی طور سے بندوبست کر سکوں، اس لئے میرا فرض تھا کہ میں برادرانِ اسلام سے درخواست کروں کہ اس موقع پر جہالت اور خام خیالی کے گڑھے سے نکالیں، چونکہ میرے موضع میں ایک شریف اور تعلیم یافتہ بیوہ رہتی ہیں اُن کو علمی ذوق اور مسلمان بچوں کی تعلیم کا شوق ایسا ہے کہ وہ موضع کے بچوں اور بچیوں کو ایک جگہ جمع کرکے جس کی موجودہ تعداد ۴۲ ہے پڑھاتی ہیں، اس بات کو میں نے پہلے پہل جناب سید کشفی شاہ صاحب نظامی سے کہا اور اُنھوں نے ازراہِ اسلامی ہمدردی اُن بیوہ معلمہ کو پانچ روپے ماہوار دینے کا وعدہ فرمایا اور پانچ روپے اُنھوں نے مسماۃ عائشہ خانم بیوہ ولی محمد خاں مرحوم کے نام محض علمی کفالت کے لئے روانہ بھی کر دئے۔ اگر اسی طرح اہلِ خیر حضرات بھی توجہ فرمائیں تو معلمہ صاحبہ جو لاوارث اور بیکس مگر شریف اور پردہ نشین ہیں، اُن کے گزارے کی صورت بھی ہو جائے گی، اور ایک اسلامی اسکول جس کا نام "مدرسہ کشفیہ نظامیہ" میں نے تجویز کیا ہے وہ چلتا رہے گا جس میں مسلمانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ہوتی رہے گی، جو صاحب زرِ نقد سے امداد کرنا چاہیں وہ اُنھیں معلمہ کے نام سے حسبِ ذیل پتہ پر روپیہ روانہ کرکے عند اللہ ماجور ہوں۔

پتہ یہ ہے۔ عائشہ خانم بیوہ ولی محمد خاں صاحب مرحوم۔ موضع صالح پور رنیجہ۔ ڈاک خانہ رونا ہی۔ ضلع فیض آباد۔ یو پی

الملتمس۔ عبد الرزاق خاں نظامی فیض آبادی، ایجنٹ اخبارات رنگون (برما) ۱۶ فروری ۱۹۳۸ء

نقد و نظر

(۱) "حسن کے دونوں رخ": متوسط کتابی تقطیع، ۴۲ صفحات حجم، کاغذ و کتابت و طباعت پاکیزہ و عمدہ، ناشر محمد تراب علی خاں باز، پتا: کاشانۂ باز، بازارگھانسی، حیدرآباد دکن، قیمت ۴ر

حضرت آزاد انصاری اُردو کے مشہور بزرگ سن اور کہنہ مشق استاد غزل ہیں لیکن ان کی شاعری فرسودہ غزل گوئی ہی تک محدود نہیں، وہ عہد حاضر کی جدید الطرز نظموں پر بھی پوری قدرت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی پیری صرف جسمانی معنی میں صحیح ہے! روحاً وہ اک شاب سدا بہار واقع ہوئے ہیں وہ مجدد شعر الہند، مولانا حالی مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، اور اپنے استاد معظم ہی کے اس زندہ دلانہ مقولے کی اک نظیر کہ ع

رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح!

آزاد اک نادر نوعیت کی ہستی نظر آتے ہیں۔ وہ نفسی طور پر بڑے حساس ہیں، ذہنی طور پر بڑے آزاد خیال، اور اپنے تنقیدی مذاق میں بڑے روادار اور وسیع المشرب۔ دور پیشین کے شعرا میں اُن سے زیادہ شرح صدر کے ساتھ کوئی "شاعرِ انقلاب" کا قدردان و ثناخواں نہیں۔ اور خود جوش کا معاملہ بھی، باہمہ نعرہ زنیِ انقلاب و شباب، اس پیرِ نحیف پیکر کے ساتھ کچھ اس قسم کا ہے کہ ؎

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بُردش بیک نگاہے

(۱۰۱-رخ)

جوش و آزاد ہمارے اُردو ادب کی تاریخ جاریہ میں اک مشترک برزخ بہم پہنچاتے ہیں! ان دونوں کی ذات میں قدیم و جدید شاعری نے ایک دوسرے کو وہ پیامِ اجنبیت نہیں سنایا کہ "ہذا فراق بینی و بینک" بلکہ ان کی باہمی صحبت نے اک "مرج البحرین" کا سا ماجرا پیش کیا ہے۔ انتہا یہ کہ بعض مواقع "من تو شدم تو من شدی" میں یہ دونوں شاعرانہ روحیں اک واحد دل و دماغ اور متحد زبان و قلم بن کر سخن سنج ہوئی ہیں۔ حیدرآباد دکن کے معاصرانہ قیام کے ایام ہیں دونوں کی اک مشترک غزلِ مسلسل کا اک دلچسپ اور یادگار مقطع یہ ہے: ؎

آج ساقی کمی نہ رہنے پائے
پینے بیٹھے ہیں جوش اور آزاد!

حضرت آزاد کی زیرِ تنقید دو نظمیں، طلعتِ حسن کے دونوں رخساروں کا مشاہدہ، یا طبیعتِ حسن کی دونوں افتادوں کی تشخیص پیش کرتی ہیں! حسن کے اس جمال و جلال میں عملاً کوئی فرق نہیں! ع

ناہید بغمزہ کشت و مریخ بقہر!

حسن کی اسی "قاہری و دلبری" کو جوش اس طرح بیک وقت دعوت دیتے ہیں: ؎

نکال لیتے ہیں ظالم دلوں کو سینوں سے
خدا بچائے نہ پھر بھی مجھے حسینوں سے!

آزاد بھی اصولاً و حقیقتہً حسن کے اس "قہر و مہر" کے یکساں قتیل ہیں۔ لیکن حسن

کی "خوبصورت بلائے گریز" کی یہ مسلسل دعوت غالباً اس لئے دے رہے ہیں کہ مشہدِ حسن میں اُن کا کوئی شریک و سہیم نہ رہے۔ اس پیام کی علتِ غائی غالباً یہ ہو کہ

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

"حُسن کے تاریک رُخ" کی ان تجلیوں کو دیکھیے، اور بتایئے کہ کیا ہمارا یہ قیاس غلط ہو کہ "انّ فی ذٰلک لشئی یراد":

حُسن کو پہلے زر دیگا بعد ازاں گُل گھر دیگا آخر آخر سَر دیگا: بھاگ، بلائے حُسن سی بھاگ!

لعلِ جادو فن کو نہ چاہ جعدِ کمند افگن کو نہ چاہ

دشمنِ جاں، دشمن کو نہ چاہ بھاگ بلائے حسن سی بھاگ:

چنانچہ حسنِ دل نواز کی بارگاہ میں باریاب ہونے کے بعد وہ "ہمہ اوست" کے نعرے مارنے لگتے ہیں اور "پروانہ چراغِ حرم و دَیر نداند" والی علی الاطلاق صلائے عام، حسن طلبی و حسن پرستی کی دیتے ہیں۔ چنانچہ:-

حسن سی نفرت کفر ہی کفر ردِّ نعمت کفر ہے کفر!

ایسی حرکت کفر ہے کفر چاہ ہر اہلِ حسن کو چاہ

~~~~~~~~

اہلِ ادا ہو، کوئی ہو! ماہ لقا ہو، کوئی ہو

بُت ہو، خدا ہو، کوئی ہو! چاہ . . . . . . !

~~~~~~~~

حسن میں فردِ دوراں ہو غیرتِ حور و غلماں ہو

اب وہ ملک ہو شیطاں ہو! چاہ . . . . . . !

~~~~~~~~

حورِ عیں پر کیا موقوف دیو لعیں پر کیا موقوف

ایک حسیں پر کیا موقوف چاہ . . . . . . !

~~~~~~~~

(۲) "نورِ مشرق" مجموعۂ منظومات جناب ضیا فتح آبادی، مجلد، متوسط کتابی قامت، ضخامت ۱۰۴ صفحات، مع عکسی تصویر صاحبِ تصنیف۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ گجندر لال سونی، کٹرہ گرانا، پھاٹک حبش خاں دہلی۔

مسٹر مہر لال سونی ضیا فتح آبادی، ایم۔ اے کے مجموعۂ کلام کی یہ اک پاکیزہ و خوش سلیقہ جلد ہے جس پر تنقید کا خوشگوار فرض آج ہمارے حصہ میں آیا ہے۔

جناب ضیا اک نوجوان، اعلیٰ تعلیم یافتہ، اور بیدار دل انسان ہیں۔ وہ اک گرانڈیل پیکر واقع ہوئے ہیں۔ لیکن اُن کی فطرتِ بلند، اور ان کی رفعتِ خیال ان کی بالا بلندی کی پوری ہم قامت کہی جا سکتی ہے، اگر ان کی بلند پیشانی، تاباں و تبسم کناں آنکھوں، اور اُن کے چست و درست ملبوس کو بھی اُن کے سراپے و حلیئے کے اجزا میں لے لیا جائے تو شاید اک مجمل مرقع اُن کی شخصی سیرت اور شاعرانہ جوہر کا صورت پذیر ہو جائے گا۔ ان کا جسم ان کی جان کا اک نادر ترجمان معلوم ہوتا ہے۔

مسٹر مہر لال صاحب ضیا وسیع المشرب انسانی "مہر و محبت" اور حقیقت رس فہم و فکر کے "نور و ضیا" سے قابلِ داد حد تک بہرہ یاب ہیں۔ وہ رندِ لم یزل اور مستِ الست، جوش کے مخلص دوستوں اور دلدادوں میں سے ہیں۔ ان کے اس "دوشیزہ" گلدستۂ سخن پر "شاعرِ انقلاب" کا دشالِ کتاب "تعارف" اسی ہمعصر آنہ محرمی کا مظہر ہے۔

جناب ضیا کے زیرِ ذکر انتخاب منظومات پر فنی انفرادیت اور ادبی اخلاص بخطِ جلی لکھا ہوا ہے۔ وہ مختلف مظاہرِ فطرت اور مناظرِ بشریت سے دوچار ہوئے ہیں اور ان کے مطالعہ و تاثر نے اپنے رنگِ خاص میں اپنے نقوشِ قدم اُن کے رشحاتِ قلم کی لوح پر چھوڑے ہیں۔

"فاتحۃ الکتاب" ہی میں ہم نوجوان شاعر کو "سربسجود" پاتے ہیں! چند کلمات "واسجد واقترب" ملاحظہ فرمایئے۔

اے چراغِ آرزوئے بزمِ ہستی کے شباب اے پرِ پروانۂ رقصِ نشاطِ کامیاب

اے نگاہِ مست و بیخود، مائلِ تخریبِ ہوش اے نیازِ میکشانِ زیست، نازِ مے فروش

میں تمہارا بن کے سوز و جذب کا ماہر بنوں! دل ہو وہ نغمے اٹھیں جنکے لئے شاعر بنوں!

"طلوعِ سحر" والی نظم کی "محرابِ معرفت" میں ان کے روحانی "رکوع و خشوع" کو دیکھیے:-

عبادتِ سحری میں جھکا دلِ شاعر

اب ایک وجد کی منزل ہی، منزلِ شاعر!

ساعتِ صبح کی "دعوتِ سیر" کی دل نشیں اثر آفرینیاں سنئے:

چمک رہے ہیں اور جگمگا رہے ہیں راستے قدم قدم پہ آئینے دکھا رہے ہیں راستے

سکوت کی زبان سی بلا رہے ہیں راستے لو آؤ سیر کو چلیں . . . . !

"صبحِ نوروز" کی "شبِ ماقبل" کے "چشمۂ حیواں" کو قدم رنجہ فرمائی کی کیسی قابل ہمدردی دعوت ہے:-

ہیں مرے واسطے وہی راتیں قصۂ غم، فراق کی باتیں

آج کی رات تم اگر آؤ ابر بن کر فضا پہ چھا جاؤ
تو میں سمجھوں کہ سالِ نو آیا!

"آجاؤ" کی التجاہائے شیدائیت و فدویت کی نوائیں کتنی شیرنیت ریز ہیں:-

آجاؤ چھیڑتی ہوئی سازِ سرور و کیف میخانہ و شراب کی دنیا لئے ہوئے
آجاؤ پھر جھکائے ہوئے چشمِ نیم باز نظروں میں اک حجاب کی دنیا لئے ہوئے
آجاؤ اب کہ دل کو نہیں تابِ انتظار حد سے گذر چکا ہے نگاہوں کا اضطرار
آدابِ عشق سے نہیں واقف اگرچہ ہیں پھر بھی مجھے ہے حسن کے وعدوں کا اعتبار

"آہ حسن" کے مد و جزرِ تخریب و تباہی کا اک منظر:-

بیٹھا ہے کشتیِ دلِ مضطر پاش پاش پر! آنکھوں میں اپنی حاصلِ طوفاں لئے ہوئے!

بوندوں کے ساز کی سامعہ نوازی و سحر کاری ملاحظہ کیجئے:

نہ ختم ہو گیت یہ ابد تک یہ کیف یونہی رہے الٰہی رہے ہمیشہ محیطِ عالم یہ شام کی پُرفسوں سیاہی
ہوا زمانے کی ہے مخالف۔ خدا مجھے کامیاب کر دے یہیں ٹھہر جائے توسنِ وقت، یہ دعا مستجاب کر دے!

"منصورِ عشق"، "ڈیوک آف وِندسر" کے ایثارِ مردانہ و قربانی عاشقانہ پر اک مجذوبانہ داد:-

محبت میں ہیں وہ آزادیاں جو مِل نہیں سکتیں
ہلانے سے بھی بنیادیں جنوں کی ہل نہیں سکتیں!

"شاہکارِ صانعِ عالم" کے دو آخری عناصرِ ترکیبی سننے کے قابل ہیں:-

لی کشش کی تاب مقناطیس سے اور مانگی سرکشی ابلیس سے
سب کو فطرت نے بہم یک جا کیا اور اس کو نام عورت کا دیا

گمراہ و نفاق زدہ ہندوستان کی "مقدس آویزشوں اور کاوشوں" پر یہ چٹکی خوب ہے:-

تا بکے شیخ و برہمن، تا کجا دیر و حرم!

"تعلیمِ اسلام" کو مقطع کے اندر خوب ہی دریا در کوزہ کیا ہے۔

جیو تو ذوقِ عبادت کی مستیاں لے کر مرو تو خونِ شہادت کی سرخیاں لے کر!

ہندوستانی نوجوان کی "مصروفِ خواب" جوانی کو اک پیامِ قُم:-

یاس و غم کا اپنے چہرے سے اُٹھا بھی دے نقاب جلوہ گر ذروں سے ہو بنکر کبھی خورشیدِ شباب!

انگریزی شاعری کی صنف موسومہ بہ "سانیٹ" کے طرز پر اک اردو نظم کا مقطع قابلِ نقل ہے:-

نہ ڈر تنقیدِ عالم کا، نہ خوفِ قہرِ داور ہے!
جوانی ڈھالتی ہے مجھ کو جس سانچے میں ڈھلتا ہوں!

"کوئی" بہر لال سونی کے ہندی گیت بھی بڑے مدھ بھرے ہیں۔ "بسنت کی اک 'برہا کی رات' کا منظرِ حسرت دیکھئے":-

چندرماں ہے مرجھایا سا دھرتی کا دل بھی ہے پیاسا
من کو کیا ہو دھیرج، آسا گئی بسنت بھی بیت!

"رونے پہ اے ندیم ملامت نہ کر مجھے" کی قسم کی اک رخصتِ گریہ کی "حسین منطق" سنئے:-

کاری کاری بدری روئے آنسوں سے آنچل کو دھوئے
اُس کو بھی تو ٹوک! سکھی ری رونے سے نہ روک!

الغرض "نورِ مشرق" ایشیائی و ہندوستانی ادبی روشنی کی گوناگوں کرنوں کی اک "قوسِ قزح" ہے۔

(ا۔ا۔خ)

ایک تو [illegible] بیچ پھیرے ہے
صبح کی ہیں یار [illegible] بھاری
جب نکلیں [illegible] ہیں اے جوبن
ایک ہلکی میٹھی سی کی دھاری

(ر۔ ش)

باغ پہ چھائے ہیں بادل
بھونرے پھولوں میں ہیں مستانی
[illegible] چھائی ہے کیفیت
نیند [illegible] اداسی

(ر۔ ش)

ضروری اطلاع

اس کے پڑھنے سے لاکھوں کا بھلا ہوگا

صاحبان! میں نہ اشتہاری حکیم ہوں نہ ڈاکٹر بلکہ ایک معمولی درجے کا آدمی ہوں۔ بدقسمتی سے مجھے اپنے ہاتھوں اپنی جوانی کا ستیاناس کرنے والی عادت پڑگئی تھی جسکے نتیجہ بد سے میں بالکل نکما ہو گیا تھا۔ اچانک عرصہ ڈیڑھ دو سال کے بعد مجھے نامردی کا نامبارک مرض لاحق ہو گیا۔ سرعت جریان، احتلام وغیرہ کی بے انتہا شکایتوں کے سبب میرا چہرہ دن بدن لاغر اور زرد ہوتا جاتا تھا۔ دیگر دل ہر وقت دھڑکتا۔ سر چکراتا آنکھوں کے سامنے اندھیرا آتا۔ گھبراہٹ سستی اور اداسی چھائی رہتی تھی۔ دوست احباب میری پژمردگی کا سبب پوچھتے تھے۔ مگر میں ان کو اپنی حالت سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا۔ مگر در پردہ مشہور شہروں کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور حکیموں سے جن کے لمبے چوڑے اشتہاروں کی کوئی حد نہ تھی، ادویات منگا کر استعمال کرتا رہا۔ لیکن مجھے بالکل خاک بھی فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ علاوہ حرج کے کئی اور تکلیفوں کا سامنا کرکے بھی مایوس ہی ہونا پڑا۔ اس مایوسی کی حالت میں زندہ در گور ہونے کو ترجیح دیتا تھا۔ اتفاقاً خوش قسمتی سے مجھے ایک ملازمت میں پشاور جانا پڑا۔ پشاور جس جگہ میں جا کر ٹھیرا ایک فقیر خضر صورت جو کہ پہلے سے وہاں مقیم تھے مجھ سے پوچھنے لگے کہ تم اداس اور تمہاری صورت مریضوں کی سی کیوں ہے۔ میرے پر درد دل نے اس خضر صورت اور کامل سنیاسی کو اپنا سارا دکھ درد کہہ ڈالنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اب میں زندگی سے تنگ آکر خودکشی کرنے پر آمادہ ہوں۔ اس فقیر صاحب کمال نے ازراہ شفقت میرے حال پر رحم فرما کر ایک نسخہ کھانے کے لئے مقوی گولیوں کا اور دوسرا نسخہ رگوں اور پٹھوں کی سستی دور کرنے کے لئے مالش کا بتلایا۔ چنانچہ میں نے حسب ارشاد اس صاحب کمال کے لاتعداد جنگل جڑی بوٹیاں اور کئی ادویات بازار سے خرید کر ہر دو جوہر کیمیا کو روبرو اس صاحب کمال کے تیار کرکے استعمال کرنا شروع کیا۔

ناظرین! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ کہتا ہوں کہ ساتویں روز ہی میری تمام شکایتیں جو کہ ایک مریض کو لاحق ہوا کرتی ہیں رفع ہونی شروع ہوئیں۔ اور میں اپنے آپ کو قابل فخر مرد کہنے کا مستحق ہو گیا۔ اگرچہ مجھ کو چند یوم دوا کے استعمال سے ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔ تاہم حسب ارشاد اپنے محسن خضر صورت کامل سنیاسی کے ۲۱ روز تک پرہیز اور علاج جاری رکھنا پڑا۔ میں ہر روز تین ساڑھے تین سیر دودھ بآسانی ہضم کر لیتا تھا۔ میرا چہرہ بارونق بدن مضبوط۔ بینائی طاقتور ہو گئی۔ اب میں ایسا قابل فخر مرد بن گیا ہوں کہ جس کے بیان کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ واپس آکر باقی ماندہ دوائی کا نامردی کے مایوس مریضوں پر تجربہ کیا تو ہر قسم کی نامردی، سستی، جریان، احتلام، سرعت وغیرہ کے لئے اکسیر سے بڑھ کر پایا۔ پھر کئی ایک دور اندیش اصحاب کے اصرار اور عوام کے فائدے کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اشتہار بغرض رفاہ عام دیا جاتا ہے کہ جو صاحب اس شرمناک اور قبیح عادت کے شکار بن کر حظوظ انسانیت سے محروم ہو بیٹھے ہوں اور سینکڑوں روپیہ علاج معالجہ پر صرف کرکے بھی مایوس ہو چکے ہوں وہ اس قلیل القیمت اور سریع التاثیر دوائی کو استعمال کرکے صحتیاب ہو جائیں اور خدا کے فضل کے گیت گائیں قیمت صرف لاگت ادویات اور خرچ اشتہار بمشکل اکتفا کرتی ہے۔ فائدہ بہت کم ملحوظ ہے۔ **قیمت مقوی گولیاں جس میں ۲۱ روز کی ۴۲ خوراک موجود ہے صرف دو روپیہ (عہ) قیمت روغن مالش طلاء جس میں ۲۱ روز تک رگوں اور پٹھوں کے لئے کافی ہے فی شیشی دو روپے آٹھ آنے (۸/۲ عہ)** جریان کے لئے یہ گولیاں از حد مفید ہیں۔ مادرزاد نامردی کے سوائے خواہ کسی قسم کی مردی کا مرض کیوں نہ ہو اکسیر ہے اور روغن مالش سے کسی قسم کی پھنسی یا آبلہ ہرگز نمودار نہ ہوگا۔ اس دوائی میں کسی کشتہ وغیرہ کی آمیزش نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ہر بچہ بوڑھا اور جوان بآسانی بغیر لحاظ موسم کے ان گولیوں کا استعمال کر سکتا ہے۔ اور لطف یہ کہ اس دوائی کے استعمال کے بعد دوبارہ کسی دوائی کی ضرورت نہ رہیگی۔ آخر میں یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اشتہار کے دینے سے میری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے۔ اور نہ ہی میرا مدعا جعلی اشتہار شائع کرکے پبلک سے روپیہ کمانے کا ہے بلکہ ہر خاص و عام کے فائدہ کو مدنظر رکھکر اور احباب کے اصرار پر یہ اشتہار شائع کیا جاتا ہے۔ تندرست اور شوقین اصحاب بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کے استعمال سے مسرت سے صحت اور صحت سے طاقتور بن جاتا ہے۔ اگر بڑھاپے میں بھی لطف جوانی اٹھانا چاہتے ہیں تو ان گولیوں اور روغن مالش کا استعمال کریں، ان کے استعمال سے بدن میں خون صالح پیدا ہو جاتا ہے۔ الغرض جب تمام جسم ڈھیلا ہو گیا ہو تو ان کا استعمال کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ مخفی دکھوں کا تمام دنیا کی دواؤں سے عجیب و غریب علاج ہے۔ نیز عورتوں کی جوانی قائم رکھنے کے لئے جو عورتیں مردوں کی طرح جریان الرحم یا اخراج رطوبت یعنی لیکوریا جیسے خطرناک امراض میں مبتلا ہوں ان کے لئے مقوی گولیاں از حد مفید ہیں۔ ضرور تنگ اصحاب تجربہ کریں۔ مکمل پرچہ ترکیب ہمراہ دوا ہوگا۔ محصول ڈاک ۸/ علاوہ۔ تمام خط و کتابت پوشیدہ رکھی جاتی ہے۔ خاص **نوٹ**۔ وہ اصحاب ہم سے دوائی منگوائیں جو استعمال کریں، اور اخبار کا حوالہ ضرور دیں، کیونکہ کئی اصحاب نے پیشہ اختیار کر رکھا ہے کہ ہم سے دوائی منگوا کر زیادہ قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں لہٰذا فقیر خضر صورت سنیاسی کے قول کے مطابق اس کی کمائی کھانا گناہ ہے۔

نوٹ: کوئی صاحب مجھے اور دوائی کے لئے تحریر نہ کریں۔ یہ گورنمنٹ آف انڈیا سے پیٹنٹ رجسٹری شدہ ہے۔

شرطیہ علاج اور شرطیہ وعدہ! ہندو کو دھرم اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے کہ اگر میری دوائی کے استعمال سے حسب دلخواہ فائدہ نہ ہو تو فوراً تحریر بھیجکر قیمت واپس منگوالیں۔ عدم صحت کی صورت میں کسی کا پیسہ رکھنا گناہ سمجھتا ہوں۔ اگر کوئی صاحب اس دوائی سے اب بھی فائدہ نہ اٹھائیں تو ان کی قسمت

ضروری اطلاع۔ یہ یاد رہے کہ میری دوائی صرف نامردی، سستی، جریان، احتلام، سرعت، کمزوری اور لاغری جریان الرحم و لیکوریا کیلئے مخصوص ہے۔ یہ امراض خواہ کسی سبب سے ہوں، خواہ کثرت مباشرت یا عادت بد سے سب کیلئے یکساں مفید ہے۔ سوزاک یا آتشک سے پیدا ہوئی کمزوری کیلئے اس کا استعمال کرنا طاقت کا بیمہ کرانا ہے۔ اور مادرزاد نامردی کے سوائے میری دوائی اکسیر ہے

ہزاروں تعریفی خطوط و سرٹیفکیٹ موجود ہیں جن کے لکھنے والے عام صاحبان کے علاوہ کئی ڈاکٹر حکیم اور وید ہیں۔ جن کی رائے ہے یہ دارالشفا مقوی گولیاں اور روغن مالش طلاء تیر بہدف ہیں۔

خط و کتابت و دوائی ملنے کا پتہ:۔ **منیجر دارالشفاء گولیاں رجسٹرڈ، بٹالہ، ضلع گورداسپور پنجاب**

۳۴۷ مارکہ کے دو نایاب تحفے
کیش سنگار ہیئر آئیل
رشکِ مُنیر (پھولوں کا سینٹ)
کاہن سنگھ موہن سنگھ میڈلسٹ پرفیومرز امرتسر
قائم شدہ ۱۸۶۰ء

بنام قوت و حیات

کلیم دہلی

منظور شدہ
ڈائرکٹران تعلیم
ریاستہائے میسور، پٹیالہ، وحیدر آباد دکن

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم

آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سُنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ، چھ روپے
ششماہے چندہ، تین روپے آٹھ آنے

سہماہی چندہ۔ دو روپے
قیمت فی پرچہ۔ نو آنے (۹)

جلد ۵ | نمبر ۴

فہرست مضامین بابتہ ماہ اپریل ۳۸ء

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ کلیم دریا گنج نمبر ۴ جینتی نواس سے شائع کیا)

اشارات

مُدیر

بے اعتدالی کی معراج

اس کون انکار کی جرأت کرسکتا ہے کہ زندگی کو خوشگوار اور حیات کو تندرست و پائدار رکھنے کے لیے سب سے زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ اہم چیز ہے اعتدال۔

توسّط و اعتدال سے بڑھکر کوئی خیر نہیں، اور بے اعتدالی، اور افراط و تفریط سے بڑھکر کوئی شر نہیں —— اگر کوئی مجھ سے پوچھے گُناہ کی تعریف کیا ہے، تو میں صرف یہ جواب دوں گا کہ بے اعتدالی۔

بے اعتدالی وہ بلا ہے کہ وہ اُمور بھی، جنھیں عُرفِ عام میں خیر کہا جاتا ہے، اس سے آلودہ ہوکر شر بن جاتے ہیں —— اور اعتدال وہ برکت ہے کہ وہ اُمور بھی جنھیں عرفِ عام میں شر کہا جاتا ہے، اس سے بہرہ مند ہوکر خیر کا لقب حاصل کرلیتے ہیں۔

دُور کیوں جائیے، عبادت ہی کو لے لیجئے، جو اہلِ مذاہب کے نزدیک بہترین عمل ہے، اگر کوئی شخص اپنے تمام فرائضِ انسانی، اور وظائفِ طبعی کو یک لخت ترک کرکے شبانہ روز عبادت، اور صرف عبادت ہی کا ہوکر رہ جائے تو کیا اُس کی یہ عبادت گزاری، بے اعتدالی کے باعث، گناہ میں تبدیل ہوکر نہ رہ جائے گی؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ، دُنیا کے تمام دیگر اہم ترین اُمور کی طرح اعتدال بھی ایک نہایت ہی مشکل امر ہے —— اور اسی وجہ سے زندگی کے کسی شعبے میں صحیح اعتدال کہیں کارفرما نظر نہیں آتا —— لیکن بے اعتدالی کے بھی، دُنیا کی تمام دوسری چیزوں کی طرح، مختلف مراتب و مدارج ہیں، اور یہی وہ مختلف مراتب و مدارج ہیں، جن پر نگاہ کرکے، انسانی اقوال و کردار کے باب میں زشت و خوب کا حکم لگایا جاتا

یہ صحیح ہے کہ نقطۂ اعتدال سے ہم سب ہٹے ہوئے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کون کس قدر ہٹا ہوا ہے۔ یعنی نقطۂ اعتدال سے جو شخص جس قدر کم ہٹا ہوا ہوگا اُسی نسبت سے وہ قابلِ تحسین، اور جو شخص جس قدر زیادہ ہٹا ہوا ہوگا، اُسی نسبت سے وہ قابلِ نفرین قرار دیا جائے گا۔

یا بہ الفاظِ دیگر یوں سمجھ لیجئے کہ نقطۂ اعتدال سے جو شخص جس قدر قریب ہے، وہ قابلِ تحسین ہے بہ اندازۂ قُرب۔ اور جو جس قدر بعید ہے، وہ شایا نفرین ہے باندازۂ بُعد۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وہ قومیں اعتدال سے نسبتہً زیادہ قریب رہتی ہیں جن کے ذہن علُوم کی روشنی سے تابناک، اور اُبھارنے والے جذبا سے طاقتور ہوتے ہیں، اور اس کے برعکس وہ قومیں اعتدال سے نسبتہً نہا ہی فاصلے پر رہتی ہیں جن کے ذہن جہالت سے تاریک، اور ہمت توڑ دینے والے آلام سے ناطاقت ہوتے ہیں —— اور چونکہ ہم ہندوستا کے جاہل و مُردہ باشندے، اسی ثانی الذکر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، اسی ہماری زندگی اور ہماری موت دونوں کو اعتدال سے کوئی دور کا بھی وا باقی نہیں رہا ہے۔

زندہ قومیں، جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے، اپنے اقوال و کردار کو توسُّط و اعتدال سے متجاوز نہیں ہونے دیتیں، لیکن مُردہ قومیں افراط و تفریط اور بے اعتدالی کا شکار رہو کر جو کام بھی کرتی ہیں، اُن میں حُدود سے

متجاوز ہو کر بہنے لگتی ہیں ———— مثال کے طور پر شاہد و شراب ہی کو لے لیجیے۔ کسی قوم کے طبائع، زندہ دل اور رنگین مزاج افراد شاہد و شراب کو پسند نہیں کرتے؟ مگر فرق صرف اس قدر ہے کہ زندہ قوموں کے افراد اِن متذکرۂ بالا فرائضِ بشری کو اس خوبی کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ اِس سے اُن کی عقلیں روشن، دل قوی، اور تندرستیاں قابلِ رشک بن جاتی ہیں، اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اِن میں قدرت نے نوعِ انسانی کے واسطے کیا کیا منفعتیں پوشیدہ رکھی ہیں۔ لیکن اِس کے برخلاف، مُردہ قوموں کے افراد جب اِس کی جانب خیر سے متوجہ ہوتے ہیں تو اِس قدر بے اعتدالی برتتے ہیں کہ اُن کی عقلیں تاریک، دل کمزور اور تندرستیاں قابلِ ماتم ہو جاتی ہیں، اور وہ چیز جو بحکمِ آلامِ حیات قطعی طیّب و حلال ہے اُن کی بے اعتدالیوں کے ہاتھوں ناپاک حرام اور عملِ شیطانی ہو کر رہ جاتی ہے

اسی سلسلے میں مجھے اپنے ایک شایانِ محبت و قابلِ ہمدردی دوست یاد آگئے، جو ایک زمانے میں خدا کے زبردست منکر تھے، اور اب خدا کے سب سے بڑے ماننے والوں میں سے ہیں۔ لیکن افسوس کہ اُن کا الحاد بھی بے اعتدالی کا شکار تھا، اور اب اُن کی دینداری بھی بے اعتدالی کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے،

جب وہ خدا کے منکر تھے تو اِس قدر غلو کے ساتھ منکر تھے کہ خدا کا نام سُنتے ہی سنجیدگی آمیز حکیمانہ تبسم کے عوض اُن کے مُنھ سے جھاگ اُٹھنے لگتا تھا، اور اُن کے خط و خال غیظ و غضب کی آگ سے اِس طرح سُرخ ہو جاتے تھے گویا کوئی اُن پر سبّ و شتم، اور اُن کے دشمن کی شان میں قصیدہ خوانی کر رہا ہے۔ اور اب جب کہ وہ عاشقانِ الٰہی کے حلقے میں داخل ہو چکے ہیں، خدا تو بڑی چیز ہے، اگر اُن کے سامنے کوئی کسی صوفی کا بھی نام لے لیتا ہے تو وہ فرطِ ادب سے اِس طرح گھبرا کر ٹوپی پہن لیتے ہیں، جس طرح غسل خانے میں کسی کے اچانک داخل ہوتے ہی نہانے والا ستر پوشی کے واسطے تولیا کی طرف جھپٹ پڑتا ہے، اور اُس وقت وہشتِ عقیدت و ہیبتِ احترام سے اُن کی آنکھیں مٹی کے اُن ڈھیلوں کی طرح بیٹھنے لگتی ہیں، جن کے نیچے پانی نے آہستہ آہستہ رینگنا شروع کر دیا ہو۔

اِنھیں بے اعتدالیوں کے سلسلے میں ذیل کی خبر بھی جو "ملاپ" (۶ / مارچ ۱۹۳۸ء) میں شائع ہوئی ہے، پڑھیے، اور پڑھ کر عبرت حاصل کیجیے: ————

ہر پانچ قدم پر نماز پڑھنے والا حاجی
پانچ سال کے عرصے میں حیدر آباد سے سہارنپور پہنچا

آج ایک اٹھائیس سالہ مسلمان نوّاب زادہ سہارنپور اور براڑہ کے درمیان سفر کر رہا ہے۔ یہ شخص ہر پانچ قدم چلنے کے بعد نماز پڑھتا ہے، اِس کا ارادہ پیدل چل کر خشکی کے راستے مکّہ پہونچنے کا ہے، یہ شخص ریاست حیدرآباد دکن کا خاندانی نواب زادہ[1] ہے۔ اِس کو حیدرآباد سے چلے قریباً ساڑھے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ یہ شخص ہر روز تقریباً ایک میل سفر کرتا ہے، اس کے ساتھ خدمت کرنے کو ایک نوکر بھی ہے[2]۔

اس کے ساتھ ضلع سہارنپور و انبالہ کے ہزاروں مسلمان ہات ملانے کے لیے آتے ہیں[3]۔ وہ قریباً ایک سال میں لاہور پہونچے گا"

انا لِلّٰہ و انّا الیہ راجعون!!

محترم قارئین! یہ خبر آپ نے پڑھی؟

(۱) کیا آپ کے نزدیک اِس کے حواس درست، اور اِس شخص کا دماغ صحیح ہے!

(۲) کیا اس "خاندانی نوّاب زادے" کا یہ فعل، اُس کی ذات، اُس کے خاندان، اُس کے ہمسایوں، اُس کی قوم، اور اُس کی نوع کے حق میں مفید قرار دیا جا سکتا ہے؟

(۳) کیا اِس شخص کا یہ رکوع و سجود آمیز سفر، پیغمبرِ اسلام، شریعتِ اسلام اور خدائے اسلام کی نظروں میں محبوب ہو سکتا ہے؟

(۴) کیا وقت کی اِتنی کثیر مقدار کا اِس بُری طرح ضائع کر دینا دُنیوی عقل، اور دینی وجدان کی رُو سے جائز ہے؟

(۵) کیا اِس "نوجوان" پر اِس کے موسمِ بہار، یعنی نوجوانی کا کوئی حق نہیں؟ اور کیا نوجوانی کی سی دولتِ بیدار کے رنگین حقوق کی پامالی کبیرہ گناہ نہیں ہے؟

(۶) اگر یہ نوّاب زادۂ دکن صاحبِ اہل و عیال ہے تو کیا اِس سفر کے ذریعے سے (جسے اُس نے اپنی صبحِ زندگی میں شروع کیا ہے اور شامِ زندگی میں

---

[1] خاندانی نواب زادے ہی ایسی حرکتیں کر سکتے ہیں

[2] یک نشد دو شد۔ اپنی زندگی کے ساتھ دوسرے کی زندگی بھی خراب کی جا رہی ہے۔

[3] کیوں نہ ہو، مسلمان ایسے آدمیوں سے ہات نہ ملائے گا تو اور کون ملائے گا۔

ختم کرے گا) وہ اپنے اہل و عیال کی پرورش اور اپنی بیوی کے شباب کو برباد نہیں کر رہا ہے؟

(۷) اگر مجرد ہے تو کیا یہ شخص نکاح نہ کرکے اسلامی آبادی میں اضافہ کرنے سے عملاً انکار نہیں کر رہا ہے؟

(۸) کیا یہ سچ ہے کہ خدا کسی کے نفس کو اُس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا؟ اگر یہ سچ ہے تو اِس نواب زادے کو اللہ تو یقیناً اِس ہولناک سفر کی تکلیف نہیں دے رہا ہے — تو پھر کیا یہ خود اپنے ہاتھوں اپنے کو اس تکلیف میں مبتلا کئے ہوئے ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا اُس چیز کو جسے خدا، اتنی بے پایاں قدرت کے باوجود روا نہیں رکھتا، ایک انسان کو خود اپنی مرضی سے اختیار کر لینا چاہیئے؟

(۹) کیا قرآن میں یہ حکم بھی ہے کہ اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو؟ اگر ہے تو کیا اِس سفر کے ذریعے سے یہ شخص اپنے کو اسبابِ ہلاکت سے دوچار نہیں کر رہا ہے؟

(۱۰) اور کیا اِس ہولناک و ہلاکت انگیز سفر کو جوشِ عقیدت و افراطِ محبت کا لقب دے کر سراہا جا سکتا ہے؟

اگر ایسا ہے تو کیا اُس شخص کو بھی جوشِ عقیدت و افراطِ محبت کی بنا پر سراہا جائے گا جو خانۂ کعبہ کو دیکھتے ہی اپنی گردن کاٹ کر پھینک دے گا؟

اگر اِن سوالوں کا جواب اثبات میں ہے تو میں بہ بانگِ دُہل کہوں گا، اِس تمام عالم کے مجموعی علم و عرفان، اور اِس کرۂ ارض کی مجموعی عقل و دانش کی قسم کھا کر کہوں گا کہ ان سوالوں کا اثبات میں جواب دینے والوں کی عقل یہودیوں کی دیوارِ گریہ کے مثل ہے جس کے سامنے کھڑے ہو کر تمام دُنیا کے عقلاً کو ماتم کرتے کرتے بیہوش ہو جانا چاہیئے۔

اور اگر اِن سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو کوئی آواز دو، خُدارا آواز دو اُن "شمس العلماؤ عالمانِ دینِ متین" اور اُن "مفتیانِ شرعِ مُبین" کو، جن کی وضو سے شاداب گھنی داڑھیوں کے نیچے، حکومتِ عالیۂ برطانیہ کے تمغے اِس طرح جھلکتے رہتے ہیں، جیسے ظُلمات کے اندر آبِ حیواں، ہلکورے لیتا نظر آتا ہے، اور اُسی کے دوش بدوش تمام دُنیا کے قوّالوں کی تالیوں اور ڈھولکوں کی قسم کوئی آواز دو اُن سجادہ نشینانِ حق شناس، اور اُن پیرانِ حقیقت آگاہ کو جن کی رنگین عبائیں شب رنگ کاکلوں سے مہکتی رہتی اور جن کے شکم ہائے مبارک میں احتی مینر بانوں کے مُرغ اذانیں دیتے رہتے ہیں کہ وہ سب کے سب اپنے اپنے حجروں، اور اپنی اپنی خانقاہوں سے چند نفس کے لئے باہر تشریف لائیں، اور حیدرآباد کے اِس خاندانی نوّاب زادے کے شانے پر پدرانہ شفقت کے ساتھ ہات رکھکر یہ سمجھائیں کہ اُس کا یہ سفر اللہ اور بندوں، دونوں کی نظر میں صرف تضیعِ اوقات ہی نہیں بلکہ گناہ ہے، اور ایک ایسا گناہ ہے جو توبہ کے بعد بھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن نہیں، یہ سعی کبھی مشکور نہیں ہو سکتی، یہ تو صرف ایک آدمی کا معاملہ ہے، اگر مسلمانوں کی پُوری قوم بھی ہلاک ہو جائے تو بھی یہ "علمائے کرام" اور یہ "پیرانِ پارسا" اپنی جگہ سے جنبش نہیں کریں گے ——

یہ "اٹھائیس سالہ نواب زادہ" میری بات تو کبھی نہیں مانے گا، ورنہ میں خود لاہور کے راستے میں اُس سے ملتا، اور ہات جوڑ کر درخواست کرتا کہ لے برادر خُدارا اپنے گھر واپس جا، اپنی قوم کی بیواؤں اور اپنی قوم کے یتیموں کی دستگیری کر کہ تیری یہ دستگیری، تیرے اِس قسم کے پچاس ہزار پیا حجوں سے بہتر ہو گی —— اپنی قوم کے درماندہ انسانوں اور بے یار و مددگار مزدوروں کی خدمت کر کہ تیری یہ خدمت تیرے اس قسم کے پچاس ہزار پیادہ حجوں سے بہتر ہو گی —— اپنے نوجوانوں کو فوجی تعلیم دینے کی سعی کر اور اپنے مسخ شدہ مذاہب کے مارے ہوئے بوڑھوں کی عقلیں درست کر کہ تیری یہ سعی تیرے اِس قسم کے پچاس ہزار پیادہ حجوں سے بہتر ہو گی —— اور اپنے ننگے، بھُوکے مُلک، اپنے ایڑیاں رگڑتے ہوئے مُلک کو محکومی و درماندگی سے نجات دلانے کی خاطر ایک جواں مرد سپاہی کی طرح سر سے کفن باندھ لے کہ تیرا یہ سر سے کفن باندھ لینا تیرے اِس قسم کے پچاس ہزار پیادہ حجوں سے بہتر ہو گا ——

لیکن میں کیا کروں —— یہ شخص میری بات ہرگز نہیں مانے گا۔ بات ماننا تو درکنار یہ تو میری صورت دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھالے گا، اِس لئے کہ میں شاعر، اور رند شاعر ہوں، جسے اِس نوعیت کے "اربابِ صلاح و تقویٰ" برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ افسوس!

محرمِ رازِ نہانِ روزگارم کردہ اند
تا بجرمِ حرفِ گوش نہند خلق، خوارم کردہ اند

حکومتِ ہند کے وحشتناک قید خانے

اب، جب کہ اُن سیاسی قیدیوں کی رہائی کی جانب ہماری توجہ بجا طور سے منعطف ہو چکی ہے جو انفرادی و ذاتی طور سے دہشت انگیزی و سازش کے ترک کردینے، اور کانگریس کے اُصولِ حق لوازئی وعدمِ اشتداد کے قبول کرلینے کا اعلان کرچکے ہیں، تو اس موقع پر ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ اِس سلسلے میں ہم ہندوستانی جیلوں کے اُن دیگر اسیروں کو بھی نظر انداز نہ کریں جن کی زندگیاں بدسلوکی کے خوفناک واقعات سے دم توڑتی نظر آرہی ہیں۔

کئے دن کی بھوک ہڑتالوں سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہندوستانی قید خانوں کے حالات کس بے پایاں حد تک ناقابلِ برداشت ہو چکے ہیں۔

اِس کے علاوہ ہندوستان کی اُس تمام پبلک کو جو اخبار بینی کا ذوق رکھتی ہے، نہایت ہی قلق کے ساتھ اُن دہشتناک اُمور کا علم ہو چکا ہے جو جیلوں کے عمّال اور پولیس کے افراد کے ہاتھوں جیلوں کی چار دیواریوں کے اندر آئے دن وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

میں آپ کو لاہور کے چیف جسٹس مسٹر جے، ڈی ینگ کے ایک فیصلے کی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ جس میں چیف جسٹس نے انتہائی غیظ و غضب سے بجا طور پر مغلوب ہوکر پولیس کے باب میں ایسے تلخ و تُرش الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جنھیں چیف جسٹس کی سی بلند ترین قانونی شخصیتیں، اپنے وقار کے منافی خیال کرکے نہایت ہی شاذ استعمال کرتی ہیں۔

چیف جسٹس نے اپنے اِس فیصلے میں اُن ہولناک اور عبرت انگیز ناقابلِ برداشت مظالم پر پولیس کو نہایت ہی شدّت کے ساتھ ملامت کی ہے، جو اقرارِ جُرم اور تکمیلِ شہادت کی خاطر، پولیس کے ہاتھوں بے قصور ملزموں پر آئے دن ہوا کرتے ہیں۔

اِسی طرح چیف جسٹس ہائیکورٹ پٹنہ نے بھی اُڑیسہ کے ایک مقدمے پر نہایت ہی تلخ الفاظ میں تبصرہ کیا ہے، جسے پولیس نے انتہائی غلط بیانی سے کام لے کر عدالت میں پیش کیا، اور عدالت کو گمراہ کرکے ایک نہایت ہی غلط فیصلہ حاصل کرلیا تھا جس کے باعث ایک شریف نوجوان کو کامل دس برس تک مصائب کا شکار رہنا پڑا تھا۔ اور آخر کار ہائیکورٹ نے اُس بیچارے کو اِس بلائے عظیم سے نجات دلائی تھی۔

ہائیکورٹوں کے اِن دو تازہ تبصروں سے اُن ناقابلِ شرح، اور ناقابلِ برداشت مظالم کا صرف ایک دھندلا سا خاکہ ہماری نگاہوں کے سامنے آتا ہے، جو پولیس کے ہاتھوں بے قصور افراد پر ہوا کرتے ہیں۔ لیکن پردے کے پیچھے کیا کیا ہوتا رہتا ہے۔ کس کی مجال ہے کہ وہ اُنھیں بیان کرنے کا تصور تک کرسکے۔

اِس سلسلے میں ریو رینڈ۔ سی، ایف اینڈ ریوز کا یہ بیان ہے کہ اُن کے پاس اُن ہندوستانی لیڈروں کی تحریریں موجود ہیں جن کی سیرت پر کوئی خوردہ گیری کی ہمت نہیں کرسکتا، اُن تحریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عدمِ تعاون کے دَورِ جیل میں اسیروں کے ساتھ ایسے ایسے سلوک روا رکھے جاتے تھے، جنھیں زبان پر لاتے ہوئے شرم و دہشت محسوس ہوتی ہے۔

قیدیوں کے ساتھ، جو انسان کی نسل سے ہیں، جانوروں اور کتّوں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا ـــــ ذرا ذرا سی بات پر اُنھیں مارا اور ٹھکرایا جاتا تھا، اور ایسے شرمناک اُمور پر مجبور کیا جاتا تھا، جن کے ارتکاب سے نفسِ انسانی خود اپنی نظر میں ذلیل ہو جاتا ہے جس کی ایک مثال یہ ہے کہ شائستہ تعلیم یافتہ اور خوش تربیت افراد کو اِس بات پر مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ ہزاروں آدمیوں کے سامنے برہنہ ہوں اور سب کے روبرو رفعِ حاجت کریں۔

کتنے مہذب و متمدّن افراد کو کال کوٹھریوں میں ٹھونس دیا جاتا تھا، جہاں بیماریوں کے جراثیم رینگا کرتے ہیں۔

اِس کے بعد مسٹر اینڈ ریوز تحریر کرتے ہیں کہ جس زمانے میں ہندوستانی قیدیوں کے حالات معلوم کرنے کی خاطر اُنھوں نے جیلوں کا معائنہ کیا تھا، قید خانوں کی چار دیواریوں کے اندر سے اُنھوں نے قیدیوں کی وہ دردناک چیخیں خود اپنے کانوں سے سُنی تھیں، جنھیں آج تک وہ فراموش نہیں کرسکے ہیں۔

یہ بات انتہائی قلق کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے کہ ہندوستانی جیلوں کا نظام سخت گیری اور انتقام پر مبنی ہے، اور قیدیوں کی اصلاح کے ہر تصور سے بُری طرح بے پروائی برتی جاتی ہے جس کا یہ عبرتناک انجام ہمارے سامنے ہے کہ قیدی جب جیل سے نکلتے ہیں تو جیسے وہ داخل ہوئے تھے اُس سے زیادہ بُرے انسان بن کر باہر نکلتے ہیں۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ قید خانوں کے بعض سپرنٹنڈنٹ نہایت ہی

شریف اور نیک دل ہوتے ہیں اور اُن کا دل بیتاب رہتا ہے کہ وہ اللہ کے ان قیدی بندوں کے ساتھ عدل و رحم کا ہر ممکن برتاؤ کریں، لیکن ہندوستان کے قید خانوں کا نظام اِس قدر سخت اور بے لچک واقع ہوا ہے کہ شریف سے شریف، اور رحمدل سے رحمدل سپرنٹنڈنٹ کا جذبۂ شرافت و ولولۂ مرحمت بھی دل ہی دل میں گھُٹ کر رہ جاتا ہے۔

کیا حکومت اِس مختصر سے نوٹ پر توجہ مبذول فرمانے کی زحمت گوارا کریگی؟

کیا ہندوستان کی پبلک اس مسئلے پر حکومت کو متوجہ کرنے کی خاطر ہاتھ پاؤں ہلائے گی؟

اگر محض امکان کا سوال ہے تو میں اس امکان کو تو مان لوں گا کہ ہندوستان کی حکومت ممکن ہے اس مسئلے پر توجہ مبذول کرے، لیکن میں اِسے کسی حالت میں بھی ماننے کو تیار نہیں کہ ہندوستانی پبلک اِس مسئلے پر دو منٹ بھی غور کرنے کی تکلیف گوارا کرسکے گی۔

"ہندوستانی پبلک" "ہندوستانی پبلک" یہ "ہندوستانی پبلک" ہے کیا بلا! کیا یہ انسانوں کا مجموعہ ہے؟ کیا واقعیٔ یہ انسانوں کا مجموعہ ہے؟

اگر گائے باجے پر لڑنے والے، مسجد و مندر پر جھگڑنے والے، محرّم ہولی پر پینترے بدلنے والے، چُٹیوں، داڑھیوں پر گتھم گُتھا کرنے والے، لوٹوں اور لُٹیوں پر ناچنے والے، بندروں اور موروں کو معبود ماننے والے، عُرسوں اور قوّالیوں میں تھرکنے والے اور زُنّار و تسبیح پر ایک دوسرے کا خُون بہانے والے انسان کہے جانے کے مستحق ہیں، تو پھر بیشک ہندوستانی پبلک مشتمل ہے انسانوں کے گروہ پر ——— اور اگر ایسا نہیں ہے اور ہرگز نہیں ہے، تو کیا اِن انسان نُما حیوانوں، حیوانوں نہیں، بلکہ درندوں سے کوئی یہ توقع رکھ سکتا ہے کہ وہ اپنے مُلک اور اپنی قوم کی خاطر قُربانی تو بڑی چیز ہے، ایک ذراسی جُنبش بھی کرسکیں گے۔

مُلک کی بھلائی کے لیے جُنبش کرنا تو درکنار، یہ گروہ اگر مُلک کی بربادی کے منصوبوں سے ہات اُٹھالے تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیئے۔

کیا آپ نے الہ آباد، بنارس اور حصار کے ہنگاموں کا حال نہیں سُنا؟ کیا آپ نے چار یار و پنجتن کی آنکھوں کے تاروں کی لکھنؤ شریف میں خونریزیاں نہیں دیکھیں؟ ———

ان حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر کبھی تو ہنسی آتی ہے اور کبھی رونا، اور کبھی کبھی نہ تو ہنسی ہی آتی ہے نہ رونا، بلکہ اِس قدر غصہ آتا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ ان تمام شریروں کو ایک میدان میں جمع کرکے سب کے سر بیک جنبشِ شمشیر اُڑادوں۔ مگر کیا کروں، قہرِ درویش بر جانِ درویش۔

لوگ کہیں گے جوشؔ نے پھر سخت اور درشت لہجے سے کام لینا شروع کردیا ہے۔ جی ہاں جوشؔ کو اقرار ہے کہ اُس نے پھر تلخ و درشت لہجہ اختیار کیا ہے۔ مگر وہ ایسا کرنے پر مجبور اور سخت مجبور ہے۔ اُس کے ہموطن اُسے دیوانہ بنائے دیتے ہیں دیوانہ۔ اگر وہ ہندوستان کے اِس پاگل خانے کا صرف ایک ہفتے کے لئے آمر بنا دیا جائے تو وہ دکھادے کہ ہندوستان کو مذہب کی آڑ میں شرارت کرنے والوں کے ناپاک وجود سے کس حیرتناک سُرعت کے ساتھ پاک کیا جاسکتا ہے۔

یہ اشرار، رُشد و ہدایت اور وعظ و تلقین سے ہرگز راہِ راست پر نہیں آسکتے۔ ان کے واسطے تو خاردار دُرّوں اور جوہردار تلواروں کی ضرورت ہے۔

مگر

غُلامی سے انسان مجبور ہے
زمیں سخت ہے، آسماں دور ہے

کاش اِس حقیقت کو تو محسوس کرسکے کہ اگر تیری سب تمنائیں پوری ہوجائیں تو دُنیا تجھے کس قدر قابلِ لعنت سمجھنے لگے۔

جب میں دیکھتا ہوں کہ مساوات کے طریقے بدل رہے ہیں تو "انسان ہونا" یہ فخر میرے دم میں دم توڑنے لگتا ہے۔

شاعروں کی عمیق فکروں سے عوام بہرہ اندوز نہیں ہوتے، جس کے پاس دوربین نہیں، باریک چیزیں کیونکر دیکھ سکتا ہے۔

اشتہاءِ شہرت میں بہت سے لوگ کام کرنے والوں کے ساتھ ہو جاتے ہیں جس طرح چلتے ہوئے موٹر پر چڑیا اُڑ کر بیٹھے اور دیکھنے والوں پر یہ ثابت کرے کہ پہیوں سے جو اس درجہ گرد اُڑ رہی ہے وہ میں ہی اُڑا رہی ہوں۔

ہم نے خواب میں دوستی کی، خواب ہی میں دشمنی، خواب میں پیدا ہوئے اور خواب ہی میں مرگئے، خواب ہی میں شادی کی، خواب ہی میں غم۔ یہ ہے دنیا، اُس کی ابتدا اور انتہا۔

رُباعیاتِ جوشؔ

اپنی ہی غرض سے جی رہے ہیں جو لوگ
اپنی ہی عبادتیں سی کر رہے ہیں جو لوگ
ان کو بھی ہے کیا اثر اب پیغمبرؐ
انسان کا خون پی رہے ہیں جو لوگ

حق کا ہو عروج، ہر دل چاہتا ہے
باطل مٹ جائے، ہر جی چاہتا ہے
لیکن یہ بزرگوار جو چپ بیٹھے ہیں
کیا قادرِ مطلق بھی وہی چاہتا ہے

ہیکل ہے مرے لئے انصابِ زر و سیم
حاصل ہے مجھے سلطنتِ قلبِ سلیم
کہتی ہے نگاہ ہوں میں جو آفاق و حیات
میری ہستی ہے وہ رصد گاہِ عظیم

مہتاب کی ضو سے گلستاں ہے تیریں
پہلو میں مچل رہا ہے اک ماہِ حسیں
ڈرتی ہے کہ آرزو لئے آیا ہے یہ کون؟
کہہ دو کہ پلٹ جائے، مجھے وقت نہیں

شاعر کا ایثار

تجھے خبر بھی ہے ہندوستاں! کہ تیرے لئے
عمل پسند ہے، غفلت شعار تھا جو شخص

رواں ہے دار و رسن کی طرف تری جانب
اسیرِ حلقۂ گیسوئے یار تھا جو شخص

وہ آج نوکِ سناں کا ہے والہ و شیدا
ہلاکِ طُرّۂ زُلفِ نگار تھا جو شخص

بنا ہوا ہے گدائے رہِ نگار، دماغ
دیارِ دل کا کبھی شہریار تھا جو شخص

وہ آج تیغِ رواں کا ہے ہمدم و دمساز
رفیقِ سروِ لبِ جُوئبار تھا جو شخص

وہ آج طنطنۂ طبلِ جنگ کا ہے امین
انیسِ زمزمۂ آبشار تھا جو شخص

شُعاعِ مہرِ خزاں سے ہے آج گرمِ کلام
خطیبِ منبرِ ابرِ بہار تھا جو شخص

وہ آج صرصر و خورشید سے ہے گرمِ ستیز
نسیم پیشہ و شبنم شعار تھا جو شخص

وہ آج صاعقہ بر دوش و سیل بر کف ہے
سمن بدست و چمن در کنار تھا جو شخص

جوش ملیح آبادی

جاپان کی سبق آموز کہانیاں

مترجمہ محمود علی خاں (جامعی) بی، اے

یوں تو جاپان کی ہر چیز سائنس کے اصولوں پر مبنی ہے، اس لئے ہمارے لئے سبق آموز ہے، لیکن اس باب میں میں نے اُن سچے واقعات کو جمع کر دیا ہے جن سے میرے ہم وطنوں کو حب الوطنی و احساس ذمہ داری، حق العباد، اور اصلاحِ سیرت کا سبق مل سکتا ہے، وقتاً فوقتاً میں یہ قصے ہندوستانی اخباروں میں شائع کراتا رہا ہوں، اب یہاں انھیں یک جا پیش کئے دیتا ہوں،

میری دلی تمنا ہے کہ کاش ہمارے نوجوان اپنے جاپانی بھائیوں سے سبق حاصل کریں اور مادرِ وطن کی جانب سے اُن پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں اُن سے پوری طرح عہدہ برا ہوں۔

وطن پرست طالب علم تیار کرنا

جاپان کے افسرانِ تعلیم کا یہ نصب العین ہے کہ وطن پرستی کے جذبہ کے ساتھ ساتھ تعلیم ہونا چاہیئے۔ چنانچہ طلبا کو اڈمرل ٹوگو کے حالاتِ زندگی بتانے کے لئے محکمۂ تعلیمات نے ان کی زندگی کا ایک فلم تیار کیا ہے جسمیں "کیاگوشیما" کی جنگ سے لے کر اُن کے جنازے کے جلوس کے واقعات تک دکھائے گئے ہیں۔ یہ تعلیمی فلم ملک کے تمام پرائمری اور مڈل اسکولوں میں بھیجا جائے گا، برعکس اس کے ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی تصویر بھی اسکولوں میں لگانا جُرم سمجھا جاتا ہے۔

وزیر کی وطن پرستی

میں اپنے اُن بھائیوں کی ہدایت کے لئے جو مغربی فیشن اور انگریزی رسم و رواج کی تقلید پر فخر کرتے ہیں ایک جاپانی وزیر کی وطن پرستی کا واقعہ ذیل میں درج کرتا ہوں۔

جاپان میں کثرت سے بچے اپنے باپ اور ماں کو "اوتوسان اوکاسان" کے بجائے "پاپا" اور "ماما" کہنے لگے ہیں، حتیٰ کہ اب یہ چیز لوگوں کی نظروں میں کھٹکنے لگی ہے، اس کے سب سے بڑے مخالف مسٹر رت سووا وزیرِ تعلیم ہیں جو خصوصیت سے اس کے انسداد کی کوشش کر رہے ہیں، چنانچہ جاپانی زبان کے ایک اخبار میں آپ تحریر فرماتے ہیں۔

"وزیرِ تعلیم کو تعلیمات کے سلسلے میں خواہ کچھ بھی اختیارات حاصل ہوں لیکن یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے خانگی معاملات میں بھی دخل دے، تاہم میں اس سلسلے میں کچھ عرض کرنے کی جرات کرتا ہوں، میری یہ عین خواہش ہے کہ جاپانی گھروں سے "پاپا" اور "ماما" کے الفاظ خارج ہو جائیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر جاپانی بچے اپنے والدین کو جو انتہائی احترام کے مستحق ہیں بدیشی الفاظ سے کیوں مخاطب کرتے ہیں، میں عرصے سے یہی رائے رکھتا ہوں اور میں نے وزیرِ تعلیم ہونے سے پہلے بھی اکثر اپنی تقریروں میں بار بار اس کا اعادہ کیا ہے۔

جب میں فرانس میں تھا تو لارڈ کرزن (جو اس وقت برطانیہ کے وزیر

خارجہ تھے) کسی معاملہ میں حکومتِ فرانس سے گفت و شنید کرنے کے لئے پیرس آئے تھے، اگرچہ وہ فرانسیسی زبان کے ماہر تھے، لیکن جب فرانسیسی وزیر خارجہ موسیو پوئنکارے سے گفتگو کرتے تھے تو برابر انگریزی بولتے تھے، اسی طرح موسیو پوئنکارے بھی اگرچہ انگلستان کے قدیم باشندے تھے، اور نہایت روانی سے انگریزی بول سکتے تھے، لیکن وہ بھی فرانسیسی میں بات چیت کرتے تھے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک قوم کو اپنی مادری زبان کا کتنا احترام کرنا چاہیے۔

میں غیر ملکی تہذیب کا مخالف نہیں ہوں، بلکہ میں چاہتا ہوں کہ لوگ غیر زبانیں سیکھیں تاکہ اُن میں جو اچھائیاں ہوں وہ اختیار کر سکیں، لیکن "پاپا" اور "ماما" جیسے بدیشی الفاظ اختیار کرنے سے کیا فائدہ ہے، یا عورتوں کو بال کٹانے، مغربی لباس پہننے اور اُن کے رسم و رواج کی پیروی کرنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے، مجھے تو عورتوں کے کٹے ہوئے بالوں اور مغربی لباس میں کوئی حسن نظر نہیں آتا۔"

وزیر تعلیم خانگی زندگی میں ان الفاظ کے استعمال کے اتنے شدید مخالف ہیں کہ بقول نپن ڈمپو (خبر رساں ایجنسی) وہ عنقریب یہ ہدایات جاری کرنے والے ہیں کہ پرائمری مدارس اور کنڈر گارٹن کلاس میں کوئی بچہ یہ الفاظ استعمال نہ کرے، نیز والدین سے بھی وہ یہ درخواست کریں گے کہ گھروں پر بھی اپنے بچوں کو "پاپا" اور "ماما" کہنے سے روکیں، وزیر موصوف کا یہ عقیدہ ہے کہ ان الفاظ کا غیر ممالک میں خواہ کچھ ہی مفہوم کیوں نہ ہو لیکن جاپان میں ان کے استعمال کرنے سے والدین اور بچوں کے روایتی تعلقات پر ناگوار اثر پڑتا ہے، اور اُن میں محبت کم ہوتی جاتی ہے۔

دھیلے کا جنگی جہاز

جاپان وطن پرستی میں لاثانی ہے، وہاں آئے دن ایسی تجویزیں سننے میں آتی رہتی ہیں جن کے ذریعے سے عوام کی وطن پرستی سے فائدہ اُٹھا کر مستقبل کو درخشاں بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، چنانچہ تازہ ترین کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ تازہ ترین کوشش "دھیلا روز" کی تجویز ہے، جسے اوساکا کے ایک سابق جہاز راں مسٹر ہیکو نارو ہنایامانے شروع کیا ہے، بہت سے سابق جہاز راں اور نوجوانوں کی انجمنوں کے اراکین اس میں شریک ہیں، ہر شخص کو دھیلا روز دینا ہوتا ہے، تاکہ اس رقم سے قومی جنگی جہاز تیار کیا جائے، اس طرح کے چھوٹے چھوٹے چندوں سے فوج کو بہت سے ہوائی جہاز بھی پیش کئے جا چکے ہیں۔

اس واقعہ سے ہمارے نوجوانوں کو اندازہ کرنا چاہیئے کہ اگر وہ چاہیں تو تعمیر قوم کے پروگرام میں کتنی امداد کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی روپیہ کی کمی نہیں ہے، البتہ سچے کام کرنے والوں کا قحط ہے، کیا ہمارے نوجوان اپنے جاپانی بھائیوں کی پیروی کرنے کی کوشش کریں گے۔

مادرِ وطن پر جان قربان

اِدھر حکومتِ جاپان نے واشنگٹن کے بحری معاہدہ کو منسوخ کرنے کا فیصلہ کیا اور اُدھر ایک جہاز راں کو نئی زندگی حاصل ہوئی۔ اُس نے اپنے جہاز سے علیحدہ ہو جانے کی شرمندگی کی وجہ سے خودکشی کرنا طے کر لیا تھا، اُس کا نام "گئی چی کوتہ" تھا، اور "یوکوسوکا اڈمیرلٹی" کے ساتویں سب میرین اسکواڈرن میں ملازم تھا، اس نے ایک اخبار میں مذکورہ بالا اعلان پڑھا اور کتاشی کے پولیس تھانہ میں حاضر ہو گیا۔

اس نے بیان کیا کہ جمعرات کو میں جہاز سے اُترا، اور ٹوکیو کے ایک قہوہ خانہ میں اپنی محبوبہ سے ملنے گیا، لیکن معلوم ہوا کہ وہ وہاں سے جا چکی ہے، اُسے بہت کچھ تلاش کیا، لیکن تمام جستجو بے سود ثابت ہوئی، اسی تگ و دو میں جہاز پر جانے میں دیر ہو گئی۔ اس طرح ہر طرف سے مایوس ہو کر میں نے طے کر لیا کہ سمندر میں کود کر اپنی جان دیدوں گا۔ میں سنیچر کے دن ایک ہوٹل میں ٹھیرا ہوا تھا، وہیں میں نے اخبار میں یہ اعلان پڑھا کہ حکومت نے معاہدۂ واشنگٹن کو منسوخ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، چنانچہ مجھے فوراً موقع کی نزاکت کا احساس ہوا اور سوچا کہ مجھے بھی اپنا فرض انجام دینا چاہیئے، اس لئے میں پولیس میں حاضر ہو گیا ہوں۔

اس پر یوکوسوکا کے دو بحری افسروں نے اسے واپس لے لیا، اب وہ صرف اس لئے زندہ ہے کہ مادرِ وطن پر اپنی جان قربان کر دے۔

جاپانی پارلیمنٹ کے سودیشی ممبر

ستمبر میں بلگریڈ میں کامرس کی بین الاقوامی کانفرنس کا انیسواں اجلاس ہونے والا تھا، اس میں شرکت کے لئے جاپانی پارلیمنٹ کے پانچ ممبر روانہ ہوئے تھے، اور اُنھوں نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اس تمام سفر میں صرف جاپانی زبان میں بات چیت کریں گے، اور جاپانی وضع کا لباس

پہنیں گے۔

مسٹر اکاکو ساکا موتو بھی اس وفد کے ایک رکن تھے، اُنھوں نے فرمایا کہ یہ سفر محض وطن پرستی کے جذبہ پر منحصر ہے۔ میں نے سوچا کہ جاپانی زبان میں تقریریں کروں گا، اور بہت زور زور سے بولوں گا، کیوں کہ باہر والے اُسی وقت متاثر ہوتے ہیں جب کوئی خوب چلا چلا کر تقریر کرے۔ میں جاپانی کُشتی کا بھی ماہر ہوں، اس لئے کمال پاشا، مسولینی اور ہٹلر کے سامنے اس کے کرتب دکھاؤں گا، جاپان کو ان کانفرنسوں میں کہنا ہی کیا ہے، ہم تو جاپان کی خاص خاص چیزوں کا مظاہرہ کرنے کے لئے جا رہے ہیں، ہم اپنے مغربی طرز کے کپڑے بھی ساتھ لے جائیں گے۔ لیکن صرف اُس وقت پہنیں گے جب جاپانی کپڑے کی خوبیاں پیش کرنا ہوں گی، ہمارے کپڑوں سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ جاپانی ریشم کتنا اعلیٰ ہوتا ہے، ہمیں امید ہے کہ ہماری اس ترکیب سے جاپانی مال کی مانگ بڑھ جائے گی۔

خون سے رنگا ہوا جھنڈا

جاپانیوں کی انتہائی وطن پرستی کی ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو۔ ایک بیس سالہ نوجوان آساکوسا کے پولیس تھانے میں حاضر ہوا، اور کہا کہ میں نے ایک جاپانی جھنڈا خود بنایا ہے، اور اُسے منچوکو میں متعینہ سپاہیوں کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں، اس کے علاوہ اس نے ایک روپیہ بھی چندے میں دیا۔

یہ نوجوان ایک قصاب کی دوکان پر ملازم تھا، اُس نے اپنی اُنگلی کاٹ کر اپنے خون سے جاپان کا آفتابی جھنڈا بنایا تھا، چونکہ اُسے خود سپاہی کی حیثیت سے بھرتی نہیں کیا گیا تھا، اس لئے اُس نے سوچا کہ جو سپاہی وہاں گئے ہیں اُن کی اس طرح ہمت افزائی کرنا چاہیئے۔

ہمارے یہاں بھی ہر فرد میں وطن پرستی کا یہی جذبہ ہونا چاہیئے جب کہیں ہم یہ امید کر سکیں گے کہ خوابِ آزادی کی تعبیر پوری ہوگی، خدا ہمیں اس کی توفیق عطا کرے۔

تختۂ دار پر سے وصیت لاش بھی وطن کی نذر

جاپانی وطن پرستی کی ایک اور عجیب و غریب مثال ملاحظہ کیجئے، تصور کیجئے کہ ایک قاتل تختۂ دار پر سے وصیت کر رہا ہے کہ میری لاش سے فوج استفادہ کرے، اس شخص کا نام تتابے تھا، اور عمر تیس سال تھی، ایک ٹیکسی ڈرائیور کے قتل کے سلسلے میں اُسے پھانسی کا حکم ہوا تھا، عدالت عالیہ نے اس کی اپیل نامنظور کر دی تھی، اس لئے اچی گایا جیل میں اُس نے اپنے باپ کو وصیت کی کہ میری لاش یونیورسٹی کے اسپتال میں دے دی جائے اور وہاں سے جو رقم ملے وہ فوج کو پیش کر دی جائے، میں اپنے آخری وقت میں ملک کی اور کیا خدمت کر سکتا ہوں، بجز اس کے کہ میری موت سے فوجی فنڈ میں کچھ اضافہ ہو جائے۔

جاپان کی ترقی کا یہی راز ہے، نہ کہ صرف شرح سکہ کی کمی، جیسا کہ ہندوستان میں ہمیں سمجھایا جاتا ہے۔

وطن پرست طلبا کے کارنامے

ہمارے مدرسین اور طلبار کو اس سے سبق سیکھنا چاہیئے، کہ جاپان کے پرائمری مدارس کے طلبار کس طرح قومی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں، یہ لڑکے ردی چیزوں مثلاً استعمال شدہ بوتلوں، پُرانے اخبارات وغیرہ کو بیچ کر رقم جمع کرتے ہیں تاکہ قومی ہوائی جہاز کے لئے چندہ دیں، اس سلسلے میں ایک جاپانی اخبار رقمطراز ہے،

"سال گزشتہ سے ٹوکیو آئر ڈیفنس یونین شاہی فوج کے لئے چندہ جمع کر رہی ہے، ٹوکیو کے اوجی حلقے نے اس سلسلے میں خاص کوشش کی، اُن کا یہ کارنامہ قابلِ صد آفرین ہے۔

اس حلقے کے نوجوانوں نے فوج کو ایک ہوائی جہاز پیش کیا ہے، اور وہ اس طرح کہ پرائمری مدارس کے طلبار نے خالی بوتلیں اور پُرانے اخبار جمع کر کے فروخت کئے، ایسی ہی اور سینکڑوں معمولی معمولی ترکیبوں سے یہ کثیر رقم اکٹھا کی، پھر اس رقم سے ہوائی جہاز خرید کر فوج کو پیش کیا۔"

کیا ہمارے نوجوان اس طرح کے قومی کاموں کے لئے روپیہ جمع نہیں کر سکتے؟ بیشک کر سکتے ہیں، بشرطیکہ اُن کے استاد اور نوجوانوں کے نام نہاد لیڈر اُن کی رہبری کریں، لیکن یہ لوگ تو صرف جلسے کرنا اور طول طویل بیان شائع کرنا جانتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ جنوری میں زور شور سے بحث مباحثے کر لینے سے اُن کا فرض ادا ہو جاتا ہے۔

پروفیسروں کو وطن پرستی کی ہدایت

ہندوستان کی طرح جاپان کے طلبا غدارِ وطن پروفیسروں کی حرکات کو برداشت نہیں کرتے، مثلاً ایک قصہ سُنئے۔

- ٹوکیو امپیریل یونیورسٹی کے پروفیسر ہکوتسو کامی گاوا نے "گیکو جی ہو" رسالہ میں ایک مضمون "معاہدہ واشنگٹن کی تنسیخ اور اس کے نتائج" کے عنوان سے شائع کرایا، اس میں انھوں نے حکومت کے رویہ پر انتہائی نکتہ چینی کی تھی، اس مضمون کو پڑھکر اُن کے دو نوجوان طالب علم اتنے مشتعل ہوئے کہ اُنھوں نے اپنے پروفیسر کو ایک خط لکھا اور اُن سے مطالبہ کیا کہ استعفیٰ داخل کر دیں۔

ایک دن وہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے، یہ دونوں نوجوان اُن کے گھر پہونچے۔ اس خط کو باآواز بلند وہاں پڑھا، انھیں غدار وغیرہ کہا اور تمام کتابیں، کرسیاں، میزیں اُلٹ پلٹ کر چلے آئے، اس کے بعد جب وہ گرفتار ہوئے تو اُنھوں نے پولیس کے سامنے اقبال کیا اور کہا کہ تخفیف اسلحہ کانفرنس کے معاملہ میں پروفیسر کامی گاوا کی رائے نہایت ناقص اور کمزور تھی، اس لئے ہم نے ایسا کیا،

اس کے مقابلے میں ذرا ہندوستان کو دیکھئے جہاں استاد اپنے طالب علموں کی جاسوسی کرتے ہیں، اور ان خدمات کے عوض میں خطاب پاتے ہیں۔

چندہ جمع کرنے کی تدبیریں

ہمارے کارکنوں کو کسی قومی کام کے لئے چندہ جمع کرنا ایک مصیبت معلوم ہوتا ہے، انھیں دیکھنا چاہئے کہ جاپان والے اس کے لئے کیا تدابیر اختیار کرتے ہیں۔

گراموفون کے تاجروں کی انجمن، شاہی فوج کے لئے کچھ چندہ دینا چاہتی تھی، چنانچہ اس نے طے کیا کہ تمام ریکارڈوں پر ایک سُرخ مہر لگادی جائے اور ان ریکارڈوں پر ایک دھیلا زیادہ لیا جائے، اس طرح تین ماہ میں جو رقم جمع ہو وہ کسی فوجی کام کے لئے دے دی جائے۔

اگر ہماری تجارتی انجمنیں بھی قومی کاموں کے لئے اسی طرح چندہ جمع کرنے کی کوشش کریں تو بغیر کسی جدوجہد اور مطالبہ کے لاکھوں روپیہ جمع ہو جائیں، مثلاً اگر ایک روپیہ کی کسی چیز پر وہ ایک پیسہ زیادہ لینے لگیں تو گاہکوں کو بھی گراں نہ گزرے اور کافی روپیہ جمع بھی ہو جائے۔ مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ تاجروں کی تنظیم کی جائے، اور انھیں اس قسم کے اقدام کے لئے آمادہ کیا جائے۔

عرضی پر خون سے دستخط

جاپان میں انقلاب پسندوں کی زبردست جماعتیں ہیں، اور عوام میں اُن کا بہت بڑا اثر ہے۔ یہ لوگ اکثر اُن وزراء کو قتل کر دیا کرتے ہیں جن سے ذرا بھی کمزوری کا اظہار ہوتا ہے، حال ہی میں ایک سابق وزیراعظم کے قتل کی سازش کے سلسلے میں بعض انقلاب پسندوں پر مقدمہ چلا تھا، اس موقعے پر سارے ملک نے یہ مطالبہ کیا کہ چونکہ ملزموں کی نیت خراب نہ تھی، اور اُنھوں نے حب الوطنی کے جذبہ کے ماتحت یہ فعل کیا اس لئے انھیں سخت سزا نہ ہونا چاہیئے، ہزاروں آدمیوں نے اس قسم کی تحریری درخواستیں عدالت میں پیش کیں، چنانچہ بقول ایک اخبار کے ایک درخواست ینگ جاپان لیگ کے تین سو اراکین نے اپنے خون سے دستخط کر کے پیش کی اور یہ مطالبہ کیا کہ ۱۵ مئی کے مقدمہ سازش کے ملزمین کو فوراً بری کر دیا جائے، یہ درخواست لیگ کے نمائندے مسٹر گیجی اجی جی نے مسٹر ناوسا اوبار وزیر قانون کو خود پیش کی اور بتلایا کہ لیگ کے جلسۂ عام میں یہ درخواست گذرانا منظور کیا گیا ہے، چنانچہ ججوں نے ملزموں کو بہت معمولی سزائیں دینے پر اکتفا کیا،

اگر ہندوستان میں ایسی کوئی درخواست پیش کی جاتی تو سب کے سب دستخط کرنے والے فوراً گرفتار کر لئے جاتے، اور مقدمہ چلائے بغیر اُنھیں نظربند کر دیا جاتا۔ لیکن جاپان میں ایسے لوگوں کی اور زیادہ عزت ہوتی ہے۔

مغربیت کو دُور سے سلام

جاپان میں قومیت کا دَور دورہ ہے، جس طرح ہٹلر تمام "غیر آرین" الفاظ کو جرمنی سے خارج کرنے کی کوشش کر رہا ہے اسی طرح جاپان بھی اپنے یہاں مغربیت کو دفن کرنے کی فکر میں ہے، اکثر اخباروں اور تاجروں نے لفظ "جاپان" کا استعمال ترک کر دیا ہے، کیونکہ اُن کا خیال ہے کہ یہ بدیشی نام ہے اس کے بجائے وہ "نپن"[1] استعمال کرتے ہیں۔

احیائے قومی کی تحریک کے ساتھ ساتھ تمام پہاڑوں اور ندیوں کے بھی نئے جاپانی نام رکھے جا رہے ہیں۔ اخبار "نچی نچی" نے "اپنے وہی پُرانے اچھے نام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جسے پڑھ کر ہمارے ان ہندوستانیوں کی آنکھیں کُھل جانا چاہئیں جو مغربی اصطلاحات کی اندھا دھند تقلید کرنے پر فخر کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے

---

[1] نپن سنسکرت کا لفظ ہے جس کا مطلب طاقتور ہے۔

"نیشنل پارک کمیشن نے حال ہی میں یہ طے کیا ہے کہ "جاپانی ایلپ" کو جاپانی زبان میں "مرکزی سلسلۂ کوہ" کہنا چاہیے بدیشی لفظ "ایلپ" کو ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا جائے۔ یہ وہ نیک کام ہے جو آج سے بہت پہلے ہونا چاہیے تھا، جب ہم اپنے پہاڑ کا نام اپنی زبان میں رکھ سکتے ہیں تو ہمیں اس نام کے اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے، جو کسی غیر ملکی سیاح نے رکھ دیا ہو، عام طور پر یہ فیشن سا ہو گیا ہے کہ اپنی تفریح گاہوں اور مشہور مقامات کو بیرونی چیزوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے "ایلپ" نام بھی اختیار کر لیا گیا۔ بعض جاپانی اوساکا کو مشرق کا مانچسٹر کہتے ہیں، اسی طرح بعض ندیوں کو جاپانی رائن یا جاپانی ڈینیوب کا خطاب دیتے ہیں اور ساحلی گرم چشموں کو جاپانی ناپولی یا ریویرا کہتے ہیں، حیرت ہے کہ کسی نے سومیدا ندی کو ٹوکیو کی ٹیمس کیوں نہیں کہا؟

بہر حال اب اس میلان کی سختی سے مخالفت ہو رہی ہے اور اس مخالفت کا کچھ نتیجہ برآمد ہو رہا ہے۔ ہمیں اپنی چیزوں کے نام اپنے طور پر اپنی ہی زبان میں لینا چاہیے۔ الکٹریسٹی کا لفظ بین الاقوامی طور پر مشہور ہے۔ لیکن اسے ادا کرتے وقت زبان دس بارہ قلا بازیاں کھاتی ہے، نازیوں نے اس کے بجائے جرمن زبان کا لفظ "برق" اختیار کر لیا ہے، جس کا مفہوم برق یا بجلی ہے۔ ہمیں اس جذبہ کی حقیقت پر غور کرنا چاہیے جس کے ماتحت وہ بدیشی الفاظ خارج اور آرین الفاظ اختیار کر رہے ہیں۔

البتہ اگر شدید ضرورت مجبور کرے تو بدیشی الفاظ کو اپنی زبان کے جامے میں ڈھال کر استعمال کرنا چاہیے۔ محض جھوٹا علمی وقار قائم کرنے اور خواہ مخواہ رعب ڈالنے کے لئے بدیشی الفاظ عمداً استعمال کرنا قومی جرم ہے۔

پولیس والوں کی قربانیاں

جاپان کے پولیس والوں میں بھی قربانی کا جذبہ پایا جاتا ہے، وہ غریبوں، محتاجوں اور مظلوموں کی دل کھول کر امداد کرتے ہیں، بلکہ وہ اپنے ضرورت مند ہم وطنوں کی خدمت کے لئے اپنے خون سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

اوگی باشی تھانہ کے علاقہ میں اکثر ہسپتالوں میں ایسے مریض آجاتے ہیں جن کے جسم میں فوراً بیرونی خون داخل کرنے کی ضرورت ہوتی تھی اور چونکہ ہر مریض کے لئے ایک خاص قسم کا خون درکار ہوتا ہے، اس لئے وہاں کے ڈاکٹر پولیس والوں کا پہلے سے امتحان کرکے اُن کے خون کے نمونے رکھتے ہیں، یہ تجویز خود پولیس انسپکٹر تکے شیرو شیبا نے پیش کی تھی، جو اس تھانہ کا افسر اعلیٰ ہے۔

ذرا اس کا مقابلہ اپنے یہاں کے پولیس والوں سے کیجئے اور دیکھئے کہ ان کا رویہ بے گناہوں کے ساتھ کیسا ہوتا ہے۔

انگریزی کا بائیکاٹ

مسٹر متسوداونزیر تعلیم "پاپا" اور "ماما" کے استعمال کو روکنے کی امکانی کوشش کر رہے ہیں، انہوں نے اعلان کیا ہے کہ اس مسئلہ میں انھیں دو سو سے زیادہ خطوط موصول ہوئے جن میں سے صرف ۳۰ خط اس تجویز کی مخالفت میں تھے، اُن کا کہنا ہے کہ ۱۹۲۳ء کے زلزلہ سے پہلے گنزا بازار میں انگریزی سائن بورڈ بہت زیادہ تھے۔ لیکن اب بہت کم نظر آتے ہیں۔ چنانچہ وزیر موصوف کی پیشین گوئی ہے کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب جاپانی گھروں میں "پاپا" اور "ماما" کے الفاظ بھی سننے میں نہ آئیں گے۔

جاپان نہایت سرعت سے انگریزی الفاظ اور انگریزی عادات واطوار چھوڑ رہا ہے، لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان انھیں اختیار کر رہا ہے۔ ہندوستان میں اسّی فیصدی دوکاندار حتیٰ کہ نائی اور دھوبی تک جو انگریزی کے حرف آشنا بھی نہیں ہوتے انگریزی ہی کے سائن بورڈ لگاتے ہیں۔

ہندوستانی امراء کے لئے سبق

ڈاکٹر کاسے متسو (پروفیسر کنسائی یونیورسٹی) کے واقعہ سے اُن کی سیرت کے ایک خاص پہلو پر روشنی پڑتی ہے، اور اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اپنے پرانے اسکول سے کتنی محبت تھی۔ انھوں نے سوگے مورا کے پرائمری مدرسے کی عمارت کے لئے جہاں انھوں نے بچپن میں تعلیم پائی تھی، دس ہزار ین دیئے لیکن یہ رقم دے کر بھی اُن کے دل کو سیری نہ ہوئی، اور خاموشی سے مزدوروں کی طرح خود عمارت کا کام کرنے لگے، شروع شروع میں انھیں کسی نے نہ پہچانا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کون شخص تھا۔ دراصل وہ روپیہ سے مدد کرنے کے علاوہ اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے اسکول کا کچھ کام کرنا چاہتے تھے، کیونکہ انھیں یہاں کی تعلیم پر ناز تھا۔

دوسری مثال سُنئے، جاپان کے دوسرے آدرہ فرعون یعنی متسوئی اور متسوبشی نے جاپان کے قحط زدہ لوگوں کے لئے ساٹھ لاکھ ین دیئے، اور

وزیر خارجہ کو اس کا اختیار دیا کہ جس طرح چاہیں اس رقم کو خرچ کریں، وزیر موصوف نے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے فوراً اپنے محکمہ کی ایک کانفرنس طلب کی چنانچہ امید ہے کہ عنقریب مزید امدادی فنڈ جمع کیا جائے گا۔

ہندوستان میں جاپان کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں لکھ پتی موجود ہیں، ان واقعات سے انھیں سبق سیکھنا چاہیئے۔ دیکھئے ہمارے یہاں سارے ہندوستان سے چندہ جمع کرنے پر وائسرائے کا زلزلہ فنڈ بہ ہزار دقت پچاس لاکھ روپیہ تک پہنچ سکا تھا، حالانکہ اس میں والیانِ ریاست اور لکھ پتی سب شامل تھے۔ لیکن جاپان کے صرف دو شخصوں نے ۷۰ لاکھ ین دے ڈالے۔ یہ ہے جاپان کی ترقی کا ایک راز۔ اس لئے اے ہندوستانی لکھ پتیو! تم بھی بیدار ہو اور اپنی تھیلیوں کے منہ کھول دو۔

ایک بیوہ کی وطن پرستی

جاپان کی عورتیں بھی کتنی بلند حوصلہ ہوتی ہیں، انھیں دیکھ کر ہندوستان کی بہادر راجپوت عورتوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جن کے کارنامے تاریخ داں حضرات پر اچھی طرح روشن ہیں۔

ٹوکیو میں ایک بیوہ عورت خادمہ کی حیثیت سے کام کیا کرتی تھی، اس نے ایک ہزار ین کے کپڑے برتن وغیرہ ان سپاہیوں کے لئے پیش کئے جو جاپان کے باہر مصروف تھے، اس عورت کا نام مسنر ہنا بوکیوتہ اور عمر ۶۰ سال تھی، یہ ٹوکیو میں ایک دواساز موتوکیچی کیتا کے یہاں کام کرتی تھی۔ جب اُس نے اخباروں میں پڑھا کہ ہمی جی کور کا ایک شخص پرائیوٹ کوآہار انچوریا میں سخت زخمی ہوا ہے، تو پہلے اس نے ضروری سامان کا ایک سٹ اُسے روانہ کیا، اس کے بعد وہ مختلف مواقع پر منچوریا کے سپاہیوں کو تحائف بھیجتی رہی، ایک مرتبہ اسے معلوم ہے کہ منچوکو سے ایک سپاہی یوسرٹی نامی واپس آیا ہے اور اُسے کاروبار کے لئے کچھ روپیہ کی ضرورت ہے فوراً اس نے دوسوین دے کر اسے چاول کا بیوپار کرا دیا، اس کا ایک دور کا رشتہ دار ریلو ژن انجینرنگ کور میں ملازم تھا، ایک موقع پر جب اس کور کے تقریباً بیس شخص ٹوکیو بھیجے گئے تو اس نے سب کے قیام و طعام کا انتظام کیا تھا۔ یہ عورت کنجیر وکیوتہ کی بیوہ تھی، جو کبھی امپیریل منا پلی بیورو میں ملازم تھا، اسے بیوہ ہوئے گیارہ برس کا عرصہ ہوچکا تھا، اس کے چھ اولادیں ہوئی تھیں۔ لیکن سب کی سب مرچکی تھیں۔ چنانچہ وہ اپنے ہر بچہ کی برسی کے موقع پر یہ سامان بھیجا کرتی تھی۔ اور کہتی تھی کہ میرے کوئی لڑکا نہیں رہا جو ملک کی خدمت کرتا۔ اس لئے جو کچھ مجھ سے ہوسکتا ہے میں ہی ان کی روحوں کی طرف سے ملک کی خدمت انجام دیتی ہوں۔ اس کے پاس ہمی جی، اوکا یما اور دوسری رجمنٹوں اور مختلف افراد کے بھیجے ہوئے آٹھ سو شکریئے کے خطوط موجود تھے، ایک ملاقات کے دوران میں اس نے اخبار کے نمائندے سے کہا کہ چونکہ میرے تمام لڑکے ملک کی خدمت کئے بغیر مر گئے۔ اس لئے جو کچھ مجھ سے ہوسکتا ہے میں ہی کرتی رہتی ہوں۔ محنت مزدوری سے جو کچھ میں پیدا کرتی ہوں اس میں سے کچھ پس انداز کرکے اُن سپاہیوں کے لئے کچھ نہ کچھ خرید لیا کرتی ہوں جو منچوکو جیسے سرد ملک میں متعین ہیں۔

آج ہمیں بھی ایسی ہی وطن پرست عورتوں کی ضرورت ہے۔

جاپان کی نجات دہندہ

جاپان کی سماجی اور امدادی سرگرمیوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہاں کی عورتیں نہایت مستعد، وطن پرست اور قربانی کرنے والی ہیں۔ اور حکومت بھی رفاہِ عام کے تمام کاموں میں اُن کی مدد کرتی ہے۔

جب جاپان میں قحط پڑا تو ٹوکیو کے روزگار مہیا کرنے والے دفتر نے ایسے ہزار خاندانوں کی فہرست تیار کی تھی جو قحط زدہ علاقے کی کم از کم ایک لڑکی کو ملازم رکھ لیں۔ تاکہ اُن کے والدین روپیہ کی خاطر انھیں پیشہ کمانے کے لئے چکلہ میں نہ بھیج دیں۔ اسی طرح عورتوں کی انجمن قحط زدہ کاشتکاروں کو سوین تک اس وعدہ پر قرض دیتی تھیں کہ وہ اپنی لڑکیوں کی جائز آمدنی میں سے رفتہ رفتہ ادا کردیں۔

ہندوستان میں تو لڑکیاں اپنے والدین کے لئے ایک بار ہوتی ہیں لیکن جاپان میں وہ اپنے خاندان کی نجات دہندہ تصور کی جاتی ہیں۔

گمراہ بہنوں کی امداد

جاپان کی عورتیں اپنی گمراہ بہنوں کی امداد کے لئے جو کچھ کر رہی ہیں اُن سے انڈین وومنز لیگ کو سبق حاصل کرنا چاہیئے، ان کی ایک ایسی انجمن ہے جو طوائفوں کو راہِ راست پر لانے کی خدمت انجام دیتی ہے، مختلف زنانہ جماعتوں کی نگرانی میں یہ کوشش بھی جاری ہے کہ جو لڑکیاں طوائفوں کا پیشہ اختیار کرنے والی ہوں اُن کو اس سے باز رکھنے کی عملی تدابیر کی جائیں، یعنی عورتوں کو طبی اور قانونی امداد بہم پہنچائی جائے، ایک جانب

ان کے خاندانوں کو ضرورت کے وقت روپیہ قرض دیا جائے اور دوسری جانب عورتوں کی خرید وفروخت کو قانوناً جرم قرار دیدیا جائے۔

کیا ہندوستان میں عورتوں کی کسی انجمن نے اب تک اس قسم کے نیک اقدامات کئے ؟ اور اپنی اُن بدقسمت بہنوں کو شرمناک زندگی سے بچانے کی کوشش کی جو ہماری ناانصافی اور سماجی خرابیوں کا شکار ہوتی ہیں۔

جاپان کا بچہ بچہ وطن پرست ہے

جاپان کس طرح اپنے بچوں کو وطن پرست بناتا ہے۔ اس کا اندازہ اگر کرنا ہو تو کھلونوں کی دو کانوں پر جاکر دیکھئے۔ ان دوکانوں پر زیادہ تر فوجی قسم کے کھلونے ملیں گے (مثلاً تلواریں۔ دوربینیں، دستی گھڑیاں وغیرہ) جو عموماً سپاہیوں کے کام آتے ہیں، لڑکوں کے کھیلنے کے لئے طرح طرح کی بندوقیں اور پستول بھی ہوتے ہیں، لیکن سب سے دلچسپ کھلونا وہ مسلح موٹر کار ہے، جس پر ایک ہوائی بندوق رکھی ہوتی ہے اور اس کا رُخ دشمن کے مقابلے کے لئے چاروں طرف پھیرا جاسکتا ہے۔

اس ابتدائی فوجی تربیت ہی کا نتیجہ ہے کہ ہر بچہ پکا قوم پرست بن جاتا ہے، کسی ملک میں یہ پُراثر منظر دیکھنے میں نہیں آتا کہ سات آٹھ برس کے بچے وردی پہنے اس قسم کے گانے گاتے جارہے ہوں، جیسے "آفتابی جھنڈا ہمیشہ بلند رہے گا"

دراصل تعمیر قوم کے لئے یہی ضروری ہے کہ وطن پرستی کا بیج بچپن میں ڈالا جائے۔ ذرا سوچئے کہ ہم نے اپنی قوم کی تربیت کے لئے اب تک کیا کیا ہے ؟

نوجوانوں کو سہارا

جس طرح دوسرے ممالک کے نوجوان روزگار کی تلاش میں مضافات سے دارالسلطنت میں آیا کرتے ہیں اسی طرح ہزاروں لڑکے اور لڑکیاں ہر سال ٹوکیو میں آتے رہتے ہیں، جن کا نہ وہاں کوئی عزیز ہوتا ہے، نہ شناسا، اس لئے ٹوکیو میونسپلٹی کے سوشل بیورو نے ایک محکمہ کھول دیا ہے جو بے یار و مددگار نوجوانوں کی خبرگیری کرتا ہے، اور اُن کو روزگار مہیا کرتا ہے۔

اسی طرح ہمارے کارپوریشن اور میونسپلٹیاں بھی اپنے سینکڑوں فاقہ کش تعلیم یافتہ نوجوان کی کیوں مدد نہیں کرتیں؟ اور انھیں خودکشی کرنے سے کیوں نہیں بچاتیں ؟

عہدہ داروں کو نصیحت

جاپان کے وزیراعظم نے اپنے عہدہ داروں کو چند ہدایات دی تھیں جو ہندوستانی اربابِ حکومت پر بھی یکساں صادق آسکتی ہیں، اس لئے ہم ذیل میں اُن کا اقتباس درج کرتے ہیں۔

"قومی استحکام کے لئے عدل و انصاف کو برقرار رکھنے کے نہایت ضروری ہے کہ سرکاری افسروں میں سخت ڈسپلن قائم رہے، اس چیز کے پیش نظر افسروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اپنے فرائض نہایت دیانتداری سے انجام دیں، اپنے حکام بالا کے احکام کی تعمیل کریں، اپنے تمام اعمال و افعال میں غیر جانب داری اور انصاف سے کام لیں، ذاتی اغراض کو کبھی دخل نہ دینے دیں، کوئی ناجائز اثر قبول نہ کریں، اور ذاتیات سے بالاتر رہیں، شرافت اور انصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُنھیں اپنے فرائض نہایت تندہی سے انجام دینا چاہئیں، خصوصاً آج کل جب کہ حالات پیچیدہ ہوتے جارہے ہیں۔ اور جذبات میں ایک عام ہیجان و انتشار پایا جاتا ہے، افسروں کو اپنے طرز عمل میں زیادہ محتاط ہونا چاہئے اور اس کا خاص لحاظ رکھنا چاہئے، کہ سرکاری ڈسپلن قائم رکھنے کے سلسلے میں لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا نہ ہونے پائیں۔

تمام افسروں کو اپنے اپنے کام میں قابلیت پیدا کرنے اور معلومات حاصل کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہنا چاہئے۔ رفتارِ زمانہ کا اچھی طرح مطالعہ کرتے رہنا چاہئے۔ اور وقت کے تقاضے اور زمانے کی ضروریات کو پورا کرنے کی انتہائی کوشش کرنا چاہئے۔ غرضکہ یہ چیز نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ انھیں زمانے کے دوش بدوش اور وقت کے قدم بقدم چلنا ہے، تاکہ کہیں ایسا نہو کہ زمانہ بہت آگے نکل جائے اور ملک و قوم پیچھے رہ جائیں۔

نظام حکومت کی روز افزوں پیچیدگیوں کی وجہ سے حکام کے اختیارات میں اضافہ ہو رہا ہے جس سے یہ امکان پیدا ہوسکتا ہے کہ ان میں اختلاف آرا ہو جائے، یا کام میں تاخیر واقع ہو۔ اس لئے افسروں کو چاہئے کہ ہر معاملہ میں سنجیدگی اور وسیع النظری سے کام لیں، اور اتحادِ عمل کے لئے کوشاں رہیں۔

افسروں کا یہ فرض ہے کہ دل و جان سے رفاہِ عام کے کاموں کی

تکمیل کریں۔ اور اس لئے اُن کی خدمات ملک کے لئے زبردست اہمیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ اُن کو بد اخلاقی، درشتی اور بے پروائی سے احتراز کرنا چاہئے اپنے اپنے فرائض نہایت وفاداری سے انجام دینا چاہئیں۔ اور بے پرائی اور بے توجہی پر ایک دوسرے کو تاکید اور تنبیہ کرتے رہنا چاہیئے۔ تاکہ کام میں تاخیر نہ ہونے پائے۔

کسانوں کی امداد

ذیل میں ہم ایک واقعہ درج کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ جاپان میں دردمند حضرات کسانوں کی کس طرح امداد کرتے ہیں۔

متسوئی، ایواساکی، اور ہرآدا خاندانوں نے ۲۵ لاکھ ین کا ایک عطیہ دیا کہ جس سے حوادث زمانہ کے ستائے ہوئے دیہاتیوں کی امداد کے لئے ایک انجمن قائم کی گئی، اس کا خاص مقصد یہ ہے کہ اُن کی طرزِ معاشرت میں اصلاح کی جائے، اور اُن کا معیارِ زندگی بلند کیا جائے۔ اس کے اراکین میں یونیورسٹی کے پروفیسر اور مختلف علاقوں کے ناظم شامل ہیں جو دیہی اقتصادیات سے پوری طرح واقف ہیں۔ ان کے علاوہ انجمن مذکور ماہرین کا ایک عملہ بھی ملازم رکھنے والی ہے، جو مصیبت زدہ دیہات میں تعینات کئے جائیں گے، وہیں جا کر قیام کریں گے اور اس طرح لوگوں کی امداد کی صورتیں پیدا کریں گے اس انجمن کی نگرانی میں ایک ماہوار رسالہ بھی شائع کیا جائے گا، جس کے ذریعے سے کسانوں کو اُن کے مفید مطلب مشورے دئے جائیں گے، اور بتایا جائے گا کہ فصلوں کو تباہ ہونے سے بچانے کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا چاہئیں، کہا جاتا ہے کہ یہ انجمن بالکل غیر سرکاری جماعت ہوگی، بانیانِ انجمن کو توقع ہے کہ جب تین سال میں یہ پچیس لاکھ کی رقم خرچ ہو جائے گی تو عام چندہ سے کام جاری رکھا جا سکے گا۔

اب ذرا ہمیں خود اپنے سے سوال کرنا چاہیئے کہ ہم نے سال میں ایک دفعہ تقریریں کرنے کے علاوہ اب تک کسانوں کی کیا عملی امداد کی ہے۔ وہ بھی مہاتما گاندھی کا شکریہ ادا کیجئے کہ اُنھوں نے دیہات سدھار کی طرف اب صحیح قدم اُٹھایا ہے۔ اگر ہم اُن کے مقاصد کو پوری طرح ذہن نشین کر لیں اور سچے دل سے اُن کی پیروی کریں تو ممکن ہے کہ کسانوں کی کچھ خدمت ادا ہو سکے، جو ہمارے ملک کی جان اور ہماری قوم کے روحِ رواں ہیں۔

نوجوانوں کے کارنامے

جاپان کے نوجوان کسانوں کی کس طرح مدد کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہمارے نوجوانوں کو ذیل کا واقعہ پڑھنا چاہیے۔ اور اُس کی تقلید کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

نوجوانوں کی انجمنوں کے فیڈریشن نے جس میں ۳۰ لاکھ رکن ہیں اپنی متعلقہ انجمنوں کو مطلع کیا کہ فیڈریشن ہٰذا نے دیہات کے نوجوانوں میں کاشتکاری اور صنعت و حرفت کا شوق پیدا کرنے کے لئے ایک لاکھ ین دینا طے کیا ہے، اس رقم میں سے فی انجمن تین سو ین یا فی رکن ایک سو ین تک قرض دیا جائیگا، اور اس قرض پر کوئی سود یا ضمانت نہ لی جائے گی۔ قرض لینے والوں کو چاہیئے کہ روپیہ وصول ہونے کے ایک سال کے اندر یکمشت یا باقساط یہ رقم واپس کر دیں۔

اس فیڈریشن کے پاس جو کچھ روپیہ ہے وہ سب ممبری کی فیس سے جمع ہوا ہے، کیا ہمارے یہاں نوجوانوں کی کسی انجمن کے پاس دو چار سو روپیہ بھی نکلیں گے؟ حتیٰ کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے پاس بھی ایک لاکھ روپیہ نہیں ہے، لیکن جاپان کے نوجوانوں کی انجمنیں لاکھوں روپیہ بلا سودی قرضہ دے سکتی ہیں۔ ؏

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

دراصل یہی ہماری بے بسی کا سبب ہے، ہمارے ملک میں کس چیز کی کمی ہے؟ خدا کا دیا سب کچھ موجود ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ تنظیم اور ڈسپلن مفقود ہے۔ جس کی وجہ سے ہم بے دست و پا ہو گئے ہیں۔

وطن پرستی کی خاطر خودکشی

جاپان میں خودکشی گناہ نہیں ہے، وہ اس اصول کے ماننے والے ہیں کہ "مصیبت کی زندگی بسر کرنے سے موت بہتر ہے" چنانچہ جہاں اُنھیں اس کا یقین ہو جاتا ہے فوراً عمل کر گزرتے ہیں۔ آئے دن اخباروں میں اس قسم کے خودکشی کے واقعات درج ہوتے رہتے ہیں۔

خودکشی کے بیشتر واقعات کی تہ میں وطن پرستی کا جذبہ کام کرتا ہے، اکثر سپاہیوں اور عہدہ داروں سے اگر اپنے فرض کے انجام دینے میں کوتاہی ہو جاتی ہے تو فوراً وہ خودکشی کر لیتے ہیں، بعض لوگ جب ایک عرصے

کے بعد غیر ممالک سے واپس آتے ہیں اور جاپانی زبان بھول جاتے ہیں تو شرم کے مارے خودکشی کر لیتے ہیں۔

ذمہ داری کا احساس

جاپانیوں میں عموماً اور عہدہ داروں میں خصوصاً ذمہ داری کا غیر معمولی احساس موجود ہے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک ذرا سی غلطی کی وجہ سے ایک صوبہ کے گورنر اور متعدد عہدہ داروں نے استعفا دے دیا، اور ایک پولیس انسپکٹر نے خودکشی کر لی۔

بادشاہ سلامت کسی مدرسے میں تشریف لے جا رہے تھے، اُن کی سواری کے آگے آگے پولس کی ایک موٹر کار تھی، اتفاق سے اس موٹر سوار سے رہنمائی میں غلطی ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ سلامت مدرسہ میں نصف گھنٹہ قبل پہنچ گئے۔ چنانچہ ایک پولیس افسر نے جو براہ راست پروگرام کی اس بے ترتیبی کا ذمہ دار تھا، شرمندگی کی وجہ سے خودکشی کر لی۔

در اصل ہوا یہ کہ شاہی جلوس کی رہنمائی کرنے میں اس نے اپنی ذمہ داری کا اتنا زیادہ احساس کیا کہ اس کا دماغی توازن درست نہ رہا اور حواس جاتے رہے، بس اسی گھبراہٹ میں اس سے یہ غلطی سرزد ہو گئی، جب اُسے ہوش آیا تو اپنی غلطی کا احساس ہوا، چونکہ وہ سچا جاپانی تھا اس لئے اُس نے سوچا کہ خودکشی کے علاوہ اس غلطی کی اور کسی طرح تلافی نہیں ہو سکتی۔ بس اُس نے تلوار سے اپنا گلا کاٹ لیا۔

آج ہمارے لیڈروں میں سے جو روز نئی نئی پارٹیاں قائم کیا کرتے ہیں، کتنوں میں ذمہ داری کا ایسا احساس موجود ہے؟

جاپان کی پیروی کرو

ہندوستان میں ٹریم چلانے والوں کی بے پروائی سے اکثر راہگیروں کی جانیں ضائع ہوتی رہتی ہیں، اور اکثر یہ لوگ مجروح کو چھوڑ چھاڑ کر تیزی سے ٹریم بھگا لے جاتے ہیں۔ لیکن جاپان میں ٹریم والے اُن کے بچانے کے لئے اپنے خون تک سے دریغ نہیں کرتے، ذیل میں ایک سبق آموز قصہ ملاحظہ کیجئے۔

ایک دن ایک ٹریم چوراہے پر سے گزر رہی تھی، ایک پانچ سالہ بچہ قریب کے احاطہ سے نکل کر پٹری پر آ گیا۔ ٹریم والا بہت کچھ چلایا، لیکن کیا ہوتا تھا، بچہ ٹریم کی زد میں آ گیا، اور اُس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی، فوراً ٹریم والا اُسے قریب کے ہسپتال میں لے گیا، اور اُس کے جسم میں خون داخل کرنے کے لئے خود اپنا خون پیش کیا۔

ذرا اس کا مقابلہ ہندوستان کے ڈرائیوروں سے کیجئے، لیکن سچ پوچھئے تو اس میں اُن کی کیا خطا ہے، اُنھیں یہ کبھی سکھایا ہی نہیں جاتا کہ ذمہ داری کا احساس بھی کوئی چیز ہے، وہ تو صرف یہ جانتے ہیں کہ ہمارے صاحب بہادر کا پولیس میں رسوخ ہے، وہ ہمیں سزا سے بچا لائیں گے، اسی زعم میں وہ اس قسم کی ذمہ دارانہ حرکتیں برابر کرتے رہتے ہیں۔

چپراسی سے وزیر سلطنت

اخبار "نچی نچی" میں ایک قصہ شائع ہوا تھا جو میں یہاں درج کرتا ہوں، ٹوکیو کے امریکن سفارت خانہ میں ایک جاپانی چپراسی ملازم تھا، اس کا کہنا یہ تھا کہ انگریزی سیکھنے کے لئے اُس نے یہاں ملازمت کی ہے، سفارتخانہ کے فوجی افسر نے جب یہ دیکھا کہ اس سے کام نہیں چلتا تو اُسے برخواست کر دیا، کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ فوجی افسر اور یہ چپراسی دونوں کون ہیں، فوجی افسر تو جنرل پرشنگ تھے جو امریکہ کی فوجیں لے کر جنگ عظیم میں یورپ گئے تھے اور یہ نوجوان چپراسی جاپان کے موجودہ وزیر خارجہ کوئی ہیروٹا ہیں۔ ذاتی ترقی کی یہ کیسی شاندار مثال ہے۔

وزیر پہلوانی کے استاد

جاپان میں وزیر اعظم سے لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ قلی تک ہر شخص وطن پرستی کے جذبہ اور ذمہ داری کے احساس سے معمور ہے، اور شیخی کے مغالطہ میں مبتلا نہیں ہے، ایک دفعہ میں نے ریلوے کے وزیر کا قصہ سنا تھا کہ اُنھوں نے خود انجن ڈرائیور کا کام کیا اور تین سو میل تک ریل چلائی، اب یہ معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے ایک جگہ پہلوانی (جوجٹسو) سکھانے کی اعزازی خدمت قبول کی ہے۔

مسٹر شینا اور چیدا وزیر ریلوے جوجٹسو کے ماہر ہیں، ایک دن وہ اپنا پُرانا مڈل اسکول دیکھنے گئے اور اس فن کے متعلق لڑکوں کو بہت سی باتیں بتائیں، اس پر لڑکوں نے اُن سے درخواست کی کہ آپ مدرسے کے شیر کشتی کی خدمت قبول فرما لیں اور ہمیں جوجٹسو کی تھوڑی بہت تعلیم دیا کریں، اگرچہ سرکاری کاموں سے اُنھیں بہت کم فرصت ملتی ہے۔ پھر بھی انھوں

وعدہ کرلیا، کہ ہفتہ میں ایک دن وہ اسکول کے بچوں کو پہلوانی سکھانے آجایا کریں گے۔

دیکھیئے اس صورت سے وہاں کے سرکاری عہدہ دار قوم کی تعمیر کیا کرتے ہیں، اور اُسے قوی تر بناتے ہیں، لیکن ہمارے عہدہ داروں اور سرکاری افسروں کا حال تو آپ پر اچھی طرح روشن ہے، اس لئے اُن کے متعلق یہاں کچھ لکھنا ہی بیکار ہے، (ان کا پہلا قصہ ملاحظہ ہو)۔

وزیر انجن ڈرائیور

ایک دن جب سوبائے ایکسپریس اوساکا پہنچی تو پلیٹ فارم پر نئے وزیر ریلوے مسٹر شنیوا وچیدا کے استقبال کے لئے بہت بڑا مجمع تھا، لوگوں نے ساری ٹرین میں وزیر موصوف کو تلاش کیا، لیکن وہ کہیں نہ ملے، اسی اثنا میں ڈائننگ کار سے کچھ لوگ برآمد ہوئے جو تیل اور سیاہی میں لت پت تھے اور بالکل انجن ڈرائیور معلوم ہوتے تھے، "دیکھنا وہ ہیں ریلوے وزیر" کسی نے ان میں سے ایک فربہ آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جو انجن کی طرف نہایت تیزی سے چلا جا رہا تھا، سب نے اُنھیں دیکھا اور پہچان لیا، اور پہچان لیا، مجمع اُن کی طرف بڑھا، لیکن اُنھوں نے اپنے قدم تیز کر دیئے، اور بڑھ کر انجن میں اس جگہ بیٹھ گئے جو ڈرائیور کے لئے مخصوص ہے، اس کے بعد گاڑی چھوٹ گئی اور سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔

ڈاکو بھی ضمیر رکھتے ہیں

جاپان میں ڈاکو اور مجرم بھی ضمیر کی آواز سنتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں، ایک قصہ ملاحظہ کیجئے۔

ایک دن ایک نوجوان میگو رو کے پولیس تھانہ میں داخل ہوا اور کہا کہ میں نے حال ہی میں ایک ڈاکہ ڈالا ہے لہٰذا مجھے گرفتار کرلیا جائے، اس نے بیان کیا کہ تین سال پہلے میں ڈاکہ کے سلسلے میں گرفتار ہوا تھا لیکن یہ وعدہ لے کر مجھے چھوڑ دیا گیا تھا کہ اگر پھر کبھی قانون کی خلاف ورزی کروں تو خود آکر پولیس میں اس کی اطلاع دے دوں گا، چنانچہ اس مرتبہ چوری کرنے کے بعد یکایک مجھے اپنا وعدہ یاد آگیا، اس لئے میں حاضر ہوا ہوں تحقیق کرنے پر پولیس کو معلوم ہوا کہ واقعی چار گھنٹہ قبل وہ ایک شخص کے مکان میں گھسا تھا، اور چاقو سے اُسے ڈرا کر اور کچھ روپیہ لے کر فرار ہو گیا تھا۔

اس قسم کے بہت سے واقعات جاپان کے اخباروں میں ہر مہینے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ بارہا مجرم خود اپنے سابقہ جرائم کا اقبال کرتے ہیں، اور درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں کافی سزا دی جائے۔

ہندوستان کی پیروی

جاپان میں اب ہندوستان کا قدیم طریقۂ تعلیم رائج ہو رہا ہے۔ یعنی گروکل کا وہ طریقہ جو اخلاق کے درست کرنے میں نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ پرانے زمانے میں وہاں بھی مندروں کے ملحقہ مدارس قائم تھے۔ اس قدیم طریقۂ تعلیم میں بہت سی خوبیاں تھیں، کیونکہ اس میں معلم اور متعلم کے درمیان براہِ راست تعلق قائم رہتا تھا جس سے بچوں کے اخلاق پر بہت اچھا اثر پڑتا تھا، محکمۂ تعلیم نے اب یہ طے کیا ہے کہ اس قسم کے مدارس کو ازسر نو جاری کیا جائے، علاقہ اہیمے میں مسٹر ہدیو تکیمانے پرانے طرز کا ایک نجی اسکول قائم کیا ہے۔ یہ قدیم طریقۂ تعلیم کا مکمل نمونہ ہے۔ سرکاری امداد سے عنقریب اسی قسم کے اور اسکول ملک کے طول و عرض میں قائم کئے جائیں گے۔

ہندوستانی مجسٹریٹ غور کریں

ان ہندوستانی مجسٹریٹوں کو جو انگریز افسروں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے سیاسی مقدمات میں ملزموں کو سخت سزائیں دیتے ہیں۔ ذیل کے واقعہ پر غور فرمائیے۔

جاپان کے مجسٹریٹ حکومت کے اشارے پر نہیں چلتے۔ بلکہ خدا کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں، اور اسی سے ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ اخبار نچی نچی کا بیان ہے کہ خونی برادری کے ۱۴ ارکین نے نظام حکومت کو بدلنے کے لئے ایک وزیر مال کو قتل کرنے کی سازش کی تھی، ان کا مقدمہ گو تچرو فیوجی جج کی عدالت میں زیر سماعت تھا، جیسے جیسے فیصلہ سنانے کا دن قریب آتا جاتا تھا جج موصوف مبھی مندر میں جاتے تھے، اور اپنی ہدایت کے لئے دعا کرتے تھے، سرکاری وکیل نے اس گروہ کے لیڈر نشو آنوئی کے علاوہ تین دوسرے ملزمین کے لئے بھی سزائے موت کا مطالبہ کیا۔ لیکن جج کو خدا نے توفیق عطا کی اور اُنھوں نے اُن کو بہت معمولی سزائیں دیں۔

اس مقدمہ میں ایک بودھ مشنری نے بھی صفائی کی جانب سے گواہی دی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگرچہ بودھ مذہب میں کسی کی جان لینے کی سخت ممانعت ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کو قتل کر دینے کی اجازت ہے۔ جن سے ملک کو نقصان پہنچتا ہو اُن کا نام مسٹر گیمو کیاموٹو تھا اور یہ دیوتا کوجی مندر کے

سب سے بڑے پروہت اور نشو انوئی کے استاد تھے، انھوں نے فرمایا کہ انوئی نے قومی جذبہ کے ماتحت بودھ مذہب کے بنیادی اصولوں کو نظر انداز کیا اس لئے خواہ اسے انتہائی سزا بھی دی جائے، لیکن اس کی روح ہمیشہ ملک کی خدمت کرتی رہے گی۔

اس ضعیف العمر پروہت نے ابتدا میں کہا کہ میں قانونی نقطۂ نظر سے انوئی کی وکالت کرنے نہیں آیا ہوں بلکہ روحانی اعتبار پر اس معاملہ کو صاف کرنا چاہتا ہوں اور نشو انوئی کے فعل پر بودھ مت کے لحاظ سے روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

نشو عرصہ تک میرا شاگرد رہا ہے، اور اُس نے بودھ مت کے تمام اصولوں کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ اس لئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نشو نے یہ فعل مذہبی ناواقفیت کی بنا پر نہیں کیا، بلکہ ملک کے حالات نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا، بودھ مت میں ہر مخلوق کو حتیٰ کہ کیڑوں تک کو مارنے کی ممانعت ہے، لیکن اگر کُل کی خاطر جزو کو یا تمام مخلوق کی خاطر ایک فرد کو مارنے کی ضرورت ہو تو بودھ مذہب اس کی اجازت دیتا ہے، مہاتما بُدھ کے علاوہ تمام بودھ اوتار کوئی نہ کوئی ہتھیار لئے ہوئے ظاہر کئے گئے ہیں۔ یہ ہتھیار اسی لئے ہیں کہ مخلوق کے دشمنوں کو ہلاک کر دیں۔

نشو کو مستقبل میں بھی قوم کی خدمت کرنے کا موقع حاصل رہے گا، اگر قانون اُسے موت کی بھی سزا دیدے پھر بھی اس کی روح ہمارے درمیان رہے گی، نشو توہمن کے سچے جذبہ کا حامل ہے، اس لئے اگر ہم اسے مار بھی ڈالیں تب بھی اس کی روح اس اعلیٰ جذبہ کی حفاظت کرتی رہے گی، دراصل جاپانی قوم کا انحصار اسی جذبہ پر ہے۔

ذرا تصور کیجئے کہ اگر کوئی شخص ہندوستان میں کسی سیاسی قتل کے مقدمہ میں اس قسم کی گواہی دیتا تو اُس کا حشر کیا ہوتا؟ قاتل کی حمایت کے جرم میں اُسے گرفتار کر کے فوراً سات برس کے لئے بھیج دیا جاتا، یہ ہے ایک آزاد اور غلام قوم کا فرق۔

اسی مقدمہ میں جاپان کے طول و عرض سے ہزاروں لاکھوں عرضیاں لے لیکر حاضر ہوئے اور التجا کی کہ ملزموں کو بہت معمولی سزا دی جائے، کیونکہ اُن کی نیت نہایت اعلیٰ، بے غرضانہ اور وطن پرستانہ تھی، چنانچہ جج نے اُنھیں بہت معمولی سزا دی۔ گویا اسے رائے عامہ کے سامنے جھکنا پڑا۔

بخلاف اس کے آپ کو یاد ہوگا کہ ہندوستان میں بھگت سنگھ کی جاں بخشی کے لئے لاکھوں آدمیوں نے میمو ریل بھیجے اور خود مہاتما گاندھی نے اپنی پوری قوت صرف کر دی، کہ محض اظہار دوستی کے طور پر لارڈ ارون بھگت سنگھ اور اُس کے ساتھیوں کو معاف کر دیں، لیکن سب کچھ بیکار ثابت ہوا۔

جاپانی فلسفہ

اخبار یچی نچی کے چیف ایڈیٹر مسٹر نکانشی نے جاپانی فلسفہ کو صرف ایک لفظ میں بیان کیا ہے، یعنی "حوصلہ" وہ لکھتے ہیں

"جاپانی قوم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بڑھتے ہوئے حوصلوں کی حامل ہے، لوگ انفرادی و اجتماعی ہر حیثیت سے کبھی اپنی موجودہ حالت پر قانع ہو کر نہیں بیٹھ جاتے، جب تک حال ماضی سے بہتر ہو، اور مستقبل حال سے بہتر ہو، تو وہ اسے تنزل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور صورت حالات کی بہتری کی کوشش کرتے ہیں، گویا جاپانی قوم کے فلسفہ کو صرف ایک لفظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، یعنی

"حوصلہ، یا اولوالعزمی"

قطعہ

محنت سے نہ گھبراؤ، ہے اس کا اثر اچھا
سینچو گے جو محنت سے پھولے گا شجر اچھا
جب کاوش و کوشش سے ملتا ہے صلہ سب کو
گر بوؤ گے تخم اچھا، پاؤ گے ثمر اچھا

(عظیم حیدرآبادی)

حضرتِ اثرؔ لکھنوی اور میں

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری ایم اے

نومبر ۳۷ء کے کلیم میں جعفر علی خاں صاحب اثرؔ لکھنوی کی ایک تحریر شائع ہوئی ہے، اس تحریر میں حضرتِ یگانہؔ اور حضرتِ صفیؔ کے دو ایک شعروں سے متعلق میرے خیالات پر حضرت اثرؔ نے اظہارِ ناخوشی کیا ہے۔ میرے خیالات اُن اشعار پر جولائی ۳۷ء کے نگار میں شائع ہوئے تھے۔ کبھی کبھی تو میں اس شبہ میں پڑ جاتا ہوں کہ کسی شعر پر وجد کرنا یا اس سے اپنے وجدان کو مجروح پانا اپنے اپنے مذاق کی چیز ہے اور بحث و مباحثہ محض ایک حد تک ممکن یا کارآمد ہوسکتا ہے۔ میرے والدِ مرحوم حضرتِ عبرتؔ کا ایک شعر یاد آیا۔

بگڑنا بننا حقیقت میں اتفاق پہ ہے
خوشی بشر کی مگر منحصر مذاق پہ ہے

خیر، میں اس کی کوشش کروں گا کہ جچے تُلے الفاظ میں حضرتِ یگانہؔ اور حضرتِ صفیؔ کے اشعار کی کچھ تحلیل کردوں۔ تاکہ اُن پر تلخی سے جو اظہارِ ناپسندیدگی میں نے کیا تھا اس کے وجوہ اگر ممکن ہو تو حضرتِ اثرؔ پر واضح ہو جائیں۔ حضرتِ یگانہؔ کا شعر یہ تھا۔

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے
کبھی رو دیے کبھی سجدے کیے خاکِ نشیمن پر

کبھی میرتقیؔ نے اپنے ایک شعر میں ایک قیامت کا ٹکڑا رکھ دیا تھا، "اے او چاک گریباں والے" اُن کے بعد کے شعرا نے بھی "والے" کے لفظ کو اشعار میں باندھا، اور کہیں کہیں سچے شاعرانہ انداز سے باندھا، مثلاً "اُن کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے" ذوقؔ، "دل جلے سینہ جلے اُف نہیں کرنے والے" امیرؔ، "آپ کی جان سے دور آپ پہ مرنے والے" داغؔ یا حضرتِ سائلؔ دہلوی نے بڑے سج دھج کی ایک غزل کہی ہے، "وہ تیکھی نوک پیکان والے وہ سوفار پر والے" یا عزیزؔ لکھنوی کا ایک شعر لے لیجئے۔

تمکاف اک پڑ گیا تربت میں جان آنے لگی مجھ میں ٭ ذرا او جانے والے قبر پر پھر مسکرا دینا

شبِ ہجر غمخوار گس کو بنائیں ہمیں ہنسنے والے ہمیں رونے والے

دیکھیے کہ "والے" کا لفظ مندرجۂ بالا مثالوں میں کیا اثر پیدا کر رہا ہے اور کتنی خوش اسلوبی سے لایا گیا ہے، ان کے مقابلہ میں "نشیمن پھونکنے والے" کے لب و لہجہ پر غور کیجئے۔ اور کیا عرض کروں۔ لیکن پہلے کی مثالوں میں اور "نشیمن پھونکنے والے" میں کچھ فرق تو ہی ہے۔ اب ذرا اور تہ میں جائیے، خواہ یہ خطاب خدا سے ہو یا دوست سے یا دشمن سے۔ مگر یوں براہِ راست کسی سے کہنا کہ اے میرا سب کچھ جلا دینے والے، اے مجھے بے خانماں کرنے والے۔ اے نشیمن پھونکنے والے" ظلم کی ایسی تشریح ہے جو مذاقِ سلیم پر گراں گزرتی ہے۔ شاعری اور غزل کی شاعری کا نازک دل اس لے دے اور اس تو تو میں میں سے بیزار ہو جاتا ہے۔ دیکھیے قاتل ایک ہی لفظ ہے، لیکن یہ ایک لفظ بھی صیغۂ حاضر میں استعمال کر کے کوئی ایسا شاعر جس کا مذاق اور وجدان تربیت یافتہ ہے اپنے شعر کو خراب نہیں کرتا، اے قاتل، او جفا کار، او بے وفا کہہ کر سوز و ساز نہیں پیدا ہوتا، شوخی اور چھیڑ چھاڑ کے مضامین کی اور بات ہے، لیکن حضرتِ یگانہؔ سے اگر کوئی کہے کہ آپ نے شوخی یا چھیڑ چھاڑ کا مضمون اس شعر میں لکھا ہے تو وہ برا مان جائیں گے۔

عزیز لکھنوی کا ایک شعر ہے۔

انہوں نے تو سوز لکھا ہے سوز۔ اور ایک کے بدلے متواتر اور مسلسل تین تین لفظوں میں ظلم کی تفصیل کی ہے۔ ضبط گناہ ہے نہ؟ آنسو روکنا گناہ ہے نہ؟ سچ ہے او مٹانے والے، او نشیمن پھونکنے والے، او مجھے کہیں کا نہ رکھنے والے، یہی کوسنے تو جانِ لطافت ہیں۔ عزیز لکھنوی کا ایک شعر سن لیجئے:

او ناشناسِ جنسِ وفا میں ترے نثار
کیا سوچتا ہے خوں بھری تلوار دیکھکر

"او ناشناسِ جنسِ وفا" میں بھی محبوب کو براہِ راست کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن کہاں یہ شستہ اندازِ بیان اور کہاں "نشیمن پھونکنے والے" عزیز ہی کا ایک اور شعر سنئے:۔

بے خبر عشق کے آثار قدیہ نہ مٹا
جوش کھاتا ہے لہو نیوں میں دیوانوں کی

معشوق کیا بلکہ دشمن کی جفا کا ذکر اور اس سے خطاب یوں کرتے ہیں۔ اچھا اب حضرت اثر کی اجازت سے میں آگے بڑھتا ہوں، جہاں تک مجھے یاد ہے حضرت امیر مینائی کے وقت تک نشیمن یا آشیانہ پر بجلی گرنے کا ذکر تو شعر میں آجاتا تھا، لیکن نشیمن اجاڑنے یا پھونکنے کا ذکر شعر میں شاید ہی کیا ہو۔ لیکن جذباتی مدرسہ نے ایک بگڑی ہوئی ذہنیت کے تابع ہو کر ظلم ہونا کہنے کے بجائے ظلم کرنا کہنا شروع کیا۔ یعنی اظہارِ غم یا غم کا تاثر پیدا کرنے کے بدلے الزام دینا اور کوسنا شروع کیا، کسی نے سچ کہا ہے کہ "غم اور احساسِ غم ایک ہی چیز نہیں ہے"! بہرحال شاعری کے سوز و گداز میں اس مدرسہ کی سہل پسندی نے یہ اضافہ کیا کہ بجائے "گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو" یا بجائے

مجھ سا فسردہ دل بھی نہ ہوگا زمانے میں بجلی بھی آکے سرد ہوئی آشیانے میں

لگے سے آشیانوں میں آگ لگوائی اور بجائے آگ لگنے کے آگ لگانے بلکہ آگ دینے کا قابل قدر ٹکڑا وضع کیا۔ اب شعر سنئے:۔

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

دوسرے مصرع کا کیا کہنا، لیکن باغباں اور اس کا یہ جرم بھی پہلے مصرع میں بیان ہو گیا۔ میں اس آگ کو ہوا نہیں دینا چاہتا۔ لیکن حضرت مصحفی کے ایک مشہور شعر میں "آشیاں اجڑا کیا" کے ٹکڑے کے ساتھ "جفائے باغباں" بھی آگیا ہے۔ اگر بے ادبی نہ ہو تو حضرت اثر سے میں عرض کروں گا کہ واردات اور سانحات کے بیان کرنے میں کسی شخص واحد پر الزام نہیں دھرنا چاہیے۔ غم اور درد سوز و گداز ٹریجیڈی کے عناصر کائنات میں سموئے ہوئے ہیں، یہ تاثرات ازلی اور ابدی ہیں، کیا فلسفۂ غم اور یاسیات کے اس پہلو پر حضرت اثر نے کبھی غور نہیں کیا، بہرحال بلند مذاق کے اشعار میں چارج شیٹ فریم نہیں کیا جاتا۔ دیکھئے میر کے یہ اشعار:۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

یا:۔ وصل و ہجراں میں کہ یہ دو منزلیں تھیں عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

یا مومن کا یہ شعر جس میں الزام دیا گیا ہے۔ مگر کن الفاظ میں:۔

میں بھی کچھ خوش نہیں جفا کرکے تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

میر نے یہ نہیں کہا کہ اے مجھ پر مصائب لانے والے تو نے میرا دل لے لیا یا برباد کر دیا اور نہ یہ کہا کہ او جفا کار مجھے وصل و ہجر کے وسوسوں میں تو نے ڈالا اور ایسا کر کے میرے غریب دل کو نہ جانے کب اور کہاں قتل کر دیا مصحفی کہتے ہیں:۔

باتوں میں اِدھر لعل فسوں گر نے لگایا دے پیچ اُدھر زلف اڑا لے گئی دل کو

اس شعر میں بھی وہ عنصر موجود ہے جسے ٹریجیڈی پر بحث کرنے میں نقادوں نے (Theory of automatism) کہا ہے، یعنی واردات اور سانحات کا ناگزیر طور پر وقوع میں آنا، ظلم کیا نہیں جاتا ہے ظلم ہو جاتا ہے۔ لعل فسوں گر اور زلف پر پیچ الزام سے بری ہیں، وہ اپنی جان لیوا دلفریبیوں کو کیا کریں! میں یہ مانتا ہوں کہ شاعری کو فلسفہ کے اصول بند نہیں کر سکتے مصحفی کا یہ شعر ہے:۔

جب اُس نے اُٹھائی تیغ ہم پر ہاتھوں کی پناہ ہم نے کر لی

لیکن مصحفی کے پہلے مصرع کا تیور دیکھئے اور "نشیمن پھونکنے والے" کی بدمذاقی دیکھئے۔ ہاں ایک بات ذہن میں آئی ہے۔ میں نے جس (Automatism) یعنی ناگزیریت کا ذکر کیا ہے (آپ اُسے تقدیر یا قضا و قدر کہہ لیجئے، یا مسئلہ جبر و اختیار، یا حسنِ اتفاق) اسی کا احساس کرتے ہوئے نگار میں شائع شدہ غزل پر اپنے

مذکورۂ بالا مضمون میں اس طرف اشارہ کیا تھا کہ دَورِ حاضر کی غزل میں حسن و عشق کا ذکر بجائے معشوقِ جفاکار، شوخ ستمگر اور بجائے عاشق کے کے جتنا اور جس طرح آ رہا ہے، اتنا اور اس طرح پہلے نہیں ملتا، غزل میں جزئی تخصیص، اور محدود چیزوں پر زور نہیں دیا چاہیئے۔ اس میں کائناتی اور آفاقی وسعتیں سموئی ہوئی چاہئیں، "نشیمن پھونکنے والے" کہنے سے یہ کام نہیں چلتا، کیا جس اصول کا میں نے ذکر کیا ہے، اسی سے یہ اصول بھی متعلق ہے کہ اکثر موقعوں پر ضمیر کا حذف کر دینا محاسنِ شاعری سے ہے، تاکہ شعر شخصیت اور جزئیت کے عیب سے بچ جائے و تنگنائے غزل نے اپنے لئے یہ وسعتیں شروع ہی سے محفوظ کر لی ہیں اور خارجی و مخصوص چیزوں کا ذکر تفصیل و تشخیص اور اصنافِ شاعری کے لئے چھوڑ دیا ہے۔

ایک شعر اصغر گونڈوی کا سُن لیجئے، یہ شعر حضرتِ اثر کو اس سے پہلے بھی متوجہ اور متاثر کر چکا ہوگا یا یہ میرا حُسنِ ظن ہے؟

ایک میرا ہی فسانہ زازل تا بہ ابد یوں نہ کرنا تھا مرے سامنے رسوا مجھکو

(سرودِ زندگی صفحہ ۱۹)

ڈرتے ڈرتے اپنا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔

دلوں کی انجمن میں بزمِ یار میں نہیں ہوں اب ؎ میں نقش تھا مٹا دیا، چراغ تھا بجھا دیا

ایک اور شعر اسی غزل کا

وہ سوز و درد مٹ گئے وہ زندگی بدل گئی ؎ سوالِ عشق ہے ابھی، یہ کیا کیا، یہ کیا ہوا؟

ہر دو شعر کے دوسرے مصرع میں ضمیر حذف کر دی گئی ہے، میرے استاد حضرت وسیم خیرآبادی نے میر کا جب یہ مصرع سُنا

دیکھا اس بیمارئ دل نے آخر کام تمام کیا

تو کہنے لگے کہ بجائے "آخر کام تمام کیا"، کے "میرا کام تمام کیا" ہونا چاہیئے تھا، میں تو استاد کا منہ دیکھکر رہ گیا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ حضراتِ لکھنؤ ضمیر کو حذف کرنے اور محذوفات سے عموماً بچتے ہیں، بلکہ محذوفات کو عیب بتاتے ہیں، اسی سے تو ان کے یہاں تو توں میں کی بھرمار رہتی ہے، بامحاورہ اور ٹکسالی اردو پر جان دیتے ہوئے اور اپنے اہلِ زبان ہونے پر ناز کرتے ہوئے بھی حال یہ ہے کہ ضمیر کو لطیف انداز سے جب محذوف پاتے ہیں تو نہایت معصوم ادا سے پوچھتے ہیں کہ شعر کا مطلب کہاں ہے، کس طرف ہے اور کدھر ہے؟" اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔

محذوفات کا لطف دیکھنا ہو تو اہلِ لکھنؤ کے خطاب و عتاب سے گذر کر شعرائے دہلی کا کلام دیکھئے۔ اب میں حضرتِ اثر کو "نشیمن پھونکنے والے" ٹکڑے سے متکیف ہوتا ہوا اور اس پر سر دھنتا ہوا چھوڑ کر آگے بڑھتا ہوں، حالانکہ ذوقِ سلیم مجروح ہو کر اب بھی پوچھے جاتا ہے کہ "نشیمن پھونکنے والے" کونسا اندازِ بیان ہے۔

"ہماری زندگی یہ ہے" اس غضب کا ٹکڑا ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر کے یہاں کسی شعر کے پہلے مصرع کے آخری الفاظ یہ ہوتے تو وہ چونک اُٹھتا کہ اس مختصر مگر زبردست تمہید کے بعد دوسرے مصرع میں کیا کہوں معلوم نہیں کہ اس ٹکڑے کے بعد حضرت بیخود کے تخیل پر کیا گزری۔ بہرحال ان کی کاوش کا نتیجہ یہ الفاظ ہیں:۔

کبھی روئے کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

جنھیں دیکھ سُنکر بادلِ ناخواستہ داغ کا یہ مصرع یاد آجاتا ہے "بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا" حضرتِ بیخود کے دوسرے مصرع کے برابر مندرجۂ ذیل اشعار کے دوسرے مصرعے رکھئے تو جذباتی مدرسے کی سہل پسند رقت کا بھرم کھل جائے۔

شبِ فراق یہی مشغلہ تھا عاشق کا کبھی چراغ جلانا کبھی بجھا دینا

(جگر گورکھپوری، ایم اے بعمر ۲۵ سال)

ترے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا (مصحفی)

بیانِ مجبوری میں جس ضبط اور توازن کی ضرورت ہے، اُن کی مثال ان اشعار کے دوسرے مصرعے میں دیکھئے۔ نہ کہیں رونا ہے۔ نہ گانا ہے، مگر اس اعتدال میں اس نیچرل اندازِ بیان میں جو بات ہے وہ اس مصرعے میں کہاں:۔

کبھی روئے کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

اظہارِ اضطراب میں جسمانی حرکات و سکنات کو بھونڈے طریقے سے پیش پیش رکھنا، اس رونے تڑپنے، لوٹنے کے مظاہرے کو سوز و گداز کا دارومدار بنانا زورِ بیان نہیں عجزِ بیان ہے، اظہارِ غم نہیں ہے خلوصِ جذبات نہیں ہے، بلکہ جذبہ اور غم اپنے اوپر طاری کرنے کی کوشش ہے۔ لطافتِ شعر ان سستے داموں حاصل نہیں ہوتی، جسمانی اضطراب کا باسلیقہ

بیان دیکھنا ہو تو یہ شعر دیکھئے :-

کیا تم کو خبر تم نے تو کروٹ بھی نہ بدلی (عبرت گورکھپوری)
میں درد سے سو مرتبہ بیٹھا بھی اٹھا بھی

یا :- بجُز دبوقت ذبح طپیدن گناہ من
دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست (غالبؔ)

اسی سے تو میں نے کہا تھا کہ شعر میں رونے کا ذکر کرنا اپنے اوپر بڑی نازک ذمہ داری عاید کرنا ہے، زندگی میں رونا جتنا ہی آسان ہے شعر میں رونا اتنا ہی مشکل ہے، شاعر کو نرمیٔ جذبات واحساس کی کڑی منزلوں سے گزر کر مقامِ گریہ پر پہونچنا ہوتا ہے۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

رونے کا ذکر کون نہیں کرتا لیکن اب جس کو خدا دے۔ میرے والد مرحوم حضرت عبرتؔ گورکھپوری کو نہ استادی کا دعویٰ تھا نہ بڑا شاعر ہونے کا، مگر ان کے دو شعر سنئے :-

تم نے پایا ہے کبھی وصل میں شاداں مجھکو
تم نے دیکھا ہے کبھی ہجر میں گریاں مجھکو

کوئی آنسو پوچھنے والا نہیں میں نے پھیلائیں نگاہیں چار سُو

حضرت امیرؔ مینائی کا یہ شعر دیکھئے :-

زانو پہ امیرؔ سر کو رکھے پہروں گزرے کہ رو رہے ہیں

حضرت عزیزؔ کا یہ شعر دیکھئے :-

ابھی تربتِ دل پہ بیٹھے رہیں گے ذرا اور کچھ دیر آنسو بہا لیں

نہ کہ اٹھا کے لکھ دیا کہ "کبھی روئے کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر" اس رونے کا رونا کہاں تک روئیں۔ اب دوسرا ٹکڑا لیجئے۔ کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر، میری جبیں تو ابھی شائستہ سجدہ نہیں ہوئی۔ لیکن سجدہ کا ذکر جس کثرت سے اردو شعرا لاتے ہیں، وہ غالباً کوئی بہت اچھی چیز نہیں۔ سجدہ کرتے وقت پاؤں سر کے اوپر نہ ہی مگر جسم کے کچھ اور حصے تو سر کے اوپر ہو ہی جاتے ہیں۔ حضرت بیخودؔ خاکِ نشیمن پر ناک اور سر رگڑنے کی تصویر کھینچتے ہیں، کبھی ہاتھوں میں اس خاک کو لے کر اُسے سینے سے اور سر سے لگاتے ہیں۔ اور خاکِ نشیمن پر سجدہ کیا ہو سکتا ہے۔ رونا ہو یا سجدہ سجدہ کرنا ہو، جلد جلد ہو یا دیر دیر ہو، مگر ذہن منتقل ہو جاتا ہے، ایک جسمانی اضطراب کی طرف، بے اختیارانہ حرکات وسکنات کی طرف اور غم کی اس مصوری پر حضرت اثرؔ جتنا چاہیں سر دھنیں، لیکن جیسا میں عرض کر چکا ہوں اظہارِ غم میں ذرا روک تھام کی ضرورت ہے۔ رونا تڑپنا سینہ کوبی ثواب کی چیزیں نہیں ہیں۔ اور جہاں تک جمالیات یا فنونِ لطیفہ کا تعلق ہے وہاں تو فنِ مصوری میں بھی غم اور اضطراب کو نمایاں کرنے میں رنگ اور خط (Colour & line) نے حرکت کے اثرات کی بہ نسبت سکون یا ٹھہراؤ سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ یعنی (contrast) سے کام لیا جاتا ہے۔

کبھی روئے کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

کا لہجہ بہت خود دارانہ نہیں ہے۔ نگار میں اس شعر کے متعلق میرے حنت الفاظ سے جو حضرت اثرؔ کے دل کو چوٹ لگی تو کیا اچانک اسی وقت انھیں یہ بھی احساس ہو گیا کہ ہاں اس مصرع کا لہجہ اور یہ حرکات بہت خود دارانہ تو نہیں ہیں، کیونکہ

کبھی روئے کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

اس میں جو حرکات وسکنات کی تصویر سامنے آتی ہے اس سے کچھ وہ بھی بیزار معلوم ہوتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ "اس میں رونے اور سجدہ کرنے کا صرف ذکر ہے، بیانِ واقعہ ہے، نہ کہ صورتِ حال۔ جس شخص کا نشیمن پھونک دیا گیا ہے وہ نشیمن پھونکنے والے کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ اسے بے خانماں کرنے والے کیوں حال پوچھکر (یہ حال پوچھنے کا زیرِ لب اضافہ ایجادِ بندہ ہے، اور جس مصلحت سے کیا گیا ہے اسے کچھ میں سمجھتا ہوں کچھ حضرتِ اثرؔ۔ خیر حسابِ دوستاں دردل) جلے ہوؤں کو اور جلاتا ہے۔ اب ہماری زندگی یہ رہ گئی ہے کہ کبھی خاکِ نشیمن پر روتے ہیں اور کبھی انتہائے غم وجوشِ محبت میں اس خاک پر سجدے کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قائل اس وقت نہ تو رو رہا ہے۔ نہ سجدے کر رہا ہے" (یعنی یہ حرکتیں وہ شروع کرے گا نشیمن پھونکنے والے کے چلے جانے کے بعد)

اس شرح داستان کے متعلق مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ حضرتِ اثرؔ نے اپنی تحریر کا عنوان تو رکھا ہے "شعر مرا بمدرسہ کہ بُرد" لیکن میں تو مدرسں ہوتا ہوا بھی اپنے ناچیز مضمون میں تشریح وتفصیل کا یہ انداز

اختیار نہ کر سکا۔ اس کا فیصلہ حضرت آثرؔ کریں کہ درس و تدریس کی بو میری ناچیز تحریر سے آتی ہے یا کسی اور کی تحریروں اور تنقیدوں سے۔ دوسری گذارش یہ ہے کہ حضرت آثرؔ کی منقولہ بالا شرح بھی کیا شعر کو سوز و گداز کی مثال بنا سکی۔ شعر میں درد پیدا کرنے کے لئے بڑی بے دردی کی ضرورت ہوتی ہے بڑے ضبط (restraint) کی ضرورت ہوتی ہے۔

چھوٹ کر اُن سے بہت بیدرد ہم بھی ہو گئے
ایک خنجر ہو گئے جب سے کھنچے قاتل سے ہم (راقم الحروف)

حضرتِ آثرؔ کی عبارت کے ان ٹکڑوں پر غور کیجئے۔

"جس شخص کا نشیمن پھونک دیا گیا ہے۔" اسے بے خانماں کرنے والے" کیوں حال پوچھ کر جلے ہوؤں کو جلاتا ہے" ہومر، ڈانٹے، ورجل، شکسپیر اور ڈکنس، اتنے سستے لہجے سے رقت نہیں پیدا کرتے تھے۔ غم اور اظہارِ غم دونوں فطری چیزیں ہیں مگر اس طرح بِھل نہیں جانا چاہیئے۔ غم کی فلسفیانہ ماہیت روک اور تنگی ہے (check is pain) وسعت (release) خوشی کی ماہیت ہے۔

فراموشی سے بامعنی بنا دے قصۂ غم کو
زمانہ طول دیتا جائے کر دے مختصر اتنا (راقم الحروف)

نثار پرسشِ غم کے، ترے کرم کے نثار
ہیں غیرتیں بھی کچھ اے دوستِ عشقِ رسوا کو (راقم الحروف)

نثار پرسشِ غم کے میں کیا کہوں اے دوست
کہ تجھ سے اب وہ مری سرگرانیاں نہ رہیں (راقم الحروف)

ہزار شکر کے پہلو خلوصِ عشق میں ہیں
سمجھ نہ اور کچھ ان شکوہ ہائے بیجا کو (راقم الحروف)

زندگی میں تو شائستۂ اخلاق ہونا اور صدق و صفا پیدا کرنا تو معلوم مگر وجدانی اخلاق بھی کوئی چیز ہے اور شعر و شاعری کے اہم مقاصد میں ایک یہ بھی ہے کہ ایک تخیلی اخلاق (ideal ethics) کی مثالیں پیش کی جائیں۔

مگر مصیبت تو یہ ہے کہ بد مذاقی جب ضبط کا ذکر بھی کرتی ہے تو شاعری کی روح کو چوٹ لگتی ہے، سوداؔ کہتا ہے۔

مت پوچھ یہ کہ رات کٹی کیونکہ تجھ بغیر اس گفتگو سے فائدہ، پیارے گزر گئی

یہ نہیں کہتا کہ کبھی روئے، کبھی تڑپے، کبھی سجدے کئے۔ لیکن ذرا لکھنؤ کے رنگ میں ایک مصرع اسی مفہوم کا سنئیے۔

تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

کتنا چھچھورا اندازِ بیان ہے۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی، لیکن آنسوؤں کو اور سجدے کو بھی ٹکے سیر کر دینا ملک و ملت کے لئے اور شاعرانہ وجدان کے لئے اتنا مضر رساں ہے کہ شاید مجھے اس تلخ نوائی سے معاف رکھیں گے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر اظہارِ غم میں غم کے خارجی پہلو جسمانی حرکات و سکنات کے ذکر پر سوز و گداز کا انحصار رہے تو یہ معائب میں داخل ہے نہ کہ محاسن میں، ایسا نہ ہوتا تو ہسپتال میں رونے کراہنے اور مریضوں کی حالت اور صورت کی تصویر یا سڑکوں پر جو لنگڑے لُونجے اور کوڑھی نظر آتے ہیں اُن کی حالت اور صورت کا بیان سوز و گداز پیدا کرنے کے لئے بہترین چیز سمجھی جاتی یا قبر کے اندر اجسام کے سڑنے گلنے کا بیان۔ نظم میں ان مناظر اور کراہتوں کا ذکر میں خود مستحسن سمجھتا ہوں، میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو ان چیزوں کو شاعری کا موضوع نہیں سمجھتے۔ ہاں لیکن غزل میں رونے تڑپنے کے مادی پہلو کو پیش کرنا بلکہ محرم اور چوٹی کا ذکر کرنا بڑا عیب ہے۔ اسی احساس سے تو کچھ بچین ہو کر حضرتِ آثرؔ کو بھی کہنا پڑا کہ کوئی اس وقت نہ تو رو رہا ہے نہ سجدے کر رہا ہے۔ اس میں تو رونے اور سجدے کرنے کا صرف ذکر ہے (یہ صرف ملاحظہ ہو) بیان واقعہ ہے نہ کہ صورتِ حال۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس شعر میں رونا اور سجدہ کرنا فی الحال ملتوی کر دینے کو ہم شعر کی جان سمجھیں یا

کبھی روئے، کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

میں جس فعل کا ذکر ہے براہِ راست اس فعل کو؟ بیان واقعہ کیا ہے۔ قائل کا ایسا کہنا یا ایسا کرنا، کیا ہماری زندگی میں جھوٹ اتنا سرایت کر گیا ہے کہ جو کچھ کسی خانماں برباد پر گزر رہی ہے جو اس کی زندگی ہے، جو وہ کر رہا ہے، اس حقیقت کو اس حقیقت کے بیان سے الگ کر دیا جائے اور سچی بات سے قطع نظر کر کے یہ کہا جائے کہ "بیان واقعہ" کو سب کچھ سمجھئے اصل واقعہ کو کچھ نہ سمجھئے۔ رہی یہ بات کہ "متخیلہ کہنے والے کی تصویر حزن و یاس پیشِ نظر کرتا ہے نہ کہ رونے اور سجدہ کرنے کی جس کو وہ بیان کرتا ہے"

لیکن اسلوب بیان ہی تو مصیبت ڈھا رہا ہے۔ اسلوب بیان میں ایک ایک نہیں دو دو بے اختیارانہ حرکتوں کا ذکر ہے اور دو تصویریں پیشِ نظر ہو جاتی ہیں۔ آخر کچھ تعلق تو حزن و یاس اور حزن و یاس اور حزن و یاس کے اس اثر میں ہے، ایک اسلوبِ بیان تو یہ ہوتا ہے کہ کسی حالت کا ذکر کرنے میں اُسے اور لطیف بنا دیں، جیسے برقِ نغمہ یا برقِ آواز یا برقِ تبسم یا سازِ ہستی، یا زندانِ حیات یا میخانۂ عالم یا موج مے کو شعلہ کہا جائے اور ایک اسلوب بیان یہ ہوتا ہے کہ لطیف چیز کو کثیف چیز سے تعبیر کیا جائے یعنی حزن و یاس کو یوں ظاہر کیا جائے کہ

کبھی روئے کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

اور یہ کہکر جان چھڑائی جائے کہ رونے اور سجدے کرنے کا ذکر نہیں بلکہ حزن و یاس کا۔ بندہ نواز برقِ نغمہ میں کبھی کسی بجلی کا ذکر نہیں، لیکن آواز کی ایک صفت کے لئے جو استعارہ استعمال کیا گیا ہے، وہ کتنا لطیف ہے اور میری محض یہ گزارش ہے کہ حضرت بیخود نے حزن و یاس ایسی پاکیزہ کیفیت کے لئے کثیف استعارہ استعمال کیا ہے۔ یعنی رونے کا اور خاکِ نشیمن کو سجدہ کرنے کا مسلسل ذکر کرکے رونے کا ذکر کافی تھا بلکہ کافی سے بھی زیادہ تھا۔ یوں کہتے تو کیا ہرج تھا۔

کبھی روئے، کبھی چُپ ہو رہے شاخِ نشیمن پر

میں نے آشیاں برباد چڑیوں کی حالت کا مشاہدہ کیا ہے۔ کچھ دیر بیچین ہو ہو کر آشیانہ ڈھونڈھنے کے بعد جس سکتے کے عالم میں وہ شاخِ نشیمن پر کھوئی ہوئی سی نظر آتی ہیں اس کو دیکھکر میرا دل خون ہو گیا ہے۔ کبھی رونے کے بعد کبھی چُپ ہو رہے کا ٹکڑا اسی انتہائے اضطراب کو ظاہر کر رہا ہے جس کا نام صبر اور ضبط ہے۔

ذرا سوچئے "نشیمن پھونکنے والے" میں پہلے ہی دو لفظ ذہن کو اس واقعہ کی طرف منتقل کر دیتے ہیں کہ نشیمن خاک ہو چکا ہے۔ اسی طرح "کبھی روئے" میں "روئے" کے لفظ میں بھی بڑی وسعت ہے، اس کے تو حضرتِ آثر بھی معترف ہیں کہ رونے سے حزن و یاس کی تصویر متخیلہ کے سامنے پیش ہو جاتی ہے (یا ابھی یہ تصویر نامکمل ہے، اور بغیر سجدے کے کام نہیں چلتا؟) پھر سجدے کے جو معنی میں نے لئے ہیں یعنی خاکِ نشیمن پر تڑپنا۔ اس خاک کو جوشِ اضطراب میں کبھی سینے سے لگانا، کبھی آنکھ اور جبین سے لگانا، یہ سب باتیں بالواسطہ رونے کے لفظ سے ادا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے نشیمن پھونکنے اور رونے کے ذکر کے بعد خاکِ نشیمن اور سجدے سب کو حشو سمجھنا چاہیئے۔ حضرتِ بیخود نے غم کی طرف اشارہ کرنے کے بجائے غم کو رگید دیا ہے۔ میں نے حضرتِ بیخود کے دوسرے مصرعے کے بجائے جو مصرع تجویز کرنے کی جرأت کی ہے اس سے یہ تمام عیوب دور ہو جاتے ہیں۔ شعر کے معنی اور تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ "نشیمن پھونکنے والے" اور "کبھی روئے" اب بجائے مبتذل ٹکڑے معلوم ہونے کے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ ان ٹکڑوں کو وہی حشو وہی الطناب ابتذال کے "کیچڑ پانی" میں گرا رہے تھے، جو "سجدے کئے" اور "خاکِ نشیمن" سے شعر میں آجاتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے نگار میں لکھا تھا کہ "یہ رونا نہیں ہے، یہ سوز و ساز نہیں ہے۔ یہ زخموں کی سینہ کوبی ہے۔ یہ اظہارِ غم نہیں، یہ جھک مارنا ہے، اور یہ ابتذال صرف لب و لہجہ سے پیدا ہو جاتا ہے" جس پر حضرتِ آثر اتنے جز بز ہو رہے ہیں۔ ارے صاحب اضطرابِ غم میں رونا، بلکنا، لوٹنا، تڑپنا، کپڑے پھاڑنا، چھاتی کوٹنا، سر دے مارنا، گھگھی بندھ جانا۔ سب کچھ ہوتا ہے۔ ہاں ان حرکات و سکنات پر فخر کرنا، ان کو اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کے لئے مایۂ ناز سمجھنا کوئی بہت اچھی بات نہیں۔ روئیے، تڑپئے، برباد شدہ گھر پر سجدے کیجئے۔ مگر للہ شعر میں اور غزل کے شعر میں کچھ تو اعتدال برتئے۔ خصوصاً جب اردو غزل میں رونے کا ذکر اس کثرت سے ہے کہ اور زبانوں کی شاعری کا تو ذکر ہی کیا، فارسی میں بھی ایسا نہیں۔ اِتنا تو نہ پھیلئے، یہ بھی یاد رہے کہ آدمی پھسلتا ہے اور بُری طرح گرتا ہے۔ اک ذراسی لغزش میں۔ جب میں نے پہلی بار حضرت بیخود کا شعر سنا تو پہلے مصرع سے لیکر دوسرے مصرع میں "کبھی روئے" تک "کے ٹکڑے نے مجھ پر سحر کارانہ عمل کیا، لیکن "کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر" کے ٹکڑے نے خود اس عمل کا ردِ عمل کر دیا، اسی پھیلاؤ سے اسی الطناب سے طبیعت بیزار ہو گئی، پھسل کر گرے وہ اور چوٹ مجھے لگی، غالب کہتا ہے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

نہ کہ:- کبھی روئے کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

اگر غم ہی کا مزہ پڑ گیا ہے تو ایسے شعر بھی ہو سکتے ہیں :-

صیاد اس طرح تو فریبِ سکوں نہ دے ❊ اس درجہ تو مجھے بھی غمِ آشیاں نہیں

(راقم الحروف)

میں نے حضرت تجوؔد کے اس شعر کے متعلق لکھا تھا کہ:۔

"موصوف نے غالباً یہ سمجھا ہوگا کہ وہ اس شعر کو انتخاب الفاظ، سلاستِ بیان، سادگی اور ترنم سے سوز و ساز کی آخری منزل پر لے گئے ہیں۔ مگر یہی جزئی خوبیاں اس شعر کو ابتذال کے گڑھے میں گرا رہی ہیں" میرے اس بیان میں اور بعد کے اس بیان میں کہ "یہ ابتذال صرف لب و لہجہ سے پیدا ہو جاتا ہے" حضرتِ آثر کو تصادم نظر آ رہا ہے، آثر صاحب کی صورت شکل اور ان کی شخصیت ایسی ہے کہ دیکھ کے عزت ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ حسین سے حسین سرخ ریشم کی ساری نہ سہی شروانی پہن لیں تو آپ کیا کہیں گے؟ کیا ان کے سنجیدہ حسن کو اس پوشاک کا شوخ و شنگ حسن بگاڑ نہ دے گا، حالانکہ یہ پوشاک اپنی جگہ ہر طرح حسین ہے۔ عورت کی آواز میں کتنی لوچ ہوتی ہے۔ اس کے لب و لہجہ میں کتنی دلفریبی ہوتی ہے۔ لیکن کسی حسین سے حسین مرد کی آواز میں اگر نسائیت آجائے تو آپ کیا کہیں گے۔ یہی نا کہ حسین آواز ہے۔ لیکن اس شخص کے منہ سے بھدّی بلکہ سمع خراش معلوم ہوتی ہے۔ باہم تردید و تصادم تو حضرت تجوؔد کے شعر ہی میں ہے کیونکہ اظہارِ غم اختصار چاہتا ہے، اور اُنھوں نے اطناب سے کام لیا ہے، اور اس اطناب اس حشو میں ایک حسین پشواز کا حسین گھیرا پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے شعر کا ہر لفظ فرداً فرداً "منتخب لفظ ہے" سلیس ہے، اور مترنم ہے، اور یہی حال اُن کے شعر کے ہر فقرے کا ہے جس سے سلاستِ بیان پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن جب ان کا پورا کلمہ کان میں پڑتا ہے تو یہ لب و لہجہ اپنے سوز و ساز کے ساتھ مبتذل معلوم ہوتا ہے، ایک کم مشق شاعر تو کرخت اور کریہہ اور گران الفاظ استعمال کرنے سے ناکامیاب رہتا ہے۔ لیکن الفاظ کا ترنم ان کی سلاست اور شستگی وہ چیزیں ہیں جو بڑے بڑے مشاق شعرا کو ابتذال کے گڑھے میں گرا دیتی ہیں۔ دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

یہ اپنا حال ہے اب شدّتِ بیماریٔ دل سے
سمجھتے ہیں مرے احباب میری بات مشکل سے (صفیؔ)

یہ عالم ہے کہ منہ پھیرے ہوئے عالم نکلتا ہے
شبِ فرقت کے غم جھیلے ہوؤں کا دم نکلتا ہے (صفیؔ)

طریقے ضبطِ غم کے نادکش ایجاد کرتے ہیں
اُکھڑ جاتا ہے دم یوں کھینچ کر فریاد کرتے ہیں
لگی ہیں ہچکیاں دم توڑتا ہوں بسترِ غم پر
صفیؔ شاید وہ بیماروں کو اپنے یاد کرتے ہیں (صفیؔ)

ٹھیرو ٹھیرو ذرا اے ڈوبتے تارو ٹھیرو
دیکھ لوں آخری عالم شبِ تنہائی کا (نامعلوم)

یا یہی مصرع لے لیجئے۔

تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

کون کہہ سکتا ہے کہ ان اشعار کی زبان کوثر میں دُھلی ہوئی نہیں ہے، لیکن لب و لہجہ سے ابتذال پیدا ہوگیا ہے۔ اسے یوں بھی سمجھ لیجئے کہ داغؔ دہلوی کی زبان کتنی مزیدار ہے، جتنی تعریف کی جائے، کم ہے، مگر قرآن پاک کی آیتوں کے لئے داغؔ کی زبان وضع نہیں ہوئی ہے، بلکہ قرآن پاک کی زبان سے داغؔ کے جذبات ظاہر کئے جائیں تو ابتذال پیدا ہو جائے گا، جی ہاں، اور لب و لہجہ سے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ حضرت تجوؔد کے اس شعر میں تو "رونے والے کے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ ہی بہتی ہوئی ناک، اور منہ سے گرتی ہوئی رال، ناک کی سرخی اور تھرتھراہٹ اور آنکھ کی سرخی اور گندگی بھی نظر آ رہی ہے جس سے شعر نہایت گھنونا ہو گیا ہے"۔ حضرت آثر کہتے ہیں "اس شعر میں رال وال کچھ نہیں بہتی"۔ میں تو حضرت آثر کی زبان میں صرف یہ کہوں گا کہ میرے بیان میں "رال وال" کا صرف ذکر ہے، بیان واقعہ ہے نہ کہ صورت حال" وجدان کہنے والے کے بیان میں جو ابتذال پیدا ہوگیا ہے اس کی "تصویر پیش نظر کرتا ہے" اور بس۔ میری گزارش تو محض یہ تھی اور ہے کہ مہذب اور سنجیدہ نرم اور مترنم الفاظ استعمال کرتے ہوئے بھی حضرات لکھنؤ اکثر اس چیز سے نہیں بچ پاتے، جسے پھبتی کہتے ہیں۔ بجائے مناسب و مختصر اظہار غم کے اگر غم کو شعر میں رگید دیا جائے تو پھبتی پیدا ہو جائے گی، حضرت آثر نے مجھ ناچیز کا یہ شعر بھی پیش کیا ہے :۔

یہ کہہ کے کل کوئی بے اختیار روتا تھا
وہ اک نگاہ سہی کیوں کسی کو دیکھا تھا

اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ اگر حضرت تجوؔد کے شعر میں ابتذال ہے تو میرے اس شعر میں بھی ابتذال ہے، حضرت آثر نے حضرت تجوؔد کے شعر کے متعلق میرے بیان کو ترقی دینے، چمکانے، اور اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، اولاً تو میں نے فی نفسہٖ رونے کے لفظ کو سرے سے نہ ممنوع قرار دیا تھا نہ حرام، میں نے صرف یہ کہا تھا کہ رونے کا ذکر ذرا بچ کے کرنا چاہیئے۔

دوسرے یہ کہ میں نے اپنے برباد کرنے والے کو کوسا نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ میں اتنا پھیل کر نہیں۔ رویا جس اطمینان سے حضرت تجو۔ کبھی روتے ہیں اور کبھی سجدے کرتے ہیں۔ پھر بھی حضرت آثر کو اختیار ہے کہ وہ میرے اس شعر کو لکھنؤ زدگی کی مثال سمجھیں۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ انتقاد عالیہ تو میرے بس کی چیز نہیں۔ مگر جیسے حضرت آثر نے حضرت تجو کے شعر کے متعلق میری ہرزہ سرائی کو جھٹکا یا ہے، اسی طرح مفصل یا مجمل طور پر اس مضمون نے یا میرے پہلے مضمون میں اصولی بحث کے سلسلہ میں میں نے جو "ہرزہ سرائی" کی ہے اُسے بھی ذرا ہاتھ لگائیں اور اُجاگر کریں، خواہ یہ مشق ستم وہ میرے ہی کسی شعر پر کریں۔ میرے ایسے تُک بند ہندوستان پیدا کرلے گا، لیکن شعر سے متاثر ہونے والی جماعت شعرا کے قبیلہ سے زیادہ اہم جماعت ہے۔ اس جماعت کی خدمت ہر نقاد پر فرض ہے کہ عام کا مذاق بلند ہو۔

میں نے حضرت صفی لکھنوی کے دو شعروں سے بھی کچھ لکھا تھا، اور یہ بھی حضرت آثر کو ناگوار ہوا۔ وہ شعر یہ تھے۔

دیکھئے کیوں کوئی تربت ہوگی　　آپ کو مفت ندامت ہوگی
جب کبھی گورِ غریباں میں چراغاں کرنا　　ایک ٹوٹی ہوئی تربت پہ بھی احساں کرنا

سب سے پہلے میں یہ بتادوں کہ جناب صفی کے دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ شاید یوں ہے "جب کبھی تازہ مزاروں پہ چراغاں کرنا" میری گزارش تھی کہ پہلے شعر میں ردیف کی شوخی نے شاعر کو اس امر پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا کہ میں کتنی سستی چٹکی محبوب کی لے رہا ہوں، اور کتنی بازاری بات کہہ رہا ہوں۔ کس خبیث روح کا اظہار کر رہا ہوں۔ مجھے یہ بھی کہنا چاہئے تھا کہ دوسرے مصرع میں "مفت ندامت" کے ٹکڑے میں جو روزمرہ کا مزہ ہے اس نے بھی حضرت صفی کو مغالطہ میں ڈال دیا۔ دوسرے شعر پر میں نے صرف یہ کہا کہ خیر غنیمت ہے۔ البتہ احسان کرنا کچھ برائے بیت سا معلوم ہوتا ہے۔

مگر حضرت آثر تو متاثر اور متکیف ہونے پر تلے بیٹھے ہیں۔ پُر ہوں میں کیف سے یوں راگ سے جیسے باجا، یا یوں کہہ لیجئے کہ ہم جان گئے اس کو وہ جس رنگ میں آئے۔ یہ بھی نہ سہی یوں کہئے کہ یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا۔ سنئے کیا کہتے ہیں "پہلا شعر ایک نشتر ہے جو دل میں پیرتا چلا جاتا ہے۔ پھر عاشق کے مرجانے کا ذکر ہے۔ پھر معشوق کو کوئی بتا رہا ہے کہ جس قبر کی طرف تجھے جذب عشق متوجہ کر رہا ہے، ہاں آپ کے چاہنے والے ہی

کی تربت ہے اور اس کی محبت کی کشش ہے جو تربت کی طرف دیکھنے پر مجبور کر رہی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اسی درس و تدریس کے انداز میں کافی خامہ فرسائی فرمائی ہے۔ مگر یہ اجنبی اپنے مرحوم دوست کے معشوق سے کہتا کیا ہے؟ حضرت صفی کے شعر کے الفاظ پڑھ لیجئے۔ اور اس کے لہجے پر غور کر لیجئے۔ سچ بتائیے کہ ایک شوخی ایک زہر چٹکی ایک طنز ایک اوچھا پن اس طرز بیان میں ہے یا نہیں۔ اگر شعر کو سنکر جو دھاریں مار مار کر روئے اور یہ کہے کہ مارے کیف کے میرا حال بُرا ہے اور یہ شعر ایک نشتر ہے جو دل میں پیرتا چلا جاتا ہے، اس شعر کے اوپر رشک آئے یا رحم یا غصہ یا ہنسی۔ میں نے تو خوش نصیبی یا بدنصیبی سے حضرت صفی کو یہ شعر بارہا پڑھتے سنا ہے، اور جس طرح وہ اس شعر کو ادا کرتے ہیں یا بتاتے ہیں اس میں چھیڑ چھاڑ ہی کا پہلو غالب رہتا ہے۔ ان حضرات نے کائنات کو، انسانیت کو۔ دنیا کی تمام قوموں کو اور خیالی معشوق کو بھی سخت دل جلاد اور قاتل سمجھ لیا ہے، اور خود ایسا دھان پان بنے ہیں کہ ایک مفروضہ ظلم کا تصور ہوتے ہی ٹپک پڑتے ہیں۔ کائنات تو سنگ دل ہے۔ لیکن ان حضرات کا دل ایسا پانی ہے کہ ایک بات بار بار فرض کی جاتی ہے۔ مثلاً گور غریباں پر معشوق کا گزرنا، اور پھر کیا۔ بس پھوٹ پڑتے ہیں، اسی سے تو میں نے لکھا تھا کہ گورِ غریباں کا ذکر کرنا بھی رونے کے ذکر سے کم نازک ذمہ داری کا کام نہیں۔ حضرت صفی کے پہلے شعر کی بازاریت کے مقابلہ میں اس شعر کو دیکھئے۔

بدنام ہوگے جانے بھی دو امتحان کو
رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو　　(میرا)

روزمرہ یوں باندھتے ہیں۔ نہ کہ

"آپ کو مفت ندامت ہوگی"

انھیں لطیف پردوں میں تو حضرات لکھنؤ بھبتی کہہ جاتے ہیں۔ اور دل ہی دل میں اُسے سوز و ساز سمجھکر روتے ہیں۔

دوسرے شعر کے بارے میں تازہ مزاروں پر چراغاں کرتا ہوا معشوق بھی کتنا انبساط آور اور کیف آور تخیل ہے، اور اس کے بعد بار بار یہ مصرع پڑھئے۔

ایک ٹوٹی ہوئی تربت پہ بھی احساں کرنا

اس مصرع کو مزے لے لے کر دس بار پڑھئے یا گنگنائیے، میرا ذمہ اگر طبیعت متنفر نہ ہو جائے۔

بہرحال کیف داثر پیدا کرنے کے یہ بگڑے ہوئے انداز شعرائے دلی کے

تو تھے نہیں، میر و غالب، درد اور مظہر جان جاناں کو تو یہ بات نصیب نہ تھی، یہ لوگ ذرا سنگدل تھے، انہیں یہ توفیق کیونکر ہوتی۔ رہ گئے حضرات لکھنؤ تو وہ ایسے اشعار سے جتنا بھی مائل بہ گریہ ہوں وہ اُن کا حصہ ہے، یہی تو غزل کی شاعری کی غرض و غائت ہے کہ ایسے اشعار سننے سنانے کے لئے صحبتیں کی جائیں۔

دو گھڑی مل بیٹھتے رونے رولانے کے لئے

حضرت آثر کے الفاظ میں (یا مشاہدہ اور تجربے کے مطابق ؟) "ہی ہی ہو ہو اور سبوں سبوں کے بعد" (جس میں دانت بھی نمایاں ہو جاتے ہیں یہ حضرت آثر آپ نے بالکل سچ کہا) پھر یہ مصرعے پڑھے جائیں کہ جانے دیجئے، کرم کیجئے، ادھر نہ دیکھئے

آپ کو مفت ندامت ہوگی

اس کے بعد بالکل اس سے الٹی خواہش ظاہر کی جائے، اور پہلے سے زیادہ چلا کر کہا جائے کہ

ایک ٹوٹی ہوئی تربت پہ بھی احسان کرنا

سچ ہے حضرت آثر اسی احسان کرنا کے ٹکرے نے شعر کو نشتر بنا دیا نہ ؟

میں پوچھتا ہوں کہ کیا دلّی کے مسلمان شعرا ہندوؤں کی طرح جلائے جاتے تھے۔ کیا قبر کس چیز کا نام ہے اسے وہ نہیں جانتے تھے، پھر وہ ایسے شعر کیوں نہیں کہتے تھے، شاید وہ سوز و ساز میں حضرت صفی سے کم تھے، بندہ نواز واحد وجہ ایسی باتوں سے اُن کے بچنے کی وہی تھی جو میں نے بتا دی تھی، یعنی بازاریت اور خباثت سے نفرت۔

ہاں آپ ضرور ایسے اشعار سے لذت یاب ہوں اور بزعم خود اسے "وجدان اور ذوقِ سلیم" بتائیں۔ اس سے اکثر لوگ بے بہرہ ہی ہیں، بقول آپ کے، مجھے یہ معلوم ہی نہیں تھا، اب میں بھی کہتا ہوں کہ حضرتِ بیخود کے ایک شعر اور حضرت صفی کے ان دو اشعار میں آہ کیا لطف زبان ہے، کیا سوز و ساز ہے، کتنی گہری کیفیت ہے، بار بار پڑھئے جی نہیں بھرتا وغیرہ وغیرہ وغیرہ، واقعی یہ دونوں حضرات بہت بڑے حسن پرست اور بہت بڑے عاشق تھے، انھیں کچھ نہ کہو۔

عورت

کبھی اک رازِ عریاں ہے کبھی اک رازِ پنہانی　　کبھی بہتا ہوا دھارا کبھی ٹھیرا ہوا پانی
نیاز و ناز کی بانی، نقوشِ زیست کی بانی　　جو سچ پوچھو تو عورت ہے اساسِ قصرِ انسانی
محبت ابتدا اس کی محبت انتہا اس کی　　یہ دیوانی محبت کی محبت اس کی دیوانی
طبیعت کی اُمنگیں ہیں جواں عورت کی ہستی سے　　مٹا دیتی ہے لوحِ دل سے یہ نقشِ پریشانی
مصور کبھی سمجھتا ہے تمنا اپنی عورت کو　　بڑھا دیتا ہے موئے کلک سے اس کی درخشانی
وہ اپنے دل کو نورِ عشق سے جب جگمگاتا ہے　　سکھا دیتا ہے حسنِ مہر وش کو لمعہ افشانی
محبت اس کی فطرت میں ہے نفرت اس کی طینت میں　　کبھی الفت کی دیوانی کبھی نفرت کی دیوانی

نہ سمجھا آج تک دُنیا نے عورت کی حقیقت کو
سراپائے محبت کو سراپائے عداوت کو

ابراہیم ہوش کلکتہ

سماج کی سنگدلی

محمد کمال احمد، راز، بھاگل پور

(۱)

ٹرین ایک معمولی سے اسٹیشن پر آکر رکی،
باہر بلا کا سناٹا، ماگھ مہینے کا جاڑا،
ماہ دو ہفتہ کی پھیکی روشنی، کہر آلود فضا تھی،
پلیٹ فارم پر جا بجا
شبنم زدہ کمہلائے ہوئے پھول
جھلملاتی ہوئی دو ایک شمعیں، دو تین سہمے سمٹائے قلی
ایک آدھ مسافر خاموش گاڑی پر
سوار ہوتے اور اترتے نظر آرہے تھے،
گاڑی نے سیٹی دی، گارڈ کی سبز جھنڈی ہوا میں لہرا رہی تھی، پہیوں میں جنبش ہو چکی تھی۔
اتنے میں ایک عورت پھٹی پرانی ساری میں ملبوس گود میں ایک ننھی بچی دبائے اندر آئی ہانپتی ہوئی۔
اس کے روکھے سوکھے بال پریشان، اور سیاہ و خوبصورت آنکھیں کمھلائی ہوئیں۔
قلی نے ایک پٹاری اور ایک حسین تصویر
جو چوکھٹے میں لگی ہوئی تھی
اندر پھینک دی

(۲)

گاڑی آہستہ خرامی کو چھوڑ کر
اب تیزی سے سائیں سائیں کرتی
دونوں طرف جنگلوں اور جھاڑیوں کو
پیچھے چھوڑتی، ہوا سے باتیں کر رہی تھی
گاڑی مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی،
عورت بھی ابھی تک کھڑی تھی
دیوار کا سہارا لئے ہوئے
اس کے پاؤں گاڑی کے ہچکولے سے ڈگمگا رہے تھے۔
آخرش وہ بیٹھ گئی اپنی بچی کو دبا کر

(۳)

موسم سرما کی بھیگی ہوئی رات
پھٹی ہوئی معمولی سوتی ساری
گاڑی کی ٹھنڈی نشست
میرا دل اس نظارہ کو دیکھ کر بھر آیا
میں نے اپنے پاس اُس کو تھوڑی سی جگہ دی
اس کی دو سالہ ننھی بچی ایک ہلکی سی اونی بنیان پہنے سردی سے گود میں سکڑی ہوئی تھی۔
"کیا تم بتا سکتی ہو کہ تم کون ہو اور کہاں جا رہی ہو"؟

میں نے پوچھا

"آہ یہ آپ جانکر کیا کریں گے؟" اُس نے جواباً کہا

اس کی آنکھیں موتی رولنے لگیں!

"میں ایک غمزدہ عورت ہوں میری کہانی بھی دردبھری ہے"

"میں سنگدل سماج کی ستائی ہوئی ایک بے زبان عورت ہوں"

"جس کا نہ کوئی مونس ہے نہ مددگار۔ نہ ساتھی نہ کوئی غمگسار"

"اس ظالم سماج کے نزدیک ہم بیواؤں کا، عالم بیوگی میں سوائے آشرم کہاں گزر ہو سکتا ہے"

"آج کوئی دو سال کا عرصہ ہوا میرا پتی، میری زندگی کا سہارا دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا"

"پرماتما نے میرے دکھ کو دیکھتے ہوئے بھی اس کو مجھ سے چھین لیا"

"پرماتما کے سینے میں شاید دل نہیں ہے!"

"وہ جوگناتھ پور میں ایک بڑی دوکان کے مالک تھے"

"اس وقت میں حسین تھی، مالدار تھی، میرے لئے خوشی کے تمام سامان مہیا تھے"

"یہ بال جو آج کسمپرسی کی حالت میں شانوں پر اِدھر اُدھر پڑے ہوئے ہیں کل تک ان سے خوشبوؤں کی لپٹیں نکلتی تھیں"

"میرے سہاگ کو اُجڑے ہوئے کوئی ایک مہینہ بھی نہ ہوا تھا کہ دوکان کی حالت بد سے بدتر ہو گئی"

"میں اکیلی، تن تنہا، دو مہینے کا بچہ۔ اتنی بڑی دوکان"

"بہت چیزیں لوگ چُرا کر لے گئے۔ کچھ تھوڑی بہت قیمت دے کر زبردستی اُٹھا لے گئے"

"میں انکار کرتی رہ گئی"

(۴)

"تھوڑے ہی دنوں میں دوکان بالکل صاف ہو گئی"

"میرے پاس کچھ نہ بچا"

"گاؤں کے لوگوں نے زبردستی مجھے گاؤں کے آشرم میں پہنچا دیا"

"میں اپنی بچی کو لے کر آنسو بہاتی ہوئی بے دلی کے ساتھ آشرم میں پڑی رہی"

"آشرم میں نام کا آشرم تھا، میں دن بھر در در کی بھیک مانگتی، اور رات آشرم میں رو رو کر گزارتی، اور اپنے آنسوؤں کا ہار اپنے پتی کی اس تصویر پر چڑھاتی"

"یہاں میرا جی نہ لگا، بھیک مانگ کر کچھ پیسے جمع کئے"

"اور آج موہن پور کے بڑے آشرم میں جا رہی ہوں"

یہ جملہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ گاڑی موہن پور کے جنکشن پر رُکی، میں نے قلی کو پکارا۔

مگر قلی نے آشرم تک اسباب لے جانے سے انکار کر دیا۔

اسباب پلیٹ فارم پر پڑا تھا۔

میں بھی گاڑی سے اُترا، وہ رونے لگی۔

"یہاں سے آشرم کتنی دور ہے" اُس نے دبی ہوئی آواز میں پوچھا

"دو میل کے فاصلے پر۔ اس کی مزدوری چار آنے ہوگی" قلی نے کہا

"مگر میرے پاس اتنے پیسے کہاں"

میری آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ڈھلک گئے!

میں نے چار آنے پیسے قلی کو دئے اور کچھ پیسے اس یتیم بچی کی ماں کو۔

اتنے میں گاڑی نے سیٹی دی، میں گاڑی پر سوار ہو گیا

(۵)

گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ چکی تھی

عورت آہستہ آہستہ آشرم کی طرف جا رہی تھی۔

مشرق کی طرف آفتاب عالمتاب بے نقاب ہو رہا تھا۔

اور

میرے دل میں بیوہ کی یہ آواز گونج رہی تھی

"پرماتما کے سینے میں شاید دل نہیں ہے!"

مذہب سے اختلاف کرتے رہئے

قبلے سے انحراف کرتے رہئے

[illegible] گر نہ شیخ [illegible] مل جائے

اپنے دل کا طواف کرتے رہئے

[illegible]

ازنارزا

صدیقہ بیگم سیوہارہ

لارڈ ڈنسنی Dunsany کے ایکٹ کے ڈرامہ Tents of the Arabs کا ترجمہ

افراد ڈرامہ

بادشاہ

بلنارب Belnarb

آؤب .... Aoob } بدو یعنی اونٹ ہانکنے والے

چیمبرلین ..... Chamberlain

زبرا ایک معزز شخصیت Zabra

ازنارزا ... Eznarza ایک عرب دوشیزہ (جس سے بادشاہ محبت کرتا ہے)

سماں :۔ شہر تھیلا نا کے پھاٹک کے باہر

وقت :۔ نامعلوم

ایکٹ پہلا

بلنارب ۔ آفتاب غروب ہونے تک ہم ریگستان میں ہوں گے ۔

آؤب : ہاں ! ...... ہے

بلنارب ۔ تب ہم ہفتوں شہر سے دور رہیں گے

آؤب ۔ آہ ! .... !

بلنارب :۔ اوہ .... ہم شہر کی خوشنا روح پرور روشنی کے راستوں پر آخری بار جھلکتی ہوئی دیکھیں گے ۔

آؤب ۔ اور پھر ہم ایک زبردست مہیب ریگستان میں داخل ہو جائیں گے ۔

بلنارب ۔ آہ ..... ریگستان ..... کتنا خوفناک ......

کس قدر بھیانک ...... مجھے اس کے نام ہی سے ڈر معلوم ہوتا ہے ۔

آؤب :۔ دیکھو ...... ریگستان کس چالاکی سے کنوؤں کو انسان کی نظر سے چھپا لیتا ہے ۔ نہ معلوم اسکو انسان سے کیا دشمنی ہے ۔

بلنارب :۔ ہاں ..... آؤب وہ انسانی دشمن ہے ، اس لئے مجھے بھی اس سے نفرت ہے ۔

آؤب ۔ بھائی .... میرا خیال ہے کہ دنیا میں اتنی حسین ، اتنی خوبصورت ، اتنی دلکش کوئی شے نہیں جتنا کہ شہر ۔

بلنارب ۔ ہاں .... واقعی شہر بہت خوبصورت ہوتے ہیں ۔

آؤب :۔ میرا خیال ہے کہ جب آفتاب پردۂ افق سے نمودار ہوتا ہے ۔ رفتہ رفتہ تاریکی دور ہو جاتی ہے ، آفتاب کی سنہری کرنیں شہروں کے گلابی رخساروں کا بوسہ لیتی ہیں ، اس وقت تمام عالم جگمگا اٹھتا ہے ۔ خوبصورت عالیشان محل دریا میں فن عکاسی کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں ، ہاں اس وقت شہر کس قدر دلکش و دلفریب نظر آتے ہیں ، انسانوں کے بولنے کی آوازیں فضا میں بلند ہو کر یکجا ہو جاتی ہیں ۔ ایسے خوشنما وقت میں میں اکثر محسوس کرتا ہوں کہ شہر میری طرف مخاطب ہو کر کہتا ہے ۔ آؤب ! ...... آؤب ! ...... اب ایسے وقت میں کون مرے گا ..... میں ..... نہیں .... میں ہرگز نہ مروں گا "

بلنارب ۔ آؤب ! میں تمہارے خیال سے اتفاق نہیں کرتا ، جس وقت آفتاب اپنی دن کی مسافت طے کر کے اپنی خوابگاہ کا رخ کرتا ہے ، اس وقت ایک ہلکی دلکش روشنی سڑکوں پر سے غائب ہوتی نظر آتی ہے ...... اس وقت

ہم انسانوں کو اپنے خوبصورت اعلیٰ لباس میں دیکھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ان کو پہچان نہیں سکتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں اس وقت شہر کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر میں شب اپنا سیاہ لباس زیب تن کرتی ہے ۔ رفتہ رفتہ شہر پر بالکل تاریکی چھا جاتی ہے ۔ اس وقت ریگستان میں سوائے سیاہ افق اور سیاہ آسمان کے کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن تھوڑی دیر میں شہر لالٹینوں کی روشنی سے جاگ اُٹھتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی نے سیاہ مخملی چادر میں ستارے ٹانک دئے ہیں ۔ اس وقت کوئی محبمۂ حُسن اپنے مکان کے چھوٹے مگر خوبصورت دروازے سے نکل کر خراماں خراماں ٹہلتی ہوئی نظر آتی ہے جس اس کے آگے آگے اٹھکھیلیاں کرتا ہوا چلتا ہے ، دوکاندار اپنی عالی شان دوکانیں کھولتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ لوگ اُن کے سامنے بیٹھ کر زندگی کے دلکش مناظر کا مطالعہ کرتے ہیں ۔ اس وقت شہر کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے ۔ آؤب ۔ ۔ ۔ آذب ! وہ سامنے دیکھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ریگستان نے آسمانوں پر بادلوں کے سُرخ تودے پھیلا دئے ہیں ۔ تاکہ ہر عرب کو معلوم ہو جائے کہ کل سخت زہریلی ریگستانی ہوا سیروک چلیگی ۔"

آؤب ۔ ہاں ـــــــ شہر کی چار دیواری میں محفوظ رہ کر سیروک ( ) کے متعلق سوچنے میں بڑا لطف آتا ہے ـــــ لیکن میں اس وقت اس کے متعلق گفتگو جاری رکھنا مناسب نہیں سمجھتا ۔ کیونکہ کل دن نکلنے سے پہلے ہم مکہ کو روانہ ہو جائیں گے ، کوئی نہیں جانتا کہ ریگستان کی فضا ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہو جائے ۔ ریگستان کا سفر ایسا ہے جیسے کہ کتے کو ہڈی ڈالنا ، کچھ وہ اُٹھا لیتا ہے اور کچھ اُس کی نظر سے بچ جاتی ہے ، جو اسی جگہ پڑی رہ جاتی ہے ، اسی طرح شاید وہ ہماری ہڈی کو چیٹ کر جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا ہم اس سے بچ کر خوبصورت مکہ میں پہنچ جائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کاش کہ میں سوداگر ہوتا ، اور تمام دن اپنی خوشنما دکان پر بیٹھ کر خرید و فروخت کا کام انجام دیتا ۔"

بلنارب :۔ ٹھیک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کسی مغرور انسان کو جو کپڑا یا زیور خریدنے آئے دھوکا دینا آسان ہے ، لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ریگستان میں موت کو دھوکا دینا بہت مشکل ہے ۔"

آؤب : (اشارہ کرتے ہوئے) "بلنارب ، دیکھو وہ کون ہے" !

بلنارب :۔ کہاں ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ریگستان کے سرے پر جہاں اونٹ جاتے ہوئے نظر آتے ہیں ؟"

آؤب ۔ ہاں وہی ـــــــ وہ کیا ہے ؟"

بلنارب ۔ وہ دیکھو ـــــــ وہ اونٹوں کے راستے پر کھڑے ہو کر ریگستان کو چاروں طرف گھور گھور کر دیکھ رہا ہے ، لوگ کہتے ہیں کہ بادشاہ اکثر ریگستان میں جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ وہاں بہت دیر تک کھڑا رہتا ہے ، یہاں تک کہ شام ہو جاتی ہے ، وہ اس وقت تک مکہ کی طرف دیکھتا رہتا ہے ۔

آؤب ۔ کیوں ؟ کیا وہ مکہ نہیں جا سکتا ۔ ؟"

بلنارب :۔ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر خدا مجھکو بادشاہ بنا دے تو میں ایک بار ریگستان ضرور جاؤں اور وہاں اپنی پگڑی اور ڈاڑھی کی تمام ریت جھاڑ ڈالوں اور میں کبھی پھر ریگستان کا رُخ نہ کروں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تب چاہے ریگستان اپنی ریت سے صحرا کے تمام کنویں پاٹ دے ، اور سیروک ہوا ریگستان میں سالہا سال ہی کیوں نہ چلے تو بھی اپنے دل سے اس کے لئے بد دعا کا ایک حرف بھی نہ نکالوں ۔"

آؤب ۔ (ایک مصنوعی قہقہہ لگاتے ہوئے) ۔ ۔ ۔ ۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم بادشاہ کی طرح معلوم ہوتے ہو ۔"

بلنارب : ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں بادشاہ ہی کی طرح ہوں کیونکہ اس کا (بادشاہ) باپ بھی میری ہی طرح ایک بدو کا بھیس بدل کر ہمارے گاؤں میں گیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اکثر اپنے دل میں خیال کرتا ہوں کہ خدا منصف ہے اگر میں بادشاہ کا بھیس بدل لوں اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کو ایک بدو کہہ کر نکال دوں تو شاید میرا یہ فعل خدا کو پسند آئے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیونکہ وہ بڑا منصف ہے ۔"

آؤب :۔ اگر تم ایسا کرو گے تو خدا کہے گا کہ بلنارب کو دیکھو کہ میں نے اُس کو اونٹ ہانکنے والا بنایا ، لیکن وہ اپنے کام کو بھول گیا ، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور تب بلنارب خدا تم کو بھی بھول جائے گا ۔"

بلنارب : (ہنستے ہوئے) "ہا ہا ہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہا ہا ہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر کون جانتا ہے کہ خدا کیا کہے گا ۔"

آؤب :۔ ہاں کوئی نہیں جانتا ، خدا کے کام پوشیدہ ہوتے ہیں ۔"

بلنارب :۔ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا ۔ میں جب کبھی ریگستان میں جاتا ہوں تو اکثر وقت گزارنے کے لئے ایسی باتیں کیا کرتا ہوں ، اور کبھی کبھی اپنے دل میں کہتا ہوں کہ بلنارب تھیلانا کا بادشاہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور تب میں چیمبرلین ( ) کو آواز دے کر حکم دیتا ہوں کہ اسکارمی ( ) کو مع اس کی فرحت بخش شراب اور

اور لالٹین کے یہاں لاؤ، اور پھر تمام شہر کے لوگوں کو محل کے قریب بیٹھ کر شراب پی پی کر دنیا میں میرا نام روشن کرنے دو "

مسافر پکارتے ہیں

مسافر - بلنارب! بلنارب!! اور دو کتوں کے بچے بلنارب!!! چلو اور اپنے اونٹوں کی رسیاں کھولو تاکہ سب لوگ مکہ کو روانہ ہوں۔

بلنارب :- میں ریگستان کو بہت بد دعا دیتا ہوں "

آؤب :- اب اونٹ کھڑے ہو رہے ہیں .... قافلہ مکہ کی جانب روانہ ہو رہا ہے .... رخصت .... اے خوبصورت شہر تفیلان رخصت ...."

(بادشاہ یہ وعدہ کرکے کہ اگلے سال اسی دن دوپہر تک مکہ واپس آجائے گا، ریگستان کی طرف روانہ ہوجاتا ہے ...... وہ اپنا لباس تبدیل کرکے مکہ واپس آتا ہے، اس کے ساتھ ایک عربی حسین دوشیزہ ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے، جیسے ہی وہ شہر میں داخل ہوتا ہے ایک بدو (اونٹ چلانے والا) اس کے سامنے آتا ہے، اور اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کرتا ہے۔)

بادشاہ - آہ .... دنیا ہمیشہ یکساں نہیں رہتی .... رفتہ رفتہ ہر شے تبدیل ہوجاتی ہے، اور آخر میں امید کی ایک ٹمٹماتی ہوئی شمع نظر آتی ہے .... اور تھوڑی دیر بعد وہ بھی خاموش ہوجاتی ہے .... اس وقت ہر طرف ناامیدی ہی ناامیدی نظر آتی ہے۔

(ازنارنا (عربی دوشیزہ) اس کا کوئی جواب نہیں دیتی، وہ اپنا منہ ڈھک لیتی ہے، بادشاہ اٹھتا ہے اور آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر چڑھتا ہے)

(چیمبرلین اور زبرا داخل ہوتے ہیں)

چیمبرلین - آئے گا .... وہ ضرور آئے گا "

زبرا - لیکن اب دوپہر ہوگئی ہے ...... آہ .... کیا ہماری قسمت نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے، ہمارے دشمن ہم کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں - آہ .... خدا کیا تو ہم سے خوش ہے .... کیا وہ آئے گا؟

(بلنارب اور آؤب داخل ہوتے ہیں)

چیمبرلین - نہیں، اگر وہ زندہ ہے تو ضرور آئے گا۔

زبرا - لیکن مجھے ڈر ہے کیونکہ اب دوپہر بھی گزر چکی ہے "

چیمبرلین - تب شاید وہ مرگیا، یا راہ میں ڈاکوؤں نے اُسے لوٹ لیا۔

(چیمبرلین اور زبرا گھبراتے ہیں)

بلنارب - (آؤب سے مخاطب ہوکر) خدا منصف مزاج ہے۔ (پھر چیمبرلین اور زبرا کی طرف مخاطب ہوکر کہتا ہے .... میں،

(بادشاہ کا ہاتھ دروازہ پر ہے، جب بلنارب یہ کہتا ہے تو بادشاہ آہستہ آہستہ سیڑھی سے نیچے اُترتا ہے، اور عربی دوشیزہ کے قریب بیٹھ جاتا ہے، ازنارنا اپنا سر اوپر اُٹھاتی ہے، اور بادشاہ کی طرف بغور دیکھتی ہے، بادشاہ، چیمبرلین، زبرا اور آؤب کی باتوں کو بغور سنتا ہے) ازنارنا اپنا چہرہ ڈھک لیتی ہے۔

چیمبرلین :- کیا آپ واقعی بادشاہ ہیں؟

بلنارب :- ہاں! ————

چیمبرلین :- حضور والا ایک سال کے عرصے میں بہت تبدیل ہوگئے ہیں۔

بلنارب - ہاں! .... انسان ریگستان کی آب و ہوا سے بہت تبدیل ہوجاتا ہے۔

آؤب :- واقعی عالی جناب آپ ہی بادشاہ ہیں (چیمبرلین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) جب حضور سلامت ریگستان گئے تھے تو میں نے ہی آپ کے اونٹ چرائے تھے۔

زبرا - ہاں! .... آپ ہی بادشاہ ہیں، میں جب کبھی آپ کو دیکھتا ہوں تو پہچان لیتا ہوں۔

چیمبرلین - تو تم نے حضور کو اکثر دیکھا ہے۔

زبرا - ہاں! ...."

چیمبرلین - اگر اس شخص کے علاوہ (جو آپ کے ہمراہ ہے) اور کوئی دوسرا شخص آپ کو پہچان لے تو ہم آپ کو بادشاہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں ..."

بلنارب :- اس کی کوئی ضرورت نہیں، میں ہی بادشاہ ہوں "

(بادشاہ اپنی جگہ سے انگڑائی لیتا ہوا کھڑا ہوجاتا ہے)

بادشاہ - ہاں! —— پاک مکہ میں میں نے آپ کو بطور بادشاہ کے دیکھا ہے۔

بلناد ب۔ یہ شخص ٹھیک کہتا ہے ۔۔۔۔۔۔ میں نے بھی اس کو اکثر مکہ میں دیکھا ہے۔

چیمبرلین۔ حضور معاف فرمایئے (سر جھکا لیتا ہے) ریگستان کی آب و ہوا سے حضور بہت تبدیل ہوگئے ہیں۔

زبیرا۔ (آہستہ گفتگو کرتے ہوئے) میں بادشاہ کو پہچانتا ہوں۔

آڈب۔ اور میں بھی ———

بلناد ب:۔ (بادشاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس شخص کو بہت کچھ انعام و اکرام دو اور اس کو محل میں کسی اچھی جگہ پر مامور کردو۔

چیمبرلین۔ بہت اچھا حضور ———

بادشاہ۔ میں ایک بدو ہوں، اور اب اپنے اونٹوں پر جارہا ہوں۔

چیمبرلین۔ جیسی تمہاری مرضی ہو ———

(بلناب۔ آڈب۔ چیمبرلین۔ زبیرا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہیں)

ازفادرسا۔ (عربی دوشیزہ) آپ نے بہت عقلمندی سے کام لیا، اور عقلمندی کا انعام ہمیشہ خوشی ہوتا ہے۔

بادشاہ۔ (ہنستے ہوئے) اب اُن کو بادشاہ مل گیا اور ہم عربوں کے خیموں پر واپس چلیں گے۔

ازنادرسا۔ اوہ ۔۔۔۔۔۔۔ وہ لوگ کیسے بیوقوف ہیں۔

بادشاہ۔ اور اُن کو بیوقوف بادشاہ بھی تو مل گیا ہے۔

ازنادرسا۔ وہ آدمی کس قدر بیوقوف ہے جو چار دیواری کے اندر گرفتار رہ کر زندگی بسر کرنا پسند کرتا ہے۔

بادشاہ۔ کچھ لوگ پیدائشی بادشاہ ہوتے ہیں، لیکن اس شخص نے بادشاہ بننا پسند کیا ہے۔

ازفادرسا۔ چلو اب ہم واپس چلیں ——

بادشاہ۔ ہاں! اب ہم واپس چلیں گے، اور ہم اپنے خوبصورت خیمہ میں لوگوں سے تھوڑے فاصلہ پر رہیں گے۔

ازنادرسا۔ ہاں! ۔۔۔۔۔۔۔ اور وہاں ہم ریت کے سریلے دلکش نغمے سنیں گے۔

بادشاہ۔ اور دور سے لوگوں کی بول چال کی آوازیں بھی ہمارے کانوں میں آئیں گی ۔۔۔۔۔۔۔ اور جب سلطان خاور اپنی خوابگاہ کی طرف رُخ کریگا، اس وقت دنیا اپنا ماتمی لباس زیب تن کرے گی۔ لیکن اس وقت ہم اپنے گزشتہ زمانہ کو یاد نہ کریں گے۔

ازفادرسا۔ رات کے وقت میں خیمہ سے اپنا سر باہر نکالوں گی، تو زریں ستارے میرے ریشمیں بالوں میں ٹمٹماتے ہوئے نظر آئیں گے، اُسوقت ہم دنیا کی حسین سے حسین ترین ملکہ پر بھی حسد نہ کرینگے

جذباتِ شہید

یہ منزلِ دشوار کہیں جلد بھی ہو طے — ہمراہ گراں گام! ذرا تیز ذرا تیز

تقدیر کا قائل نہیں وہ مردِ جو اس عزم — رکھتا ہے تصرف میں جو دستِ فلک آویز

منصور نہیں قابلِ تعزیر تھا ساقی — کیوں اس نے سبک جام کو تلخابہ دیا تیز؟

کیا جانئے اب کس سے ہم آغوشِ ہو شیریں — پیدا ہوئے پھر دہر میں تیشہ زن و پرویز

میں کیف میں کیا کہہ گیا اللہ ہی جانے

مے ریز تھا ابر اور سماں کیفیت انگیز

شہید ابن علی

اورنگ زیب اور راجہ جسونت سنگھ

کوثر چاندپوری

کون نہیں جانتا کہ اورنگ زیب نہایت دین دار اور متقی بادشاہ تھا، اور یہی اس کی ایسی زبردست خطا ہے جس نے اورنگ زیب کو ہزاروں الزامات کا ہدف بنا دیا ہے، حالانکہ جو لوگ دین اور مذہب کی حقیقت سے باخبر ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ ایک مسلمان بادشاہ جس کے تمام افعال و اعمال اسلام کے دائرے میں محدود ہوں کسی حالت میں بھی غیر مسلم رعایا کے ساتھ بے انصافی نہیں کر سکتا، نہ ان کے مذہبی حقوق اور آزادی کو سلب کرنے کی جرأت کر سکتا ہے، وہ اسلامی قانون کی رو سے مجبور ہے، کہ مختلف طبقات رعایا میں عدل و مساوات کی میزان کے پلڑے برابر رکھے۔ اگر کوئی پلڑا بھی جھک گیا تو عاقبت میں اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب پکا مسلمان تھا، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ نہایت سیاسی، دور اندیش اور سمجھدار انسان تھا، اُس نے مذہب کو ہمیشہ سیاسی سربلندیوں کے لئے بطور آلۂ کار استعمال کیا ہے، اور یہ کہنا حقیقت سے لاعلمی کا ثبوت دینا ہے کہ اس نے ہر کام مذہب کی روشنی میں کیا ہے، وہ بیک وقت مسلمان بھی تھا اور بادشاہ بھی۔ اس لئے جو لوگ اس کی دونوں حیثیتوں کو جداگانہ نقطۂ نظر سے نہیں دیکھ سکتے، وہ اس کی زندگی کے ایک رُخ کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کے ہر کام میں مذہبی رنگ پیدا کر دینا ایک سخت قسم کا تعصب ہے، جس کے لئے جہالت اور بے بصری لازمی ہے، اورنگ زیب نے شروع سے آخر تک جو کچھ بھی کیا وہ خالص سیاست اور جہانبانی کے اصول سے کیا، باپ اور بھائیوں کے ساتھ اس نے جو طرزِ عمل اختیار کیا، اس میں بھی ملکی اور سیاسی اغراض کارفرما تھے، اور ایک اولوالعزم بادشاہ کو اس کے سوا کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا۔ بیٹوں کے ساتھ بھی اس کا یہی عمل رہا، اس کا بیٹا محمد معظم بلایا ہوا آتا ہے، اور ذرا سے شبہ پر بادشاہ توپوں کا منہ اس کے لشکر کی طرف پھیر کر حکم دیتا ہے کہ ہتھیار اتار صرف بیٹوں کو ساتھ لے کر آؤ۔ پھر اسی بیٹے کو معاملاتِ دکن کی پیچیدگیوں سے متاثر ہو کر قید کر لیتا ہے اور اس وقت تک رہا نہیں کرتا۔ جب تک دکن کی صورتِ حال سے مطمئن نہیں ہو جاتا۔ اکبر بغاوت و سرکشی کرتا ہے تو اس کے مقابلہ میں بھی اورنگ زیب وہی سیاسی چالیں چلتا ہے جو کسی خطرناک غنیم کے ساتھ چلی جا سکتی ہیں، حسنِ تدبر سے بیٹے کی فوج کے عمدہ سرداروں کو اس سے توڑتا ہے، اس کے لشکر میں پھوٹ ڈلواتا ہے اور اس طرح بغیر تلوار میان سے نکالے دفعتہً نقشۂ جنگ کو بدل دیتا ہے، اورنگ زیب کے بھائی اور بیٹے سب مسلمان تھے، اس لئے یہاں قدرتاً مذہبی تعصب کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ ساری کارروائیاں ملکی اور سیاسی امور سے متعلق تھیں۔ لیکن یہی سیاسی اور ملکی ضرورتیں غیر مسلم سرداروں اور باغیوں کے بالمقابل استعمال کی جاتی ہیں تو جاہل اور بے بصر معترض فوراً انھیں تعصب اور ہندو کشی سے تعبیر کرتا ہے، چنانچہ سیواجی اور اس کے خیرہ سر بیٹے سنبھا پر اسی اصول کے ماتحت فوج کشی کی جاتی ہے، اور انھیں اسیر و دستگیر کرنے کی سعی عمل میں لائی جاتی ہے تو یہ سیاست اور ملکی ضرورت بلا کسی توقف کے تعصب اور تنگ نظری میں تبدیل ہو جاتی ہے، حالانکہ تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ سیواجی مرہٹہ اورنگ زیب کا باغی اور اس کی حکومت کا بدترین دشمن تھا، سنبھا کی حیثیت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ یہ دونوں حکومتِ مغلیہ کو بیخ و بن سے اُکھاڑ دینا چاہتے تھے، مقبوضاتِ شاہی پر غاصبانہ قبضہ کرتے تھے، بادشاہ کی رعایا کو لوٹتے اور اُن کے گھروں کو تباہ کرتے تھے۔

پھر بھی اورنگ زیب اُن کے استیصال کی غرض سے فوجی قوت استعمال کرتا ہے، اور عساکرِ مغلیہ کو حرکت میں لاتا ہے تو اس اہم اور ملکی خدمت کو اس کے اسلامی جذبات سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

اورنگ زیب اور مہاراجہ جسونت سنگھ والئ جودھپور کا معاملہ بھی اسی نوعیت کا ہے اگرچہ اس میں اوّل سے آخر تک اورنگ زیب کی فیاضی، فراخدلی اور عفو و درگذر کی متواتر اور حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں۔ مگر ان سب کو نظر انداز کرکے ایک یا چند غلط فہمیوں کی بنا پر جو یورپین مورخین کی حماقت کے باعث پیدا ہوگئی ہیں، اُسے بدنام و رسوا کرنے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے، اگرچہ ان ہرزہ سرائیوں کے خلاف متعدد بار آواز بلند کی جاچکی ہے۔ بالخصوص علامہ شبلی مرحوم نے اس خصوص میں نہایت کامیاب اور قابلِ تعریف خدمات انجام دی ہیں۔ مگر جو لوگ جھوٹ بولنے اور فساد پھیلانے کے عادی ہوتے ہیں، ان پر دلائل کی معقولیت اور واقعات کی اصلیت کا اثر نہیں ہوا کرتا، ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ فرضی اور غلط افسانے بیان کرکے ہنگامہ برپا کردیں اور بس، چنانچہ اسی "عادتِ قدیم" اور خصلتِ لئیم کی بنا پر آج بھی اورنگ زیب کے خلاف غیر ذمہ دار حضرات کی زبانیں اور اُن کے قلم اپنے کام سے غافل نہیں۔ اس کام کی اہمیت کو وہ خود بھی اچھی طرح محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اپنی اغراض سے مجبور ہیں اور اجنبی اقتدار کی ریشہ دوانیاں ہر روز انھیں اس شرارت پر اکساتی اور آمادہ کرتی ہیں یہی راز ہے جو بار بار شاہجہاں اور عالمگیر کو موردِ طعن بنایا جاتا ہے، اور ان پر بے بنیاد، دل آزار حملے کئے جاتے ہیں، غور و تامل سے دیکھا جائے تو ان غلط فہمیوں کا سرچشمہ جو عالمگیر کے خلاف پھیلائی جاتی ہیں۔ انگریز مورخین کی وہ کتابیں ہیں جو ایک غیر ملک میں بیٹھکر، یہاں کے رسم و رواج اور خصوصیات سے بے خبری کے عالم میں انھوں نے مرتب کی ہیں، اور محض اس وجہ سے کہ یورپ کے آسمان سے نازل ہوئی ہیں، ناواقف اور متعصب لوگ ان پر اعتماد کرتے ہیں۔ حالانکہ ہندوستان کی تاریخ ہندوستانیوں سے بہتر اور کوئی شخص بیان نہیں کرسکتا۔

موجودہ زمانہ میں جب کہ ہندوستان صدیوں تک سو چکنے کے بعد متحدہ قومیت کا خواب دیکھ رہا ہے اور اربابِ فکر و نظر اس کی تعبیریں تلاش کررہے ہیں۔ اس قسم کی بیہودہ گفتاریوں کا سلسلہ قطعاً بند ہوجانا چاہیئے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مدبرین یورپ نے جو زہریلے اثرات پھیلائے ہیں ہمارے دل و دماغ پر ابھی ان کا کافی اثر موجود ہے، چنانچہ ابھی حال میں ایک تاریخی افسانہ "انتقام" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس کے مصنف ڈاکٹر لکشمی دت صاحب ہیں، میری رائے میں یہ افسانہ تاریخی حقائق سے زیادہ تلخ گفتاریوں، اور افسانہ طرازیوں کا حامل ہے۔ مجھے خوشی ہوتی اگر اس کے نامور مصنف معمولی سی تحقیق و کاوش سے بھی کام لیتے، اگر معاملہ میرا اور مصنف ہی کا ہوتا تو یقیناً میں اس کا جواب دے کر اپنی اور اپنی معلومات کی "توہینِ بالقصد" کا مرتکب نہ ہوتا۔ لیکن صورتِ حال دوسری ہے، اور یہ سمیّت افراد سے گزر کر ملک کو بھی مسموم کرسکتی ہے، اس لئے میری وطن دوستی مجھ سے مطالبہ کرتی ہے کہ میں ان تاریخی صداقتوں کو عالم آشکارا کردوں، جن کو "کذب و افترا" کے غبار سے دھندلا کیا جارہا ہے۔

ہندوستان ایک نئے قومی دور سے گزر رہا ہے، اس وقت تک وہ اپنی متعین کی ہوئی منزلِ مقصود تک نہیں پہونچ سکتا، جب تک ہمارے خیالات اور عزائم میں بلندی پیدا نہو۔ غیروں کی بیان کی ہوئی جھوٹی داستانوں پر اعتماد کرنے کی مذموم عادت خود اعتمادی کے بالکل خلاف ہے، اس لئے ہمیں اس کے خلاف پوری قوت سے جہاد کرکے اپنے ارادوں میں بلندی اور خیالات و محسوسات میں پاکیزگی پیدا کرنی چاہیئے۔ علامہ شبلی کی کتاب "عالمگیر پر ایک نظر" اور اس کے تمام مآخذ میرے سامنے ہیں، اور میں کوشش کرونگا کہ جس چیز کو علامہ مرحوم نے ایجاز و اختصار کے ساتھ پیش کیا تھا، تفصیل و وضاحت سے بیان کردوں، اور ان ضروریات کا بھی احاطہ کرلوں جو بعد میں پیدا ہوئی ہیں۔

مہاراجہ جسونت سنگھ وہ شخص ہے جو اورنگ زیب کی اقبالمندی کا آفتاب طلوع ہوتے ہی، اُس سے ٹکرایا۔ اُجین کے مقام پر جس کو عالمگیر کے "خورشیدِ اقبال" کا مطلع کہنا چاہیئے۔ راجہ جسونت سنگھ ہی تھا جس نے اورنگ زیب کی سطوت و اقتدار کے تیز دھارے کو روکنے کے لئے نیزہ و شمشیر کا استعمال کیا۔ مگر وہ طاقت و شجاعت کے اس سیلاب کو نہ روک سکا اور بالآخر شکست کھاکر بھاگ گیا۔ میرا خیال ہے کہ واقعات کو سمجھانے میں "اشارات" سے حسب دلخواہ امداد نہیں مل سکتی۔ اس لئے ضروری "تفصیلات" کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

۷ رذی الحجہ ۱۰۶۷ھ کو اورنگ زیب کا باپ اور شہنشاہِ ہند شاہجہاں بیمار ہوگیا، اور کمزوری کے باعث سلطنت کے نظم ونسق کی نگرانی نہ کرسکا۔ شاہجہاں کے چاروں بیٹوں میں سے صرف داراشکوہ جو اپنے متعلق ولی عہد ہونے کا یقین رکھتا تھا، بادشاہ کے پاس موجود تھا، اورنگ زیب دکن میں قلعۂ بیجاپور کی بلند اور سنگین دیواروں پر اپنی قوت آزما رہا تھا، مراد گجرات کی صوبہ داری کے جھگڑوں میں الجھا ہوا تھا، شجاع بنگالہ میں تھا۔ داراشکوہ نے میدان خالی دیکھ کر کاروبار حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ساتھ ہی یہ بے عقلی بھی کی کہ دارالخلافہ کی خبروں کا باہر جانا بند کردیا۔ خطوط پر نگرانی قائم کردی، امراء اور شاہزادگان کے وکلاء کو سختی سے ممانعت کردی کہ دربار کی کوئی خبر نہ لکھیں، داراشکوہ کی اس ناعاقبت اندیشی کا یہ نتیجہ ہوا کہ بادشاہ کی موت اور زندگی کے معاملہ میں لوگوں کو شبہات پیدا ہونے لگے۔ رعایا جو بادشاہ کے درشن کی عادی تھی اس دولت سے محروم ہوگئی۔ ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک ہیجان پیدا ہوگیا، جگہ جگہ فتنے برپا ہونے لگے۔

مراد بخش نے گجرات میں اپنی بادشاہت کا اعلان کرکے خطبہ اور سکہ جاری کردیا۔ شجاع بھی خاموش بیٹھنے والا نہ تھا، اس نے بھی خودمختاری اور آزادی کا دعویٰ کیا، اور پٹنہ پر قبضہ کرکے بنارس تک آگیا، اورنگ زیب ان سب میں عقلمند اور دور اندیش تھا، اس نے اپنے دامن کو خودسری اور بغاوت کے داغ سے محفوظ رکھا۔

داراشکوہ خوب سمجھتا تھا کہ اورنگ زیب کے علاوہ اس کے کسی بھائی میں مقابلہ کی ہمت نہیں۔ عالمگیر کی دانشمندی اور شجاعت کا اس پر کافی اثر تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب عالمگیر بیجاپور کے محاصرے میں مصروف تھا اور فتح کے آثار پیدا ہوگئے تھے۔ داراشکوہ کو معلوم تھا کہ اورنگ زیب کے پاس کافی لشکر موجود ہے، وہ جس وقت چاہے گا دارالخلافہ پر حملہ کردے گا، چنانچہ اورنگ زیب کا زور توڑنے کی اس نے یہ تدبیر کی کہ امدادی لشکر کو جو فتح بیجاپور کے لئے مامور ہوا تھا بادشاہ سے کہہ کر واپس بلا لیا۔ تمام امراء حکم شاہی کی تعمیل میں مہم کو ادھورا چھوڑ کر حضور میں آگئے، اورنگ زیب تنہا رہ گیا، بڑے بڑے امیروں میں سے معظم خاں، شاہنواز اور نجابت خاں کے علاوہ کوئی امیر اس کا شریک حال نہ رہا۔

داراشکوہ، بادشاہ کو دہلی سے آگرے لے آیا، اور مراد و شجاع کی تنبیہ کے لئے فوج بھیجنے کی فکریں کرنے لگا۔ آخر ایک زبردست لشکر راجہ جسونت سنگھ راٹھوڑ کی زیر سرکردگی اجین روانہ کیا، اس سے مقصد یہ تھا کہ دریائے نربدا کے گھاٹوں پر قبضہ ہوجائے، اور عالمگیر آگرے کا رُخ نہ کرسکے۔

مراد اور شجاع کی طرف سے داراشکوہ نے بادشاہ کو برہم کردیا تھا، وہ چاہتا تھا پہلے ان دونوں کا قصہ تمام ہوجائے، اور عالمگیر تنہا رہ جائے تاکہ اس کا مقابلہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے، شجاع کی سرکوبی کیلئے بھی فوج جاچکی تھی، مراد کا یہ انتظام ہوا کہ قاسم خاں کو لشکر دے کر راجہ جسونت سنگھ کے ہمراہ بھیجا گیا تاکہ ضرورت کے وقت مراد کو گجرات سے بے دخل کردے۔

اگرچہ اورنگ زیب نے اب تک باپ کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا تھا اور نافرمانی کا خیال بھی اس کے دل میں نہ آیا تھا، لیکن داراشکوہ نے جھوٹی خبریں بیان کرکے بادشاہ کو اس کی طرف سے بھی منحرف کردیا۔ اور اس کے وکیل عیسیٰ بیگ کو گرفتار کرکے اس کا مال و اسباب ضبط کرلیا گیا۔

اورنگ زیب اور جسونت سنگھ کا مقابلہ

پہلے لکھا جاچکا ہے کہ اورنگ زیب بیجاپور کے محاصرے میں مصروف تھا کہ فوجوں کی واپسی کے لئے شاہی فرمان پہونچ گیا۔ اور اس نازک وقت میں اورنگ زیب تنہا رہ گیا، مجبوراً وہ سکندر عادل شاہ سے صلح کرکے اورنگ آباد آگیا۔

یہاں آکر عالمگیر نے آگرہ جانے اور داراشکوہ کے اختیارات کو کم کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا، اس کا خیال تھا کہ مراد کو بھی ساتھ لے جائے اور باپ سے اس کا قصور معاف کرائے۔

اورنگ زیب اچھی طرح جانتا تھا کہ دارشکوہ اُسے دربار تک نہ پہونچنے دے گا۔ جہاں تک ممکن ہوگا باپ اور بیٹے کی ملاقات میں رکاوٹیں پیدا کریگا، اس کے علاوہ آگرہ جانے کے لئے مالوے سے گزرنا ضروری تھا، جہاں راجہ جسونت سنگھ اور قاسم خاں اپنا لشکر لئے پڑے تھے۔ اور قلعہ بندی کررہے تھے، ان حالات کا اقتضا تھا کہ وہ بھی تیار ہوکر جائے، اور اپنے راستے سے رکاوٹوں کو دور کرتا ہوا آگرہ پہونچ جائے، اس خیال سے اس نے اپنی فوج درست کی، امراکی استمالت کیلئے ان کو مناصب و خطابات عطا کئے۔ شاہزادہ مراد کو پیام بھیجا کہ تم بھی مالوے کی طرف بڑھو اور نربدا کو

عبور کرکے ہم سے آملو۔ ان انتظامات سے فارغ ہوکر اورنگ زیب ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۰۶۸ھ کو اورنگ آباد سے برہان پور کی طرف بڑھا، برہان پور سے اس نے باپ کی خدمت میں مزاج پرسی کے لئے عریضہ لکھا، جواب کے انتظار میں ایک مہینہ تک وہاں قیام کیا، لیکن جواب نہ آیا، اور وحشتناک خبریں برابر آتی رہیں مجبوراً ۵ جمادی الآخر کو وہ برہان پور سے اکبرآباد کی طرف چلا، دیپالپور سے نکلا تو شاہزادہ مراد بھی اس کا شریک سفر ہوگیا۔

راجہ جسونت سنگھ نے اجین سے سات کوس بڑھکر شاہزادوں کو روکا، اورنگ زیب کی نیت خواہ کچھ بھی ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ لڑائی سے بچنا چاہتا تھا، اس نے راجہ جسونت سنگھ کے پاس کہلا بھیجا کہ میں باپ کی زیارت کو جا رہا ہوں، لڑائی کا ارادہ نہیں رکھتا، بہتر ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلو ورنہ راستہ سے ہٹ جاؤ، راجہ نے اس پیام کا کوئی اثر نہ لیا، اور جنگ وجدل پر آمادہ ہوگیا۔

۲۲ رجب ۱۰۶۸ھ کو جمعہ کے دن اورنگ زیب نے اپنا لشکر آراستہ کیا۔

عالمگیر نامہ کی روایت ہے کہ راجہ جسونت سنگھ نے اورنگ زیب سے مرعوب ہوکر کہلایا کہ میں لڑنا نہیں چاہتا، بلکہ اطاعت و ملازمت کا قصد رکھتا ہوں، اورنگ زیب نے اس کی بات کا اعتبار نہ کیا، اور جواب دیا کہ سچے ہو تو تنہا نجابت خاں کے پاس جاؤ وہ شہزادہ محمد سلطان کے پاس تمہیں لے جائے گا، شاہزادہ ہمارے پاس لائے گا، راجہ نے اس حکم کی تعمیل نہ کی، اور لڑائی کے اہتمام میں مصروف ہوگیا، ہزاروں بہادر راجپوت اور مسلمان اس کے ساتھ تھے، لڑائی شروع ہوئی اور تیر وتفنگ سے گزرکر دست بدست مقابلہ ہونے لگا، راجپوتوں نے اورنگ زیب کے ہراول پر زبردست حملہ کیا، اورنگ زیب اس معرکہ میں خود شریک تھا، اس نے دشمن کا منہ پھیر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ جسونت سنگھ شکست کھاکر اپنے وطن جودھپور چلا گیا اور قاسم خاں لشکر شاہی کے ساتھ فرار ہوا۔

یہ تھی اورنگ زیب اور جسونت سنگھ کی مخاصمت کی ابتدا جس سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ عالمگیر امن وسکون کے ساتھ مالوے کی سرحد سے نکل جانا چاہتا تھا، مگر راجہ کی فساد آمادگی نے اس کے امکانات باقی نہ رکھے، اور مجبوراً لڑائی تک نوبت پہونچی، جس کی تمام ذمہ داری راجہ جسونت سنگھ کے سر عاید ہوتی ہے، اگرچہ اس حیثیت سے کہ وہ داراشکوہ کے احکام کی تعمیل کر رہا تھا، اور بالفاظ دیگر اپنے فرائض کی بجاآوری میں وفاداری سے کوشش کر رہا تھا، راجہ کو کسی طرح مورد الزام نہیں بنایا جاسکتا، لیکن اورنگ زیب اور راجہ کے تعلقات پر اس وفاداری کا کوئی اثر نہیں پڑسکتا، داراشکوہ اور عالمگیر کی حیثیت ایک تھی، ایسی صورت میں راجہ کو ان کے معاملات میں دخل نہ دینا چاہئے تھا، آگے میں داراشکوہ جن فریب کاریوں کے جال بچھا رہا تھا، راجہ ان سے بھی بے خبر نہ تھا، اس وقت یہی مناسب تھا کہ وہ عالمگیر کو نہ چھیڑتا اور نکل جانے دیتا، ان واقعات سے یہ نتیجہ نکالنا بعید از عقل نہیں ہے کہ اورنگ زیب کو راجہ جسونت سنگھ کی یہ بے ادبی سخت ناگوار ہوئی ہوگی، اور اقتدار وسطوت حاصل کرنے کے بعد اگر وہ اس سے انتقام لینے کی سعی کرتا تو قطعی حق بجانب ہوتا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اورنگ زیب کی یہ مہم جو مالوے کی لڑائی سے شروع ہوئی تھی بادشاہت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی، تو اس نے اپنے شکست خوردہ راجہ جسونت سنگھ کے ساتھ کیا کیا؟ اس کا جواب نہایت مختصر ہے، یعنی اورنگ زیب سریرآرائے سلطنت ہوا تو پہلے ہی سال راجہ جسونت سنگھ نے معافی اور قصور کی درخواست پیش کی، اور عالمگیر نے اپنی شاہانہ فیاضی سے اس کا قصور معاف کردیا، جشن وزن کے موقعہ پر منصب اور خلعت بھی عنایت کیا۔

راجہ جسونت سنگھ کی غداری

اجین کی جنگ کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ جسونت سنگھ نے عالمگیر کا مقابلہ کرکے اپنا وہ فرض ادا کیا تھا جو شاہی حکم کی رو سے اس پر عاید ہوتا تھا اسی لئے ہم بھی قضیۂ اجین کو نظر انداز کئے دیتے ہیں، اور راجہ کی غداریوں کا اس وقت سے شمار کرتے ہیں، جب شجاع کی لڑائی میں دفعتہ وہ اورنگ کے لشکر سے بھاگ کر سخت نقصان اور فتنہ کا باعث ہوا تھا، ہم اس واقعہ کو بھی تفصیل سے بیان کریں گے تاکہ وقت کی نزاکت اور عالمگیر کی مشکلات کا اچھی طرح اندازہ ہوجائے، اور بادشاہ کی رواداری وفیاضی کا اندازہ کرنے میں کوئی غلطی نہ ہو۔

اورنگ زیب نے اپنے بھائی شجاع کو صلح وآشتی کی دعوت دی لیکن اس نے دل سے اس کی پذیرائی نہ کی۔ آخرکار ۱۹ ربیع الثانی ۱۰۶۹ھ کو اورنگ زیب شجاع کے مقابلہ کو چلا، اور شجاع کے لشکر سے نصف کوس کے فاصلہ پر مقیم ہوا۔

دونوں لشکر آمنے سامنے پڑے تھے، گولہ اندازی اور ناوک فگنی ہورہی تھی، رات کے وقت شجاع نے اپنا توپ خانہ جو اورنگ زیب پر گولہ باری کرنے کی غرض سے میدان میں بھیجا گیا تھا واپس بلالیا۔ اور اپنی ساری فوج کو اکھٹا کرلیا، لشکر آراستہ ہوچکے تھے۔ مگر باقاعدہ جنگ کی نوبت نہ آئی تھی، سورج غروب ہوگیا تو عالمگیر نے حکم دیا کہ فوج کی ترتیب اور آراستگی میں فرق نہ آئے، سپاہی گھوڑوں سے اُتر آئیں۔ مگر اسلحہ نہ اتاریں اور مسلح ہوکر لشکر کی حفاظت کرتے رہیں۔ سرداران سپاہ فوج کے آگے مورچے بنا کر دشمن کی نقل وحرکت کو غور سے دیکھتے۔ یہ احکام دے کر بادشاہ ایک چھوٹے سے خیمہ میں جو لشکر گاہ میں نصب تھا چلا گیا۔ فوج رات بھر یوں ہی مستعد کھڑی رہی نہ ہتھیار الگ کئے گئے نہ گھوڑوں سے زین اتارے گئے،

رات کے آخری حصے میں دفعتہً لشکر میں ایک شور برپا ہوا اور زبردست ہیجان پھیل گیا۔ معلوم ہوا کہ جسونت سنگھ لشکر کو لوٹتا، کھسوٹتا، قتل و خونریزی کرتا ہوا شجاع کے پاس جارہا ہے، یہ بہت ہی خراب وقت تھا، لشکر میں سخت برہمی اور بے چینی پھیل گئی، اور جملہ انتظامات میں خلل پڑگیا، جسونت سنگھ نے شجاع سے سازش کرکے طے کرلیا تھا کہ میں رات کو شاہی فوج پر شب خون ماروں گا اور لوٹ مار کے بعد وہاں سے بھاگنے لگوں گا تو بادشاہ میرا تعاقب کرے گا۔ عین اُسی وقت شجاع کی فوج لشکرِ شاہی پر حملہ کردے۔

چار پانچ گھڑی رات باقی تھی کہ اس قرار داد کے موافق راجہ جسونت سنگھ نامور راجپوتوں اور رام سنگھ راٹھور، بھیش داس اور زبردست فوج کے ساتھ متحرک ہوا۔ بادشاہ، امراء، اور شاہزادوں کے جس قدر کارخانے اس کے راستہ میں پڑے سب کو اچھی طرح اس نے لُوٹا، جو اس کارروائی میں مانع آیا راجپوتوں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ شاہزادہ محمد سلطان کو راجہ کی اس قزاقی سے بہت زیادہ نقصان پہونچا۔ اس کا کوئی خیمہ راجپوتوں کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہا۔ بادشاہی خزانے اور کارخانے بھی لوٹ سے نہ بچے، اور دولت خانہ تک تمام خیموں پر راجپوتوں نے ہاتھ صاف کیا، دیر تک اس شور وغوغا کا سبب معلوم نہ ہوسکا۔ لشکر میں قیامت برپا تھی، اور عجیب قسم کا تفرقہ پڑگیا تھا، کوئی راجپوتوں کے ساتھ مل جاتا کوئی دشمن کے پاس چلا جاتا، اور وہاں مارا جاتا، امراء جو بادشاہ کے ساتھ تھے اپنے خیموں اور اہل وعیال کی دیکھ بھال کو دوڑے کسی نے جنگل کی طرف بھاگ کر وہاں پناہ لی۔ بزدل اور منافق تو الگ رہے۔ اچھے اچھے جاں نثاروں اور بہادروں کے قدم ڈگمگاگئے اور اتنی ہیبت طاری ہوگئی کہ ایک راجپوت بھی نیزہ لے کر آتا تو پوری جماعت کی جماعت بدحواس ہوکر کھڑی کی کھڑی رہ جاتی، راجپوت لدے ہوئے اونٹوں کو گھیر کر لے جانے لگے، تو کسی کو روکنے کی ہمت نہ ہوتی، غرض فوج میں ایسی ابتری پھیلی کہ سارا نظام درہم وبرہم ہوگیا، لیکن عالمگیر کی شجاعت اور دلیری دیکھئے کہ اس کی جبین استقلال پر بل بھی نہ آیا، جب اس کو اطلاع ہوئی کہ جسونت سنگھ بھاگ گیا تو اس نے ذرا بھی پریشانی اور اضطراب کا اظہار نہ کیا۔ بلکہ ہاتھی پر بھی سوار نہ ہوا، اور تختِ رواں پر بیٹھ کر ہراول مقرر کئے کہ فیل سواروں اور گھوڑا سواروں کو تاکید کردیں کہ اپنی جگہ سے نہ ہلیں، اگر کوئی بھی ہٹے تو نہایت ذلت سے کھینچتے ہوئے ہمارے پاس لائیں۔

بادشاہ اس خطرناک اور نازک وقت میں بھی نہایت مطمئن تھا۔ بلکہ خدا کا شکر کر رہا تھا کہ اس طرح منافق ومخلص میں تمیز ہوگئی، جو لوگ اپنی بے عقلی کے باعث راجہ کی اس حرکت کو دشمن کی فتح خیال کرکے اس سے جا ملے ہیں، وہ جلد اپنے کیفرِ کردار کو پہونچیں گے۔ باوجودیکہ آدھا لشکر فرار ہوکر غنیم سے جا ملا تھا، لیکن اورنگ زیب برابر اپنے کام اور لڑائی کے انتظام میں مشغول رہا، صبح کو معلوم ہوا کہ راجہ جسونت سنگھ آگرے چلا گیا۔ بادشاہ نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور ہاتھی پر سوار ہوکر لڑائی کا بندوبست کرتا رہا۔ جسونت سنگھ کی جگہ اسلام خاں برانغار کا سردار مقرر ہوا۔

ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ راجہ جسونت سنگھ جس پر اعتماد کرکے اورنگ زیب نے ایک بھاری فوج کا افسر بنادیا تھا، اس محسن کشی اور کفرانِ نعمت میں کہاں تک حق بجانب تھا، اور اس کی یہ غداری کس قدر خطرناک شرارت آمیز، اور بزدلانہ تھی، عالمگیر کی جگہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس کے گرفتار اور ہلاک ہونے میں کیا کمی رہ گئی تھی، لیکن یہ عالمگیر ہی تھا کہ نصف لشکر کے فرار ہوجانے اور حالات کا رخ پھر جانے پر بھی اس کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی اور پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہا۔ حتیٰ کہ فتح وکامرانی نے اس کے قدم چومے اور دشمن تباہ وبرباد ہوا۔

صاحب سیرالمتاخرین اس واقعہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

در اواخر ایں شب سانحۂ عظمیٰ شورش افزا بظہور پیوست و اختلالِ کلی در انتظامِ افواج روئے دادہ بیدلانِ قابو پیشہ را پائے قرار وثبات لغزیدہ راہ فرار کشادہ گشت وعنانِ استقلال و اصطبار از دست رفت، اما مخلصانِ غیرت مند شجاعت کیش وفا اندیش پائے ثبات و قرار افشردہ از جانہ رفتند و تزلزلے در اساسِ اخلاص شاں راہ نہ یافت، سنوحِ واقعہ آں کہ راجہ جسونت سنگھ ضلالت کیش بے عار وننگ باوجود تقصیراتش کہ عالمگیر نمودہ بعنایات وافرہ اورا اختصاص دادہ بود، در ظاہر سر بر خطِ بندگی نہادہ دوست خواہی می نمود بدیں جہت دریں یورش براو اعتماد فرمودہ ہمراہی و سرداری برانغار بخشیدہ بود چوں طینت فتنت سرشت و از حمیت مردانہ بے بہرگی داشت بعزمِ فتنہ پردازی از معرکۂ کارزار آخر ہمیں شب فرار نمودہ "

راجہ جسونت سنگھ کی اس حرکت کو کسی آئین اور اصول سے بھی معاف نہیں کیا جاسکتا، اور اب کسی دانشمند انسان کو اس کی حمایت وتائید کا حق باقی نہیں رہ جاتا، یہ وہ جرم ہے کہ موجودہ قانون میں بھی اس کی کم سے کم سزا قتل ہے، جن لوگوں نے "انتقام" میں تصور کا صرف ایک ہی رُخ دیکھا ہے جو تعصب اور جہالت کی تاریکی میں حقیقت وصداقت کی روشنی سے محروم ہو چکا ہے، وہ ان تصریحات کو آئندہ واقعات کے ساتھ ملا کر سوچیں اور انصاف کریں کہ اورنگ زیب نے راجہ جسونت سنگھ کے ساتھ کس قدر انسانیت، شرافت اور جوانمردی کا ثبوت دیا اور اس کے جواب میں خود راجہ نے جن "حرکات مذبوحی" کا مظاہرہ کیا، اس سے عالمگیر کی رواداری کا وزن بھی کرلیں تاکہ بدگمانیوں کی گنجائش باقی نہ رہے۔

راجہ جسونت سنگھ کی تادیب

راجہ جسونت سنگھ نے شجاع کی لڑائی میں جس ناعاقبت اندیشی اور بزدلانہ سازش کا ارتکاب کیا تھا، اس کا تدارک نہایت ضروری تھا۔ خصوصاً ایسے وقت میں کہ شجاع کی مہم پورے طور پر سر نہ ہوئی تھی، داراشکوہ گجرات پہونچ گیا تھا، اور وہاں فساد برپا کر رکھا تھا، کسی طرح بھی راجہ کو مزید بغاوتوں اور سازشوں کے لئے آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا تھا؛ چنانچہ محمد امین خاں کو دس ہزار سواروں کا سردار بنا کر سعد اللہ خاں کے ہمراہ جسونت سنگھ کی تادیب کے لئے روانہ کیا گیا۔

اُدھر رائے سنگھ راٹھور کو جو جسونت سنگھ کا بھتیجا تھا راجہ کا خطاب اور منصب عطا کرنے کے بعد اس مہم میں شریک کیا گیا۔

راجہ جسونت سنگھ کی سرگرمیاں

جسونت سنگھ آگرے کے قریب پہونچا تو اکثر کم ہمت لوگوں کے دل میں یہ خطرہ پیدا ہوا کہ وہ قلعہ کا محاصرہ کر کے شاہجہاں کو چھڑائے گا اور اُسے تخت نشین کرے گا۔

عاقل خاں لکھتا ہے کہ جسونت سنگھ آگرے کے قریب آیا تو شائستہ خاں حاکم آگرہ بہت پریشان ہوا۔ اس نے شاہجہاں کی دوبارہ تخت نشینی کے خطرے سے آدھی رات کو افضل خاں کے پاس پیام بھیجکر استدعا کی کہ شاہجہاں سے میرا قصور معاف کرادو۔ مگر افضل خاں نے اُس کو سمجھایا اور اس افواہ کی تصدیق تک خاموش رہنے کی ہدایت کی، چنانچہ یہ سب اندیشے غلط ثابت ہوئے اور راجہ آگرے سے گزرتا ہوا، اپنے وطن کو چلا گیا، وہ خود بدحواس تھا اور یقین رکھتا تھا کہ اس کے تعاقب کے لئے لشکر روانہ ہو چکا ہوگا، اس لئے اپنی عافیت اسی میں سمجھتا تھا کہ جلد مارواڑ کی حدود میں داخل ہو جائے۔ اور داراشکوہ کو بلا کر اس کے دامن میں پناہ لے۔

اُدھر داراشکوہ احمد آباد پہونچ چکا تھا اور جسونت سنگھ سے ملنے کی تدابیر کر رہا تھا، اسی اثنا میں اُسے اطلاع ہوئی کہ جسونت سنگھ لشکر شاہی سے بھاگ گیا۔ پھر جسونت سنگھ کا خط بھی پہونچ گیا جس میں اس نے داراشکوہ کو اجمیر آنے کی دعوت دی تھی، راجہ کا خط پہونچنے پر جمادی الاول ۱۰۶۹ھ میں داراشکوہ اپنی فوج اور توپ خانہ کو درست کر کے اجمیر کی جانب چلا، ہر منزل پر اُسے جسونت سنگھ کا خط ملتا تھا، وہ برابر داراشکوہ کی ہمت بڑھا رہا تھا۔ اور لکھ رہا تھا کہ میں اجمیر کے رہنے والے راجپوتوں اور راٹھوروں کو لے کر آتا ہوں آپ جلد آئیے، داراشکوہ پر ان خطوط کا بہت اثر ہو رہا تھا، اور وہ تیزی سے بڑھا چلا آ رہا تھا داراشکوہ جودھپور سے تین منزل کے فاصلہ پر رہ گیا تو تربیت خاں

فوجدار اجمیر کو بہت تردد ہوا اور وہ بھاگ کر اورنگ زیب کے پاس آگیا۔ اورنگ زیب خود ان امور سے آگاہ تھا، اور داراشکوہ کے مقابلہ کو اجمیر روانہ ہوچکا تھا۔

راجہ جے سنگھ کی سفارش

راجہ جے سنگھ جسونت سنگھ کا عزیز تھا، بادشاہ اس پر نہایت مہربان تھا، جے سنگھ نے بادشاہ سے جسونت سنگھ کی سفارش کی، اور اس کے قصور کی معافی مانگی۔ بادشاہ نے نہایت فراخدلی سے اس کی سفارش منظور کرلی، اور حکم دیا کہ جسونت سنگھ کو معافی جرائم کی خوش خبری سنادو۔ جے سنگھ نے جسونت سنگھ کو خط لکھ کر یہ مژدہ سنایا،

اس خط کے پہونچتے ہی جسونت سنگھ نے داراشکوہ کی امداد سے پہلوتہی شروع کردی، جس وقت خط ملا ہے وہ اجمیر کے ارادے سے جودھپور سے بیس کوس آگے نکل آیا تھا، لیکن پھر واپس ہوگیا۔

داراشکوہ نے راجہ کو اس کے وعدے یاد دلائے، لیکن وہ ٹال گیا، اس کا بیٹا سپہر شکوہ بھی بلانے آیا، مگر جسونت سنگھ نے اُسے بھی کسی نہ کسی طرح واپس کردیا۔

خطابخشی کا دوسرا فرمان اور صوبہ داری

عالمگیر کو داراشکوہ کے مقابلہ میں فتح ہوئی، جسونت سنگھ کا قصور پہلے ہی معاف ہوچکا تھا، مگر وہ شرم سے بادشاہ کو منہ دکھانا نہ چاہتا تھا، راجہ جے سنگھ کی سفارش سے بادشاہ نے دوبارہ اس کی تسلی کے لئے فرمان لکھا اور خطائیں معاف کیں، احمد آباد کی صوبہ داری مرحمت فرمائی، سات ہزاری منصب بحال ہوا، اور خلعت عنایت کیا گیا۔

اس موقعہ پر کوئی منصف مزاج انسان بھی اورنگ زیب کی شاہانہ نوازشوں کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ اعتراض کہ اورنگ زیب نے جسونت سنگھ سے دب کر یہ کام کیا تھا، نہایت لغو، بے بنیاد اور طفلانہ ہے، معرکۂ اجین کے بعد جس میں راجہ کی ذاتی شجاعت وطاقت کے علاوہ شاہی اقتدار بھی اس کی پشت پناہی کررہا تھا، اورنگ زیب کے ڈرنے اور دبنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اگر جے سنگھ بیچ میں نہ پڑتا اور راجہ جسونت سنگھ حسب وعدہ داراشکوہ کا ساتھ دیتا، اس وقت بھی وہ اجین کے میدان سے زیادہ بہادری نہ دکھا سکتا تھا، اور مالوے کی لڑائی کا جو انجام ہوچکا تھا وہ پہلے آپ پڑھ آئے ہیں، وہاں بھی داراشکوہ ہی کے اشارے سے جسونت سنگھ نے معرکۂ کارزار گرم کیا۔ اور اس وقت کا داراشکوہ اتنا کمزور، اور بیکس نہ تھا، وہ راجہ کی امداد کے بھروسہ پر احمدآباد سے اجمیر نہیں آرہا تھا، بلکہ چتر شاہی کے سایہ میں بیٹھا ہوا، دولت، سپاہ اور شاہانہ عنایات سے خود راجہ کی اعانت کررہا تھا، اور اسی امداد کا نتیجہ تھا کہ راجہ جسونت سنگھ نے اپنی فوجی طاقت کے بھروسہ پر اورنگ زیب کا راستہ روک لیا تھا، لیکن طوفان انسانوں کی صفوں سے نہیں رُکا کرتا، وہ زمین کے نشیب وفراز کو روندتا اور پہاڑوں سے ٹکراتا ہوا اپنی منزل مقصود پر ہی پہونچ کر دم لیا کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب کچھ تو راجہ جے سنگھ کی مروت کے باعث اور کچھ اپنی جوہرشناسی وقدر دانی کے باعث راجہ جسونت سنگھ کے جرائم پر پردہ ڈال رہا تھا، اور اُسے معاف کرکے ایک راجپوت جرنیل کی حیثیت سے کام لینا چاہتا تھا، اور یہ کوئی نئی یا عجیب بات نہیں اکثر اولوالعزم بادشاہوں نے اپنی حکومت کے باغیوں کو اسی طرح معاف کیا ہے۔ تیموری سلطنت ہی میں اس کی بیشمار مثالیں دستیاب ہوسکتی ہیں۔

دکن کی مہم میں جسونت سنگھ کی سستی

سنہ ۱۰۷۳ھ میں راجہ جسونت سنگھ کو حکم ہوا کہ دکن پہونچ کر سیواجی کے استیصال میں امیرالامراء کی شرکت اور ہمنوائی کرے۔

جسونت سنگھ احمدآباد سے چل کر دکن پہونچا۔ مگر اپنی فوج کو لئے ہوئے پونا کے اطراف میں بیکار پڑا رہا، آخر امیرالامراء کو گھر میں گھس کر مرہٹوں نے مجروح کیا اور راجہ جسونت سنگھ کو خبر نہ ہوئی، صبح کو جسونت سنگھ امیرالامراء کا حال پوچھنے گیا تو امیرالامراء نے کہا کہ میں تو سمجھتا تھا، آپ کام آگئے، جب ہی تو یہ نوبت پہونچی۔

اس واقعہ کے بعد امیرالامراء کو مرہٹوں کی مہم سے بدل دیا گیا اور شاہزادہ محمد معظم اس کی جگہ مقرر ہوا راجہ جسونت سنگھ پہلی کی طرح کمک پر متعین رہا۔۔۔

جسونت سنگھ نے سیواجی کے بعض علقوں کا محاصرہ کیا، لیکن کوئی اچھا قلعہ فتح نہ کرسکا۔ مدت تک اس سے سیواجی کی مہم میں کوئی نمایاں کام نہ ہوسکا۔ تو عالمگیر نے راجہ جے سنگھ کو چودہ ہزار فوج دے کر بھیجا، راجہ جے سنگھ اورنگ آباد میں شاہزادہ معظم سے ملاقات کرکے ۲۵ رشعبان ۱۰۷۵ھ کو پونا پہونچا، جہاں جسونت سنگھ مقیم تھا، اور اس کو شاہی فرمان کی بموجب دربار میں روانہ کردیا۔

کابل کی مہم پر جسونت سنگھ کی نامزدگی

۴ ربیع الاول ۱۰۷۶ھ کو راجہ جسونت سنگھ شاہزادہ محمد معظم کے ہمراہ کابل کی مہم پر نامزد ہوا۔ بیس ہزار سوار اس کے ساتھ کئے گئے۔ لیکن یہ مہم لاہور سے آگے نہ بڑھ سکی، اور شاہ عباس کی وفات کے باعث عالمگیر کے حکم سے واپس آگئی۔

جسونت سنگھ کی دوسری غداری

۷ رشوال ۱۰۷۷ھ کو راجہ جے سنگھ کی جگہ شاہزادہ محمد معظم دکن کی صوبہ داری پر روانہ کیا گیا، جسونت سنگھ امداد کے لئے شاہزادہ کے ہمراہ گیا۔ لیکن راجہ نے اس مرتبہ پھر عالمگیر کے ساتھ غداری کی۔ وہ مرہٹوں سے مل گیا اور شاہی مقبوضات پر انھیں دست درازی کرنے کے آزاد چھوڑ دیا، صرف یہی نہیں کہ وہ خود ہی مرہٹوں سے ملا بلکہ اس نے بوندی کے راجہ راؤ بھاؤ سنگھ ہاڈا کو بھی جو اس کا سالا تھا اور تین ہزاری منصب پر فائز تھا، اپنی سازش میں شریک کرنا چاہا، بھاؤ سنگھ نے اس نمک حرامی سے قطعی انکار کردیا، راجہ جسونت سنگھ نے اس کی بہن یعنی اپنی بیوی کو وطن سے بلا کر بیچ میں ڈالا، لیکن بھاؤ سنگھ پھر بھی متزلزل نہ ہوا۔ صاحب مآثر الامرا لکھتا ہے۔

چوں ہمشیرۂ راؤ بھاؤ بدست مہاراجہ بود، مہاراجہ زنِ خود را
از وطن طلب داشتہ واسطہ نمود کہ با وے سازِ موافقت کوک
نماید، اما راؤ بھاؤ حقِ نمک مقدم داشتہ تن بموافقتش در نداد۔

شاہزادہ معظم بھی اپنی سادہ لوحی سے راجہ کا شریک کار ہوگیا۔ چنانچہ سیواجی نے پندرہ ہزار فوج جمع کرکے سورت کی غارت گری کا ارادہ کیا تو شاہی فوج بھی یہ خبر سنکر پہونچ گئی۔ لیکن شاہزادہ اور جسونت سنگھ نے شاہی لشکر کو وہاں سے ہٹا دیا۔ سیواجی نے اطمینان سے تین دن تک سورت کو لوٹا، فرمانروائے کاشغر حج کی واپسی پر سورت میں مقیم تھا، اس کا اس قدر مال واسباب سیواجی کے ہاتھ آیا کہ وہ ہمیشہ اس پر فخر کرتا رہا۔

جسونت سنگھ کی یہ دوسری غداری تھی جس کو شاہی عنایات والطاف کے پیش نظر کسی طرح معاف نہیں کیا جا سکتا، راجہ پر اورنگ زیب نوازش کرنے میں دریغ نہیں کرتا، لیکن وہ ہر بار اس کے احسانات کے بوجھ کو اپنے سر سے اس طرح اتار کر پھینک دیتا ہے گویا اس کی نظر میں وہ نہایت بُری اور قابلِ نفرت چیز ہے، اورنگ زیب کی عالی ظرفی اور رواداری ملاحظہ ہو کہ اس نے اس لغزش کو بھی نظر انداز کردیا، اور ۱۰۸۱ھ میں مہابت خاں کو چالیس ہزار کی جمعیت دے کر دکن بھیجا۔ مہابت خاں نے دکن پہونچ کر شاہزادہ محمد معظم کی فوج کم کردی۔ صرف ایک ہزار آدمی اس کے پاس رہ گئے۔ جسونت سنگھ کو واپس بلا لیا گیا۔

کابل کی نائب صوبہ داری

کابل میں افغانوں نے بغاوت اور شورش برپا کی تو راجہ جسونت سنگھ کو کلی صوبہ دار بنا کر امیر خاں صوبہ دار کابل کی امداد کے لئے مقرر کیا گیا آغر خاں بھی اس کے ساتھ تعینات ہوا۔

جسونت سنگھ کابل ہی میں اپنی اس خدمت کے دوران میں ۲۲ جلوس عالمگیری یعنی ۱۰۹۰ھ میں فوت ہوگیا۔

راجہ جسونت سنگھ کے بیٹے

جسونت سنگھ کے مرتے ہی اس کے بھائی بند راجپوت رانی اور دو کم عمر بیٹوں کو بغیر حکم شاہی وہاں سے لے کر چل دئے۔

مآثرِ عالمگیری کا مصنف لکھتا ہے کہ جسونت سنگھ کے مرنے تک اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ البتہ دو رانیاں حاملہ تھیں۔ لاہور پہونچ کر اس کے کارپردازوں نے اطلاع دی کہ دونوں رانیوں کے بطن سے دو بیٹے پیدا ہوئے ہیں، ان کو منصب، خطاب اور راج عطا کیا جائے۔ عالمگیر نے مغلیہ آئین کے موافق حکم دیا کہ دونوں بیٹوں کو دربار میں بھیجدیا جائے۔ جب وہ ہوشیار ہوں گے تو خطاب اور منصب دیا جائے گا۔ مصنف مذکور لکھتا ہے

حکمِ اقدس واعلیٰ صادر شد کہ ہر دو پسر را بدرگاہ سپہر
بارگاہ بیارند و ہرگاہ پسران بسنِ تمیز خواہند رسید

بہ عنایتِ منصب و راج نوازش خواہند یافت۔

اس حکم میں کوئی فریب، دھوکہ یا مغالطہ نہیں ہے۔ تیموری خاندان کا اصول ہی یہ تھا کہ جب کوئی عہدیدار مر جاتا تھا اور اس کی اولاد کم سن ہوتی تھی تو بادشاہ اپنی نگرانی میں ان کی تعلیم، تربیت اور پرورش کا انتظام کرتا تھا۔ شہزادوں کی طرح ان کی عزت کی جاتی تھی، جب وہ سنِ تمیز کو پہونچ جاتے تھے تو اُن کی استعداد کے موافق منصب اور عہدے مل جایا کرتے تھے، حکومتِ مغلیہ میں شروع سے آخر تک اس قسم کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں، مگر جسونت سنگھ کے ساتھیوں نے حکم کا انتظار بھی نہ کیا، اور بغیر پروانہ راہداری حاصل کئے کابل سے چل دیئے۔ دریائے اٹک پر امیر بحر نے پروانہ راہداری نہ ہونے کی وجہ سے روکا تو اس سے لڑے، اور زبردستی دریا کو عبور کر لیا۔ وطن جانے کے لئے اُنھیں لازمی طور پر دہلی سے گزرنا تھا، چنانچہ دہلی آئے تو عالمگیر نے ان کی شوریدہ سری کے پیش نظر ان کی قیام گاہ پر پہرہ لگا دیا۔ کچھ دنوں کے بعد درگا داس اور چند سرداروں نے وطن جانے کی اجازت مانگی، بادشاہ نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ اُنھوں نے یہ فریب کیا کہ راجہ جسونت سنگھ کے لڑکوں کو غلاموں کے لڑکوں کا لباس پہنایا اور غلام زادوں کو راجہ کے بیٹوں کے کپڑے پہنائے، رانی کو بھی مردانہ لباس میں ملبوس کیا، اور اس کی جگہ لونڈی کو زیور وغیرہ سے آراستہ کر کے چھوڑ دیا، اس طرح جسونت سنگھ کی رانی اور بیٹوں کو لے کر چلے۔ خیمہ میں بہادر راجپوتوں کو بٹھا کر ہدایت کر دی کہ جانے کے بعد راز کھل جائے، تو جعلی لڑکوں اور رانیوں کی حفاظت میں تم اتنی سعی کرنا کہ پانچ چھ گھنٹے تک کسی کو ہماری تلاش کا خیال پیدا نہ ہو، دو تین پہر کے بعد بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو اس نے کوتوال سے پوچھا، کوتوال نے جواب دیا یہ خبر غلط ہے، بچے اور رانیاں خیمہ میں موجود ہیں۔ بادشاہ نے راجپوتوں کے تعاقب میں آدمی بھیجے، اور خیمہ والے بچوں اور رانیوں کو قلعہ میں طلب کیا، راجپوتوں نے کہا ہم رانیوں اور لڑکوں کو نہیں دیں گے چاہے ہماری جان جاتی رہے۔ عالمگیر نے اس گستاخی اور نافرمانی کی سزا دینے کو فوج بھیجی، راجپوتوں نے مقابلہ کیا۔ لیکن شاہی آدمیوں کے سامنے نہ ٹھہر سکے، اور بھاگ گئے اس میں اتنی دیر لگ گئی کہ رانی اور بچے آسانی سے نکل گئے اور بخیر زندہ و سلامت جودھپور پہونچ گئے۔

مہارانا اودے پور نے ان کی طرف داری کی، عالمگیر نے اس کے نام فرمان بھیجا کہ باغیوں کی حمایت نہ کی جائے اور جسونت سنگھ کے بچوں کو ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔ لیکن رانا پر اس فرمان کا اثر نہ ہوا، مجبوراً فوج کشی کی گئی اور رانا کو مطیع کر کے اس سے عہد لیا گیا کہ جسونت سنگھ کے بچوں کی مدد نہ کرے گا۔ مگر وہ اس عہد سے پھر گیا۔

رانا اودے پور کی عہد شکنی کے بعد بادشاہ خود رجب سنہ ۱۰۹۰ھ میں رانا کی گوشمالی کے لئے اجمیر روانہ ہوا۔ اور شاہزادہ محمد اعظم کو دکن سے معظم کو بنگالہ سے بلانے کے احکام نافذ کئے۔

اجمیر پہونچ کر بادشاہ نے شاہزادہ محمد اکبر کو رانا کی مہم پر بھیجا، وہ جسونت سنگھ کے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں میں جا چھپا، عالمگیر نے اپنے تینوں بیٹوں کو رانا اور دوسرے راجپوتوں کی تادیب کے لئے مقرر کر کے سب کے فرائض تقسیم کر دئے، رانا کی اعانت کے لئے پچیس ہزار راجپوت جودھپور کے جمع ہو گئے۔ اور شاہی لشکر پر حملے کرنے لگے۔ رسد بھی ان کی دستبرد سے تباہ ہو جاتی تھی، لیکن جلد شاہی فوج نے ان کو مغلوب کر لیا۔

رانا لشکرِ شاہی سے ٹکرانے کی تاب نہ رکھتا، اس نے تنگ آکر شاہزادہ محمد معظم سے درخواست کی کہ بادشاہ سے معافی دلا دے۔ شاہزادے کی والدہ نواب بائی نے اُسے ہدایت کر دی کہ راجپوتوں کی ان باتوں پر ہرگز متوجہ نہ ہو، بلکہ رانا کے وکلا کو اپنے پاس بھی نہ آنے دے۔ یہاں سے مایوس ہو کر رانا نے شاہزادہ اکبر کو پھانسنے کی تدبیریں کیں، درگا داس بہت چالاک اور چرب زبان تھا۔ اُس نے اکبر کو یہ فریب دیا کہ چالیس ہزار راجپوت آپ کی اطاعت کے لئے اور بیشمار خزانے خرچ کے لئے موجود ہیں۔ آپ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیجیے۔ اکبر نوجوان اور ناتجربہ کار شہزادہ تھا، راجپوتوں کی باتوں میں آکر باپ سے باغی ہو گیا۔ محمد معظم نے باپ کو اطلاع کی کہ اکبر سے بغاوت کا اندیشہ ہے۔ لیکن اورنگ زیب کو یقین نہ ہوا۔ سمجھا کہ شاہزادے نے اکبر پر بہتان باندھا ہے۔ لیکن درگا داس تیس ہزار راجپوت سواروں کی جمعیت لے کر اکبر سے جا ملا۔ اکبر نے اورنگ شاہی پر بیٹھ کر سکہ جاری کر دیا، اور اپنی فوج کے امرا کو منصب و خطابات عطا کئے، ان کاموں سے فارغ ہو کر باپ سے لڑنے کو چلا۔

بادشاہ کی ساری فوج راجپوتوں کے مقابلہ میں اکبر کے ساتھ تھی بادشاہ

کے پاس دو تین امیروں کے سوا کوئی نامور امیر موجود نہ تھا اور پوری فوج جس میں خواجہ سرا اور اہلِ دفتر بھی شامل ہیں سات آٹھ سو سواروں پر مشتمل تھی اورنگ زیب نے شاہزادہ محمد معظم کو حکم بھیجا کہ جلد آکر ہم سے ملو، وہ حکم پاتے ہی نو دس ہزار کی جمعیت لے کر بادشاہ سے آملا۔

شاہزادہ اکبر کی رکاب میں ستر ہزار سوار تھے۔ بادشاہ اور محمد معظم کی فوج کسی طرح ان کا مقابلہ نہ کرسکتی تھی۔ بادشاہ کے لئے یہ وقت بہت ہی سخت تھا۔ لیکن اس نے حسبِ معمول اپنی دانشمندی اور انجام بینی کے اوصاف حمیدہ کو ہاتھ سے نہ دیا۔ اس نے اپنی حسنِ تدبیر سے اکبر کے فریب کو اس پر اُلٹ دیا، متعدد امراء کو اس سے جدا کر لیا۔ جن کے ٹوٹ جانے سے اکبر کا زور کم ہوگیا۔

اکبر کی فوج کا ہراول تہور خاں چند آدمیوں کو ہمراہ لے کر کسی خراب ارادے سے بادشاہ کے پاس آیا۔ اُس کو ہتھیار اُتارنے کا حکم دیا گیا، تہور خاں نے تعمیلِ حکم میں تامل کیا۔ بادشاہ نے جوش میں آکر تلوار نکال لی، اور غصہ سے کہا کیوں ہتھیار اُتارنے کو کہتے ہو آنے دو! تہور خاں اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اور خیمہ کے قریب قتل ہوگیا۔ اکبر پر اُس کے مرجانے کا بہت اثر ہوا، اس کی فوج نے بھی اس نقصان کو محسوس کیا، چند راجہ اور امراء بادشاہ کے پاس آگئے، کچھ فرار ہوگئے راجپوتوں نے دیکھا معاملہ بگڑ گیا اور ساری ذمہ داری ہم پر آپڑی تو ان میں بھی بھاگڑ پڑ گئی۔ محمد اکبر نے راجپوتوں کو بھاگتے دیکھا تو خود بھی فرار ہوگیا۔

اس کے بعد اورنگ زیب نے جودھپور اور اودے پور کے سرکشوں کی اچھی طرح تادیب کی۔ مگر راجپوتوں کی بغاوتوں اور لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ لیکن رانا اودے پور نے اپنے نقصانات سے متاثر ہوکر صلح کی التجا کی۔ بادشاہ نے رانا سے اس کے ملک کا کچھ حصہ لے کر لی، اور یہ طے کردیا کہ اجیت سنگھ پسر جسونت سنگھ کو بالغ ہونے پر راج گدی دی جائے۔

یہ ہے تفصیل اُن بے سروپا افسانوں اور کہانیوں کی، جن کا سلسلۂ دراز کسی طرح ختم نہیں ہوتا۔ اور اب بھی ان کی گونج فضا میں موجود ہے، ان تفصیلات کے بعد ہر شخص فیصلہ کرسکتا ہے کہ جسونت سنگھ کے معاملہ میں بادشاہ کی طرف سے زیادتی ہوئی یا خود جسونت سنگھ نے احساناتِ شاہی کے بوجھ کو اپنے سر سے اُتار کر بار بار اس سے غداری اور سرکشی کی، آخر میں اس کے ہمراہی راجپوتوں نے اپنے سردار جسونت سنگھ کی قدیم تربیت کے اثر سے خیرہ سری کا ثبوت دیا، اور کابل سے ہندوستان پہونچنے تک چند مرتبہ قوانین وضوابط کی خلاف ورزی کی۔ اگر وہ مہاراجہ جسونت سنگھ کے بیٹوں کو بادشاہ کے حوالے کردیتے تو ہرگز اس جنگ و جدل کی نوبت نہ آتی۔ بلکہ سن تمیز کو پہونچکر وہ حسب وعدہ شاہی راج اور منصب سے سرفراز ہوتے، مگر راجپوتوں نے ایک سیدھی اور سچی بات کو اپنی فساد آمادگی سے افسانہ بنا دیا۔ اور رائی کو پربت بنانے کی ضرب المثل کو صحیح ثابت کر دکھایا۔

میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تمام افسانہ طرازیاں حقیقت کی روشنی میں آکر اپنے اصل لباس میں سامنے آگئی ہیں۔ تاہم بعض باتیں ابھی تشنۂ بحث ہیں

افسانہ نگار کا یہ دعویٰ کہ ـــــ اورنگ زیب نے جب اس دیرگشتری کو بزورِ تلوار زیر کرنے میں پے درپے ناکامی و زک اُٹھائی تو آخر مجبور ہوکر دوسرا راستہ اختیار کیا، اور جسونت سنگھ کو شاہی اعزاز عطا کرکے اپنی طرف سے کابل کی بغاوت فرو کرنے کے لئے بھیجدیا۔" تاریخی واقعات کی روشنی میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ جسونت سنگھ کی اورنگ زیب کے مقابلہ میں کیا حقیقت تھی، جب وہ داراشکوہ کو جسے شہنشاہ وقت شاہجہاں کی پوری تائید وحمایت حاصل تھی، شکست دے چکا تھا۔ شجاع کو میدان سے بھگا چکا تھا، خود راجہ جسونت سنگھ بھی اُجین کے مقام پر اس سے شکست کھاکر بھاگ گیا تھا، کیا اجین کی ہزیمت کے بعد راجہ جسونت سنگھ نے کوئی "کایا پلٹ" استعمال کرلی تھی کہ اورنگ زیب اس سے ڈرنے لگا تھا، اور راجہ کے حوصلے بڑھ گئے تھے، اس میں شک نہیں کہ جسونت سنگھ دلیر اور شجاع تھا، مگر اس کی تمام سازشیں بزدلی، مکاری اور کمزوری کا اعلان کررہی ہیں، کسی موقعہ پر بھی اس نے اپنی قومی شجاعت کا ثبوت نہیں دیا، جو حقیقتاً راجپوتوں کا فطری حق ہے، تاریخ کی سچی شہادتوں کو جھٹلانا ممکن نہیں، اور مہاراجہ جسونت سنگھ کا باربار معافی مانگ کر آمادۂ اطاعت ہونا کسی طرح بھی اس امر کی دلیل نہیں کہ اورنگ زیب تلوار کے زور سے اس کو زیر نہ کرسکا۔ جسونت سنگھ بغاوت اور سرکشی کرتا تھا۔ مگر جس طاقت کے بھروسہ پر وہ یہ عمل کرتا تھا، جب وہ قوت بادشاہ کے اقبال سے ٹوٹ جاتی تھی تو راجہ فوراً اپنی "جائے پناہ" کی تباہی سے متاثر ہوکر معافی کی درخواست پیش کردیتا تھا، یقیناً یہ اس کی ایک "اچھی حکمت عملی" تھی۔ لیکن بہادری نہ تھی۔

ڈاکٹر صاحب ایک اور کند نشتر نکالتے ہیں، کہ

"اس سے اس کا اصل منشا، کابل کی بغاوت فرو کرنے کے بجائے
جسونت سنگھ کا کانٹا پہلو سے نکال پھینکنا تھا۔"

ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اورنگ زیب نے اپنے بیٹے کو بھی کابل بھیجا تھا۔ کیا وہ بھی اس کے بیٹے کا کانٹا ہی تھا؟

حقیقت میں جسونت سنگھ کا افغانستان بھیجا جانا اس لئے نہ تھا کہ وہ اورنگ زیب کے پہلو کا کانٹا تھا، کیونکہ عالمگیر کانٹے نکالنے کے اور طریقوں سے بھی واقف تھا۔ بلکہ بات یہ تھی کہ جسونت سنگھ جس مہم پر بھیجا جاتا تھا اُس میں خرابیاں پیدا کرتا تھا، اور دشمنوں سے ساز کر لینے کا عادی تھا اس لئے اس کو کابل بھیجا گیا۔ تاکہ وہ اپنی راجپوتی شجاعت سے کام لے اور سازش و دغا کے لئے کوئی میدان اس کے سامنے نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ افغانستان کے جاہل اور جنگجو پٹھانوں سے زبان، تمدن کی مغائرت کے باعث وہ کوئی سازش نہ کر سکتا تھا، اور اس سے کام لینے کی اس کے علاوہ کوئی صورت ہی نہ تھی، کہ اُسے ایسے ملک میں رکھا جائے جس میں اُس کی خطرناک ریشہ دوانیوں کا سلسلہ منقطع ہو جائے۔ ایسا ملک افغانستان سے بہتر کوئی اور نہ ہو سکتا تھا جہاں حُسنِ اتفاق سے اس وقت بغاوت بھی ہو گئی تھی، عالمگیر ہی پر کیا موقوف ہے، اس سے پہلے شہنشاہ اکبر نے بھی اپنے عزیز اور محبوب راجپوت جرنیل راجہ مان سنگھ کو کابل بھیجا تھا، کیا اس کے متعلق بھی کہا جائے گا کہ مان سنگھ اس کے پہلو کا کانٹا تھا، اگر نہیں تو یہ ترجیح بلا مرجح کیسی؟ صرف کابل بھیجد ینا ہی مخالفت اور بد نیتی ہے تو اکبر کو اس الزام سے کیوں بری رکھا جاتا ہے؟

شاہی اعزاز کا عطا کرنا محض اورنگ زیب کی فیاضی اور مردم شناسی سے متعلق ہے، ورنہ جسونت سنگھ اپنے اعمال کی بنا پر اس کا مستحق نہ تھا، ہر عقلمند بادشاہ ایسے آدمیوں کو دوست رکھتا ہے جو بہادر اور جنگجو ہوں اورنگ زیب میں یہ وصف خاص طور پر نمایاں تھا، وہ شجاعت و مردانگی کا دلدادہ تھا، اور ایسے آدمی کی ہمیشہ عزت کرتا تھا، ابوالحسن تاناشاہ کا جاں نثار جرنیل عبد الرزاق لاری حالانکہ قلعہ گولکنڈہ کے محاصرے میں اورنگزیب کے خلاف سخت جانفشانی کر چکا تھا، اور قلعہ فتح ہونے پر بھی اس نے اس وقت تک عساکرِ مغلیہ کا مقابلہ کیا تھا، جب تک مجروح ہو کر معذور نہ ہو گیا، لیکن وہ اسیر ہو کر آیا تو بادشاہ نے ہندوستانی اور فرنگی جراحوں سے نہایت اہتمام کے ساتھ اس کا علاج کرایا اور اس کی بہادری کی تعریف کرتے ہوئے اپنی ملازمت میں آنے کی ترغیب دی۔ اس نے انکار کیا۔ ادھر سے شاہانہ فیاضی اور قدر شناسی میں مبالغہ کیا گیا۔ آخر لاری نے اورنگ زیب کی ملازمت پر آمادگی ظاہر کر دی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ابوالحسن کے شکست اور گرفتاری کے بعد عالمگیر لاری سے ڈر رہا تھا جو زخموں کی کثرت سے بیدم ہو کر اس کی قید میں تھا، اگر واقعی ڈر رہا تھا اور اسی بنا پر شاہی اعزاز عطا کرنے پر مصر تھا تو سمجھنا چاہیئے کہ اورنگ زیب بادشاہ نہ تھا بلکہ ایک ایسا بچہ تھا جو خواب میں بھی خیالی "ہوّے" کے تصور سے چونک جاتا ہے۔

داراشکوہ کی لڑائی میں راجہ روپ سنگھ راٹھور دشمن کی فوج میں شامل تھا اور نہایت بے جگری سے لڑ رہا تھا، ایک مرتبہ جوش میں آ کر وہ اپنے گروہ سے نکل کر اورنگ زیب کے قلب لشکر پر حملہ آور ہوا، جہاں خود اورنگ زیب موجود تھا، راجہ تلواریں مارتا ہوا بادشاہ کے ہاتھی تک پہونچ گیا، ہاتھی کے قریب پہونچ کر وہ پیدل ہو گیا، اور نہایت مردانگی و جلادت کا اظہار کیا، حتیٰ کہ فیل خاصہ کی عماری کے بند کاٹ ڈالے۔ اورنگ زیب راجہ کی بہادری، بیدلی اور بے باکی کے حیرت انگیز تماشے دیکھ رہا تھا اور برابر غل مچا رہا تھا، "خبردار راجہ کو چشم زخم نہ پہونچے، زندہ گرفتار کیا جائے۔ ایسے شجاعت پیشہ انسان کو ہمارے مخلصوں میں شامل ہونا چاہیئے"۔ اورنگ زیب کو راجہ کی یہ ادا اس قدر پسند آئی تھی کہ ایسے خطرناک وقت میں بھی جب ذرا سی غفلت میں اس کو نقصان پہونچ سکتا تھا، وہ راجہ کو یعنی ایک بپھرے ہوئے شیر کو زندہ گرفتار کرنے کی ہدایات کر رہا تھا۔ مگر موقعہ بہت ہی نازک تھا، راجہ زندہ ہاتھ آنے والا نہ تھا، اِدھر سے ہجوم ہوا اس نے مردانہ مقابلہ کیا، آخر اسی ردّ و بدل میں کام آ گیا۔

ہر چند جسونت سنگھ نے اب تک اپنی بہادری اور شجاعت کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا تھا، تاہم وہ راجپوت تھا اور مردانگی اس کی سرشت اور خمیر میں داخل تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنے اس "جوہر" سے بادشاہ کی خدمت نہ کر سکا تھا۔ مگر اُمید تھی، راہِ راست پر آ گیا تو کام کا آدمی ثابت ہوگا، بس یہی خیال اور یہی جذبہ تھا جس نے عالمگیر کو آخر وقت تک اس پر مہربان رکھا، اور سخت سے سخت لغزشوں کے ظاہر ہونے پر بھی اس نے کوئی دوسری کارروائی نہیں کی۔

رہا صاحبِ افسانہ کا یہ ادعا کہ ــــــــــــ "کابل کے ناقابلِ تسخیر قلعہ پر راجپوتوں کا کیسری جھنڈا لہرانے لگا، فتح و نصرت نے میواڑ کے سگھوں کے کابل کی سربلند اور سرکش پہاڑیوں پر پاؤں چوم لئے۔ شکست خوردہ باغیوں نے بھارت کے مایۂ ناز سپوت دیر کے مجسم اوتار، راجپوتی روایات کے بہترین محافظ جسونت سنگھ کے روبرو ہتھیار ڈال دئے ــــــــــــ"

اس کے متعلق صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ جسونت سنگھ کابل کے صوبہ دار کا معاون اور مددگار تھا اور آغر خاں کے ساتھ مددگاری کے لئے متعین ہوا تھا، افغان کی مہم آغر خاں کی مردانہ یورشوں سے طے ہوئی، آغر خاں کی شجاعت اور شمشیر زنی کا افغانیوں کے دلوں پر ایسا سکہ بیٹھا تھا کہ افغانوں کے بچے روتے تو انھیں آغر خاں کے نام سے ڈرایا جاتا تھا، اس میں شک نہیں کہ راجپوت اور مغلوں کا لشکر بھی اس کے ہمراہ تھا، لیکن افغانستان میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ سب آغر خاں کی جوانمردی اور اس کے حقیقی بھائی سنگری وردی خاں کے دم سے ہو رہا تھا، آغر خاں نے کابل سے مقتولوں کے سترہ سو سر اور بےشمار قیدی بادشاہ کے پاس بھیجے۔ بادشاہ نے اس کارگزاری کے صلے میں اس کو چار ہزاری منصب عطا کیا۔

افسانہ نگار نے اورنگ زیب کے لئے جو دل آزار اور خلافِ حقیقت الفاظ استعمال کئے ہیں، ان کے لئے میں انھیں قابلِ معافی سمجھتا ہوں، ذہنیت مسموم اور دماغ ماؤف ہو جاتا ہے تو زبان اور قلم پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے، البتہ ان کی تاریخی غلط بیانیوں کا پول کھولنا ضروری تھا، اور میں نے اپنی دانست میں شرارت انگیز، اور حقارت آمیز الفاظ سے بچتے ہوئے اپنا یہ فرض انجام دید یا یمکن ہے بعض الفاظ مثلاً غداری، سازش، بغاوت وغیرہ سے کوئی صاحب تکلیف محسوس کریں۔ لیکن اول تو معنی اور مفہوم کے لحاظ سے کسی موقعہ پر بھی ان کا غلط استعمال نہیں کیا گیا اور جہاں ان کو لکھا گیا ہے محض اس مجبوری سے کہ اپنے مفہوم کو ظاہر کرنے کی غرض سے ان الفاظ سے اجتناب ممکن نہ تھا، بادشاہ سے روگردانی کرنے والے اور محسن کشی کے عادی شخص کا تذکرہ کرتے وقت کوئی مضمون نگار کتنا ہی گریز کرے لیکن ان الفاظ سے نہیں بچ سکتا۔ حالانکہ افسانہ نگار نے ایک غلط داستان، اور دل آزار افسانہ لکھتے وقت بہت زیادہ سخت اندازِ گفتگو اختیار کیا ہے، اور اس بنا پر وہ بیک وقت دو بداخلاقیوں کا مرتکب ہو گیا ہے۔ ایک غلط اور بدگمانی پھیلانے والے جھوٹے واقعات کا بیان، دوسرے ناروا، اور سخت الفاظ کا استعمال، قومی عدالت میں افسانہ نگار کے یہ دونوں جرائم حقیقتاً سخت سزا کے مستحق ہیں، میں اگر اس کا جواب دیتا تو یہ مضمون تاریخی حقائق کا مرقع نہ ہوتا، بلکہ تلخ کامیوں کا مجموعہ ہو جاتا جو مجھے گوارا نہ تھا، کیونکہ میں نے صحیح تاریخ بیان کرنے کی غرض سے قلم اٹھایا تھا، دشنام طرازی اور سب و شتم کی گندگی اچھالنا میرا مدعا نہ تھا، میں ہندو مسلم اتحاد کی دل سے قدر کرتا ہوں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میرے پیدا کئے ہوئے لٹریچر میں ایک حرف بھی اس دعوے کے خلاف مل سکتا ہے، میرا اعتقاد ہے کہ ہندوستان کی نجات ہندو مسلم اتحاد میں مضمر ہے حقیقتاً یہی جذبہ ہے جس نے مجھے اس مضمون کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ تاکہ اصل حقیقت کا انکشاف ہو جائے۔ اور تاریخ کی وہ غیر مستند مگر دل فریب روایات جو کسی خاص "حکمتِ عملی" کے پیشِ نظر وضع کی گئی ہیں، قابلِ التفات نہ رہیں، اور آئندہ یہ سنگریزے اتحاد و محبت کے سمندر میں "نفاق و شقاق" کی لہریں پیدا نہ کر سکیں۔

مقالاتِ زرّیں

وہ پھول صرف قبروں ہی پر چڑھانے کے واسطے ہیں جو تاریخی عمارتوں کے کھنڈروں میں پیدا ہوتے ہیں۔

بیتاب ہو جا، تڑپ جا، یہ نہ پوچھ کون روتا ہے؟ یہ دیکھ کوئی "انسان" روتا ہے۔

زندگی آہستہ آہستہ دبے پاؤں گزر رہی ہے اور ہم شور انگیز ولولوں اور طویل اُمیدوں کے شکار ہیں۔

نیک آدمیوں کے مرتے ہی بُرائیاں زور پکڑ جاتی ہیں، آفتاب ڈوبنے لگتا ہے تو سایہ دراز ہو جاتا ہے۔

علوم کے سمندروں سے ہم گزرتے ہیں، اور روز بروز جہالت کے تازہ جزیرے دریافت کرتے جا رہے ہیں۔

ہر شخص کی طرف سے نیک گمان رکھنا ایک اعلیٰ مگر بہت جلد تباہ کر دینے والی صفت ہے۔

(مقالاتِ زرّیں از جوش)

پاسبانِ شبابِ طفلی

کل شہر سے باہر پئے گلگشت گئے ہم — اک حُسن کا گلزار بھی تھا ساتھ ہمارے
کچھ پھُول تھے کچھ غنچے تھے، نورستہ و رنگیں — کچھ برگ و گیا ساتھ میں پھُولوں کے سہارے
بے قید مناظر وہ فراغت کی ہوائیں — بیروں کے وہ باغیچے، وہ کھیتوں کے نظارے
گیہوں کے ہرے کھیتوں میں پھولی ہوئی سرسوں — اس طرح نہ چھٹکے کبھی افلاک پہ تارے
گو، پردے کی پابند نہ تھیں پھر بھی وہ حوریں — کچھ دیر ذرا دور رہیں شرم کے مارے
دوڑی کوئی پھسلی کوئی جھجکی کوئی سنبھلی — دل تنگ و شکستہ سے وہ کھیتوں کے کنارے
مرغانِ حرم، نیند سے جاگے ہوئے فتنے — جس طرح ہرن دشت میں بھرتے ہوں طرارے
بکھرے ہوئے گیسو، وہ لچکتی ہوئی کمریں — اُڑتے ہوئے ڈھلتے ہوئے ساری کے کنارے
پیڑوں میں چھُپیں اور کبھی میدان میں آئیں — نکلا کئے ڈوبا کئے وہ چاند ستارے

جو کافر و خونریز تھی اس جمعِ حسیں میں — صد شکر وہی سمجھی مرے دل کے اشارے

آزاد و گرفتار و حیا پیشہ و بیباک　　آنکھوں میں حیا دل میں محبت کے شرارے

وہ نازک و نرم آنکھ وہ نشتر سی نگاہیں　　وہ پھول سے رخسار دمکتے ہوئے تارے

کچھ دیکھ کے شرمائی کبھی شرما کے کبھی دیکھا　　بنتے رہے مٹتے رہے الفت کے نظارے

ملتی رہیں نظریں کبھی ترچھی کبھی سیدھی　　چلتے رہے دل پر کبھی نشتر کبھی آرے

آنکھوں میں وہ طوفاں کبھی رندی کبھی تقوئی　　بکھرائے کبھی اور کبھی بال سنوارے

وہ ہاتھ اُٹھائے ہوئے انگڑائی کا عالم　　طوفان کی وہ موج جو پہونچی نہ کنارے

اک چھوٹی بہن ساتھ میں "وہ حسن کا دربان"　　ہشیاری سے جس شوخ کی دربان بھی ہارے

حائل کہیں پردے کی طرح اور کہیں حیراں　　منظر کئے دیتے تھے اُسے میرے نظارے

تنبیہ کی جرأت بھی نگاہوں میں جھجک بھی　　غصہ بھی وہ معصوم وہ انداز پیارے

آخر کو وہ گھر لے ہی گئی ساتھ بہن کو　　جیتی وہی اس بازی کو ہم جیت کے ہارے

آنے دے جوانی کو کوئی دن اور ٹھہر جا　　الفت ہی پہ تو اپنا دل و جان نہ وارے

کیا کام فقیروں سے تمہیں جاؤ سدھارو　　ہو جائیں گے اپنے بھی کسی طرح گزارے

اپنے ہی سے اب خلوتِ دل کیجئے روشن

یہ جلوے یہ عالم تو ہیں مغرب کے ستارے

میکش اکبر آبادی

گُنبَد یا گُنبُد؟

ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی (لندن)
پروفیسر ڈھاکا یونیورسٹی

چند روز ہوئے، میں ایم اے کلاس کے طلبہ کو شاہنامہ پڑھا رہا تھا۔ افراسیاب و سیاوش کی داستان میں جب اس شعر پر پہنچا کہ:۔

بہر گوشۂ گنبذی ساختہ
سرش را با بر اندر افراختہ

تو ایک متعلم، جو مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے فارغ التحصیل مولوی ہیں، کسی قدر استعجاب سے میری طرف دیکھنے لگے اور خواہشمند ہوئے کہ میں اس شعر کو مکرر پڑھ دوں۔ میں نے پڑھا۔ اُن کے چہرہ سے عدم اطمینان کے آثار ظاہر تھے۔ میں نے سمجھ لیا کہ اس شعر کے پڑھنے میں اُن کے خیال کے مطابق ضرور مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے، وہ اپنا خیال ظاہر کرنا چاہتے تھے، مگر میرے احترام کا لحاظ مانع تھا، آخر میں نے باصرار پوچھا تو اُنھوں نے بتایا کہ "آپ نے گُنبَد پڑھا حالانکہ یہ لفظ گُنبُد ہے"۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ کو کیونکر تحقیق ہوا۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ مولانا نیاز فتحپوری نے نگار کے ایک مضمون میں اس لفظ کے اعراب بیان کئے ہیں اور گُنبَد کو (بفتحِ با) غلط اور گُنبُد کو (بضمِ با) صحیح قرار دیا ہے۔

گُنبَد کے یہ نئے اعراب سنکر مجھے اس سے زیادہ تعجب ہوا جتنا اُنھیں میری زبان سے گُنبَد سنکر ہوا تھا۔ مجھے کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ نیاز صاحب نے گُنبُد لکھا ہوگا اور گُنبَد کو غلط بتایا ہوگا۔ اس لئے کہ صرف علمائے ہند ہی کو نہیں بلکہ فضلائے ایران کو بھی میں نے گُنبَد ہی بولتے سنا ہے۔ بہرحال

مجھے اپنے اس سماعی علم پر پورا اعتماد نہ تھا۔ میری خواہش پر وہ مولوی صاحب اُسی وقت نگار کا پرانا فائل لائبریری سے اُٹھا لائے، دسمبر ۳۲ء کے نگار میں یہ عبارت درج تھی۔

"جوشؔ (ملیح آبادی) نے ایک نظم خاتونِ ہندی کے عنوان سے لکھی تھی جس کا پہلا شعر یہ ہے:۔

سُن اے خاتونِ ہندی انجمن سے کیا تجھے نسبت
کہ زیبا ہے تجھے تو خلوتِ اخلاق کی مسند

اسی نظم کا دوسرا شعر ہے:۔

تری رعنائیوں پر حق نہیں بزمِ شبستاں کا
ترے عشووں کا مرکز ہے حیا و شرم کا گُنبَد

لفظ گُنبَد کو مَسنَد کا ہم قافیہ استعمال کیا گیا ہے، درآنحالیکہ صحیح تلفظ اس کا گُنبُد (بضمِ با) ہے"

نیاز صاحب کی اس تحقیق کا ماخذ کیا ہے ہمیں معلوم نہیں، اس لئے اس کے مستند اور غیر مستند ہونے کے متعلق ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے۔ البتہ اس لفظ کے صحیح اعراب دریافت کرنے کی تین صورتیں ہیں۔

اول یہ کہ فضلائے ایران کس طرح بولتے ہیں؟

دوسرے یہ کہ مستند لغات میں اس لفظ کے اعراب کیا بیان کئے گئے ہیں

تیسرے یہ کہ مسلم الثبوت اساتذہ کے کلام میں یہ لفظ کس طرح استعمال ہوا ہے۔

پہلی صورت غالباً نیاز صاحب کے نزدیک قابلِ قبول نہ ہوگی۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ "جس طرح اپنی آنکھ سے رمضان کا چاند دیکھے بغیر روزہ رکھنا ہم پر واجب نہیں ہوتا، اسی طرح کسی ایرانی فاضل کا قول جو بطریق روایت کسی کی زبانی ہم تک پہونچے، کسی لفظ کی لُغوی تحقیق کے بارے میں ہمارے لئے حُجت نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ خود ایران میں بھی یہ لفظ غلط اعراب کے ساتھ مُروّج ہوگیا ہو"

لہٰذا ہمارا یہ کہنا کہ ہم نے ایران میں متعدد فضلا کی زبان سے گُنبَد ہی سنا ہے، چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ البتہ لُغت اور کلام اساتذہ کی سند اگر پیش کی جاسکے تو نیاز صاحب کو بھی اس کے قبول کرنے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔ آئیے پہلے لغات ہی کو لیں۔ جن لغات سے لفظ گُنبَد کے اعراب کی تحقیق میں مدد مل سکتی ہے، وہ پانچ قسم کے ہیں۔

(۱) فارسی کے وہ لغات جو اہلِ ہند نے مرتب کئے۔

(۲) فارسی کے وہ لغات جو ایران میں لکھے گئے۔

(۳) فارسی کے وہ لغات جو اہلِ فرنگ کی تالیف ہیں۔

(۴) دوسری زبانوں کے وہ لغات جن میں اُن زبانوں کے الفاظ کے معنی فارسی میں بیان کئے گئے ہیں، اور رومن رسم الخط میں تحریر ہیں۔

(۵) اردو زبان کے لغات (ا) اہلِ ہند کے لکھے ہوئے۔ (ب) اہلِ فرنگ کے مُرتب کئے ہوئے۔

اب ہم پانچوں قسم کے مستند و معتبر لغات سے لفظ گُنبَد کے اعراب پیش کرتے ہیں۔

فرہنگِ جہانگیری۔ گُنبد و گنبدہ۔ با اول مضموم بثانی زدہ و بائی مفتوح۔

بُرہانِ قاطع ۔ گنبد۔ بضم اول و فتح بای ابجد و سکون ثانی و دالِ بے نقطہ

بہارِ عجم ۔ گُنبد۔ بالضم۔ (صاحبِ بہارِ عجم نے لغات کے اعراب بیان کرنے کا یہ قاعدہ اختیار کیا ہے کہ حروفِ ثالث مفتوح ہو تو اس کا ذکر نہیں کرتے، مثلاً غمزہ۔ بالفتح" صرف غین کی حرکت بتائی اور "ز" چونکہ مفتوح ہے اس کا ذکر نہ کیا، لیکن غُلغُل" (بضمِ ہر دو غین) میں چونکہ حرفِ ثالث مضموم ہے، اس لئے اس کا ذکر بھی کر دیا۔ گُنبد کی "ب" چونکہ مفتوح ہے اس لئے اس کا ذکر نہیں کیا)

ہفت قلزم : گنبدِ (نیلوفری)۔ بضمِ اوّل وسکونِ نون و فتحِ بائے موحدہ تحتانی

شمس اللغات۔ گنبد۔ با اول مضموم بثانی زدہ و بائی مفتوح

فرہنگِ آنندراج گنبد و گنبدہ بضم اول و فتح بائی موحدہ و سکونِ ثانی و دالِ بے نقطہ

برہانِ جامع (تالیفِ عہد فتح علی شاہ قاچار) گنبد و گنبدہ۔ بضم اول و فتح ثالث

فرہنگِ نوبہار (چند سال قبل تبریز میں چھپی ہے) گنبد چو دُختر۔

فرہنگِ کاتوزیان (چند سال قبل طہران میں چھپی ہے) گُنبَد

Persian-English Dictionary by Steinguss.

Gumbad - گنبد

Lexion Persico-Latinum by Vullers.

گنبَد B. s. گُنبَد

Dictionnaire Persan-Francais by Desmaisons.

Goumbed. گنبد

Dictionary English-Persian by Palmer:-

Dome = گنبد Gumbad (Gumbaz)

Dictionary English-Persian by Phillot:-

Dome = Gumbad or Gumaz

Dictionary Hindustani-English by Forbes:-

Gumbad, Gumbaz = گنبذ۔ گنبد

Dictionary Hindustani-English by Fallon:-

Gumbad, Gumbaz = گنبد

نور اللغات۔ گنبد (ف۔ صحیح دال سے ہے۔ ذال سے غلط ہے۔ تلفظ گُنبَد)۔

یہ اور اِن کے علاوہ لغت کی جتنی کتابیں ہماری نظر سے گزری ہیں، سب میں گنبد کی "ب" کو مفتوح ہی لکھا ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اتنی کثیر مستند شہادتوں کی موجودگی میں گُنبُد کو صرف اس لئے غلط مان لیا جائے کہ جوشؔ صاحب نے (جن کا کلام، خدا کے کلام کی طرح اسقام سے پاک نہیں) اسے گُنبُد لکھا ہے، اور نہ گُنبُد کو اس لئے صحیح مانا جا سکتا ہے کہ صرف نیازؔ صاحب کے نزدیک اس کا صحیح تلفظ گُنبُد ہے۔

شعرائے ایران کے کلام میں یہ لفظ بارہا استعمال ہوا ہے لیکن ایسے متعدد اشعار تلاش کرنے کے لئے جن میں یہ لفظ بطور قافیہ واقع ہوا ہو، وقت اور محنت کی ضرورت ہے۔ لیکن اس زحمت کا کوئی خاص فائدہ نہیں کیونکہ لغت کی تمام مستند کتابوں میں اس کا تلفظ بصراحت مذکور ہے۔ بہرحال اتمامِ حجت کے لئے ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں اور وہ ایک ہی مثال ایسی ہے کہ اس کے بعد پھر کسی دوسری سند کی ضرورت باقی نہیں رہتی، سعدیؔ علیہ الرحمۃ کا یہ شعر غالباً نیازؔ صاحب نے بھی ضرور سنا ہوگا۔

پرتوِ نیکاں نہ گیرد ہر کہ بنیادش بد است
تربیت نااہل را چوں گردگاں بر گنبد است

نیازؔ صاحب کی منصف مزاجی سے مجھے امید ہے کہ جس طرح انھوں نے میرے بتلانے پر جوشؔ کی "ہمیر شکار" والی ترکیب کو صحیح تسلیم کر کے علی الاعلان اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا تھا، اِن سطور کے ملاحظہ فرمانے کے بعد اپنی اس چھوٹی سی لغزش کو بھی مان لیں گے، اور اولین فرصت میں اعلان کر دیں گے کہ "غلطی میری تھی جوشؔ کی نہ تھی" تاکہ جو لوگ اُن کی پہلی تحریر سے غلطی میں مبتلا ہو گئے ہیں وہ راہِ راست پر آ جائیں۔

اس امر کے متعلق تو اب کوئی شبہ باقی نہیں رہا کہ گنبد کی "ب" مفتوح ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لغت کی مختلف کتابوں میں اس لفظ کی دو شکلیں یعنی گنبد اور گنبذ کیوں پائی جاتی ہیں؟ اس دال (مہملہ) اور ذال (معجمہ) کے فرق کو سمجھنے کے لئے پہلے فارسی زبان کے ایک اصول کا جاننا ضروری ہے۔ اساتذۂ فن نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ فارسی زبان کے مفرد الفاظ جو "دال" پر تمام ہوتے ہیں ان میں اگر "دال" سے پہلا حرف ساکن ہے۔ لہٰذا آخری حرف کو دال پڑھنا چاہیئے۔ اس کے برعکس اگر دال سے پہلا حرف متحرک ہو تو آخری حرف کو ذال پڑھنا چاہیئے جیسے گنبذ کیونکہ "ب" متحرک ہے۔ البتہ اگر دال سے پہلا حرف ساکن ہونے کے ساتھ ساتھ حرفِ علت بھی ہے (یعنی الف۔ واؤ۔ ی۔ میں سے کوئی حرف ہے) تو اس صورت میں بھی دال کو ذال ہی پڑھنا چاہیئے، مثلاً استاذ (استاد) جوذ (جود) وغیرہ۔

خواجہ محمود ابن یمین نے اس قاعدہ کو ایک قطعہ میں بیان کیا ہے:

قطعہ۔

در زبانِ فارسی فرقے میانِ دال و ذال ... با د گیر از من کہ ایں نزدِ افاضل مبہم است
پیش از و در لفظِ مفرد گر صحیح و ساکن است ... دال خواں آں را و باقی جملہ ذالِ معجم است

بعض کتابوں میں ابنِ یمین کا قطعہ اس طرح منقول ہے۔

ہر گاہ دال، ذال، کہ در مفرد می فتد ... ز الفاظ پارسی بشنو زانکہ مبہم است
حرفِ صحیح ساکن اگر پیش ازو بود ... دال است و ہر چہ ہست جز ایں، ذالِ معجم است

ابن یمین کے علاوہ دوسرے اساتذہ نے بھی اس قاعدہ کو نظم کیا ہے۔ محقق طوسی کہتے ہیں۔

آنانکہ بفارسی سخن می رانند ... در معرضِ دال، ذال را بنشانند
ماقبلِ وی ار ساکن جز "وای" بود ... دال است وگرنہ ذالِ معجم خوانند

ظہیر فاریابی نے اسی مضمون کو عربی میں بیان کیا ہے۔

اِحفَظُوا الفرقَ بینَ دالٍ و ذالٍ
فَھُوَ رُکنٌ بالفارسیۃِ مُعظَمُ
کُلُّ ماقبلَہُ سکونٌ بِلا (وای)
فھو دالٌ وَغَیرُہٗ ذالٌ مُعجَمُ

شہاب الدین احمد حکیم کرمانی نے ایک قطعہ میں سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اس اصول کو نظم کیا ہے۔

ہر کجا ماقبلِ وی جز حرفِ علت ساکنست
ہمچو مرد و گرد و سرد و برد، آں را دال خواں
ہر کجا ماقبلِ وی ساکن بحرفِ علت است
ہمچو بازو بید و بوذ و باذہ آں را ذال خواں

حکیم انوریؔ کی ایک رباعی بھی اس قاعدہ پر دلالت کرتی ہے۔

دستِ تو بسخاوت ید بیضا بنمود ... از جوذِ تو بر جہان، جہانی افزود

کس چو نتو سخی نہ ہست و نی خواہد بود گو قافیہ ذال شو زہی عالم جود

افزود کے ساتھ قافیہ جُود ہونا چاہیئے تھا، لیکن شاعر کہتا ہے کہ دال کے بجائے اگر ذال قافیہ ہوگیا (یعنی جُوذ) تو کچھ مضائقہ نہیں۔ جُوذ (جو یعنی سخاوت) کا مرتبہ بہرحال بہت عالی ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ زبان کے اکثر قاعدوں کی طرح یہ قاعدہ بھی کُلّیہ نہیں بلکہ اکثریّہ ہے۔ بہرحال اس سے ظاہر ہے کہ گنبد کی "ب" چونکہ متحرک ہے اور حرف صحیح ہے، حرفِ علّت نہیں۔ لہٰذا آخری حرف کو دال نہیں بلکہ ذال پڑھنا چاہیئے۔ اور اس اصول کی رُو سے گنبذ ہی صحیح ہے، فارسی کی پرانی قلمی کتابوں میں آپ کو بہت سے ایسے الفاظ جو آج کل دال کے ساتھ لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ ذال کے ساتھ لکھے ہوئے ملیں گے، بات یہ ہے کہ آج سے چند سو سال قبل تک اس اصول کی پابندی کی جاتی تھی، مگر متاخرین نے اس قاعدہ کو ترک کر دیا۔ لہٰذا صرف چند مخصوص الفاظ کے سوا تمام الفاظ ذال ہی سے لکھے اور پڑھے جانے لگے۔

خاتمہ پر اس قدر اور عرض کر دینا مناسب ہے کہ پرشین فلالوجی (علم اللسانِ فارسی) کے ماہرین کے نزدیک یہ لفظ (گنبذ) فارسی میں آرامی زبان سے لیا گیا ہے، اور پہلوی میں اُس کی شکلِ تحریری "گمبت" (بعدمِ حرکتِ گاف و میم و بفتحِ با) پائی گئی ہے۔

دوشیزۂ جمنا

وہ آبشارِ جمنا وہ دلفریب منظر	وہ بیخودی کا عالم وہ کیف روح پرور
خاموش وہ فضائیں بہتا ہوا وہ پانی	وہ عشق کا فسانہ وہ حُسن کی کہانی
دوشیزہ اک کنارے تفریح کر رہی تھی	سُرخی شفق سے لیکر ذرّوں میں بھر رہی تھی
وہ حُسن کی شعاعیں ذرّوں کا جگمگانا	پانی کا آسماں کو وہ آئینہ دکھانا
گویا چراغِ الفت پانی میں جل رہے تھے	خورشید ڈوبتا تھا تارے نکل رہے تھے
انگڑائی لے رہا تھا مسرور ہوکے پانی	موجوں سے کھیلتی تھی کافر ادا جوانی
رُخسار پر ہوا سے بل کھا رہی تھیں زُلفیں	شام و سحر کا منظر دکھلا رہی تھیں زُلفیں
وہ زیرِ لب تبسّم وہ بھولی بالی باتیں	وہ نیم باز آنکھیں وہ دلبری کی گھاتیں
بڑھ بڑھ کے آبِ دریا قدموں کو چُومتا تھا	لہرا رہی تھیں موجیں اور حُسن جھُومتا تھا
پتھر اُٹھا اُٹھا کر پانی پہ مارتی تھی	اللہ جانے کس پر غصہ اُتارتی تھی
اُمید ڈوبتی تھی ارمان بہہ رہے تھے	شاید پلٹ پلٹ کر یہ بات کہہ رہے تھے

دلچسپیوں میں پھنس کر تو قید ہو رہا ہے
محسن تجھے خبر ہے دل صید ہو رہا ہے

محسن اعظمگڈھی

اسلام اور وطن!

کشّاف

ڈاکٹر اقبال نے مولینا حسین احمد مدنی کے پبلک بیان شائع شُدہ اخبارات (دربارۂ بحثِ وطنیت و قومیت) پر اپنا بھی اک بیان شائع کیا ہے، یہ امر معنی خیز ہے کہ علامۂ اقبال نے جناب اقبال سہیل کے قطعہ (بجواب ابتدائی قطعۂ اقبال متعلق مولینائے مدنی) کا کوئی منظوم جواب الجواب دینے سے گُریز کیا! محاذ کی یہ تبدیلی اولین اعترافِ شکست ہے! مولینا حسین احمد صاحب کے مُعاملے میں یہ تاریخ کا اک خوشگوار اعادہ ہے! ظہورِ دعوتِ اسلام کے زمانے کا ذکر ہے کہ اک مُعاندِ اسلام جاہلی شاعر اِس مُبارزت کے ساتھ حضرت داعیٔ اسلامؐ کے سامنے آیا کہ "میں آپ کے شاعر سے زبان آوری میں مقابلہ کرنا چاہتا ہوں، اور اپنی فتح و شکست کو ظہورِ پیامِ اسلام کی حقانیت یا بطالت کا معیار تسلیم کرنے کو تیار ہوں"! اِس "با شیر پنجہ کردن" کی جو "سزا" اِس مدعیٔ شاعری و ساحری و جزوی پیغمبری" کو انگیز کرنی پڑی وہ "قاضیٔ تاریخ" کی عدالت کے "محافظ خانے" میں محفوظ ہے! مدینۃ النبی کے اس نخوت رسا آور کے حوصلہ مند ڈرامے کا "آخری بابِ حُزنیہ" یہ تھا کہ بقول اِسی مُبارزِ سخن کی سرپرست ہمراہی جماعت کے "الحق کہ آپؐ کا شاعر ہمارے شاعر سے بازی لے گیا!" ——— اپنے جد ذوالمجدؐ کی اِس قدیم "فتحِ مبین" کی یہ تازہ ترین تکرار آلِ رسول "مولینائے مدنی کو مبارک ہو! ہمارے عہد کے ادیبِ لبیب اور مُناظرِ بےنظیر، مولینا ابوالکلام آزاد کی زبان میں اقبال گویا "اپنے ہی پسند کئے ہوئے میدان میں ہار گئے"! ——— وھٰذا یوم الفرقان: یوم التقی الجمعان!

اور ہمارا خیال ہے کہ اب حضرتِ اقبال کی یہ موضوعِ بحث "نثر فرمائی" بھی اپنی "فارسی طرازی" سے کچھ بہتر حشر مقدر نہیں رکھتی۔ شاید اُن کا یہ "شعرِ منثور" (اخباری بیان!) ان کے ماقبل قطعے کی زبوں انجامی کی طرف تلمیح کرتے ہوئے، زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ ع

تو بُرونِ ما چہ کردی کہ درونِ ما بیائی؟!

(۲)

"قومؔ" اور "ملّت"!

حضرتِ اقبال اپنے بیان کے افتتاحی جُملے ہی میں تسلیم کرتے ہیں کہ اپنے معلومہ مصرعے میں "میں نے لفظ 'ملت' 'قوم' کے معنوں میں استعمال کیا ہے!" اور معاً بعد اعتراف فرماتے ہیں کہ "اس میں کچھ شک نہیں کہ عربی میں یہ لفظ، اور بالخصوص قرآن مجید میں، شرع اور دین کے معنوں میں استعمال ہوا ہے!" ——— سُوال یہ ہے کہ لفظ متنازعہ فیہ کے لُغوی معنی، اور "عین قرآنِ مجید" کے مدلول سے دیدہ و دانستہ انحراف کرنے کی کونسی وجہِ مُوجہ اقبال کے پاس تھی؟ کیا یہ "دلیرانہ تحریف" اِس لئے اختیار کی گئی کہ اس حیلے سے حضرتِ مدنی

مدظلہ العالی کو "بوجہل و بولہب" قرار دیا جائے ؟! (نقل کفر کفر نباشد!)۔ غلط بیانی ویسے ہی اک مکروہ چیز ہے، اور پھر "ترجمانِ حقیقت" کی زبان سے؟! اور اک نیک محضر عالمِ ربانی، اور روشناسِ ایشیا و یوروپ و افریقہ مردِ مجاہد کو نشانۂ "سب و شتم" بنانے کے لئے! "بنا ر الفاسد علی الفاسد" کی ایسی غلیظ نظیر شاید "حکیم اسلام" کے سوا دوسری جگہ نہ ملے! ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ اقبال کی کاوشِ بدگوئی اسی پر قانع نہیں! وہ "قدیم قرآن" سے مایوس ہوکر "حال کی عربی، فارسی، اور ترکی زبان" کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، اور اُن سے "بکثرت سندات" لاتے ہیں، تاکہ غریب حسین احمد پر جو کُند پھینکی گئی تھی اُس کی زد میں ایک بار پھر اِس مظلوم و معصوم کی گردن لائی جائے، اور اِس "عشرۂ محرم الحرام" میں اِس "ابن علی" پر تیغِ تبری دوبارہ رواں کی جائے! ؎

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

مولانا حسین احمد صاحب وہ آخری شخص ہونے چاہیئے تھے جن کے لفظِ قوم کو کوئی کلمۂ "ملت" میں منتقل کردے! وہ اک عالمِ دین ہیں، اک فقیہ متقی ہیں، مدرسۂ عالیہ عربیۂ دیوبند کے صدر المدرسین ہیں، وہ حرمین شریفین تک کی دینی درسگاہوں کی مسندوں کی سالہا سال تک زینت رہ چکے ہیں، اور اُن کی ساری ہستی و زندگی اور تمامی قلب و روح پر احترامِ اسلام اور رعایتِ شریعت چھائی ہوئی ہے، اگر اُن کی قومیت اور ملت میں بھی کوئی حدِ فاصل نہیں رکھی جاتی تو اس سے بڑھکر شیرۂ باطن سوئے ظن اور کیا ہوسکتا ہے! ع

بدتر مرگ، وے بدتر از گمانِ تو نیست!

اور اب تو مولینائے مدنی نے اپنے مفصل و مشرح بیان میں قرار واقعی طور پر رفعِ شکوک فرما دیا تھا، "قوم" و "ملت" کے شرعی فرقِ عظیم کو واضح کر دیا تھا، ہر دو میں "زمین و آسمان" کا فرقِ مراتب جتایا تھا، باایں ہمہ اقبال اسی پر مُصر ہیں کہ مولینا حسین احمد کی مصطلحۂ قرآن "قوم"، گویا ہٹلر و مسولینی کی غالی قوم پرستی ہے! ناکردہ گناہ مدنی کے اُس دامن پر جس پر فرشتے اگر نماز پڑھیں تو زیبا ہے، داغ لگانا کیا ایسا ہی ناقابلِ ترک فرضِ عین ہے کہ اُسے بجا لانے کے لئے کوئی غلط تعبیری اور کوئی دیدہ بردہ دُزدگی ایسی نہیں جو مُباح نہو؟! کیا "ظن المومنین خیراً" کا حکم البدل یہی "ظن الجاہلیہ" ہے؟!

لطف یہ ہے کہ علامۂ اقبال لفظ قوم کے ترجمۂ "ملت" کو "زیر بحث مسئلے پر چنداں مؤثر نہیں" سمجھتے! تعبیر و روایت کی جس لغزشِ شدید نے "جانشینِ شیخ الہند" کو ابو جہل و ابو لہب بنا دینے کی زشت کاری کا ارتکاب کر ڈالا، وہ "حکیم الامت" کی تشخیصِ حاذق اور تحقیقِ انیق کی رو سے اِس نزاع میں سرِ مو فرق پیدا نہیں کرتی! ع

آنچہ می شنوم بہ بیداری ست یا رب یا بخواب!

(۳)

تغافل سے جو باز آئے جفا کی!

بالآخر علامۂ اقبال کسی بحث میں پڑے بغیر ہی تسلیم کئے "لیتے ہیں کہ "مولینا حسین احمد کا ارشاد یہی تھا کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں"؛ تاہم اپنے اس اعتراف سے فریقِ ثانی کو کوئی فائدہ حاصل کرنے نہیں دیتے! بجائے اس کے کہ وہ اپنے اس اعلان کے اس نتیجۂ صریح کو قبول کریں کہ مولانائے مدنی پر "قوم" کو "ملت" کا مقام دینے کی بنا پر جو اعتراضات وارد ہوتے تھے وہ اخباری اطلاع کی اِس تصحیح، یا اقبال کے اِس غلط ترجمے سے رجوع کر لینے کے بعد از خود مرتفع ہوگئے ——— وہ اک نیا شاخسانہ چھیڑ دیتے ہیں کہ "مبنی بر وطن قوم سے" قومیت کا جدید فرنگی نظریہ ہمارے سامنے آجاتا ہے"!

حضرتِ علامہ کے توہمات کو ہم کیا کہیں! یہ "محض قوم" سے "قومیت کا جدید فرنگی نظریہ" اُن کے سامنے اسی طرح آگیا ہے جس طرح کہ قبل ازیں "قوم" کا لفظ اُن کی زبانِ قلم پر جاکر "ملت" بن گیا تھا! یہ اک چیز کو ایک ہاتھ سے دیکر دوسرے ہاتھ سے واپس لے لینے کی ستم ایجادی ہے! علامۂ اقبال نے پہلے ترجمہ غلط کیا تھا، اور اب تعبیر غلط فرما رہے ہیں! یہ کس درجہ اک قیاس مع الفارق ہے کہ لغتِ عربی اور قرآنِ محمدی کی مستعملہ قوم بھی ممالکِ مغرب کی جدید العہد مصطلحہ قومیت ہی کے ہم معنی ہے؟ ایسا کہنا بعینہٖ اس دعوے کے مترادف ہے کہ انگریزی لفظ (People) فرنگی سیاسی اصطلاح (Nationalism) کے قائم مقام واقع ہوا ہے!

اقبال کو اس غیر منطقی سینہ زوری کی ضرورت یوں لاحق ہوئی کہ جو "خطابات" اُنھوں نے مولینائے مدنی کو، قوم کو ملت بنا دینے کی مزعومہ پاداش میں،

دیئے تھے، وہی لعن وطعن اب اِس طرح جاری رکھیں کہ ہندوستان کے مظلوم و قسمت آزمائے آزادی ہندو مُسلم ہموطنوں کو (مثلاً) جاپان کی مردم خوار و خون آشام "ڈریگن سوسائٹی" کے مثیل اصیل قرار دیں! ؂

اہلِ زمیں نے کیا ستم نو کیا کوئی! نالہ جو آسمانِ کہن سے نکل گیا!

نہ صرف یہ کہ ہم اس بے پناہ استدلال پر حیران ہیں، بلکہ خود جناب اقبال کی زبان بھی ہر جگہ اُن کی غیر محمود کاوش کا ساتھ دینے سے اِبا کر جاتی ہے! چنانچہ زیرِ بحث پیراگراف ہی میں، مولینائے مدنی کے مرکزِ بحث جملے کے بعد ہی علامۂ ممدوح کا یہ بھی ارشاد موجود ہے کہ "مجھکو حقیقت میں مولانا کے اِس ارشاد پر بھی اعتراض نہیں!" ——— ہماری عقل یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ جب مولانا حسین احمد کا لے دے کے یہی ارشاد مابہ النزاع تھا اور اُس سے اب حضرتِ اقبال کوئی تعرض کرنا نہیں چاہتے، تو پھر اِس نئی کالم در کالم دراز نفسی کا قلعہ کیا محض ہَوا یا غلاہی کے سنگِ بُنیاد پر تعمیر ہوا ہے؟! ؂

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے! کچھ اسمیں تکلف نہیں واللہ نہیں ہے!

تھوڑی دیر کے بعد صاحبِ ممدوح، مولینا حسین احمد صاحب کے معلومنہ اظہار پر سے اپنے اعتراض کو بارِ دگر ہٹاتے ہیں، وہ "اقوام و اوطان" کے درمیان کے "ازلی رابطۂ لاینفک" کا اعتراف کرتے ہیں، پھر از راہِ ذرہ نوازی اپنی ذات فانی فی الحجاز کو "ہندی" کہلانا بھی قبول فرماتے ہیں، ہم آغوشیٔ وطن کو اسلام سے باہم آویزی کے ہم معنی نہیں سمجھتے، اپنی جنم بھوم سے محبت اور اُس کی خدمت و فدویت کو بھی اک فطرتِ انسانی تسلیم کرتے ہیں! تاہم یہ سب کچھ منظور فرما لینے کے بعد وہ معاً اک انقباضِ روح سا محسوس کرتے ہیں! چنانچہ اگر کوئی اِن تمام جذباتِ فطرت کے حُسن و استحسان کی تقریب سے "حُبّ الوطنِ من الایمان" کی گلبانگِ عقیدت بلند کر دے تو وہ اِس جہل و "نادانی" پر منغص ہو جاتے ہیں! اور "ملفوظاتِ محمدی" کی فہرست سے، اک "کاتبِ وحی" کی شان سے، اس بیان کردہ حدیث کو خارج فرما دیتے ہیں! اُن کا اِرشاد ہے کہ وطن اک "جغرافیائی اصطلاح" ہونا چاہیئے، اور بس! اگر کوئی فرزندِ سرزمین اپنے وطنِ مالوف سے اُس ننگِ تعلق تعلق سے زیادہ خلاملا رکھتا ہے جتنا کہ اک مسافر "سرائے" سے، تو معاً حرم اسلام اِس مادرِ وطن کا حریف بن جاتا ہے، اور اک "تصادم" و "تزاحم"، اور اک معرکۂ حرب و ضرب شروع ہو جاتا ہے! ——— اللہ اللہ!

اِس قدر دُشمنِ اربابِ وفا ہو جانا؟!

(۴)

علامۂ اقبال کا مُغالطہ و واہمہ!

ڈاکٹر اقبال کو باوجود فاضلِ اجل ہونے کے یہ معلوم نہیں کہ مولینا حسین احمد یا کوئی مسلمان "وطن" کو اک "ہیئتِ اجتماعیہ کے قانون" کی حیثیت سے قبول نہیں کرتا! ہندوستانی وطن کا اقتضا ہم سے اتنا ہی ہے کہ ہم سب اپنی سیاسی و معاشی زندگی کی یکجائی و ہمرشتگی کو محسوس کریں، اور اُس کی تنظیم کے لئے اک مشترک ادارۂ نظم و نسق کے عَلَم کے نیچے کھڑے ہو جائیں! ہم سیاسیات و معاشیات کے علاوہ اپنا کوئی اور شعبۂ حیات اِس وطنی سررشتۂ حکومت کو تفویض کرنا نہیں چاہتے! ایسا ممکن بھی نہیں، اس لئے کہ یہ زائد کاروبار مختلف ہندوستانی فرقوں اور ملتوں کے درمیان کم و بیش مُتبائن واقع ہوئے ہیں، جن کی داشت و پرداخت کا بندوبست فرقہ وارانہ اصول پر علیحدہ علیحدہ ہی ہو سکتا ہے! اِس اعتبار سے ہندوستانی قومیت کو بجائے علی الاطلاق و ہمہ گیر، یکرنگ و ہم آہنگ قومیت کے، قدرے اک "وفاقِ سیاسی" سے تعبیر کرنا زیادہ موزوں ہوگا! شاید یہی وجہ ہے کہ مُتعارف سیاسی وطنیت کی جگہ ہماری زبان پر "مُتحدہ قومیتِ ہند" کی ترکیب جاری ہو گئی ہے! پس ہمارا ہندوستانی وطن اک "فیڈریشن" ہے! فیڈریشن "کلچرل جذب و انجذاب" کی کوئی کارگاہ نہیں ہوا کرتا! بخلاف اِس کے وہ "ثقافتی استقلال" (Cultural independence) کے تحفظ و ضمانت کی اک صورت ہوتا ہے! ہندوستان ایسی واحد المسکن اور متعدد المذاہب دُنیا میں قومی سیاسی زندگی صرف عبارت ہو سکتی ہے اک "آل انڈیا کانٹی نینٹل فیڈرل گورنمنٹ" سے، جو اس مشترک سرزمین کی بس دو قدرِ مشترک ——— سیاسی نظم و نسق اور معاشی "تدبیرِ امر" (dishensation) ——— کی انچارج ہوگی، اور جس کی اِس سطحی سیادتِ بالائی کے زیرِ سایۂ عاطفت تمام انفرادی ثقافتی خطوں اور مذہبی ملتوں کو گویا اک نوع کی "داخلی آزادیٔ کامل" (Autonomy) نصیب ہوگی! خود وطنی تحریک کی اِس وقت تک کی رفتار اِسی نہج پر رہی ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس

شدت کے ساتھ اپنی سیاسی واقتصادی حدود کے اندر مُقید رہی ہے۔ اور ایسے حزم واحتیاط کے ساتھ کہ گویا ؎

اگر یک سَرِ موئے برتر پَرم فروغِ تجلّی بسوزد پَرم!

ضمیر کی آزادی، مختلف ملتوں کے شخصی قانون کی ضمانت، اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ وغیرہ وغیرہ اسی حفظِ مراتب کے مظاہر ہیں! "جیؤ اور جینے دو" کی اس "برادرانہ فضا" میں کسی ہندوستانی جماعت یا ملّت کے مخصوص مذہب وتہذیب کے معرضِ خطر میں ہونے کا خیال یا مغالطہ ہے یا واہمہ یا ہَولِ دِل! اور اس سے گُریز و پرہیز یا وحشت زدگی ہے یا مَردُم بیزاری!

ہمیں با دِلِ ناخواستہ کہنا پڑتا ہے کہ حضرتِ اقبال کو کم وبیش یہ ساری ہی علّتیں عارضِ حال ہیں! چنانچہ اس مجوزہ نظامِ زندگی کی خوشگواری ومُبارکی پر اپنے اک ہمصفیر کا یہ افسونِ محبت پڑھنے کے بجائے کہ ؎

حافظا! گر وصل خواہی، صلح کُن با خاص و عام
با مُسلماں اللہ اللہ، با برہمن رام رام!

وہ یہ بے محل "خدائی فوجداری" کی "آرڈی نینس نما" زبان بولتے ہیں کہ:

"بنی نوعِ آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی: مُوحد ومُشرک!
...... اُمتہ مُسلمہ کے مقابل میں تو صرف ایک ہی ملت ہے،
اور وہ "الکفرُ ملّۃ واحدہ" کی ہے!"

کیا مُولینائے رُوم کے اِن "پنجابی اوتار" کو ہم مولینائے رُوم ہی کی اک صدائے غفلت شکن رسید کرسکتے ہیں، کہ ؎

تو برائے "وصل" کردن آمدی؟ یا برائے "فصل" کردن آمدی!

پھر خیر سے اِس اقبالی حقیقت کا کہیں مصداق بھی ہو! مسلمانانِ ہند آج نہ "اُمتہ مُسلمہ" ہیں، نہ ہنود وغیرہ "ملتہ الکفر"! ہندوستان کے نام نہاد فرزندانِ توحید وہی تو ہیں جن کے "اِسم بامسمّیٰ" وجودِ باجود کی منقبت خود اقبال اس طرح کرتے ہیں: ؎

چہ گوئمت زمسلمانِ "نامسلمانے"؟ جُز اینکہ پورِ خلیلؑ است و "آذری" داند!

پھر جن "پیرانِ پارسا" کی روحانی آغوش میں پلکر یہ جگر گوشگانِ اسلام نکلتے ہیں، اُن کی پوست کندہ حقیقت بھی اقبال ہی کا کوئی "آنی لمحہ" زورِ جنوں" یوں کہہ گیا ہے: ؎

شیخِ ما از برہمن کافر تر است زانکہ او را "سومنات" اندر سر است!

ہمارے فرزندان ودخترانِ خلیلؑ وکلیمؑ کی نا خلفی جس شرمناک نُزبونی تک پہونچ گئی ہے، اُس کی پیمائش بھی "ترجمانِ حقیقت" ہی کے قلم کو ذرا کرنے دیجئے:

مُسلم از سرِ نبیؐ بیگانہ شد باز ایں بیت الحرم بُت خانہ شد!
از منات ولات وعُزیٰ وہُبل ہر یکے دارد بُتے اندر بغل!

ہمیں اپنے تئیں "اُمتہ مُسلمہ" کہتے ہوئے شرمانا چاہیئے! ہمیں کیا خبر، لیکن اقبال ہی کی روایت ہے کہ:

آنکہ بخشش بسترِ مازاغ البصر سوئے قومِ خویش باز آید اگر
لَنْ تَرانی! گویدت مولائے ما وائے ما اے وائے ما اے وائے ما!

پھر وہ اسلام کے "تیرہ سو برس کے کارناموں" کی طرف دعوتِ نظر دیتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اسلامی تاریخ کے اس طویل دَور کا بیشتر حصہ صدرِ اوّل کے خیر القرون کی تعمیر کی تخریب ہی کا شاہد بنا ہے! اور اس وقت اغیار کی پُر زور تحریکوں کی ضرب سے ہمارے مُسلم نوجوان جیسے اُفتان وخیزاں ہو رہے ہیں، اور اُن کی دستگیری ونُشت پناہی سے ہمارا "پیرِ حرم" جیسا واماندہ ودَرماندہ ہو رہا ہے، اِس حقیقتہ نفس الامری کی ترجمانی بھی اقبال ہی کو کرنے دیجئے!

مجھکو تو یہ دُنیا نظر آتی ہے دگرگوں! معلوم نہیں دیکھتی ہے تیری نظر کیا!
ہر سینے میں اک صُبحِ قیامت ہے نمودار افکار جوانوں کے ہوئے زیر و زبر کیا!
کرسکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی اے پیرِ حرم، تیری مُناجاتِ سحر کیا!

اپنی ہی زبان سے حالات یوں طشت از بام ہو چکے ہیں، اور پھر بھی ہم اپنے کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ "بر سرِ منبر" یہ "سرود" گایا کریں کہ مابدولت نے اپنے منشائے ہمایونی سے عالمِ انسانی کو صرف دو عنواناتِ جلی کے تحت تقسیم فرما دیا ہے: ایک ملتہ مُسلمہ، (یعنی اینجانب!)، اور دوسری ملتہ الکفر!" (جملہ کفار و اغیار!) ؎

بنگے زدیم وسرِ انا الحق شد آشکار! مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود!

(۵)

مزید بحثِ وطنیت!

بلا شبہ "وطنیت" کو قومی زندگی پر جا بجا وہ احاطہ واستیلا بھی حاصل ہے جس کو علامہ اقبال نے ہر جگہ علی الاطلاق وبلا استثنیات فرض کیا ہے! لیکن حقیقتہً یہ صورت اُنہی سرزمینوں کے ساتھ مخصوص ہے جو کُلیتہً یا تقریباً

ایک ہی دین یا تمدن کے گہوارے ہیں! قدرتہً وہاں حیاتِ قومی کے تمامی شعبے نظامِ حکومت وہئیتِ ریاست کے سپرد ہونا چاہئیں اور وہ ہو جاتے ہیں! مگر ظاہر ہے کہ حکومت کی اس ہمہ گیری سے وہاں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ نہ مختلف ومُعاند فرقہائے آبادی ہوتے ہیں، نہ ایک کے دوسرے کے اندر جذب و فنا کا کوئی سُوال ہوتا ہے! تاہم جن جن ملکوں میں مذہب وتہذیب کا تعدّد پایا جاتا ہے، وہاں معاً حکومت اپنے تنگ حلقۂ نظم ونسق وتنظیم معیشت کے اندر پاؤں سکیڑ کر بیٹھ جاتی ہے، اور اُس سے سرمو تجاوز نہیں کرتی: ایسے ملکوں میں حکومت گویا قیامِ امن وعدل ہی کی ضامن ہوتی ہے، آبادی کی تہذیب وثقافت کی ترجمان نہیں ہوا کرتی! عمومی حکومت کے بیرونی اجمال کی ساری اندرونی تفصیل مختلف ملی تنظیمات کے ہاتھوں انجام پاتی ہے، جو اپنے کاروبار واختیارات کے اعتبار سے "حکومت اندرونِ حکومت" کہی جانی چاہئیں: جنگِ عظیم کے بعد یورپ میں، سلطنتوں کی شکست وانقراض سے بکثرت چھوٹی چھوٹی مستقل ریاستیں معرضِ وجود میں آئیں، لیکن باوجود چھوٹی ہونے کے کسی حکومت کو تام وکمال یکرنگ وہم آہنگ رعیت نہ ملی۔ بے تکلف اس کا علاج یہی کیا گیا کہ اقلیتوں کو اُن کے عام تمدنی استقلال کی ضمانت دے کر اور اُسے داخلِ دستورِ اساسی کرکے، کم وبیش وفاقی ڈھانچے کی مرکزی حکومتیں کھڑی کرلی گئیں، جس سے وہاں نہ اکثریت کو چیرہ دستی کا حوصلہ ہے نہ اقلیتوں کو مُلک کے غالب تمدن کا لُقمہ بن جانے کا خطرہ! ——— اب خدا جانے ہمارا یہ فقدانِ تخیل ہے یا ہماری یاس مشربی کہ ہم اپنے سادہ سے ہندو مُسلم مسئلے کو اک تا قیامت جاری رہنے والا عقدۂ لاینحل سمجھ بیٹھے ہیں، اور اُس کے لئے کبھی "پاکستان" بناتے ہیں، اور کبھی "ناپاکستان"! ؎

ہزار رخنہ بدام ومرا بسادہ دلی تمام عمر در اندیشۂ رہائی رفت!

"قاضئ شہرِ اسلام" اقبال کو اک اور "اندیشہ" نڈھال کئے ڈالتا ہے، کہ ہندو مُسلمانوں کی مخلوط حکومت میں آخر سیاسی دستور اور معاشی نظام کس فرقے یا ملت کا، اساس کار بنایا جائے گا، اور آیا وہ کہاں تک اسلامی منافع ومصالح کے لئے قابلِ قبول ہوگا؟ وہ سُوال کرتے ہیں کہ اگر اس تشکیل سیاسی واقتصادی میں اسلامی نظریۂ سیاست ومعیشت کو نظر انداز کر دیا گیا تو کیا مسلمانانِ ہند کے لئے یہ امر ممکن یا مستحسن ہوگا کہ وہ جماعتی حیات کے اِن دو اہم ترین شعبوں میں طاغوت کی اطاعت کا جُوا اپنے حساس اسلامی شانے پر رکھ لیں، اور اسلامی نظام کے جسم کے سر اور سینے سے مقطوع ومحروم ہو جائیں؟

یہ فکر بجا اور قابلِ ہمدردی ہے! لیکن مسلمانوں کو دیکھنا چاہیئے کہ اگر مُلک کی سیاسی ومعاشی شیرازہ بندی میں اصل واساس، اسلامی اصول ونوامیس کو نہ بنایا گیا تو یہ چیز کسی دوسرے مذہب یا تمدن سے بھی نہ لی جائیگی! یہ اک عمومی وآفاقی تصورِ سیاست ومعیشت ہوگا، جس کا تعین غالباً یہ اصل الاصول کرے گا کہ "زیادہ سے زیادہ فائدہ، زیادہ سے زیادہ تعدادِ خلق اللہ کے لئے کس چیز میں ہے؟" مسلمان اِس میں علانیہ نفع میں رہیں گے! یہاں سیاست کا سنگِ بُنیاد آزادئ مُلک وحریتِ ضمیر ہوگا، اور معیشت کی اساس کم وبیش "اسٹیٹ سوشیلزم" ہوگی، جو عین رُوحِ اسلامی ہے، جو ۹۹ فیصدی اسلامی منشائے معیشتِ قومی ہے! ؎

جو حرفِ قل العفو میں پوشیدہ ہے ابتک
اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار! (اقبال)

بخلاف اِس کے ہندوؤں کے حق میں دیکھئے کہ اِس انقلاب کے کیا معنی ہوں گے! اُن کے رائج کے تصور والا "اِندر صفت" مہاراجہ دھراج اپنے عرشِ کبریائی سے سرنگوں ہو جائے گا! دوسری طرف "مارکسزم" کا گرزِ غزنوی، "بھیمی دیوی" کے "بُتِ سومنات" کو پارہ پارہ کر ڈالے گا! اس ساری شکست وریخت میں اغیار کی تہذیب کی صدفی صد تخریب ہے، درآنحالیکہ اسلامی تمدن کی کم از کم بقدر ۹۰ فیصدی تعمیر وتجدید! ہماری یہ کیسی کورانہ بدبختی ہے کہ ہم تغیر پذیر زمانے کی ہر ادنیٰ جنبش پر لرزہ براندام ہو ہو جاتے ہیں، کہ اب ہمارا کام تمام ہوا، اب ہمارا کام تمام ہوا! ؎

ختم کا ہے کو ہُوا، کام ابھی باقی ہے!
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے! (اقبال)

(۶)

وطنیت مطلعِ تاریخ پر!

اقبال کی نظروں میں وطن کچھ اِس درجہ مکروہ ومبغوض واقع ہوا ہے کہ بلا مُبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اب وہ بجائے "شیطان" کے "وطن" ہی کو جانتے ہیں! اقبال نے جس پیمانۂ تخیل سے وطن کی ارادت ومحبت کو ناپا ہے

اُس کے اعتبار سے بھی وطن معرضِ لعنت سے صرور نکل جانا چاہیئے! لیکن بدبخت وطن کی اِتنی رعایت بھی غالباً دُنیا کی شرم سے ہے! —— خوفِ خدا سے نہیں! چنانچہ وطن کے اثر دحق کے اِس ہا دل ناخواستہ اعتراف کا وہ مختلف پیرایوں میں سخت انتقام لیتے ہیں! وہ اُسے "سب سے بڑا طاغوت" کہتے ہیں! وطن نواز علمائے ہند کے التفات بوطن کو "لعنت" کے نام سے پکارتے ہیں! اور ایک جگہ تو اپنے جوشِ ایمان کے بحران میں اِس حبِ وطن کو "روحانی جذام" سے تعبیر فرماتے ہیں! اس سارے فلسفے کا "عکس" یہی ہو سکتا ہے کہ وطن سے دامن کشی شاید سب سے بڑی "سومنات شکنی" ہوگی! وطن سے بیزاری اک سعادتِ کبریٰ" ہوگی! اور محبتِ وطن سے خانۂ دل کی ویرانی سب سے بڑا "تزکیۂ نفس" اور سب سے بڑھ کر "طہارتِ روح" ہوگی! ؎

بیا در بزم رنداں تا بہ بینی عالمِ دیگر
بہشتے دیگر و ابلیس دیگر، آدمے دیگر!

اسلامی تصور کا عنصر اِس ساری ژاژ خائی میں صرف اِتنا ہے کہ "اگر راہِ حق میں تمہیں اپنے وطنِ مالوف کو بھی عارضی طور پر ترک کرنے کی ضرورت لاحق ہو تو تم کو بے تکلف یہ قربانی بھی پیش کر دینی چاہیئے! وطن کی خاک سے خاکسارانہ وابستگی تمہاری علمبرداریٔ حق میں حائل نہو!" —— لیکن یہ تو بالکل اک دوسرا نقطۂ نظر ہے! نہ یہ وطن بیزاری کے ہم معنی ہے، نہ اصلاً کوئی ناپسندیدہ نظریہ ہے، نہ حقیقتہً اسلام کے ساتھ کوئی خصوصیتِ خاصہ رکھتا ہے: تاریخِ حُرّیت کے روشناس عالم پیابرداران وطنیت شاید قدم اوّل ہی پر سرزمینِ وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوئے ہیں! لیکن عین اسی غرض و غایت سے کہ چند ہی روز کے بعد غاصب اغیار بیک بینی و دو گوش، صحنِ وطن سے خارج کئے جائیں! اور مادرِ وطن کے "عاشقانِ مہجور" دیوانہ وار اُس کی آغوشِ عاطفت کی طرف دوڑیں، یہ رجزِ وطن پڑھتے ہوئے کہ ع

بشہرِ خود روم و شہریارِ خود باشم!

الغرض اِس ماجرائے خاص میں وطن صرف وقتی طور پر "متروک" ہو جاتا ہے، ازلی و ابدی طور پر "مردود" نہیں ہو جاتا! نامور شہیدِ مجاہدِ وطن، آغا کرمانی کو اپنے تمام ایامِ شباب میں بمشکل ہی کبھی دو روز گھر پر چین سے بیٹھنا نصیب ہوا، لیکن اِس جبریۂ ہجرِ وطن نے معشوقۂ وطن کو اِس "فرہادِ وطن" کے لئے جیسا "شیریں" بنا دیا تھا، اُس کا پُر سوز نوش و نیش اِس شاعرِ وطن پرست کے ان "سیپارہائے دل" میں پڑھیئے:

بہ ایراں مُبادا آں چناں روز بد	کہ کشور بہ بیگانگاں او فتد!
نخواہم زمانے کہ ایں نو عروس	بیفتد بزیرِ جوانانِ روس!
گیتی مبادا کہ ایں حورِ دیس	شود بہرۂ "کُردے" از انگلیس!

عارضی ترکِ وطن بسلسلۂ جہادِ آزادی —— "ہجرت" باصطلاحِ اسلام! —— حقیقتہً اک عام و ناگزیر مرحلہ ہے تحریکِ حریت کی راہ میں! اقبال کے لئے تو "ہندو ہندوستان" کا کوئی شرف و فخر تسلیم کرنا ناممکن ہے، لیکن آیئے ہم خود کانگریس کی (بخیال آپ کے) "ملحدانہ دعوتِ وطنیت" میں "ہجرۃ" کے نقوشِ قدم دیکھیں! لالہ لاجپت رائے مرحوم مذہبِ آزادی کے مؤمنینِ اولین اور پیامِ حُریت پر لبیک کہنے والے "السابقون الاوّلون" (Pioneers) میں سے ہیں! نتیجہ یہ ہے کہ اِس پُر شورش عشقِ وطن کی پاداش میں فوراً ہی اُنھیں "ہجرِ وطن" کی منزل پر گامزن ہونا پڑا، جب کہ اُنکا "دارالہجرت" دور دراز مانڈلے (شمالی برما) بنا! بھلا یہ ممکن ہے کہ ع

"عشق" کسی کا بے خبر ہو "ہجر" کے آزار سے!

حضرت "لسان العصر" اکبر الہ آبادی علیہ الرحمتہ نے اِس "قیسِ لیلائے آزادی" کی "اسیریٔ جلوۂ محل" کی نقاشی اپنے "مصوّرِ عصر" قلم سے یوں فرمائی تھی ؎

کرتی ہے خلق کو لیلائے لبرٹی مفتوں	ہند کے دل کو لُبھا لیتا ہے دِل کا یہ فسوں!
لاجپت بھی ہوئے شاید کہ اسیر و محزوں	پائے کو یاں کوئی زنداں میں نیا ہی مجنوں!

آتی آوازِ سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی!

وطن کا اک دوسرا عاشق، جو اس سالِ سَنجدِ آزادی کی طرف "شدِّ رحال" کرنے والے قافلۂ قومی کا "میر کارواں" بنا ہے (ہمارا روئے سخن بابو سبھاش چندر بوس کی طرف ہے) وہ لیلائے وطن کے ساتھ اس ہمنشینیٔ محل (صدارتِ کانگریس!) سے پہلے سالہا سال تک شہر بدری و جلاوطنی کے مراحلِ صعب و سخت سے گُزر چکا ہے! ؎

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بسے	شرطِ اوّل قدم آنست کہ "مجنوں" باشی!

پس وہ جو "ترکِ وطن سُنتِ محبوبِ الٰہی ہے" اُس کی اقتداء و اتباع کی سعادت بھی اِنہی "پرستارانِ بُتِ وطن" کو حاصل ہے! ؎

مُسلمان گر بدانستے کہ بُت چیست ؟
بدانستے کہ دیں در بُت پرستی ست ! (رومی)

کیا علامہ سر اقبال کو راونڈ ٹیبل کانفرنس مُنعقدۂ "قصرِ سینٹ جیمس" کی سمت قبلہ میں "بَربند یدمکھا" کے اعزاز کے علاوہ کبھی اپنی مشہورہ ہجرت کی یہ سعادت بھی نصیب ہوئی ہے ؟ ! یا "بندے ماترم" کے مُقابلے میں اُن کا ترانۂ ناآشنائی وطن یہی ہے کہ ؎

پھر کر رہے ہیں عزمِ طوافِ "حریمِ لندن" !
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا !

اقبال جرح فرماتے ہیں کہ "کیوں نہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو محض اک ہمہ گیر معمولی ملت سمجھکر بلحاظِ قوم یا قومیت ابوجہل و ابولہب کو اپنائے رکھا، اور اُن کی دلجوئی کرتے رہے بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی اُمور میں اُن کے ساتھ قومیتِ وطنی قائم رکھی، اگر اسلام سے مطلق آزادی مُراد تھی ؟"—— ممکن ہے اسلام سے مُطلق غلامی مراد ہو ! اور ہر شریف سے شریف غیر مُسلم کا تسمیۂ شاعرِ اسلام "کی زبان میں" ابوجہل و ابولہب "ہی ہو ! لیکن ہم کو تو بجائے اِس کے فدائے اسلام کی یہ "موعظت" آویزۂ گوش ہے کہ "لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم!" پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "جامِ محبت" قلبِ محمد اپنے ہم قوم مُعاندینِ حق کی دلجوئی سے ایسا ہی (نعوذ باللہ) خالی ہو جیسی کہ اقبال کی مروی "حدیثِ قدسی" ہے ! تاہم ہمارے سامعۂ اسلامی میں اِس "رحمۃ للعالمین" کی تو یہی "قومی دلسوزی" کی نوائے دہاں نواز گونج رہی ہے کہ: "اللھم اھد قومی : فانھم لا یعلمون ما یفعلون !" (پروردگار میری قوم پر راہِ ہدایت کھول دے ! اور اُنھیں مُعاف فرما دے، اِس لئے کہ وہ شرارت و مُعاندت سے یہ حریفانہ کاوشیں اسلام اور داعیٔ اسلام کے خلاف نہیں کر رہے ہیں، بلکہ وہ جانتے ہی نہیں کہ اُن سے کیا حرکات سرزد ہو رہی ہیں !)—— اللہ اکبر ! ؎

کہیں کیا دل کی وُسعت اپنی ہم ۔ اللہ ری وسعت !
اگر نہ آسمان ہوں جمع اک خالِ سُویدا ہو !

آپ سمجھے ! یہ تھی عاشقانہ فدویت پیغمبرِ عرب کی، اپنی دشمنِ خدا و رسول "قوم" کے ساتھ ! اِس منقولۂ بالا دُعائے نبوی کی شانِ نزول یہ تھی کہ اُمرائے طائف نے آپ کو "مفتری نبی" کہہ کر آپ کو در خورِ خطاب بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا ! اور قبائل کے غنڈوں نے آوازے کسے تھے ۔ بچوں نے تالیاں پیٹی تھیں اور بعض اشقیا نے اِس مجسمِ پیامِ رحمت پر صحرا کے کتوں کو للکار دیا تھا ! اور ہمراہِ رکابِ نبوت حضرت صدیقِ اکبرؓ ایسے رقیق القلب انسان تک کو اس یکسر فضائے بربریت و سَبُعیت سے اک تیز و تند عذابِ آسمانی کا اُسی لمحے نزول ہوتا نظر آتا تھا ! لیکن نہیں، عشق ریز لسانِ محمدؐ نے فی الفور اِس سارے پُر ہَول ماحول کو اپنی محولۂ بالا "شفاعتِ کُبریٰ" سے ٹال دیا ! اللہ اللہ ! ؎

اسد بسمل ہے کس انداز کا ؟ قاتل سے کہتا ہے
"تو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر" !

اقبال اپنے پنجابی دل و دماغ سے قلبِ نبوت کی اِس کائنات پیاپیما کو نہیں سمجھ سکتے ! ؎

اور ہے تیرا شعار، آئینِ ملت اور ہے ! زشت روئی سے تری آئینہ ہے رُسوا ترا !
قیس ہوں پیدا تری محفل میں یہ ممکن نہیں ، "تنگ" ہے صحرا ترا ، محمل ہے "بے لیلیٰ" ترا !

تعجب ہے کہ یہ اقبال ہی کے اشعارِ آبدار ہیں ! لیکن ایسی روحِ شعری اقبال کی بغل میں موجود ہے ، اور اُس کو اُس سے مَس تک نہیں ؟ ! ؎

چہ گُنم باکہ تواں گفت کہ او —— در کنارِ من و من مہجورم !

شاید اِس رازِ سربستہ کا حل بھی زبانِ محمدؐ نے کیا تھا جبکہ آپنے اک ترجمانِ حقیقت - لیکن ساتھ ہی مُعاندِ تحریکِ اسلام شاعر کا کلام سُنکر اُس پر یہ "تحلیلی تنقید" کی تھی کہ "آمَنَ لِسَانُہٗ وَ کَفَرَ قَلْبُہٗ !"—— یعنی ع

"قلبِ او کافر ، زبانش مومن است" !

جنابِ "حکیم الامۃ" (اقبال) کی "الہامی تشخیص" یہ ہے کہ "حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد یا اُن کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریۂ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں انکارِ خاتمیت، کا نظریہ !"

اقبال کا طورِ قلب ماشاء اللہ ساری دنیا کے تاریک توہمات کی نزول گاہ ہے ! اللہ اللہ وہ اپنے ہم وطن "قادیانی مُتنبی" کا مثیل اک "سید مدنی" میں ڈھونڈتے ہیں ،—— بجائے اک "پشتینی برہمنِ لاہوری" کے ! ؎

تھا وہ تو "رشکِ حورِ بہشتی" ہمیں میں میر !
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا !

اقبال کو اِس "گلدرخ اندازی" کا صلہ بجز اک "دندان شکن سنگ" کے کیا ملے !

سے بل سکتا ہے ؟! اس میں کیا شک ہے کہ سر اقبال اور مرزا غلام احمد آنجہانی کے باہمدگر "خاکِ خمیر" سے بڑھکر اک "روحانی مشارکت" بھی ہے! آخر الذکر نے ایک "دینی شقاق" پیدا کیا، اور اول الذکر نے اک "سیاسی نفاق" ایجاد کیا! ایک کا کارنامہ قادیان کا "بہشتی مقبرہ" ہے، دوسرے کا شاہکار شمالی مغربی ہند کا "پاکستان"! لیکن یہ "بہشت نما قبرستان" اور یہ "جوکا صفت پاکستان" دونوں "کلیسائے سینٹ پال لندن" ہی کے دو مخفی حجرے ہیں! مرزا صاحب آنجہانی نے، بقول خویش، برطانوی سلطنت کی نعت و منقبت میں اتنا بے پایاں "اعلان مہ" تیار کیا کہ "پچاس الماریاں" اس کے بارِ عظیم کی حامل ہیں! اور ماشاء اللہ چشم بد دور حضرت "حسان الہند" نے ان پنجابی مجاہدین کے سامنے اک "رجز" پڑھا جو جنگِ عظیم میں "یونین جیک" کے نیچے بغداد و بیت المقدس پر پرچم اسلام کو پارہ پارہ کرنے کے لئے روانہ ہوئے تھے! ——— کیوں نہ ہو! "الجنۃ تحت ظلال السیوف البرطانیہ"!

لیکن نہیں، حقیقت یہی ہے کہ مولینا حسین احمد اور ان کے دیگر ہمخیالوں کے افکار میں "نظریۂ وطنیت" وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں "انکارِ خاتمیت" کا نظریہ!"

"باحیا" باش و ہرچہ خواہی گو!

ہم علامہ کے اک اور قول کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کیا سچ مچ سر اقبال کا یہی خیال ہے کہ اگر "ملکِ عرب" آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت سیاستہً غلام ہوتا تو آپ قدم اول ہی پر "حریتِ عرب" کا رایت بلند نہ فرماتے ؟! محمد عربی ہی کے اک نہایت "مماثل" انبیؑ طریقہ "حضرتِ موسیٰ کا اسوۂ حسنہ کیا تھا؟! کیا ان کی تمامی دینی دعوۃ کا اولِ کلمۂ طیب یہی سیاسی اعلان نہ تھا کہ "ادّوا الیّ، وَ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْ اِسْرَائیل"! ——— یہ مطالبہ اگر اک جدید العہد "پولیٹکل مینی فیسٹو" میں منتقل کر دیا جائے تو کیا اس کا یہ اک آزاد ترجمہ ہوگا کہ "اہلِ مصر اپنے مالک آپ ہیں، نکہ تیرے غلام و رعیت اے فرعون!" یا بالفاظِ دیگر "مصر مصریوں کے لئے ہے"!

خود عرب کی قرنِ اول کی اسلامی تاریخ بھی ان نظائر سے خالی نہیں، جو چشم بد دور "دیدہ ور" اقبال کو نظر نہیں آتے! قادسیہ کے فیصلہ کن معرکۂ مابین اسلام و زرتشتیت کے لمحۂ موت و حیات پر، حضرتِ فاروقِ اعظمؓ کی یہ کیا کوئی "ملحدانہ سیاست"، یا "اسلام فراموشانہ وطنیت"، یا "ملت فروشانہ قومیت" تھی کہ آپ نے قبائلِ عرب کے ایک ایک خیمے میں یہ صلائے عام پہنچائی تھی کہ:-

"آج عرب و عجم ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں؛ اس لئے اسلامی علم کو عرب کے ایک ایک فرزندِ زمین کی ضرورت ہے! ——— عام اس سے کہ وہ مسلم ہو یا یہودی، یا عیسائی!"

کیا ہمارا "کانگریسی ترنگا جھنڈا" عہدِ خلافتِ راشدہ کے اس "مثلث الالوان" پرچم اسلام کے نمونے سے کچھ مختلف "ڈیزائن" رکھتا ہے جو عمر ابن الخطابؓ نے کارزارِ قادسیہ میں اڑایا تھا؟، اور جو اسلام، یہودیت اور مسیحیت کے مختلف مذہبی ریشوں سے مل کر اک غیر شکستنی "حبل المتین" بن گیا تھا!!

پھر مدینے میں ہجرت فرما ہونے کے بعد ہی پیغمبر اسلام نے اس دار الہجرۃ کے ساکن ——— اور عملاً حاکم و آمر ——— یہود کے ساتھ جو خالص و اخلص "سیاسی و وطنی میثاق" خود اپنے اقدام پر، کیا تھا وہ ہندوستان کے ہنود کے ساتھ کراچی کانگریس والے "اعلانِ حقوقِ اساسی" سے کیا کچھ زیادہ ہے؟ مدینے کے اس "اسلامی یہودی معاہدے" کے بنیادی شرائط یہی تھے کہ (ملخصاً) "باوجود اختلافِ دینی و نزاعِ مذہبی کے ہمارا تمہارا مشترک وطن یثرب ہی ہے! پس اس کی سیاسی حفاظت اور داخلی امن و قانون کی صیانت فریقین کی یکساں غرض و مصلحت ہے، جس کے تحفظ و ذمہ کے مشترک محاذ کو ہم اس دفاعی ائتلاف کا سنگِ بنیاد بناتے ہیں!"

سنتِ نبوی کی اسی روشنی میں فی زماننا مصر و فلسطین وغیرہ اسلامی ممالک کی اسلامی اکثریت اور عیسائی اقلیت نے بے تکلف "میثاقہائے وطنیت" قائم کرلئے، جن کے زیر سایہ ان ہر دو ملکوں کے مسیحی باشندوں نے قوم کے مشترک دشمن، برطانوی حکومت کے خلاف اس کے مذہباً عیسائی ہونے کے علی الرغم، اپنے مسلم رفقائے وطن کے دوش بدوش ویسی ہی دادِ شجاعت دی جیسی کہ "سرحدی گاندھی" خان عبد الغفار خاں کے "سرخپوش خدائی خدمتگاروں" نے کانگریسی علم کے نیچے خدا پرستانہ خدمتِ وطن انجام دے کر اپنی "سرخپوشی" پر "سرخروئی" کو بھی مستزاد کیا! ؎

ز اتفاق بگس شہد میشود پیدا!
خدا چہ لذتِ شیریں در اتفاق نہاد؟

مصر و فلسطین و سرحدِ ہند پر مختلف المذاہب فرزندانِ وطن کی "قومی بُنیانِ مرصوص" کے اندر ایک بھی رخنہ پیدا کرنے سے "تاریخِ بشری کی سب سے بڑی تفرقہ پرداز سلطنت" قاصر رہی ہے۔ حالانکہ خاص ہندوستان جنت نشان کے اندر وہ اِتنی کامیاب ہوئی ہے کہ آج اس بدنصیب سرزمین میں ہندو مسلم مذہبی تفرقات ہم معنی ہوکر رہ گئے ہیں "ہندو مسلم سیاسی فسادات" کے! ـــــ وجہ یہی ہے کہ یہاں کی رائے عامہ کے راہبر "سر" ہیں، اور وہاں کے "سرکف"! یا دش بخیر "سروں" اور خان بہادروں کو جن جگہوں میں "خضرِ راہ" تسلیم کیا جاتا ہو وہاں والوں کی قسمت اگر مُہر زدہ ہوکر رہ جائے تو کیا ہو؟!

ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو!

ستم ظریفی دیکھئے کہ اسی مصر و شام و فلسطین و عراق کے اندر وطنیت کے ظہور کو اقبال اِن ممالک کی سب سے بڑی بدبختی قرار دیتے ہیں، اور اُس پر بُری طرح خون در جگر ہیں! وہ جنگِ عظیم کے دَوران میں ترکی سلطنت کے اِن عرب وِلایات کی بغاوت کی طرف دعوتِ نظر دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں اُن کو اپنے "وطن دشمن فلسفے" پر گویا عین الیقین حاصل ہوگیا ہے! لیکن اگر علامۂ ممدوح تھوڑی سی حکیمانہ دِقتِ نظر سے کام لیتے تو عثمانی خلافت کے یہ حوادث اک دوسری ہی حقیقت نغز کے شاہدِ عادل نظر آتے! ہم واقعات کی تاریخی ناگزیزی سے گُریز نہیں کرسکتے! تُرکی کے عرب صوبجات کی نام نہاد غدّاری دراصل "عثمانی سامراج" کا براہِ راست منطقی نتیجہ تھا! عربی بغاوت، اِسلام کی سیاست و حکومت سے کسی روگردانی و سرتابی کے ہم معنی نہ تھی، بجائے اِس کے اُس کا ہدف مُستبد خاندانِ عثمان کی مجرمانہ غلط کاری، فرض فراموشی، اور عرب پامالی تھی! ممکن کیا مُسلّم ہے کہ اِس نقشۂ بساطِ سیاستِ بین الاقوامی سے یوروپی شاطروں نے خوب ہی فائدہ اُٹھایا، لیکن یہ سمجھنا بڑی گُمراہ تاریخ فہمی ہوگی کہ اُس کی بانی دُسبانی ہی مغربی دسیسہ کاری تھی! البتہ فرنگی عیاری سے اِن ایامِ تاریک کا جو سانحہ منسوب کیا جاسکتا ہے وہ خیر سے ہندوستان کے "فرزندانِ توحید" مسلمان مجاہدین کے وہ "غزوات" تھے جو اُنھوں نے مظلوم ترک سپاہیوں ـــــ نہ کہ اصل ظالم عثمانی سُلطان! ـــــ کی گردن زنی و خون آشامی سے انجام دیئے تھے! اور جس پر "نغمۂ ساربانِ حجاز" الاپنے والے اقبال نے لاہور کے ڈپٹی کمشنر کے دربارِ گہربار میں اک "پیشگی قصیدۂ تہنیتِ فتح" پیش کیا تھا!

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

کیا ہمارے "حسّان الوقت" اور برطانوی شاعرِ قیصریت رُڈیارڈ کپلنگ بالکل ایک دوسرے کے مثیل نہیں؟ د[illegible]!!

پھر یہ بھی صحیح نہیں کہ عربوں کا دَورانِ جنگِ عظیم کا وہ اقدام کوئی زبوں انجام قسمت آزمائی تھی! عثمانی استبداد کے جوئے کو اُتار پھینکدینے کے بعد عرب علاقے انگریزی اور فرانسیسی انتداب کا طوقِ لعنت اِمکاناً نہ پہن سکتے تھے! اور یہ اِنہی یوروپی اُستادوں کے پیدا کئے ہوئے مذاقِ وطنیت کے طفیل میں! انگلستان و فرانس نے جو فائدہ نادانستہ عربوں کو پہنچایا تھا، وہ اک "ٹھوس خدمت" تھی، لیکن جو سیاسی شکار یہ صیادانِ مغرب اِن میدانوں میں کھیلنا چاہتے تھے وہ اک حسرتناک سراب ثابت ہوئے! اور اب جس طرح یہ شکاری بے نیلِ مرام اپنی شکارگاہوں سے ایک ایک کرکے رُخصت ہو رہے وہ اِس حقیقت کا اک مصداق ہے کہ ؎

دمید دانہ و بالید و آنکہ خرمن شد
در انتظارِ ہُما دام چیدہ ام بنگر!

عربی تاریخ کے اِس ماضیٔ قریب کی یہ مثال حقیقتہً اِس قدر وطنیت کے خلاف اِستعمال نہیں کی جاسکتی جس قدر کہ وطنیت کی حمایت میں! اس کا عیاں تاریخی سبق یہی ہے کہ جب ایک دفعہ جذبۂ وطنیت بیدار ہوجاتا ہے تو پھر تمام پُرِ دہائے فریب چاک ہوجاتے ہیں، اور قوم بجز آزادیٔ کامل کے کسی طفل تسلّی سے مطمئن نہیں ہوسکتی! ع

درد بندِ عشق را دارد بجز دیدار نیست!

عربی خطّوں پر مغربی "انتداب" کا دَور بھی اک حکمتِ فطرت اپنے اندر مُضمر رکھتا تھا! عرب وطنیۃ کا بادہ ابھی قدرے خام تھا! "مینڈیٹ" کے عہدِ جبر و قہر نے اس بادۂ خام کو "مئے دوآتشہ" میں تبدیل کردیا! اور یوروپین سرپرستی و سیادت بالائی کی "مینائے نازک" کو خمیر پذیر "تُندیٔ صہبا" نے بالآخر پگھلا ڈالا! ع

خام بُدم، پُختہ شدم، سوختم!

خود تُرکوں کے حق میں بھی یہ ساری عرب تحریک مُبارک ثابت ہوئی! وہ "سامراج" کی لعنت سے نجات پاگئے! اور اسی برکت کا نتیجۂ مابعد یہ ہوا کہ اُن کی اصلی مرز بوم اناطولیہ میں اک خالص جمہوری حکومت قائم ہوسکی! خود بالغ نظر تُرک مُدبّرین نے اس مصلحت پر ثابت قدمانہ اصرار کیا! لاکسین کانفرنس میں جس طرح وہ خالص ترکی علاقوں کی ایک ایک انچ زمین پر صُلح کی اس بزم

کو "رزم" بنا دیتے تھے۔ اسی طرح عربی النسل خطّوں کے ایک ایک چپّے سے بیزاری اُن کی پالیسی کی دوسری خصوصیتِ خاصہ تھی! وہ خطرناک اور مہمل و منقضی المیعاد عثمانی خلافت اور عربی ممالک ہر دو سے دستبرداری، ایک ہی حکمتِ سیاسی کے دو لازم و ملزوم عناصر جانتے تھے! وہ اب خلافتِ عظمیٰ کے "زر دادن و دردِ سر خریدن" کے "مقدس خبط" کو قطعاً اک قصۂ ماضی بنا دینے کا عزم بالجزم کر چکے تھے! ع

مرا بخیر تو امید نیست شر مرساں!

دوسری طرف اِس کا ردِّ عمل بھی عین حسبِ مُراد تھا! عرب لوگ، ترکی منصوبوں سے تمام و کمال مطمئن و امین ہوگئے! اُنھوں نے اپنی تمامتر توجہ مغرب کے نوزائیدہ استعمار و استبداد پر "تیزن" بولنے پر مرکوز کر دی! ترکانِ کمال کی اخلاقی ہمدردی اُن کی پشت پناہ بنی، اور یہ جدید بندِ غلامی جلد پارہ پارہ ہو گیا! ع

من و ساقی بہم سازیم و بُنیادش براندازیم!

ترکوں کے لئے عرب امداد اِس سے زیادہ سرگرم تھی۔ ابتدائی باہمی صُلح و صفائی کے بعد ہی عربوں نے ترکانِ انگورہ کی کشش کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا! چنانچہ یہ ترکی یونانی کشمکش کے دورِ اوّل کی بات ہے کہ عرب مجاہدین نے سرحدِ اناطولیہ کو عبور کیا اور عسکی شہر و سکاریہ کے زہرہ گداز معرکوں میں یونانی دراندازوں کے خلاف اپنے ترک بھائیوں کے عناں بعناں لڑے، اور وہ جان نواز منظر تازہ ہو گیا کہ ع

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک!

یہ وہی عرب تھے جنھوں نے جنگِ عظیم کے لمحۂ نازک پر ترکوں کو "بذا فراق بینی و بینک" کا پیامِ وداع سُنایا تھا! "وطنیت" کے دَور کے دو طرفہ آغاز کے ساتھ ہی، قیصریۂ پرستانہ خلافتِ عثمانی کے عہدِ زبوں کے ترکوں اور عربوں کے درمیان، اک "تجدیدِ اخوت" ظہور میں آگئی! سے

ہو رازِ دل نہ یار سے پوشیدہ یار کا
پردہ جو درمیاں ہو دل کے غبار کا!

الغرض جو شے اک مستقل و مسلسل آیۂ رحمت تھی، علامۂ اقبال اُس کو اک "ملت سوز لعنت" فرماتے ہیں! ع

حیران ہوں کہ شاعرِ قرآں کو کیا ہوا!

اور ابھی اِن سارے گلہائے لعنت کا گُلِ سرسبد باقی ہے! یہ خاص، بلا شرکتِ غیرے "عہدِ وطنیت" کی سعادتِ عظمیٰ ہے کہ مغربی و وسطی ایشیا کی مبنی بر وطن و وابستۂ قوم ریاستوں کا اک سیاسی ائتلاف ——— عملاً اک "اسلامی مجلسِ اقوام" ——— معرضِ ظہور میں آرہی ہے! اور کس کی صدارت میں؟ "ناسخِ خلافت"، وطن پرست، دلدادۂ الحاد و تفریخ مصطفےٰ کمال کی صدارت میں!

خلافتِ عثمانی کے سارے طویل قرون میں ہم اخوۃِ اسلامی کے اِن نادر مناظر کو ترستے ہی رہے! اور اب اُن سے آنکھیں شادکام بھی ہوئیں تو کہاں؟ "دَورِ وطنیت کے کلجگ" میں!

آبِ حیات در تہِ ظلمات یافتیم!

الغرض محبوبِ وطن، اور اُس کی محبوب تر سیاسیات ایسی چیز نہ تھی جو شعراء کی غلط تعبیری اور رتبری طرازی سے مردود و متروک ہو جاتی! روحِ انسان کے صانع سامعے نے اِن توہم کوش بدیاں سرائیوں کو اپنے ایوان میں باریاب کرنے سے اِنکار کر دیا! بجائے اس کے اُس نے وطن نوازی ہی کی "زبانِ خلق" میں "نقارۂ خدا" سُنا، اور اِس جرسِ کارواں کی مسلسل تال پر قدم زن ہوتی ہوئی منزلِ مقصود سے ہم کنار ہوگئی! سے

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت میں روتی چشمِ آدم کب تلک!

اور مستقبل بھی "وطن" ہی کے ہاتھ میں ہے! اک بین الاقوامی "عالمی ریاست" کا جو مطلوبہ نصب العین ہے اُس کا پیش خیمہ بھی وطنیت ہی بننے والی ہے، اور عملاً اُس کی سڑک صاف کر رہی ہے! جو چیز ملعون و مہلک ہے وہ "سامراج" ہے، نہ کہ "سوراج"! اقبال برسوں سے جس چیز سے ڈرتے رہے ہیں اپنے اِس "ہَوّے" کو آج تک پہچانتے تک نہیں! شاید اُن کی "وحشت" نے اُنھیں اِس "شناخت" کا موقع ہی نہیں دیا! جس طرح مخلصانہ فرقہ پرستی بُری نہیں، اور اِس قسم کی مختلف فرقہ پرستیوں کی واقعی شکایات و مطالبات کی رفعداد و ہمسایانی سے ہم اک مضبوط و مربوط قومیت ڈھال سکتے ہیں۔ (بشرطیکہ نمائشی فرقہ نوازی کے نقاب کے نیچے "خود پرستی" کے مکروہ خط و خال نہ ہوں!) اسی طرح مخلصانہ قوم پرستیوں کے اطمینان یافتہ ستونوں سے مجوزہ "عالمگیر ریاستِ انسانی" کا قصر بھی تعمیر کیا جا سکتا ہے! ———

بشرطیکہ اِن ارکانِ عمارتِ عالم میں نہ جاپان کی طرح کا کوئی بر ہمزن عنصر ہو، نہ انگلستان کی مستم کا کوئی سنگِ راہ!

غاصب قیصریتوں سے محروم وطنیتیں ٹکرا ٹکرا کر، اوّل الذکر کی زندگیوں کو برابر دُشوار بناتی رہیں گی۔ تا آنکہ وہ مساوی و معتدل، مریخ و مرنجان قسم کی وطنیتوں کی سطحِ مستوی پر آکر، اور پسماندہ وطنیتوں کو ذرا اُبھار کر، عرصۂ عالم میں اک صالح المزاج اور رقائم الطبیعت عالمی ریاست کے قیام کے لئے زمین ہموار کردیں، اور اس مضطرب اور پُرکرب دُنیا کو یہ شادیانہ گانے کا موقع بخشیں کہ ؎

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید!

(دکشاف)

عیش تکمیلِ صدِ عید نظر آتا ہے
اک قلب اپنا سپاہی نظر آتا ہے
گر پڑی ہے جب خاک کے ذروں پہ نظر
ہر ذرے میں خورشید نظر آتا ہے

بسمل سعیدی ٹونکی

مژدہ ہو جہنم کے سزاواروں کو
اللہ کی رحمت کے پرستاروں کو
دوزخ کو تو لے خوار لیے جاتے ہیں
اب کون جلائے گا گنہگاروں کو

بسمل سعیدی ٹونکی

حسرت ہی ہماری کوئی تو نہ جب نکلی
راحت بھی ملی ہے حق میں مصیبت نکلی
میٹھا تھا بہت دولت کی توقع پہ عظیم
خود وقت کی ہمت آج یہ دولت نکلی

عظیم حسیں آبادی

وہ شام ہے صبح کی عنبر ریزی
ہر سانس میں وہ نور کی رنگ آمیزی
پیغامِ بہار اندری و بیرونی ہے
ہر سمت کی ہوا گلوں کی تیزی

اثر لکھنوی

مزدور کی جوانی

سری نگر (کشمیر) کی ڈل پر ایک تاثر

وادیٔ کشمیر اور پھر ڈل پہ یہ ہنگامِ شام
کشورِ تنویر میں ہے ظلمتوں کا اہتمام

سانگینوں میں نسیمِ شام کے ہے رُوحِ گُل
ہے شمیمِ جانفزا اک بادۂ بے ظرف و جام

چھن رہا ہے آنچلوں سے ابر کے رنگِ سیاہ
پڑ گیا دھیما حسیں موجوں کا بے پروا خرام

ہیں رواں ہر چار سو تاریکیوں کے قافلے
پاسباں بن بن کے سناٹے ہیں مصروفِ خرام

بارسے تاریکیوں کے دب رہی ہے روشنی
کھُل رہی ہے نوعروسِ شب کی زلفِ مشک فام

جُھک گئیں جلوؤں کی پلکیں رُک گئی نبضِ شفق
پڑ گئی محرابِ مغرب پر ردائے تیرہ فام

یہ ہجومِ کوہ یہ سمٹی ہوئی راتوں کے ڈھیر
رُک گئے ہوں جیسے نیلی آندھیوں کے اژدہام

بھاری بھاری تیرگی ہے ہلکی ہلکی روشنی
پھیکے پھیکے سے چمن ہیں مہکا مہکا سا مشام

وقت کے عارض پہ وہ نمکینیاں ہیں الاماں
ہر کنول کا پھول ہے گویا چراغِ بزمِ شام

سو چکے ہیں پتھروں کے بستروں پر زمزمے
نطق کی بستی میں ہے لب بستگی کا اہتمام

یہ شکارے، سانولے خوابوں کی رنگیں کشتیاں
نیم بیداری کے دھارے پر ہیں سرگرمِ خرام

شوخیٔ فطرت میں اندازِ حیا پیدا ہوا
شورشوں سے اک سرودِ بے صدا پیدا ہوا

آہ اس دھندلے سے منظر میں رہینِ انقلاب　　جا رہا ہے اک جواں مزدور با حالِ خراب
وقتِ رفتن پیرہن کی دھجیاں ہلتی ہوئیں　　رہروؤں کے ٹھاٹھ سے کٹتا ہوا زعمِ شباب
جنبشِ مژگاں میں دل کی ناتوانی کا ثبوت　　چینِ پیشانی میں محرومی، تبسم میں حجاب
کرب سے اترے ہوئے بے نور چہرے سے عیاں　　شادمانی سے کنارہ، راحتوں سے اجتناب
پتلیوں کے گرد آنسو رقص سا کرتے ہوئے　　ٹھیس سے چھلکی ہوئی میخانۂ دل کی شراب
دامنِ عسرت میں عہدِ نوجوانی غنچہ ریز　　مفلسی کی گود میں پالی ہوئی روحِ شباب
گرد آلودہ جبیں میں جراتوں کے آئینے　　ہر نفس کی آمد و شد برق و باراں کا جواب
سامنے تقدیر کے تدبیر ہے محوِ سجود　　مطلعِ خاکی کے تارے پر ہے گردوں کا عتاب
بدنصیبی سے خزاں کی زد پہ تھراتا ہوا　　آنکھ کا غنچہ، لبوں کا لالہ، عارض کا گلاب
ہائے چھانٹا ہے کسے مشقِ ستم کے واسطے　　دیدنی ہے گردشِ گردوں کا ذوقِ انتخاب!
یہ بجا رائج ہے آغازِ جہاں سے آج تک　　مکتبِ آلام میں مردانہ سیرت کا نصاب
لیکن اُف یہ موت کا سیلاب اور انساں کا دل　　صرصرِ اندوہ کے جھونکے ہیں اور جانِ حباب

کس طرح کہہ دوں کہ شکوہ آدمی کی بھول ہے
مسئلہ یہ پیشِ اہلِ ہوش نامقبول ہے

احسان دانش

ہندوستان کی جمہوری زبان

امام اکبر آبادی

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

اس دنیا میں زبان کا مسئلہ بھی ایک ایسا مہتم بالشان مسئلہ ہے، جو عالم کی تمام قوموں میں پایا جاتا ہے، اور ہر فاتح نے تسلط کے بعد اس مسئلہ کی نشر و اشاعت میں کافی حصہ لیا ہے۔ نیز ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مفتوح قوم کو اپنی زبان سے آشنا کر دے، تاکہ باہمی تعاون سے ایک دوسرے کے لئے آسانی پیدا ہو اور روزمرہ کی بول چال میں، کاروباری معاملات میں، تہذیب و معاشرت میں مخصوص میلانِ طبع میں، ذوقِ ادب و سیاست میں، ہمزبان و ہم قوم ہونے میں ہمرنگی نظر آئے، اور دوسرے ملکوں کی قوموں سے ایک نوع کا امتیاز حاصل ہو۔ نیز ان کی عادات و خصائص سے واقف ہو سکیں،

یوں تو انسان، خواہ وہ دنیا کے کسی خطے کا رہنے بسنے والا ہو، اور خواہ وہ کسی مرز بوم سے متعلق ہو، بہ لحاظ انسان ایک ہی جنس اور ایک ہی چیز ہے۔ لیکن مختلف الالوانی کے فطری قانون کے ماتحت، انسانی طبائع بھی مختلف ہیں۔ اس طرح جس طرح ایک باغ میں مختلف رنگ کے پھول ہوتے ہیں اور پھول ہونے کی حیثیت سے تمام پھول ہیں۔ پر خواص و الوان میں اختلاف ہوتا ہے، اسی طرح اس دنیا کے باغ میں مختلف النوع انسان ہیں، کہ ایک ملک کا آدمی اپنے جغرافی ماحول کے تاثر سے، دوسرے ملک کے آدمی سے بالکل جدا نظر آتا ہے، اس کے حالات و تخیلات مختلف، حرکات و سکنات مختلف، اشکال و اجسام کی ساخت مختلف، رنگ اور روپ مختلف، لباس و خوراک مختلف، اور زبان و کلام مختلف، حتیٰ کہ اسی اختلاف کی بنا پر دو ملکوں کے دو آدمی مختلف مذاق و مختلف تہذیب نظر آئیں گے۔ اور وہ یکجا رہ کر کبھی لطف و راحت کی زندگی بسر نہیں کر سکیں گے، البتہ ہمزبانی بڑی حد تک ان میں اُنسیت پیدا کر دے گی، ہمزبان ہونے سے ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا احترام کرنا پڑے گا، اور حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی شیرازہ بندی کے لئے یہی ایک واحد و تنہا ذریعہ ہے۔

جس قوم کے پاس اپنی کوئی ایک زبان نہیں، وہ قوم نہیں، بلکہ مفلسوں، مفلوجوں، گونگوں، اور بہروں کا ایک گلہ ہے۔ جو بھیڑیوں کے خواص اپنے اندر رکھتا ہے، جب کبھی کسی قوم کا دورِ ارتقاء شروع ہوا ہے، تو سب سے پہلے اُس نے اپنی زبان ہی کی طرف توجہ کی ہے، تاکہ باہمی اجنبیت دور ہو سکے، جب کبھی ایک ملک کے دو آدمی کسی دوسرے ملک میں حسنِ اتفاق سے ملے ہیں تو ہمزبانی ہی نے اُن کے جذبۂ اخوت و ہمدردی میں تحریک پیدا کی ہے۔ باوجود اس جہل و تعصب کے جو آج ہندوستان میں رونما ہے، اگر یہاں کا ایک ہندو ایک مسلمان کو کسی غیر ولایت میں مل جائے تو وفورِ مسرت سے دونوں کے دل بھر آئیں گے، اور دونوں ہم آغوش ہو کر ایک دوسرے کی دوستی کا دم بھرنے لگیں گے۔

غرضکہ ہمزبان ہونا قوم کے لئے باعثِ رحمت و برکت ہے، اور

اور موجبِ عروج و ارتقا۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر ملک اپنی ایک علیحدہ زبان رکھتا ہے، اور ہندوستان بھی باوجود مختلف مقامی زبانوں اور بولیوں کے، ایک مشترکہ و جمہوری زبان رکھتا ہے، ایسی جو اطرافِ ہند میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اور جس کا نام اردو ہے، یا ہندوستانی، یہی زبان آج سے چند سال پیشتر حکومتِ ہند کی دفتری زبان تھی، اور مغلوں کے زمانۂ حکومت سے لے کر برٹش حکومت تک یہی ملکی زبان سمجھی گئی تھی، اور سمجھی جا رہی ہے۔

لیکن جب سے ہند کی سیاست نے اہلِ ہنود کی ذہنیت میں انقلاب برپا کیا ہے تب سے تنگ خیالی کے باعث، اس زبان کے رسم الخط کو عربی زبان کے مشابہ دیکھکر، مسلمانوں کی مذہبی زبان سمجھ لیا، اور اس لئے اس سے اس کے لفظوں سے اور اس کے حرفوں سے ان کو بوئے خون آنے لگی۔ چنانچہ یہ ہندی رسم الخط کی نشر و اشاعت کی طرف مائل ہو گئے کہ اُن کی نگاہوں میں ناگری رسم الخط سنسکرت کے مماثل ہونے کے علاوہ مذہبی تقدس کی بھی چیز ہے۔

اگرچہ یہ معرکتہ آرا مسئلہ کانگریس کے اہلِ بینش کے پیشِ نظر رہا ہے، اور اہلِ فکر نے اس پر اجتہاد و فیصلہ کن اجتہاد بھی کیا ہے اور چاہا ہے کہ کسی طرح زبان کی اس گتھی کو سلجھایا جائے، چنانچہ جماعتوں کا دل رکھنے کے لئے، یا عارضی مفاہمت کو پیشِ نظر رکھکر بڑی حد تک اس مسئلہ کو حل بھی کیا ہے، یعنی یہ کہ اردو زبان کا نام "ہندی" یا "ہندوستانی" رکھا جائے، یا ہندی اردو دونوں زبانیں ملک میں جاری رکھی جائیں اور غیر ممالک سے انگریزی زبان میں مراسلت کی جائے، گویا ایک ملک میں تین زبانوں کو استعمال کیا جانا کانگریس کے نزدیک عقلمندی، حق، اور انصاف ہے، لیکن میرے نزدیک ابھی تک یہ مسئلہ لاینحل ہے، نہ صرف میرے نزدیک بلکہ آٹھ کروڑ انسانوں کے نزدیک حل نہیں ہو سکا ہے۔

بظاہر اس کے حل میں ایک عارضی مفاہمت و رواداری تو ضرور معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بباطن اس میں فریب کاری، غیر دیانتداری، نا انصافی، اور ہٹ دھرمی اپنا کام کر رہی ہے، یہ سبب ہے مذہبی جنونِ شباب کا۔ جس طرح انسان جنون کی حالت میں نشیب و فراز کو نہیں سمجھ سکتا، اسی طرح ارتقا کا پندار قوتِ انصاف و حق کو زائل کر دیتا ہے۔

بملک ہستی ما رو نہادہ سلطانے
کہ ما بہ صلح دہیم، او بجنگ می طلبد

ظاہر ہے کہ یہ جنگ اردو، ہندی کی نہیں ہے، بلکہ عربی و ناگری رسم الخط کی ہے۔ اگر آج مسلمان عربی و فارسی کے تمام الفاظ نکال کر سنسکرت کے تمام الفاظ اردو زبان میں بھرتی کر لیں، اور رسم الخط اردو ہی رکھیں، تب بھی برادرانِ وطن کو تسکین نہ ہوگی، گویا سیاہ لکیریں بدل دینے سے اُن کے نزدیک چالیس یا ۳۸ کروڑ انسان متحد ہو سکتے ہیں، بصورتِ دیگر نہیں ہو سکتے۔ یعنی اگر آج ہندی رسم الخط اختیار کر لیا جائے تو پھر کوئی جھگڑا باقی نہ رہے، حصولِ آزادی و اتحاد کے نزدیک تو یہ کوئی بڑی اور اہم بات نہیں ہے کہ لکیروں کی صورت بدل دی جائے، بشرطیکہ تبدیل شدہ املا سے کسی زبان کے لفظوں کے معنی مہمل نہ ہو جائیں۔ لیکن اگر معنی کی صورت ہی مسخ ہو جائے تو پھر ایسا کرنا نا ممکن ہے۔ مثال کے طور پر دو چار الفاظ، ہم آواز و مختلف المعانی درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ اگر ذیل کے الفاظ اور اسی قبیل کے سیکڑوں الفاظ جو اردو میں شامل ہیں، ناگری رسم الخط میں لکھے جائیں گے تو یقیناً ان کے معنی کچھ نہ ہوں گے۔ مثلاً

آسی و عاصی۔ اثیر و اسیر۔ عاملہ و آملہ۔ اِن کی آوازیں ایک ہیں، لیکن معنی جداگانہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندی رسم الخط میں، ح۔ ہ۔ ث۔ س۔ ص۔ ع۔ الف۔ ذ۔ ز۔ ض۔ ظ وغیرہ وغیرہ کے لئے الگ الگ حروف نہیں ہیں۔ اگرچہ اس کے املا میں ۳۷ حروف دیجن، ۱۶ حروف سُوَر، اور ۱۶ ماترا یعنی اعراب ہیں۔ اگر ان پر ۵ اُن حروف کا اضافہ کیا جائے جو۔ خ۔ ز غ۔ ف اور ق، کی آوازوں کے لئے نقطے لگا کر بنائے گئے ہیں، تو یہ جملہ (۷۱) حروف ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود اتنے کثیر ذخیرے کے ل۔ ہ۔ اور ن۔ ہ کی مرکب آواز کے کوئی ترکیب نہیں ہے۔ مثلاً کولہو میں لؔ کے ساتھ ہؔ کی مرکب آواز نکلتی ہے، اور لفظ ننھا میں نؔ اور ہؔ کی آواز مرکب ہے۔ لیکن ناگری میں مرکب آواز نہیں نکل سکتی۔ چتر ویدی دوآرکا پرشاد شرما کی ہندی ڈکشنری میں یہ الفاظ اس طرح استعمال ہوئے ہیں کہ کولہو कोल्हू ننھا नन्हा ان سے جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں وہ یہ ہیں۔ کوُل ہو اور نَن ہا اس طرح ان الفاظ کے معنی بالکل مہمل ہو گئے۔ اصل میں ناگری حروف کے ٹکڑے حرف الف اور نون کے ساکن ہونے کو تو بتاتے ہیں۔ لیکن مرکب آواز پیدا نہیں کر سکتے جیسا

مندرجہ بالا الفاظ سے ظاہر ہے۔

دکھلاؤ، بلاؤ، کھلاؤ اور اسی نوع کے ہزارہا الفاظ ہیں، جن کی آوازیں ہمزہ اور واؤ سے ادا کی جاتی ہیں۔ لیکن ناگری میں اس کا کوئی علاج نہیں ہے، سوائے اس کے کہ الف اور واؤ سے لکھا جائے۔

اردو رسم الخط میں عربی و فارسی کے حروف ہونے سے، الفاظ کا کافی ذخیرہ جمع ہوتا رہا ہے، اور ہوتا رہے گا۔

اس کے رسم الخط میں عربی، فارسی اور ناگری کے جملہ حروف ۵۴ ہیں، اگر ان میں اعراب بھی شامل کر لئے جائیں تو مع جزم، تنوین اور تشدید کے چالیس عدد ہوتے ہیں، جو ناگری حروف سے تقریباً نصف ہیں، لیکن دنیا کی کوئی زبان، اور زبان کا کوئی حرف و لفظ ایسا نہیں، جو بآسانی اردو کے سانچے میں نہ ڈھل سکے کسی زبان کا لفظ مفرد ہو یا مرکب، منوّن ہو یا مشدد، ادا کرنے میں اور لکھنے میں کوئی تکلیف اور کوئی رکاوٹ نہیں۔

پھر یہ کہ چونکہ دونوں کے رسم الخط کے حروف کی تعداد میں تقریباً دگنا فرق ہے، لہٰذا اس میں اقتصادی پہلو بھی نکلتا ہے، اور اقتصاد و کفایت شعاری کے لئے دنیا اور دنیا کا ہر فرد جویا ہے، قوموں کی ترتیب میں اور اس کے اصول میں اقتصادیات جزو اعظم ہے۔

اگر ہندی کا ایک مضمون ایک صفحہ پر لکھا جائے گا، تو اردو کے ذریعے وہی مضمون نصف صفحہ پر آ جائے گا۔ اگر ہندی میں ایک مضمون ایک گھنٹے میں لکھا جائے گا تو اردو میں وہی مضمون نصف گھنٹے گا۔ اور دونوں کا رسم الخط پڑھنے میں بھی وقت کا یہی اوسط رہے گا۔ پیسے کی اور وقت کی کفایت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بلکہ قوموں کی بہبودی اور بھلائی کا مدار زیادہ تر انہیں دو چیزوں پر ہے۔

بظاہر ہم آواز حروف غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ مگر املا بدل جانے سے معانی کے اختلاف کا کیا علاج ہے؟ اس نازک و اہم ترین بات کی حامل نہ تو ناگری ہو سکتی ہے، اور نہ رومن۔ حصولِ الفاظ کی فراوانی کا یہ ذریعہ جو اردو کے لئے ہے سب سے زیادہ مفید ہے، اور زبان کے لئے یہ ایک قسم کا زیور ہے۔ مندوق ہمیشہ حق ہی سے لکھا جاتا ہے۔ اب اگر ہم اس کو تق سے لکھنے لگیں تو کون سمجھے گا! پھر اس کے سمجھنے کے لئے جس قدر زمانے کی ضرورت درکار ہوگی اس مدت میں ہم دوسرا کام انجام دے سکتے ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ناگری املا نسبتہً اردو املا کے زیادہ آسان ہے۔ اور ہفتہ عشرہ کی معمولی محنت کے بعد لکھنا پڑھنا آ سکتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ جو لوگ ایسا سمجھتے تھے یا سمجھتے ہیں، وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں، چنانچہ جب ان کو ناگری سے واسطہ پڑا تو حقیقت کا اظہار ہوا، ایسی مثالیں ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں ہیں، کہ جس وقت انھوں نے ناگری سیکھنا چاہی تو بمشکل ہفتے دو ہفتے میں صرف حروف کی شکلیں پہچان سکے، ناموں کے اور خطوں کے لکھنے کے لئے مہینوں کی ضرورت پڑی، ہندی کا ایک خط ہجے کر کر کے اور اٹک اٹک کر پڑھا جاتا ہے۔ لیکن اردو کا خط بآسانی روانی کے ساتھ پڑھ لیا جاتا ہے۔ ناگری رسم الخط سے تو کہیں زیادہ آسان رومن رسم الخط ہے، لیکن ہم آواز حروف کے ساتھ معنی کے تبدیل ہونے کا علاج اس کے پاس بھی نہیں۔ پھر ہندی کا کیا ذکر؟

حال میں میرے پاس کانگرس کمیٹی آگرے کا ایک چھپا ہوا فارم ہندی رسم الخط میں آیا۔ یہ فارم ایگزیکٹو کمیٹی کی ممبری کے داخلے کے لئے تھا، اس میں چونکہ سنسکرت کے الفاظ زیادہ استعمال کئے گئے تھے، اس لئے میں نہیں سمجھا۔ چنانچہ میرے پڑوس میں جو ایک ہندو ماسٹر رہتے ہیں، میں نے ان کو بلایا۔ یہ ایک باقاعدہ اسکول میں ہندی پڑھاتے ہیں۔ جب ان سے کہا گیا کہ اس فارم کو آپ بھر دیجئے، دستخط میں کر دوں گا تو انھوں نے پہلے تو کم از کم پندرہ منٹ تک فارم کی تحریر کو سمجھا، اس کے بعد کہا کہ چونکہ اس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ ہیں اس لئے میں بخوبی نہیں سمجھ سکتا۔ بہر نوع انھوں نے اپنی سمجھ کے موافق نام ولدیت اور سکونت وغیرہ اپنے قلم سے لکھ دیا۔ اس کے بعد جب میں نے دستخط کر کے یہ فارم دفتر کانگرس کو واپس بھیجا تو یہ اس بنا پر ریجکٹ کر دیا گیا کہ فارم غلط بھرا گیا ہے۔

یہ تو روزمرہ کی ہندی کی حالت ہے، لیکن اگر اس کے کلاسیکل لٹریچر پر نظر ڈالی جائے تو وہ اردو لٹریچر کے مقابلہ پر ہیچ ہے، بڑے بڑے ہندی کے انشا پردازوں کے مضامین کا معیار اس درجہ پست ہے کہ اگر آج ایسے مضامین کوئی اردو کا رسالہ پیش کر دے تو شاید یہ ایک نمبر کے بعد بند ہو جائے۔ اس کے چند وجوہ ہیں، ایک یہ کہ اس کے لکھنے والے انگریزی زبان کے بیشتر سند یافتہ ہیں، جن کو انگریزی کے مقابلہ پر اپنی زبان سے مطلق دلچسپی نہیں۔ عدم ذوق کا سبب، عدم صلاحیتِ زبان ہے، اس لئے

کہ ناگری کسی بلند تخیل کی نزاکت کے بار کی متحمل نہیں ہوسکتی، اور انداز بیان میں وہ تنوع پیدا نہیں کرسکتی، جو مختلف اسلوبِ بیان کے لئے ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ عربی وفارسی کی طرح اس میں تصریفی سہولتیں نہیں ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ ہندی کوئی علمی زبان نہیں ہے، بلکہ فرعی زبان ہے، اور ہر فرعی زبان تاوقتیکہ اپنی کسی علمی زبان سے مستفیض نہ ہوگی کبھی مکمل ہی نہیں ہوسکتی۔ سنسکرت سے یہ بخوبی فیضیاب ہوسکتی تھی، لیکن ذات پات کے جھگڑوں نے اُسے اتنی مہلت نہ دی کہ یہ اپنی علمی اصل سے فیضیاب ہوسکتی۔ تواریخ سے یہ ثابت ہے کہ ہندو مذہبی لوگوں نے سنسکرت کے دامنِ دوشیزگی سے کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیا، اور مہاتما و پنڈت اس سے اور اس کے جمالِ باصرہ نواز سے حسبِ دلخواہ فیضیاب ہوتے رہے۔ مولف آبِ حیات نے لکھا ہے کہ :-

"چنانچہ جب (ایرین) نسلوں کی حفاظت کا پورا بندوبست کرچکے تو خیال ہوا کہ شودروں کے ساتھ آٹھ پہر بات چیت، رہنے سہنے، اور لین دین کرنے میں بزرگوں کی زبان دوغلی ہوجائے گی، اس واسطے کہا کہ ہماری زبان زبانِ الٰہی ہے اور الٰہی عہد سے اسی طرح چلی آتی ہے، چنانچہ اس کے اصول وقواعد باندھے اور ایسے جانچ کر باندھے کہ جن میں نقطے کا فرق نہیں آسکتا۔ اصل پاکیزگی نے غیر لفظ کو اپنے دامن پر ناپاک دھبہ سمجھا، اور سوائے برہمن کے دوسرے کی زبان، بلکہ کان تک گزرنا بھی ناجائز ہوا۔"

پھر لکھا ہے کہ

"اسی بنا پر (ایرین) فتح یابوں کی بلند نظری نے اسکا نام سنسکرت رکھا۔ جس کے معنی آراستہ پیراستہ، منزہ ومصفا اور مقدس، جو چاہو سمجھ لو، اِن کے قواعدِ زبان بھی ایسے مقدس ہوئے کہ بزرگانِ دین ہی اسے پڑھائیں تو پڑھائیں، بلکہ اس طرح پکار کر پڑھنا بھی گناہ ہوا کہ شودر کے کان میں بھی آواز نہ پڑے۔ اس کا نام دیو بانی ہوا، یعنی زبانِ الٰہی"

جو کچھ مولف آبِ حیات نے لکھا ہے، یہی مفہوم، ہیم چند لغاتِ سنسکرت کا جامع بھی لکھتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں پراکت زبانیں رائج ہوگئیں۔ اور سنسکرت کے علم سے عوام ہندو محروم رہے، آج سینکڑوں برس کے بعد سیاسی جنون نے ہندو دماغ کو اس طرف بھی متوجہ کردیا ہے۔ لیکن اس کے حصول میں عوام کو جو تکلیف ہوگی اور جس قدر مدت درکار ہوگی وہ ظاہر ہے، تاہم اگر یہ کشاکش اردو کے رسم الخط کو مٹا سکتی ہے، تو ایسا کرنا کوئی دشوار نہیں، لیکن اگر اردو رسم خط مٹانا ناممکن ہے، اور یقیناً ناممکن ہے کہ

"ایں خیالست ومحالست وجنوں"

تو پھر آزادی کے میدان میں، حصولِ آزادی کے لئے یہ رکاوٹ سنجیدگی وانصاف کے خلاف ہے، اور تنگ خیالی کے مرادف، حقیقت یہ ہے کہ تحریر میں، تقریر میں، سلاست وروانی میں، اور انجذاب واستطاعت میں، جو طاقت اردو کو حاصل ہے، وہ ہندوستان کی کسی زبان کو نصیب نہیں، اردو بھی ایک فرعی زبان ہے، لیکن اُس کو اول روز سے تین علمی زبانوں نے نوازا، اور آج تک نواز رہی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے دو زبانوں والے فاتح مسلمان تھے، جن کی مذہبی زبان عربی تھی، لیکن انھوں نے اپنی زبان میں باوجود قرآن کی زبان ہونے کے، اور باوجود مذہبی تقدس کے، کبھی بخل سے کام نہیں لیا، کہ عوام اس سے محروم رہیں، چنانچہ تینوں علمی زبانوں نے نہایت فیاضی ونہایت دلیری کے ساتھ (فیض عام جاری) کردیا، اور تھوڑی مدت میں اردو زبان، الفاظ کی دولت سے مالا مال ہوگئی، دنیا کی شاید ہی کوئی فرعی زبان ایسی ہو جس کو ایک ہی وقت میں تین علمی زبانوں نے نوازا ہو، یہ وجہ تھی، یہ سبب تھا کہ ہندوستان کی جملہ مقامی زبانوں کو پیچھے چھوڑ کر اردو آگے نکل گئی۔ اور باوجود فرعی زبان ہونے کے آج علمی زبانوں کے مدِ مقابل ہے، اس کے مقابلہ میں ہندوستان کی پراکرت زبانیں کیوں پیچھے رہ گئیں؟ صرف اس لئے کہ اُس وقت تک سنسکرت کو ایک عروسِ نو کی طرح سات پردوں میں چھپائے رکھا، لیکن مسلمان فاتحین نے اس علمی دلہن کو دنیا سے روشناس کرایا۔ اگر مسلمان ایسا نہ کرتے تو سنسکرت کا تمام بیش بہا خزانہ کرم خوردہ ہوگیا ہوتا، یہ اردو والوں ہی کا کرم تھا کہ سنسکرت کی جان بچالی، ورنہ اندلس کے عیسائی بادشاہوں کی طرح، جنھوں نے مسلمانوں کے عربی علوم وفنون کا قیمتی خزانہ نذرِ آتش وآب کردیا تھا، یہ بھی کرسکتے تھے۔

(باقی آئندہ)

نصیبن!

وجاہت سندیلوی، بی اے

رات زیادہ جا چکی تھی، مولوی صاحب نے دو گھنٹہ تک اخوت اور مساوات پر دھواں دھار تقریر کی تھی اور سینکڑوں آسمان پھاڑ نعرے بلند کئے تھے، لہٰذا حلق خشک ہو چکا تھا، طبیعت خستہ تھی تھکاوٹ قدم قدم پر بٹھائے دیتی اور پھر بھوک کی شدت سے تو سکرات ہی کا لطف آ رہا تھا۔ راستہ بھر مولوی صاحب نے جلسہ کرنے والوں کو گالیاں دیں کہ کیسے کمبختوں نے چار جلیبیوں پر ٹرخا دیا، گھر پہونچتے ہی مولوی صاحب بڑے زور سے گرجے "نصیبن، نصیبن، کھانا لاؤ" نصیبن شامت کی ماری ذرا غافل ہو گئی تھی، لہٰذا پہلی آواز پر نہیں بولی، اب کیا تھا، مولوی صاحب نے اپنا سارا غصّہ اُسی پر اُتار دیا "حرامزادی، لاٹ صاحب کی بچی بنی ہے، اِدھر شام ہوئی، اُدھر مر رہی، نوکری کرنے چلی ہے، کہ نخرے دکھانے، کیا کچھ تیرے باپ رکھا گئے تھے ہمارے پاس! کام کی نہ کاج کی دشمن اناج کی" وغیرہ وغیرہ، مولوی صاحب اپنا لیکچر دیتے ہوئے بیگم صاحبہ کے پاس پہونچ گئے، بیگم صاحبہ ننھے کو ابھی ابھی سلا کر مُنّے کو دودھ پلا رہی تھیں، مولوی صاحب نے جاتے ہی جاتے پوچھا "پھر تو چُنّی کو کوئی دست نہیں آیا" بجائے اس کے کہ بیگم صاحبہ اس سوال کا جواب دیتیں اُنھوں نے نصیبن کو کوسنا شروع کر دیا، "اس مال زادی نے شام کو پھر ٹھنڈا دودھ پلا دیا اس کو ٹھنڈا دودھ پلا دیا!" مولوی صاحب اپنی جگہ سے ایک بالشت اُچھل گئے۔ "پھر؟" "پھر کیا دو دست اور آ گئے" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"ارے کھانا نہیں لائی ابھی تک حرامزادی، میں دیکھتا ہوں اس کمبخت مال زادی کے تو مزاج ہی نہیں ملتے، آج میں اس کی مرمت کئے بغیر نہ چھوڑوں گا، جان کے پیچھے پڑی ہے بچی کے، ارے کھانا لے چل یا پھر میں آؤں!" مولوی صاحب پھر گرجے،

نصیبن ایک سینی میں کھانا لے کر آ گئی۔ جیسے ہی اُس نے سینی رکھی بیگم صاحبہ نے ڈانٹ بتائی "نہ ہاتھ دھونے کا پانی، نہ تولیہ، بیگم صاحبہ لے کر آ گئیں کھانا"

نصیبن نے مُنھ بسور کر کہا "لئے آ رہی ہوں"

"لئے آ رہی ہوں کی بچی! پہلے سے خیال نہ تھا" مولوی صاحب نے پھر غصّہ دکھایا،

جلدی سے نصیبن پانی اور تولیہ لائی، تو اب صابن کی مانگ پڑی، صابون آیا تو مولوی صاحب اور بیگم صاحبہ نے کھانا شروع کیا۔

"یہ دال میں مرچ کس قدر تیز ہے"

"یہ شوربہ ہے کہ پانی"

"آلو بالکل ہی کچے رکھے ہیں"

مولوی صاحب کھانا کھاتے جاتے اور اُن کا غصّہ تیزی سے بڑھتا جاتا، بیگم صاحبہ بھی اس شعلے کو ہوا دیتی جاتیں، نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی صاحب نے کھانا کھاتے ہی سے اُٹھکر نصیبن کو مارنا شروع کر دیا، "بدمعاش، حرامزادی

کمینی، چوٹی، نمک حرام، دُور ہو، حرام خور!!!

وہ تو کہیئے کہ بیگم صاحبہ کو ترس آگیا، ورنہ مولوی صاحب تو نصیبن کی جان لئے بغیر نہ چھوڑتے۔

خود مار کھاکر، مولوی صاحب اور بیگم صاحبہ کو کھانا کھلاکر اور ان کے لئے خلال، پاندان، اگالدان مہیا کرکے اور حقہ بھر کر آدھی رات کے قریب نصیبن خود کھانا کھانے بیٹھی، چونکہ آج پہلا واقعہ تھا کہ اُس نے مار کھائی تھی، لہٰذا اپنی ذلت اور بیکسی پر اُس کا دل رو رہا تھا، بار بار وہ آنسو پونچھتی لیکن پھر اُس کی آنکھیں بھر آتیں، اور اس کے منھ سے ایک آدھ سسکی نکل جاتی، بڑی مشکل سے اُس نے دو چار لقمے کھائے۔

اپنے پھٹے پرانے بستر پر وہ تنہا بیٹھی بڑی دیر تک کچھ سوچا کی، کئی دفعہ اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ نوکری چھوڑ دے، لیکن فوراً اُس کی آنکھوں کے سامنے تصویر کھنچ جاتی کہ کس طرح اُس کی بہنیں کلّو اور شبّو بھینی سے منتظر ہوتی ہیں، کہ کب وہ روٹی لے کر آئے، اور کب وہ کھانا کھائیں۔ اگر اُس نے نوکری چھوڑ دی .... ؟

گھڑیال نے ایک بجایا۔ وہ جلدی سے اپنے بستر میں گھُس گئی، اُسے پانچ بجے اُٹھ کر مولوی صاحب کو وضو کا پانی دینا تھا، اور پھر کل دن بھر کا کام، برتن مانجھنا، جھاڑو دینا، کھانا پکانا، مسالہ پیسنا، حقہ بھرنا، بچوں کو کھلانا، کپڑے دھونا، پاندان اُٹھانا، اُگالدان لانا، پلنگ اُٹھانا، بچھونے کرنا .... وہ سوچتے سوچتے سوگئی۔

مزدور!

وہ، جس کا گردشِ تقدیر پر کچھ بس نہیں چلتا
وہ جس کی گرم آہوں پر کسی کا بس نہیں چلتا

وہ، جس پر مشکلیں پڑتی ہیں تو آساں نہیں ہوتیں
وہ، جس کے حال پر آنکھیں کبھی گریاں نہیں ہوتیں

وہ، ہر اک سانس جس رنجور کی فریاد ہوتی ہے
وہ، ہستی جو کہ غیروں کے لئے برباد ہوتی ہے

وہ، جس کا زندگی بھر غنچۂ حسرت نہیں کھلتا
عروسِ نو کو بھی جس کی لباسِ نو نہیں ملتا

کڑی محنت کی آنچوں میں جو دن بھر جان کھوتا ہے
وہ جو اکثر گرسنہ زیرِ چرخِ پیر سوتا ہے

کسی کو پاس جس کے درد کا مطلق نہیں ہوتا
جسے آرام و آسائش کا کوئی حق نہیں ہوتا

بناتا ہے جو قصرِ عیش کے دیوار و بام و در
سلاتا ہے جو معصوموں کو اپنے گرم ریتی پر!

رہا کرتی ہے پامالِ خزاں جس کی بہار اکثر
ہلاکِ بیکسی ہوتے ہیں جس کے شیر خوار اکثر

کوئی سنتا نہیں دنیا میں فریاد و فغاں جس کی
بیانِ دردِ دل پر کاٹی جاتی ہے زباں جس کی!

وہ، جس کو سب غریب و بیکس و مجبور کہتے ہیں
اُسی کو اصطلاحِ دہر میں "مزدور" کہتے ہیں

یہی ہے جو قتیلِ خنجرِ سرما بھی ہوتا ہے
یہی ہے جو ہلاکِ شدتِ گرما بھی ہوتا ہے

یہی ہے وہ جو زندہ دفن ہو جاتا ہے کانوں میں
یہی ہے جو کہ کٹ جاتا ہے اکثر کارخانوں میں

اُٹھاتا ہے یہی قوموں پہ جب افتاد پڑتی ہے
بناتا ہے یہی ملکوں کی جب قسمت بگڑتی ہے

یہی ناکام رہ کر کام اک دنیا کے آتا ہے
یہی ذلت گدائی کی بڑھاپے میں اُٹھاتا ہے

مائل نقوی

آج کل

پھر کاروانِ شوق پریشاں ہے آج کل — پھر ذرّہ ذرّہ دشت بداماں ہے آج کل

پھر ہو چلا ہجومِ ہزارِ پریدہ رنگ — گُل پھر چراغِ گورِ غریباں ہے آج کل

پھر زاویہ نگاہ کا بدلا ہوا سا ہے — پھر میں ہوں اور گردشِ دوراں ہے آج کل

پھر آرزوئے مرگِ مفاجات ہے ہمیں — پھر اعتبارِ دوشِ عزیزاں ہے آج کل

ہو جائے پھر بتوں کی حقیقت نہ بے نقاب — دنیا میں پھر نمائشِ ایماں ہے آج کل

یہ مشتِ خاک پھر ہے تماشائے رہگذر — دامن پھر اُن کا میرا گریباں ہے آج کل

پھر آنسوؤں نے حُسن کی گرمی کو کم کیا — پھر دردِ عشق مائلِ درماں ہے آج کل

پھر خرمنِ اُمید پہ ہنستی ہیں بجلیاں — پھر دانہ دانہ شعلۂ رقصاں ہے آج کل

رگ رگ پھڑک رہی ہے بہ اندازِ نغمہ پھر — پھر تار تار ساز کا لرزاں ہے آج کل

پھر چل کے پُوچھ لیں دلِ شوریدہ کا مزاج — قسمت سے بند پھر درِ زنداں ہے آج کل

پھر رنگ و بُو میں جان پڑی دیکھنا بہار — ہر غنچہ، عندلیبِ گلستاں ہے آج کل

پھر چُھپ گیا ہے پردۂ تصویر میں کوئی — پھر جوشِ پرتصوّرِ عُریاں ہے آج کل

پھر جبر و اختیار میں ہے کشمکش تپشؔ
پھر مرگ و زیست دست و گریباں ہے آج کل

شیخ عبداللطیف تپشؔ ایم اے

رفتارِ وقت!

ادارۂ کلیم

ماہ اکتوبر ۳۷ء کے کلیم میں ہم نے یوروپین سیاسیات کی رفتار کا مطالعہ کرتے ہوئے جز ذیل مندرجۂ ذیل خیالات کا اظہار کیا تھا۔

"برطانیۂ عظمیٰ پر مدت سے اک دورِ کہولت و سن شیخوخت طاری ہے! جرمنی و اٹلی گزشتہ نصف صدی سے نوجوانی کا لنگر لنگوٹ کس رہے ہیں! جاپان نہ معلوم کب سے مشرق کی فتح کا پرچم اُڑا رہا ہے۔ امریکہ "ملکۂ بحر" کی شہ نشین سے قبل ازیں انگلستان کو معزول کر چکا ہے! اور پھر شاید "سُرخ روس" تو محفلِ عالم میں اک نو نمو تمدنِ بشری کی دعوت لئے ہوئے مسند نشینِ مجلس بن چکا ہے! ترکی کی "ترکی تمام" ہو جانے کے بعد قسطنطنیہ کا "مردِ بیار" کبھی کا "انگورہ کا مردِ قوی" بن چکا ہے! اور ہاں سرزمینِ ہند و چین پر جو مناظر گزشتہ دیکھنے میں آئے ہیں، اُن کا عنوانِ جلی یہ ہے کہ ؎

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
"ہمالہ کے چشمے" اُبلنے لگے!

پس یہ ہم اہلِ ہند کا خوابِ خرگوش ہی ہے کہ دُنیا کو غدر ۵۷ء کے بعد ساکن سمجھ چکے ہیں! بقول مسولینی کے "تاریخِ عالم چلتے چلتے رُک نہیں گئی ہے! اور انگریز خدانخواستہ "خاتم الاقوام" نہیں ہیں!" ایسی خوش فہمیوں میں انسان اس سے پہلے بھی مبتلا رہا ہے، لیکن بالفاظِ خضرِ مشرق شیخ سعدیؔ کے دریائے دجلہ بدستور ع

پس از خلیفہ بخواہد گزشت در بغداد!

لوحِ تقدیر کبھی کی بے نقاب ہو چکی ہے: اب یہ اک رازِ فاش ہے کہ انگلستان و فرانس کے بعد برِ اعظم یوروپ کی کارواں سالاری جرمنی و اٹلی کو حاصل ہونے والی ہے! "سوویٹ روس" غالباً اک نیم مغربی و نیم مشرقی طاقت کی حیثیت سے اپنے اک جُداگانہ منصب پر قابض رہیگا، اور ہٹلر و مسولینی اپنے عارضی "تخریبی وُجودِ عبوری" کے خاتمے اور برِ اعظم کے میدان کے تخلیئے کے بعد شاید روس کے "پرولتاری عمران کے جوہرِ رواں کے لئے سڑک صاف کرنے والے" ثابت ہوں گے! جدید العہد جرمن اور اطالوی ہماری ہندوستان کی تاریخِ سابق کے مرہٹے اور سکھ بنتے نظر آتے ہیں! در آنحالیکہ برطانیۂ عظمیٰ یا دش بخیر عالمگیر کے بعد کی "سلطنتِ مغلیہ" کے تاریخی ڈرامے کے پارٹ کو کھیلنے والی ہے! جرمنی کا "نازی ازم" اور اٹلی کا "فاسزم" اُس وقت کے مہاراشٹر اور پنجاب کی "قزاقی جنگ" کا عین تاریخی مثنیٰ نظر آتا ہے! شاید موجودہ روس اُس وقت کے انگلستان کی تاریخ کو دوہرائے: اور اِن دوسرے اور تیسرے درجے کے تمام تباہکن عناصر سے مطلع صاف کر کے اک بشری تہذیب کے آفتابِ جہانتاب کے مطلع الانوار کی جلوہ گاہ بنے! ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!"

باوجود سارے نیاز کے ہم اپنے دل میں یہ ناز محسوس کرتے ہیں کہ یہ تاریخِ حاضر کا اک لمبی دَوڑ کی نظر رکھنے والا تبصرہ تھا! اِس تمام دَوران کے واقعات وحوادث اِسی اجمال کی تفصیل نظر آتے ہیں! جرمنی کا تازہ شکار آسٹریا اِسی صورت پذیر تاریخی حقیقت کا اک نوبنو مظہر ہے! جیسا کہ ہم نے ماضیٔ قریب ہی میں لکھا تھا "یورپ میں جو سیاسی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے وہ پورٹ کنڈہ زبان میں یوں ہے کہ براعظم کی "گرسنہ قومیں" وہیں کی شکم سیر سلطنتوں" سے "خوانِ یغما" پر اپنا حصہ مانگ رہی ہیں! لیکن انگلستان اُن کے سامنے کھڑا ہوا "شانتی! شانتی!" کا منتر پڑھ رہا ہے! اُس پر جرمنی و اٹلی زبانِ حال و زبانِ قال دونوں سے اِس "ناصحِ مشفق" سے کہہ رہے ہیں کہ ع

تو بہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند؟!

حملۂ حبشہ کے وقت فرشتۂ امن و قاضیٔ عالم انگلستان کے لنفسِ ناطقہ مسٹر بالڈون، کی محتسبانہ زجر و توبیخ کا جواب "جرائم پیشہ" مسولینی نے خوب دیا تھا (بزبانِ اقبال)

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جُرم — بے طرح بگڑا ہے "معصومانِ یورپ" کا مزاج
میرے سودائے مُلوکیت کو ٹھکراتے ہو تم — تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج؟
آلِ سیزر چوب نے کی آبیاری میں رہے — اور تم دُنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج!
پردۂ تہذیب میں غارتگری، آدم کشی، — کل رَوا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج!

پس انگلستان و فرانس اور جرمنی و اٹلی کے درمیان کا معرکہ کوئی "حق و باطل" کی نزاع نہیں ہے! بجائے اس کے وہ اک مُقابلہ ہے" باطل اور باطل" کا! اِس لئے اِس کا خاتمہ بھی ہٹلر اور مسولینی کے ترکِ عزائم و پرہیزِ جرائم سے نہیں ہوسکتا! اِس کے لئے ضرورت ہے مسٹر چیمبرلین اور موسیو بلم کی قومی سلطنتوں کے اپنا نگلا ہوا اُگلنے کی! یہاں "سابقہ حالت بحال" (Status Quo) کے افسوں سے کام نہ چلے گا، اِس لئے کہ ہر برہمنِ عالمِ آج "بزن و بگیر" کی اک ترکتاز برپا کرکے کل اِس حالت کو "حالتِ سابقہ" کہہ سکتا ہے۔ اور اِس نکتے کے تحت اُس کی "بحالی" کا دعویدار ہوسکتا ہے! پس مختص الوقت ظلم کے جواز کا نظریہ ناقابلِ فہم ہے، ظلم اگر آج ظلم ہے تو کل بھی تھا! بیسویں صدی میں اگر حبش کے حملے، رہائنلینڈ کے دھاوے، آسٹریا کے چھاپے، اور اسپین کے اندر فتنہ پردازانہ ہنگامے کی بنا پر اٹلی اور جرمنی بین الاقوامی قزاق و آتش زن کہلاتے ہیں تو اٹھارویں اور اُنیسویں صدی میں ہندوستان کی تسخیر، سلطنتِ عثمانی کی قطع و برید، تمامی براعظم افریقہ کی تقسیم، اور چین و ایران کے نفاق و شقاق کی ترویج کی پاداش میں، انگلستان و فرانس بھی کسی بہتر سیاسی لقب کے مستحق نہیں ہوسکتے! یا تو کاروبارِ ظلم میں "تمادیِ عارض" نہیں، یا اگر ہے تو "قبضہ، ملکیت، قانونی میں بیش بسے ہے" والی دوسری دستوری نظیر بھی موجود ہے! "شیخ" انگلستان و فرانس کی مذمت و ملامت پر اٹلی و جرمنی کی نوپیشہ "زنانِ فاحشہ" کے پاس بڑا مُسکت جواب موجود ہے، یعنی:

گفتا "شیخا ہر آنچہ گوئی ہستیم — اما تو چنانکہ می نمائی ہستی؟!"

اور پھر تازہ دم و نوخیز ہٹلر و مسولینی کے پاس اُن کا، لاقت نامہ برطانیہ و فرانس کے لئے اِس سے بھی زیادہ دنداں شکن جواب ہے! قانون و قبضہ دونوں اُن کے وکیل ہیں، اور نوشیروانِ انگلستان و فرانس کی طرف سے بین الاقوامی امن و عافیت کی موعظت فرمائی اِس سے کم زُہد فروشانہ مضحکہ خیزی نہیں کہ "نوسو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی؟!"

معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ کم ازکم اپنے اِس "رازِ درونِ پردہ" اور اپنے "رازہائے سینہ گداز" کو سمجھتا ہے! چنانچہ وہ نئے تاریخی راہزنوں سے اموالِ غنیمت کی تقسیم پر آمادہ ہو گیا ہے! یا آخرالذکر کو تازہ تاخت و تاراج پر چشم پوشی کا حق دینے کے لئے تیار ہے! جرمنی سے گذشتہ بحری مفاہمت، حادثۂ حبشہ کی دن دہاڑے "پولٹیکل عصمت دری" پر اُس کا "کا نام بھی ہم دم نہ کشیدم"، فتنۂ ہسپانیہ میں آتش افروزِ فرینکو کے ساتھ راز و نیاز جنبش کے قاتل اور بحر الروم کی وسیع آبی دُنیا کے نقضِ امن کے بانی کار مسولینی سے خلا ملا، آسٹریا کو بیک لُقمۂ تر نگل جانے والے ہٹلر پر "صرف" معذرت بلند ی" کی قسم کی معشوقانہ خشمگینی، پھر عام بین الاقوامی طوائف الملوکی و نادر گردی میں اُس کا نامردانہ سکوت و جمود وغیرہ وغیرہ اِسی نئی تقدیر اقوام پر رضا لقضا ہو جانے کے مسلک کے غماز ہیں!

اور بجز اِس کے کوئی چارۂ کار ہی نہیں! اِس لئے کہ مجلسِ اقوام کے "سیاسی تقوے اور بین الملی احتساب جبر و جرم" کا نعم البدل ایک ہولناک و لرزہ خیز جنگ ہوگی، جس میں سائنس کے ایجاد کردہ آلاتِ مہلکہ سائنس کے تخلیق کردہ تمامی تمدن و عمرانِ انسانی کو خاکستر کر دیں گے!

پس بآثارِ ظاہر ہمارے سامنے دُنیا کے اک نئے سیاسی نقشے اور

جغرافیے کی تدوین ہے: انگلستان کی عملی سیاست کی زبانِ حال سے اس بلیغ، اگرچہ غیر محفوظ، مقولے کی تکرار سنائی دیتی ہے کہ "سب دھن جاتا دیکھئے تو آدھا لیجے بٹائے"!

انگلستان نے اِس "سنگ آمد و سخت آمد" پر بدرجۂ مجبوری اپنا گلا رکھا ہے۔ اِس لئے کہ اُس نے اپنے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے تاریخی حربے کی پوری آزمائش قبل ازیں کرلی ہے۔ اِس کارفرما و فاتح کارآلے کا آخری استعمال ابھی ماضیٔ قریب تک میں ہُوا جبکہ مسٹر چیمبرلین نے اٹلی سے ہر ممکن شرط پر سمجھوتہ کرنے کا منصوبہ کرکے اُسے جرمنی سے توڑلینا چاہا! لیکن بجائے اِس کے کہ مسولینی و ہٹلر ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں، چیمبرلین اور ایڈین کے درمیان "ھٰذا فراق بینی و بینک" کا ماجرا پیش آیا! کیا برطانیہ کا یہ "مارِ دست پرورِ خود" اُس کے لئے اک "مارِ آستین" بن رہا ہے؟! کیا انگریزی ڈپلومیسی "چاہ کن را چاہ درپیش" کی جزائے اعمال سے دوچار رہے؟

اٹلی اور جرمنی کے درمیان ایسے مستحکم اتحاد کی اُمید تو نہ تھی، اِس لئے کہ بعض جزوی اسبابِ تفریق اور بناہائے نزاع اُن کے باہم ضرور موجود ہیں، تاہم وہ جزوی وجذباتی ہی ہیں۔ برِاعظم میں اُن کی عام اقتصادی بینوائی، صلح نامۂ وارسائی کے نتیجے میں اُن کی خارج البلدی، اُن کی نوخیز نسلوں کی جوانی وجولانی کے لئے اُن کے بیرونی مقبوضات کی تنگ دامانی وغیرذٰلک یہ ایسی چیزیں تھیں جنھوں نے اُنھیں مستقبل کا باہم دگر حلیف بنا دیا! ؎

اور ہمدرد کہاں؟ ہو ہنولئے حضرتِ دل

درد اب تم کو ہمارا ہو، تمہارا ہمکو!

اِن عمیق ہمدردیوں کی بناپر دونوں کے درمیان ائتلاف کی اساس بھی اتنی ہی عمیق واقع ہوئی ہے! آج "روم، برلن خطِ سیاسی" پیرس۔لندن "رشتۂ مودّت" سے براصل مستحکم تر ہے! پھر اِس سررشتۂ ائتلاف کی اُس طولانی توسیع نے جس کا نام سیاسی اصطلاح میں "روم، برلن، ٹوکیو محاذ" ہے اک سدِّ سکندری ہی تعمیر کرلی ہے، جس سے ٹکر لینے کے تصور سے بھی عظیم برطانوی قیصریت لرزہ براندام ہے! ——— پس اٹلی و جرمنی کے درمیان کی متوقع رقابت اک اُمیدِ موہوم ہے! اِن ہردو ترکتازوں کے لئے کافی ووافی اموالِ غنیمت موجود ہیں! بیدخل ہونے والے انگلستان و فرانس کی تمامی میراث کے وارث وہی ہوں گے! برطانوی و فرانسیسی سلطنتوں کی ناپیدا کنا پہنائیاں دُور دُور تک اِن دونوں فاتحوں کو بلا کسی ورت وگریبانی کے لبھاسکتی ہیں! لندن اور پیرس ہر رخنہ اندازی سے قریبًا مایوس ہو چکے ہیں!

چنانچہ یہ اک رازِ فاش ہے کہ انگلستان، جرمنی کے مرکوزِ خاطر الحاقِ آسٹریا پر پیشگی مُہرِ تصدیق ثبت کرچکا تھا، بحرالروم کے عالمِ آب پر فرمانروائی کے حقوق میں اٹلی کو برابر کا شریک ماننے کے جانستان مطالبے کو انگیز کرچکا ——— اور نہ معلوم آگے جاکر واقعات کی منطق اور وقت کا حکمِ ناطق اُسے کن کن باتوں پر آمنّا و صدقنا کہنے پر مجبور کرے! ؎

مرا در ارسّد کبریا و منی ……… کہ مُلکش قدیم ست و ذاتش غنی!

اور حکومتوں کے بعد پھر قوموں کا نمبر ہے! کرۂ زمین کی آراضی اتنی تنگ ہے اور جوع الارض کے مریض سامراجوں کی ہوس اتنی بلا نوش واقع ہوئی ہے کہ وہ ساری کی ساری اِن معدودے چند غارتگرانِ اقوام کے لئے کافی نہیں! لیکن اگر یہ صیادانِ بنی آدم باہم مطمئن بھی ہوجائیں تو اِن سے بدرجہا زیادہ عظیم تنقیح مظلوم ومحکوم ومحروم اقوام کی ہے، یہ سارا خاندانِ بشریت کب تک چند آدم زاد درندوں کی "درید و بُرید و شکست و بہ بست" کا تختۂ مشق بنا رہے گا؟ عالمگیر علوم ومعارف اور ہمہ گیر پروپگنڈا نے ساری روئے ارض پر ایک دائم وقائم روزِ روشن قائم کردیا ہے، جس کے سامنے ہر شب گرد نقب زن گریز پائی پر مجبور ہے: الغرض اب وہ وقت وساعت ہے کہ ہم یہ "ترانۂ صبوحی" چھیڑ سکتے ہیں کہ ؎

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند

واندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند!

اِس وقت شر عالمگیر ہوگیا ہے، لیکن وہ "عالمگیر خیر" ہی کا پیش خیمہ بننے والا ہے! یہ سب شرور ایک دوسرے ہی کے خلاف صف آرا ہیں، اور باہمی تصادم وتزاحم سے ہلاک ومعدوم ہوجائیں گے! تمام "سودیانِ" عالم میں اک آفاق گیر "کٹ پٹ" ہے جو اک آفاق گیر "نجات" پر منتج ہوگی!

سینے سے اندھیری راتوں کے چھنتی ہی ضیا انسانوں میں

فطرت کا نظامِ تعمیری ہے گرمِ عمل طوفانوں میں!

رہ جائیں گے قتل وغارت کے اذکار فقط افسانوں میں

تلواریں رکھی جائیں گی پُرہول عجائب خانوں میں!

مٹ جائیں گے نقشے ظلمت کے، آثارِ ضیا رہ جائیں گے

قلعوں کے یہ گنبد سرِ بفلک آنسو کی طرح بہہ جائینگے!
خونریز فضا سے طیارے غاروں میں اُترنے والے ہیں
بستی کے دھویں سے "چپکیلے مینار" اُبھرنے والے ہیں!
کہتا ہے حوادث کو جو بُرا ہمدرد نہیں ہے، ظالم ہے!
دراصل وہ رُوحِ عالم کی ہمت شکنی کا مجرم ہے!

حالات و سیاسیاتِ عالَم کا یہ مطلع ہے، اور ہم اہلِ ہند کس خوابِ خرگوش میں ہیں! بحرِ آرُوم میں ایطالیہ و برطانیہ کی کشیدگی کے اک سابقہ آنی لمحے پر وادیٔ نیل کی پَون کروڑ آبادی نے اپنے ہاں کے "دَورِ فرعونی" کو غرق کردیا! لیکن آج انگلستان کی نامتناہی مشکلات سے ہم ۳۵ کروڑ سے متجاوز ہندوستانی دُنیا کیا فائدہ اُٹھا رہی ہے؟ بجز اِس کے جوابِ باصواب کیا ہے کہ "محرم الحرام" اور "ہولی" کے مشترک عشرۂ مبارک میں ہندو مسلم فسادات برپا کرکے ہم نے پیرزالِ برطانیۂ عظمیٰ کی کمر ہی تھامی ہے!! ہیہات! ہندوستانِ "جنت نشان" اپنا نامۂ اعمال صحیح بیان کرتا ہے جب کہ وہ کہتا ہے کہ:-

نہنگوں کا سمندر ہوں، پتنگوں کا بیاباں ہوں
عدو سے کیا غرض؟ آپس ہی میں دست و گریباں ہوں!
خدا کے فضل سے بدبخت ہوں، بزدل ہوں، نادان ہوں
درِ آقا پہ سر ہے کفش برداری پہ نازاں ہوں!
مری گردن میں ہے طوقِ غلامی پا بجولاں ہوں!

تاہم انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک، ہندوستان کی ناصیۂ قسمت کا اک اخترِ تاباں ہے! یورپ میں ظالم و آدم خوار قوتوں کی باہم آویزی سے جو بادلوں گرد اُڑنے والی ہے، اُس کی نسبت ہم اپنے پاس مشربِ اہلِ سیاست سے کہہ سکتے ہیں کہ ع

تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد!!

مسٹر ایچ، جی، ویلز، نامور مؤرخ تاریخ عالم و بالغ نظر مبصرِ مستقبل کہتا ہے کہ "انسانیت کی بس اب آنکھوں ہی کی سوئیاں نکلنی باقی رہ گئی ہیں! زیادہ سے زیادہ صرف ایک عارضی ہنگامہ آدر بطنِ مستقبل میں نظر آتا ہے، اور اُس کے بعد امن و عدلِ عالَم کا ماہتابِ شب تابِ بشریت کی صبحِ سعادت کے طلوع کا اعلان کردے گا!" سے

رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا — اب لیا چشمۂ بقا تو نے!

(۲) "**فیڈریشن**" کے بارے میں لندن ٹائمز نے اک معنی خیز افتتاحیہ لکھا ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ "برطانوی حکومت کو چاہیئے کہ ہندوستان کے مجوزہ "نظامِ وفاق" کو اپنی موجودہ ہیئت میں اہلِ ہند پر عائد کرنے کے منصوبے کو ترک کردے، سردست اُس کے قیام کو ملتوی کردے، اور اِس اثنا میں ایک وقفۂ مہلت کا اعلان کرے، تاکہ ریاستہائے ہند کے نظم و نسق کے اندر کم ازکم اتنے مبادیٔ جمہوریت پیدا ہوجائیں کہ اُن کے تحت "فیڈرل اسمبلی" میں اُن کے نمائندے ریاستی رعایا کے منتخب شدہ ترجمان ہوں، نہ کہ والیانِ ریاست کی ذاتہائے شاہانہ کے شخصی وکیل!"

فیڈریشن کی مزاحمت میں نیشنل کانگریس نے جس استقامت کی نمائش کی ہے اُس کا یہ ثمرِ اولین ہے! اِس مسئلے کے متعلق مزید قومی مطالبات بھی اِسی پالیسی کے تسلسل و استقلال سے حاصل ہوسکتے ہیں! سے

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حُدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی!

ہم لندن ٹائمز کے اِس فیاضانہ و عاقلانہ اقدام پر اُسے مبارکباد دیتے ہیں، لیکن ٹائمز اپنی عادتِ دیرینہ کے تقاضے سے اک نازیبا کی بات بھی کہہ گیا ہے: وہ یہ کہ کانگریس کو اِس اجمال کی کچھ زیادہ تفصیل پر مُصر نہ ہونا چاہیئے، اس لئے کہ موجودہ نازک بین الاقوامی صورتِ حالات کے اعتبار سے کوئی برطانوی وزیرِ اعظم اِن طویل و لاطائل حرف و حکایات کو سُننے کے لئے فارغ نہیں ہے! بابو سبھاش چندر، کانگریس پریزیڈنٹ نے اِس کا ترکی بہ ترکی جواب دیا ہے، آپ نے فرمایا کہ "حاضرالوقت سیاسیاتِ عالَم ہی تو وہ چیز ہے کہ کوئی برطانوی وزیرِ اعظم بصحتِ نفس و ثباتِ عقل نوجوان ہندوستان کے کسی اہم سیاسی مطالبے کو نذرِ تغافل کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا!" سے

کہسار میں تیشے کی صدا گونج رہی ہے!
اے وائے بریں زمزمۂ عشرتِ پرویز!

(۳) **بنگال** میں آزاد پرجا پارٹی، کرشک پارٹی اور دلت پارٹی کا متحدہ محاذ وزیرِ اعظم کی مابقی عددی طاقت اسمبلی کے خلاف اک چونکا دینے والی سیاسی نشوونما ہے! حد یہ ہے کہ کاؤنسل کا "یورپین گروپ" تک جنابِ فضل الحق کی ڈکٹیٹرانہ حرکات سے بددل ہو رہا ہے! ع

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہوا تھا!

کلکتے میں گاندھی جی کی مقلب القلوب موجودگی، کانگرسی ارباب حل و عقد کے درمیان مسلسل شوریٰ، مختلف سیاسی پارٹیوں کے باہم گفت و شنود اور مناسب توڑ جوڑ کے ممکنات کی تحقیقات، اک نئے مستقبل کی گرم خبریں اور بلیغ آثار ہیں! مسٹر فضل الحق کی سربراہی پر جا پارٹی اک مہیب فریب تھا: عرصے تک ہندو مسلم نفاق، جراثیم پرور فضائے تعصب و منافرت، حکومت اسلامی کے غلاف کاوش کے مشہورہ افسانے۔ مسٹر فضل الحق و سر ناظم الدین کی وزارت کو زندگی کا اک مصنوعی پٹہ بخشتے رہے! لیکن وقت اب باطل کی طبعی عمر سے متجاوز ہو چکا ہے! اور "حق وزارت" اپنی قدرتی موت سے روز بروز نزدیک تر آ رہی ہے: دوسری کاؤنسل پارٹیوں کا اُس سے قطع تعلق، اُن کے جماعتی گنجفۂ سیاست کا بارِ دگر پھینٹا جانا، اور کانگریس کی نیک نام عام اور معتمدِ حلیف و غنیم پارٹی کے زیر سایہ اک نئے ترقی پسند ائتلاف کی تشکیل وغیرہ بنگال کی بساطِ سیاست پر تازہ ترین چالیں ہیں، جو غالباً زیادہ عرصہ گزرنے سے پہلے بار آور ہونے والی ہیں۔

(۴) بنگال ہی کے ہمجوار صوبۂ **آسام** کی غیر کانگرسی وزارت بھی متزلزل واقع ہوئی ہے! اک سابقہ موقعے پر اُس پر کانگرس پارٹی کی طرف سے عدم اعتماد کی تحریک پیش ہونے پر تقسیم آرا کے مخالف و موافق اعداد ۴۹ اور ۵۰ تھے! اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ حکومت غارِ ہلاکت کے عین دہانے پر کھڑی ہوئی ہے! بادِ مخالف کا اک ہلکا سا جھونکا کسی بھی لمحے اُسے سقوط سے دوچار کر سکتا ہے! ع

اگر ماند شبے ماند، شب دیگر نمی ماند!

(۵) **صوبۂ سندھ** میں اک ضمنی انتخاب کی تقریب سے اک کانگرسی مسلمان کا "وزارت پارٹی" کے اک "خان بہادر" حریف کو شکست دینا، اور اُس کے بعد ہی سر غلام حسین ہدایت اللہ کی کابینہ پر اسمبلی کی دوسری پارٹیوں کے مشترکہ ووٹ سے ملامت کی قرارداد کا پاس ہونا اور وزارت کا بالآخر مسندِ حکومت کو خالی کر دینا حیرت خیز سیاسی اُفتادیں ہیں! کاؤنسل کی کانگرس پارٹی کو تشکیلِ حکومت کی دعوت منجانب گورنر اِس کا پیش خیمہ بنی! سندھ کی مجلس قانون ساز میں اگرچہ پارٹیوں کی قوتوں کا موجودہ توازن کانگرس کو ترکیبِ وزارت کی اجازت نہیں دیتا، تاہم آخر کار یہ ساری مضطرب غیر کانگرسی حکومتیں کانگرس ہی کی فطری آغوشِ مادری میں آکر آسودگی و دیرپائی حاصل کریں گی! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری "پولٹیکل سڑکیں" نیشنل کانگرس ہی کی "منزلِ مقصود" کی زائر ہیں!

اس ساری صورتِ حال کی تشخیص ہمیں یہ نظر آتی ہے کہ غیر کانگرسی وزارتیں اک سلبی و منفی حقیقت رکھتی ہیں! اُن کے درمیان کوئی براہِ راست اندرونی رابطہ و رشتہ نہیں ہے! اُن کے ارکان کے آپس میں قدرِ مشترک اور بنائے اتحاد "کانگرس دشمنی" ہے! لیکن ایجابی طور پر وہ رجعت پسند ہیں۔ یا اس سے بھی بدتر یعنی بے اور مستقل اتحاد ناممکن! پھر خود اُنہی کا ہم مذہب ترقی نواز عنصر بھی قدرۃً اُن سے غیر مطمئن رہتا ہے! بالآخر "آشناؤں" کے فریب کی آزمائش کے بعد وہ کانگرس ہی کا رُخ کرتے ہیں، یہ بیت پڑھتے ہوئے کہ ؎

تا بیا ساید دلِ بیتابِ من
بستگی پیدا کند سیمابِ من!

(۶) **شہید گنج** کا سارا ماجرا بھی اک دلچسپ ڈرامہ بنتا جا رہا ہے! جو لوگ رازِ درونِ پردہ سے واقف ہیں ——— اور اب تو یہ راز رُسوائے کوچہ و بازار بھی ہو چکا ہے ——— اُنھیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ پنجاب کی جو وزارت آج اِس قضیۂ نامرضیہ کا شریفانہ و نیاضانہ حل چاہتی ہے، وہی اِس فتنے کو جگانے والی آتش افروزہ ہے! نہ صرف یہ بلکہ مسجد شہید گنج کے "تاریخی مشہد" میں سادہ لوح مسلمانوں کا خونِ ناحق بہا کر اِنھی امواجِ خون پر اپنی خود فروشی کا بجرا چلا کر دہ دارالوزارت کے "ساحلِ مراد" تک پہنچی تھی! لیکن اب چونکہ اِس مہم جہاد فی سبیل اللہ کے "مقاصدِ مقدسہ" حاصل ہو گئے ہیں، اِس لئے اب جو دعوتِ حقہ دی جا رہی ہے اُس کا عنوانِ جلی یہ ہے کہ ع

یاراں فراموش کردند عشق!

تاہم پنجاب کے جاہل و بیخبر عام مسلمان سیاسی لغت کے اِن اسرار کو کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ مسجد شہید گنج کی "بشارت دادہ باز یافت" ہو، یا ایوانِ وزارتِ پنجاب کی کرسیوں پر تمکن، دونوں "مترادف کلمات" ہیں! ؎

قاصد رقیب بود و من غافل از فریب
بیدرد مدعائے خود اندر میانہ ساخت!

لیکن شاید سکندری وزارت اِس قول کو اپنے منطقی نتیجے سے بھی پرے

سے جانا چاہتی ہے کہ "سیاسیات میں کوئی شرافت نہیں ہے"! چنانچہ وہ پوری "شاہانہ شان" سے اپنی رقیب ومبغوض اور کشتۂ نازِ معشوقی، کانگریس پارٹی کے آگے یہ دستِ سوال پھیلاتی ہے کہ "للہ آپ اپنی وسیع المشربی وجگرداری کی لاج کیجئے، اور مسئلۂ شہید گنج کو کسی طرح طے کرا دیجئے! اس بات کو بھول جائیے کہ ہمیں نے گزشتہ انتخاباتِ اسمبلی کے ڈراماٸی لمحے پر وہ فرقہ وارانہ آگ جلائی تھی جس میں مجلسِ احرار اور پنجاب کی کانگریس پارٹی کی کامیابی کے سارے آثار سوخت ہوگئے تھے! اگر ہم اس وقت آپکا گلا کاٹنے سے نہ چوکے تو آپ بھی اپنے جانستان دشمنوں کو تیغِ احسان سے قتیل بنانے سے باز نہ رہئیے! آج ہماری وزارت وحکومت کی سو فیصدی نجات آپ کے ہاتھ ہے، اگرچہ آپ کی اسی "نجات دہندہ جماعت" کے ۹۰ فیصدی ارکان جرائم پیشہ ہیں"!

اگر پنجاب کی کانگریس پارٹی سکندری وزارت کی آگ میں کود پڑتی تو اس کی اس معصومانہ خودکشی پر ہم اس کو اس طرح داد دیتے کہ ؎

آسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر

(ا-ا-خ)

شاعر کی دُعا

قاضی الحاجات! ہم کو بھوک سے کر دے نڈھال
ہو مصائب کی فراوانی سے جینا تک محال

صورتِ شعلہ بھڑک اُٹھیں زمین و آسماں
پیاس کی شدت سے بچے ہوں ہمارے نیمجاں

راکھ کردے خرمنِ ہستی کو برقِ شعلہ زا
آسماں سے بوندیوں کے بدلے برسیں اژدہا

صورتِ منصور سولی پر بھی کھنچوانا ہمیں
ہو اگر خواہش تو انگاروں پہ تڑپانا ہمیں

دست و پا شل ہوں، نظر بیکار اور دل ہو فگار
موت سینے سے لگانے کے لئے ہو بےقرار

بن کے خنجر کاٹ ڈالے آرزوؤں کا گلا
آرہی ہو صحنِ گلشن سے جو بادِ جانفزا

مضطرب آنسو ہوں آنکھوں میں، لبوں پر ہو کراہ
زندگانی پر ہماری موت کا ہو اشتباہ

آبِ دریا ہو لہو یہ بھی ہمیں منظور رہے
ہو غضب آلود تو یہ بھی ہمیں منظور رہے

قاضی الحاجات! لیکن اس دعا کو دے اثر
گر پڑیں طوقِ غلامی گردنوں سے ٹوٹ کر!

ف — سے
الطاف مشہدی

نقد و نظر

سائرہ

"صحیفۂ چین" چھوٹی کتابی قامت، ۴۴۸ صفحات ضخامت، کاغذ و کتابت و طباعت پاکیزہ و عمدہ، مجلد مع مصور و رنگین کاغذ کتاب پوش، قیمت ؏ شائع کردہ: مکتبۂ جامعہ، قرول باغ، نئی دہلی۔

"صحیفۂ چین" نامور چینی حکیم و دینی مقتدی کنفیوشس کی اک اہم تصنیف "شو کنگ" کا ترجمہ ہے، جس میں چین کے شاہی خاندانوں کے مختلف و متعدد نسلوں اور اُن کے جداگانہ اُدوارِ حکمرانی کی تصریح کے علاوہ چینی تمدن و ثقافت، معاشرت و معیشت، اخلاق و آداب کے اصول و ضوابط کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ چینی تاریخ و ادبیات میں یہ کتاب "اُمہات" کی حیثیت رکھتی ہے! عہدِ حاضر کے چین کے انقلابات و سیاسیات و عام حالات کی محرمانہ تفہیم و تعبیر کے لئے اِس قدیم و عتیق ملت و سلطنت کے اِس روایاتی و نفسیاتی "پس منظر" کا ذہن نشین کر لینا اک شرطِ ناقبل ہوگا! جناب سید اسد علی صاحب انوری، فرید آبادی، بی ایس سی، آئی، الیف، ایس نے اِس کتاب کو اُردو میں منتقل کرکے اپنی زبان و ادب کی اک حقیقی خدمت انجام دی ہے۔

ترجمہ قابلِ داد حد تک فصیح و سلیس ہے، اک مترجمانہ جدت ــــ یقیناً اک "بدعتِ حسنہ"! ــــ یہ نظر آتی ہے کہ "شو کنگ" کے بعض متنوں کی نظموں کا ترجمہ بھی منظوم کیا گیا ہے! کتاب کو متعدد ضمیموں سے آراستہ، اور "تا تاریخ مکمل" کر دیا گیا ہے، اور اب اُس کے مطالعے سے چین کے عہدِ عتیق اور اُس کے لمحۂ حاضر کے حالات کے "دونوں ورق" آئینہ ہو جاتے ہیں!

"چینی تاریخ و تہذیب کی قدامت و عظمت کا اک تصور حاصل کرنے کے لئے فاضل مترجم کے دیباچے کا منقولۂ ذیل اقتباس بصیرت افروز ثابت ہوگا:

"غور تو کیجئے! سنہ عیسوی کی ابتدا سے ۲۵ صدیاں پیشتر ہی چین میں فوجداری و دیوانی قانون جاری تھا! شہنشاہ کے ماتحت ۹ وزرا کی اک "کابینۂ وزارت" قائم تھی! ـــــــ برآمد و درآمد کا توازن محفوظ تھا! جہاز رانی و آب پاشی کے لئے دریاؤں اور نہروں کا جال بچھا ہوا تھا! "لوکل گورنمنٹ" کے ادارات موجود تھے! "ٹیکس" کے اصول طے ہو چکے تھے! ادب و موسیقی اور سائنس کے مدارس قائم تھے! شمسی سال کی مدت کا تعین اور جنتری کی تصحیح عمل میں آ چکی تھی! دریائی بند باندھ باندھ کر یانگ تسے اور ہوانگ ہو کے رُخ پلٹ دئے گئے تھے!"

(ز۔ا۔خ)

اقوالِ زرّیں

اس دَور میں جسے لوگ یہ کہیں "فلاں خوب ترقی کر رہا ہے" بے دھڑک اُس کا نام بدمعاشوں کی فہرست میں لکھ لو۔

اے جھوٹے! ایک نہ ایک دن استفراغ ضرور ہوگا، یہ قسمیں تو جو کھاتا ہے سب کی سب ہضم نہیں ہو سکتیں۔

وہ شہرت جو بدی سے پیدا ہو گندی نالی ہے جو بُو کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔

رباعیاتِ اثر

دریا ہوتا ہے، چشمۂ فرقت سے
کھلتی ہے نوائے زخمۂ فرقت سے
بڑھتی ہے تپش روح کی منزل کی طرف
ہوتا ہے فروغ نغمۂ فرقت سے

ہے پھول وہی جس پہ چمن نازاں ہو
ہے مشک وہی جس پہ ختن نازاں ہو
موتی ہے وہی جس پہ عدن نازاں ہو
انساں ہے وہی جس پہ وطن نازاں ہو

ایسا بھی کوئی مضطر و ناشاد نہ ہو
دشمن سے بھی دشمن پہ یہ بیداد نہ ہو
چپ چاپ سہا اور حکمِ صیاد
یہ بس نہ اسیر لب پہ فریاد نہ ہو

زنہار قسم پہ زنگ لگنے پائے
چتون پہ ذرا میل نہ آنے پائے
ملحوظ رہے نفس کی عزت کا لحاظ
سر جائے مگر بات نہ جانے پائے

ھمایوں

(۱) **ھمایوں** اتنا پابندِ وقت ہے کہ جنوری ۲۲ء سے لے کر (جب یہ جاری ہوا تھا) آج تک کبھی اس کی اشاعت میں ایک دن کی تاخیر کبھی واقع نہیں ہوئی، اردو صحافت میں اس سے قبل ایسی باقاعدہ مثال نہیں مل سکتی۔

(۲) **ھمایوں** آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم جج ہائیکورٹ پنجاب کی یادگار کے طور پر ایک مستقل سرمایہ سے جاری ہے۔ اس لئے اس کے ظاہری و معنوی حسن کو برقرار رکھنے کے لئے کسی قسم کی کاروباری مصلحت مدنظر نہیں رکھی جاتی۔

(۳) **ھمایوں** کا اخلاقی معیار اس قدر بلند ہے کہ ملک کا کوئی ادبی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اس میں فحش اشتہارات، عریاں تصاویر اور مخرب اخلاق مضامین اور نظموں کے لئے قطعی گنجائش نہیں۔ یہ رسالہ بلا خطر خواتین کے ہاتھوں میں دیا جاسکتا ہے۔

(۴) **ھمایوں** کی ادارت جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا کے قابل ہاتھوں میں ہے۔ اس کی ترتیب میں مضامین کے محض بلند معیار ہی کا خیال نہیں رکھا جاتا، بلکہ تنوع کا بھی اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہمایوں کا ہر پرچہ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں کے لئے یکساں جاذبِ توجہ ہوتا ہے۔

(۵) **ھمایوں** کے مضامین محض پُر از معلومات ہی نہیں ہوتے، بلکہ انتہا درجے کے دلچسپ بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمایوں آپ اپنی نظیر ہے۔

(۶) **ھمایوں** صحتِ زبان کے لحاظ سے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے مستند ترین رسائل کی صفِ اول میں شمار ہوتا ہے۔

(۷) **ھمایوں** میں علمی و ادبی، تاریخی و تمدنی مضامین، دلکش افسانے اور ڈرامے، پاکیزہ نظمیں، مزاحیہ مقالے، مشرقی و مغربی رسائل کے دلچسپ اقتباسات اور ملک کی موجودہ ادبی تحریکات کے متعلق نہایت بیش قیمت اطلاعات شائع کی جاتی ہیں۔

(۸) **ھمایوں** ملک کے محکمۂ تعلیم کی طرف سے منظور شدہ ہے، ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں بے انتہا مقبول ہے۔

(۹) **ھمایوں** کے کاغذ، کتابت، طباعت اور تصاویر وغیرہ پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔

(۱۰) **ھمایوں** کے سالگرہ نمبر اور دیگر خاص نمبروں کے لئے کوئی زائد قیمت نہیں لی جاتی۔

چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے، مع محصول ہے

خاکسار منیجر رسالہ ہمایوں لاہور

ہندوستان کے مشہور رسالہ کلیم کیلئے دیانتدار اور محنتی ایجنٹوں کی ضرورت ہے

وہ دوائیں جنکا دنیا میں جواب نہیں ہے
نوجیون
جل جلان
جمیلان
طلاء عجیب
طلاء زود اثر
عالیجناب مسیح الملک حکیم جمیل خان صاحب سرپرست ہندوستانی دواخانہ دہلی
کا
وہ نسخہ جس سے ۲ لاکھ مریضان جریان کو ابتک آرام ہوچکا ہے
جریان کا نتیجہ کیا ہے ؟ دل و دماغ و جگر کا کمزور ہوجانا۔ ہاضمہ کا بگاڑ، حافظہ کی خرابی، ہمت کی پستی
طبیعت کی سستی، اولاد سے محرومی، جوڑوں کا درد اور عام ناتوانی، پھر رفتہ رفتہ مالیخولیا یا جنون
یا کوئی سخت بیماری، مثلاً دق وسل وغیرہ، اگر آپ کو جریان کی شکایت ہو تو فوراً توجہ کیجئے آج ہی اس
بیش بہا اور کامیاب دوا کا استعمال شروع کردیجے
جمیلان
مرض جریان کی بہترین اور کامیاب ترین دوا ثابت ہوچکی ہے، جس سے اب تک دو لاکھ
بیماروں نے فائدہ اٹھایا ہے، جریان چاہے پرانا ہوچکا ہو یا نیا ہو ہر حالت میں اس
سے فائدہ ہوجاتا ہے، رفتہ رفتہ دل و دماغ کی کمزوری اور اعضا کا اضمحلال دور ہوکر تندرستی اصلی حالت
پر آجاتی ہے، قبض پیدا نہیں ہوتا۔ بھوک خوب لگتی ہے، غذا اچھی طرح ہضم ہوتی ہے، اور زرد چہرے
پر سرخی جھلکنے لگتی ہے
جریان کی دواؤں میں
جمیلان سب سے بہتر ثابت ہوئی ہے
ترکیب استعمال
دو قرص۔ صبح دودھ کے ساتھ استعمال کریں۔ ترشی، تیل، گڑ اور
ثقیل چیزوں سے پرہیز
قیمت
فی شیشی ۲۲ گولیاں
چار روپے آٹھ آنے
حب ممسک
قرص عجیب
ہندوستانی دواخانہ دہلی

بنام قوت و حیات

کلیم دہلی

منظور شدہ
ڈائرکٹران تعلیم
ریاستہائے میسور، پٹیالہ، وحیدرآباد دکن

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم

آگے گئی صدیوں پہ فسانہ اپنا
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ - چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپیہ آٹھ آنہ

سہ ماہی چندہ دو روپے
قیمت فی پرچہ نو آنے (۹/)

جلد ۵ — نمبر ۵

فہرست مضامین بابتہ ماہ مئی ۳۸ء

اشارات

عہدِ حاضر کی ادبی دنیا کا سب سے بڑا حادثہ

اقبال کی موت

جس وقت ریڈیو نے اقبال کے انتقال کی خبر سنائی، ایک تیر سا دل و جگر کے پار ہو گیا، اور ضبط کی انتہائی سعی کے باوجود میری آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے اُبلنے لگے۔ یہ دیکھ کر حضرت آزاد انصاری نے مجھ سے کہا "آپ کو اقبال کی اب قدر ہوئی"۔ میں نے جواب دیا کہ آزاد صاحب کس روز اقبال میری نگاہوں میں ذی قدر نہ تھا، ہر چند مجھے اس کے مسلک و خیالات سے شدید اختلاف تھا لیکن اس اختلاف کے باوجود مجھے اس کے شاعرانہ کمال اور اس کی مفکرانہ عظمت سے کب انکار تھا۔

اقبال ہر حالت، اور ہر رنگ میں اقبال تھا۔ افسوس کہ ہماری شاعری کا آفتاب غروب ہو گیا۔

اقبال ان لوگوں میں سے تھا جو صدیوں اور قرنوں کی سعی پیہم کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

مت سہل ہمیں سمجھو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے اس کی روش اور اس کے دائرۂ عمل سے شدید اختلاف تھا۔ ابتدا میں ہر عظیم شاعر کی طرح، اقبال کی شاعری بھی وسیع اور آفاقی شاعری تھی۔ اس کی نظر دور رس، اور اس کا سینہ چوڑا تھا، مگر اس کے بعد بعض وجوہ کی بنا پر، اس کی شاعری کا دائرہ تنگ ہونے لگا اور آخرکار یہاں تک تنگ ہو گیا کہ اس کی تمام تر شاعری مذہب تک محدود ہو کر رہ گئی۔

اعتراض یہ نہیں ہے کہ اس نے شاعری کے ذریعہ سے مذہب کی خدمت کیوں کی۔ شکوہ تو صرف اس بات کا ہے کہ اس کے سے عظیم شاعر کی آفاق گیر فطرت نے اپنے کو ایک ہی دائرے میں محدود کر لینے کی پابندی کو کیونکر گوارا کر لیا۔ اس لئے کہ شاعر کے متعلق یہ بات حیرت انگیز بھی ہے، اور عبرتناک بھی کہ وہ حیات کے تمام ناقابل شمار پہلوؤں اور کرۂ ارض کے تمام لاتعداد امور کی طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف ایک ہی کوچے میں پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے۔ شاعر تو بہتا ہوا ہمیشہ بہتا ہوا پانی ہوتا ہے۔ اس کا تو یہ نعرہ مستقل نعرہ ہے۔

در ہیچ مقامم نگزارد بدر رنگے
از بوئے بسوئے برد، از رنگ برنگے

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کس کے منہ میں اتنے دانت ہیں کہ وہ اقبال کی عظمت کا انکار کر دے۔ اقبال شاعر تھا، اور عظیم شاعر۔ اقبال مفکر تھا، اور عظیم مفکر۔

یہ صحیح ہے کہ وہ ایک لیڈر کی حیثیت سے ناکام رہا۔ لیکن یہی ناکامی اس کی شاعرانہ عظمت کی دلیل کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ کوئی شاعر لیڈری کی سی فروتر سطح تک اُتر نہیں سکتا۔

میں ہندوستان کے رعب آفریں اور حیرتناک وسیع براعظم پر اس سرے سے اس سرے تک نگاہ دوڑاتا ہوں۔ مگر کروڑوں کی اتنی زبردست آبادی کے اندر مجھے ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اس بلند پایہ مرنے والے

کی خانہ پری کرسکے ۔

آج اقبال ہمارے درمیان موجود نہیں ہے لیکن جب تک اس دنیا کے کسی گوشے میں علم وادب کا نام باقی رہے گا، اقبال زندہ و پایندہ رہے گا اس کے گیت ایک ملک سے دوسرے ملک تک سفر کرتے رہیں گے۔ اور اس کا نام انسانی ذہن کے افق پر آفتاب کی طرح جگمگاتا رہے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان نے اقبال کو اس کے تمام معصر شعراء سے زیادہ سراہا۔ اور سب سے بڑھ کر اس کی قدر کی۔ لیکن عجیب الخلقت ہندوستان کی قدرشناسیاں محض رسمی اور تفریحی ہوتی ہیں، اور بعض اوقات تو ان کا دائرہ ذاتی تعلقات، یا صوبوی افتخار تک محدود ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اقبال کی مالی حالت تمام عمر خراب رہی، اور بھوپال کے وظیفے کے باوجود وہ ہمیشہ تنگ دست ہی رہا ۔ لیکن اب آسانی کے ساتھ یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ہندوستان اس کی قبر کو زر وجواہر سے پاٹ دے گا۔ محض اس خوشی میں زر وجواہر سے پاٹ دے گا کہ شاعر مرچکا ہے۔

مگر یاد رکھئے یہ تمام ندباشیاں اس کی قبر ہی تک محدود رہیں گی۔ کوئی اللہ کا بندہ بھولے سے بھی یہ دریافت کرنے کی زحمت بیجا گوارا نہیں کرے گا کہ اقبال کے بچے اور اس کے متعلقین شکم سیر ہیں، کہ فاقہ کر رہے ہیں۔ زندہ ہیں کہ مرگئے۔

اقبال بلند مرتبہ اقبال، تو مرگیا، بہت اچھا ہوا کہ تو مرگیا۔ اس کمبخت ملک میں تیری ہستی پلید تھی۔ ہرچند تیری موت نے ہمارے سینوں کو سنسان، اور آنکھوں کو ویران کردیا ہے، مگر خود تیرے حق میں یہ بہت اچھا ہوا کہ تو مرگیا اور مرکر ناقدرشناس غلام ہندوستان کی سرد مہریوں سے تونے نجات حاصل کرلی

میرے دوستو کیا اقبال کی موت کو بھی معمولی موت سمجھ کر ٹال دیا جائیگا؟ کیا اُس عظیم مرتبت انسان کی کوئی یادگار قائم نہیں کی جائے گی؟

محض کسی شخص کا اسٹیچو نصب کردینا، یا اس کی قبر پر کوئی منارہ تعمیر کردینا یا ہر سال مرنے والے کی برسی منا دینا تو کوئی بہتر یادگار نہیں ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ "دائرۂ اقبال" کے نام سے ایک ایسی مستقل انجمن کی بنیاد ڈالی جائے جو ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اپنی شاخیں قائم کرکے ہر جگہ ترجمہ وتالیف اور تصنیف کا کام جاری کردے؟

اس انجمن کی بقا کی سب سے زیادہ آسان صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اردو زبان کے ہر سمجھنے اور بولنے والے پر یہ فرض عائد کردیا جائے کہ وہ اپنی آمدنی میں سے صرف ایک روپیہ فی صدی سالانہ چندہ دیا کرے۔

اگر ہندوستان کے سے وسیع براعظم میں سے جہاں پینتیس کروڑ انسان آباد ہیں، ہمیں صرف پچاس ہزار آدمی ہی ایسے مل جائیں جو ایک روپیہ فی صدی کے حساب سے چندہ دینا شروع کردیں تو اندازہ لگائیے کہ "دائرۂ اقبال" میں کتنی خطیر دولت جمع ہوسکتی ہے۔ اور اس دولت سے ہم اردو زبان کو کس آسانی اور کس حیرتناک سرعت کے ساتھ فروغ دے سکتے ہیں۔ اور اس کے دوش بدوش اقبال کے متعلقین کی کس قدر خدمت انجام دی جاسکتی ہے اور ہر سال بہترین تصانیف پر ہم انعام بھی دے سکتے ہیں۔

فی صدی ایک روپیہ بھی بڑی چیز ہے۔ اگر پچاس ہزار ایسے ہی آدمی مل جائیں جو صرف ایک روپیہ سالانہ چندہ دیں پھر بھی اس دائرے کی آمد فی پچاس ہزار سالانہ ہوسکتی ہے۔ اور پچاس ہزار سالانہ کی رقم بھی اتنی ہے کہ ہم اپنی زبان کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا سکتے ہیں۔

نحوست کے پردے میں سعادت

آج کرۂ ارض کے ہر گوشے، اور ہر مقام پر ایسے ہولناک ہنگامے برپا ہیں، جن کا اس عہد سے پیشتر، اس دنیا نے کبھی تجربہ نہیں کیا تھا۔

ہرچند ہماری یہ دنیا کسی عہد میں بھی ہنگاموں سے خالی نہیں رہی ہے اور حوادث اس شاہراہ سے ہمیشہ گذرتے ہی رہے ہیں۔ لیکن اس دور کے ہنگامے، اور اس زمانے فسادات اپنی نوعیّت وشدّت میں ایسے عجیب مہیب، اور عمومی واقعے ہوئے ہیں کہ تاریخ عالم میں ان کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

اس سے پیشتر بھی فتنے برپا ہوتے تھے۔ اور زمین انسانی خون سے رنگین ہوجاتی تھی۔ مگر وہ تمام بدامنیاں اور خوں فشانیاں چند افراد اور چند مقامات تک محدود رہنے کے باعث وقتی ومقامی ہوا کرتی تھیں۔ اور انھیں تھوڑی بہت سعی کے بعد دبا دیا جاتا تھا۔ لیکن اس بیسویں صدی کے فتنے کی نوعیت ووسعت گذشتہ زمانے کے فتنوں کے مقابلے میں عجیب بھی ہے۔ اور ہولناک بھی۔

عصر حاضر کا فتنہ کسی ایک صوبے، کسی ایک ملک اور کسی ایک قوم تک

محدود نہیں ہے، بلکہ یہ فتنہ تو احاطہ کئے ہوئے ہے ہر بر اعظم کا۔ ہر ملک کا ہر صوبے کا، ہر شہر کا، ہر قصبے کا، ہر گاؤں کا۔ ہر محلّے کا۔ بلکہ ہر گھر اور ہر فرد کا اور اس طرح احاطہ کئے ہوئے ہے، جیسے شدید حبس کے بعد کا پانی سے لدا ہوا طوفانی ابر۔

دنیا میں اس وقت جتنی قومیں بھی موجود ہیں۔ وہ سب کی سب بلا استثنا اس غیر طبعی ذہنی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ جسے جنون کہا جاتا ہے۔

ہر قوم، دوسری قوم کو دیکھ کر دانت نکال رہی ہے، اور ہر ملک دوسرے ملک کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر بھونک رہا ہے۔

جنگ کے بادل، آفاقی جنگ کے بادل قطبین کے درمیان ہر رطب و یابس کو جلا کر خاکستر بنا دینے والی جنگ کے خوفناک بادل اقوام عالم کے سروں پر گھمڑ گھمڑ رہے ہیں۔ اور وہ آخری لمحہ سر پر آ چکا ہے۔ جب طوفانی ہواؤں کی سنسناہٹ اور لرزہ انگیز بجلیوں کی کڑک کے ساتھ پانی دہشتناک جنگھاڑوں کے ساتھ برسنا شروع ہو جاتا ہے۔

اخبار بین طبقے کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس وقت مشرق و مغرب میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ حبش میں کیا ہو چکا ہے۔ آسٹریا پر کیا کچھ بیت چکا ہے۔ عربوں پر کیا کچھ گذر رہا ہے۔ چین و جاپان میں کیا قیامت برپا ہے۔ روس۔ فرانس۔ انگلستان۔ اٹلی اور ٹرکی گھبرا گھبرا کر کس امر کی سرگوشیاں اور کس مہم کی طیاریاں کر رہے ہیں۔ اور ہندوستان کے مستقبل کے باب میں کیا کیا پیش بندیوں کے جال بچھائے جا رہے ہیں۔ اقوام کے سینے اس عبرتناک حد تک تنگ و تار ہو چکے ہیں، اور افراد کی حرص و ہوس کا دامن اس حیرتناک طور سے وسیع ہو چکا ہے کہ انسانیت کی نجات کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کسی پہاڑ کی ایسی پھسلن پر آ گئی ہے جہاں ہر چند کہ ہر شخص اپنی پوری قوت سے پاؤں جما رہا ہے اور زمین کو ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ رہا ہے، لیکن اس تمام سعی کے باوجود جسے دیکھو وہ آہستہ آہستہ پھسلا ہی جا رہا ہے۔

کیا قدرت انسانی نسل سے تنگ آ چکی ہے۔ آدم کے بچوں کو ختم کر دینا چاہتی ہے؟

بظاہر تو ایسا ہی نظر آ رہا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا کے تمام مفاسد کی جڑ ہے جہالت، اور تمام فتنوں کا سرچشمہ ہے علم۔

یہ ایک بہت بڑی حد تک درست ہے۔ لیکن تمام تر درست نہیں ہے اس لئے کہ وہ علم جو انسانی نفس میں محبت و شرافت کے عوض شقاوت پیدا کر کے اُسے منظم قتل عام پر آمادہ کر دے، اس جہالت سے بدتر ہے جس کی بربریت شعور کی بے ترتیبی کے باعث، محدود رہنے پر مجبور رہتی ہے۔

ہنگامے تو دونوں جگہ برپا ہیں۔ مشرق میں بھی، اور مغرب میں بھی۔ لیکن لیکن یہ ایک مزے کی بات ہے کہ مشرق میں ہنگامے برپا ہیں مشرق کی جہالت کی وجہ سے، اور مغرب میں ہنگامے برپا ہیں مغرب کی علمیت کے باعث۔

یعنی اس وقت علم و جہل، دونوں مصروف کار ہیں، اور ہر چند کہ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مگر دونوں ایک ہی مقصد حاصل کرنے کے واسطے دوش بدوش سرگرم عمل ہیں۔ اور دونوں کے نتائج عمل میں حیرتناک ہم آہنگی پائی جا رہی ہے۔

یورپ کی علمیت نے یورپ کو بتایا ہے کہ سیاسی، صنعتی اور تجارتی فروغ کے بغیر کوئی قوم زندہ رہنے کا حق نہیں رکھتی۔ اور جس دن سے یورپ نے یہ بات سمجھ لی ہے، اس کے دامن میں پرورش پانے والی تمام قومیں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے آلات ہلاکت کی طیاریوں میں دیوانہ وار کوششیں کر رہی ہیں۔

ہندوستان کی جہالت نے ہندوستانیوں کے کان میں یہ پھونک دیا ہے کہ مسجد کے سامنے باجا بجنے سے اللہ تعالیٰ کی حرمت میں فرق آ جاتا ہے۔ گائے کے ذبح ہونے سے دیوتاؤں کے گلوں میں نوالے اٹک جاتے ہیں چار یار کی مدح سنتے ہی روحوں میں آبلے پڑ جاتے ہیں۔ اور تعزیوں کا جلوس جب رک جاتا ہے تو ائمہ معصومین سوگواروں کے نام دوزخیوں کے رجسٹر میں درج فرما لیتے ہیں۔ اور جس دن سے ہندوستانیوں نے اس جاہلانہ بکواس کو ایمان سمجھ لیا ہے۔ اس روز سے یہ ایک دوسرے کو لاٹھیوں اور سوڈے کی بوتلوں سے ہلاک کرنے کے واسطے ہر وقت بڑی خوشی سے آمادہ رہتے ہیں

قدرت کے کھیل عجیب ہوتے ہیں۔ وہ جب کوئی آفاقی و عالمگیر تحریک جاری کرنا چاہتی ہے تو اضداد کو اپنا ایجنٹ بنا کر پانی سے بھی وہی کام لے لیتی ہے جو آگ سے لیا کرتی ہے۔ اور علم سے بھی وہی خدمات

انجام و لاتی ہے جو خدمات کے جلیل انجام دیا کرتی ہے ۔

اور یہی وہ مواقع ہوتے ہیں کہ دردمند انسانیت بے تاب ہوکر چیخ اٹھتی ہے کہ:۔

گذرز نحوست و سعادت ، کہ مرا
ناہید مغزہ کشت و مریخ بقہر

بظاہر یہ تمام علامتیں سخت ہولناک ہیں۔ اور اتنی ہولناک ، کہ ان کے تصور تک سے جسم میں لرزہ پیدا ہوجاتا ہے ـــــ لیکن ان خونی آثار کے پس پردہ جو جلوۂ رنگین چھپا ہوا ہے کوئی نہیں دیکھتا۔ اور جو دیکھ لیتا ہے اس کے لبوں پر اس یقین سے تبسم کھیلنے لگتا ہے کہ قدرت کس زبردست حکمت عملی سے کام لے رہی ہے ، اور کس زبردست آپریشن کے ذریعے سے انسانی جسم کے تمام فاسد مادے کو یکسر خارج کردینے کے عزائم پختہ ہو چکے ہیں ۔

یہ عہد حاضر جو توپوں کی گرج سے لرزہ براندام ، اور ہڈیاں تک گھلا دینے والی گیسوں سے تھر تھرا رہا ہے بظاہر کس قدر منحوس معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن بہت کم افراد اس بات پر یقین لائیں گے کہ اور تو اور خود دنیا کے تمام جلیل القدر پیمبروں کے زمانوں کے مقابلے میں بھی یہ زمانہ زیادہ مسعود اور زیادہ مبارک ہے ۔

پیمبروں کے زمانے میں صرف پیمبروں کی ایک ذات ، یا ان کے معتقدین کی ایک قلیل جماعت ہوتی تھی ، جو شر کا مقابلہ کرتی تھی ۔ لیکن آج کائنات کا ہر ذرہ ، خم ٹھونک کر شر کا مقابلہ کرنے کے لئے طیار ہو چکا ہے ۔

پیمبروں کے عہد میں شر کو جو ایک قوی شے ہے ، خیر کے ذریعے سے چیلنج دیا جاتا تھا ۔ جو نسبتاً کمزور چیز واقع ہوئی ہے ۔ اور اسی وجہ سے پیمبروں کے دل میں ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ کاش وہ خیر کے دائرے کو حسب مراد وسیع دیکھ سکتے ۔

لیکن اب قدرت نے تنگ آکر ، اور پرانے تجربات سے فائدہ اٹھا کر شر کا زور توڑ دینے کی خاطر اپنا سب سے بہتر اور آخری حربہ استعمال کرنے کا ارادہ کر لیا ہے ۔ اور وہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کی تمام حریص قوموں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا ہے ۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ قدرت نے شر کی مختلف مقداروں کو کہیں متوازن اور کہیں غیر متوازن صورتوں میں ایک دوسرے کے مقابلے کے لئے لا کر کھڑا کر دیا ہے ۔ اب اگر جنگ ہوگی تو خیر اور شر کے درمیان جنگ نہ ہوگی ، بلکہ خود ایک شر کو دوسرے شر سے ٹکرا دیا جائے گا ۔ اور اس ہولناک دھماکے کے ساتھ ٹکرایا جائے گا کہ شر کے تمام اجزا سفوف بن کر ہواؤں میں اڑ جائیں گے ۔

یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ دنیا کی تمام چھوٹی بڑی قومیں ایک دوسرے کو ذبح کر ڈالنے کی خاطر تلواروں پر سان رکھ چکی ہیں ، اور انسانی تہذیب و ثقافت کو جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں ۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ساتھ ہر قوم تلوار پر ہاتھ ڈالنے سے لرز بھی رہی ہے ۔

کیوں لرز رہی ہے ؟ اس لئے کہ ایک بار تلوار چلتے ہی سب کی موت ایک یقینی چیز ہے ۔

چالاک ، شرارت اپنی موت سے گریز کر رہی ہے ۔

بات یہ ہے کہ یہ چنگیز و ہلاکو کا زمانہ نہیں ہے ۔ جب ایک قوی گروہ دوسرے کمزور گروہ کو بہ آسانی ہضم کر جاتا تھا ۔ اور ایک بیدار جماعت دوسری خوابیدہ جماعت کو اپنا نوالہ بنا لیتی تھی یا ایک چالاک جماعت دوسری بے وقوف جماعت کو ہلاک کر ڈالتی تھی ۔

اب تو وہ زمانہ ہے کہ تقریباً دنیا کی ہر قوم بیدار ، چست ، ہوشمند اور قوی ہو چکی ہے ، اور آسانی کے ساتھ ایک دوسرے کا شکار نہیں بن سکتی ہے ۔

اب جب جنگ ہوگی تو خفتہ و بیدار اور کمزور و قوی کے درمیان نہیں ہوگی ۔ بلکہ بیدار کے مقابلے میں بیدار ۔ چالاک کے مقابلے میں چالاک اور قوی کے مقابلے میں قوی ہتھیار اٹھائے گا ۔

اور ظاہر ہے کہ یہ صورت حالات ہرگز ایسی نہیں ہے کہ کسی منچلی قوم کا کوئی نوجوان کرنیل دیوانہ وار نعرۂ جنگ بلند کرتا ہوا جنگ کی آگ میں کود پڑے ۔

معاملہ اس قدر سنگین اور نازک صورت اختیار کر چکا ہے کہ عقلیں بڑی بڑی باریک ہیں ، اور دقیقہ سنج عقلیں سر بزانو نظر آ رہی ہیں ۔

اگر ایک طرف امن پسند و غیر مسلح شہری ہوں اور ایک طرف امن سوز و مسلح ڈاکو ۔ تو تمام کارروائی آسانی کے ساتھ بخیر و خوبی انجام تک پہنچ جاتی ہے ۔ مگر جب دونوں طرف چور ۔ ڈاکو اور بدمعاش ہوتے ہیں تو اس وقت عقلیں معطل ہو کر رہ جاتی ہیں ۔

اگر اقوام عالم کو جلد ہوش نہ آگیا ۔ اور سیاسی ۔ تجارتی اور صنعتی استیلا کا خیال ترک کرکے انسانیت کے میدان حشر میں عدل و داد کی ترازو بہت جلد نہ کھڑی کر دی ۔ ۔ ۔ ۔ گئی اور تمام زر و گوہر اور تمام پیداوار کو نوع انسانی میں مساوی طور سے تقسیم کر دینے کی کوئی صورت بہت جلد نہ نکالی گئی تو یاد

رکھنا چاہیئے کہ ہماری لاکھوں برس کی تہذیب آنِ واحد میں فنا ہوکر رہ جائیگی ——— میں بین الاقوامی سیاست سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ عدل نہیں کرے گی۔ کیا بازار سب کے لئے مساوی طور سے کھلے نہیں رہیں گے؟ کیا رنگ، نسل، مذہب اور وطن کے تعصبات نہیں بھلائے جائیں گے اور کیا "جیو اور جینے دو" کے اصول پر عمل نہیں کیا جائے گا؟ اور کیا دولت و ذرائع دولت کی مساوی تقسیم سے دلوں کے زخم مندمل نہیں کئے جائیں گے؟

امکان کا دائرہ تو بہت وسیع واقع ہوا ہے۔ ممکن ہے بشریت اپنی اصلاح کرلے لیکن حد سے گزرے حالات سے اندیشہ ہو رہا ہے کہ انسانیت ایک بہت ہی بڑے آپریشن کے بغیر اپنی اصلاح کی طرف مائل نہ ہو سکے گی۔ اور قدرت کو مجبور ہوکر وہ عمل کرنا پڑے گا جو دیکھنے میں نوشقاوت آمیز ہوگا۔ لیکن حقیقت میں اس کے اندر ایک ایسی بے پایاں رحمت ہوگی کہ انسانیت اس وقت تک شکریہ ادا کرتی رہے گی جب تک کہ یہ ننھا سا کرۂ ارض عظیم الشان آفتاب کے گرد رقصاں و غزلخواں رہے گا ——— کیونکہ اس شکست و ریخت کے بعد بگڑی ہوئی انسانیت کی خاک سے ایک ایسا حیرتناک نیا آدم پیدا ہوگا جسے دیکھ کر قدرت کا جذبۂ الوہیت جھومنے لگے گا۔ اور انسانیت کے ماتھے پر الوہیت کا زرین تاج جگمگا اٹھے گا۔

"کلیم" کی زندگی میں سب سے پہلی اپیل

قارئین کرام کو اول تو خود ہی یہ بات معلوم ہوگی، اور اگر نہیں معلوم ہے تو اب ان کی خدمت میں یہ عرض کیا جاتا ہے کہ مدیرِ کلیم کوئی تجارت پیشہ انسان نہیں ہے۔ "کلیم" کو اس نے تاجرانہ نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ وطن عزیز کی خدمت کے لئے جاری کیا ہے۔

"کلیم" کی زندگی کا یہ تیسرا سال ہے۔ اور اس تمام مدت میں ہر ماہ یہ صورت پیش آتی ہے کہ مدیرِ کلیم کو خود اپنی جیب سے ایک کافی رقم صرف کر دینا پڑتی ہے۔

لیکن اب حالات کی نوعیت کچھ ایسی نازک صورت اختیار کر چکی ہے کہ مدیر اپنی جیب پر کوئی مستقل بار ڈالنے کے امکانات سے محروم ہو چکا ہے۔ اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا کہ وہ اپنے قدردانوں کی خدمت میں یہ درخواست کرے کہ ہر خریدار براہ کرم پانچ پانچ خریدار مہیا کرکے "کلیم" کے اجرا میں اس کا ہاتھ بٹائے۔

اگر قارئین کرام کے نزدیک "کلیم" ایک ایسا پرچہ ہے، جسے وطن عزیز کی خاطر زندہ رہنا چاہیے تو پھر ان کا یہ ایک ذاتی کام ہے۔ کہ وہ مندرجہ بالا درخواست پر توجہ مبذول فرمائیں۔ اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہے تو وہ اپنی رائے سے مطلع کریں تاکہ اس سلسلے کو ہمیشہ کے لئے مسدود کر دیا جائے۔

پیرزنِ لیگ

کل رات کو یہ خواب تھا کیا حضرتِ آزاد[1] — آغوش میں ظلمت کے ہے سہما سا اجالا

سہمے سے اجالے میں ہے اک پیرزنِ تند — اوڑھے ہوئے شبہائے جوانی کا دوشالا

یوں گرمِ سخن ہے کہ جو اللہ نے چاہا — کر دوں گی میں اسلام کی دنیا میں اُجالا

ایک بوند میں بہ جائے گی تعمیرِ دو عالم — چھلکے گا مرے صبر کا جس وقت پیالا

ہاں لیگ ہوں اسلام کی دیرینہ مجاہد — ہر بات مری تیغ ہے ہر سانس ہے بھالا

کافر کو جلاتی ہوں سرِ نارِ جہنم — مومن کو عطا کرتی ہوں جنت کا قبالا

آ ہی نہیں سکتا مرے منہ "لا لہٗ" بزدل — میں پاک، وہ ناپاک ہیں گوری ہوں، وہ کالا

کیا اس کا مرا ذکر، وہ دیسی، میں بدیشی — میں مصر کی مسجد، وہ بنارس کا شوالا

گنگا کی ہر اک لہر میں غلطیدہ ہے پستی — دجلے کی ہر اک موج میں رقصاں ہے ہمالا

کفار کے دل، اور مرے چند سپاہی — اعدا کے پرے، اور مرا ایک رسالا

بھڑکوں تو ابھی سینۂ گیتی کو جلا دوں — گرجوں تو ابھی چرخ کو کر دوں تہ و بالا

[1] حضرت آزاد انصاری۔

ہر فردِ حکومت ہے مری آنکھوں کا تارا ہر خان بہادر ہے مری گود کا پالا

اتنے میں اک انگریز نے ایک قصر کے در سے
آہستہ سے پٹ کھول کے سر اپنا نکالا

پیشانیِ گلرنگ پہ کج افسرِ شاہی آنکھوں میں فسوں ہات میں سونے کا نوالا

یہ دیکھتے ہی پیر زنِ لیگ یکایک دوڑی بڑی شفقت سے اٹھائے ہوئے مالا

مالے کو پنھاتے ہی بہ اندازِ محبت چہرے پہ نظر گاڑ کے آنچل کو سنبھالا

اور کہنے لگی پیار سے، لے لے کے بلائیں
"اے نورِ نظر! سلمہ اللہ تعالےٰ!!"

جوشؔ

مجبور ہوں مقہور ہوں، ہنس نہیں سکتا ہوں
ڈستے ہیں قوی الفور، ہٹ نہیں سکتا ہوں
احباب ہیں منہ پھٹ بہ عادات قبیح
واقف ہوں مگر چھیڑ نہیں سکتا ہوں

جوشؔ

جاری ہے بزرگوں کے درمیان گفت و شنود
موضوعِ مکالمات ہے نجابتِ محمود
کھلتی ہوئی کلیوں پہ ہے تنقید و جرح
الزام ہے شبنم پہ کہ ہے اشک آلود

جوشؔ

سرمایہ

فیضی پراچہ

"جو شے وجودِ جنسی کی خرابی یا خلل کے بغیر موڑی کے طور پر جمع یا اکٹھی کی جاسکے اور وقتِ خواہش، خواہشات کی تکمیل میں کام آئے سرمایہ کہلاتی ہے ......"

فیضی پراچہ

دورِ حاضر میں جبکہ انسانی حیات کا فرضِ اولین اور منتہائے مقصد محض "حصولِ زر" ہی رہ گیا ہے اور جبکہ ہر انسان کو اس کے اردگرد، پیسے سے حاصل کردہ، منڈلاتی ہوئی شان و شوکت سے پہچانا جاتا ہے، تو یہ قدرتی بات ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اسی طرف راغب ہو اور اسی کے حصول میں منہمک لیکن اس سالہا سال کے انہاک و رغبت نے جو نتائج پیدا کئے ہیں وہ آج ہمارے سامنے ہیں۔ انسانیت دو عالمگیر گروہوں میں تقسیم ہوگئی ہے، ایک وہ جس نے ماضی میں اپنی تمام تر توجہ حصولِ زر کی طرف مرکوز رکھی، ظلم و استبداد چالاکی و بے انصافی کی تمام کلوں کو کام میں لاکر دولت جمع کی۔ اس پر قابض ہوکر اپنے رعب و وقار کو بڑھایا اور رعب و وقار کے نشے میں مخمور ہوکر جمہور کو دباتا رہا،

دوسرا وہ، جو ان تمام بد دیانتیوں، اور چالاکیوں سے بے خبر قسمت و مقدر پر والہانہ یقین رکھے۔ ان فریب کاریوں کا شکار ہوتا رہا، اپنے خون پسینے سے، تمام تر سادہ لوحی کے تحت، دوسرے کے گھر کی دیوار پر اینٹ گارا لگاتا رہا؛ ایک کی چالاکی اور دوسرے کی سادگی سے یہ عمل تیز رفتاری سے جاری رہا۔ حتیٰ کہ توازنِ معاشرت اس قدر بگڑ گیا کہ ایک کو تو دنیا کی ہر وہ چیز حاصل ہوگئی جس کی ایک انسان تمنا کرسکتا ہے، اور دوسرا اس قدر مفلوک الحال ہوگیا کہ محنت و مزدوری کی اَن تھک کوششوں کے باوجود، ضروریاتِ حیات کی تکمیل سے عاجز رہا۔ اس زمین و آسمان کے فرق نے پسماندہ کے دل میں اعلیٰ کے خلاف شبہات و گمان پیدا کئے۔ فکر و غور کی بلند پروازیوں کے ساتھ ساتھ یہی شبہات حقیقت میں بدلے گئے، اور پسماندہ کو احساس ہونے لگا، کہ "اعلیٰ" کو سب کچھ اس کی "بلند اقبالی" کی وجہ سے حاصل نہیں، بلکہ خود (پسماندہ) کی سعی و محنت سے حاصل ہے، اُس کے اس احساس نے شبہات کو عناد و دشمنی میں بدل دیا۔ اور وہ تمام شد و مد کے ساتھ سرمایہ کے مقابل صف آراء ہوا، اس کے مساوی ہونے کا دعوٰی کیا اور اُسی نظام و تمدن و معاشرت کو یکسر بدل دینے کا مطالبہ کیا، جو سرمایہ دار کو لوٹنے اور جمہور کو لٹنے کے مواقع بہم پہنچاتا ہو۔ سرمایہ دار اپنی طاقت کے زعم میں مخمور، ان چیزوں کو کب برداشت کرسکتا تھا۔ اُس نے اپنی تمام قوت ان جذبات کو دبانے میں صرف کی۔ خدا اور مذہب کے نام کو، کلیساؤں، مساجد، اور مناد میں رہنے والے راہنماؤں کی وساطت سے اپنی مطلب برآری کے لئے استعمال کیا، یہ کشمکش جاری رہی، حتیٰ کہ دنیا کے ایک کونے میں حق و صداقت کو فتح ہوئی، اور روس میں، نیکولس زار کے زیرِ قیادت سرمایہ داروں کے جبر و استبداد کا خاتمہ ہوگیا اور عنانِ حکومت جمہور کے ہاتھ آئی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ "سرمایہ" (زر و سیم) کو انسانی حیات کے ساتھ کہاں تک تعلق ہے، اسکا اجراء ضروری ہے کہ نہیں، اور اس کے بغیر ہم، روزمرہ

کی ضروریات نبھا سکتے ہیں یا نہیں، سرمایہ کی مختصر سی تعریف یہ ہو سکتی ہے "جو شے بس وجہ جنسی کی خرابی یا خلل کے بغیر موڑی کے طور پر اکٹھی کی جاسکے، اور بوقت خواہش خواہشات کی تکمیل میں کام آئے، سرمایہ کہلاتی ہے" کیا ایسے سرمایہ کے بغیر انسانی گزر ہو سکتا ہے؟ فرض کیجئے سونے اور چاندی کو "معیار تبادلہ" کی حیثیت حاصل نہ ہوتی۔ تو کیا سونا اور چاندی بنفسہٖ ہمارے کسی کام آسکتے۔ کیا ان سے حیاتِ انسانی کی کوئی خاص ضرورت پوری ہو سکتی؟ "ضرورت" کا اطلاق آج کل بہت وسیع ہے، دیکھنا یہ ہے کہ انسان کو قدرتی طور پر کیا کچھ ضرورت ہے، اور اس میں کلام نہیں کہ قدرتی ضروریات ہر انسان کی مساوی ہیں، مثلاً انسان کو زندگی کی اعتدالی ہئیت قائم رکھنے کے لئے مندرجہ ذیل اشیاء ازبس لازمی ہیں، اور ان کا ہر ذی روح بغیر امتیاز پست و بالا، امیر و فقیر، مزدور و سرمایہ دار، یکساں طور پر محتاج ہے۔

(۱) خوراک (۲) پوشش (۳) ہوا (۴) باد و باراں سے بچنے کے لئے گھر۔ ان کے علاوہ اگر کسی کے قبضے میں کوئی شے ہے تو وہ ضرورت کو نبھانے کے لئے نہیں، بلکہ تکمیلِ خواہشات کے لئے، فالتو قبضہ ہے، جو قدرتی طور پر اس کا اپنا حق نہیں بلکہ وہ کسی اور کے حق پر قابض ہے، یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ راجہ کا محل بھی تو گھر ہے اس کی نلئے و نوش بھی تو خوراک ہے، اس کا زیب تن بھی تو پوشش ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں صرف اُس چیز کی ضرورت ہے جو حیاتِ انسانی کو اعتدال میں رکھے، جو اس سے بڑھ جائے "فالتو" ہے، اور جو گھٹ جائے "کم" ہے، اس "کم اور فالتو" کے تفاوت ہی نے دنیا میں آگ لگا رکھی ہے۔ انسان، انسان کے خون کا پیاسا ہے، اگر سونے چاندی سے ہمیں دیگر حسبِ خواہش اشیا مہیا نہ ہو سکیں تو سونا اور چاندی بذاتہ ہماری کسی کام کی چیز نہیں۔ اُن سے ہماری کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی، نہ وہ خوراک ہے، نہ پوشش، اور نہ مکان میں استعمال ہونے والی دھات، زیادہ سے زیادہ آج اُن کے وجود سے جو کام لیا جاتا ہے وہ زیورات ہیں، اور زیورات ضرورت کی چیز نہیں۔ یہ محض شان و شوکت اور ملوکیت کے مظاہرات کے کام آتے ہیں، اور یہی وہ مظاہرات ہیں جو بے انصافی و بد دیانتی کو منظرِ عام پر لاکر، نادار، قدرتی ضروریات کے لئے محتاج نادار کے دل پر چوٹ لگاتے ہیں۔ بظاہر اس نکمی شے کو اس قدر ہر دلعزیزی اور مقبولیت کیوں حاصل ہوئی؟

فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ نظامِ قدرت کے صحیح قیام کے لئے جابر پر جابر جماعت کو پیدا کرتی ہے، تاکہ توازن قائم رہ سکے۔ چنانچہ کیڑوں کو لیجئے، مُرغ اور پرندوں کی خوراک ہیں۔ مرغ اور پرند، شہباز اور چیل کا لقمہ ہیں، بکری نباتات میں ملے ہوئے بے شمار حشرات الارض کو کھا جاتی ہے، اور بکری کو شیر کھا جاتا ہے، لیکن ماسوائے حادثات کے یہ انسانی مشاہدے میں نہیں آیا کہ شیر، شیر کے گوشت سے شکم پروری کرے، شہباز، شاہباز کو مار کھائے۔ بلکہ اس کے برعکس دیکھا گیا ہے کہ چیونٹیاں حصولِ خوراک کے لئے تعاون کرتی ہیں، ایک چیونٹی کہیں کچھ دیکھ پائے تو بقیہ ساتھیوں کو خبر کرتی ہے اور وہ بڑے انہماک سے سب مل کر قطار در قطار بار برداری شروع کر دیتی ہیں، یہی حال چڑیوں کا ہے۔ اور اس سے زیادہ سبق آموز منظر اس وقت دیکھنے میں آتا ہے جب ان میں سے انکا کوئی کمزور ساتھی مرجاتا ہے یہ ننھی مخلوق اپنے مردہ رفیق کے جسم کو سنبھالنے میں جس انہماک و سعی کا ثبوت دیتی ہے وہ انہی کا حصہ ہے لیکن انسانی دستور جدا ہے، ان میں سے ہر چالاک و جابر۔ کمزور و ناتواں کے وجود پر اپنی عیش و عشرت کا عالیشان قصر تعمیر کرتا ہے اور اُس قصر کی حفاظت کے لئے خود کمزور و ناتوان کو استعمال کرتا ہے، کمزور و ناتواں کیسے استعمال ہوتا۔ اس کی یہی ایک راہ ہو سکتی تھی کہ اس کی ضرورت کی تمام اشیاء پر قبضہ کر لیا جائے، اور ضرورت کی انتہائی شدت میں اُسے اِس قدر دیا جائے کہ وہ زندہ تو رہ سکے لیکن اس کی ضرورت قطعی طور پر پوری نہ ہو، اور اس داد و ستد کے لئے اسے اپنی مطلب برآری کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس میں مذہب اور خدا کو بڑی حد تک غلط طور پر استعمال کیا گیا۔ عوام الناس کو کہا گیا کہ یہ قدرتی فعل ہے کہ کمزور، طاقتور و توانا کے زیر سایہ اُس کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرے، اور اس دعوے کے جواز میں اوپر تلے ہوئی دلائل پیش کی گئیں اور اس حقیقت سے یکسر انکار کر دیا گیا، کہ ہم جنس، ہم جنس پر ظلم نہیں ڈھاتا، چونکہ کمزوری و توانائی کا تعلق فطری ساخت سے ہے، اس لئے کمزور بیچارا اپنی نافہمی کی وجہ ان نقلی دلائل سے گمراہ ہو کر طاقتور کی چالاکی کا شکار رہتا رہا، اور اس کی سرداری کے آگے جھکتا رہا۔ اور ابتدا میں تقریباً تمام ضروریات بھی قوتِ بازو سے مہیا تھیں۔ مثلاً خوراک شکار کے گوشت سے پوشاک اس کی پوستین سے، اور گھر پہاڑ میں غار کھودنے سے۔

اس لئے بھی قوی و توانا کا بہت حد تک دور دورا رہا۔ جب عقلِ انسانی نے ترقی کی اور شکار کے بجائے زراعت وسیلۂ معاش ٹھہرا، تو اجتماعی محنت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انفرادی طاقت و زور ہیچ ثابت ہوا، چنانچہ اب اسی طاقتور نے اپنی بہبودی اسی میں دیکھی کہ زیادہ سے زیادہ زمین پر قابض ہو جائے، اور اپنی سرداری کو قائم رکھے۔ جوں جوں نسلِ انسانی حیاتِ اجتماعی کی عادی ہوتی گئی، طاقتور کی سرداری بھی کمزور ہوتی گئی۔ زمین کا قبضہ اس کی سرداری کو زیادہ دیر قائم رکھنے میں ممد و معاون ثابت نہ ہوا۔ اب ضرورت تھی کہ کوئی اور طریقہ اختیار کیا جائے، اور وہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ کسی کمیاب دھات کو "معیارِ تبادلہ" قرار دے کر اس دھات پر قبضہ رکھا جاتا، کیونکہ پیداوار (commodity) پر تو قبضہ ہی نہیں ہو سکتا تھا، اگر ہو بھی سکتا تو دیر پا نہیں۔ یہاں سے وہ دور شروع ہوتا ہے جس کے حالات مختلف آثار و قرائن کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہیں۔ دھات کو مستقل طور پر "معیارِ تبادلہ" کی حیثیت کب اور کیسے حاصل ہوئی، یہ ایک تاریخی سوال ہے، اور اس کے حل کے لئے ہمیں ابتدائی دور کی مذہبی کتب کی طرف رُخ کرنا ہوگا۔ یہ کتب ہی اپنے وقت کی بہترین تاریخ ہیں، کیونکہ عام تاریخوں کی طرح یہ محض حالات پر ہی بحث نہیں کرتیں بلکہ اپنے اپنے زمانہ کا قانون، جو معاشرت کا بڑی حد تک ذمہ دار ہوتا ہے بھی پیش کرتی ہیں، ہندو مت کی ہی کتب کو لیجئے، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ زراعت کے ابتدائی ارتقا کے دوران ہی میں خدائی پرستش کا چرچا ہو چکا تھا، اور انسان نے کسی نہ کسی طرح اپنے ہم جنس طاقتور و توانا کے رعب و وقار سے منہ موڑ کر، ایشور کی پرستش شروع کر دی تھی۔ دھات کا استعمال بھی تقریباً اسی دور سے شروع ہوتا ہے لیکن یہ بالکل عیاں ہے کہ ابھی تک دھات کو "معیارِ تبادلہ" کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی، کیونکہ ہندو وقت کی ابتدائی کتب سرمایہ (زر و سیم) کو کسی خاص ایسی بین شکل میں پیش نہیں کرتیں، جیسے کہ بعد کے مذاہب کی کتب صریح و واضح طور پر بیان کرتی ہیں، بلکہ اس کے برعکس مشہور تقسیم فرائض اور جمہور کی چار بڑے گروہوں، برہمن۔ کشتری۔ ویش۔ شودر، میں تقسیم اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اُس وقت تک صرف محنت ہی تکمیلِ ضروریات کا واحد ذریعہ تھی۔ ایک گروہ نے ایک کام کر دیا اور دوسرے نے دوسرا۔ اس طرح سب کا گزر ہوتا رہا۔ یہی وہ زمانہ ہے جہاں سے جسمانی طاقت و توانائی پر مبنی سرداری کا دورِ انحطاط شروع ہوتا ہے۔ اُس زمانے کے چند سکے جو آج کل مختلف جگہوں کی کھدائی سے برآمد ہوئے ہیں بتاتے ہیں کہ اُن کی قدر و منزلت اقتصادی بنا پر نہیں تھی بلکہ اعتقادی وجہ تھی۔

یہ ہڈی تانبے۔ اور لوہے کے ٹکڑوں پر کھدی ہوئی چند مورتیاں ہیں جن پر قیمت درج نہیں۔ ان کے صلے میں جو کچھ ملتا ہوگا وہ اُس محنت کی وجہ جو صناع نے اس پر صرف کی اور خریدنے والے نے اُس مورتی سے عقیدت کی وجہ، جو کہ ان ٹکڑوں پر کھدی ہوئی ہے انھیں خریدا، زر و سیم کے عوض نہیں بلکہ غلہ کھال یا ایسی ہی کوئی اور چیز دے کر۔[1] (تبت میں آج کل بھی یہ رواج عام پایا جاتا ہے، فصل کی کٹائی کے دوران میں صناع کئی قسم کی مورتیاں۔ لکڑی، پتھر، مٹی، تانبے اور پیتل کے ٹکڑوں پر بنا کر لے آتے ہیں۔ جن کا معاوضہ غلہ کے مقررہ وزن کی شکل میں مقرر ہے۔ کسان وہ غلہ دے کر مورتیاں صناع سے تبرک کے طور پر لے لیتا ہے، آج کل اُن پر فصلی سنہ بھی درج ہوتا ہے) ان مورتیوں کی خرید و فروخت اتنی بڑھی کہ عام کا رجحان اسی طرف ہو گیا۔ اب طاقتور کو ایک اور موقع ہاتھ آیا۔ اُس نے دھات پر، جو ان دنوں بہت تھوڑی مقدار میں مہیا ہو سکتی تھی، لوٹ کھسوٹ سے قبضہ کر لیا، اور اُس پر اپنی مورتیاں کھدا کر اجناس اور جانوروں کے عوض اُن کی فروخت شروع کر دی۔ یہی خرید و فروخت انجام کار دھات کے مستقل "معیارِ تبادلہ" کی حیثیت پر منتج ہوئی۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جتنے سکے مروّج ہیں اُن پر بادشاہوں کے بُت منقش ہیں، اور جو جمہوری نظام کے سکے ہیں اُن پر بھی کوئی نہ کوئی بت بنا ہوا ہے۔ اُن بتوں کے معنی یہ ہیں کہ یہ دھات اُن کی ملکیت ہے، جن کا بت اُس کی سطح پر موجود ہے، یہ اُسی ابتدائی، جبر و سطوت اور اظہارِ ملوکیت کے دستور کا اعادہ ہے، جو انسان نے سب سے پہلے اختیار کیا۔ ارتقاء کے ساتھ ساتھ انسان غیر فطری زندگی اختیار کرتا گیا، اعلیٰ و ادنیٰ کی تفریق بڑھتی گئی امیر و غریب کی پہچان ہونے لگی۔ حتیٰ کہ بعد کے مذاہب نے بھی سرمایہ اور سرمایہ دار کے متعلق کوئی نہ کوئی حکم کسی نہ کسی شکل میں پیش کیا۔ انسانیت بھی مذاہب کے عروج کے ساتھ ساتھ

---

[1] چین کے مشہور مورخ سی مانگ نے اپنی کتاب Influence of Gold میں لکھا ہے "انسانی حیات میں دھات کا اولین استعمال سورج پرستی سے شروع ہوا۔ دھوپ اور چاندنی کی ہم رنگ دھاتوں کو ان کے وجود کا حصہ سمجھ کر انسان نے ان کی بہم رسانی کو فعلِ احسن سمجھا اور تسکین قلب کے لئے اپنے پاس اور گھر میں رکھے۔"

اِس مسئلہ کو قضاو قدر سے متعلق مانکر اس سے مانوس ہوتی گئی، اور اس قدر ہوئی کہ پستی کا احساس ہی مٹ گیا۔ لیکن جب کبھی کوئی شے حدِ اعتدال سے بڑھ جاتی ہے، اس کی خوبیاں مٹ جاتی ہیں اور برائیاں منظرِ عام پر آجاتی ہیں، یہی حال "سرمایہ" (سیم و زر) کا ہے۔ جب اس کی مقبولیت حد درجہ بڑھ گئی اخلاق و دیانت کا خون ہونے لگا۔ خود غرضی بڑھ گئی۔ بد دیانتی اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوا، تو یہ خیال پیدا ہوا کہ اِن تمام قباحتوں کی علتِ غائی کیا ہے۔ فکر و غور اور مشاہدات نے ثابت کیا کہ اِن تمام برائیوں کا بڑی حد تک ذمہ دار یہی سرمایہ ہے۔ فرض کیجئے اگر ایک کے پاس سونے چاندی کا انبار ہے اور دوسرا قدرتی ضروریات کے لئے محتاج تو یقیناً محتاج سرمایہ اسے اپنی ضروریات کو نبھانے کے لئے اس کا جمع کردہ سرمایہ چھیننے کی کوشش کرے گا، خواہ اُسے چوری ڈاکہ، قتل، بد دیانتی یا کوئی اور ایسا ہی طریقہ کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ اگر یہی تفاوت مٹ جائے تو یقیناً چور کو چوری۔ ڈاکو کو ڈاکا۔ چالاک کو بد دیانتی۔ زور آور کو قتل اور ضروریات شکم کے لئے زانیہ کو عصمت فروشی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس سرمایہ کے بغیر نظام چل سکتا ہے یا نہیں، یقیناً چل سکتا ہے، آج بھی سرمایہ کے اس مقبولانہ دور میں ہمارے نظام کا بیشتر حصہ زر و سیم کا محتاج نہیں اززراعت ہی کو لیجئے، مالک و مزارعہ کے تعلقات نقد و زر کے لین دین پر نہیں بلکہ محنت اور حاصل محنت کی تقسیم پر ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ زمیندار بے محنت کئے سرمایہ دارانہ نظام کے طفیل دوسرے کی محنت پر عیش اُڑاتا ہے، اور مزارعہ اپنی محنت کے بل بوتے پر زندہ ہے۔ پنجاب کے دیہات میں آج کل بھی جولاہوں، بڑھیوں، لوہاروں۔ موچی اور نائیوں سے کسانوں نے ان کی مزدوری غلہ کی شکل میں مقرر کر رکھی ہے۔ غلہ کی قیمت میں اتار چڑھاؤ کا اس مزدوری پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ موچی اور نائی سارا سال کسان کا کام کرتے رہتے ہیں اور فصل کے موقعے پر اپنا مقررہ غلہ لے لیتے ہیں۔ پنجاب کے ہر گاؤں میں ایک جولاہا آج بھی چار چار گندم کے عوض چار ہاتھ کپڑا بن دیتا ہے۔ کشمیر میں یہ عام رواج ہے کہ سبزیوں کے موسم میں مالنیں سنگھاڑے اور دیگر سبزیاں لے کر گلیوں میں پھیری کرتی ہیں اور پیسوں عوض سودا قطعی نہیں بیچتیں۔ بلکہ خالص دھان اور چاولوں کے عوض فروخت کرتی ہیں۔ یہی دھان انھیں آئندہ کاشت میں بیج کا کام دیتے ہیں۔ راجپوتانہ میں بھی یہ رواج عام ہے۔ بازار میں بیٹھی ہوئی

مالنیں سودا۔ گندم۔ مکی اور جو کے عوض ایسا ہی فروخت کرتی ہیں جیسے نقد کے عوض۔ غرض تمام تر مقبولیت کے باوجود سرمایہ (سیم و زر) اس نظام کو ازسر مٹا نہیں سکا۔ جس کی بنیاد "محنت کا معاوضہ محنت" پر ہے، دورِ حاضر میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ضروریات کی تکمیل کے لئے سونا چاندی یا کوئی اور دھاتی سکہ بہت کم کام آتا ہے۔ بلکہ زیادہ تر ان کا نعم البدل نوٹ ہی استعمال ہوتا ہے۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا جس کی بذاتہ کوئی قیمت نہیں، معیارِ تبادلہ کی حیثیت سے کیسے استعمال ہوتا ہے؟ کیا امپیریل حکومتوں کے پاس اس قدر "ریزرو فنڈ" موجود ہے، جتنے کہ نوٹ رائج ہیں۔ نوٹوں کے مساوی "ریزرو" تو درکنار۔ انکا دس فیصدی بھی ریزرو نہیں۔ پھر یہ کیوں روپیہ کی مساوی حیثیت سے چل رہا ہے، اس لئے کہ اس کی پشت پر حکومت کا وقار ہے اور محض وقار، جبکہ "پرسٹیج" سے ایک ناقص سرمایہ داری نظام کا نوٹ معیارِ تبادلہ کی حیثیت سے چل سکتا ہے تو کیا اُسی "پرسٹیج" سے "پرولیٹریئیٹ نوٹ (Prolatariat note) نہیں چل سکتا۔ جو معاوضہ میں سونا چاندی مہیا نہیں کرے گا، جو اکھٹی کرکے رکھی جاسکے، بلکہ ضروریاتِ روزمرہ کی اشیا محنت کے ذریعے بہم پہنچائے گا، چونکہ امپیریئل نوٹ (constant) مستقل حیثیت رکھتا ہے اور چاندی سونے کی ایک مقررہ تعداد کو پیش کرتا ہے اس لئے اس کا جمع کرنا بھی مفید ہوسکتا ہے۔ لیکن "پرولیٹریئیٹ نوٹ (In constant) غیر مستقل حیثیت کا ہوتا ہے، اور اس مقررہ عرصے کے گزر جانے کے بعد جس کے لئے کہ اس کا اجرا عمل میں آیا ہے بے قیمت ہو جاتا ہے، اور اس کے علاوہ وہ سونا چاندی نہیں بلکہ صرف جنس ہی مہیا کرسکتا ہے، اس لئے اس کا اکھٹا کرنا کسی طرح مفید نہیں ہوسکتا، اور چالاک انسان دوسرے کے حقوق اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکتا۔ جرمنی اور روس کے "امپیریئل کرنسی نوٹوں" کا جو حشر جنگِ عظیم کے بعد ہوا وہ آج ہمارے سامنے ہے ۱۰۰ اسم کا روسی روبل، اور ۱۰۰ مارک کا جرمنی نوٹ صرف چار چار آنے کو بکے، یہی نوٹ جنگِ عظیم سے پہلے، دنیا کی تمام مارکیٹوں میں ایک امتیازی درجہ رکھتے تھے، غرض اگر غور کیا جائے تو دنیا کی تمام برائیوں کا ۷۵ فیصدی ظہور اس سرمایہ کی وجہ سے عمل میں آتا ہے۔ اگر اسی دھاتی "معیارِ تبادلہ" کو اڑا کر تکمیلِ ضروریات کا ذریعہ محض محنت کو قرار دیا جائے تو دنیا میں بہت

حدتک امن وسکون قائم ہوجائے گا۔ اور ایک نا قابل انسان کو محض اس وجہ سے وقار حاصل نہیں ہوگا، وہ کسی نہ کسی طرح دولت پر قابض ہے بلکہ علم اور محنت ہی کا دور دورا ہوگا، اور انسان اپنی ذات اور خدا کے سوا کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں ہوگا۔ سرمایہ داری کا مکمل انہدام ہماری موجودہ مشکلات، بےچینی، بےکاری اور بےروزگاری کا واحد حل ہے،

دلِ محزوں

دلِ محزوں جسے کہتے ہیں، اک سنسان بستی ہے
یہ دُنیا ہے وہ دنیا، جس پہ ویرانی برستی ہے

سرور اس کا فغاں ہے اور نالہ اس کی مستی ہے
لہو پینا پلانا اس کا شغلِ مے پرستی ہے

اگر لیلےٰ کی ہے یہ ہاٹ تو مہنگی سے مہنگی ہے
جو ہے یہ جائدادِ قیس تو سستی سے سستی ہے

یہ سودا بھی عجب سودا ہے بازارِ محبت میں
کہ سب اجناسِ ارزاں میں یہی اک جنس مستی ہے

شرر افشانی، اخگر دامنی، اور آتش اندامی
دھواں اس کی بلندی اور شعلہ اس کی پستی ہے

بھڑکتا ہے ہوا سے، اور بجھ جاتا ہے پھونکوں سے
فنا انجام اس کا، یہ چراغِ راہ ہستی ہے

فنا اس کا قرار اور بے قراری ہے بقا اس کی
اسے بےچین رکھنا عین اس کی سرپرستی ہے

اسی کا درد ہمسایہ ہے، اور ہمدرد بیتابی
جنھیں ہر وقت جوشِ خودسری و خود پرستی ہے

تردد اور تفکر میں سدا حیران و سرگرداں
تغافل نیستی اس کی توجہ اس کی ہستی ہے

کبیدہ آرزوئیں اور مکدر حسرتیں اس کی
تمنا اس کی، ناکامی کا فقرہ اس پہ کستی ہے

ہے وسعت حرص اس کی، اور ہوس اس کی فراخی ہے
قناعت اس کی ناداری ہے، سیری تنگدستی ہے

حریم کلبۂ حزن و ندیم ذاتِ ناکامی
وہ اس کی آرزو ہے جو نکلنے کو ترستی ہے

نہ دا لگ جائے ہلکا سا حرارت کا اگر جھونکا
جھما جھم بادلوں سے آگ پھر اس کے برستی ہے

انی برچھی کی، پر تیروں کے اور ٹوٹے ہوئے نشتر
یہی دو چار چیزیں اس کی ساری گھر گرستی ہے

ابابیلوں کے گھر، زاغ و زغن کے آشیانوں سے
خزاں دیدہ چمن میں اس کے شادابی برستی ہے

عدم اس کا وجود اور ہے وجود اس کا عدم سلطان
یہ ایسی زندگی ہے، زندگی جس کو ترستی ہے

رضیہ سلطان ادیبہ
بھوپال

کامیاب ناکام

محمد خلیق ابراہیم لکھنوی

(۱)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ محبت کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ بعض کہتے ہیں کہ ہوتی تو ہے مگر شاذ۔ میں جو پریم کہانی اس وقت بیان کر رہا ہوں اس میں محبت کامیاب بھی ہوئی اور بہت ہی جلد یہ کامیابی غم و اندوہ میں بھی تبدیل ہوگئی۔ یہ ایک بھڑکتا ہوا شعلہ تھی جس سے کچھ عرصہ تک تو بجلی کی سی نرم رَو، ٹھنڈی اور صاف شفاف روشنی ظاہر ہوئی، لیکن بہت جلد اس کی لطافت ختم ہوگئی اور تیز و تند ہوائیں بھڑکتے ہوئے لال لال شعلے کی گرمی نے دو معصوم دلوں کو پگھلا کر اُن کی زندگیوں کو بھسم کر دیا۔

وہ ایک خوشگوار و دلفریب شام تھی۔ گرمیوں کی پُرفضا شام۔ ہندوستان کی گرمیاں ناقابلِ برداشت ہیں۔ مگر موسم گرما کی شامیں مستی پیدا کرنے والی فضا رکھتی ہیں۔ شانتی نکیتن کے بورڈنگ ہاؤس کے باہر لان (lawns) پر وہ خوش نصیب طالبانِ علم لہلہاتے ہوئے سبزے اور بھینی بھینی خوشبوؤں میں معطر ہلکی ہوا کا لطف اٹھا رہے تھے جو شاعرِ اعظم حکیم ٹیگور سے اسباقِ فطرت کا درس لیتے تھے۔ قریب کی ایک بنچ پر جو چاروں طرف خوشنما پھولوں کی کیاریوں سے گھری ہوئی تھی۔ ایک حسین دوشیزہ نیم وا اپنی سیاہ اور رقیق آنکھوں کو حکیم ٹیگور کی "عرضِ نغمہ"[1] پر جھکائے ہوئے تھی، اُس کے سڈول اور بھرے بھرے جسم کی دلفریبیاں باریک ساری سے پھوٹی پڑتی تھیں، وہ ایک اندازِ استغنا کے ساتھ "عرضِ نغمہ" کا مطالعہ کر رہی تھی، اُسے شانتی نکیتن میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے، جمیلی شانتی نکیتن کا ہونہار طالب علم جو آج ہی چھٹیوں سے واپس آ رہا تھا ٹہلتا ہوا ادھر نکل آیا اور بنچ کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ اندرا کی محویت میں خلل پڑ گیا، دو معصوم شرارت تاب آنکھیں اُٹھیں۔ لبوں پر ایک شوخ تبسم کھیل گیا۔ جمیلی سے آنکھیں چار ہوئیں۔ دونوں کے سینوں میں دفعتاً ایک ہنگامہ خیز ہلچل مچ گئی، جس طرح سورج کی کرن اُس کو اپنے میں جذب کر لیتی ہے، اُسی طرح دونوں کے دل ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے، جذباتِ محبت دلوں میں اس طرح اُبھرنے لگے جس طرح کسی گہرے چشمے سے پانی اُبلتا ہے، دونوں کی دوستی بہت سے خوبصورت و حسین لڑکوں اور لڑکیوں سے تھی مگر اِس وقت نظروں کے ملاپ نے دونوں کو ایک بالکل نیا تجربہ کرایا، بالکل نئی قسم کی حسیات اور احساسات اُبھر آئے، بیک نظر عاشق ہونا سُنتے آئے تھے لیکن یقین نہ تھا، اب عملی تصدیق ہوگئی،

دونوں کا بات چیت کرنے کو جی چاہ رہا تھا، اندرا اپنی نسوانیت اور حیا کی وجہ سے بات کرنے میں سبقت نہ کر سکی۔ جمیلی مرد ہونے کی وجہ سے

---

[1] ٹیگور کی اصل کتاب کا نام گیتان جلی ہے، نیاز فتحپوری نے اس کا اردو ترجمہ عرضِ نغمہ کے نام سے کیا ہے۔ ر۔خ

جرأت کر گیا۔ اُس نے پوچھا "آپ 'عرضِ نغمہ' پڑھ رہی تھیں شاید"۔

اندرا۔ جی ہاں، بہت عمدہ کتاب ہے، مجھے بھی پسند ہے۔

جمیلی:۔ جی ہاں، ہے ہی پسند کئے جانے کے قابل (ذرا رُک کر) آپ کا غالباً نیا داخلہ ہوا ہے؟

اندرا۔ جی ہاں، کوئی چھ سات روز ہوئے۔

جمیلی:۔ جبھی آپ کو آج پہلی بار دیکھا۔ میں چھٹی لے کر گھر گیا ہوا تھا۔ (تھوڑی دیر کے بعد)۔ اچھا، اپنا تعارف تو کرائیے۔

اندرا۔ میں الٰہ آباد کی رہنے والی ہوں۔ میرے والد بہت بڑے تاجر تھے۔ تین ماہ ہوئے وہ دس لاکھ کی جائداد میرے نام چھوڑ کر اس دُنیا سے سدھار گئے (اُس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں) میری والدہ کا میری شیر خوارگی کے زمانے ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ میرے بہت دور دراز کے چند عزیز ہیں۔ مگر اُن سے اور والد سے جانے کس بات پر ہمیشہ لڑائی رہی۔

جمیلی:۔ تو اب آپ تعلیم حاصل کرنے کے لئے شانتی نکیتن آ گئیں؟

اندرا۔ جی ہاں، میرے والد کو میری تعلیم کا بڑا خیال تھا، پارسال جب میں نے ایف اے کیا تو اُن کا ارادہ شانتی نکیتن بھیجدینے کا تھا مگر زندگی نے وفا نہ کی۔ بہرحال میں نے اُن کی خواہش پوری کر دی۔

جمیلی:۔ بہت اچھا کیا آپ نے، شانتی نکیتن واقعی شانتی نکیتن ہے، اس طرز کی درسگاہ ہندوستان تو کیا دُنیا میں شاید ہی ملے۔

اندرا۔ جی ہاں، مگر اپنا تو تعارف کرائیے۔

جمیلی:۔ مجھے جمیلی کہتے ہیں۔ مجھے یہاں دو سال ہو گئے۔ میں ڈاکٹر جعفری ڈی مالٹ کا لڑکا ہوں۔

اندرا۔ ڈاکٹر جعفری مشہور کانگریسی لیڈر؟

جمیلی۔ جی ہاں۔

اندرا:۔ آپ کی تعریف بھی میں یہاں بہت سُن چکی ہوں، بڑی خوش قسمتی ہے جو آپ سے ملاقات ہوئی۔

جمیلی، خوش قسمتی تو میری ہے جو آپ جیسی خوبصورت و پاک سیرت دوشیزہ کی دوستی نصیب ہوئی۔ (اندرا کے چہرہ پر سُرخی دوڑ گئی)

اندرا۔ (شرما کر):۔ یہ آپ کا حُسنِ ظن ہے ورنہ میں اس قابل کہاں؟

جمیلی:۔ غضب کرتی ہیں آپ، آپ اس قابل نہ ہوں گی تو اور کون ہوگا۔ (اندرا نے شرما کر نظریں نیچی کر لیں۔)

اندرا۔ آپ کو زیادہ شغف کس مضمون سے ہے؟

جمیلی:۔ شاعری سے۔ گو خود شاعر نہیں ہوں، ہاں یہ فخر ضرور ہے کہ شعر کے مطالب صحیح طور پر سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے ہومر، خیام اور میر حسن بہت پسند ہیں؛ کالج میں میں نے لیرک شاعری "بطور اختیاری مضمون" لئے ہوئے تھا۔ کچھ روز اردو کلاسیکل شاعری کا بھی مطالعہ کیا۔

اندرا:۔ ہومر اور خیام کے ساتھ میر حسن کا نام لینا آپ کے فطری ذوق پر دال ہے۔ مجھے میر حسن، انیس سے زیادہ پسند ہے۔ اُس کی ایک مثنوی ہزاروں دیوانوں پر بھاری ہے، اُس کی مثنوی کے کئی اشعار ہومر سے ٹکر کھاتے ہیں مثلاً شاہزادہ کے ہوش آنے پر پری کا کہنا ؎

ابھی تک تو میرا تھا تیرا نہیں پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں

تعریف سے مستغنی ہے۔ لوگ انیس و دبیر کے آگے میر حسن کو کچھ نہیں سمجھتے۔ اکثریت کے ذوق کے خلاف کوئی بات زبان سے نکالنا بڑی جرأت کا کام ہے، آپ نے بڑی جرأت و ہمت سے کام لیا جو ہومر کے ساتھ میر حسن کا نام لیا۔

جمیلی:۔ بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کا اور میرا ذوق اتنا یکساں ہے؟

اندرا۔ مجھے بھی بیحد مسرت ہوئی کہ آپ کو شاعری سے اس قدر دلچسپی ہے یہاں چھ سات روز میں مجھے کوئی اپنا ہمخیال دوست نہ ملا۔ اب آپ سے بڑی پُرلطف صحبتیں رہا کریں گی۔

جمیلی:۔ مجھے بھی یہاں آپ کا ایسا صحیح ذوق رکھنے والا کوئی شخص نہ ملا۔ دو سال کے بعد آج آپ جیسی صحیح و بلند ذوق رکھنے والی خاتون سے ملاقات ہوئی۔ اب شانتی نکیتن میں بقیہ زندگی بڑی پُرلطف گزرے گی۔

اندرا:۔ صوفیانہ شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

جمیلی:۔ لاحول ولا قوۃ

اندرا:۔ یہی معلوم کرنے کو تو پوچھا تھا، مجھے بھی اس ہرزہ گوئی سے سخت نفرت ہے۔ جگر مرادآبادی کا کلام شروع سے آخر تک بہترین ہوتا، اگر وہ صرف اس طرح کے اشعار کہتے ؎

ہنسی پھر اُڑنے لگی عشق کے فسانے کی
نقاب اُٹھاؤ بدل دو فضا زمانے کی

قفس کے سامنے بجلی کچھ اس طرح چمکی نظر میں پھر گئی تصویر آشیانے کی
یہ نشہ بھی کیا نشہ ہے کہتے ہیں جسے حسن جب دیکھئے اک نیند سی آنکھوں میں بھری ہے

لیکن اس طرز کے اشعار نے کہ ؎

مجھے تلاش کرا ے بے خودیٔ شوقِ سجود پہنچ کے منزلِ مقصد پہ کھو گیا ہوں میں
تو سامنے ہے پھر بھی بتلا کہ تو کہاں ہے کس طرح تجھکو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے
ٹھہر لے دلِ دردمندِ محبت تصور کسی کا پریشان ہو گا

اُن کے کلام میں بھی خرافات کا ایک حصہ شامل کر دیا ہے۔

جمیلی :۔ ماشاء اللہ آپ کی نظر بہت وسیع ہے، اور کیوں نہو، بھلا ہو مر اور خیام کے پسند کرنے والے کی نگاہ میں ان خرافات کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے؟ آپ کا مجھ سے پوچھنا ہی بیکار تھا کہ میں صوفیانہ شاعری کو کیا سمجھتا ہوں۔

اندرا :۔ بعض لوگ صوفیانہ شاعری کی طرفداری میں بڑے غلو سے کام لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کا عندیہ معلوم کروں۔

جمیلی : بہت اچھا کیا آپ نے۔

(۲)

اسی طرح پانچ چھ مہینے گزر گئے۔ دونوں میں روزانہ دلچسپ علمی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ مگر اپنے دل کی بات ظاہر کرنے کی ابھی تک کسی کو جرأت نہیں ہوئی تھی۔ شانتی نکیتن میں عنقریب طالب علموں کی طرف سے حکیم ٹیگور کا ایک عاشقانہ سوشل ڈرامہ دکھایا جانے والا تھا، اس میں ہیرو اور ہیروئن کے پارٹ جمیلی اور اندرا کو دئے گئے۔ ریہرسل شروع ہوئے، دونوں کے جذباتِ محبت اور زیادہ اُبھر آئے۔ خاص ڈرامہ دکھانے کی رات آئی۔ ڈرامہ دکھایا گیا۔ حکیم ٹیگور نے بیحد پسند کیا۔ جمیلی اور اندرا کا پارٹ بالکل فطری رہا، اور کیوں نہ رہتا۔ دونوں کے دل ایک دوسرے کی حقیقی محبت میں سرشار تھے۔ شانتی نکیتن کی طرف سے دونوں کو انعام میں تمغے ملے۔ تین بجے ڈرامہ ختم ہوا۔ جمیلی اور اندرا دونوں کے جذبات بیحد اُبھر آئے تھے۔ دونوں کے دل بھرے ہوئے تھے اس خوف سے کہ کہیں دلوں کے یہ طوفان اک دم پھوٹ نہ پڑیں دونوں فوراً اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ بقیہ رات میں کسی کو نیند نہ آئی۔ ڈرامہ کے پریمی مناظر دماغ میں چکر لگاتے رہے۔ جذباتِ محبت کا اثر زور و شور سے دل و دماغ پر چھا گیا۔ پچھلے کو تھوڑی سی بارش ہوئی، صبح آسمان بالکل صاف ہو گیا۔ تڑکے اُٹھ کر جمیلی نہایا اور اندرا کے کمرہ کی طرف روانہ ہوا۔ فضا بیحد خوشگوار تھی۔ ہلکی ہلکی صباحی ہوا پھولوں کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی دماغوں کو تازگی اور دلوں کو فرحت بخش رہی تھی۔ ہرے بھرے پودوں پر برسے ہوئے پانی کی بوندیں آبدار موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اندرا اپنے بازو پر سر رکھے کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی باہر لہلہاتے ہوئے سبزے پر پانی کی ننھی ننھی بوندوں کے خوشگوار منظر کا لطف اُٹھا رہی تھی۔ اس کا چہرہ گوناگوں کیفیات کا حامل تھا۔ جمیلی جا کے اُس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اُس نے جمیلی پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی نظریں جمیلی پر گاڑ دیں جمیلی نے اُس کی آنکھوں میں موتی جیسا ایک آنسو جھلکتا ہوا دیکھا وہ اس منظر کی تاب نہ لا سکا۔ بے اختیارانہ وہ اندرا کے سامنے دو زانو ہو گیا۔ اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پے در پے بوسے لینے لگا۔

جمیلی (بھرائی ہوئی آواز میں) اندرا، میں تم سے پریم کرتا ہوں۔ (اس دفعتاً اظہارِ محبت نے اندرا کو ایک وقفہ کے لئے خوشی سے سرشار کر کے بالکل بیحس کر دیا)

جمیلی :۔ بولو، اندرا بولو ——— میں تم سے پریم کرتا ہوں ——— تم کیوں نہیں بولتیں؟

اندرا نے اب جمیلی کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر اُسے اپنے پاس ایک صوفہ پر بٹھا لیا۔ اپنی مرمریں باہیں اُس کی گردن میں حمائل کر دیں۔ ایک آنسو اب بھی اُس کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا ——— مگر محبت اور پریم کا مقدس مسرت انگیز آنسو۔

اندرا۔ جمیلی پیارے! تمہارا حسن پہلی ہی نظر میں اپنا کام کر گیا تھا۔ اُسی روز سے میرے دیدہ و دل میرے نہیں بلکہ تمہارے ہو گئے ہیں۔ شرم و حیا نے میری زبان کھلنے نہ دی۔ مگر میں اس کی آرزومند ہی تھی کہ کسی طرح ظاہر داری کا یہ حجاب ہمارے درمیان سے اُٹھ جائے۔

جمیلی :۔ اندرا پیاری! مجھے پورا الیقین تھا کہ میرا پریم یکطرفہ نہیں ہے (آسمان کی طرف سر اُٹھا کر) اے اللہ، میں کتنا خوش قسمت ہوں۔

اُس نے اندرا کی کمر میں اپنے قوی بازو حمائل کر دئے اور اُسے اپنے آغوش میں کھینچ لیا۔ اندرا نے بھی اپنے جسم کا تمامتر بوجھ جمیلی پر ڈال دیا وہ نرم و نازک پنکھڑیوں والی نیم شگفتہ گلاب کی سی کلیاں ایک دوسرے

میں پیوست ہوکر رہ گئیں۔

(۳)

اس واقعہ کے بعد شام کو جب دونوں میں ملاقات ہوئی تو گفتگو کا موضوع محبت تھا، اندرا بولی "جمیلی پیارے لوگ کہتے ہیں کہ محبت سراسر لطیف و پاک ہوتی ہے، اگر ایسا ہے تو یہ آغوش میں لینا یا پیار کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ ہر عاشق و معشوق کو یہی کرتے دیکھا اور سُنا۔ اُس کے تو یہ معنی ہوئے کہ یا تو حقیقی محبت کا وجود ہی نہیں یا محبت کا مفہوم بالکل غلط ہے۔"

جمیلی۔ ہاں پریتم، دراصل مفہوم غلط ہے۔ ایک طرف تو محبت کو سراسر لطیف و والہانہ ماننے والے لوگوں کا گروہ ہے، دوسری طرف اُس کو سراسر گندگی سے آلودہ ماننے والے لوگ۔

مشہور ادیب علامہ عبدالوالی اپنے ایک افسانہ "مرد، عورت اور دنیا" میں لکھتے ہیں کہ پانی میں کنکر ڈالو تو دائرے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح لفظِ "محبت" منہ سے نکالنے سے مختلف دائرے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً عورت و مرد کی نظروں کا چار ہونا، بیک نظر عاشق ہونا، ملاقات ہونا، پینگ بڑھنا اور بے تکلفی ہونا، اظہارِ محبت، شادی، وصل حاملہ ہوجانا، پھر آخر میں لکھتے ہیں کہ زچہ خانہ کوئی اچھا منظر پیش نہیں کرتا، کتنا پھڑکتا ہوا اور صحیح یہ جملہ ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ محبت نہ صرف پاکیزگی ہی پاکیزگی ہے اور نہ صرف خواہشاتِ نفسانی کا نام۔ ایک روز مشہور جرمن شاعر گوئٹے اور اُس کی محبوبہ شارلوٹ ایک کمرے میں بیٹھے تھے، شارلوٹ کسی کام سے ذرا دیر کے لئے اُٹھکر باہر گئی، گوئٹے اپنی جگہ سے اُٹھا اور اُس جگہ کے پے در پے بوسے لینے لگا، جہاں شارلوٹ بیٹھی تھی۔ یہ ہے والہانہ محبت، مگر یہ کہنا غلط ہے کہ گوئٹے کو شارلوٹ سے بالکل بے لوث اور خواہشاتِ نفسانی سے پاک محبت تھی، اسی کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی غلط ہے کہ محبت کا منتہا زچہ خانہ اور ایک نووارد بچہ کا ٹیہوں ٹیہوں کرنا ہے، محبت مجموعہ ہے لطیف اور کثیف دونوں عناصر کا جس طرح انسان مظہر ہے برائی اور اچھائی دونوں کا، اور جس طرح سے انسان کو بُرائی اچھائی دونوں کا مظہر ہونے سے اشرف المخلوقات بنا دیا، اُسی طرح جذبۂ محبت کو لطیف و کثیف دونوں عناصر سے مرکب ہونے کی وجہ سے بہترین جذبہ قرار دیا گیا۔

اندرا۔ بڑے ذہین ہو تم جمیلی۔ میں نے اس پر بہت غور کیا تھا، مگر کچھ نہ سمجھی تھی، اب جو تم نے اس کا تجزیہ کیا تو سب کچھ سمجھ میں آگیا۔ میں تم پر کیوں نہ فخر کروں!

جمیلی۔ اور مجھے تم پر فخر ہے، سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ ہم میں مذہب کے اختلاف کے باوجود جذباتِ محبت نے نشوونما پائی اور اب ہم شادی کرکے ہندوستانی سناتنی اور عصبیت سے بھری ہوئی فضا میں ایک انقلابی قدم اُٹھانے میں کامیاب ہوں گے۔

اندرا۔ جمیلی پیارے، مجھے بھی اس کی بڑی خوشی ہے، مذہب کی ظاہر داری سے میرے تن بدن میں آگ لگجاتی ہے، ہندو مسلمان میں شادی ہو، رشتۂ محبت قائم نہ ہو، حقیقی الفت قائم نہ ہو۔ کیوں؟ اس لئے نہیں کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک انسانیت سے خارج ہے۔ بلکہ اس لئے کہ خدا کو دونوں دو مختلف طرزِ عبادت سے پوجتے ہیں، مذہب جو امن و سلامتی، ہمدردی و محبت کا پیغام لے کر آیا تھا، آج قتل و غارتگری، بیدردی و نفرت کا باعث ہے، عیسیٰؑ۔ بدھ، کرشن، اور محمدؐ کی روحیں کیا خوش ہوتی ہونگی، جب وہ شیعہ سنی، ہندو مسلم، مسلم عیسائی فسادات کے مناظر دیکھتی ہونگی، وہ انسانیت جس کی تبلیغ کرنے کرشن و محمدؐ آئے تھے دُنیا اس کے وجود سے خالی ہے۔

جمیلی، بالکل ٹھیک کہتی ہو تم، اندرا پیاری! ان جنت و بیکنٹھ کے خود ساختہ ٹھیکیداروں کے دراصل یہ سب بیج بوئے ہوئے ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ سرمایہ داروں کا بھی جو ان رنگروٹوں کے ہاتھ کا کھلونا ہیں بہت ہاتھ ہے۔

اندرا۔ یہی کمبخت تو منافرت اور درندگی کے رہنما ہیں۔ اگر اپنی یہ حیوانی حرکات چھوڑ دیں تو مالویت، مولنائیت[1]، پرمانندیت اور جناحیت کا ٹھکانا ہی کہاں رہے۔

جمیلی۔ بڑی سچی بات کہی ہے تم نے، خدا کا شکر ہے کہ میرے والد ان خرافات سے پاک ہیں، جبھی میں اُنھیں بے حد چاہتا ہوں۔ تم سے شادی پر والدہ ضرور خفا ہوں گی، مگر والد سب ٹھیک ٹھاک کرلیں گے، ہم کتنے خوش نصیب ہیں اندرا کہ ہماری راہ میں زیادہ روڑے نہیں ہیں، ورنہ تم جانتی ہو اس قسم کی شادیاں قریب قریب ناممکن ہوتی ہیں۔

---

[1] مراد شوکت علی سے ہے۔ خ

اندرا۔ اور میرا کوئی اعتراض کرنے والا ہے ہی نہیں۔ چند دُور کے رشتہ دار ہیں سو پہلے ہی سے رُوٹھے بیٹھے ہیں۔

جمیلی:۔ مگر جن کو ہم سے کوئی سروکار نہیں ہے وہ زیادہ شور و غل مچائیں گے۔ جلوس نکالیں گے۔ اور نہ معلوم کیا کیا کریں۔

اندرا۔ تو ہم اُن کی بات پر کان ہی کب دھرتے ہیں۔

جمیلی:۔ جب ہم تعلیم ختم کرکے اک دم شادی شدہ دہلی پہونچ جائیں گے تو ابّا جان اس شادی پر کتنے خوش ہوں گے۔ دوڑ کر مجھے اور تمہیں دونوں کو لپٹا لیں گے۔ تم سے محبتانہ گفتگو کریں گے، اماں جان تم سے اگر نہیں بولیں گی تو اُن کو ڈانٹیں گے۔

اندرا۔ اور میں تمہاری اماں جان پر اپنی معصومانہ ڈبڈبائی آنکھوں سے ملتجیانہ نظریں جماکر اُن سے منت کروں گی، اُنھیں مناؤں گی۔ وہ ضرور من جائیں گی۔ پھر ہماری زندگی کیسی پُرلطف گزرے گی۔

جمیلی۔ خدا ایسا ہی کرے۔ امّاں بڑی متعصب اور کٹّر مسلمان ہیں، مجھے شانتی نکیتن بھیجنے کی صرف اس لئے مخالف تھیں کہ ڈاکٹر ٹیگور کا قائم کیا ہوا ہے اور ٹیگور ہندو ہیں

اندرا۔ مگر ہم جب اسی قدر سناتنی شخص کو نرم نہیں کرسکیں گے تو اور کیا کرسکیں گے؟ میں اُن کو سمجھاؤں گی۔ اُن کے پاؤں پڑوں گی۔ اُن کے لپٹ جاؤں گی۔ آخر وہ بھی عورت ہیں اور عورت کے جذبات سے واقف، اپنی جوان بہو سے راضی ہو ہی جائیں گی۔ چاہے باولِ ناخواستہ ہی کیوں نہیں۔

جمیلی۔ ہاں راضی تو ہو جانا چاہیئے انھیں، رہا یہ کہ وہ عورت کے جذبات سے واقف ہیں، غلط ہے، وہ عجیب الخلقت عورت ہیں۔ تمام دوسری عورتوں سے الگ، اور قدامت پرست جاہل عورتیں تو سب ہی ویسی ہوتی ہیں۔

اندرا۔ ہاں میری دور دراز کی اکثر رشتہ دار عورتیں ایسی ہی ہیں، اور دراصل وہی اصل وجہ میرے والد اور دوسرے رشتہ داروں کے جھگڑے کی ہیں۔ میرے والد......... میری والدہ کو لے کر انگلستان گئے تھے۔ وہاں سے واپس کیا ہوئے بس اَدھرمی ہو گئے۔ برادری نے حُقّہ پانی بند کر دیا۔ پھر بھی کچھ رشتہ دار ملتے جُلتے رہے۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد سب کے سب آپ ہی آپ رُوٹھ گئے۔ والد نے بھی کہا کہ چلو اچھا ہوا۔ اِن روز روز کے نام دھرنے والوں سے فرصت ملی، ایک پُرلطف قصہ سنو، انھیں رشتہ داروں میں سے ایک صاحب سے والد سے کسی بات پر جھاک جھک ہو گئی۔ والد نے کہا خیر۔ آپ اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر خوش، "شما بخیر ما بسلامت" چھُوٹتے ہی وہ صاحب بولے، "ہاں تم تو ادھرمی ہو ہی، بات بات پر وہی ملکشوں کے مسئلے مسائل"

جمیلی۔ تعصب ہر مذہبی شخص میں آج کل ہے۔ مگر ہندوستان میں جس انوکھے طرز کا تعصب ہے اُس کا دوسرے ممالک میں وجود ہی نہیں ہے اور خدا کرے نہ ہو۔

اندرا۔ جمیلی پیارے، تعلیم سے فارغ ہوکر ہم دونوں اپنی زندگیاں انھیں اصلاحات کے لئے وقف کردیں، کیوں کیسا خیال ہے؟

جمیلی، بہت مبارک خیال ہے۔

(۴)

اسی طرح تین سال کا عرصہ گذر گیا، دونوں کی محبت زیادہ والہانہ ہوتی گئی۔ ہر وقت دونوں ایک دوسرے کے خیال میں محو رہتے تھے، دونوں ایک دوسرے میں جذب ہو کر رہ گئے تھے، اُن کی صحبتیں بہت دلکش و دلچسپ ہوتی تھیں، اب جمیلی کو تعلیم سے فراغت حاصل ہو گئی، اندرا نے چونکہ اُس کے دو سال بعد داخلہ کرایا تھا، اس لئے ابھی اُس کو فراغت میں دو سال باقی تھے، شانتی نکیتن میں تعلیمی زمانہ میں شادی ممنوع تھی، اس لئے ابھی دونوں کی شادی بھی ملتوی تھی۔ جمیلی نے اندرا کے اصرار سے یہ دو سال کا عرصہ بھی شانتی نکیتن ہی میں شعر و شاعری کے مطالعہ میں گزارنے کا ارادہ کرلیا۔ باپ سے اجازت منگالی۔ وہ علم کے بڑے شائق تھے، اپنے بیٹے کو بہترین عالم و فاضل دیکھنا چاہتے تھے اس لئے دو سال تک اور لڑکے کو اپنی آنکھوں سے دور رکھنے پر راضی ہو گئے۔

اب جمیلی کا ظرفِ زندگی لبالب بھرا ہوا تھا، ذرا بھی خلا نہ تھا، وہ اندرا کو پورے جوش و خروش کے ساتھ چاہتا تھا، اس کو اندرا کا محبوب اور اُس کا ہونے والا شوہر ہونے پر فخر تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اُس کی اندرا ہر لحاظ سے ایک عظیم شخصیت کی مالک ہے۔ اندرا کی محبت بھی اُس کے ساتھ کچھ کم جوش و خروش کی نہ تھی، اُس کو بھی فخر تھا کہ جمیلی کا ایسا شخص اُس کا

عاشق، محبوب اور ہونے والا شوہر ہے۔ جمیلی کو اپنے باپ سے بیحد محبت تھی، لا انتہا محبت، باپ بھی اُسے بیحد چاہتے تھے، اُن کی محبت کو جمیلی کی نئی کیفیاتِ قلبی نے دبا دیا تھا، یہ نہ تھا کہ باپ کے دیکھنے کو اُس کا دل نہ چاہتا ہو۔ باپ سے ملنے کی بھی خواہش تھی اور اندرا کو بھی نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ باپ سے دو سال بعد وہ دل کھول کر ملے ہی گا اور اندرا تو اُس کے پاس ہی تھی، کیا ایک دل میں بیک وقت دو خواہشات نہیں ہو سکتیں؟ اور اگر ایک خواہش پُوری کرلے تو کیا یہ سمجھا جائے گا، کہ دُوسری طلب کمزور تھی؟ انسانی طبیعت کے ولولے اور جذبات منطقی نہیں ہوتے، اس لئے یہ کہنا کہ باپ کی محبت کو نئی کیفیاتِ قلبی نے دبا دیا تھا صحیح نہیں۔ اِن کیفیات کا بھی زور تھا اور اس محبت کا بھی۔ اسی وجہ سے کہا گیا کہ جمیلی کا ظرفِ زندگی لبالب بھرا تھا، ظرفِ زندگی کا نہ بھرا ہونا مصیبت ہے، اور ناقابلِ برداشت مصیبت۔ مکمل انسانی زندگی وہی ہے جو اذواق و خواہشات و جذبات سے بھری ہوئی ہو، اذواقِ انسان کو مشغولِ کار رکھتے ہیں اور خواہشات و جذبات سرور پیدا کرتے رہتے ہیں۔

(۵)

ایک روز اپنی شام کی دلچسپ ملاقاتوں میں سے ایک خوشگوار ملاقات میں اندرا نے کہا۔ جمیلی پیارے، کچھ بھی ہو محبت کا عقدہ لاینحل معلوم ہوتا ہے۔ نئے نئے سوالات دماغ دل سے کرتا ہے۔ مگر جواب قریب قریب ناممکن ہوتا ہے۔ مثلاً اسی کو لو کہ یہ کیا کہ ایک شخص صرف ایک ہی سے محبت کرتا ہے۔ اُسی کا نام چپکے چپکے زور زور ہر وقت وردِ زبان رکھتا ہے۔ وہی نام دل کی گہرائیوں سے اس طرح اُبلا کرتا ہے جیسے گہرے کنوئیں کا سوتا، پھر اگر کوئی بیحد حسین ہے تو صرف ایک یا دو انسان ہی کیوں اُس سے محبت کرتے ہیں، ساری دنیا اس کو کیوں نہیں چاہتی؟

جمیلی:- اندرا پیاری، یہ کوئی عقدہ لاینحل نہیں ہے، ذرا غور کی ضرورت ہے۔ تمہارے اس سوال کا جواب صرف یہ ہے کہ ہر شخص اپنی مخصوص پسند رکھتا ہے، تم جو کچھ میری نظر میں ہو کیا اپنے والد کی نظر میں بھی وہی تھیں؟ وِہسکی کی بوتل رام لال کے لئے لو رو ہے ہیں، مہاتما گاندھی کے نزدیک ایک ظرف ہے جس میں سانپ بچھو سے زیادہ زہریلی کوئی چیز بند ہے۔ مرلیا عبدالماجد کو مشتعل کر دینے والا اسپال اور کسی کے لئے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

کی تفسیر۔ ایک ہی چیز کیسے کیسے رُخ پلٹتی ہے۔ اشیاء کی حیثیت نقطۂ نظر کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے ؎

مجھے تو پسند اور مجنوں کو لیلیٰ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ جمیلی کا دوست سُریندر نکل آیا، باتوں میں خلل پڑ گیا، سُریندر نے پوچھا "کہو جمیلی، آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

جمیلی:- مُلک اور زبان کی خدمت،

سُریندر۔ زبان کی خدمت تمہارے لئے مناسب ہے۔ مگر مُلک کی خدمت کے لئے کسان اور مزدور بنائے گئے ہیں نہ کہ تم جیسا عالی دماغ۔

جمیلی:- شانتی نکیتن میں رہ کر تمہارے یہ خیالات! میرا دل بیٹھا جاتا ہے،

سُریندر:- واہ میں نے تو عین فطری بات بتائی ہے۔ فطرت نے تم کو عیش و عشرت کے لئے تخلیق کیا ہے، نہ کہ تکالیف و مصائب اُٹھانے کے لئے۔ اگر اُسے تم سے یہ پُرہول کام کرانے ہوتے تو وہ تمہیں مزدور بناتی۔ عالی دماغ نہیں۔

جمیلی۔ تمہاری ذہنیت میں مجھے عظیم انقلاب رُونما ہوتا معلوم ہو رہا ہے۔ کسان اور مزدور کیا انسانیت سے گرے ہوئے ہیں؟ کیا وہ ہمارے ہی جیسے آدمی نہیں۔ رہا عیش و عشرت کا فلسفہ تو میں اپنے لئے تو کیا اُسے کسی شخص کے لئے بھی مناسب و بہتر نہیں سمجھتا، سکون و اطمینان اور عیش و عشرت کی تلاش موت کے آثار ہیں۔ ہر چیز ایک نئی چیز بننے کے لئے ترکیب پا رہی ہے، اس تحت میں ہم تم بلکہ ساری کائنات منہمک ہے، جو عیش و عشرت ڈھونڈے وہ اِس دنیا کے لئے بیکار ہو گیا۔ اُس کے اجزا ترقی کرنے سے معذور ہو گئے، خدا کا حکم انسان کو اور نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کو یہ ہے کہ آگے بڑھے جاؤ۔ یہی عقبیٰ ہے اور یہی آخرت۔ اس کے علاوہ سب دل بہلانے کے ڈھکوسلے۔ موجودہ سائنٹیفک ایجادات ایک نئی زندگی کا پیش خیمہ ہیں جو انقلاب اور ترقی کی حامل ہے، پھر آنے والی نسلیں اس سے بھی افضل و برتر دَورِ زندگی کے لئے کوششیں کریں گی، یہی ہوتا چلا جائے گا، یہاں تک کہ نظامِ کائنات درہم و برہم ہو جائے۔ مگر یہ ایجادات ترقی کی راہ میں صرف بار برداری کے خچر ہیں۔ اصل ترقی "انسانیت" کی ترقی ہے۔

سریندر۔ تم اُس انتہائی تخیل پر پہنچ گئے ہو، جہاں سے پھر راہِ راست پر واپس آنا ناممکن ہے، انسان جب اپنے کو دوسروں کا ٹھیکیدار اور اُن کے مصائب کے ختم کرنے کو اپنا فرض سمجھنے لگتا ہے تو اُس کے ذاتی جوہر ختم ہوجاتے ہیں۔ میں تو مسولینی کی فیسزم کا حامی ہوں۔ آخر انفرادی عظمت بھی کوئی چیز ہے؟

جمیلی۔ بھئی تم تعلقدار کے لڑکے ہو، تمہاری ایسی ذہنیت نہ ہو تو تعجب ہے۔ رہا انفرادی عظمت، کوئی شک نہیں اس کے وجود میں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ بڑا شخص عوام سے حقوقِ انسانیت میں بالا تر ہے، ابوبکرؓ و عمرؓ عظیم الشان انسان تھے۔ خلیفہ تھے۔ لوگوں کے دلوں میں ان کی عظمت تھی۔ مگر حقوقِ انسانیت میں دوسروں سے بالا تر نہیں تھے، ہندو مذہب سے تو مجھے واقفیت نہیں مگر اسلام میں محمد الرسول اللہؐ کی زندگی خود انسانی مساوات و اخوت کا بہترین پیکر تھی۔ تم انسانیت کا درد اپنے دل میں رکھنے والے کو کہتے ہو کہ وہ اپنے کو دوسروں کا ٹھیکیدار سمجھتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تم "انسانیت" کے مفہوم ہی سے نہیں واقف ہو۔

اندرا۔ تعلقدار اور پھر اودھ کے تعلقدار کا لڑکا "انسانیت" کے مفہوم سے کیسے واقف ہو سکتا ہے؟

سریندر۔ جواب دیئے نہ بن پڑا تو امیروں اور تعلقدار کو گالیاں دینے پر اُتر آئے۔ (ہنسکر) اچھا چھوڑو اس قصہ کو، کچھ اور مزے کی باتیں کرو۔

جمیلی۔ میں تو خود تم ایسے کوڑمغز سے بحث کرتے گھبراتا ہوں۔ خدا خدا کر کے جان بچی۔

(۶)

اسی طرح سے دلچسپیوں اور دلفریبیوں سے بھرے ہوئے یہ دو سال بھی گذر گئے۔ جمیلی نے اندرا سے کہا کہ شادی یہیں کر کے دہلی چلیں تو اچھا ہوگا۔ اندرا نے کہا کہ ہنی مون بھی یہیں منانا چاہیئے۔ بہرحال چند دوستوں کے جھرمٹ میں دونوں رشتۂ نکاح میں وابستہ ہو گئے۔ حکیم ٹیگور نے دونوں کو دعائے ترقی دی۔ شہر کے ہندو مسلمانوں نے سخت احتجاج کئے مگر جو عزم مصمم کر چکا ہو وہ اِن گیدڑ بھبکیوں میں کب آتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ شانتی نکیتن ایسے ادارے کے بھی چند اشخاص اس مبارک شادی کے مخالف تھے، مگر عزائمِ صمیم کے آگے کسی کی کچھ نہ چلی، ہندو مسلم پریس کے لئے تو گویا ایک شگوفہ ہات آگیا۔ ساتھ ہی ساتھ ملک میں چند خیر مقدم کرنے والے بھی تھے، اخبار سے معلوم ہو کر ڈاکٹر جعفری نے جمیلی کو مبارکباد کا خط لکھا اور لکھا کہ اندرا کو لیکر فوراً چلے آؤ۔ دیکھنے کو بیحد جی چاہتا ہے۔ تمہاری والدہ کو بیحد رنج ہے، اور تم سے بہت خفا ہیں۔ مگر میں اُنھیں سمجھا لوں گا۔" جمیلی نے جواب دیا کہ ہم ہنی مون منا کر آئیں گے، آپ والدہ سے کہئے کہ وہ تمہارے ڈر سے نہیں آتا۔ ایک آدھ ماہ بعد اُن کی ماتا جوش مارے ہی گی، اُس وقت واپس ہونگا، تو کوئی جھگڑا بکھیڑا نہ اُٹھے گا، ڈاکٹر جعفری نے بھی اس رائے کی تائید کی۔

شادی کو تین ماہ ہو گئے۔ ڈاکٹر جعفری کا خط آیا کہ تمہاری ماں کسی طرح نہیں سمجھتیں۔ مگر اُن کو بکنے دو۔ زیادہ سے زیادہ تم سے اور اندرا سے نہ بولیں گی۔ اب فوراً چلے آؤ۔ جمیلی نے لکھا کہ چند روز میں واپس ہوں گا۔ آنیکی تار سے اطلاع دیدوں گا۔

اس روز رات کو جمیلی نے کہا "اندرا پیاری جلد از جلد دہلی چلو۔"

اندرا۔ تم نے ابھی سے زبردستی شروع کر دی۔ دہلی پہنچکر اس میں اور ترقی ہو جائے گی۔

جمیلی۔ مجھے اس بارے میں زبردستی کرنے کا حق پیدا ہو گیا ہے، کیا میرے اس حق سے تمہیں انکار ہے؟

اندرا۔ میرے ہی خلاف مجھی سے شہادت لیتے ہو، یہ دوسری زبردستی۔

جمیلی۔ میں جھوٹی شہادت دینے پر مُصر نہیں ہوں۔

اندرا۔ جھوٹی ہو یا سچی۔ میں شہادت دینے کی عادی نہیں ہوں۔ اچھا تمہیں کس طرح یقین ہوا کہ میں تمہارے اس حق کو مان لوں گی۔ اگر میں انکار کر دوں تو؟

جمیلی۔ میں برباد ہو جاؤں گا۔ میرے دل کی بستی ویران ہو جائیگی۔

اندرا تو میرے ساتھ زبردستی کرنے میں تمہارے دل کی بستی آباد ہے؟

جمیلی۔ مگر یہی حق تمہیں بھی میرے اوپر حاصل ہے، پھر شکایت کیسی؟

اندرا۔ مگر میں تو اس حق کا مطالبہ نہیں کرتی؟

جمیلی۔ یہ ممکن ہے اس وجہ سے ہو کہ میری محبت کا جذبہ تمہارے جذبۂ محبت سے قوی تر ہو۔

اندرا:۔ ابھی سے یہ شک اور بدگمانی ؟

جمیلی:۔ اندرا پیاری! مجھے دق نہ کرو۔ خوش ہونے دو۔

اندرا۔ (ہنسکر اور جمیلی کو لپٹاکر) نہیں پیارے، میں تمہیں کیوں دق کرنے لگی؟ پرسوں ہی دہلی چلو۔

(۷)

دوسرے دن رات کو جب اندرا اور جمیلی گلوں میں باہیں ڈالے بوس و کنار میں کھوئے ہوئے تھے، اندرا نے کہا "اگر اسی حالت میں مر جاؤں تو میرا خاتمہ بالخیر ہو جائے گا"

جمیلی۔ مگر میری حالت کیا ہوگی؟

اندرا۔ پیارے، محبت خود غرضی کا عطر و جوہر ہے۔ جب تمہاری محبت میرے دل میں جوش مارتی ہے تو مجھے اپنی ذات کے سوا کوئی ذات نہیں دکھائی دیتی۔ مجھے تمہارا پیار کرنا نہیں اچھا معلوم ہوتا۔ جی چاہتا ہے خود ہی پیار کروں خود ہی لپٹوں۔ اس کیفیت میں جان کی طرف سے بے پروائی ہو جاتی ہے۔ جذبہ جان سے تحریک نہیں پاتا۔ خود اپنے میں نئی جان پیدا کر لیتا ہے، جان تھک جاتی ہے تو اپنی باگ جذبہ کے ہاتھ میں دیدیتی ہے، جذبہ جان پر حاوی ہو جاتا ہے۔ جان ایک بے حقیقت شے ہو جاتی ہے۔ یہ ایک عجیب وقت ہوتا ہے۔ ایک نیا عالم سامنے آتا ہے ——— ایک نہایت پُرکیف عالم ——— اگر موت اس عالم میں ہو جائے تو یقیناً خاتمہ بالخیر ہوگا۔

جمیلی۔ تم کیفیاتِ اندرونی کی تحلیل و تجزیہ خوب کرتی ہو۔ مگر عالمِ بیرونی کو بھول جانا اس تحلیل و تجزیہ میں کہاں تک صحیح ہے۔؟

اندرا:۔ عالمِ بیرونی کا تصور کیفیتِ اندرونی کا تابع ہے۔

جمیلی:۔ کیا تم بودلیر اور رانبو کی پیرو ہو۔ اس نئے اسکول کی طرح عالم کی کسی چیز کی صورت و حقیقت معلوم کرنے کی جستجو نہیں کرتیں۔

اندرا۔ میں کسی شخص اور کسی اسکول کی پیرو نہیں۔ پیروی کرنا اپنے ہاتھ سے اپنے پیروں میں بیڑیاں ڈالنا ہے۔ میری جو کچھ سمجھ میں آتا ہے اُسی کی قائل ہوں۔ نظام قائم کرنا متحرک زندگی کو ساکن کر دینا اور اس میں جمود پیدا کر دینا ہے۔ میں اس سے چڑتی ہوں کہ فلاں مذہب یہ ہے، فلاں مذہب وہ ہے۔ خیال کو فریم میں لگا کر بند کرنے سے میرے آگ لگتی ہے، کیمونزم یہ ہے، امپیریلزم اسے کہتے ہیں۔ لبرلزم کے مقابل ایک دوسرا نظامِ خیال کنسرویٹیزم ہے۔ میری طبیعت ان "ازموں" سے بھاگتی ہے۔ پیغمبر مذہب بنایا کرتے تھے یہ عالم "ازمیں" بنانے لگے ہیں۔ ان کی پیروی بھی مذہب کی پیروی سے کم نہیں ہے۔ انسانی زندگی خانوں میں بند نہیں کی جاسکتی۔ اصل پوچھو تو کوئی شخص بھی کسی مذہب کا پابند نہیں۔ ہاں تو بودلیر اور رانبو کی شاعری فطرت پرستی اور خیال پرستی کی شاعری نہیں ہے۔ کیفیت پرستی کی شاعری ہے، مرکزِ عالم انسان کے لئے انسان ہے، شاعر کو صرف ان تحریکات سے غرض ہے جو اشیائے عالم کو دیکھنے یا تجربہ کرنے سے اُن کے دماغ میں پیدا ہوں۔ حقیقتِ عالم جب فلسفہ اور سائنس کی کوششوں سے نہ معلوم ہو سکی تو شاعری کیا معلوم کرے گی، تم مجھے اسی لئے تو عزیز اور پیارے ہو کہ تمہارے پاس بیٹھنے سے میری قلبی کیفیات میں ہل چل مچ جاتی ہے، اگر میں تمہاری تحلیل اور تجزیہ کرنے لگوں گی اور تمہاری حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کروں گی تو میرا مزہ بھی خاک میں مل جائے گا اور تمہاری حقیقت بھی ذرّہ برابر نہ معلوم ہوگی۔

جمیلی۔ اگر یہ بات ہے تو اس قصہ کو جانے دو۔ میرے گلے لگ جاؤ لیکن یہ معاہدہ ہمارے تمہارے درمیان ہو جائے کہ مرنے کے وقت ہم دونوں میں سے کوئی مرے نہیں۔ مجھے مفلسی، مرض اور موت سے نفرت ہے، ہم تم جب دنیا میں نہ رہنا چاہیں تو عالمِ بالا کی طرف اُٹھتے چلے جائیں اور پھول کی خوشبو کی طرح ہواہیں غائب ہو جائیں۔ یہ طبیب اور اُن کے لواحقین اس کے بعد تجہیز و تکفین کے سامان غسل دینے والے اور گورکن یہ سب کتنی نفرت انگیز چیزیں ہیں۔ تصور سے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ زندگی سے اِنکا تعلق کیوں ہے؟ اس کا خیال دل بٹھا دینے والا ہوتا ہے۔

اندرا۔ مگر یہ مشین کسی نہ کسی دن بند ضرور ہو جائے گی۔

جمیلی۔ لیکن آج اس لطف میں تو اس بات کو میں نہ مانوں گا۔ ہم ہمیشہ ہمیشہ زندہ اور تندرست رہیں گے۔ اندرا اور جمیلی جب تک ہندوستان باقی ہے اُس وقت تک باقی رہیں گے۔ میں، میری اندرا اور میرا ہندوستان۔ اس تثلیث کا میں قائل ہوں۔ عالم کی حقیقت بس اسی تثلیث میں ہے،

اندرا۔ میرے اور تمہارے خیالات کتنے یکساں ہیں گو کہ اندازِ بیان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جمیلی تم بہت پیارے ہو۔ (گلے لپٹ کے پیار کرنے لگتی ہے۔)

(۸)

اس کے دوسرے روز اندرا اور جمیلی شام کی گاڑی سے دہلی کے لئے روانہ ہوگئے اسٹیشن سے جمیلی نے ڈاکٹر جعفری کو اپنے آنے کا تار دیدیا۔ صبح چھ بجے تار ملنے پر ڈاکٹر نے بیوی سے کہا کہ جمیلی اور اندرا صبح نو بجے یہاں پہنچ جائیں گے۔

بیوی۔ اُن سے اگر تم کو اتنی ہی محبت ہے تو الگ رکھنے کا سامان کرو، میرے گھر میں وہ قدم نہیں رکھ سکتے۔

ڈاکٹر۔ بڑی کٹر ہو تم خدا کی قسم، لڑکے کی ماںتا بھی نہیں رہی۔

بیوی۔ میرے بدلے تم کو ماںتا ہوگئی ہے، اُس نے میرا کلیجہ کچھ کم پکایا ہے۔ خاندان بھر کے طعنے تشنے سننا پڑتے ہیں۔ نا بابا نا، میں ایسی ماںتا نہیں رکھتی، اُس کا نام سُنکر میری آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے، کمبخت، ننگِ خاندان۔

ڈاکٹر۔ اوفوہ، اتنی عصبیت۔

بیوی۔ نہیں تو مذہب چھوڑ دوں۔ ریت رسم کو بالائے طاق رکھدوں۔ میں نالائق بیٹے کی خاطر اپنی عقبیٰ تھوڑی خراب کروں گی۔

ڈاکٹر۔ تم مذہب سے واقف ہی کب ہو۔ ریت رسم جانتی ہو بس۔

بیوی۔ اے لو جتنا چپ رہو اُتنا ہی دباتے ہیں۔ لو اب ہم مسلمان بھی نہیں رہے۔ پھر کون خدا کا سوا را مسلمان ہے! دیکھو جی، اب کی تو کہا، اب نہ کہنا۔

ڈاکٹر۔ خدا کی قسم جاہل بیوی عذابِ الٰہی ہے۔ ہندو عورتوں کو دیکھو۔

بیوی۔ ہاں ہاں عیاشی اور عاشق مزاجی ہی کے لئے تو کانگریسی ہوئے تھے۔ لو بیوی اب مسلمان پردہ نشین بہو بیٹیوں سے یہ مُوئی کافر بچی ہندنیاں جن کو نہ کچھ حیا ہے نہ شرم، اچھی ہوگئیں۔

ڈاکٹر۔ اجی تم تو بیحد کوڑ مغز ہو، اگر ایسا ہی ہے تو تم بیٹے بہو سے بات نہ کرنا۔ رہا یہ کہ میں اپنے گھر میں نہ رکھوں ناممکن ہے۔

بیوی۔ اگر ایسا ہی ہے تو میری صورت نہ دیکھو۔

ڈاکٹر۔ دیکھو جی، تمہاری جہالت اب ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی ہے۔ میں جو چاہوں گا وہ ہوگا۔ تم میری بیوی ہو، مالک نہیں۔ تم کو میرا حکم ماننا پڑے گا۔

بیوی۔ آئے وہاں سے حکم کی دھونس بٹھانے۔ میں نے آج تک اپنے ماں باپ کی تو بات سُنی نہیں، تمہاری بہت سُنوں گی؟

ڈاکٹر۔ ماں کے قدموں کے نیچے تو جنت ہے۔ یہی تم مذہب سے واقف ہو۔ جاہل اجہل۔

بیوی۔ (بیحد غصہ میں) دیکھو ذرا زبان سنبھال کے بات کرو۔ برابر بکے جارہے ہو۔ میں جب تک نہیں بولتی ہوں تبھی تک۔

ڈاکٹر۔ خیر، میں کچھ نہیں جانتا، اندرا اور جمیلی یہیں اسی گھر میں رہیں گے۔

بیوی۔ جمیلی تک تو میں راضی ہوں۔ مگر وہ ہندنی مُوئی کافرنی یہاں ہرگز قدم نہیں رکھ سکتی۔

بیوی۔ یہ قیامت تک نہیں ہوسکتا۔

اب بہت زور و شور کی لڑائی ہونے لگی۔ اندرا اور جمیلی جب اسٹیشن پر اُترے تو انھیں کوئی نظر نہیں آیا۔ جمیلی نے کہا "معاملہ دگرگوں معلوم ہوتا ہے، ورنہ ابّا جان لینے ضرور آتے"۔ خیر، گاڑی کرکے دونوں ایوانِ جعفری پہنچے۔ اندر سے شور و غل کی آوازیں آرہی تھیں۔ گاڑی کو کھڑا رہنے کا حکم دے کے جمیلی اندرا کو لے کے اندر گیا۔ باپ دیکھتے ہی دوڑ کر بہو اور بیٹے سے لپٹ گئے۔ ماں نے کہا "ارے نکل نکل چھوکری۔ یہاں تیرا کوئی کام نہیں"۔

اندرا (دوزانو ہوکر):۔ اماں جان، ابتو میں آپ کی بہو ہوں۔ خدارا رحم کیجئے۔ دنیا میں سوائے آپ کے میرا اور کون بزرگ ہے۔ آپ ہی اپنی پناہ میں مجھے لے لیجئے۔

جمیلی کی ماں (لکڑی اُٹھا کر اور اندرا کو دو تین مرتبہ مار کر) چل نکل مُوئی کافرنی میرے گھر سے۔

جمیلی۔ چلو اندرا چلو۔ (ماں سے) اماں جان، اب آپ میری صورت کبھی نہ دیکھئے گا۔ انشاءاللہ۔

ماں۔ جمیلی تجھے جنت نصیب نہیں ہوگی، ماں کو خفا کرکے۔ بیٹا اس ہندنی کو چھوڑ دیکھ تو کیسی ننھی ننھی چاند سی دولہن بیاہ کے لاتی ہوں۔

جمیلی۔ بس چُپ رہیئے، اماں جان!

ماں برابر چیختی چلاتی رہیں۔ جمیلی اندرا کا ہات پکڑ کر باہر چلا گیا، پیچھے پیچھے ڈاکٹر جعفری گئے۔ باہر ڈاکٹر جمیلی سے بولے "بیٹا، تم تاج محل ہوٹل

میں ٹھیر جاؤ۔ میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ کل تک کوئی اچھا بنگلہ ڈھونڈھ لیں گے، میں بھی اب تمہارے ہی ساتھ رہوں گا۔"

جمیلی۔ بہت اچھا باداجان!

ڈاکٹر۔ اندرا بیٹی! معاف کرنا۔ تم جانتی ہی ہو کہ جاہل متعصب عورتیں کس ٹائپ کی ہوتی ہیں۔

اندرا۔ جی اباجان، اس میں معافی کی کونسی بات ہے۔ اماں جان ابھی بجد غصہ میں ہیں۔ میں چند روز بعد اُن کو منانے میں ضرور کامیاب ہوجاؤنگی۔

ڈاکٹر۔ آمین۔

تینوں آدمی تاج محل ہوٹل روانہ ہوگئے۔ بیوی کو معلوم ہوا کچھ نہیں بولیں۔ دو تین گھنٹہ کے بعد جب ذرا دماغ درست ہوا اور واقعات پر غور کیا تو خیال کیا کہ یہ تو بُرا ہوا کہ میاں صاحب بھی بیٹے اور بہو کے ساتھ چلے گئے۔ ہندوستانی سماج بڑی خطرناک ہے۔ جاہل عورتیں مکر و فریب کے پُتلے اور چالاکی میں بجد مشاق ہوتی ہیں۔ خدا ان کے تریا چرتر سے بچائے۔ ایک مکروفریب سے پُر اسکیم اُس کے دماغ میں آئی۔ سوچا کیوں نہ اندرا کو ختم کردوں۔ بیٹے کو وقتی رنج ہوگا۔ باپ سنبھال لیں گے۔ چند ماہ بعد مجھ سے ہل مِل جائے ہی گا۔ آخر کو ماں ہوں اُس کی۔ سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہوجائے گا۔ یہ بھی نہ خیال کیا کہ بیٹا تعلیم یافتہ ہے۔ وہ کہاں پلٹ سکتا ہے۔ یا اندرا کے قتل سے پولیس کچھ ایکشن لے۔ جاہل عورت تو مکاری کرنا جانتی ہے۔ اُسے اُس کے نتائج سے کیا مطلب۔

بہرحال شام کو اُنھوں نے بیٹے کے نام اپنے یہاں کے منشی سے لکھوا کر ایک رقعہ بھیجا کہ بیٹے میں اپنے کئے پر بجد نادم ہوں۔ اندرا پھر بھی میری بہو ہے۔ جو ہونا تھا ہوچکا۔ اب میرا پچھتانا بیکار ہے۔ اپنی بوڑھی ماں کے کلیجے سے تم اور اندرا دونوں آکر لگ جاؤ، تاکہ میں اپنی بے اعتنائیوں اور بیجا گھڑکیوں کا بدلا اُتار سکوں۔"

رقعہ پہنچا تو ڈاکٹر جعفری، جمیلی اور اندرا سب بجد خوش ہوئے۔ ڈاکٹر بولے کہ بھئی ماں کی ماتا کہاں تک ٹھنڈی رہتی۔ تینوں فوراً مع اسباب کے ایوانِ جعفری پہنچے۔ مکان میں داخل ہونا تھا کہ دوڑ کر جمیلی کی ماں نے اندرا کو لپٹا لیا: "بیٹا مجھے معاف کر۔ میں نے تیرے ساتھ بڑی زیادتیاں کی ہیں۔ تو میری بہو ہے، اپنی بوڑھی ساس کی باتوں کا کچھ خیال نہ کر۔ بیٹی، میرے سینے سے زور سے لپٹ جا۔ میں تجھے بجد چاہتی ہوں۔ اندرا بیٹی!" جمیلی اور اندرا کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔ اندرا زور سے جمیلی کی ماں کے لپٹ گئی۔

جمیلی کی ماں (اندر سے دودھ کا ایک گلاس لاکر) لے بیٹی، یہ دودھ پی لے۔ ہمارے یہاں رسم ہے کہ بہو پہلے پہل آتی ہے، تو دودھ پلاتے ہیں۔

اندرا نے شکریہ کے ساتھ دودھ پی لیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہیں۔ جمیلی کی ماں بجد مسرور تھی۔ ذرا دیر میں اندرا نے کہا کہ اُس کی طبیعت خراب معلوم ہوتی ہے۔ لمحہ کے لمحہ میں وہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔ جمیلی از حد پریشان ہوگیا، وہ ڈاکٹر کو ٹیلیفون دینے جا ہی رہا تھا کہ اندرا کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ جمیلی ہائے اندرا کہہ کر اُس کی لاش پر گر گیا جعفری ہکا بکا ہوگیا تھا۔ اُٹھانے بڑھا تو جمیلی بھی بالکل سرد تھا، اُس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اپنی انگوٹھی کا ہیرا چبالیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی تڑپ تڑپ کر جاں بحق ہوچکا تھا، تینوں لاشیں ایک عجیب بے نیازی کی شان میں پڑی تھیں، فضا پر اُداسی چھا رہی تھی۔ گھر بھر کے ملازم کھڑے حیرت زدہ سے ہوگئے تھے۔ اندرا اور جمیلی ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے، اُن کے لب ایک دوسرے میں پیوست تھے، ایک دائمی ہنسی اُن کے معصوم چہروں پر کھیل رہی تھی۔ فضا بالکل ساکت وصامت تھی کہ جمیلی کی ماں کی دلدوز چیخوں نے فضا کے سکوت کو درہم وبرہم کردیا۔

پیغام

مظلوم کو غرقِ صہبائے گلفام ہمیں کرنا ہے اُٹھو

لبریز لہو سے ظالم کے اک جام ہمیں کرنا ہے اُٹھو

جو مذہبوں سے حل ہو نہ سکیں اُن گتھیوں کو سلجھانا ہے

جو کام خدا سے ہو نہ سکا وہ کام ہمیں کرنا ہے اُٹھو

"پیش رو"

لفظِ آزادی

(یہ نظم محض اپنی معنوی حیثیت سے شائع کی جا رہی ہے)

نظر آزادی دفترِ اوراقِ عالم دیکھنے والے
جماعت در جماعت ربطِ باہم دیکھنے والے

یہی اک لفظ بنیادی ہے تعمیرِ حکومت کا
اِسی اک لفظ میں نقشہ دبستانِ سیاست کا

اسی اک لفظ میں دعوت ہے غور و فکر کی تجھکو
اِسی اک لفظ میں گویا ہے درسِ آگہی تجھکو

یہی اک لفظ منشیٔ ازل کا جو عطیہ ہے
اُسی اک لفظ پر شاہوں کا استادانہ قبضہ ہے

یہی اک لفظ جو دیباچۂ ہستی کا عنواں ہے
یہی جس کے عمل کی فطرتِ آزاد خواہاں ہے

یہی اک لفظ جو آئینہ انسانی شعائر کا
یہی اک لفظ گنجینہ حقائق کا بصائر کا

یہی اک لفظ باعث ہے زبانِ بے زبانی کا
اِسی سے ناطقہ ہے بند زعمِ حکمرانی کا

یہی اک لفظ جو ہے خاتمہ قیدِ غلامی کا
یہی عنوانِ مقصد ہے محبت کے پیامی کا

یہی اک لفظ ہم معنی ہے جو خود اختیاری کا
یہی جو ہے خلاصہ ہند کی مقصد براری کا

یہی اک لفظ جو ضامن ہے انصاف و عدالت کا
یہی مفہوم رکھتا ہے مساوات و اخوت کا

یہی اک لفظ جس پر خواجگی تیور بدلتی ہے
یہ جس سے بیکسی اعزاز کے سانچے میں ڈھلتی ہے

یہی اک لفظ جو ہے رُوحِ آئینِ جہانداری
اِسی پر مشرق و مغرب میں ہے اک کشمکش جاری

یہی اک لفظ جو بیدار کُن جذبات رکھتا ہے
یہی جو اپنی تہ میں حشرِ احساسات رکھتا ہے

یہی جس سے غرورِ شہریاری ٹوٹ جاتا ہے
یہی جس سے کہ پابندِ غلامی چھوٹ جاتا ہے

یہی جس سے غلام اپنی جگہ بیباک ہو جائیں
یہی جس پر ہزاروں عہد نامے چاک ہو جائیں

یہی اک لفظ بے معنی پئے ہندوستاں اب ہے
یہی جس میں کہ پنہاں دفترِ معنی و مطلب ہے

سمجھ اس لفظ کو ہمراز یہ ہے لفظِ آزادی
سیاست داں جماعت کو ہے جس پر زعمِ استادی

(آغاز برہانپوری)

ہندوستانی ورڈسورتھ

سید رضا قاسم مختار

فنا کے بعد بھی اہلِ کمال زندہ ہیں
زہے وہ کام کہ جس سے جہاں میں نام رہے

جبکہ نادرشاہ کے خونچکاں و خونریز حملے دلّی کو تاراج کر رہے تھے اور وہاں کی گلی کوچوں میں خون کے نالے بہہ رہے تھے اسی زمانے میں وہ وہاں پیدا ہوا تھا۔

میانہ قد، چوڑا سینہ، ورزشی بدن۔ بڑی آنکھیں، پتلیاں سیاہ، ستواں ناک، بڑی مونچھیں، کتابی چہرہ۔ پورے سر پر پٹّہ (زلفیں[1]) دونوں ابرو کے درمیان سیاہ تل، چیکَردار پگڑی، گاڑھے یا گزی کا سیدھے پردے اور نیچی چولی کا انگرکھا کبھی ترکا پاجامہ اور کبھی لُنگی (مارکین[1]) کا تہبند، جاڑے کے دنوں میں فرخ آبادی چھینٹ کا جُبّہ، پاؤں میں ٹھیلا جوتا اور کبھی ننگے پیر۔ ہاتھ میں آڑو کی خمیدہ و پیچدار چھڑی اور انگلی میں دو انگوٹھیاں عقیق سُرخ اور فیروزے کی پہنا کرتا تھا۔

اُس کا نام ولی محمد اور تخلص نظیر تھا، اُس کا باپ شیخ محمد فاروق عظیم آباد میں کسی نواب کا مصاحب تھا جس کی بارہ اولادیں ہوئی تھیں۔ مگر صرف وہی اکیلا بچ گیا تھا، اس لئے ماں باپ کا بہت ہی لاڈلا اور پیارا تھا، باپ کے مرنے کے بعد جب کہ اس کی عمر تقریباً بائیس سال کی تھی احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت وہ اپنی ماں اور نانی کو ساتھ لے کر آگرے (اکبرآباد) چلا آیا، اور تا زندگی وہیں ملکوں والی گلی محلہ تاج گنج میں سکونت اختیار کر لی تھی، اس کی شادی شیخ محمد رحمٰن کی بیٹی مسماۃ تہور بیگم سے ہوئی تھی جس کے بطن سے اُس کی دو اولادیں ہوئی تھیں، ایک لڑکا مسمیٰ گلزار علی اور ایک لڑکی امامی بیگم تھی۔

اوائل عمر میں بطلبِ روزگار متھرا جا کر کسی جگہ معلمی کی نوکری کر لی تھی۔ مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد پھر آگرے واپس آ کر لالہ بلاس رام کے یہاں سترہ روپے ماہانہ تنخواہ پر اُس کے لڑکے کو پڑھایا کرتا تھا۔ نیز مائی تھان میں دوسرے کا ئستھ طلبا کو بھی پڑھایا کرتا تھا، اور اسی طرح اُس کی تمام عمر درس و تدریس ہی میں بسر ہوئی اور یہی اُس کا دلچسپ شغلہ رہا۔

جوانی میں البتہ رنگین مزاج تھا اور عشق و عاشقی کا بھی شوق تھا، مشہور ہے کہ ایک طوائف سے بھی جس کا نام موتی تھا، اس کو تعلق ہو گیا تھا۔ مگر ضعیفی میں یہ کل باتیں بالکل ہی بدل گئی تھیں، اور گزشتہ عادات سے توبہ کر کے صوفی مشرب ہو گیا تھا۔ اور شاہ غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کر لی تھی۔ مذہبی جھگڑوں اور فرقہ دارانہ مناقشوں سے اس کو بالکل ہی بے تعلقی تھی۔ شاعری کے علاوہ ورزش و ریاضت اور موسیقی کا بھی خاص مذاق رکھتا تھا۔

فارسی میں قابلِ لحاظ دستگاہ رکھنے کے علاوہ تھوڑی بہت عربی بھی

---

[1] ہمارے صوبہ بہار میں پٹے کو زلفی اور لُنگی کو مارکین کہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رضا قاسم

جانتا تھا اور فنِ خوشنویسی سے بھی واقفیت رکھتا تھا۔ اُس کی طبیعت میں آسودگی اور قناعت اس درجہ تھی کہ نواب سعادت علی خاں کی طلبی کے باوجود لکھنؤ جانے سے اُس نے انکار کر دیا، اور اسی طرح راجہ صاحب بھرت پور کے یہاں بھی نہ گیا۔

اُس کے مزاج میں متانت اور شوخی اور طبیعت میں تفنن بدرجۂ اتم موجود تھا، خلق و انکسار میں وہ بےمثل تھا اور بیکسوں کی خبرگیری اور غریبوں سے ہمدردی اُس کا شعار تھا، وہ نہایت ہی صحبت پسند تھا، اور مختلف قسم کے لوگوں سے میل جول رکھتا تھا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ جب اُس کا انتقال ہوا تھا تو اُس کے جنازے میں مسلمانوں کے علاوہ ہزاروں ہندو بھی شریک تھے۔

وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں میں ہمیشہ بےدریغ شریک ہوا کرتا، اور اُن کے میلے ٹھیلوں کی خوب سیر کیا کرتا، انہی وجوہ کی بنا پر اُس کا تجربہ بہت وسیع تھا، اور بقول شکسپیئر "عقلمند پتھر سے وعظ سنتے ہیں، اور ہر چیز سے اچھائی حاصل کرتے ہیں"؛ اُس نے اپنی اس طرزِ معاشرت کا بہت بڑا فائدہ اُٹھایا تھا جس کا ثبوت اُس کے کلام سے ملتا ہے، اُس نے معمولی معمولی باتوں کو ایسی دلچسپ تفصیل سے بیان کیا ہے کہ بغیر تعریف کئے رہا نہیں جاتا۔ اُس کی معلومات غیر محدود، اُس کا خزانۂ لغات غیر مختتم اور اُس کی صفائی بیان دلکش ہے۔ وہ دوسرے ہندوستانی شعراء کی طرح عاشقانہ نغمے نظم نہ کرتا تھا، اُس کی رگوں میں خالص ہندوستانی خون دوڑ رہا تھا، اُس کے قلب میں وطن پرستی کی آگ مشتعل تھی، چنانچہ اپنے مُلکی لوگوں کی معاشرتی و ذہنی ترقی کا خیال اُس کی حب الوطنی کا بیّن ثبوت تھا، شاعری میں وہ کسی کا شاگرد نہ تھا، مگر اُس کے بہت سے شاگرد تھے، اُس کی نظمیں حقیقت میں ایک نگارخانہ ہے جس میں کھیل کود، عیش و آرام، مسرت و شادمانی، غم و الم، دکھ درد اور ہندوستانیوں کے دل و دماغ کی زندہ و متحرک تصویریں نظر آتی ہیں۔

اس کا معیارِ شاعری نیچرل تھا، اور معاصر ہندوستانی شعراء سے اُس کا رنگ بالکل ہی جدا تھا، وہ یورپ کے شعراء کی طرح مبالغے اور صنعت سے بیزار تھا، اور سیدھی سادھی باتیں اور حقیقی کیفیتیں صاف اور ستھری زبان میں نظم کیا کرتا تھا۔ مناظرِ قدرت، واقعاتِ عالم، اور جذباتِ انسانی وغیرہ اُس کی نظموں میں بکثرت پائے جاتے ہیں چنانچہ فطرت نگاری کی حیثیت سے بجا طور پر وہ ہندوستانی ورڈسورتھ کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ نیز اُس کی متصوفانہ شاعری نے اُس کو اُردو زبان کا امیر خسرو بنا دیا ہے اور یہ اس کا ایسا گہرا رنگ تھا جو اُس کے تمامی کلام پر حاوی ہے اور بقول ؎

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی
کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

وہ مذہبی تعصبات اور نسلی امتیازات کا محض مخالف ہی نہ تھا، بلکہ اس قسم کی باتوں کو نہایت نفرت اور حقارت کی نظروں سے دیکھا کرتا تھا، یہی وجہ تھی کہ ہندو اُس سے اس قدر غلط ملط رہتے تھے کہ وہ صرف اُن کے رسم و رواج، ان کی زبان، اُن کے خیالات ہی سے نہیں بلکہ اُن کے معتقدات تک سے کماحقہ واقف ہو گیا تھا، جس کو اُس نے اپنے کلام میں ایسی خوبی اور صحت کے ساتھ اس قدر دلچسپ طریقے پر بیان کیا ہے کہ اُس کی ہمہ دانی میں مطلق شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

دوسرے مذاہب یا اُن کے لوازم پر ہنسی اُڑانا تو درکنار وہ کبھی اُن کو حقارت کے ساتھ بھی نہ دیکھتا تھا۔ جو کہ ہمارے ہندوستانی شعراء میں صرف کمیاب ہی نہیں بلکہ نایاب ہے، وہ مسلمان یا ہندو نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں ایک ہندوستانی شاعر تھا، اس نے ایسے الفاظ کو جنھیں ہمارے شعراء ادنیٰ اور بازاری کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اپنے کلام میں جگہ دی اور اپنے معاصرین کو دکھلا دیا کہ ان میں کیسی کیسی خوبیاں پوشیدہ ہیں جن کو شاید ظاہر بین نگاہیں نہیں دیکھ سکی تھیں۔

اُس کی ہمدردی اور محبت صرف بنی نوعِ انسان کے ساتھ محدود نہ تھی بلکہ حیوانات کے علاوہ غیر ذی روح اشیا سے بھی وہ ایک خاص اُنس و محبت رکھتا تھا، چنانچہ اُس کی نظمیں ریچھ کا بچہ۔ گلہری کا بچہ۔ ہرن کا بچہ۔ اور بلبلوں کی لڑائی وغیرہ جانوروں کے متعلق نیز روٹی دال اور تربوز وغیرہ بے جان چیزوں کے متعلق نہایت دلچسپ اور جزئیات سے اس قدر مملو ہیں کہ پڑھنے والے کو شاعر کی کماحقہ واقفیت اور ہمہ دانی پر سرِ تسلیم خم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ بڑے تو بڑے چھوٹے بچے تک اُس کی چھوٹی چھوٹی نظمیں مثلاً کبوتر بازی، پتنگ بازی، ہولی، دیوالی، بسنت اور عید وغیرہ پڑھکر باغ باغ ہو جاتے ہیں۔

وہ مثل گرو نانک کے تارک الدنیا فقیر اور سادھو منش شاعر تھا، اُس کی

وسیع النظری، آزاد خیالی۔ ہمہ گیری اور بے تعصبی ایسی خصوصیات ہیں جو اُس کے کلام کو تمامی شعرائے اُردو کے کلام سے ممیز و ممتاز کرتی ہیں۔ اُس کے اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ولی کامل دنیا کی بے ثباتی پر پُرزور وعظ کہہ رہا ہے، اور ایک دوسری زندگی کی تعلیم دے رہا ہے، جو بہر طور رذائل و معائب سے بالکل ہی پاک و صاف ہے۔ اُس کی بعض ایسی دلچسپ اور مؤثر نظمیں بھی ہیں۔ جن کے اشعار اکثر فقیر اور سادھو نہایت خوش الحانی سے پڑھ پڑھ کر سننے والوں کے دلوں کو ---------------

---- نہایت درجہ موثر اور بیتاب کر دیا کرتے ہیں۔ اُس کی تمثیلیں نہایت خوب اور بہت ہی دلکش ہیں۔ اُس کی نظمیں موت اور بنجارہ نامہ نہایت ہی مشہور ہیں۔ جو مغرور اور سرکش لوگوں کے لئے تازیانۂ عبرت کا کام کرتی ہیں۔ ان نظموں میں دنیا داروں کو وہ آگاہ کرتا ہے، کہ دنیا فانی ہے اس کو چھوڑ دو۔ اس کے لذات کی طرف سے مُنہ موڑ دو اور عاقبت کی فکر کرو۔ چنانچہ اس معانی میں اس کا مقابلہ سعدی علیہ الرحمۃ سے خوب ہو سکتا ہے، کیونکہ دونوں کے کلام صاف، سلیس اور تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں خذ ما صفا ودع ما کدر کے مصداق مغرب میں ہمیشہ یہی دستور رہا ہے کہ کسی کے کلام کی تعریف نہیں کی جاتی جب تک کہ اس میں کسی قسم کا کمال نہ پایا جائے، چنانچہ اُنھوں نے نظیر کے کلام کو بھی پرکھا اور اپنی قیمتی اور بے لوث رایوں کا اعلان کر دیا۔ بڑے تعجب اور لطف کی بات ہے کہ جس پر ہمارے ہندوستانی شعرا غلط گوئی اور عامیانہ و سوقیانہ الفاظ کے استعمال کا الزام لگاتے ہیں، اُسی شاعر کو ڈاکٹر فیلن حقیقی ہندوستانی شاعر کہتا ہے، اور اُسی کے اشعار کا بیشتر حصہ اپنی مشہور و معروف لغت میں بطور سند پیش کیا ہے ؎

حافظ از بادِ خزاں در چمنِ دہر مرنج
فکر معقول بفرما گُلِ بے خار کجا

ڈاکٹر موصوف نے اپنی لُغت" کے دیباچے میں جو کچھ اس حقیقی شاعر کے متعلق حوالہ قلم کیا ہے اُس کا ملخص ترجمہ درجِ ذیل کیا جاتا ہے۔ ع

قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

"شعرا ہند میں صرف نظیر اکبرآبادی ہی ایک ایسا شاعر ہے جو مغرب کی حقیقی شاعری کے قائم شدہ معیار پر پورا اترتا ہے اور وہ صحیح معنوں میں شاعر کہلانے کا مستحق ہے۔ مگر تعجب ہے کہ وہ ہندوستانی جن کے نزدیک معانی سے زیادہ الفاظ کی بندش اہمیت رکھتی ہے، اس کو شاعر ہی ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ لیکن اس سے اس کی شہرت اور مقبولیت میں کوئی کمی پیدا نہیں ہو سکتی، کیونکہ اُس کے اشعار تو مقبولِ عام اور زباں زدِ خلائق ہو چکے ہیں۔ اور اُس کی ذات اُن کُل ذہنی و جذباتی خوبیوں کی حامل ہے جو ایک پختہ کار شاعر میں ہونی لازمی ہیں۔

اُس کی نظموں میں اُس کی شخصیت کا ہر پہلو نمایاں ہے۔ اور اُس کے اشعار اُس کی سوانح حیات کا کامل مرقع ہیں۔ وہ فی الحقیقت ایک آزاد مرد اور تارک الدنیا بیراگی تھا، جو تقدیر کی عنایات اور حوادث روزگار سے بالکل ہی بے پرواہ تھا، خوش قسمتی اس کو مسرور یا بدنصیبی اُسے ہرگز ملول نہیں کر سکتی تھی اور وہ اپنی کھال میں ہمیشہ مست رہا کرتا تھا۔

وہ بڑی حد تک ایک نئی طرز کا مُوجد تھا، اور اُس کی جولانیٔ طبع اُس کے مختلف مضامین سے آشکار رہی ہے۔ اُس نے ایسی ایسی چیزوں پر نظمیں لکھی ہیں جن پر ہندوستان کے کسی دوسرے شاعر نے اب تک طبع آزمائی نہیں کی ہے۔ مگر افسوس کہ ہندوستانی اپنی جہالت کی وجہ سے انھیں مضامین کی بنا پر اس کو شاعر تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نظیر شاعر کہلائے جانے کا ہرگز مستحق نہیں ہے، کیونکہ اُس نے تو آٹا، دال، روٹی، مکھی اور مچھر وغیرہ جیسے مبتذل مضامین کو نظم کیا ہے، اور عامیانہ و سوقیانہ الفاظ کی آمیزش سے اردو زبان کو غارت و برباد کر دیا ہے۔"

واقعی نظیر جیسے شاعرِ بے بدل نے اپنی مادری زبان میں جواہر اکٹھا کر رکھے ہیں۔ اُس نے اپنی نظموں میں وہی کچھ کیا ہے جو کہ چوسر اور شکسپیر جیسے ماہرینِ ادب نے اپنی زبانوں میں کیا ہے، اُس نے ہندی الفاظ کو اردو زبان میں اس خوبی سے استعمال کیا ہے کہ اس سے بہتر صورت خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ اُس نے نئے نئے الفاظ اور بندشیں بڑی جرأت اور خود اعتمادی سے استعمال کر کے اردو زبان کو مالا مال کر دیا ہے

اُس کا کلام "کلیات نظیر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، نیز محترمی سید عابد حسین ساکن شاہ گنج آگرہ اُس کا بقیہ غیر مطبوعہ کلام جمع کر رہے ہیں، اور اس کی چار جلدیں مرتب کر چکے ہیں، چنانچہ یہاں پر اُس کے چند اشعار بطور

نمونہ نقل کئے جاتے ہیں ؎

اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یہ کچھ بہروپ پن دیکھو کہ بن کر شکل دانے کی
بکھرنا، سبز ہونا، لہلہانا پھر کرشٹ جانا

تلخی مرگ جسے کہتے ہیں افسوس افسوس ایک دن سب کے تئیں زہر یہ کھانا ہوگا
دیکھ لے اس چمن دہر کو دل بھر کے نظیر پھر ترا کاہے کو اس باغ میں آنا ہوگا

مرد و زن، طفل و جواں، خرد و کلاں، پیر و فقیر
جتنے عالم میں ہیں محتاج و گدا شاہ و وزیر
سب کے دل ہوتے ہیں پھندے میں خوشامد کے اسیر
تو بھی واللہ بڑی بات یہ کہتا ہے نظیر
جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
حق تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

اپنی عمر کے آخر پانچ سال تک ہندوستان کا وہ مایۂ ناز شاعر بہت ہی کبرسنی اور ضعف کے باعث خانہ نشین ہو گیا تھا۔ گھر کے اندر دالان میں قیام رہتا تھا، صحن میں اُتر جانب نیم اور بیر کے درخت تھے جن کے سائے تلے کبھی کبھی بوریا بچھا کر بیٹھا کرتا تھا، یہاں تک کہ تقریباً سو سال کی عمر میں فالج کے مرض میں مبتلا ہو گیا جس کے باعث زبان ماؤف ہو گئی تھی، اور آخر کار سولہویں اگست ۱۸۳۰ء مطابق ۲۶ ویں صفر المظفر ۱۲۴۶ھ کو انتقال ہوا اور اپنے ہی صحن میں نیم کے درخت کے نیچے مدفون ہوا پختہ قبر موجود ہے۔ جس پر متذکرہ درخت سایہ کئے ہوئے ہیں۔ اور جہاں اب تک ہر سال ۲۶ صفر المظفر کو عرس ہوا کرتا ہے ؎

ہے دلا کس کو دوام اس گردش افلاک میں
خاک کے پتلے ہزاروں مل گئے ہیں خاک میں (ناسخ)

آخر میں یہ بھی عرض کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ ہندوستان کی وہ بے بدل ہستی جس نے اپنے حکیمانہ و فلسفیانہ کلام کے ذریعہ اپنی زبان، ملک اور قوم کی درستی و ترقی کے لئے جان و دل سے کوشش کی ہے۔ آج ہم میں موجود نہیں ہے، تاہم وہ اپنے پُر اثر مواعظانہ کلام کی وجہ سے یقینی طور پر زندۂ جاوید ہے، کیونکہ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

کسی کی آمد

وہ دیکھو میری ۔۔۔۔۔۔ نور برساتی ہوئی آئی
شراب و شعر کی دنیا کو شرماتی ہوئی آئی

وہ آئی، رنگ و بو کی ایک دنیائے حسیں لیکر
وہ آئی اور رنگ خلد برساتی ہوئی آئی

وہ انداز حسیں اس کا، وہ روئے آتشیں اسکا
وہ گھبراتی ہوئی آئی وہ شرماتی ہوئی آئی

وہ چھائی اک بہار تازہ بنکر میری ہستی پر
شباب و حسن کے انداز دکھلاتی ہوئی آئی

نگاہ شوق جس کی منتظر تھی ایک مدت سے
وہ آئی اور میرے دل کو گرماتی ہوئی آئی

محمد ضیاء الاسلام

شیلا و سلیم

سجاد حیدر ملیح آبادی

(۱)

سلیم کی گھٹی میں مذاق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اور کالج کی تعلیم نے تو اُس کے اس جذبہ کو اور بھی اُبھار دیا تھا۔ لذّتِ غم سے وہ قطعاً ناآشنا تھا، اُس کی زندگی ایک رنگین زندگی تھی، جو فطری رنگوں میں رنگی ہوئی تھی۔ اُس میں محبت کے تاثرات بھی تھے جس کا وجود ایک بالغ نظر نوجوان کے دل کے ساتھ لازم و ملزوم کا تعلق رکھتا ہے۔ شباب جب اپنے نکھار کے ساتھ ایک ناقابلِ اظہار حشر دنیائے دل میں پیدا کر دیتا ہے، تو عشق ایک انگڑائی لے کر رونگٹے رونگٹے کو چونکا دیتا ہے۔ یہی کیفیت سلیم کی بھی تھی۔

آہ عشق کا اندھا دیوتا، یہ نہیں جانتا کہ اُس کے زہر میں بجھے ہوئے تیر کون سے دو دلوں میں پیوست ہو رہے ہیں۔ وہ تیر چلائے جاتا ہے.... اُسے جوانی کا علم ضرور ہوتا ہے...... نہ جانے کیسے...... لیکن اغلباً وہ مذہب و ملت کی تفریق کو ناجائز قرار دیتا ہے...... چنانچہ سلیم کی سرشت میں بھی یہی راز نہاں تھا، اور جس کے عقدے وقت کے ساتھ ساتھ کھلتے چلے گئے۔ اور جب وہ نیک و بد سوچنے کے قابل ہوا تو اُس نے اپنے دل کے اُفق پر ایک غیر مذہب دوشیزہ کو جلوہ گر پایا۔ بچپن میں لاگ سی تھی...... جو جوانی میں آگ بن گئی۔ وہی جو کل تک آنکھ مچولی کھیلتے تھے، آنکھ ملاتے ہوئے شرمانے لگے۔ دم بھر الگ رہتے تو اُداس ہو جاتے ...... خدا جانے کیوں...... کچھ تھا ضرور جو اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ جس کا احساس رفتہ رفتہ پیدا ہو چلا تھا، اور اب وہ سوسائٹی اور وقت کی ضرورت کی بنا پر الگ رہنے پر مجبور ہو گئے...... آہ سلیم جسے اپنے نام سے ذرّہ بھر بھی تعلق نہ تھا، جو سلیم الطبع ہونے کی بجائے شوخ واقع ہوا تھا، اکثر سنجیدہ اور قدرے رنجیدہ بھی ہو جاتا تھا، ہاں وہی سلیم جو اپنی ظرافت کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکا تھا، آہیں بھرنے لگا۔ ایک جذبۂ محبت کی بنا پر...... ورنہ اور کیا وجہ ہو سکتی تھی۔

(۲)

دسمبر کی ایک اندھیری رات...... تاریک...... بھیانک ...... خوفناک تیز ہوا چل رہی تھی۔ گورنمنٹ کوارٹرز کے اس طرف جیل کے ساتھ ساتھ ایک تنہا سڑک پر ایک تن تنہا نوجوان خوبصورت لڑکی.... اُف وہ...... دُور تک برقی لیمپوں پر پروانے جھومتے نظر آ رہے تھے، لیکن سڑک بالکل سنسان تھی، سوائے اُس اکیلے راہگیر کے...... وہ ٹھٹھری بار بار اِدھر اُدھر دیکھتی چلی جا رہی تھی، اپنے خیالات میں مگن، کبھی کبھی برقی لیمپوں کے نیچے پہنچتی تو خوف و ہراس کے بجائے اُس کے چہرے پر اُداسی کی لہریں دوڑتی ہوئی نظر آتیں۔ لیکن وہ اپنی منزل کی طرف لپکی ہوئی چلی جا رہی تھی، اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اسپتال کی گھڑی نے بارہ بجائے.... وہ چونک پڑی ...... اُس نے اپنے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو اور تیز کر دیا۔ اب اُس کی منزل بہت قریب تھی، وہ ایک کوارٹر کے قریب آ کر رُکی۔ شاید غیر ارادی طور پر اُس نے اندر جھانک کر دیکھا، ایک کمرے کی کھڑکی سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی...... قبروں کی

طرح..... ستارے آسمان پر آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ستارہ بھاگ کھڑا ہوتا تو آسمان ایک لمحہ کو جگمگا اٹھتا...... کبھی کبھی پہرے دار کی آواز خاموشی کو توڑتی ہوئی کانوں کو زخمی کر جاتی تھی۔ لیکن وہ ان سب سے بے خبر۔ ان سب سے بے پروا جھانک رہی تھی۔

سلیم کرسی پر بیٹھا ہوا۔ بڑی بے تابی سے اُس کا انتظار کر رہا تھا، آہ سلیم، آج واقعی سلیم ہو چکا تھا، آج تک اُس کو کسی نے اس انداز میں نہیں دیکھا تھا، یک بیک ایک دوسرے کمرے سے آواز آئی۔

"تم اتنی رات گئے تک نہیں سوئے، کیا بات ہے بیٹا؟ اب سو جاؤ"

"ابھی سوتا ہوں۔ آپ سو جائیں" اتنا کہہ کر وہ پھر اپنے منتشر خیالات میں غرق ہو گیا۔

شیلا یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی....... وہ سب کچھ سُن رہی تھی، لیکن خاموش تھی، وہ سلیم کی تذبذب کی وجہ بھی جانتی تھی، مگر خاموش تھی، اُس کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ وہ اُس سلیم کو جس کو وہ مدت سے اپنا چکی ہے مخاطب کرے...... ہاں...... آج کی رات...... آج کی رات...... اُسے ایک تلخ ترین حقیقت کا انکشاف کرنا ہے۔ اُس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ گھڑی کی طرف...... وہ رونے لگی، اُس کو سردی کی شدت کا احساس اب ہوا۔

اُس نے آہستہ سے شیشے پر دستک دی۔ سلیم کرسی پر اُچھل پڑا، اور دروازے کی طرف لپکا، اُس نے جلدی سے دروازہ کھولا، اور شیلا کو اندر بلا لیا۔ پھر خاموشی سے تمام دروازوں اور کھڑکیوں کو بند کیا، اور اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اُس نے شیلا کے برف سے ہاتھوں کو پکڑتے ہوئے کہا: "شیلا بہت سردی تھی، آج تو تمہیں بہت تکلیف ہوئی ہوگی" شیلا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ہاں اگر کسی اور کے لئے آتی تو تکلیف ہوتی۔ مگر تمہارے لئے نہیں لیکن یک لخت اُس نے تن کر کہا "سلیم صاحب اب وہ سننے کے لئے تیار ہو جایئے جس کی توقع شاید آپ کو خواب میں بھی نہیں ہو سکتی، آپ کو معلوم ہے کہ اس مذہب کی دیوار نے حائل ہو کر ہمارے ارمانوں کی دنیا کو الگ کر دیا، اور فی الحقیقت ہم اپنے آپ کو اس سے مستثنیٰ بھی نہیں کر سکتے۔ باوجود اعلیٰ تعلیم کے...... باوجود موجودہ متغیر زمانے کے ہمارے والدین، ہماری سوسائٹی، ہمارا ضمیر ہمیں ایک نہیں کر سکتے۔ سلیم صاحب! آپ دیکھ رہے ہیں...... ہاں...... استفہامی نظروں سے، لیکن آپ کی سوالیہ نگاہیں، میرا جواب نہیں بن سکتیں۔ آج میں نے اپنے جی کو کڑا کر لیا ہے اور میں بغاوت کر رہی ہوں...... آپ سے...... اپنے والدین سے...... اپنے مذہب سے...... اور اپنے آپ سے، چونکہ میرے خیال میں محبت نام ہے اُس کیفیت کا۔ جسے عوام جنون کے نام سے پکارتے ہیں۔ چنانچہ ؎

رہے جو عشق جنوں تک تو موت ہے لیکن
فنا کے گھاٹ سے اُترے تو زندگی ہو جائے

چونکہ ہمیں اپنی موت پر قدرت حاصل نہیں، اس لئے اپنی زندگی پر اختیار رکھتے ہوئے میں نے اپنے لئے ایک ایسی زندگی تجویز کی ہے جسے عیسائیت ایک راہبہ (NUN) کے نام سے موسوم کرتی ہے، اس سے زیادہ نہ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں نہ سننا، بس سمجھ لیجئے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے...... آخری..... ہاں آخری..... ہم زیادہ دیر تک دنیا کی آنکھوں میں دُھول نہیں جھونک سکتے۔ ہم لاکھ پاکیزہ ہوں۔ لیکن دنیا کی اُنگلیاں اُٹھیں گی...... ضرور اُٹھیں گی...... چنانچہ میں بدنام ہو چکی ہوں اور میں ذلت کی زندگی سے گمنامی کی زندگی کو ترجیح دیتی ہوں، بس میں کہہ چکی کہ آپ سے کچھ سننا نہیں چاہتی۔

اُس کے بعد اُس کا جی بھر آیا، اُس کی نسائیت عود کر آئی، وہ دروازے کی طرف لپکی۔ سلیم نے اپنے ہاتھ اُٹھا کر کچھ کہنا چاہا۔ لیکن وہ جا چکی تھی۔ سلیم نے باہر نکل کر دیکھا۔ چاروں طرف خاموشی اور تاریکی چھائی ہوئی تھی، اور شیلا اُس تاریک فضا میں گم ہو چکی تھی۔

(۳)

شیلا کے جاتے ہی سلیم کی دُنیا بدل گئی، وہ ہر وقت اُسی کے خیالات میں ڈوبا رہتا۔ اُس کی والدہ اُس کو سمجھاتیں، وہ خاموشی سے سب کچھ سنتا۔ دفتر جاتا تو اُس کا دل و دماغ اُس کی اُنگلیاں اُس کو جواب دے جاتیں۔ وہ کام باقاعدگی کے ساتھ نہ کر سکا۔ دفتر سے غیر حاضری بھی ہونے لگی۔ جس کی وجہ سے اُسے کافی خفت اُٹھانی پڑتی۔ اُس کے دوست اُس سے مایوس ہو گئے۔ بالآخر اُس نے اِس حالت سے مجبور ہو کر چار ماہ کی رخصت لے لی۔ اب وہ بالکل بیکار تھا، اور پہلے سے بھی زیادہ بیتاب،

اُس کی حالت اس قدر بدل گئی تھی کہ اُسے پہچاننے میں بھی دقت ہوتی، اُس کی پریشانی حد سے تجاوز کرچکی تھی، وہ نیم پاگل سا ہوگیا تھا، حتیٰ کہ وہ گاہے گاہے مجنونانہ حرکت بھی کر بیٹھتا، اُس کی کیفیات ایک بچہ کی سی تھیں، جو دوسرے کے ہاتھ کا کھلونا ہو۔ اگر کھانا لے آتی تو کھا لیتا، ورنہ اُس کو بھوک تو قطعاً نہ لگتی۔ غرض کہ وہ پاگل ہوچکا تھا،

آہ بیچارہ سلیم، صرف وہی جان سکتا تھا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں ٹھیک کر رہا ہوں۔ میرا ہر قدم صحیح پڑ رہا ہے، لیکن افسوس دُنیا والے ایسا نہ سمجھتے، اور اُسے مجنون کہتے۔ شیلا نے اپنے جانے کے بعد کوئی خط بھی نہ لکھا تھا۔ شیلا کے والد کئی دفعہ سلیم کے گھر تک پہنچے، لیکن اُس کو پاگل سا دیکھکر لوٹ آئے، وہ اُس دیوانے کو اور زیادہ مجروح کرنا نہیں چاہتے تھے، گو اُن کے دل کو بھی ایک ناقابلِ برداشت ٹھیس لگ چکی تھی، لیکن وہ اس کو برداشت کر گئے۔ ایک کڑوی دوا تھی جسے پی گئے۔ خوشی سے یا ناخوشی سے...... بہرحال پی گئے...... کسے معلوم کیوں.... شاید اس لئے کہ وہ اس ناشدنی بیٹی کی موت چاہتے تھے جو ایک غیر مذہب کے فرد سے گناہِ محبت کا ارتکاب کرچکی تھی، لیکن وہ غمگین ضرور تھے۔

(۴)

آج سلیم خلافِ معمول گھر میں بیٹھا ریڈیو سن رہا ہے شاید اُسے اپنی حالت کا علم ہوچکا ہے، یا شاید اس لئے کہ وہ شیلا کو بھول جانا چاہتا ہے، آج اُس نے پھر داڑھی بنوائی، بال ترشوائے، نیا سوٹ نکالا اور پہنا، اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا، مانگ نکالی، بازار سے نئی ریشمی ٹائی لایا.... اور اُسے لگایا..... پھر جیب سے ایک شیشی جس پر انگریزی حروف میں (Poison.) لکھا تھا، نکالی، اُسے دیکھا اور خوب زور سے ہنسا........ اتنا کہ چند راہگیروں نے اُس کے مکان کی طرف گھور گھور کر دیکھا، اُس کی والدہ نے کمرے میں جھانکا، اور سلیم کو نئے کپڑوں میں دیکھکر اُس کے غمگین چہرے پر ہنسی کھیلنے لگی، اُسے یقین ہوگیا کہ اُس کے بیٹے کی تپِ عشق اُتر گئی، اُس کا بیٹا اب سنبھل چکا ہے........ لیکن اُس کو اس امر کا علم نہ تھا کہ یہ بجھتی ہوئی چنگاری کی آخری نمود ہے۔ سلیم نے شیشی کو جیب میں ڈال لیا، اور ریڈیو کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

پروگرام ڈائرکٹر نے سنایا، اب مس میلا کماری بی اے ایک غزل گائیں گی، جس کا مطلع ہے ؎

ترے خیال کی وسعت کو پا رہا ہوں میں
کہ تیرے راز تجھی کو بتا رہا ہوں میں

وہ سننے لگا، ہر شعر پر غور کرنے لگا، گانے والی کے گلے میں کچھ ایسا رس تھا کہ سلیم بے خود سا ہوگیا، جب وہ اس شعر پر پہونچی ؎

پھر آج کھول دے در گھر سنوار لے اپنا
کہ آج پھر تری خلوت میں آ رہا ہوں میں

تو وہ مضطرب سا ہوگیا، اُس نے سوچا یہ شعر تو بالکل میرے حسبِ حال ہے، یہ میرے راز سے آگاہ معلوم ہوتی ہے........ ہاں..... اور یہ آواز مہین میٹھی میٹھی کس کی ہے اور میں اس آواز سے کچھ مانوس بھی ہوں، یہ آواز..... یہ آواز........ وہ سوچنے لگا........ اُس نے انگلی کو دانتوں میں دبا لیا....... یہ آواز...... وہ سوچتا رہا، تاآنکہ اُس نے مقطع پڑھا،

پھر آج دشت نوردی کو جا رہا ہوں ظفر
پھر اپنے عشق کا سکّہ جما رہا ہوں میں

معاً اس کے دل میں خیال آیا، وہ جلدی سے اُٹھا اور سڑک کی طرف دوڑنے لگا، ٹانگہ میں بیٹھکر ریڈیو اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا، ٹانگہ شہر کے ہجوم کو چیرتا ہوا علی پور روڈ پر ہولیا۔ سڑک صاف تھی۔ ٹانگہ والے نے ٹانگہ کو تیزی سے دوڑانا شروع کر دیا۔ کئی مرتبہ وہ ٹانگوں اور موٹروں سے ٹکراتے بچا، لیکن قدسیہ باغ کی موڑ پر ایک مقابل سے آنے والے ٹانگہ سے اس زور سے ٹکرایا کہ دونوں بم ٹوٹ گئے اور ایک پہیہ بھی جواب دے گیا، دوسرے تانگے کا ہُڈ گر گیا اور سلیم اپنی نشست سے اچھل کر دوسرے تانگہ کی چھت پر جا گرا، دونوں گھوڑے زخمی ہوچکے تھے۔ اُن کی چوٹوں سے خون نکل رہا تھا، دوسرا تانگہ والا پہلے تانگے والے پر برس پڑا۔ سلیم کچھ بے ہوش سا ہو رہا تھا یک لخت اسنے محسوس کیا کہ وہ جس چھت پڑا ہے اس کے نیچے کوئی متنفس ہے اُس نے چھلانگ لگا کر چھت کو اُٹھایا، نیچے شیلا بے ہوش پڑی تھی، سلیم جلدی سے شیلا کو اُٹھایا اور دیوانہ وار چلا، شیلا کو نکلسن پارک میں لٹا کر قریب نل سے اپنا رومال بھگو لایا، اور ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا، اُسے اپنی چوٹ کا احساس نہ تھا، خون کے گرم گرم قطرے اس کے ماتھے سے گر رہے تھے، لیکن وہ اس وقت عالمِ جذب میں تھا اُس کو اپنی زندگی اور موت

کی پروا نہ تھی۔ اس لئے کہ اس کو کھوئی ہوئی شیلا مل چکی تھی۔ شیلا کو جب کچھ جلد اُس کی گھبراہٹ دور ہوگئی، اُس نے دھیمی اور کمزور آواز میں کہا "سلیم تم" ہوش آیا تو اُس نے اپنے آپ کو ایک نامحرم کے پاس پایا، وہ گھبراگئی، لیکن بہت "ہاں شیلا" اُس نے جواب دیا،

شیلا نے آخری مرتبہ آنکھیں کھولیں اور سلیم کو ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا

ہمارا ادب

وجاہت سندیلوی

"مجھے چھوڑیئے مجھے جانے دیجئے"

"نہیں، نہیں، ابھی نہیں، مجھے تم سے محبت ہے"

کبھی آپ نے کسی خونخوار جانور کو اپنا شکار بھنبوڑتے دیکھا ہے؟ بس اُسی طرح ایک سنسان شام کو ایک خلوت کدہ میں محبت کی تفسیر کی جارہی تھی۔

میں خلوت کدہ سے باہر نکلی تو رات چھا چکی تھی۔ ہر طرف تاریکی تھی، لیکن مجھے ایک روشنی دکھائی دی۔ آج میری آنکھوں سے پردہ ہٹ چکا تھا، اور میں صاف دیکھ رہی تھی کہ محبت کیا ہے۔ کتنا پیارا لفظ ہے "محبت" مُ، حب، بت۔ لیکن اس معصوم لفظ کی آڑ میں کیسے کیسے بوالہوسی کے وحشتناک سانپ اینڈ رہے ہیں، بل کھا رہے ہیں۔ انسان سب سے زیادہ دھوکہ اپنے آپ کو دیتا ہے، جس طرح اُس نے اپنی مختلف قسم کی نفسانی خواہشات پر پردے ڈال رکھے ہیں۔ اسی طرح اُس نے ایک خاص قسم کی نفسانی خواہش پر بھی کیا پردہ ڈالا ہے، مُ حب بت۔

اس شام کو قصور میرا تھا، اس کی کیا خطا؟ میں کیوں اس کی بھکی بھکی باتوں میں آگئی میں کیوں نہ سمجھی کہ محبت کا معصوم لفظ کن کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے؟ خیر اب گزری ہوئی بات کا افسوس ہی کیا؟ کچھ ہوا! اب میں سمجھ تو گئی کہ یہ رنگین شعبدہ کیا ہوتا ہے، باپ اپنے لڑکے سے محبت کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اُس کا ہے، اُس سے اُس کو توقعات ہیں، اس کا نام ہے شفقت پدری! کبھی آپ نے کسی باپ کو کسی دوسرے کے لڑکے سے بھی محبت کرتا دیکھا ہے، فقیر کو کھانا دیا جاتا ہے، اس لئے کہ کہیں گھر میں کھانا خراب نہ ہو جائے، اس کا نام ہے خدا ترسی! کبھی آپ نے کسی کو اپنا پیٹ کاٹ کر بھی فقیر کو کچھ دیتے دیکھا ہے؟! اہا ہا ہا ہا ہم نے الفاظ کے کیسے رنگ برنگی پردے ڈال رکھے ہیں، محبت! یہ بھی بلی کے خوشنما سمور میں چھپا ہوا ایک خونخوار پنجہ ہے!

ہاں تو اس نے وہی کیا جو اُسے کرنا چاہیئے تھا، جب میں اس سنسان شام کو اس سے تنہا ملنے گئی تھی تو مجھے پہلے ہی سے غور کر لینا چاہیئے تھا کہ وہ کیا کرے گا، لیکن نہیں غلطی میری بھی نہیں، غلطی ہے میرے ماحول کی، غلطی ہے میرے ادب کی، اُس نے مجھے پہلے ہی سے کیوں نہ بتادیا، کہ جو غواص محبت کے دریا میں کودتا ہے وہ صرف اس کا صاف و شفاف پانی دیکھکر نہیں کودتا، وہ کودتا ہے، اس کے کنول نکالنے کے لئے وہ کودتا ہے اُس کے موتی لانے کے لئے وہ کودتا ہے، اُس کے پانی سے اپنے جسم کو راحت پہنچانے کے لئے۔

اس سنسان شام کو میں خوش تو ہوئی کہ مجھے معلوم ہوگیا کہ محبت کیا بلا ہوتی ہے۔ لیکن مجھے اس کا افسوس ہے کہ مجھے اپنے کتب خانے کی تین چوتھائی کتابیں آتشدان میں پھینکدینا پڑیں۔ محبت تو ایک دھوکا ہے، لیکن ہمارا ادب ایک دغا بازی! وہ محبت کے دھوکے کو پاک اور معصوم بتاتا ہے۔

اَقوالِ زرّیں

میرے مالک واسطہ ہے تجھے اپنی عظمت کا بتادے اور صاف بتادے کہ اس زمانے میں شریف النفس کو احمق کیوں کہتے ہیں۔

ہم نے خواب میں دوستی کی، خواب ہی میں دشمنی، خواب ہی میں پیدا ہوئے اور خواب ہی میں مرگئے، خواب ہی میں شادی کی، خواب ہی میں غم۔ یہ ہے دنیا، اُس کی ابتدا اور انتہا۔

کام یوں کرو کہ ہر دن کو زندگی کا آخری دن سمجھو۔

جرمنی کا آسٹریا پر قبضہ کیوں اور کیسے؟

سید سعید جعفری مچھلی شہری

۱۱ مارچ ۳۸ء کا دن مابعد جنگِ عظیم یورپ میں ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ جرمنی کا آسٹریا کو ہڑپ کر جانا ایک اہم اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے زبردست واقعہ ہے۔ اس لئے نہیں کہ موجودہ دورِ تہذیب میں اس قسم کی بربریت کی مثالیں مفقود ہیں یا زیادہ تعداد میں نہیں ملتیں، حبش، ہسپانیہ اور چین بحالتِ موجودہ زبانِ حال سے پکار پکار کر اس بربریت و استبدادیت و چنگیزیت کا رونا رو رہے ہیں، جو آج ایک عالمگیر وبا کی طرح کمزور اقوام کو گھیرے ہوئے ہیں، بقول اقبال ؎

غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

بلکہ اس لئے کہ ابھی تک اس دیدہ دلیری کے شکار سیاہ یا زرد قومیں نہیں، جو باوصف دعوائے جمہوریت مہذب اقوام کی صف میں شمار کرنے کے قابل نہیں تصور کی جاتی تھیں، حبش اور چین پر اٹلی اور جاپان کی دست درازی نے یورپ کی بڑی قوموں کے اطمینان میں صرف اس حد تک خلل ڈالا۔ جہاں تک کہ اُن کے اپنے سیاسی و اقتصادی مفاد کو دھکا پہونچنے کا احتمال تھا، آج جنگِ عظیم کے بعد پہلی بار یورپ کی خود اعتمادی کو ضربِ کاری لگی ہے اور ہر شخص از دستِ خویش نالہ و فریاد میں مصروف ہے۔

بہت کم لوگ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ آسٹریا کا جرمنی میں جذب ہو جانا نہ صرف ایک ممکن الوقوع حادثہ تھا، بلکہ گزشتہ بیس سال کی تاریخ اس بات کی مظہر ہے کہ یہ واقعہ ایک "تاریخی ناگزیریت" کی حیثیت رکھتا ہے یہ کیوں۔

آئیے! آج کی صحبت میں اس ملک کی گزشتہ بست سالہ تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالیں، آسٹریا میں چند سال پہلے یہ جملہ ضرب المثل تھا کہ "جرمنی میں صورت حالات سنگین ہے لیکن ناگفتہ بہ نہیں" "آسٹریا میں صورت حالات ناگفتہ بہ ہے لیکن سنگین نہیں" اس جملہ کے اندر وہ روح پوشیدہ ہے جو آسٹریا کی مخصوص مسرت و بہجت برقرار رہتی ہے۔ جان گنٹر یورپ کا شہرۂ آفاق مصنف اپنے دلچسپ انداز میں آسٹریا پر رقمطراز ہے "آسٹریا یورپ کا خوشگوار ترین ملک، جہاں لوگ زندگی کی سنجیدہ چیزوں میں منہمک رہتے ہیں، جیسے سامعہ نواز موسیقی یا ہوا خوری اور شراب نوشی"۔

لیکن غالباً پہلے چند دنوں میں نہ صرف ایک سیاسی انقلاب ہوا ہے بلکہ ممکن ہے کہ آسٹریا کی عام بے پرواہی امن پسندی، سکون طمانیت میں بھی تبدیلی پیدا ہو جائے۔

جنگِ عظیم سے پہلے آسٹریا ہنگری اگرچہ قریب المرگ تھی، لیکن اپنے رقبہ کے لحاظ سے ایک عظیم الشان حکومت تھی۔ دنیا میں انقلابات ہمیشہ آیا کرتے ہیں۔ آسٹریا کی حکومت میں جنگِ عظیم کے باعث جو انقلاب ہوا وہ کوئی خاص دور رس نہیں تھا، لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ وہ ریاست جو ایک

زمانہ میں اپنے دامن میں ڈھائی کروڑ آبادی کو سموئے تھی صرف ایک چھوٹے سے رقبہ میں محدود ہو گئی اور اس کی کل آبادی صرف ۶۰ لاکھ رہ گئی (جو لندن کی آبادی سے کم ہے) یہ تشنیع نہ صرف ایک دردناک پہلو رکھتا ہے بلکہ کسی حد تک مضحکہ خیز بھی ہے۔ مشہور کہانی ہے کہ جنگ کے بعد دو اطالویوں میں حسب ذیل بات چیت ہوئی "آؤ جی ذرا آسٹریا کے چاروں طرف گھوم آئیں" دوسرے نے جواب دیا "نہیں بھائی، میں دوپہر سے پہلے واپس نہیں آنا چاہتا" لیکن یہ محض مذاق کی بات نہیں۔ آسٹریا کی اس کمزوری کا اثر یورپ کے سارے سیاسی و اقتصادی نظام پر پڑا۔

ذرا غور کیجئے کہ معاہدۂ وارسائی کے ترتیب دینے والوں نے ایک ایسا ملک بنا دیا جو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی بھی صلاحیت نہ رکھتا تھا، ۳۲ ہزار مربع میل کا ایک چھوٹا سا ملک لیکن اس میں بھی نوّے فیصدی پہاڑی علاقہ۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ آسٹریا کی خاص پیداوار پہاڑی سینری ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ آسٹریا میں خود اتنی استطاعت نہ رہی کہ اپنا پیٹ اپنے غلے سے بھر سکتا۔ اس لئے غلہ کی درآمد لابدی تھی، اس کے بدلے میں ضروری تھا کہ صنعتی کاروبار ہوتا لیکن خام پیداوار مثلاً کوئلہ وغیرہ کی کمی تھی۔ ہاں لوہا کی فراوانی تھی اور جنگلوں کی کثرت، جس کی وجہ سے آسٹریا کی خاص صنعت کاغذ سازی اور لکڑی کے کاروبار کو فروغ ہوتا رہا لیکن آسٹریا کی ہمسایہ اقوام نہ خام پیداوار مہیا کرنے پر راضی تھیں اور نہ اُس کی مصنوعات ہی کو خریدنے کے لئے تیار۔ نتیجہ اقتصادی اور تجارتی انتشار۔

جنگ عظیم کے وقت یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ یہ جنگ دنیا سے جنگ کو ختم کرنے کے لئے لڑی جا رہی تھی، یہ دعویٰ تو باطل ثابت ہو چکا لیکن ایک ظریف کے قول کے بموجب اس جنگ کے بعد جو معاہدہ ہوا وہ یقیناً ایسی صلح تھی جس نے صلح کا امکان دنیا سے خارج کر دیا۔ پریسیڈنٹ ولسن کے بلند بانگ دعاوی حرف غلط ثابت ہوئے۔ معاہدۂ وارسائی کے الفاظ میں "آسٹریا ہنگری کی اقوام کو خود مختارانہ ترقی کی پوری آزادی دی جائے" لیکن مقام صد حیف ہے کہ ایک طرف خود اختیاری کا نظریہ تھا۔

لیکن علاوہ بہت سے حصے جو نسلاً آسٹریا سے متعلق تھے آسٹریا سے الگ کر دئے گئے۔ مثلاً جنوبی ٹائیرول۔ گیلیشیا۔ ٹسچن۔

زیکوسلوکیا کے قبضہ میں ...... ۳۰ جرمن زبان والے آسٹریا نکے دیئے گئے۔

اگر ولسن کے دعووں میں کچھ بھی حقیقت تھی تو آسٹریا کو جرمنی سے ملحق کر دینا چاہئے تھا، کیونکہ بقول کول ۹۰ فیصدی آسٹریا کے باشندے جرمن زبان بولتے ہیں اور اسی نسل اور تہذیب سے متعلق ہیں۔ اگر ایسا کر دیا جاتا تو آج یورپ کو یہ ہزیمت نہ اُٹھانی پڑتی۔ اور امن کی دیوی اس شرمندگی سے بچ جاتی جو آج ہٹلر کی زبردستی سے اس کے حصے میں آئی۔ محض اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ آسٹریا سے جو معاہدہ ہوا (معاہدۂ سینٹ جرمین ۱۰ ستمبر ۱۹۱۹ء) اس میں صاف الفاظ میں لکھ دیا گیا کہ "آسٹریا ہر اس عمل سے احتراز کریگا جو بالواسطہ یا بلا واسطہ یا کسی طریقے سے بھی اس کی آزادی کو معرض خطر میں ڈالے گا"

اس مایوسی کے عالم میں آسٹریا کے لئے اگر کوئی امید تھی تو جرمنی کے ساتھ اقتصادی تعاون میں، لیکن فرانس اس کو کب برداشت کر سکتا تھا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۹-۲۰ء کے دوران میں آسٹریا کو فاقہ کرنا پڑا۔

مگر فرانس کو آسٹریا کی آزادی برقرار رکھنی تھی۔ کیونکہ آسٹریا کے لئے سوائے جرمنی سے الحاق کے اور کوئی چارہ نہ تھا، جس کو بچانے کے لئے فرانس ہر جائز و ناجائز اقدام پر عمل کرنے کے لئے تلا بیٹھا تھا، کہا گیا ہے "کہ آسٹریا کی کمزوری میں اس کی طاقت مضمر تھی" اس معنی میں کہ ایک شیر خوار بچہ کی طرح اس کی ہر ضد پوری کی جاتی تھی۔

۱۹۳۲ء تک اقوام لیگ آسٹریا کی ہر نازک وقت پر مدد کرنے کو تیار تھے، بھلا ہو اُن کی ضد کا کہ آسٹریا کو کئی مرتبہ سیاسی و مالی و اقتصادی مدد حاصل ہوئی، اور برطانوی اور فرانسیسی بنکوں کے دروازے آسٹریا کے لئے ہر وقت کھلے رہے، اس خوف کے مارے کہ مبادا آسٹریا کی شکست سے سارے وسط یورپ کا نظام متزلزل نہ ہو جائے۔

آسٹریا کے لئے یہ کوئی خوشگوار صورت حالات نہ تھی، اس لئے متعدد بار اس نے جرمنی سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان سب کا اعادہ یہاں ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً ۱۹۲۱ء میں آسٹریا کے ۹ صوبجات میں سے تین صوبوں نے جرمنی سے اتحاد کا ریزولیشن پاس کیا جو کہ فرانس وغیرہ کی وجہ سے شرمندۂ عمل نہ ہونے پایا۔ سب سے اہم واقعہ وہ تھا جب آسٹریا نے جرمنی سے اقتصادی اتحاد عمل کا ارادہ کیا، لیکن فرانس سے ایسی سخت

مخالفت ہوئی کہ یہ اسکیم کامیاب نہ ہوسکی۔ یہی نہیں بلکہ فرانس نے آسٹرین بنیک کریڈٹ ایشالٹ (credit anstalt) (جو کہ وسط یورپ میں اقتصادی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا) سے امداد واپس لے لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے یورپ کے اقتصادی نظام کا پنجر ڈھیلا پڑ گیا اور نہ صرف آسٹریا ہی دیوالیہ بن کے سمندر میں ڈوبنے لگا بلکہ اُس کی لہریں برطانیہ تک پر اثر انداز ہوئیں، ایک مشہور مصنف میکارٹنی کا دعویٰ ہے کہ "فرانس کی اس مضبوط اقتصادی گرفت کا ہی نتیجہ تھا کہ آسٹریا ہر ممکن تدبیر کے باوصف فاقہ کی مصیبت سے نجات نہیں حاصل کرسکتا تھا"

یہ بات واقعی قابلِ حیرت ہے کہ فرانس وغیرہ کی خیرات کے باوجود آسٹریا کس طرح زندہ رہ سکا۔ غالباً جو چیز اس عالمگیر مصیبت میں آسٹریا کی معاون ثابت ہوئی وہ آسٹریا کے باشندوں کا جمود و استقلال تھا، لیکن یہ بے خبری اور بے پروائی اور تعطل زیادہ عرصہ برقرار نہیں رہ سکتا تھا، بقول گنتر دو طاقتیں آسٹریا کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے میں عمل پیرا ہوئیں، ایک ہٹلر اور دوسرا ڈولفس۔

اس جگہ ضروری ہے کہ ہم آسٹریا کے سیاسی نظام پر ایک نظر ڈالیں، جس کے بغیر گزشتہ ۱۸ سال کی ہنگامی تاریخ ناقابلِ فہم ہے۔

جنگِ عظیم کے بعد آسٹریا میں ایک وفاقی نظام قائم ہوا اور یہ چھوٹا سا ملک ۹ صوبوں میں منقسم ہوگیا۔ دار الخلافہ ویناؔ کی حیثیت ایک صوبہ کی تھی، ساری آبادی کا تہائی حصہ دار الخلافہ میں آباد تھا، ویانا مع اپنی گوناگوں ہماہمی کے دیگر صوبجات سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتا تھا یعنی جہاں باقی صوبے جن میں کسان آباد تھے مذہبی رجحان کے باعث رجعت پسندانہ سیاست کے حامل تھے۔ ویانا ایک ترقی پسند صوبہ تھا جس پر اشتراکی جمہوری پارٹی برسرِ اقتدار تھی۔ جنگِ عظیم کے فوراً بعد جب کمیونزم کا ایک سیلاب سارے وسطی یورپ میں موجزن ہو رہا تھا، اس وقت اس اشتراکی جمہوری پارٹی نے آسٹریا میں کمیونزم کو پھیلنے سے روکا۔ ویانا میں اور اس کے ہمسایہ صوبوں میں ایک کشمکش جاری تھی۔ لیکن اس دباؤ کے باوجود ویانا میونسپلٹی اپنے کام میں لگی رہی اور چند ہی سالوں میں اصلاحات کی یہ فراوانی تھی کہ بلاشبہ ویانا دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ میونسپلٹی میں شمار کی جاتی تھی۔ (socialist) نے ویانا کی کایا پلٹ دی اور کامرانی اور فتحمندی کے نقارے بجنے لگے، سوشلسٹ پارٹی کی یہ عملی کامیابی ایک معجزہ سے کم نہ تھی اور دنیا کی دوسری قوموں کے لئے مشعلِ راہ ہدایت ثابت ہوسکتی تھی۔ لیکن اس معجزہ میں عصائے موسیٰ فرانس وغیرہ کی مالی امداد تھی، جس کے بغیر جیسا ہم اوپر ظاہر کرچکے ہیں آسٹریا کا ایک منٹ زندہ رہنا ناممکن تھا۔ سیاسی حیثیت سے آسٹریا ایک عجیب ملک تھا، ایک رجعت پسند ملک میں ایک (socialist) دار الخلافہ بیرونی ممالک اگر مالی مدد روک لیں تو سارا توازن درہم برہم ہوجائے اور آسٹریا کی ساری ترقی کافور ہوجائے۔ ۱۹۱۹ء میں جیسا ہم اوپر لکھ چکے ہیں، فرانس نے ہاتھ روک لیا اور آسٹریا کے بنیک منجملہ دیگر ممالک کے بنکوں کے بوسیدہ عمارت کی طرح گرنے لگے۔

سیاسی حیثیت سے اس اقتصادی ہنگامہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے، کیونکہ دراصل آسٹریا میں جمہوریت کی موت اور آمریت کی پیدائش اسی رستخیز بیجا کی مرہونِ منت ہے۔

اس سے قبل ہی آسٹریا میں فسطائی بیج بویا جاچکا تھا، اور انتہائی قدامت پسند صوبے اور لوگ شہزادہ فان اسٹاریمبرگ کی قیادت میں ایک نئی فوج میں منظم ہونے لگے تھے جس کا نام (Heimwehr) تھا۔ ان فسطائیوں میں اور سوشلسٹ حکومت میں اکثر جھگڑا رہتا تھا جس نے ۱۹۲۷ء سے ذرا سنگین صورت اختیار کرنا شروع کی۔

ایسی فضا میں ایک کہربائی طاقت وجود میں آتی ہے جس کا نام ڈولفس تھا۔ چند ہی سالوں میں اُس نے آسٹریا کی اسمبلی میں ایک نمایاں پوزیشن حاصل تھی۔ پس جب ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر بورش کی حکومت مستعفی ہوئی تو ڈولفس کو حکومت بنانے کی دعوت دی گئی۔ اگرچہ اس کی میجارٹی صرف ایک کی تھی۔ پھر بھی وہ ذرا نہ ڈرا، اور بے خطر ہوکر چانسلری منظور کرلی۔ یہ ناٹے قد کا چانسلر آسٹریا کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا مالک ہے، اُس نے آسٹریا سے جمہوریت کی بیخ کنی کی، پارلیمنٹ کو ختم کردیا، آمریت کی بنیاد ڈالی، اجتماعی اور فسطائی پارٹیوں میں تصادم پیدا کرنا چاہا۔ لیکن اسی تصادم سے خود بھی ختم ہوگیا۔

وہ ایک کسان تھا اور ایک کسان کی طرح برخود غلط ذہنیت کا مالک، خدا پر یقین رکھتا تھا اور مطمئن تھا کہ اس کے ہر کام میں خدا کا ہاتھ

کار پرواز ہے، جمہوریت اور آزادی کے پرستاروں کے لئے ۱۳ مارچ ۳۸ء کا دن آسٹریا کی تاریخ میں ایک نہایت منحوس دن تھا کیونکہ اسی دن آسٹریا کی پارلیمنٹ نے خودکشی کی اور ڈولفس کا پیش کردہ زہر کا پیالہ پی لیا۔ دنیا کے متعدد اکثر واقعات کی طرح اس کی بھی ابتدا نہایت ہی معمولی طریقے سے ہوئی، کسی شمار رائے کے دوران میں ایک سوشلسٹ ممبر کسی ضرورت سے باہر چلا گیا اور اس کی جگہ پر اُس کے کسی دوست نے اس کی طرف سے ایک جعلی بیلٹ پیپر ڈال دیا۔ اسمبلی کا صدر جو ایک (   ) تھا، بہت عالی دماغ اور ایماندار تھا۔ اُس نے اس قانون درازی کی اجازت نہ دی، اور فیصلہ سوشلسٹوں کے خلاف اور حکومت کے موافق دیدیا، رائے کا تناسب ۸۰ - ۸۱ تھا۔ شور و غل میں صدر نے دماغی توازن کھو دیا، اور اسی جگہ پر استعفا دیدیا۔ دونوں نائب صدروں نے بھی صدر کی تقلید کی۔ بات تو آئی گئی ہو جاتی۔ لیکن ایک مشکل یہ آن پڑی کہ آسٹریا میں قانونی طور پر پارلیمنٹ یا اسمبلی کا اجرا صرف صدر یا نائب صدر کر سکتا تھا، اور اُس وقت تینوں مستعفی ہو چکے تھے، ڈولفس کے ایسا شاطر سیاست داں اس موقعہ سے کب چُوکنے والا تھا۔ اس نے فوراً اپنا بھی استعفا دیدیا اور تین روز کے اندر اندر ایک آمر کی حیثیت سے نمودار ہوا۔

یہاں تو یہ خودسری تھی، یہ تو تو، میں میں، یہ تصادم، یہ کشمکش اور دور اُفق پر ایک چھوٹا سا بادل وجود میں آ رہا تھا، جو عنقریب سارے آسٹریا پر محیط ہو جانے والا تھا، یہ بادل ہٹلر تھا۔

ہٹلر ایک ناقابل فہم انسان ہے یا بقول ہیڈن "ہٹلر انسان نہیں ہے جس کے ساتھ کوئی سمجھدار آدمی کسی قسم کا سمجھوتہ یا بات چیت کر سکتا ہے۔ وہ ایک مافوق الفطرت ہستی ہے جس کو آپ ختم کیجئے یا خود ختم ہو جائیے" لیکن اس کے باوجود وہ ایک صاف گو انسان ہے، اور یہی غالباً اُس کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اُس نے اپنی عہد آفریں خود نوشت سوانح عمری "میری جد و جہد" میں متعدد بار آسٹریا کے بارے میں اپنے خیالات اور نصب العین کا اظہار کیا ہے۔ ہٹلر کا پیدائشی وطن آسٹریا ہے اور اس لئے ایک نفسیاتی کشش اس کو آسٹریا کی طرف کھینچتی رہی ہے، اس پر اضافہ کیجئے، اقتصادی اور سیاسی فوائد اور آپ پر ہٹلر کی آسٹریا سے دلچسپی کا راز منکشف ہو جائے گا۔ "میری جد و جہد" کا پہلا ہی جملہ ہٹلر کے اس جذبہ کی تشریح کرتا ہے۔ وہ رقمطراز ہے "میرے لئے یہ بات بہت مفید ثابت ہوئی کہ میری پیدائش براناؤ میں ہوئی۔ یہ چھوٹا سا شہر ان دونوں جرمن ممالک کی درمیانی سرحد پر واقع ہے۔ جن کے اتحاد کے لئے ہر ممکن کوشش ہم جائز سمجھتے ہیں" اور پھر "جرمن آسٹریا کو جرمن قوم عظیم کے پاس واپس ہونا پڑے گا۔ اقتصادی وجوہات کی باعث نہیں، مشترک نسبت ایک مشترک ملک میں ہونی چاہیئے"۔

ایک ایسے شخص کے لئے جس کا مقولہ ہے "سرحدیں محض انسانی طاقتوں سے بنتی اور بدلتی ہیں، طاقت ہی ملکیت کا واحد حق ہے، جس کی لاٹھی اُس کی بھینس" یہ جذبہ جتنا محرک ثابت ہو کم ہے۔ ان واقعات اور درمیانی کڑیوں کی تفصیل جن کا نتیجہ آج ہماری نظروں کے سامنے ہے، آسان نہیں، کیونکہ اکثر باتیں ابھی تک صیغۂ راز میں ہیں اور سیاسی تحقیق بینوں کی رائے اتنی متضاد ہے کہ کسی غیر جانبدار شخص کے لئے تصفیہ کرنا ذرا مشکل ہے۔ پھر بھی ہماری کوشش ہوگی کہ مختصر طور پر ان شاطرانہ چالوں اور تحریکوں کا ذکر کریں، جس نے حق کو باطل کی طاقت کے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کیا۔

جس وقت سے ہٹلر جرمنی میں برسر اقتدار ہوا اُسی وقت سے آسٹریا کی طرف حریصانہ نگاہیں اُٹھنے لگیں، اور چونکہ شروع شروع میں نازیوں کی طاقت مستحکم اور منظم نہ ہوئی تھی اور یوروپ کی سیاسی فضا اتنی مکدر نہ تھی، اس لئے اکثر حرکتیں پوشیدہ رہیں۔ نازیوں کے آلۂ کار دہشت انگیزی اور پروپیگنڈا تھے، اول الذکر اس قدر سرعت کے ساتھ ترقی پذیر تھی کہ آسٹریا کی آبادی کا معتد بہ حصہ جرمنی کے خلاف ہو گیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ۳۰ء اور ۳۲ء کے دوران میں آسٹریا کی ہمدردی جرمنی کے ساتھ تھی، لیکن گنتر کی سند ہے کہ ۳۳ء کے آواخر تک کم از کم ۶۰ فیصدی لوگ جرمنی کے مخالف ہو گئے۔ اس کا باعث دہشت انگیزی اور پروپیگنڈا کا وہ سیلاب تھا جو بہتا چلا آ رہا تھا، اور جس نے فرانس، اٹلی اور برطانیہ کو بھی خواب غفلت سے چونکا دیا۔ ان اقوام نے صدائے احتجاج بلند کی، جس کا فوری نتیجہ نازیوں کی سرگرمیوں کی سرد رفتاری کی صورت میں ظاہر ہوا۔

ممکن تھا کہ فضا اسی طرح گرم و سرد ہوتی رہتی کہ آسٹریا کی خارجی اور اندرونی حکمت عملی میں ایک انقلاب پیدا ہوا جس نے آسٹریا کی سیاسی بساط کا پرانا نقشہ درہم برہم کر دیا، اور جس نے نازیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ

کسی متعین اور مخصوص راہِ عمل پر گامزن ہوں۔

ڈولفس کی طاقت کا راز اس کی خود سری اور مسولینی کی مدد میں مضمر تھا۔ آج جب کہ ہم مسولینی اور ہٹلر کی نصب العینیت کی یک جہتی کو مدنظر رکھ کر ان دونوں کے لازمی اتحاد پر حکم صادر کرتے ہیں تو ہم غالباً بھول جاتے ہیں کہ ان دونوں آمروں کا اتحاد بہت تازہ ہے۔ اور کئی سال تک دونوں میں آسٹریا کے اوپر کشمکش رہی، یہاں تک کہ ان دونوں کا تصادم کسی کو بھی حیرت میں نہ ڈالتا۔ اس کشمکش کی وجوہات کئی ہیں۔

(۱) مسولینی ہر حالت میں اپنی سرحد پر کمزور قوموں کے وجود کو طاقتور اور جنگجو جرمن لوگوں پر ترجیح دے گا۔ اگر آپ نقشہ پر ایک نظر ڈالئے تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ اٹلی کے شمال میں کوہ (   ) ویسے ہی محافظ کا کام دیتا ہے جیسے ہمالیہ ہمارا پاسبان ہے۔ اور شمال سے فوجوں کے آنے کا راستہ صرف بذریعہ درۂ برنیر ہے جو آسٹریا اور اٹلی کی سرحد پر واقع ہے۔

(۲) ہٹلر کا دعوےٰ یہ تھا اور ہے کہ تمام جرمن نسلیں ایک ہی ملک کی سرحد میں آجانی چاہئیں، بدقسمتی یا خوش قسمتی سے جنگ عظیم کے بعد کی لوٹ مار میں اٹلی کے قبضہ میں جنوبی ٹائیرول آگیا جس میں ۲ لاکھ جرمن زبان بولنے والے لوگ آباد ہیں۔

چند دیگر وجوہات کی بنا پر جن کا ذکر آگے آئے گا، مسولینی نے یوں کہئے کہ ڈولفس کو اپنی جیب میں ڈال لیا۔ مسولینی نے یہی نہیں کیا، بلکہ اپنا ایک اور ایجنٹ شہزادہ اسٹارہمبرگ کو بنا لیا، جو جیسا ہم اوپر دیکھ آئے ہیں۔ آسٹریا میں فسطائی جماعت کا بانی اور رہنما تھا، اُس وقت تک ڈولفس نے اپنی آمریت کی بنیادیں کافی مستحکم کر لی تھیں، ڈولفس کا ارادہ ایک طرف تو سوشلسٹ جماعت کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کچل دینا تھا اور دوسری طرف وہ اپنے ملک کو آزاد بھی رکھنا چاہتا تھا اور اس لئے جرمنی سے نازیوں کے سیلاب کے دفاع کے لئے بھی پریشان تھا۔ پس اُس نے اپنے ملک کی اندرونی فسطائی جماعت سٹارہمبرگ کی ہیموہر سے اتحاد پیدا کرنا چاہا۔ ممکن تھا کہ ڈولفس اسی طرح (   ) میں رہ کر راست وچپ دونوں جانب اشتراکیوں اور نازیوں سے لڑتا رہتا، لیکن مسولینی کی شہ مل جانے کے بعد اس نے طے کر لیا کہ اپنی استبداد دیتا

اور طاقت کا رُخ سوشلسٹ جماعت کی جانب پھیر دے۔

آسٹریا میں سوشلسٹ جماعت کافی منظم اور ترقی یافتہ تھی۔ لیکن اس نے اپنے ہاتھوں آپ اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری کیونکہ اس نے اپنی آنکھیں اس خطرہ کی طرف سے بند کر لی تھیں، جو فسطائی طاقت کی بے راہ روی میں پوشیدہ تھا، سوشلسٹ جماعت صلح پسند جماعت تھی، امن پسند جماعت تھی، ان مزدوروں کی جماعت تھی جو اپنی مزدوری سے مطمئن تھے اور جن کو ویانا کی ترقی پسند میونسپلٹی کی بدولت ہر قسم کا آرام مہیا تھا، آسٹریا کی سوشلسٹ جماعت کے رہنما ایسے عالی ظرف لیکن بر خود غلط لوگ تھے، جو کسی حالت میں یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ اُن کے دشمن ذلیل اور کمینہ حرکات پر اُتر آئیں گے۔ غور تو کیجئے ڈولفس سوشلسٹ جماعت کی بیخ کنی شروع کر دیتا ہے۔ سٹاہمبرگ کی فسطائی فوج کی چیرہ دستیاں زوروں پر ہیں اور دونوں مصمم ارادہ کر چکے ہیں کہ ویانا سے سوشلسٹ پارٹی کا وجود معدوم کر دیا جائے گا۔ لیکن دوسری جانب سوشلسٹ پارٹی کا رہنما بائیر ایک امید موہوم پر کہ شاید اب بھی صلح کا امکان ہو اور خونریزی بچ جائے اپنی جماعت کو کسی قسم کے اقدام سے روکتا ہے۔ کسی مصنف نے کتنی سچی تُلی بات کہی ہے "کہ آسٹریا میں سوشلزم اپنی شرافت کی وجہ سے ختم ہو گئی"۔ آسٹریا کی سوشلسٹ پارٹی نے ایسی حالت میں جو مقابلہ کیا اور بہادری اور اولوالعزمی کا جو نمایاں ثبوت دیا وہ دنیا کی تاریخ میں ایک درخشندہ باب ہے چاروں تک خانہ جنگی ہوتی رہی۔ ویانا کے مزدوروں کے فلیٹ کوارٹر بمباری کی نذر کر دئے گئے۔ عورتیں اور بچے فسطائیوں کی بندوقوں کا نشانہ بنائے گئے اور چار روز کے اندر اسٹریا سے سوشلسٹ پارٹی صرف کالعدم ہو گئی۔

ڈولفس کا نصب العین، خواہ کچھ بھی رہا ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا تا کہ وہ آسٹریا کی آزادی کو برقرار رکھنا چاہتا تھا، لیکن اس نے اسی جذبہ کو اسی جماعت کو اسی طاقت کو جو آسٹریا کی آزادی کی علمبردار ہو سکتی تھی، ختم کر دیا اور نازیوں کو بغلیں بجانے کا موقع دیا، کیونکہ نازیوں کی دہشت انگیزی اور روپے جس کام کو سرانجام دینے میں ناکامیاب رہے وہ کام ڈولفس نے جو کہ نازیوں کا کسی صورت سے دوست نہ تھا پورا کر دیا۔ جمہوریت کے نام لیواؤں کا قلع قمع ہو چکا تھا، اس لئے اب نازیوں کی طاقت کو عروج

لازمی تھا، اور بہت ممکن تھا کہ ڈولفس فوراً ہی ختم ہو جاتا، لیکن سولینی کی مدد برقرار رہی اور ڈولفس اپنی آمریت کی میعادِ زندگی کچھ دنوں تک اور طویل کرنے میں کامیاب رہا۔

لیکن سارا توازن درہم برہم ہو چکا تھا، فرانس اور برطانیہ عظمیٰ اپنی اپنی مشکلات میں مشغول تھے اور دخل درمعقولات سے عاجز۔ ڈولفس اور اسٹارہمبرگ میں وہ پرانا ربط ختم ہو چکا تھا، کیونکہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی طاقت میں رخنہ خیال کرنے لگے تھے۔ ڈولفس نے بجائے اسٹارہمبرگ کی فوج کے ایک نئی فوج کو جو شہنشاہیت و مذہب پرست شسنگ کی سرکردگی میں قیام میں آئی تھی امداد دینی شروع کی۔

۵ مہینے تک صورت حالات اس خاموشی کے مانند رہی جو طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے، لیکن اس دوران میں طوفان خیز جماعت - جرمنی کے نازی، برابر اپنی سرگرمی میں مصروف رہے اور کہا جاتا ہے کہ تقریباً ۸ کروڑ مارک جرمنی کی طرف سے محض پروپیگنڈا پر خرچ کئے گئے۔ مگر محض پروپیگنڈا کسی ملک کو اپنی آزادی قربان کرنے پر راضی نہیں کر سکتا۔ نازی اس حقیقت سے واقف تھے، خود جرمنی میں اُن کا تجربہ اُن کو بتلا چکا تھا کہ جب تک نصف آبادی کو وہ تہ تیغ نہ کر چکے اُن کی ساری عیارانہ چالیں اور ساری دہشت انگیزی کسی کام نہ آئی۔ اس لئے تیاری کی گئی کہ ڈولفس کا جو نازیوں کے حملہ کے لئے سینہ سپر تھا، خاتمہ کر دیا جائے، اور ۲۵ جولائی ۳۴ء کو ڈولفس ایک نازی کی گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ انتظام تو یہ کیا گیا تھا کہ ڈولفس کے قتل کے ساتھ ہی حکومت پر بھی نازی قبضہ کر لیں۔ لیکن چند غلطیوں کی وجہ سے ساری سازش ممکن نہ ہو پائی۔ نازیوں کا خیال تھا کہ آسٹرین فوج اُن کا ساتھ دے گی۔ مگر آسٹرین فوج اپنے ملک کی آزادی کی وفادار رہی، نازیوں کا خیال تھا کہ کیتھولک صوبے جو اشتراکیت کے خلاف تھے، ان کا ساتھ دیں گے، لیکن یہ صوبے پہلے ہی نازیوں کی دہشت انگیزانہ کارروائیوں کے باعث اُن کے خلاف ہو چکے تھے، ایسی حالت میں صرف جرمنی کی مدد اُن کے کام آسکتی تھی، مگر ہٹلر باوجود اپنے بلند بانگ دعاوی کے جہاں خطرہ دیکھتا ہے دبے پاؤں واپس ہو جاتا ہے۔ یہ ساری سازش جرمن قوم کے قائدوں کی مرضی اور مدد سے وجود میں آئی، لیکن جرمنی نے اپنا قدم واپس لے لیا، کیونکہ سولینی جو ڈولفس کا مربی تھا کسی حالت میں بھی آسٹریا کو جرمنی کے قبضہ میں دینے کے لئے تیار نہ تھا، سولینی نے فوراً اٹلی کی فوج کو آسٹریا کی جانب روانہ کر دیا۔ سولینی کی اس دلیری کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری سازش غلط ملط ہو کے رہ گئی اور صرف ڈولفس کی روح ان اشتراکی مقتولین سے ملاقات کرنے کے لئے چلی گئی جن کو ڈولفس نے اپنی زندگی میں گولی کا نشانہ بنایا تھا۔

ڈولفس کا قتل نہایت ہی اہم واقعہ ہے۔ اسی واقعہ سے یورپ کی سیاست میں ڈاکوں کا انداز شروع ہوتا ہے، نازی اُس وقت تک کافی منظم ہو چکے تھے اور اس واقعہ نے دنیا پر واضح کر دیا کہ ایک ایسی جماعت ظہور میں آنے والی ہے جس کے لئے سیاست میں شرافت، ایمانداری معاہدہ پرستی سب بے معنی الفاظ ہیں، دنیا پر ظاہر ہو گیا کہ ہٹلر جو کہتا ہے وہ کرتا بھی ہے، نازیوں کی اس حرکت کا سب سے بڑا اثر تو یہ پڑا کہ آسٹریا کی اکثریت ہٹلر اور جرمنی کے خلاف ہو گئی جس نے ان سے اس کے "ننھے ڈکٹیٹر" کو چھین لیا۔ اور یہ ناممکن ہو گیا کہ نازی صلح جوئی سے آسٹریا پر قابض ہو سکیں۔ ڈولفس کے ہٹ جانے سے آسٹریا کی حکمت عملی میں سولینی کا اثر کم ہونا شروع ہوا۔

آسٹریا کا دوسرا ڈکٹیٹر شسنگ تھا جو زیادہ ہر دلعزیز نہ تھا، سولینی ابی سینیا کی وجہ سے ذاتی مشکلات میں مبتلا تھا، شسنگ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جرمنی سے کسی قسم کا اقتصادی اور مالی سمجھوتہ کرے، شسنگ کا یہ اقدام آسٹریا کی حکمت عملی میں ایک انقلاب کی حیثیت رکھتا تھا، سولینی آسانی سے اس کے لئے راضی نہ ہوتا۔ اگر یورپ کی سیاسی فضا نہ بدل گئی ہوتی۔ حبش کے حملہ کے دوران میں جب ساری اقوام عالم اٹلی کے خلاف ہو رہی تھیں صرف جرمنی نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا، اور اس کے لئے شرط یہ تھی کہ آسٹریا سے جرمنی کے سمجھوتے میں سولینی رخنہ اندازی نہ کرے۔ جولائی ۳۶ء کو جرمنی کے نمائندہ فان پیپن اور آسٹریا کے درمیان ایک قسم کی صلح ہو گئی جس سے آسٹریا اور جرمنی کے تعلقات راہِ راست پر آگئے۔ یہ بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی کہ جرمنی اور آسٹریا کے ناخوشگوار تعلقات کیسے اتنی جلدی صلح جوئی میں تبدیل ہو گئے، اور خصوصاً جب آسٹریا کا نیا چانسلر شسنگ بہ نسبت ڈولفس کے جرمنی کے زیادہ خلاف تھا۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ ہٹلر یہ سمجھ چکا

تھا کہ صورت حالات مقتضی تھی کہ بجائے زبردستی کے کم ازکم کچھ دنوں تک اور چکنی چپڑی باتوں سے آسٹریا میں جرمنی کے اقتدار و رسوخ کو فروغ دیا جائے دیا بقول گنتھر "اس لڑکی کی زبردستی عصمت دری کرنا جس سے آپ کل شادی کرنے والے ہیں ایک فضول سی بات ہے"۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تفصیل کا محتاج نہیں۔ گزشتہ ماہ شسنگ سے ایک سمجھوتہ جو کہ دراصل ایک دھمکی تھی وقوع میں آیا۔ شسنگ کو احساس ہوا کہ آسٹریا کی آزادی معرض خطر میں ہے۔ اس نے ہٹلر کی زبردستی سے بچنا چاہا۔ مگر دوسری طاقتوں نے اس کی مدد نہ کی اور ہٹلر تین گھنٹہ کے اندر اندر آسٹریا پر قابض ہوگیا۔

جو بات قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ کیا وجہ ہے کہ ہٹلر جو آج سے ۴ سال پہلے باوجود اپنی طاقت کے آسٹریا پر قبضہ کرنے میں بری طرح ناکام رہا۔ آج بغیر ایک گولی چلائے سارے آسٹریا پر مختار کل ہوگیا، اس کا جواب ہم کو یورپ کی سیاسی شطرنج کی چالوں میں ملے گا۔ اس لبا طپر بھی ایک سرسری نظر ڈالنی ضروری ہے

ڈیلی ہیرلڈ اپنے ایک مقالۂ افتتاحیہ میں رقمطراز ہے، "جرمن حکمت عملی کا مخصوص حربہ یعنی عریاں زبردستی پھر نمایاں ہوا ہے۔ آسٹریا دراصل اس حزنیہ ڈراما کا تازہ ترین ایکٹ ہے جس کے پہلے حصے منچوریا، حبش، اسپین اور چین ہیں، اور ڈراما ابھی اختتام سے بہت دور ہے"۔

ڈیلی میل لکھتا ہے "ہم یورپ کے تاریخی ارتقاء کے ایک فیصلہ کن مقام پر پہونچ گئے ہیں۔ سوال یہ ہے اب کیا ہوگا؟ یا غالباً اب کون ہوگا؟"

یہ سوال محض پریشانی کا اظہار نہیں ہے بلکہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جرمنی کی خارجی حکمت عملی یورپ کو جس راستہ کی طرف لے جا رہی ہے، وہی راستہ جنگ کا ہے۔ قتل و غارت کا ہے، خودکشی کا ہے، موت کا ہے۔ یہ حکمت عملی کیا ہے؟

ہٹلر اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھتا ہے "ہم کو چاہیئے کہ جرمنی کی توسیع کا رُخ بجائے یوروپ کے بیرونی ممالک کے یا یوروپ کے مغربی اور جنوبی ممالک کے مشرقی یورپ کی طرف پھیر دیں"۔ اور اسی لئے گزشتہ چار سال میں اس کی برابر یہ کوشش رہی ہے کہ فرانس اور برطانیہ کی طرف سے اطمینان حاصل کرلے، تاکہ آسٹریا اور زیکوسلوکیا اور یوکرین پر دعاوی بول سکے۔ بعض سادہ لوح برطانوی مدبرین اس حکمت عملی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ ہٹلر کو مشرق کی طرف پھیلنے کی مکمل آزادی دیدی جائے۔ تاکہ برطانیہ اور فرانس ہر قسم کے خطرہ سے بری رہیں، اور کسی جنگ عظیم کا امکان نہ رہے۔ لیکن ایسا کرنے سے وہ اسی چالاکی کا شکار ہو جاتے ہیں جو ہٹلر کا اصل مقصود ہے۔ ہٹلر تو صرف یہ چاہتا ہے کہ شروع میں وہ ان کمزور اقوام پر حملہ کرسکے اور پھر جب اُدھر سے اطمینان حاصل ہوجائے تو اسی رسمی و تاریخی دشمن فرانس کی طرف رُخ کرے۔ ہٹلر کو اپنے ملک میں جو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی وہ اس کی خارجی حکمت عملی کی کامیابی کے سامنے ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ شروع شروع میں ہٹلر کے پاس عسکری اور فوجی طاقت کی کمی تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ دوسروں کی خودغرضانہ مناقشات سے فائدہ اُٹھاتا رہا اور یکے بعد دیگرے کامیابی حاصل کرتا رہا۔ سب سے پہلے ۱۹۳۳ء میں اس نے اسلحہ بندی شروع کی اور جمعیت اقوام کا وقار ختم کرنا شروع کیا، اس کے بعد پولینڈ سے معاہدہ کیا۔ یہ بھی معاہدہ وارسائی کے خلاف تھا، اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں آسٹریا میں اس شورش کا پھیلانا تھا جس نے ڈولفس کو قتل کیا، مگر جو ناکامیاب رہی۔ اس تمام عرصہ میں ہٹلر کی دستِ راست برطانیہ کی خاموش سند تھی۔ برطانیہ کی حکمت عملی یورپ میں ہمیشہ طاقت کے توازن کے نظریہ پر قایم رہی ہے۔ جرمنی کی کمزوری جس کے باعث فرانس کی طاقت روز افزوں ترقی پذیر تھی۔ برطانیہ کے مفاد کے خلاف تھی، اس لئے معاہدہ وارسائی کے باوجود برطانیہ کی برابر یہ کوشش رہی کہ جرمنی کی طاقت بڑھتی رہے۔ برطانیہ کی اس حکمت عملی کے پس پشت دراصل لندن کے بڑے بڑے تجار اور سرمایہ داروں کا ہاتھ تھا جو جرمنی کو روس اور سوشلزم کا دشمن سمجھتے ہوئے بغض معاویہ کے اصول پر مدد دیتے رہے، لیکن ڈولفس کے قتل کے فوری بعد کچھ عرصے تک برطانیہ کا جرمنی سے یہ ہمدردانہ رویہ ٹھنڈا پڑگیا، اور فروری ۱۹۳۵ء میں برطانوی فرانسیسی معاہدہ وجود میں آیا جس کے تحت مشرقی یورپ کے تحفظ کے لئے اسکیم بنائی قرار پائی۔ ہٹلر ان بلند بانگ دعاوی کی اصلیت سے واقف تھا، اس لئے مارچ ۱۹۳۵ء میں معاہدہ وارسائی کی رُو سے جو فوجی پابندیاں عاید کی گئی تھیں اُس نے اُنھیں بھی مسترد کردیا، فرانس، برطانیہ اور اٹلی کے ایوانوں میں ایک وقتی ہیجان برپا ہو گیا، اور سٹریسا کانفرنس منعقد ہوئی جس میں جرمنی کی آئندہ جارحانہ کارروائی کے خلاف ایک

محاذ قایم کرنا طے پایا۔ لیکن اس میں کس قدر ایمانداری اور اصلیت تھی اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اس معاہدہ کی سیاہی بھی خشک نہیں ہونے پائی تھی کہ دس دن کے اندر برطانیہ کا وزیر خارجہ سر جان سائمن ہٹلر سے دوستانہ ملاقات کے لئے برلن جاتا ہے۔ چہ دلا ورست دزدے کہ بکف چراغ دارد۔ اور جون میں اس کا نتیجہ برطانوی جرمنی بحری معاہدہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جو معاہدہ کی خلاف ورزی کا برطانیہ کی طرف سے نمایاں کارنامہ ہے، ۳۶ء میں (Rhineland ـــ) پر جرمنی کا قبضہ اس کی جارحانہ کارروائی میں ایک اور قدم تھا، اس کے بعد ۳۶ء میں اسپین میں جرمنی کا شورش پھیلانا اور خانہ جنگی پیدا کرنا اور ترقی دینا جرمنی کا یورپ کی فضا کو مکدر کرنے کے لئے سب سے اہم کارنامہ تھا۔ مگر اسپین میں اٹلی کا رجحان اور توجہ دیکھکر ہٹلر نے اپنا ہاتھ واپس لے لیا، اور اسپین اٹلی کے حوالہ کر دیا یہ کہتے ہوئے کہ سپردم بتو مایۂ خویش را۔

لیکن ان سب کے باوجود اس دعوے میں بہت کچھ حقیقت ہے کہ ہٹلر اتنا زبردست کارنامہ یعنی آسٹریا پر کھلم کھلا حملہ کرنے کی جرأت نہ کرتا، اگر گزشتہ سال کے دوران میں یورپ کا سیاسی توازن درہم برہم نہ ہوچکا ہوتا۔

دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے برطانیہ کے علاوہ جو دو قومیں سب سے زیادہ کوشاں تھیں وہ سویٹ روس اور امریکہ ہیں۔ جنگِ حبش کے موقعہ پر امریکہ نے ثابت کر دیا کہ وہ ہر عملی کارروائی کے لئے تیار ہے، اور اگر برطانیہ امریکہ سے اشتراکِ عمل کرکے پٹرول کی درامد بند کر دیتا تو اٹلی کو ایک مہینہ کے اندر حبش سے واپس ہونا پڑتا۔ گر برطانیہ ان فسطائی طاقتوں سے کچھ ایسا خوفزدہ رہا ہے، اور برطانیہ کے سرمایہ داروں کا اٹلی اور جرمنی سے ہمدردانہ رویہ ہمیشہ ایسا فیصلہ کُن رہا ہے کہ سوائے مسولینی کو خفا کرنے کے کوئی طاقت کچھ نہ کر سکی۔ یوروپ کی سیاست پر جنگِ حبش کا سب سے زبردست اثر یہ ہوا ہے کہ اٹلی اور جرمنی میں اتحادِ عمل کے لئے برلن۔ روما، محور وجود میں آئی، آج جب ہٹلر آسٹریا پر قابض ہو جاتا ہے تو وہی مسولینی جو چار سال پہلے ہٹلر کے خلاف فوجی طاقت روانہ کرنے سے پرہیز نہیں کرتا، ہٹلر کو دوستانہ پیغام روانہ کرتا ہے اور اس کے کان پر ظاہرا جوں تک نہیں رینگتی۔ کونسی تعجب کی بات ہے کہ ہٹلر مسولینی کے اس پیغام کا جواب دلی تشکر و امتنان سے دیتا ہے اور مسولینی کو یقین دلاتا ہے کہ اگر اٹلی پھر جرمنی کی مدد یا ہمدردی کی ضرورت ہوئی تو ہٹلر اس سے دریغ نہیں کرے گا۔

جنگِ حبش کے بعد سے برطانیہ کی خارجی حکمت عملی جو رہی ہے اس سے ان امروں پر یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی کہ برطانیہ ہر حالت میں جنگ سے احتراز کرے گا خواہ یورپ کی سیاست سے اخلاقی عنصر عنقا ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کا امن خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ امریکہ کی ہمیشہ سے یہ پالیسی رہی ہے کہ یورپ کے مسائل ایک خانگی صورت رکھتے ہیں جس سے امریکہ کا کوئی تعلق نہیں۔ فرانس اپنے میں اتنی سکت نہیں پاتا کہ بغیر برطانیہ کی پالیسی کی تشریح کے کوئی مستقل فیصلہ کر سکے۔ امن پسندوں کی امید کا واحد مرکز سویٹ روس رہ گیا۔ مگر گزشتہ ڈیڑھ سال سے روس کے اندر ایک زبردست خانگی ابتری سی پھیل رہی ہے جس کی وجہ سے روس غالباً معذور ہے کہ تن تنہا سیاستِ عالم میں چنگیزیت اور رہزنیت کے خلاف اپنا علم نصب کر سکے۔ مسٹر ایڈن کا استعفیٰ، بقول مسٹر لائڈ جارج، مسولینی اور ہٹلر کی فتح ہے، فرانس کی سیاست حسب معمول ایک نازک دور سے گزر رہی تھی۔ ایسے موقعہ کو ہٹلر کب ہاتھ سے دینے والا تھا۔ اس نے فوری فیصلہ کیا۔ حالات کا ٹھیک جائزہ لیا اور تین گھنٹے کے اندر یورپ کا سارا سیاسی نظام اُلٹ دیا۔

اجتماعی تحفظ جس تخیل پر جمعیت اقوام وجود میں آئی تھی ایک بیکار چیز ثابت ہو چکی ہے، اور جب اس زمانہ کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس گناہ کبیرہ کا سب سے بڑا الزام برطانیہ کے سر رکھا جائے گا۔ باوجود اپنی طاقت کے گھمنڈ کے نہ مسولینی اور نہ ہٹلر میں یہ جرأت ہوتی کہ یکے بعد دیگرے من مانی کرتے چلے جاتے۔ اس دعوے کا ایک ادنیٰ سا ثبوت یہ ہے کہ جب گزشتہ سال مراقش کے بارے میں ہٹلر کی کارروائی ظاہر ہوئی تو فرانس نے بخوبی ظاہر کر دیا کہ ہٹلر کا مراقش کی طرف متوجہ ہونا فرانس کبھی برداشت نہ کرے گا۔ نتیجہ ظاہر تھا، ہٹلر نے صاف اس واقعہ سے ہاتھ دھو لیا، پھر جب گزشتہ سال بحرۂ روم میں آبدوز کشتیوں نے برطانوی جنگی جہازوں پر حملہ کرنا شروع کیا اور برطانیہ نے نین کانفرنس منعقد کرکے اس صورتِ حالات سے اپنی بیزاری ظاہر کی تو تین مہینہ تک پھر کسی قسم کا "اتفاق" نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ فسطائی طرزِ حکومت کے اندر جنگجو روح کارفرما ہے۔ یہ بھی صحیح ہے

کہ ایک نہ ایک دن فسطائی طاقتیں دنیا کو عالمگیر جنگ میں مبتلا کریں گی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود دنیا میں امن خواہ لوگوں اور قوموں کی اکثریت ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ترقی پسند ممالک مثلاً روس و فرانس اور برطانیہ اجتماعی تحفظ کے لئے کوئی مستقل قدم اٹھائیں اور فسطائی قوموں کی دھمکیوں کی اصلیت سمجھ لیں۔ جمعیت اقوام ایک عضوِ معطل کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ان سب وجوہ سے یہ خطرہ بہت قریب ہو جاتا ہے کہ ہٹلر اپنی اسکیم کی آئندہ منزل کی طرف روانہ ہو جائے۔ یعنی زیکوسلو ویکیا۔

ہٹلر نے اپنی کتاب میں بار بار اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ جرمنی کے لئے اپنی گذشتہ مقبوضات کے حصول کی سعی ایک فعلِ عبث ہے، اور مقبوضات میں اور خام پیداوار کی فراوانی محض ایک ڈھونگ ہے۔ مگر یہ ڈھونگ محض اس لئے رچایا جا رہا ہے کہ ہٹلر برطانیہ کو مجبور کر دے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کے خیال سے ہٹلر کو روس پر حملہ کرنے کا موقع دیدے۔ مقبوضات کے واپس لینے کی چیخ پکار محض برطانیہ کو پریشان کرنے کے لئے ہے، اور یورپ کی سیاست میں مول بھاؤ کا ایک نادر نمونہ ہے۔ ہنگری اور بلغاریہ ہٹلر کی طرف راغب ہو ہی چکے ہیں۔ پولینڈ سے تعاون کا معاہدہ تکمیل کو پہونچ چکا ہے۔ اب صرف زیکوسلاویکیا پر حملہ باقی ہے۔

زیکوسلو یکیا بھی ان ریاستوں میں سے ہے جو معاہدۂ وارسائی کے مرتب کرنے والوں نے قلم کی جنبش سے پیدا کر دیں۔ اور قریب ڈیڑھ کرور آبادی میں تقریباً ۳۰ لاکھ جرمن نسل کے باشندے ہیں۔ جرمنی اس بات کو ایک عذر بنانا چاہتا ہے، تاکہ زیکوسلو یکیا کے معاملات میں دخل دینے کا ایسے موقع مل جائے، اور آسٹریا کی تاریخ زیکوسلو یکیا میں دوہرائی جائے تو کیا واقعی زیکوسلو یکیا کے اوپر عنقریب مصیبت نازل ہونے والی ہے؟ سویٹ روس اور فرانس دونوں نے صاف طور سے ظاہر کر دیا ہے، کہ بغیر برطانیہ اور دوسری اقوام کی رائے کے وہ زیکوسلو یکیا کو جرمنی سے بچانے کے لئے جنگ سے احتراز نہ کریں گے۔ ایسے تو ابھی کچھ عرصہ آسٹریا ہی میں ہٹلر کو اپنی بنیادیں مستحکم کرنے میں لگے گا۔ کم از کم ۷۰ فیصدی آسٹرین باشندے ہٹلر کے خلاف ہیں اور ۷۰ فیصدی کی آبادی کو ختم کرنا جیلخانہ بھیجنا اور زبردستی اپنی رائے کا بنانا کچھ دن لیتا ہے! بہر حال وسطی اور مشرقی یورپ کی چھوٹی ریاستیں ایک مسلسل خطرۂ عظیم سے دوچار ہیں، اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جب تک برطانیہ کی خارجی پالیسی چیمبرلین اور لارڈ ہیلیفکس ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے کیا کچھ نہ ہو جائے۔

اگرچہ جنگ کے بعد آسٹریا کا جرمنی میں جذب ہو جانا ایک جائز بات تھی اور زیادہ قابلِ اعتراض نہیں، لیکن آج جس طریقہ سے ہٹلر نے آسٹریا کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے، وہ ایک سنگین واقعہ ہے، یہ واقعہ بذاتِ خود اتنا سنگین نہیں جتنا وہ طریقہ ہے جس کو ہٹلر نے آلۂ کار بنایا ہے۔ اقوامِ عالم کی بے بسی اس بات کی مظہر ہے کہ آج دنیا میں بندوق کا بول بالا ہے فسطائیت کی روز افزوں ترقی دنیا کی امن و تہذیب و تمدن کے لئے ایک خطرۂ عظیم ہے۔ اگر نازی جرمنی اور فسطائی اٹلی اور جنگ پرست جاپان اسی طرح جنگ کے دیوتا کی پرستش کے لئے انسانی خون کی بھینٹ چڑھاتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہماری ساری تہذیب و تمدن ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ وقت تھوڑا ہے۔ لیکن ابھی بارہ نہیں بجے ہیں، اور ابھی ممکن ہے کہ اشتراکی اور جمہوری اقوام دنیا سے فسطائیت کی جنگجو پالیسی کو نیست و نابود کرنے کے لئے ایک متحدہ محاذ قایم کر لیں۔ مگر کیا ایسا ہو سکے گا؟

(۲۱ مارچ ۱۹۳۸ء)

نگاہِ محبت

[illegible] مصور [illegible] ہوں میں

[illegible] محبت [illegible] ہوا ہوں میں

[illegible] پریشاں [illegible] زلف [illegible]

سمجھ [illegible] کہ وہ مصور [illegible] ہوا ہوں میں

نگاہِ محبت [illegible]

(راز)

مولانا عبدالسلام پر بیجا حملہ

عبداللطیف اعظمی

صحیح نقد و تبصرہ۔ لٹریچر کی بقا و تحفظ اور ترقی و اصلاح کے لئے نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ جس قدر اہم ہے، افسوس ہمارے یہاں اسی قدر کم یاب ہے، خصوصیت کے ساتھ موجودہ دور میں، اس کی کمیابی نہایت شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی ہے، کیونکہ :۔

ادبی تخلیق و ابداع کے سامان کے لئے موضوعات ختم ہوتے جاتے ہیں۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، سلام، مرثیہ غرض ہر شعبۂ نظم میں بالکل اسی طرح کے خیالات اب بھی پیش کئے جا رہے ہیں۔ جو صدیوں سے ہمارے پاس نسلاً بعد نسل چلے آ رہے ہیں۔ عصر حاضر کی مغربی طرز کی نظمیں بھی کوئی نئی چیز نہیں، اُن کی ساری جدت اتنے ہی میں منحصر ہے کہ اشعار زیادہ تر ناموزوں ہوں، ایک ہی شعر کے دو مصرعے دو مختلف بحروں میں ہوں، تشبیہات مغربی زبانوں سے مستعار ہوں اور زبان حد درجہ نامانوس ہو، رہی نثر تو رتن ناتھ سرشار کے زمانے سے اس وقت تک کے ناول، قصے کہانیاں اور فسانے سوائے معدودے چند کے سب ایک ہی ڈھانچے پر الفاظ بدل بدل کے لکھے جاتے ہیں، نہ ان میں تنوع ہے اور نہ وہ نفسیاتی تحلیل جو اس طرح کے تخلیقی کاموں کے لئے، جو بڑی حد تک تنقیدی بھی ہیں، بہت زیادہ ضروری ہے[1]۔

لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اگر کوئی نقاد، عام دستور سے ہٹکر تبصرے کے صحیح فرائض انجام دیتا ہے تو اس کے سر کی خیر نہیں! اس کے خلاف تمام ممکن حربے استعمال کئے جاتے ہیں، تعریضات و کنایات، استخفاف و استہزار، تحقیر و تذلیل کے جتنے الفاظ لغات میں مل سکتے ہیں وہ تمام اس پر صرف کر دئے جاتے ہیں، اسی وجہ سے ہمارے یہاں نقاد بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو ہمت بھی ہوئی تو دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا حالی کی سی شخصیت کو اس وادی میں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہو سکی[2]۔

میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ تبصرہ نگار معدوم ہوتے ہیں، ان سے غلطیاں ممکن نہیں۔ وہ جو لکھدیتے ہیں، صحیح ہی ہوتا ہے۔ تبصرہ نگار کو صحیح راہ دکھلانا، ان کی غلطیوں پر اُنھیں متنبہ کرنا، درحقیقت یہ بھی ادب و زبان کی بہت بڑی خدمت ہے، کیونکہ اُسے ہئیتِ اجتماعی (میں مخصوص اہمیت حاصل ہوتی ہے، اس کی بے راہ روی بہتوں کو گمراہ کر دے گی اور لٹریچر کو غیر معمولی نقصان پہونچ جائے گا۔ لیکن لکھنے اور کہنے کے طریقے ہوتے ہیں۔ یہ کیا کہ جو زبان و قلم پر آیا اُسے لکھدیا۔

ٹھیک انھیں خصوصیات کا حامل، اگست کے نیرنگِ خیال میں مولانا

---

[1] ہندوستانی ۳۲ء صفحہ ۲۱۶

[2] شعر و شاعری، ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی صفحہ ۲۵۴

عبدالسلام صاحب ندوی کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ مضمون کیا ہے گالیوں کا مجموعہ! صرف اس قصور پر کہ مولانا نے معارف بابت ماہ فروری میں جہانِ آرزو پر تبصرہ کیا تھا اور اُس کی خامیوں کو بھی ظاہر کیا تھا، یہ مصنف کے معتقدین کو پسند نہیں آیا، پھر کیا تھا،

یا دیتھیں جتنی "دُعائیں" صرفِ درباں ہوگئیں

میں نہ لکھتا، کیونکہ کسی مسئلہ پر تمام لوگوں کا اجتماع ناممکن ہے، لیکن فاضل مجیب کی ذہنیت اور طریقۂ نگارش نے لکھنے پر مجبور کیا۔

محترم مجیب کا لب و لہجہ نہایت درشت اور ناروا ہے۔ اگر ان کے نزدیک مولانائے محترم کے اعتراضات غلط تھے تو آدابِ شرافت و صحافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی، ان کی تردید ہوسکتی تھی۔ تعریضات و کنایات اور ذاتی حملوں کی کیا ضرورت تھی۔

مضمون میں فاضل نقاد کی ادبی قابلیت پر بھی بحث کی گئی ہے اور اڈیٹر اودھ پنچ کے "اُڑائے ہوئے چیتھڑے" پیش کرکے، ادبی میدان میں اُن کی شکستہ پائی کا ثبوت دیا گیا ہے۔

علمی اور ادبی میدان میں مولانا کو جو حیثیت حاصل ہے، اُس کے متعلق چنداں لکھنے کی ضرورت نہیں، یہ بالکل مسلم ہے اور سورج کی طرح روشن۔ فاضل مجیب اگر تھوڑی دیر کے لئے، اپنی تعصب کی عینک اتار کر، ان کی کسی اور کتاب کو نہیں، شعرالہند کو جو اُن کے نزدیک مصنف کی بدمذاقی، تنقیدی کج نگاہی اور ادبی شکستہ پائی کی آئینہ دار ہے، پڑھیں تو مصنف کی علمی و ادبی قابلیت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آپ کے الفاظ میں اس کے چیتھڑے اڑائے گئے ہیں۔ لیکن اس کے لکھنے والے، آپ کے سے، صرف چند ہیں، اور تعریف کرنے والوں کے مقابلے میں ان کو مطلق اہمیت حاصل نہیں ہے۔ مگر چونکہ مجیب بدقسمتی سے اعظم گڈھ کے لوگوں پر خاص طور پر مہربان ہیں، اس لئے ظاہر ہے وہ تبصرے ان کی نظر سے نہیں گزرے ہوں گے، لیکن اگر وہ تحقیق کرنی چاہیں تو آج بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اودھ پنچ کی جلدوں کی طرح وہ بھی کتب خانوں میں محفوظ ہیں ـــــ صرف اودھ پنچ کے اڑائے ہوئے چیتھڑے ہی نہیں پڑھنا چاہیے سر شارتے کے دنداں شکن جوابات پر بھی نگاہ ہونی چاہیئے۔

تاریخ ادب اردو، مجیب کی نظر سے ضرور گذری ہوگی، معلوم نہیں اس کے مصنف کی کیا رائے ہے، اور فاضل نقاد کے متعلق جو لکھا گیا اُسے موصوف نے پڑھنا گوارا بھی کیا یا نہیں؟! اگر نہ پڑھا ہو تو ذرا ملاحظہ فرمائیں تکلیف تو ہوگی، وہ لکھتے ہیں:-

مولوی عبدالسلام صاحب کی ذات پر دارالمصنفین کو جس قدر ناز ہو کم ہے وہ وقتاً فوقتاً معارف میں نہایت اعلیٰ درجہ کے مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز، اسوۂ صحابیات، شعرالہند حصہ اول و دوم، ابن یمین وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ سنا ہے کہ مولانا شبلیؒ کی زندگی کے حالات بھی مرتب کر رہے ہیں۔ مگر وہ اب تک شائع نہیں ہوئے۔ شعرالہند میں جو نظم کی ایک مبسوط تاریخ ہے، ان اثرات و حالات کو جو مختلف اوقات میں نظمِ اردو پر مترتب ہوئے ہیں مفصل اور نہایت خوبی سے بیان کیا ہے اپنی نوعیت میں یہ کتاب بہت عمدہ اور قابلِ تعریف ہے، اس کتاب کو تصنیف کرکے مصنف نے فی الحقیقت زبان اردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے ......[1]

اس کے بعد چند سطروں میں، بعض لوگوں کے اعتراضات کو دبی زبان سے تسلیم بھی کیا ہے، اور یہ اعتراف ہی درحقیقت اس تنقید کی اہمیت او صحت کا ضامن ہے، اگر مصنف محض تعریف پر اکتفا کرتا، جیسا کہ آپ جہانِ آرزو کے ہر تبصرہ نگار سے متمنی ہیں، تو اُس کی حیثیت تقریظ سے زیادہ نہ ہوتی۔

مولانا عبدالحق صاحب نقاد کی حیثیت سے بہت بڑی شہرت کے مالک ہیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ وہ تعصب اور شخصیت پرستی سے بہت بلند ہیں اسی وجہ سے اُن کے رسالہ اردو کی تنقیدوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ شعرالہند کے متعلق اس رسالہ کی کیا رائے ہے؟ اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"فاضل مولف نے جہاں تک ان کی دسترس تھی، دونوں پہلوؤں پر بخوبی بحث کی ہے اور تحقیق کی داد دی ہے۔ تاہم بعض عنوانات تشنہ رہ گئے ہیں، جوں جوں قدیم چیزیں دستیاب ہوتی جائیں گی، تحقیق کا میدان وسیع ہوتا جائے گا، ہر عنوان کے تحت میں شعراء کے کلام سے نمونے کے اشعار کافی دیئے گئے ہیں۔ اور ہر عنوان کا تجزیہ بڑی خوبی سے کیا گیا ہے اور اُس کی ساری کیفیتیں کلام نمونہ کے ساتھ بتائی گئی ہیں۔

یہ کتاب اردو شاعری پر بہت قابل قدر ہے، خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ قابل مولف نے ہر پہلو کا موازنہ نہایت انصاف اور سچائی سے کیا ہے

[1] حرف نثر صفحہ ۵۰

اِس کے علاوہ خورشید بھی دیکھ رہا تھا کہ چرس نے اُس کی حالت بد سے بدتر کر دی تھی، اور نہ صرف یہ کہ وہ دُبلا کمزور اور کام کے قابل نہ معلوم ہوتا تھا، بلکہ اُس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اُسے حرارت بھی ہے۔

خورشید کھانے کے کمرے میں جا کر کھڑکی سے دیکھنے لگا۔ جہاں سے لکڑی کی کوٹھری اور میدان صاف نظر آ رہا تھا۔

باورچن آگے آگے جا رہی تھی، اور فقیر پیچھے پیچھے۔ باورچن نے راستے میں اپنے ساتھی کو غور سے دیکھا، کچھ کہا اور اُس کے بعد لکڑی کی کوٹھری کے پاس پہونچ کر تالا کھولا، اور دھکے کے ساتھ دروازہ کھولدیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ باورچن کسی کام میں مصروف تھی، اور اُسے ناوقت بلانا ناگوار گزرا۔ خیر" خورشید نے خیال کیا۔

بھکاری ایک لکڑی کے کندے پر بیٹھ گیا اور اپنے سر کو ہاتھ کا سہارا دے کر کچھ سوچنے لگا۔ باورچن نے کلہاڑی اُس کے قدموں کے پاس پھینکدی، اور کچھ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگی، جیسے اُس کو گالیاں دے رہی ہو۔ فقیر نے بے پروائی سے ایک کُندا اُٹھا لیا، اور اپنے پیروں کے درمیان مضبوطی سے پکڑ کر اُسے چیرنے لگا۔ لیکن جیسے ہی اُس نے کندے پر کلہاڑی چلائی کُندا اُچھل کر دُور جا گرا اور فقیر کو دکر دوسری طرف۔ فقیر نے پھر اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور ڈرنے لگا کہ مبادا کلہاڑی اُچھل کر اُس کی پیر کی انگلی کو زخمی کر دے۔ آخر اُس نے دوبارہ کلہاڑی چلائی، اور اس بار لکڑی اُچھل کر دور جا گری۔

خورشید کھڑکی کی آڑ سے یہ سب کرشمے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں اپنے اوپر نفرین کر رہا تھا کہ ناحق اُس نے ایسے ناکارہ آدمی کو ایسے سخت کام پر مقرر کرکے اپنے سر عذاب مول لیا۔ وہ اس وجہ سے اور پریشان تھا کہ وہ مریض بھی تھا۔

"کوئی حرج نہیں" اُس نے آخرش خود ہی کہا" میں جو کچھ کر رہا ہوں اُس میں اُسی کا فائدہ مضمر ہے" یہ کہتا ہوا وہ اپنے مطالعے کے کمرے میں چلا گیا۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد باورچن نے آ کر اطلاع دی کہ لکڑی ختم ہوگئی۔

"لو، یہ اٹھنی اُس کو دیدو" خورشید نے کہا" اور اُس سے کہدو کہ ہر ماہ کی پہلی کو وہ اسی طرح آ کر لکڑی کاٹ جایا کرے۔ وہ کبھی واپس نہیں کیا جاوے گا۔ کوئی نہ کوئی کام اُسے ضرور دیا جائے گا"

دوسرے ماہ فقیر پھر آیا اور حسبِ سابق لکڑی کاٹی اور دام لے کر چلا گیا۔ اِس بار وہ پہلے سے بھی نحیف و کمزور معلوم ہو رہا تھا، مگر کسی نہ کسی طرح اس نے کام کر دیا۔ کبھی کبھی اُسے مختلف کام بھی کرنا پڑتے تھے۔ کبھی جھاڑو دیتا۔ لحاف اور گدّے صاف کرتا اور کبھی لکڑی کاٹتا۔ غرضکہ وہ اِسی طرح کام کرتا اور دام وصول کرتا رہا۔

خورشید کبھی کبھی ترس کھا کر اُسے قمیص اور پائجامہ بھی دیدیتا تھا۔

جب وہ کام کرکے جانے لگتا تو خورشید اُسے مطالعے کے کمرے میں بلاتا، اُس سے میز، کرسی، دری، اور کھڑکیاں صاف کرواتا۔ فقیر نہایت سنجیدگی سے اُس کی ہر فرمائش اور اُس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا، لیکن کبھی کسی سے کلام نہ کرتا۔ اُس کے کمرے میں اور جو لوگ بیٹھے ہوتے وہ اُسے دیکھ دیکھ کر ہنستے۔

ایک دن جب وہ کام ختم کر چکا تو خورشید نے اُسے بلا کر کہا "سنو دوست، مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میرے الفاظ رائگان نہ گئے، اور تم نے اُن سے اثر لیا اور اب تم کام کی طرف توجہ کرنے لگے ہو، لو یہ اٹھنی ـــــ اچھا تمہارا نام کیا ہے؟"

"فیروز"

"فیروز، میں چاہتا ہوں کہ تمہیں تمہاری حیثیت کے مطابق کام دوں۔ کیا تم لکھ پڑھ سکتے ہو؟"

"ہاں، جناب، بہت اچھی طرح"

"ادھر آؤ، یہ رقعہ لو اور میرے ایک کالج کے دوست جو فلاں دفتر میں ہیں اُن کو دیدینا، وہ تمہیں نقل کا کچھ کام دیدیں گے، اُس کو نہایت احتیاط سے انجام دینا۔ اور سنو، مستعدی سے کام کرنا، چرس نہ پینا، کبھی نہ پینا ـــــ اور دیکھو میرے الفاظ ہمیشہ یاد رکھنا۔ اچھا .... خدا حافظ۔

خورشید یہ سمجھتے ہوئے کہ اُس نے ایک غریب و ناکارہ فرد کو کسی قابل کر دیا، بہت خوش تھا، اُس نے فیروز کو آفرین کہتے ہوئے رُخصت کر دیا، اور رخصتی کے وقت اُس سے ہاتھ بھی ملایا۔ فیروز نے رقعہ لیا اجازت چاہی اور سلام کرکے کمرے کے باہر نکل گیا اور اُس کے بعد پھر کبھی اِس ارادے سے نہیں آیا کہ اُسے لکڑی چیرنا ہے۔

رفتہ رفتہ دو سال گزر گئے۔

ایک دن خورشید عکاس خانے کے پاس کھڑا تھا اور ٹکٹ خرید کر دام کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک اُس نے اپنے نزدیک ایک چھوٹے آدمی کو کھڑے دیکھا۔ وہ گرم نیلے سوٹ میں ملبوس تھا۔ اُس نے کلرک سے ٹکٹ کے لئے کہا اور دام دے کر انتظار کرنے لگا۔

"اخاہ فیروز صاحب آپ کہاں ہیں؟ خورشید نے اپنے لکڑہارے کو پہچانتے ہوئے کہا: کہو بھائی، اچھے تو ہو"

"بہت اچھا جناب، میں بالکل بعافیت ہوں اور آج کل ایک دفتر میں مہتمم کی حیثیت سے پونے سو روپیہ ماہوار پر ملازم ہوں"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ فیروز صاحب، میں یہ سنکر بہت مسرور ہوں، اتنی تنخواہ تو کافی ہے تمہارے لئے۔ تم جانتے ہو تم کسی نہ کسی نہج سے میرے چیلے ہو، تمہیں یاد ہے کہ میں نے تمہیں کس طرح راہ راست پر لگایا۔ اگر میں اُس دن تم پر اتنا خفا نہ ہوتا، اتنا سخت سست نہ کہتا تو شاید آج تمہیں یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا، میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تم نے میرے الفاظ تو ضائع نہ ہونے دیئے۔

"اس میں کلام نہیں کہ اگر میں اُس دن آپ کے پاس نہ جاتا تو اِس وقت تک اپنے کو متعلم و متکلم کی خلیج ہی میں پھنسا ہوا پاتا اور اب تک اسی مفلسی اور ناکامی کی زندگی بسر کرتا ہوتا، میں بلاشبہ آپ کی وجہ سے سنبھلا اور مفلسی کے غار سے نکل آیا۔

خورشید نے کہا "میں تم سے بہت خوش ہوں"

"اور میں بھی آپ کے گزشتہ الطاف و عنایات کا بیش از بیش شکریہ ادا کرتا ہوں، آپ نے مجھے اُس دن جو رائے دی تھی وہ بالکل صائب تھی، میں آپ کا نہایت ممنون ہوں اور خصوصاً نصیبن با ورچن کا، وہ رحمدل اور شریف عورت۔ میں آپ کا احسان قیامت تک نہیں بھول سکتا۔ لیکن حقیقتاً وہ صرف نصیبن باورچن کی ہستی تھی، جس نے مجھے اُس عذاب سے نجات دلائی"

"میں سمجھا نہیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو" خورشید نے کہا۔

سنیئے، واقعہ یہ تھا" فیروز نے کہا "میں تو آپ کے یہاں ہر ماہ لکڑی چیرنے کی غرض سے آتا تھا، لیکن میں بہت نحیف و نزار تھا۔ مجھ میں چلنے کی تاب نہیں تھی۔ لکڑی کیسے چیرتا، باورچن میرے سامنے کندوں کا ڈھیر لگا دیتی اور میں کلہاڑی لے کر چیرنے کھڑا ہوتا، ایک ضرب لگاتا تو دس منٹ دم لیتا۔ غریب باورچن دیکھنے آتی اور آخر رحم کھا کر خود لکڑیاں چیر دیتی۔ میں آخر وقت اُٹھتا آپ سے دام لیتا اور خوش خوش چلا جاتا، آپ کو سنکر تعجب ہوگا کہ میں نے آپ کے یہاں ایک بار بھی لکڑی خود نہیں چیری۔

خورشید یہ سنکر سخت متحیر ہوا، اور غصہ ہو کر بولا۔

"ناشدنی، خدا تجھے سمجھے۔ بدقسمت آدمی۔ نہ تیرے لئے یہاں سکون ہے نہ آخرت میں۔

لیکن آپ یقین کیجئے جب وہ لکڑی چیرتی ہوتی تو میں اپنی جگہ بیٹھا بیٹھا محجوب ہوا کرتا اور شرمایا کرتا، اُس نے متعدد بار میرے حال پر تاسف کیا۔ مجھے سمجھایا اور آخر کار میں بھی رفتہ رفتہ سمجھا کہ آخر میں تو جو کچھ کرتا ہوں کرتا ہوں۔ لیکن میری وجہ سے اِس باورچن کو کیوں تکلیف ہو، چنانچہ میں نے چرس پینا چھوڑ دیا، اور اُس کے بعد سے میری حالت سدھرنے لگی۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف باورچن تھی جس نے مجھے فرش سے اُٹھا کر عرش پر بٹھا دیا۔

"خیر وہ میں ہوں یا باورچن، مدعا تو تمہارا سدھرنا تھا سو وہ پورا ہو گیا"

(چیخوف)

تلاشِ حق

خدا کو بزمِ امیری میں ڈھونڈنے والو
نشانِ شباب کا پیری میں ڈھونڈنے والو

خدا تمہیں نظر آتا ہے زر پرستی میں
خدا کو ڈھونڈتے ہو تم فراخ دستی میں

تلاشِ حق میں بھٹکتے ہو کچھ خیال کرو
"خدا کہاں ہے" غریبوں سے یہ سوال کرو

(سید فیضی جالندھری)

حسّاس بھکاری

لطیف شاہد

"للہ، مجھ پر رحم کیجئے۔۔۔۔ میں سخت بھوکا ہوں، میں نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا ہے۔۔۔۔۔۔۔ میرے پاس ایک پائی نہیں جو کچھ لے لیتا۔۔۔۔ سرکار! مجھ غریب پر ترس کھائیں۔۔۔۔۔۔۔ رحم کیجئے۔۔۔۔۔۔۔ آپ باور کیجئے، میں ذلیل آدمی نہیں، آوارہ نہیں۔ شریف ہوں۔ ایک سال قبل قصبے میں مدرس تھا، جھوٹی شہادت کے الزام میں نکال دیا گیا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔ اب تک بیکار ہوں۔۔۔۔ پریشان ہوں۔۔۔۔ خدا کے لئے مجھ بیکس کی مدد کیجئے۔۔۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں۔"

خورشید نے ایک نگاہِ غلط انداز اُس پر ڈالی اور معاً اُس کا پھٹا ہوا نیلا کوٹ چیچڑی آنکھیں اور داغدار گال دیکھکر اُسے خیال ہوا کہ شاید اُس نے اِس سے قبل اُسے کہیں دیکھا ہے۔

"اور سرکار" فقیر نے ذرا دم لے کر کہا "فلاں شہر میں ایک اسامی خالی ہے لیکن کیا کروں۔ میرے پاس ایک حبہ نہیں۔ خود بھوکوں مر رہا ہوں، کرایہ کہاں سے لاؤں۔۔۔۔۔ حضور میری مدد کیجئے۔۔۔۔۔ خدا آپ کو اِس کا اجر عطا کرے گا۔۔۔۔ گو مجھے سوال کرتے شرم آتی ہے۔ لیکن کیا کروں حالات سے مجبور ہوں۔"

خورشید نے اتنی دیر میں اُسے غور سے دیکھ لیا، اور اُس کے غیر معمولی لمبے ربڑ کے جوتے دیکھکر جو گھٹنوں تک مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے فوراً یقین کر لیا کہ وہ اُسے دو روز قبل دیکھ چکا ہے۔

"میں نے تجھے پرسوں گلی میں اِسی حالت میں دیکھا ہے" خورشید نے کہا اور اُس دن تو نے کہا تھا کہ میں ایک غریب طالب علم ہوں، اسکول سے نکال دیا گیا ہوں۔ اور اب کوئی ذریعۂ معاش نہیں۔" کیوں، تجھے یاد ہے یا بھول گیا؟ اور آج تو کہہ رہا ہے کہ میں مدرس ہوں۔"

"نہیں حضور۔۔۔۔۔۔ کبھی نہیں" اُس نے گھبرا کر کہا "میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں مدرس ہوں۔ اگر آپ کو کچھ شک ہے تو میرے کاغذات دیکھ لیجئے۔"

"بالکل جھوٹ، تین دن کی بات میں بھول نہیں سکتا۔ تو نے صاف صاف کہا تھا کہ میں طالب علم ہوں، بلکہ یہ بھی بتلایا تھا کہ اسکول سے کیوں نکالا گیا۔۔۔۔۔۔ ذرا یاد کر۔"

خورشید غصہ سے سُرخ ہو گیا اور اُس نے اتنا کہہ کر بھکاری کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں۔ "جناب بڑی ذلت کی بات ہے، میں جھوٹا نہیں" اُس نے آواز پر زور دے کر کہا، "فریب، سراسر فریب۔۔۔۔۔ میں تجھے پولیس کے حوالے کروں گا، غدار کہیں کا۔ تو غریب ہے، بھوکا ہے۔ یہ سب صحیح ہے مگر اس کے یہ معنی تو نہیں کہ تو اِس دلیری سے جھوٹ بولے۔"

بھکاری نے مایوسی سے کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالی، گویا وہ ایک قفس میں قید ہے، اور نکلنے کے لئے راستے کی فکر میں۔

"جھوٹ؟ میں جھوٹ ایک حرف نہیں کہتا۔ آپ باور کیجئے اور میری اسناد دیکھ لیجئے۔" فقیر نے جھنجھلا کر کہا۔

"اب یقین کیسے آسکتا ہے" خورشید نے زیادہ ترش رو ہو کر کہا "کس قدر

کمینہ پن کی بات ہے کہ تو اپنے کو طالب علم اور مدرس جتا کر نہ صرف لوگوں کی ہمدردی حاصل کرتا ہے بلکہ مستحقین کا حق بھی غصب کرتا ہے!"

فقیر کے صریح جھوٹ سے خورشید کو بہت رنج پہونچا، وہ بہت رحمدل واقع ہوا تھا اور نہ صرف غریبوں اور محتاجوں کے ساتھ اُسے ہمدردی تھی بلکہ وہ اُن کی دامے درمے امداد بھی کیا کرتا تھا، لیکن اِس فقیر کے اصرار اور جھٹلانے پر اُسے سخت طیش آیا۔ پہلے تو اُس نے اُسے بہت زجر و توبیخ کی، بہت بُرا بھلا کہا۔ مگر آخرش اُس نے عہد کر لیا کہ اب وہ اِن غریب حرامزادوں کی مدد کر کے اُن کے کاروبار کو فروغ نہ دے گا۔

فقیر بھی اُس کی باتیں سنا کیا اور خاموش رہا۔ وہ اس قسم کی باتیں سُننے کا عادی ہو گیا تھا، پہلے تو وہ اپنے الفاظ کی حمایت کرتا رہا قسمیں کھائیں اور یقین دلایا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ لیکن جب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ اُس کے فریب میں آنے والا نہیں، اور اُس پر یہ چال نہیں چل سکتی، تو وہ خاموش ہو گیا اور آخر کار شرم سے مغلوب۔

"سرکار، اُس نے نہایت لجاجت سے کہا" آپ سچ فرماتے ہیں، میں جھوٹا ہوں ...... بالکل جھوٹا، لیکن آپ ہی فرمائیں کہ میں اس کے سوا کر ہی کیا سکتا ہوں ------ یقیناً میں مدرس نہیں ہوں اور نہ طالب علم۔ یہ سب میرے دماغ کی اختراعیں ہیں ------ میں گویا ہوں۔ چونکہ چرس پینے کا عادی تھا، اسی لئے بہت جلد میری صحت خراب ہو گئی اور میں کام کے قابل نہ رہا اور نکال دیا گیا ...... اب اگر میں اپنے واقعات صحیح صحیح بتلاؤں تو مجھ پر کون ترس کھائے گا، کون میری مدد کرے گا۔ اگر میں سچ بولتا ہوتا تو اب تک کب کا بھوک اور جاڑے کی شدت سے مر چکا ہوتا ----- یقیناً آپ جو کچھ فرماتے ہیں بالکل صحیح ہے اور میں سمجھ بھی گیا ہوں، لیکن خدا کے لئے آپ ہی انصاف سے بتلایئے کہ میں اس کے سوا کر ہی کیا سکتا ہوں؟"

"مجھ سے پوچھتا ہے کہ میں اس کے سوا کیا کروں" خورشید نے اُس کے نزدیک جا کر چیختے ہوئے کہا "میں بتلاؤں ------ کوئی دھندا کر ----- دھندا۔"

"کام ------ لیکن ------ سرکار ------ کام مجھے ملتا کہاں ہے؟ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ مجھے کچھ کرنا چاہیئے۔"

"بالکل لغو۔ نوجوان ہے۔ تندرست ہے اور اگر چاہے تو تجھے کام آسانی سے مل جائے ----- لیکن تجھے معلوم ہے، تو کاہل ہے۔ کام چور ہے۔ چرس پیتا ہے، اور چرس نے تجھے بالکل ناکارہ کر دیا ہے، اور اب تجھکو اس کے سوا اور کوئی دھن نہیں۔" اگر اب بھی تو اپنی حالت سنبھال لے تو کسی نہ کسی دفتر میں معمولی ملازمت مل سکتی ہے۔ کسی طائفے میں اب بھی کام کر سکتا ہے۔ مگر تجھ سے اب محنت ہو ہی نہیں سکتی۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ تو معمولی سے معمولی کام بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس میں تو تیری توہین ہوتی ہے۔"

"ممکن ہے آپ کا فرمانا صحیح ہو" فقیر نے تلخ تبسم کے ساتھ کہا، میں اب اس قسم کے کام کیسے حاصل کر سکتا ہوں، اب میرے لئے یہ مشکل ہے کہ میں کسی دکان پر کام کروں۔ کیونکہ اس کام میں سخت تجربے کی ضرورت ہے، اور اب مجھے کوئی معمولی کام بھی کیوں دینے لگا۔ میں کسی کارخانہ میں کام کے قابل نہیں۔ کسی کاروبار کے لئے سرمایہ نہیں۔ پھر آپ ہی بتلائیں میں کیا کروں؟

"لغو۔ تم ہمیشہ اپنے ناکارہ ہونے کا کوئی نہ کوئی عذر ڈھونڈھ لیتے ہو۔ کیا تم لکڑی نہیں چیر سکتے؟"

"میں اِس کام سے انکار تو نہیں کرتا۔ لیکن اس کام والے بھی تو مارے مارے پھر رہے ہیں۔"

"ارے سب کام چور اسی طرح حجت کرتے ہیں اور اِس سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تم لکڑی چیر سکو تو میں تمہیں دوں۔"

"جناب عالی، میں بہت ممنون ہوں گا۔"

"اچھی بات، مجھے دیکھنا ہے کہ تم ...."

خورشید نے جو اتنی طویل اور بے جا بحث سے عاجز ہو چکا تھا، اپنی باورچن نصیبن کو آواز دی۔

"نصیبن، سنو، تمہیں لکڑی چیرنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے، اس لئے اِس آدمی کو لے جاؤ۔ اور اِس سے لکڑی کٹواؤ۔"

فقیر جو بالکل ساکت کھڑا تھا، ہاتھ پیر جھٹک کر باورچن کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گیا، گو اُس کی نقل و حرکت اور انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے الفاظ دے کر سخت پشیمان ہے، اور صرف اپنے الفاظ کی بیچ میں لکڑی کاٹنے کے لئے جا رہا ہے۔ مگر وہ اِس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا کہ وہ سخت بھوکا تھا، اور اب اُس کی بھوک ضبط کی حد سے گزر چکی تھی۔

اور روایتی تعصبات اور رسمی خیالات کی مطلق پرواہ نہیں کی ہے[1]

۳۸ء میں زمانہ میں دار المصنفین (اعظم گڈھ) کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا تھا مضمون نگار مولانا عبد السلام صاحب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"مولانا کی اصلی خصوصیت صرف ادب وانشار کی ہے۔۔۔۔۔ آپ فطرۃً ادیب پیدا ہوئے ہیں، اس لئے آپ کی توجہ کا محور صرف لٹریچر ہے، ان کے فقرے نہایت مختصر، فصیح اور برجستہ ہوتے ہیں، اردو میں وہ نظم ونثر دونوں پر قادر ہیں اور دونوں کو اس انداز سے لکھتے ہیں کہ اس کی تقلید نہیں ہوسکتی"

استقصار مقصود نہیں، اور نہ اس کی ضرورت، مولانا کی قابلیت اس قسم کے ثبوت سے بالا ہے، ورنہ دفتر کے دفتر پیش کئے جاسکتے ہیں۔

رہا آپ کا یہ فرمانا کہ شعر الہند کے چیتھڑے اُڑائے گئے ہیں، اُسے نامکمل ثابت کیا گیا ہے، تو یہ کونسی نئی اور تعجب کی بات ہے۔ دنیا میں کونسی ایسی تصنیف ہے جس کے چیتھڑے نہ اُڑائے گئے ہوں جس کے مصنف پر فقرے نہ کسے گئے ہوں، خصوصاً اِس جماعت پرستی کے دور میں ؟! یہ تو عام تصانیف کی کیفیت ہے۔ تنقیدی کتابوں اور تبصرہ نگاروں کی جو گت بنتی ہے، وہ موجودہ دور کا نہایت ہی المناک اور شرمناک واقعہ ہے۔

مضمون نگار کے نزدیک شعر الہند کا مصنف جہانِ آرزو پر تبصرہ کرنے کا اہل نہیں۔ لیکن

ہرکس وناکس ہے نقدِ تبصرہ کا مدعی! زندہ رہنا اہلِ فن کا آج کل دشوار ہے
لکھدی شعر الہند جب کاغذ قلم ہاتھ آگیا شعر کہنے کے لئے خونِ جگر درکار ہے

کہنے والے کو وہ شعر الہند پر تنقید کرنے کا نہ صرف حق دیتے ہیں بلکہ اس کی رائے کو قابل ثبوت سمجھتے ہیں، سچ ہے، دوسروں کی آنکھ کا تنکا بہت آسانی سے نظر آجاتا ہے، اور اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ جو شخص چار مصرعے بھی صحیح نہ کہہ سکے، جسے یہ بھی نہ معلوم ہو کہ مترادف الفاظ میں ترکیب اضافت جائز نہیں۔ وہ شعر الہند پر کیا تبصرہ کرسکتا ہے اور اُس کے تبصرے کو کیا وقعت دی جاسکتی ہے۔

مجیب نے اُسے یا تو اس لئے نقل کر دیا کہ یہ اُن کے کوئی بزرگ ہیں اور شعر الہند کے خلاف لکھا ہے، اس سے بحث نہیں کہ شعر کہنے والا تنقید کی اہلیت سے کس قدر معرا ہے اور یا تو اُن کے نزدیک تنقید کے لئے کسی خاص صلاحیت کی ضرورت نہیں، ہر وہ شخص جسے قلم پکڑنا آجائے، وہ تبصرہ کرسکتا، حالانکہ

(۱) نقاد کو ادب کی معلومات اور اس کے متفرق شعبوں کی خصوصیات سے واقف رہنا چاہیئے، نیز متفرق اصنافِ سخن کی اصطلاحات کے اشتقاق ومعانی پر بھی اُس کو کافی عبور ہونا ضروری ہے، تاکہ جہاں کہیں اصطلاحیں آئیں، وہ ان کی تمام علیہیات سے واقف ہو جائے۔

(۲) تاریخ پر اس کی گہری نظر ہونی چاہیئے، ماضی کے تمام ادبوں اور صنعتی دوروں کی نشوونما اور عروج وزوال سے اس کو کافی واقفیت ہونی ضروری ہے، ورنہ بہترین سے بہترین تنقیدی تحریر بھی ایک شاندار لیکن پا در ہوا عمارت ثابت ہوگی۔ (روحِ تنقید صفحہ ۷)

مجیب کا یہ کہنا بالکل خلاف واقعہ ہے کہ مولانا نے اپنی زندگی میں ایک مصرع بھی موزوں نہیں کہا، اگر وہ معارف کا مطالعہ کرتے تو اپنی بے خبری کا ثبوت نہ دیتے۔ لیکن جب مجیب کے نزدیک بھی غیر شاعر کو شاعری پر تنقید کا حق حاصل ہے تو پھر مولانا عبد السلام صاحب نے کیا قصور کیا ہے کہ اُنھیں یہ حق نہ دیا جائے، کیا صرف اس وجہ سے کہ آرزو لکھنوی کی اُنھوں نے اندھوں کی طرح محض تعریف پر اکتفا نہیں کی ؟!

مضمون نگار نے مولانا سید سلیمان صاحب ندوی سے استدعا کی ہے کہ باب الانتقاد کے فرائض، وہ اپنے ذمہ لے لیں۔ لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ کل اگر مولانا سید سلیمان صاحب نے آرزو صاحب کی شان میں کوئی تقریظی قصیدہ نہ کہا تو یہی مطالبہ ان سے نہ کیا جائے گا اور اُن کے خلاف اسی طرح غلاظت نہ اچھالی جائے گی، جس طرح جہانِ آرزو کے نقاد کے خلاف اُچھالی گئی ہے۔

اعظم گڈھ سے، فاضل مضمون نگار کی سرگرانی کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی صدا اعظم گڈھ سے بلند ہوتی ہے، تو چاہے وہ اپنی جگہ کتنی ہی صحیح، کتنی ہی اہم اور کتنی ہی ضروری ہو، وہ انکار کر دیتے ہیں، صرف اس وجہ سے کہ وہ اعظم گڈھ سے آئی ہے، چنانچہ اصغر مرحوم اور جگر کی خوش بیانی اور قادر الکلامی کے اعتراف کے باوجود، ان سے صرف اس لئے ناراض ہیں کہ اُن کی تعریف اعظم گڈھ سے کی گئی ہے، مجیب کا ذہنی تضاد ملاحظہ ہو، وہ سید صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ باب الانتقاد اپنے ذمہ لے لیں، یا کم از کم

[1] اردو اکتوبر ۲۹ء

دیوانوں اور ادبی کتابوں پر خود تبصرہ فرمایا کریں اور جب وہ لکھنؤ کو علم و ادب کا گہوارہ اور بڑے بڑے ادیبوں کا مرکز لکھتے ہیں تو انھیں پیکرِ انصاف مولانا اور قبلہ و کعبہ سب کچھ کہا جاتا ہے، لیکن وہی جب جگرؔ کے دیوان پر مقدمہ لکھتے ہیں تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے اور انھیں جگر کا کنڈیڈیٹ کہا جاتا ہے۔ محترم مجیب ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"مولانا کے اس ریویو میں وہ جذبہ بھی شریک حال ہے جس کا مظاہرہ لکھنوی اور غیر لکھنوی شاعری کی بحث میں یوپی کے رسائل اور بعض دواوین کے دیباچوں اور مقدموں میں اکثر نظر سے گزرتا رہتا ہے"

علامہ سید سلیمان کے ایک خطبہ صدارت کی کچھ عبارت نقل کر کے لکھتے ہیں۔

"آگے چل کر لکھنؤ کی خدمات کا اعتراف جن الفاظ میں کیا ہے وہ عبدالسلام صاحب ندوی نے مزدور دیکھا ہوگا۔ حیرت کا مقام ہے کہ ایک انصاف کا پتلا اور دوسرا از سرتاپا تعصب کا کالبد ہو کر رہ گیا"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مولانا عبدالسلام صاحب کی کس تحریر سے فاضل مجیب نے یہ نتیجہ نکالا ہے، کیا جہان آرزو کے تبصرے سے؟ اگر مضمون نگار لکھنے سے پہلے صرف معارف اور ہندستانی کی جلدیں دیکھ لیتے تو اُنھیں اس الزام کی جرأت نہ ہوتی۔

افسوس اس وقت میرے پاس شعر الہند موجود نہیں اور قریب کے کسی کتب خانے میں بھی اتفاق سے نہ مل سکی، ورنہ دکھلاتا کہ انھوں نے کتنے مقامات پر لکھنؤ کی علمی خدمات کا اعتراف کیا ہے، مولانا کا ایک مضمون شاعرہ کے عنوان سے البتہ پیشِ نظر ہے، یہ اعظم گڈھ کے ایک مشاعرے میں پڑھا گیا تھا اور معارف میں شائع ہو چکا ہے، مولانا ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"دلی کے تباہ ہونے کے بعد جب لکھنؤ اردو شاعری کا مرکز قرار پایا تو یہاں مشاعروں نے اور بھی رونق حاصل کی، بالخصوص شہزادگانِ دلی نے جو لکھنؤ میں آ رہے تھے، اُن کی رونق کو اور بھی دوبالا کیا ..... اُن کے ذریعے سے فنِ تنقید کو جو شاعری کا ایک لازمی جزو ہے، نہایت ترقی ہوئی تھی چنانچہ مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے آبحیات میں اس قسم کے بہت سے تنقیدی نکتے لکھے ہیں جو انھیں مشاعروں کی پیداوار ہیں، مثلاً خان آرزو کے مکان پر مشاعرہ تھا، سوداؔ نے یہ مطلع پڑھا

آلودۂ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو اختر پڑے جھانکے ہیں فلک پر سے زمیں کو

خان آرزو نے فوراً قدسی کا ایک مطلع پڑھا۔

آلودۂ قطراتِ عرق دیدہ جبیں را اختر زفلک مے نگرد روئے زمیں را"

ہاں! ان سے یہ قصور ضرور سرزد ہوتا ہے کہ تبصرہ کرتے وقت نقائص کو بھی نہایت جرأت کے ساتھ ظاہر فرما دیتے ہیں، اور اس کا مطلق خیال نہیں کرتے کہ صاحبِ دیوان یا مصنف لکھنوی ہے یا غیر لکھنوی، مضمون نگار کے ممدوح کے استاذ حکیم سید ضامن علی جلالؔ لکھنوی کی شاعری کے متعلق، مولانا کا جو مضمون ہندستانی میں شائع ہوا ہے غالباً وہ مضمون نگار کی نظر سے نہیں گزرا، ورنہ شاید وہ اس الزام کی جرأت نہ کرتے۔

گو مضمون نگار کے جواب کے متعلق کچھ عرض کرنے کا ارادہ نہیں تھا، بلکہ صرف مجیب کے اس ناروا رویّے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنی تھی، جو جواب کے سلسلہ میں اختیار کیا گیا تھا، کیونکہ میرا خیال ہے کہ شاعری کا ذوق سے بہت گہرا تعلق ہے، ناممکن ہے کہ کوئی شاعری پر تنقید کرے اور اس کے ذوق کو اس میں دخل نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ ایک ہی دیوان پر متضاد تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ صرف ذوق ہی کی کارفرمائی نہیں ہوتی، بعض دوسرے جذبات کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ مگر اس کا اثر سب پر غالب رہتا ہے۔ ممکن ہے میرا خیال غلط ہو۔ مجھے اس کی صحت پر چنداں اصرار نہیں، مگر خود میرا اسی پر عمل ہے۔ لیکن جب یہ بحث چھڑ گئی ہے تو ذوقیات سے علیحدہ ہو کر جہاں تک اصول کا تعلق ہے اس پر بھی ایک نظر ڈالی جائے تو بہتر ہوگا۔

مولانا عبدالسلام صاحب جہانِ آرزو پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حکیم سید ضامن علی جلالؔ، لکھنؤ کے ان شعرا میں تھے جنھوں نے سب سے پہلے لکھنؤ کی شاعری میں انقلاب پیدا کیا اور خارجی مضامین یعنی خال و خط، زلف و کاکل اور محرم اور دوپٹہ کو چھوڑ کر جذبات و واردات کو اپنا سرمایۂ تغزل بنایا۔ اُن کے تلامذہ نے بھی یہی روش اختیار کی ہے، اور اُن میں سید انور حسین آرزو نے اس روش کو اس قدر ترقی دی کہ اب اُن کا شمار دورِ جدید کے شعرا میں کیا جاتا ہے، اس جدید رنگ میں

اور روایتی تعصبات اور رسمی خیالات کی مطلق پرواہ نہیں کی ہے[1]

۱۹۳۲ء میں زمانہ میں دارالمصنفین (اعظم گڈھ) کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ مضمون نگار مولانا عبدالسلام صاحب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"مولانا کی اصلی خصوصیت صرف ادب وانشار کی ہے ۔۔۔۔۔ آپ فطرۃً ادیب پیدا ہوئے ہیں، اس لئے آپ کی توجہ کا محور صرف لٹریچر ہے، ان کے فقرے نہایت مختصر، فصیح اور برجستہ ہوتے ہیں، اردو میں وہ نظم ونثر دونوں پر قادر ہیں اور دونوں کو اس انداز سے لکھتے ہیں کہ اس کی تقلید نہیں ہوسکتی"

استقصار مقصود نہیں، اور نہ اس کی ضرورت، مولانا کی قابلیت اس قسم کے ثبوت سے بالا ہے، ورنہ دفتر کے دفتر پیش کئے جاسکتے ہیں۔

رہا آپ کا یہ فرمانا کہ شعرالہند کے چیتھڑے اُڑائے گئے ہیں، اُسے نامکمل ثابت کیا گیا ہے، تو یہ کونسی نئی اور تعجب کی بات ہے۔ دنیا میں کونسی ایسی تصنیف ہے جس کے چیتھڑے نہ اُڑائے گئے ہوں، جس کے مصنف پر فقرے نہ کسے گئے ہوں، خصوصاً اس جماعت پرستی کے دور میں؟! یہ تو عام تصانیف کی کیفیت ہے۔ تنقیدی کتابوں اور تبصرہ نگاروں کی جو گت بنتی ہے، وہ موجودہ دور کا نہایت ہی المناک اور شرمناک واقعہ ہے۔

مضمون نگار کے نزدیک شعرالہند کا مصنف جہانِ آرزو پر تبصرہ کرنے کا اہل نہیں۔ لیکن

ہر کس وناکس ہے نقدِ تبصرہ کا مدعی!　　زندہ رہنا اہلِ فن کا آج کل دشوار ہے
لکھدی شعرالہند جب کاغذ قلم ہاتھ آگیا　　شعر کہنے کے لئے خونِ جگر درکار ہے

کہنے والے کو وہ شعرالہند پر تنقید کرنے کا نہ صرف حق دیتے ہیں بلکہ اس کی رائے کو قابل ثبوت سمجھتے ہیں، سچ ہے، دوسروں کی آنکھ کا تنکا بہت آسانی سے نظر آجاتا ہے، اور اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا، جو شخص چار مصرعے بھی صحیح نہ کہہ سکے، جسے یہ بھی نہ معلوم ہو کہ مترادف الفاظ میں ترکیب اضافت جائز نہیں۔ وہ شعرالہند پر کیا تبصرہ کرسکتا ہے اور اُس کے تبصرے کو کیا وقعت دی جاسکتی ہے۔

مجیب نے اُسے یا تو اس لئے نقل کردیا کہ یہ اُن کے کوئی بزرگ ہیں اور شعرالہند کے خلاف لکھا ہے، اس سے بحث نہیں کہ شعر کہنے والا تنقید کی اہلیت سے کس قدر معرا ہے اور یا تو اُن کے نزدیک تنقید کے لئے کسی خاص صلاحیت کی ضرورت نہیں، ہر وہ شخص جسے قلم پکڑنا آجائے، وہ تبصرہ کرسکتا، حالانکہ

(۱) نقاد کو ادب کی معلومات اور اس کے متفرق شعبوں کی خصوصیات سے واقف رہنا چاہیئے، نیز متفرق اصنافِ سخن کی اصطلاحات کے اشتقاق ومعانی پر بھی اُس کو کافی عبور ہونا ضروری ہے، تاکہ جہاں کہیں اصطلاحیں آئیں، وہ ان کی تمام علیہیات سے واقف ہوجائے۔

(۲) تاریخ پر اس کی گہری نظر ہونی چاہیئے، ماضی کے تمام ادبوں اور صنعتی دوروں کی نشوونما اور عروج وزوال سے اس کو کافی واقفیت ہونی ضروری ہے، ورنہ بہترین سے بہترین تنقیدی تحریر بھی ایک شاندار لیکن پا در ہوا عمارت ثابت ہوگی۔　　(روح تنقید صفحہ ۷۱)

مجیب کا یہ کہنا بالکل خلاف واقعہ ہے کہ مولانا نے اپنی زندگی میں ایک مصرع بھی موزوں نہیں کہا، اگر وہ معارف کا مطالعہ کرتے تو اپنی بے خبری کا ثبوت نہ دیتے۔ لیکن جب مجیب کے نزدیک بھی غیر شاعر کو شاعری پر تنقید کا حق حاصل ہے تو پھر مولانا عبدالسلام صاحب نے کیا قصور کیا ہے کہ انھیں یہ حق نہ دیا جائے، کیا صرف اس وجہ سے کہ آرزو لکھنوی کی اُنھوں نے اندھوں کی طرح محض تعریف پر اکتفا نہیں کی؟!

مضمون نگار نے مولانا سید سلیمان صاحب ندوی سے استدعا کی ہے کہ باب الانتقاد کے فرائض، وہ اپنے ذمہ لے لیں۔ لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ کل اگر مولانا سید سلیمان صاحب نے آرزو صاحب کی شان میں کوئی تقریظی قصیدہ نہ کہا تو یہی مطالبہ ان سے نہ کیا جائے گا اور اُن کے خلاف اسی طرح غلاظت نہ اچھالی جائے گی، جس طرح جہانِ آرزو کے نقاد کے خلاف اُچھالی گئی ہے۔

اعظم گڈھ سے، فاضل مضمون نگار کی سرگرانی کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی صدا اعظم گڈھ سے بلند ہوتی ہے، تو چاہے وہ اپنی جگہ کتنی ہی صحیح، کتنی ہی اہم اور کتنی ہی ضروری ہو، وہ انکار کردیتے ہیں، صرف اس وجہ سے کہ وہ اعظم گڈھ سے آئی ہے، چنانچہ اصغر مرحوم اور جگر کی خوش بیانی اور قادرالکلامی کے اعتراف کے باوجود، ان سے صرف اس لئے ناراض ہیں کہ اُن کی تعریف اعظم گڈھ سے کی گئی ہے، مجیب کا ذہنی تضاد ملاحظہ ہو، وہ سید صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ باب الانتقاد اپنے ذمہ لے لیں، یا کم ازکم

---

[1] اردو اکتوبر ۱۹۳۰ء

دیوانوں اور ادبی کتابوں پر خود تبصرہ فرمایا کریں اور جب وہ لکھنؤ کو علم و ادب کا گہوارہ اور بڑے بڑے ادیبوں کا مرکز لکھتے ہیں تو اُنھیں پیکرِ انصاف مولانا اور قبلہ و کعبہ سب کچھ کہا جاتا ہے، لیکن وہی جب جگر کے دیوان پر مقدمہ لکھتے ہیں تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے اور انھیں جگر کا کنڈیڈیٹ کہا جاتا ہے۔ محترم مجیب ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"مولانا کے اس ریویو میں وہ جذبہ بھی شریک حال ہے جس کا مظاہرہ لکھنوی اور غیر لکھنوی شاعری کی بحث میں یو پی کے رسائل اور بعض دواوین کے دیباچوں اور مقدموں میں اکثر نظر سے گزرتا رہتا ہے۔"

علامہ سید سلیمان کے ایک خطبہ صدارت کی کچھ عبارت نقل کر کے لکھتے ہیں۔

"آگے چل کر لکھنؤ کی خدمات کا اعتراف جن الفاظ میں کیا ہے وہ عبدالسلام صاحب ندوی نے مزدور دیکھا ہوگا۔ حیرت کا مقام ہے کہ ایک انصاف کا پتلا اور دوسرا از سرتا پا تعصب کا کالبد ہو کر رہ گیا۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مولانا عبدالسلام صاحب کی کس تحریر سے فاضل مجیب نے یہ نتیجہ نکالا ہے، کیا جہان آرزو کے تبصرے سے؟ اگر مضمون نگار لکھنے سے پہلے صرف معارف اور ہندستانی کی جلدیں دیکھ لیتے تو اُنھیں اس الزام کی جرأت نہ ہوتی۔

افسوس اس وقت میرے پاس شعر الہند موجود نہیں اور قریب کے کسی کتب خانے میں بھی اتفاق سے نہ مل سکی، ورنہ دکھلاتا کہ انھوں نے کتنے مقامات پر لکھنؤ کی علمی خدمات کا اعتراف کیا ہے، مولانا کا ایک مضمون شاعرہ کے عنوان سے البتہ پیشِ نظر ہے، یہ اعظم گڈھ کے ایک مشاعرے میں پڑھا گیا تھا اور معارف میں شائع ہو چکا ہے، مولانا ایک جگہ لکھتے ہیں۔

دلی کے تباہ ہونے کے بعد جب لکھنؤ اردو شاعری کا مرکز قرار پایا تو یہاں مشاعروں نے اور بھی رونق حاصل کی۔ بالخصوص شہزادگانِ دلی نے جو لکھنؤ میں آرہے تھے، اُن کی رونق کو اور بھی دوبالا کیا۔۔۔۔ اُن کے ذریعے سے فنِ تنقید کو جو شاعری کا ایک لازمی جزو ہے، نہایت ترقی ہوئی تھی چنانچہ مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے آبحیات میں اس قسم کے بہت سے تنقیدی نکتے لکھے ہیں جو انھیں مشاعروں کی پیداوار ہیں۔ مثلاً خان آرزو کے مکان پر مشاعرہ تھا، سودا نے یہ مطلع پڑھا

آلودۂ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو   اختر پڑے جھانکے ہیں فلک پر سے زمیں کو

خان آرزو نے فوراً قدسی کا ایک مطلع پڑھا۔

آلودۂ قطراتِ عرق دیدہ جبیں را   اختر ز فلک مے نگرد روئے زمیں را"

ہاں! ان سے یہ قصور ضرور سرزد ہوتا ہے کہ تبصرہ کرتے وقت نقائص کو بھی نہایت جرأت کے ساتھ ظاہر فرما دیتے ہیں، اور اس کا مطلق خیال نہیں کرتے کہ صاحبِ دیوان یا مصنف لکھنوی ہے یا غیر لکھنوی، مضمون نگار کے ممدوح کے استاذ حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی کی شاعری کے متعلق، مولانا کا جو مضمون ہندستانی میں شائع ہوا ہے غالباً وہ مضمون نگار کی نظر سے نہیں گزرا، ورنہ شاید وہ اس الزام کی جرأت نہ کرتے۔

گو مضمون نگار کے جواب کے متعلق کچھ عرض کرنے کا ارادہ نہیں تھا، بلکہ صرف مجیب کے اس ناروا رویّے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنی تھی، جو جواب کے سلسلہ میں اختیار کیا گیا تھا، کیونکہ میرا خیال ہے کہ شاعری کا ذوق سے بہت گہرا تعلق ہے، ناممکن ہے کہ کوئی شاعری پر تنقید کرے اور اس کے ذوق کو اس میں دخل نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ ایک ہی دیوان پر متضاد تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ صرف ذوق ہی کی کارفرمائی نہیں ہوتی، بعض دوسرے جذبات کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ مگر اس کا اثر سب پر غالب رہتا ہے۔ ممکن ہے میرا خیال غلط ہو۔ مجھے اس کی صحت پر چنداں اصرار نہیں، مگر خود میرا اسی پر عمل ہے۔ لیکن جب یہ بحث چھڑ گئی ہے تو ذوقیات سے علیحدہ ہو کر جہاں تک اصول کا تعلق ہے اس پر بھی ایک نظر ڈالی جائے تو بہتر ہوگا۔ مولانا عبدالسلام صاحب جہانِ آرزو پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حکیم سید ضامن علی جلال، لکھنؤ کے ان شعراء میں تھے جنھوں نے سب سے پہلے لکھنؤ کی شاعری میں انقلاب پیدا کیا اور خارجی مضامین یعنی خال وخط، زلف و کاکل اور محرم اور دوپٹہ کو چھوڑ کر جذبات و واردات کو اپنا سرمایۂ تغزل بنایا۔ اُن کے تلامذہ نے بھی یہی روش اختیار کی ہے، اور اُن میں سید انور حسین آرزو نے اس روش کو اس قدر ترقی دی کہ اب اُن کا شمار دورِ جدید کے شعراء میں کیا جاتا ہے۔ اس جدید رنگ میں

ان کا دوسرا دیوان جہانِ آرزو کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ہمارے پیش نظر ہے۔ اور اس کے دیکھنے سے ان کے کلام کی جو خصوصیات سامنے آتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) وہ بہت سی غزلوں میں نامانوس قافیے استعمال کرتے ہیں، جن کی تعداد محدود ہوتی ہے، اور اس وجہ سے شعرا غزلوں میں، ان قافیوں کو بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً

(پہلا شعر) یہ دوئی کب تک جو دل کو سوزِ غم سے لاگ ہے
جل اُٹھی ہیزم تو پھر ہیزم نہیں ہے آگ ہے

جواب۔ نامانوس قافیوں سے کیا مراد ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آیا، واگ، لاگ کو اگر قافیہ قرار دیا جائے تو یہ قوافی محدود تو ہیں مگر غیر مانوس کس جہت سے ہیں؟ کیا محدود قافیوں میں غزل کہنا قانونی جرم، اخلاقی کمزوری یا ادبی گناہ ہے۔

گذارش۔ دوسرا اعتراض مجیب نے تسلیم کیا ہے، اب رہا یہ مسئلہ کہ یہ قانونی جرم یا ادبی گناہ ہے تو اس سے اہل علم اور ادبی ذوق رکھنے والے بخوبی واقف ہیں۔ غیر مانوس کا مطلب چونکہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا ہے، اس لئے اس کے فیصلے کا اُنھیں کوئی حق نہیں، پہلے سمجھ لیں پھر جواب دینے کی کوشش کریں۔

دوسرا شعر۔ کم التفات پر بھی شوقِ دل کو سیری ہے
گھنا درخت نہ ہو چھاؤں تو گھنیری ہے

دوسرا شعر دم بخود بیٹھ کے خود جیسے زباں کیلی ہے
سانس کیا لوں کہ ہوا دہر کی زہریلی ہے

اس کا مجیب نے کوئی جواب نہیں دیا ہے صرف یہ کہہ کر ٹال دیا ہے کہ "اشعار نمبر ۲ اور ۳ کی قدر وہ حضرات اور زیادہ کریں گے جو زبان کے لغات کی تصنیف و تالیف میں اپنا عزیز وقت صرف کرتے ہیں۔ شاعر نے گھنا اور گھنیری کا فرق ظاہر کرکے اردو زبان پر احسان کیا، گھنا درخت بولتے ہیں اور گھنیری چھاؤں۔ زبان کیلی محاورہ ہے"۔

گذارش۔ واقعی گھنا اور گھنیری کے معنی کسی کو معلوم نہیں تھے، آپ نے بتلا کر بڑا احسان کیا۔ زبان کیلی کا محاورہ بھی نہیں معلوم تھا، حیدرآباد میں اردو کا لغت تیار ہو رہا ہے، آپ اُنھیں بھیج دیجئے، اردو کی بہت بڑی خدمت اور مرتبین پر بہت بڑا احسان ہوگا

چوتھا شعر۔ ہم کو تو حسرت دیں کبھی عزت، ان کو منہ کہ خفیف کرو
ڈھائیں ستم اور اس پر ستم یہ کہتے ہیں تعریف کرو

اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا گیا ہے۔ ناظرین ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ چاروں شعروں میں شاعر کی سعی مشکور نظر آتی ہے "کی آڑ میں پناہ لی گئی ہے۔

گذارش۔ سوال سعی مشکور اور غیر مشکور کا نہیں ہے۔ نقاد کا کہنا یہ ہے کہ قافیے محدود اور نامانوس ہیں۔ جواب اُس کا دیجئے۔

(۲) بہت سی غزلوں میں نامانوس بحریں اختیار کرتے ہیں مثلاً

(۱) کیوں وادیٔ ایمن کے پھیر سے کیوں طور کو آنا جانا ہے
(۲) میں نے بھی کب کہا اگر یہ کہا نہیں کہ ہے۔
(۳) سپید و سیاہ ایک ہی ہیں تو کچھ نظر نظر ہی نہیں۔
(۴) دے کے قریب لے کے دل کہتے ہیں جلد ساز ہو۔

جواب۔ پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں جو بحریں ہیں وہ نامانوس نہیں بلکہ مروجہ بحریں ہیں۔ موجودہ شعرا میں بھی سینکڑوں غزلیں ان بحروں میں موجود ہیں یہاں تک کہ انھیں بحروں میں برابر مشاعرے ہوتے ہیں۔ حضرت اصغر مرحوم کا دیوان میرے پاس ہے نہیں، جگر صاحب کا دیوان ہے۔ جگر کے ذیل کے مصرعے انھیں بحروں میں ہیں۔

(۱) مشروط نگاہ ساقی کی تحریک پہ جس کا ہے
(۲) مرا جو حال ہو سو ہو، برقِ نظر گرائے جائے۔

جگر کے دیوان میں یہ بحریں مولانا کی آنکھوں کو مانوس نظر آتی ہیں، اب رہے آرزو صاحب تو ظاہر ہے کہ وہ لکھنوی ہیں۔

آرزو صاحب کا تیسرا مصرعہ اس میں شک نہیں کہ نامانوس بحر میں ضرور ہے۔ مگر میں بھی عرض کروں گا کہ شاعر اپنے خیال میں آزاد ہے، اگر اس نے ایک غزل نامانوس بحر میں کہہ دی تو شہر کے اندیشے سے قاضی صاحب کو دُبلا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

گذارش۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے یہ تو تسلیم کیا کہ ایک مصرعہ نامانوس بحر میں ہے۔ رہا یہ کہ تبصرہ نگار، شاعر کی آزادی کو مقید کیوں کر رہا ہے، شہر کے اندیشے سے دُبلا ہونے کی کیا ضرورت ہے تو مولانا عبدالسلام کوئی پہلے نقاد نہیں ہیں جنھوں نے کسی شاعر کی بے راہ روی پر ٹوکا ہو، اس سے

پہلے بارہا ایسا ہو چکا ہے۔ خود مجیب کے ممدوح کے استاد، حضرت جلال لکھنوی بھی شہر کے اندیشے سے گھل چکے ہیں۔ اگر انہیں معلوم نہ ہو تو آرزو صاحب کی خدمت میں لکھکر یا خود اپنے الفاظ میں فریادنامہ ارسال فرماکر ان سے دریافت کیجئے کہ حضرت جلال نے نواب کلب علی خاں کو یہ کہہ کر کیوں ناراض کر دیا تھا کہ "حضور نے مطلع میں روی کے ساتھ تاسیس اور دخیل کا التزام کیا ہے، اور اشعار میں اس کی پابندی نہیں کی۔ یہ درست نہیں"۔

شاعر تو اپنے خیال میں آزاد ہے، شہر کے اندیشے سے قاضی صاحب کو دُبلا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

بقیہ تین بحروں کے متعلق، مجیب کا جواب ناکافی ہے۔ قدیم و جدید شعراء کی سینکڑوں غزلوں میں سے دو چار اشعار تو پیش کیجئے۔ یقین رکھئے اگر مولانا، جگر کے کلام پر تبصرہ کرتے تو نامانوس ہی کہتے۔ لکھنے سے پہلے اپنی معلومات کا جائزہ لے لیا کیجئے۔ تدلیس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

(۳) اس قسم کی بحروں میں بعض غزلیں ایسی ہیں جن کا مضمون بجائے ایک شعر کے دو شعروں میں تمام ہوتا ہے۔ اور آخری شعر میں قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے۔ مثلاً

ہے راہِ ہوس وہ طولانی حد جس کی کوئی نہ تمامی ہے
ہر گام خوشی کا سہی پھر بھی آخر منزل ناکامی ہے
اس باغ میں آکر ہم کو بھی تقدیر ملی ہے قمری کی
بندش بازو میں اطاعت کی
گردن میں طوقِ غلامی ہے
میں ہوں تیرا خلوتی ازل مجھے کام منظرِ عام سے
سرِ بام جلوہ ہے ضو فگن نظر آگئے رفعتِ بام سے
وہ پلٹ کے جلد نہ آئیں گے یہ عیاں ہے طرزِ خرام سے
کوئی گردش ایسی بھی اے فلک جو ملا دے صبح کو شام سے
دِ قفس نصیب نہ آشیاں ہے میانِ برزخِ این و آں
ابھی پرشکستہ ہے مرغِ جاں
کہ پھڑک کے نکلا ہے جام سے

مجیب نے اس کے جواب میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ اشعار غلط نقل ہو گئے ہیں، ایک مصرع کو ایک شعر سمجھ لیا گیا ہے۔ یعنی

ہے راہِ ہوس وہ طولانی حد جس کی کوئی نہ تمامی ہے
ہر گام خوشی کا سہی پھر بھی آخر منزل ناکامی ہے

کے بجائے یوں ہونا چاہیئے۔

ہے راہِ ہوس وہ طولانی، حد جس کی کوئی نہ تمامی ہے ہر گام خوشی کا سہی پھر بھی، آخر منزل ناکامی ہے

چنانچہ آخری منزل کے متعلق لکھتے ہیں کہ تین چار سال قبل سندیلہ میں مشاعرہ تھا، جس میں آرزو صاحب اور حضرت جگر دونوں شریک تھے۔ جگر کی ذیل کی غزل اسی بحر میں ہے۔

اسے حال قال سے واسطہ، نہ غرض مقام و قیام سے
جسے کوئی نسبتِ خاص ہو، ترے حسنِ برق خرام سے
مجھے دے رہے ہیں تسلیاں، وہ ہر ایک تازہ پیام سے
کبھی آکے منظرِ عام پر، کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے
کہوں کیا رہا جو مقابلہ، خطراتِ گام بہ گام سے
سرِ بام عشق تمام تک، رہِ شوق نیم تمام سے
نہ غرض کسی سے نہ واسطہ، مجھے کام اپنے ہی کام سے
ترے ذکر سے، تری یاد سے، تری فکر سے ترے نام سے

وغیرہ وغیرہ (ملخصاً)

گذارش، انتہائی کوشش کے باوجود جہانِ آرزو دستیاب نہ ہو سکا، اس لئے اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہت ممکن ہے کہ مجیب کا کہنا درست ہو۔ مگر یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ تنقید نگار نے قصداً ایسا کیا ہو، ممکن ہے دیوان کی طباعت میں اس قسم کی غلط فہمی کا امکان ہو، بہرحال جہانِ آرزو دیکھنے کے بعد اس کا بہتر فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

(۴) ان خصوصیات کا نتیجہ ہے کہ اُن کی اکثر غزلیں حسنِ تغزل سے معرا ہیں، اس کے ساتھ انھوں نے اس جدید کوچے میں بے تکلف قدم رکھا ہے اور لکھنؤ کے دائرے سے نکلنے کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ سرے سے عاشقانہ مضامین ترک کر دیئے جائیں۔ حکیم جلال نے بے شبہ مبتذل اور خارجی مضامین کو جو غزل سے تعلق نہیں رکھتے ترک کر دیا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے حدودِ تغزل سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ لیکن سید انور حسین کے بیت سے اشعار پڑھتے چلے جائیے۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم غزل کے اشعار پڑھ رہے ہیں۔ ایک پوری غزل ملاحظہ ہو

مانگ جو کچھ کے آن بان نہ مانگ — قتل ہو جا مگر امان نہ مانگ
دیکھ پیماں شکن امان نہ مانگ — بعد کو پھیر دے کے جان نہ مانگ
صرف اُس کی خوشی میں سب کچھ ہے — ایک ٹھے مانگ دو جہان نہ مانگ
روح پرور ہے کاہشِ غم دل — موت ہو ہو کے بدگمان نہ مانگ
ظلم سے بھاگتے نہیں حق گو — دار کافی ہے ریسمان نہ مانگ
دینے والے سے تو ہے کم ہمت — خود اُسے مانگ لے جہان نہ مانگ
جان کر جان دی نہیں جاتی — ہوں دھنی بات کا زبان نہ مانگ
بے دلی میں دکھاؤں دل کیونکر — نہیں جو شے وہ میری جان نہ مانگ

آرزو یہ طلب ہے بے معنی
ہند میں رہ کے اصفہان نہ مانگ

مجیب نے اس کا فیصلہ ناظرین پر چھوڑا ہے۔ میں بھی ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔ وہ شروع سے آخر تک پڑھ جائیں، انشاء اللہ انھیں ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں ملے گا جس میں شانِ تغزل اور عاشقانہ مضمون کا شائبہ تک ہو۔

مجیب نے یہ بھی لکھا ہے اور پورے جزم و یقین کے ساتھ کہ نقاد نے بغیر پوری کتاب پڑھے ہوئے صرف چند اوراق پڑھکر ریویو کیا ہے۔

اولاً مجیب کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، دوسرے بقول اوسکر وائلڈ (مشہور تنقید نگار)

"پوری کتاب پڑھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، کسی شراب کا مزہ اور ذائقہ دریافت کرنے کے لئے کیا ضرورت ہے کہ خُم کا خُم چڑھا لیا جائے؟ آدھ گھنٹے پڑھنے کے بعد بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب قابل قدر ہے یا بالکل لغو ہے، بلکہ اگر کسی کو فطرت نے صلاحیت دی ہے تو اُس کے لئے واقعی صرف دس منٹ کافی ہیں۔ کسے فرصت ہے کہ ایک بے مزہ جلد کو پورا کا پورا پڑھے، بس ذرا سا چکھ لینا بالکل کافی ہے۔ بلکہ کافی سے بھی زیادہ ہے۔ (ہندوستانی ۳۳ء صفحہ ۲۱۱)

(۷) "باوجودیکہ ان کے کلام میں اغلاق و ابہام نہیں ہوتا، شعرائے دورِ جدید کی طرح مصنوعی فارسی ترکیبیں بھی استعمال نہیں کرتا، تصوف و فلسفہ کے پیچیدہ مسائل بھی نظم نہیں کرتے۔ لیکن ہاایں ہمہ اس قسم کے پھیکے اور بدمزہ اشعار سے اُن کا یہ دیوان بھرا پڑا ہے البتہ کہیں کہیں معیارِ تغزل کے مطابق کچھ اشعار بھی اُن کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں اور انہی کو، دیوان کا حاصل سمجھنا چاہئیے"

اس کے بعد بارہ تیرہ اشعار بطور مثال کے نقل کئے ہیں۔

اس کے جواب میں مجیب نے تقریباً ۳۰۳ اشعار انتخاب کئے ہیں اور ناظرین کو غور کرنے کی دعوت دی ہے کہ "آیا آرزو کا کلام خیال الفاظ اور اندازِ بیان کی خوبیوں سے مالا مال اور اُن کے شعروں میں جذبات کی مصوری اور محاکات کی نادر مثالیں ہیں یا نہیں" اسی کے ساتھ ایک نئی چیز بھی پیش کی ہے جس سے نہ صرف شعر الہند کا مصنف بلکہ تمام دنیا ناواقف تھی، ناظرین کی حق تلفی ہوگی مگر انھیں ان نوادر سے محروم رکھا گیا۔ اس لئے ملاحظہ فرمالیں۔

وہ لکھتے ہیں۔

"غزل میں اب تصوف اور اخلاق کے مضامین بھی بالتکلف نظم کئے جاتے ہیں۔ ضرب المثل باتوں کو بھی نظم کا جامہ پہنایا جاتا ہے، فلسفہ بھی ان کا جزو بن گیا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر پند و نصائح سے بھی اپنے کلام میں کام لیتا ہے"

خوفناک انتقام!

مترجمہ آغا محمد شریف، بی، اے (علیگ)

رات بھیگ چکی تھی۔ کارنیوال پورے شباب پر تھا، گھاڑیوں کا ایک لامتناہی جلوس، کنیز کی گلیوں میں سے گزر رہا تھا۔ ہوٹلوں، قہوہ خانوں اور مکانوں کے دریچوں سے جہاں بیکرے تماشائی تفریح کے لئے جمع ہو رہے تھے۔ گانے ہنسی اور قہقہوں کی آوازیں پیہم آرہی تھیں۔ ان جگہوں سے حال ہی میں یہ لوگ نکل کر جلوس میں شامل ہونے والے تھے۔

شہر کی ایک طویل اور تاریک گلی میں سے جیکس ڈی ناٹویل گردو پیش کے ہنگامہ سے بے خبر لیکن مخرو مسرت سے معمور دل کے ساتھ رقص کی ایک مشہور دھن سیٹی میں بجاتا ہوا تیز روی سے گزر رہا تھا، ایک ہفتہ سے وہ شہزادی اولگا ڈیمی ڈوف کا خوش قسمت عاشق تھا۔

شہزادی اولگا نے اوائل عمر ہی میں زار کے ایڈ یکانگ پرنس سرجی ڈیمی ڈوف سے شادی کرلی تھی، جسے اب دس سال ہوگئے تھے، اُس وقت اُس کی خوبصورتی کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ لوگوں میں اس کے چال چلن کے متعلق چہ میگوئیاں ہوا کرتی تھیں، لیکن پرنس کے رعب اور قہاری کے باعث کسی میں علانیہ اظہار رائے کی ہمت نہ تھی۔ خود پرنس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک مشہور ایکٹرس کے ساتھ اختلاط رکھتا ہے۔ کہا جاتا تھا کہ وہ ایک حسین اور نوجوان رقاصہ پر ایک عجیب طریقہ سے متصرف ہوا تھا۔ عرصۂ دراز تک جب وہ باوجود کوششوں کے اس کے جال میں نہ پھنسی تو غضب اور ہوس کی آگ سے مشتعل ہو کر وہ اُسے اُس وقت اُڑا لے گیا، جب کہ وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر تھیٹر سے نکل رہی تھی۔ پھر اُس کے پیہم انکار پر برافروختہ ہو کر اس نے اپنے مکان میں قید کر کے اُسے گوناگوں اذیتیں دینی شروع کیں جب اس سے بھی کام نہ چلا تو جوشِ غضب سے اندھا ہو کر اس نے اُسے پچاس ضرب ناوٹ[1] مارنے کا حکم دیا۔

بدقسمت حسینہ نے رو رو کر اس وحشی سے جان بخشی کی بیہودہ التجا کی، لیکن درندہ صفت پرنس کا فولادی دل اس کی آہ و زاری پر نہ پسیجا، ناوٹ کی پندرہویں ضرب پر نازک اندام حسینہ بیہوش ہوگئی، اور سزا کے خاتمہ سے پہلے ختم ہوگئی!

اس بہیمانہ واردات کے راز کے طشت از بام ہونے کا بڑا خوف تھا، لیکن پرنس کے ذاتی رسوخ اور اس کے کارندوں کی راز داری اور حکمت عملی سے بات پھوٹنے نہ پائی۔

جیکس ڈی ناٹویل نے صرف اُس کا نام سنا تھا، نہ وہ کسی فیشن ایبل جگہ میں اُس سے متعارف ہوا تھا، اور نہ ہی کہیں اس کی صورت دیکھی تھی آجکل پرنس روس میں تھا، اُس کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس کی بیگم جیکس کے ساتھ بہت بے تکلف ہوگئی تھی۔

---

[1] روسی تازیانہ جسے انگریزی میں (" Cat of nine tails ") کہتے ہیں۔ چمڑے کے متعدد گرہ دار تسمے ایک دستہ سے بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ زمانہ قریب تک اس وحشیانہ سزا کا رواج روس اور برطانوی افواج میں بھی تھا، اس سزا کا مسٹر جے ڈبلیو بیلاڈ نے اپنے ناول "سولجرز وائف" میں پُر درد نقشہ کھینچا ہے۔ (مترجم)

وہ شہر سے باہر ایک چھوٹی سی خوشنما کوٹھی کی مکین تھی، جہاں آج وہ پہلی مرتبہ اپنے عاشق کا استقبال کرکے اُسے باغیچہ کی راہ سے اپنے پھولوں اور عطر سے بسے ہوئے مشرقی وضع کے کاشانے میں لائی۔ اس سے پیشتر وہ اکثر خود اس کے پاس جا چکی تھی۔ لیکن آج پرنس کی غیر حاضری میں اپنے محبوب کو یہاں بُلانے میں اُسے کوئی امر مانع نہ تھا۔

جیکیس نے ایک مہذب مہمان کی طرح کمرے کی آرائش کا اک نگاہِ غلط انداز سے جائزہ لیا۔ یکایک اُس کی نظر مینٹل پر رکھی ہوئی ایک تصویر پر پڑی۔

"یہ کون صاحب ہیں؟" اس نے پوچھا

"آپ ڈیمی ڈوڈف ہیں۔ آؤ میں اِن سے تمہارا تعارف کراؤں۔ ایم جیکیس ڈی نالوئیل! یہ ہیں میرے شوہر و عاشق —— پرنس ڈیمی ڈوڈف!" اس نے ایک شانِ دلربائی کے ساتھ تصویر کے سامنے خم ہوتے ہوئے کہا!

جیکیس مسکرانے لگا۔ لیکن اپنی محبوبہ کے شوہر کی تصویر پر سے (جسے آج پہلی مرتبہ اس نے دیکھا تھا) وہ یکایک اپنی نظر نہ ہٹا سکا۔ پرنس شاہی دستہ کی وردی میں ملبوس تھا، وہ ایک جوان العمر آدمی معلوم ہوتا تھا جس کی آنکھیں بہت بارعب تھیں۔

"کچھ ظالم اور وحشی سا معلوم ہوتا ہے، کیوں؟ اولگا نے شوخی سے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کے باوجود میں اُسے انگلیوں پر نچا سکتی ہوں، پیارے جیکیس! آج کی رات ہمارے لئے کتنی پُرکیف ثابت ہوگی۔ میں نے اپنے تمام نوکروں کو آج تفریح کے لئے کارنیوال بھیج دیا ہے۔"

جیکیس نے خاتون کو اپنی آغوش میں لیتے ہوئے کہا "اولگا میں تمہاری پرستش کرتا ہوں! تمہارے بغیر زندگی بے معنی ہے، تم جسم ہو تو میں اُس کا سایہ۔ تم چاہو تو میں تمہارے ظالم شوہر کو ہلاک کر سکتا ہوں اور اپنے تئیں بھی......"

"محبت اور پرستش کے معنی کچھ عورتیں ہی بہتر جانتی ہیں۔" اولگا نے اپنے عاشق کا قطع کلام کرتے ہوئے کہا: "قربانی کا وقت آنے دو۔ یقیناً میں اس امر میں پیش پیش ہوں گی۔"

اس کا جواب اس کے محبوب کی طرف سے ہم آغوشی کے ساتھ گرم جوشی کے چند پیہم بوسے تھے۔ یکایک وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر دبی آواز سے کہا۔

"خاموش! —— کوئی باغیچہ میں ہے"۔ اُس نے بجلی کا لیمپ گل کرکے پردۂ دَرِ نُور کو پردۂ وار ظلمت میں تبدیل کر دیا۔ لیکن کوٹھی میں پھر بھی شہر خموشاں کا سا سناٹا تھا۔

"یہ صرف تمہارا واہمہ تھا، پیاری!" یہ کہہ کر جیکیس نے بٹن دبا کر کمرہ کو بار دگر بقعۂ نور بنا دیا اور دونوں اس واقعہ پر ہنسنے لگے۔ یکایک اولگا پھر چونکی۔ اس دفعہ جو آہٹ ہوئی وہ نہایت صاف تھی! —— کوئی شخص سامنے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آنے والے خطرہ کے خوف سے اولگا کانپنے لگی۔

"خلافِ توقع نوکر شاید جلد ہی واپس آگئے ہیں" اُس نے سرگوشی میں کہا: "اُن سے تمہارا سامنا نہ ہونا چاہئے۔ میری خوابگاہ میں نکل چلو، وہاں ہم نسبتہً محفوظ ہوں گے۔"

"نہیں!" جیکیس نے جواب دیا "اب ہمارا علیحدہ ہو جانا ہی بہتر ہے، اب زیادہ دیر یہاں ٹھیرنا مصلحت کے خلاف ہے۔" یہ کہہ کر وہ کھڑکی کی جانب بڑھا، اور اُسے کھول کر چاہتا تھا کہ باہر پھلانگ جائے۔ لیکن اس کی حیرت اور دہشت کی انتہا نہ رہی! —— دریچے میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں!۔

"یہ کیا؟" اُس نے خشمگیں انداز سے پلٹ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں!" شہزادی نے جواب دیا "میرے شوہر روانگی سے پیشتر رہزنوں کے خوف سے تمام دریچوں کو اسی طرح محفوظ کرنے کی ہدایت کر گئے تھے، کنیز کی حالت سے تم واقف ہو۔ خصوصاً کارنیوال کے ایام میں -----!"

"باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟" اُس نے عجلت سے دریافت کیا۔

"ہاں! میری خوابگاہ کے دریچے سے تم بیلوں کے جالیدار فریم کے ذریعہ نیچے اُتر سکتے ہو" یہ کہہ کر اولگا نے دروازہ کھولنا چاہا، لیکن وہ باہر سے مقفل تھا! اس کا رنگ خوف سے زرد ہو گیا!

"دغا، فریب!" اُس نے گھبرائی ہوئی آواز سے کہا "یہ محاصرہ ہے یا اک دام گاہ؟! ہمیں محتاط رہنا چاہئے! ممکن ہے اس وقت بھی ہماری نگرانی کی جا رہی ہو۔"

وہ دونوں دروازے سے ہٹ کر کمرے کے ایک گوشے میں آ گئے۔ تھوڑے وقفہ کے بعد دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر داخل ہوا!۔

جیکس نے پرنس سرجی ڈیمی ڈوف ـــــ اپنی محبوبہ کے شوہر کو جسے اُس نے آج پہلی مرتبہ تصویر میں دیکھا تھا، پہچان لیا۔

لیکن وہ جیکس کی طرف قطعاً متوجہ نہ ہوا! وہ صرف اپنی بیوی کو تیز نظروں سے گھورتا رہا، جو فرطِ خوف سے بےحال ہو رہی تھی۔ بالآخر اُس نے کرخت لہجے میں روسی زبان کے چند جملوں میں اُس سے خطاب کیا۔ خطا کار رخا تون دو زانو ہو کر اُس سے رحم کی التجا کرنے لگی۔ لیکن ڈیمی ڈوف بغیر کچھ جواب دئیے کمرے سے باہر نکل گیا۔

جیکس جو اس دوران میں امید و بیم کے تہلکہ میں مبتلا تھا، اپنی محبوبہ کی طرف بڑھا۔

"اس نے تم سے کیا کہا اولگا؟"

شہزادی کے ہونٹوں کو دو مرتبہ جنبش ہوئی۔ لیکن منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ بالآخر گلوگیر آواز میں اُس نے کہا۔

"ہم دونوں میں سے ایک کو ایسا کرنا پڑے گا ـــــ ایک کو! ـــــ اس کا ہمیں فیصلہ کر لینا چاہئیے! ـــــ پانچ منٹ کے بعد وہ واپس آ کر ہم دونوں میں سے ایک کو ہلاک کر ڈالے گا! ـــــ سمجھے؟ ـــــ تم کو یا مجھکو!"

یہ سنتے ہی جیکس کے حواس باختہ ہو گئے۔ لیکن اُسے یاد آیا کہ وہ اس وقت روس میں زار کی چنگیزی حکومت کے ماتحت نہیں ہے۔ بلکہ فرانس میں ہے! ـــــ مہذب اور جمہوری فرانس کی زمین پا آئین میں!

"ڈیمی ڈوف ایسا ہرگز نہیں کر سکتا اُس کا مقصد صرف ڈرانا تھا۔ اس معاملہ کا فیصلہ "ڈوئیل" سے ہو گا یا طلاق سے"! اس نے اولگا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

شہزادی نے جل کر جواب دیا:۔ "تم اُسے نہیں جانتے۔ وہ ایک بے بس عورت کو ناؤٹ کی پیہم ضربات سے ہلاک کرنے سے نہ چوکا، باوجودیکہ وہ عُلیا ملکہ کی امان میں تھی"!

"تو پھر اس صورت میں ہم کو اپنی حفاظت کی آخر دم تک کوشش کرنی چاہئیے" جیکس نے کہا۔ "جس وقت وہ اندر داخل ہو کیوں نہ ہم دونوں اُس پر اچانک جا پڑیں یا مدد کے لئے چلائیں"!

"حملہ بےسود ہے۔ وہ مسلح ہے! رہا مدد کے لئے چلانا ـــــ ہماری کون سنے گا؟ اگر ملازم یہاں موجود ہوتے تب بھی فضول تھا۔ کیونکہ وہ سب کے سب روسی ہیں۔ جن کے جان و مال کا پرنس مالک و مختار ہے! وہ اُس کی مرضی کے خلاف اُنگلی نہیں اُٹھا سکتے!"

"تو پھر میں! اس دریچہ کی سلاخوں کو توڑتا ہوں"! یہ کہہ کر جیکس نے اپنا تمام و کمال زور سلاخوں کو خم دینے میں لگا دیا، لیکن اُنھیں جنبش تک نہ ہوئی! بہت جلد اُسے معلوم ہو گیا کہ اُس کی رہائی کا ہر راستہ مسدود ہے!۔

اولگا قالین پر پڑی سسک رہی تھی۔ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا، "وہ ہم دونوں میں سے ایک کی جان چاہتا ہے جیکس ـــــ تمہاری یا میری! ـــــ خوب سوچ لو! ـــــ یہ سب کیا دھرا تمہارا ہے!"

یہ الزام سنکر اُسے تاب نہ رہی، اُس نے جل کر جواب دیا۔

"میرا کیوں! قصور سراسر تمہارا ہے۔ تم نے ہی تو مجھے یہاں بلایا تھا"!

"بزدل! غدار! ـــــ کیا تو نے خود یہاں آنے کی مجھ سے درخواست نہیں کی تھی؟"

"اور جس کو تم نے بلا کسی پس و پیش کے منظور کر لیا تھا!"

"تمہیں تو ایک شہزادی کے عاشق ہونے کے پندار نے مغالطہ زدہ بنا رکھا تھا!" اولگا نے کہا۔

"لیکن ایک ایسی شاہزادی کا عاشق کہلانا جس کے مجھ سے پہلے کئی عاشق رہ چکے ہوں۔ چنداں فخر کی بات نہیں"!

کتنی جگر خراش بات تھی! ؏

ہیچ عاشق سخنِ تلخ بہ معشوق نہ گفت!

وہی طالب و مطلوب جو کچھ عرصہ پہلے باہم دائمی محبت کے عہد و پیمان باندھ رہے تھے اب وہ درندوں کی طرح "زندہ رہنے کے حق" پر جھگڑ رہے تھے! ؏

کہ یاراں فراموش کردند عشق!

یکایک دروازہ کھلا اور پرنس سرجی ڈیمی ڈوف ریوالور بدست اندر داخل ہوا!۔

جیکس نے پھرتی سے اُچک کر اولگا کو باوجود اس کی مزاحمت کے اپنے بازوؤں میں لے کر اس کے جسم لرزاں کو اپنے بچاؤ کے لئے ایک "زندہ ڈھال"

بنالیا! ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

پرنس نے حقارت آمیز تبسم سے کہا۔

"اچھا تو تم دونوں نے ایک ساتھ ہی مرنے کا تہیہ کرلیا ہے؟! بہت مبارک خیال ہے! بیشک تم یک جان ودو قالب ہو! ریوالور کی ایک ہی گولی تم دونوں کو قید ہستی سے آزاد کردے گی!" اور یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنا ریوالور اٹھایا، دونوں عاشق ومعشوق ایک چیخ مار کر ایک دوسرے سے جدا ہوگئے!۔

"رحم! رحم!!" خاتون نے اپنے شوہر کے قدموں پر گر کر روتے ہوئے کہا "میں بے قصور ہوں! مجھے اس شخص سے محبت نہیں ــــ اس نے مجھے بدراہ کیا!"

اس پر جکیس بول اُٹھا!

"خدارا مجھے بخش دو۔ یہ سب فتنہ اسی عورت کا ہے۔ اس نے اپنے شادی شدہ ہونے کا مجھ سے تذکرہ ہی نہیں کیا، مجھے جانے دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ اس کی صورت بھی نہ دیکھوں گا۔"

پرنس نے نفرت بار سکوت سے اُن کی طرف دیکھا، اور حقارت آمیز تبسم سے کہا!

"ابھی چند ہی لمحے پہلے تم دونوں باہم محبت اور پرستش کے تذکرے کر رہے تھے۔ اور اُس کی راہ میں قربانیاں دی جارہی تھیں! لیکن بہت جلد عُریاں حقیقت آشکارا ہوگئی! اچھا تمہیں یہ سنکر تعجب ہوگا کہ میرا ارادہ اب تمہیں قتل کرنے کا نہیں ہے! میرا انتقام اس سے کہیں زیادہ ہولناک ہوگا! میں تم دونوں کو ایک ہی جگہ قید رکھوں گا۔ تاکہ جب تک موت تمہیں آزاد نہ کرے، قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی صورت سے متنفر اور بیزار رہو"

یہ کہہ کر پرنس مُڑا اور ان مجرمین عشق بافسق کو اپنی سزا بھگتنے کے لئے چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا!

(فرانسیسی افسانہ کا ترجمہ)

میرے لئے

صبح غم میرے لئے شام بلا میرے لئے　　ابتدا میرے لئے ہے انتہا میرے لئے

کہتی ہے تقدیر تیرے نام کا کچھ بھی نہیں　　میں سمجھتا تھا کہ ہیں ارض وسما میرے لئے

بے طلب دنیا کو ملتا ہے دلِ راحت طلب　　وائے قسمت تھا دلِ درد آشنا میرے لئے

چارہ گر کی کیا ضرورت کیوں ہوں ممنونِ دوا　　درد خود بنجائے گا بڑھکر دوا میرے لئے

بدگماں صیاد دشمن باغباں گلچیں خفا　　ناموافق ہے زمانے کی ہوا میرے لئے

آگیا محسن سمجھ میں ٹھوکریں کھانے کے بعد
میں بلا کے واسطے ہوں اور بلا میرے لئے

محسن اعظمگڈھی

ہندوستان کی جمہوری زبان

امام اکبر آبادی

(۲)

مصنف فرہنگ آصفیہ لکھتا ہے کہ اردو زبان کا سرمایۂ الفاظ و محاورات کل ۵۵ ہزار ہے۔ اس میں تقریباً تیس ہزار عربی کے الفاظ۔ اس سے کچھ زیادہ فارسی کے۔ ہزار آٹھ سو الفاظ ترکی، پرتگالی اور انگریزی کے ہیں۔ باقی میں چوتھائی کے قریب خالص اردو کے وضع کئے ہوئے ہیں۔ اور اس کے بعد بڑی تعداد ہندی الفاظ کی ہے۔

یہ فرہنگ ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی ہے، اور چوتھی جلد کے آخر میں تفصیل درج ہے۔ لیکن تیس سال کے گزشتہ دور میں اردو نے جس قدر ترقی کی ہے اور جس سرعت کے ساتھ اس نے اصطلاحات وضع کرنے کا، اور نئے نئے الفاظ ڈھالنے کا کام کیا ہے۔ نیز دُنیا کے روبرو جو معیاری ادب پیش کیا ہے، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ چند ماہ میں انجمن ترقی اردو نے تنہا کچھ اوپر چھ ہزار علمی اصطلاحات وضع کیں، اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی انجمنوں نے، اور انفرادی طور پر سے دیگر شعرا و ادبا نے ہزارہا نئی نئی تراکیب استعمال کرکے اردو زبان کو چار چاند لگادئے، اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ آج اردو کا سرمایۂ الفاظ دوگنا ہوگا۔

یہ اعتراض کہ موجودہ دور میں اردو کے انشا پرداز عربی و فارسی کے زیادہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اُن کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے کہ برادرانِ وطن کو اس سے چڑھ ہے، اور ایسا کرنے سے اردو عام فہم نہیں ہوسکتی، میرے نزدیک یہ اعتراض کچھ وزن نہیں رکھتا، اس لئے کہ اول تو برادرانِ وطن کو اُردو الفاظ سے نفرت نہیں بلکہ اس کے رسم الخط سے متنفر ہیں، دوسرے یہ کہ ہر زبان کے دو فریق ہوتے ہیں، ایک وہ جو ملک کے روبرو اعلیٰ لٹریچر پیش کرتا ہے، اور اس کو ہمیشہ علمی زبان سے استفادہ کرنا پڑتا ہے، اور چونکہ عربی و فارسی علمی زبانیں ہیں، اور اس گروہ کا انھیں زبانوں سے قریبی رشتہ ہے۔ لہٰذا اس کی نظر انھیں پر ہوتی ہے۔ دوسرا گروہ غیر انشا پرداز ہوتا ہے، جو معمولی لکھنے پڑھنے پر اکتفا کرتا ہے، اس کو معیاری ادب سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

اس کو بھی چھوڑیئے اور دیکھئے کہ اردو زبان میں عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں یا ہندی کے ابھی اس کا شمار اوپر بتایا جاچکا ہے، اس کے ثبوت میں ڈاکٹر گستاؤلی بان، جو ایک فرانسیسی محقق ہے، اور جس نے ہندوستان میں اپنا سارا وقت اسی تحقیق و تفتیش میں گزارا کہ یہاں کی قوموں، برادریوں، زبانوں کی تحقیق کرے اور تہذیب و تمدن نیز تاریخی حالات قلم بند کرکے دنیا کے روبرو پیش کرے۔ لکھتا ہے کہ

> "جو سیاح ہندوستان میں اس خیال سے آئے کہ وہ تمام ملک ہند کے باشندوں سے انھیں کی زبان میں گفتگو کرے تو اسے تقریباً ۲۰۰ زبانیں اور ۳۰۰ محاورے سیکھنا پڑیں گے۔"

اس بنا پر انھوں نے بسیار تحقیق و کاوش کے بعد اردو زبان کو ملکی تبایا، جیسا کہ آپ آگے پڑھیں گے، یہاں صرف ملاحظہ کے لئے نمونے کے طور پر ذیل کے مضامین درج کئے جاتے ہیں۔ تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں یا ہندی کے۔ بھاشا کا ادیب لکھتا ہے۔

"درختوں کے جھنڈ چھائے ہیں۔ گھنے ہوئے پتے ہیں۔ اُن کی گھری گھری چھاؤں ہے۔ جامن کی ٹہنیاں، اور آم کے پتوں میں کھچری ہو رہی ہے۔ امرنی کی ٹہنیاں۔ فالسے کے درخت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چاندنی کی بیل، گمرل کے درختوں پر لپٹی ہوئی ہے، عشق پیچاں کگروندے پر چڑھی جا رہی ہے۔ اس کی ٹہنیاں سانپ کی طرح لہرا رہی ہیں۔ پھولوں کے گچھے پڑے جھوم رہے ہیں۔"

برسات کی بہار کے متعلق اس طرح کہتا ہے۔

"سامنے سے کالی گھٹا جھوم کر اُٹھی۔ ابر دھواں دھار ہے۔ بجلی کوندتی چلی آتی ہے۔ سیاہی میں بگلوں کی سفید سفید قطاریں بہار دکھا رہی ہیں۔ جب بادل گرجتا ہے۔ اور بجلی چمکتی ہے تو پرندے دبک کر کبھی ٹہنیوں میں چھپ جاتے ہیں، کبھی دیواروں سے لگ جاتے ہیں۔ مور جھنکارتے ہیں اور پپیہے الگ پکارتے ہیں۔ پہاڑیاں ہری بھری ہیں، اردگرد سرسبز میدانوں میں بسے ہوئے گاؤں آباد ہیں۔ پہاڑ کے نیچے ایک دامن میں نرمل جل بہہ رہا ہے جیسے موتی کی آب۔ بیچوں بیچ میں شہر آباد ہے۔ جب اس کے اونچے اونچے مکانوں اور برجیوں کا عکس پڑتا ہے تو پانی میں کلسیاں جگمگ جگمگ کرتی ہیں۔"

رات کی اداسی کے متعلق یوں کہتا ہے۔

"آدھی رات اِدھر آدھی رات اُدھر، جنگل سنسان، اندھیرا بیابان، مرگھٹ میں دور دور تک راکھ کے ڈھیر جلے ہوئے لکڑ پڑے ہیں۔ کہیں کہیں چتا میں آگ چمکتی ہے۔ بھوتوں، پریتوں کی ڈراؤنی صورتیں، اور بھیانک مورتیں ہیں۔ کوئی تاڑ سا قد۔ کوئی لال لال دیدے پھاڑے، لمبے لمبے دانت نکالے گلے میں کھوپڑیوں کی مالا ڈالے کھڑا ہے۔"

اب فرمایئے کہ مندرجہ صدر مضامین میں عربی و فارسی کے کتنے الفاظ ہیں؟ اور ہندی کے کتنے؟ اسی نوعیت کے ہزارہا مضامین ہیں، جن کے مقابلے میں عربیت و فارسیت آمیز مضامین ایسے ہوں گے جیسے آٹے میں

نمک، حقیقت یہ ہے کہ اگر ہندوستان کی زبانوں اور بولیوں کے متعلق بحث کی جائے، اور تفصیل سے لکھا جائے تو یہ داستان کئی جلدوں میں ختم ہوگی، کیوں کہ یہاں کی سرزمین پر صدہا زبانیں اسی طرح پھیلی ہوئی ہیں، جس طرح صدہا مختلف ذاتیں اور برادریاں۔

اسی وجہ سے ڈاکٹر گستاؤلی بان کو اور تمام سیاحوں کو تکلیفوں اور دقتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں کوئی مشترکہ زبان نہیں، اور ایک ہے بھی تو اُس کو مٹا دینا چاہتے ہیں، حالانکہ اردو زبان کی تدوین اور اُس کی توسیع و اشاعت میں جس قدر حصّہ مسلمانوں نے لیا ہے، اُسی قدر اہلِ ہنود نے بھی، آج بھی ہندو مسلمانوں کا ایک کثیر گروہ اردو زبان کی توسیع میں برابر کا حصہ لے رہا ہے۔ ہندو دوستوں نے اس کو اپنی زبان سمجھکر تصنیف و تالیف میں، شعر و شاعری میں، اور ادب لطیف میں، باوجود زمانہ حاضرہ کی مخالفت کے وہ دلچسپی لی ہے جو تاریخ میں یادگار رہے گی۔ نہ صرف ہندو، بلکہ ہر زمانے کے یورپین حضرات نے بھی اردو کی توسیع میں کافی حصہ لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومتِ ہند کو سوچنا پڑا کہ ہندوستان کی دیسی زبانوں میں اگر کوئی زبان ملکی زبان بننے کا حق رکھتی ہے تو وہ صرف اُردو ہے۔

چنانچہ اُس نے مُلک کے ماہرینِ زبان کو وقتاً فوقتاً جمع کر کے مشورہ لیا کہ ہندوستانیوں کے لئے اور خصوصاً انگریزوں کے لئے کونسی زبان ایسی ہو سکتی ہے، جو سہل الحصول ہو، سادہ و سلیس ہو، اور تمام مروجہ زبانوں پر حاوی ہو؟ اِس پر سب کی متفقہ رائے ہوئی کہ اردو زبان سے زیادہ کوئی زبان ایسی نہیں جو وسعت و جاذبیت، سلاست و روانی میں اس کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ لارڈ وارن ہیسٹنگز جو ہندوستان میں انگریزی سلطنت کے قیام کا بانی سمجھا گیا ہے، اس نے انصاف پسندی سے انگریزی زبان پر عربی و فارسی کو ترجیح دے کر ۱۷۸۱ء میں ایک مدرسہ "مدرسہ عالیہ" کے نام سے کلکتہ میں جاری کیا، اور فارسی کو دفتری زبان تسلیم کیا گیا، یہ اس لئے کہ چونکہ فارسی علمی زبان ہے اور اردو فرعی ہے، اور فرعی زبان ہمیشہ علمی زبان سے استفادہ کرتی ہے، لہٰذا فارسی کے رائج ہونے سے اردو کی اشاعت خاطر خواہ ہوتی رہے گی۔ لیکن اس کے بعد جب لارڈ میکالے نے محسوس کیا کہ یہ دونوں زبانیں، یعنی عربی و فارسی غیر ملکی ہیں تو اُنھوں نے

اپنی آتش بیانی سے ایک انقلاب برپا کیا، اور عیسائی مشنریوں کی تحریک پر فارسی کو دفتر سے ہٹا کر، انگریزی اور اردو کو اس کی جگہ دیدی یہ کس لئے؟ صرف اس لئے کہ یہی ایک زبان ایسی سمجھی گئی جو تمام ملک کے لئے آسان ترین تھی، چنانچہ ۱۸۰۰ء میں ڈاکٹر جون گلگرائسٹ کی نگرانی میں سرکاری حکم اور خرچ سے فورٹ ولیم کلکتہ میں اردو زبان کا ایک کالج قائم کیا گیا، اور صدر عدالت دیوانی نے حکم نافذ کیا کہ جملہ ماتحت عدالتیں اردو کو رواج دیں۔ چنانچہ حکومت ہند نے اس زبان کی تصنیف و تالیف پر انعامات مقرر کردئے اور تمام مدارس میں اس کو جاری کردیا۔ رفتہ رفتہ یہ زبان سارے ملک میں پھیل گئی۔

مگر یہ تو بعد کی باتیں ہیں، انگریزوں کی حکومت سے بہت پہلے، تاریخوں کے مطالعہ سے یہ بات ہر تعلیم یافتہ جانتا ہے کہ شمالی ہند میں ہندو مسلم اختلاط وارتباط کی وجہ سے ہندی وفارسی کے الفاظ مخلوط ہوکر ایک نئی زبان پیدا کرچکے تھے، جس کا نام اردو ہے، سکندر لودھی کے زمانے میں جب کہ آگرے کو پایۂ تخت بنایا گیا تھا، تو اسی وقت سے برادران وطن نے فارسی زبان سیکھنا شروع کردی تھی، اور غالباً فارسی کا سب سے پہلا شاعر پنڈت ڈونگرمل تھا، کائستھ وکشمیری پنڈتوں کو اس زبان سے کافی دلچسپی تھی، اور اسی بنا پر اردو اُن کی مادری زبان ہوچکی تھی، پس جس زمانے میں اردو کی تشکیل شمالی ہند میں ہورہی تھی قریباً اسی زمانے میں یہ کام جنوبی ہند میں ہورہا تھا، اور متفقہ طور پر ہورہا تھا، جس میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے حصہ دار تھے، اور انگریز بھی کافی دلچسپی لے رہے تھے، مثال کے طور پر چند انشا پرداز ہندو بزرگوں کے نام درج ذیل کئے جاتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے تصنیف وتالیف وادبیات میں کافی حصہ لیا۔

کبیر داس، ان کی شاعری میں بھاشا کا رنگ غالب تھا، ان کا کلام علاوہ آدیات کے دوسری کتابوں میں بھی ملتا ہے، گرو نانک صاحب یہ مواحد تھے، اور ان کا سارا کلام صوفیانہ رنگ میں ہے، بابا تلسی داس مترجم رامائن وغیرہ۔ سور داس جی، آپ نے سری کرشن جی کا ترجمہ کیا، للو لال جی آپ نے چند کتابیں تصنیف کیں، راجہ شیو پرشاد میر منشی تھے، سندر برہمن چند کتابوں کے مصنف تھے، بسنا پت برہمن قنوجی اردو زبان سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ رتناکر تا پاٹھی، شعر وشاعری کا ذوق رکھتے تھے، بہاری لال سنسکرت کے فاضل ہونے کے باوجود اُردو سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور حُسن پرستی کے باب میں خوب شاعری کی ہے۔ تان سین موسیقی کے ماہر تھے، اور اردو ادبیات کا ذوق رکھتے تھے، گنگ، یہ خان خاناں کے درباری شاعر تھے، ایسے کہ اُن کی شاعری سے متاثر ہوکر شاہ نے ان کو ایک موقعے پر ۳۶ لاکھ روپیہ بطور انعام دیا، جسونت سنگھ، دیوکوی، ملکیت مشر رام جی، کالی داس وغیرہ وغیرہ یہ سب کے سب اُردو زبان کے حامی و مددگار تھے، ان کے علاوہ مہاراجہ بلوان سنگھ صاحب دیوان تھے، منشی جواہر لال جواہر مثنوی سحر البیان اور سیر المتاخرین وغیرہ کے مصنف تھے۔ شہاب الدین غوری کی فتح پر ۱۱۹۳ء میں چند کوی نامی شاعر نے، پرتھی راج راسا لکھا۔ راجہ جے سنگھ سوائی نے اردو زبان کی بڑی قدر کی، منشی ہرگوپال تفتہ کی مرزا غالب بحیثیت ادیب ہونے کے بڑی قدر کرتے تھے، پنڈت موتی لال مترجم گورنمنٹ پنجاب، اور دیگر اسی قبیل کے ادب نواز مشہور و معروف گزرے ہیں۔

مہاراجہ صاحب الور اُردو کے مشہور شاعر ہیں، اور اغلباً صاحب دیوان بھی ہیں۔ کشن پرشاد صاحب سابق وزیر اعظم نظام حیدرآباد اردو کے اعلیٰ شاعروں میں ہیں، اور سارے ہندوستان میں مشہور ہیں، پنڈت موتی لال نہرو کے تمام خاندان کی مادری زبان اردو ہے، اور شمالی ہند کے تمام کائستھ وکشمیریوں کا شمار اُردو کے اہل ادب میں ہے۔ سر تیج بہادر سپرو نے اردو زبان کے متعلق ۲۸ فروری ۱۹۳۸ء کو انجمن بہار ادب کی صدارت کے موقع پر اردو کی ہمہ گیری، اور اُس کی بنیاد کے متعلق ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی جو درج ذیل ہے۔

"در اصل اردو زبان کے وجود میں آنے کی وجہ یہ تھی کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے متحد ہوسکیں، کیونکہ اس زمانے میں یہ ناممکن تھا کہ تمام ہندو عربی سیکھ لیتے یا تمام مسلمان ہندی سیکھ لیتے، اس لئے ایک مشترک زبان کی حیثیت سے اُردو وجود میں آئی۔ میں یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوں کہ اردو زبان صرف مسلمانوں کی زبان ہے، اور اردو جاننے والے محض مسلمان ہیں۔ اردو کی خدمت سب سے زیادہ لکھنؤ نے کی ہے اور جس قدر خدمت اس جگہ ہوئی ہے ہندوستان کے کسی اور شہر میں نہیں

ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اہلِ لکھنؤ اس خزانے کے وارث ہی نہیں، بلکہ محافظ بھی ہیں اور اگر یہ خزانہ لٹ گیا تو اہلِ لکھنؤ مجرم ہوں گے۔

میں اخباروں میں زبان کے معاملہ کے اختلاف کو بڑے افسوس سے دیکھتا ہوں۔ مگر نہ تو اس کو ہندو سمجھتے ہیں اور نہ مسلمان کہ ہم اس ذریعۂ اتحاد کو کمزور کرتے چلے جاتے ہیں۔ پچاس سال قبل یہ ہوتا تھا کہ جب ایک بچہ مکتب میں پڑھنے جاتا تھا تو پانچ روپے والے مولوی صاحب سے تعلیم حاصل کرتا تھا، اس وقت نہ تو کوئی یونیورسٹی تھی نہ کچھ اور تھا۔ مگر اس وقت یہ ہوتا تھا کہ ہندو بچہ اسلامی تہذیب سے اور مسلمان بچہ ہندو تہذیب سے واقف ہوتا تھا۔ جب آپ ایک دوسرے کی تہذیب و تمدن سے واقف نہ ہوں گے تو باہم اتفاق و اتحاد کیونکر ہو سکتا ہے؟ اور ایک دوسرے کی عزت کیونکر کر سکتے؟

جب عربوں نے اسپین فتح کیا تو وہاں انھوں نے ایک ایسی زبان کی بنا اتحاد کے لئے ڈالی تھی۔ اگر آپ اتحاد کے جویا ہیں جس کے بغیر ہندوستان ترقی نہیں کر سکتا تو آپ اردو زبان کو ترقی دیں، موجودہ اردو کی روش سے مجھکو اتفاق نہیں ہے۔ آج کل اردو ایسی استعمال ہو رہی ہے کہ بغیر لغت دیکھے کام نہیں چلتا۔ کیونکہ مختلف قسم کے غیر مانوس الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح جو حضرات بنارس وغیرہ میں رہتے ہیں اور ہندی و سنسکرت کے حامی ہیں وہ بھی یہی کر رہے ہیں۔ یہ طریقہ اچھا نہیں ہے۔ میں نہایت عجز کے ساتھ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کے حامیوں سے کہوں گا کہ اس زبان کو ذریعۂ اتحاد بنائیں ورنہ یہ اردو نہ رہے گی۔ لکھنؤ کی اردو زبان سے بہتر اردو کا نمونہ نہیں ہے۔ مجھے انجمن بہار ادب کے مقاصد سے دلی ہمدردی ہے۔ اور میں اس کی خدمت کرنے کے لئے ہر طرح تیار ہوں۔"

یہ تو ہیں اردو نواز ہندو بزرگ، جو معمولی لوگ نہیں ہیں، بلکہ ہندوستان کی ممتاز شخصیت کے گروہ کے ایک فرد ہیں۔ لیکن آج جو ذہنیت برادرانِ وطن کے ایک کثیر گروہ میں کام کر رہی ہے، وہ مسموم اور زہر آلود ذہنیت ہے، بظاہر اس گروہ کی روش منافقانہ نظر آتی ہے، لیکن بباطن ہلاکت آفریں ہے، زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق محبت، یگانگی،، اور آشتی کے اعلانات کئے گئے، اور کئے جا رہے ہیں، انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے اتحاد و تحفظِ اقلیت کی آواز اٹھتی ہے، اس کی ورکنگ کمیٹی بار بار اقلیتوں کو تحفظ کے زرّیں لفظوں میں دعوت دیتی ہے، اور رہا زبان و رسم الخط کے متعلق کہا گیا ہے کہ کانگریس کسی زبان کے رسم الخط میں مداخلت نہیں کرے گی۔ کانگریس کے دستورِ اساسی کی دفعہ ۲۰ میں یہ درج ہے کہ اس کی جملہ کارروائی معمولاً ہندوستانی زبان میں ہوا کرے گی، اور ہندوستانی زبان کی تعریف اندور کے "ہندی ساہتیہ سمیلن" کے سالانہ اجلاس میں گاندھی جی نے اس طرح کی تھی کہ

"وہ زبان جو شمالی ہند میں عام طور سے بولی جاتی ہے اور جسے اردو و دیوناگری دونوں حروف میں لکھا جاتا ہے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو نے زبان کے مسئلہ پر جو ایک مختصر رسالہ لکھا ہے اس میں اس طرح اعلان کیا ہے،

"شمالی ہندوستان میں عمومیت کے ساتھ جو زبان بولی جاتی ہے وہی ہندوستانی ہے، خواہ اُسے ہندی کہا جائے یا اردو۔"

مسٹر سوبھاش چندر بوس نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس مسئلہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے یوں فرمایا کہ

"ہندی اردو کے درمیان جو فرق بتایا جاتا ہے وہ اصلی نہیں ہے مصنوعی بنا دیا ہے۔ ہماری مشترکہ قومی زبان وہی ہے جو ملک کے ایک وسیع حصہ میں عموماً بولی جاتی ہے چاہے اُسے اردو رسم الخط میں لکھا جائے یا دیوناگری رسم الخط میں۔"

لیکن اس تمام توضیح و تصریح کے باوجود کانگریس کے بیشتر رہنماؤں کی ذہنیت یہ ہے کہ وہ ہندوستانی زبان سے ہر اُس لفظ کو نکال دینا چاہتے ہیں، جو اصل کے اعتبار سے عربی یا فارسی ہے۔ ایسے الفاظ جو روزمرہ کی عام گفتگو میں خواہ کتنے ہی مستعمل ہوں، اور خواہ اُن کے سمجھنے میں کتنی ہی آسانی ہو لیکن اُن کی مسموم ذہنیت اِن کے ترک کر دینے پر بالکل آمادہ و مستعد ہے، اور اُن کے بدلے وہ جناتی زبان لکھی اور بولی جاتی ہے، جس کو سوائے مقرر کے پانسو پچاس چیدہ آدمیوں کے اور کوئی نہ سمجھ سکے۔ اس جناتی زبان کو ملک میں عام کرنے کی پوری کوشش و طاقت صرف کی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر یہاں چند الفاظ درج کئے جاتے ہیں۔

گرہن	منظور	آوشک	ضروری
پرستاؤ	تجویز	سنشودھن	ترمیم
پرانت	صوبہ	سوتنترتا	آزادی
سبھیتا	تہذیب	اُنتی	ترقی

شکشا	تعلیم	شدھانت	اصول
گھوشن	اعلان	مت بھید	اختلاف
سویم سیوک	رضاکار	راشٹریہ مہاسبھا	کانگریس
کھلی بیٹھک	کھلا اجلاس	پرتی ندھی	ڈیلیگیٹ
بھوجنالیہ	جائے طعام		

کانگریس کے قائدین عظام کے پیہم مواعید و اعلانات کے بعد اور اس کی دفعہ ۷ اکے تحت یہ ہے شمالی ہندوستان کی عام زبان جس کا ایک ایک لفظ نہ کوئی مسلمان سمجھ سکتا ہے اور نہ ہندو۔ پھر اس کے علاوہ کانگریس کے پنڈال میں اس کی ہر ہر نشستگاہ پر، دروازوں پر، نمائش گاہ میں، اور یہاں کے ذرّے ذرّے پر سوائے ہندی و گجراتی رسم الخط کے اردو کا کہیں نام تک نہیں ہوتا۔ اُن کے کاغذات، اُن کے رجسٹر، اور ان کی رسیدات، اشتہارات و پوسٹر وغیرہ وغیرہ سب کے سب دیوناگری میں ہوتے ہیں، دیکھنے والوں کو اور خصوصاً شمالی ہند کے باشندوں کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یا تو ہم کسی غیر ملک کے جلسہ میں شریک ہیں، اور یا جاہل و اَن پڑھ گونگے، بہرے اور اندھے ہیں کہ نہ بول سکتے، نہ سمجھ سکتے۔ اور نہ دیکھ سکتے ہیں۔

ہری پور کانگریس میں یہ تھی شمالی ہند کی زبان، اب اگر مسلمان آنکھوں پر پٹی باندھ کر اور کانوں میں روئی ٹھونس کر کانگریس میں شریک ہوئے تو یہی جناتی زبان سارے ملک میں پھیلی ہوئی نظر آئے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی فرد یا کوئی قوم قوی سے قوی تر ہو جاتی ہے، تو طاقت کا زعم، آنکھوں کی بصارت، کانوں کی سماعت، اور دماغوں کی قابلیت زائل کر دیتا ہے، اور حق و انصاف کا نام صرف زبانوں اور کاغذوں پر رہ جاتا ہے۔ تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ عہد و پیمان ہمیشہ توڑنے کے لئے باندھا گیا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کا تاریخ داں گروہ باخبر ہے، کہ ۱۸۱۳ء میں برٹش پارلیمنٹ نے ہندوستان کے مفاد کے لئے کیا اعلان کیا تھا؟ پھر ۱۸۳۳ء میں مذہب، نسل، اور رنگ کے فرق امتیاز کے متعلق کیا کہا تھا؟ پھر یہ وعدہ کہ "ہم ہندوستان کے مفاد کو یورپین مفاد پر ترجیح دیں گے" کیا ہوا؟ آخر میں ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریا آنجہانی نے اِن اعلانات کی تصریح میں جو کچھ فرمایا اور جن لفظوں میں فرمایا خبردار، اِن ہند کے دلوں پر وہ الفاظ ابھی مرتسم ہیں۔ لیکن طاقت نے ان تمام وعدوں کو یکسر محو کر دیا، بھلا دیا۔ آج اُنھیں وعدوں کو یاد دلانے کے لئے کانگریس قائم ہوئی لیکن ابھی اُس نے پوری طاقت بھی حاصل نہیں کی کہ عہد باندھنے کے ساتھ ہی توڑ دیا۔ اگر واقعی سنسکرت کا سارے ملک میں پرچار کرنا ضروری سمجھا گیا ہے تو کیجئے، اس بدعہدی کا نتیجہ وہی ہوگا جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔

بہر نوع کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں برادرانِ وطن نے اس زبان کو مشترکہ زبان نہ سمجھا ہو۔ موجودہ دور میں جو جہالت و تعصب کے باب میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں کوئی جگہ ایسی نہیں، جہاں اُردو نواز ہندو دوست، مسلمانوں کے ہمدوش نظر نہ آتے ہوں۔ اس گروہ نے محسوس کر لیا ہے۔ اور اس کو بخوبی علم ہے کہ اردو تنہا مسلمانوں ہی کی زبان نہیں ہے، بلکہ ہند کی تمام قوموں کی ہے، اور جبکہ اس میں ہندی کے سیکڑوں الفاظ ہیں، اور ان الفاظ کا استعمال مسلمان بھی کرتے ہیں تو پھر کیا وجہ کہ اس کا رسم خط اردو نہو؟ الفاظ ہندی کے اور خط اُردو کا، زنار میں تسبیح کے دانے معلوم ہوتے ہیں، اور رشتۂ اتحاد کی مثال دنیا میں اِس سے بہتر نہیں ملے گی، جب کہ ہندی کے الفاظ مسلمانوں نے قبول کر لئے تو اردو رسم خط ہندوؤں کو قبول کر لینا چاہئے، اس سے بہتر انصاف ہو نہیں سکتا، اور اگر ہے تو پیش کیا جائے۔

ہندو ادبار و شعرا کے یہ چند نام بطور نمونہ پیش کر دئے گئے ہیں، اور ان میں ایسے ایسے بزرگ اور قوموں کے بانی ہیں، جن کے نام نامی سے بچہ بچہ واقف ہے، اور جن کا احترام ہر قوم و جماعت کے لوگ کرتے آئے ہیں، گرو نانک صاحب، کبیر داس جی، بابا تلسی داس، کالی داس، اور تان سین، یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے ہند کی سرزمین میں جھنڈے گاڑ دئے ہیں، اُن کی روش کو ٹھکرا دینا آسان کام نہیں ہے۔ اگر تمام اردو نواز ہندوؤں کے نام درج کئے جائیں تو اس کے لئے کئی جلدیں درکار ہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کی جاذبیت حیرت افزا ہے۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس کے الفاظ اِس میں بآسانی نہ سما سکیں، اور اس حُسن خوبی کیساتھ کہ بولنے اور سننے والا محسوس نہیں کر سکتا کہ یہ اس کی مادری زبان کے الفاظ ہیں، یا کسی غیر زبان کے؟ مثال کے طور پر یہاں چند غیر زبانوں کے الفاظ درج کئے جاتے ہیں، ملاحظہ ہوں۔

انگریزی کے الفاظ۔ گلاس، بٹن، ہٹ، کوٹ، پتلون۔ انجن، ریل، لائن

اسٹیشن ۔ ٹکٹ ۔ بنک ۔ نوٹ ۔ سائیکل ۔ موٹر ۔ کاپی ۔ پوسٹ کارڈ وغیرہ وغیرہ
پرتگالی الفاظ ۔ کمرا ۔ تمباکو ۔ بوتل ۔ گملا ۔ الماری ۔ آلپین ۔ تولیا وغیرہ وغیرہ
ترکی الفاظ ۔ قاب ۔ قابو ۔ تاش ۔ قرق ۔ قزاق ۔ تلاش ۔ قورما ۔ قینچی ۔
چیچک ۔ چمچہ ۔ ماشہ ۔ مالش ۔ ماز و (ایک پھل کا نام ہے ۔ جو گنوار تک بولتا ہے ،
فارسی الفاظ ۔ چابک ۔ چاپلوسی ۔ دو ۔ چار ۔ چارہ ۔ چاشنی ۔ چاکر
چالاک ۔ چائے ۔ چپاتی ۔ چراغ ۔ چربی ۔ چرخہ ۔ چست ۔ چشمہ ۔
عربی الفاظ ۔ ماتم ۔ ماجرا ۔ مادہ ۔ ماش (دال کا نام ہے) مال ۔ ضامن ،
مالک ۔ ملکیت ۔ اراضی ۔ عدالت ۔ وکیل ۔ محرر ۔ عرضی ۔ عزت ۔ عرق ۔ محل ،
روضہ ۔ مضائقہ ۔
ہندی ، اور اردو کے الفاظ کی تو بھرمار ہے ۔ اس لئے ان کا یہاں
درج کرنا بے سود ہے ۔ یہ اور اسی قبیل کے ہزارہا الفاظ روزانہ استعمال
کئے جاتے ہیں ۔ جن سے ایک شہری ، ایک دہاتی ، ایک عالم اور ایک
گنوار تک واقف ہے ۔ اور جانتا ہے ۔ سمجھتا ہے کہ یہ الفاظ میری مادری
زبان کے ہیں ۔ اُس کو ان کے بولنے اور سمجھنے میں کوئی تکلیف اور کوئی رکاوٹ
نہیں ہوتی ۔

چونکہ سب سے پہلے یورپ سے ہندوستان میں پرتگالی قوم آئی تھی
اور باوجود اس کے کہ اس کی حکومت یہاں پر برائے نام رہی ۔ تاہم پرتگالی
زبان کے الفاظ بھی اس میں بآسانی مدغم ہوگئے ۔ ان کے علاوہ فرانسیسی
اور یونانی الفاظ بھی اردو میں شامل ہیں ۔ "جنس" یونانی لفظ ہے ۔ جس سے
ایک گنوار تک واقف ہے ۔ (باقی آئندہ)

عہد

ہندوالوں کو جگا دوں گا میں خوابِ ناز سے
زندہ کر دوں گا میں اُن کو شعر کے اعجاز سے

سبحہ و زنّار کے افسوں مٹا ڈالوں گا میں
"ہڈیاں اس کفر و ایماں کی چبا ڈالوں گا میں"

عارضی درد و الم مجھ کو ڈرا سکتے نہیں
حادثاتِ زندگانی مجھ پہ چھا سکتے نہیں

بادۂ حُبِّ وطن سے سربسر سرشار ہوں!
عشق کی تمثیل کا اک جاوداں کردار ہوں

میرے نعروں میں جہاد و جہد کے پیغام ہیں!!
رُست خیزی اور تغیّر دو ہی میرے کام ہیں

جبر و استبداد کے قلعوں کو ڈھانے کے لئے
عزّتِ مزدور دُنیا میں بڑھانے کے لئے

میں اُٹھا ہوں ہند کے اک گوشۂ آزاد سے
لے کے اپنے ساتھ تند و تیز و عالی حوصلے

کپکپا اُٹھے گا میرے نام سے سرمایہ دار
زندہ ہو جائے گا پھر عُسرت کا مارا کاشتکار

شیر کی صورت بپھر جاؤں گا ، چاہے کچھ بھی ہو
مجھ کو جو کرنا ہے کر جاؤں گا ، چاہے کچھ بھی ہو

آتش ہمکوالی ، بی اے

خونِ آرزو

شکیلہ اختر

"بابا۔۔۔ بابا کچھ دیدو۔۔۔۔ راہِ خدا پر کچھ دیدو۔۔۔" اندھا فقیر صدا لگا رہا تھا۔ مراد پور کے پُر رونق بازار میں جھلملاتی ہوئی دوکانوں اور سر بلند عمارتوں کے آگے اندھا فقیر گڑگڑا رہا تھا۔ اُس کی دونوں آنکھیں اُس کے فلاکت زدہ چہرے کی جُھرّیوں میں دھنسی ہوئی تھیں۔ اور داڑھی کے بال بے ترتیبی سے چہرے کے دونوں طرف پھیلے ہوئے تھے، اُس کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ صرف دھجیوں کا ایک ہار اُس کے جسم کی ہڈیوں پر پڑا ہوا تھا، وہ صدا لگا رہا تھا اور حسرت کے ساتھ کبھی اِس طرف منہ پھیر کر چلاتا اور کبھی اُس طرف۔ اُس کے حلقۂ چشم میں دھنسی ہوئی پلکیں تیزی سے چل رہی تھیں اور وہ اپنے ننھے سے بچے کے سہارے آہستہ آہستہ چل رہا تھا، معصوم بچہ اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے اپنے اندھے باپ کی لاٹھی پکڑے بازار کے انتہائی ہجوم میں دھیرے دھیرے چلا جا رہا تھا، وہ پانچ سال کا بچہ تھا جس کے بدن پر صرف ایک پھٹی ہوئی لنگوٹی کے سوا اور کوئی ایک چیتھڑا تک نہ تھا، بھوک کے شکنجے میں جکڑا ہوا معصوم بچہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا، وہ مراد پور کے چہکتے ہوئے بازار میں اپنے بھوکے باپ کو بھیک دلانے آیا تھا۔ بھیک ۔۔۔۔ صرف چند معمولی سکوں اور کچھ سوکھی ہوئی روٹیوں کی، وہ ہر ایک جھلملاتی ہوئی دوکانوں سے ڈانٹ کر نکال دیا جا چکا تھا، ننھا بچہ بڑی حسرت سے الماری میں رکھے ہوئے خوبصورت خوبصورت کھلونوں کو تک رہا تھا۔ مگر حلوائی کی دوکانوں میں کتنی اچھی اچھی اُجلی پیلی مٹھائیاں لگا کے رکھی تھیں۔

اُس نے حلوائی کی دوکان پر باپ کے نہیں اپنے پیٹ کے لئے ہاتھ پھیلا دیا۔ "بابا۔۔۔ کچھ دیدو۔۔۔۔ بھوکا ہوں" مگر حلوائی کی ایک دلدوز ڈانٹ سُنکر وہ سہم گیا، اور باپ کے گلے کی جھُرّیوں سے لپٹ کر پھوٹ پڑا" بابا۔۔۔ بابا وہ نہیں دیتا" بچہ باپ کی لاٹھی کو چھوڑ کر اپنی ننھی انگلیوں سے آنکھیں مل کر رونے لگا" بابا بھوک لگی ہے، کچھ دلا دو" اندھے فقیر نے اپنا حسرتناک چہرہ اُٹھایا۔ دھنسی ہوئی آنکھوں کو گردش دیتے ہوئے کہا "دیدو بھائی کچھ بھی دیدو۔ یقین کرو کہ یہ معصوم بچہ صبح سے بھوکا ہے، اور اب رات ہو رہی ہے، تمہارے بھی بچے ہیں کچھ تو سوچو" فقیر کی آواز سنکر آس پاس کے حلوائیوں نے بھی کہا" کیا تمہارا یہاں کچھ قرضہ ہے جو اتنی دعویداری کر رہے ہو!؟" "نہیں بابا بچے کے لئے کہہ رہا ہوں، وہ صبح سے بالکل بھوکا ہے"۔ فقیر نے اپنے سوکھے چہرے کو ہلاتے ہوئے کہا" ارے ان فقیروں کا کچھ نہ پوچھو۔ ہر وقت ہر جگہ اور ہر گھڑی سینے پر سوار رہتے ہیں" یہ کہتے ہوئے کچھ لوگ اندھے فقیر اور اُس کے ننھے بچے کو دھکیلتے ہوئے گزر گئے۔

بچہ اب چپ تھا۔ فقیر نے جھُک کر اپنے بچے کو ٹٹولتے ہوئے کہا" کیا کھا رہا ہے منیر؟ بابا سڑک پر کٹھل کی گٹھلی پھینکی ہوئی تھی وہی کھا رہا ہوں تم بھی لوگے بابا؟" فقیر رو پڑا۔ اُس کی آنکھوں کے غاروں سے مشکل آنسو نکل رہے تھے، اُس نے اپنے بچے کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا دنیا خود غرض ہے منیر" معصوم بچہ اپنے ننھے ہاتھوں سے باپ کے ناکام چہرے کو اُٹھاتے ہوئے بولا" اُس:

کی للچائی ہوئی نظریں فالودہ کی دوکان پر گڑی ہوئی تھیں" بابا یہ لوگ دودھ کیوں پی رہے ہیں؟ ہم کو بھی دو بابا، ہم بھی دودھ کھائیں گے بابا دودھ کیسا ہوتا ہے، اُجلا اُجلا نہ بابا؟ دلادو بابا ذرا سا بھی دلا دو"

اندھا فقیر سسک سسک کر رونے لگا اور بچہ حیرانی سے اپنے باپ کا منہ تک رہا تھا، تم کیوں روتے ہو بابا؟ تمہیں کس نے مارا ہے؟ بتادو بابا تو ہم اُسے بھی ماریں گے۔ ننھا بچہ اپنے اندھے باپ کے کلیجے سے لگا ہوا دنیا کی خود غرضیوں سے اپنے باپ کا انتقام لینا چاہ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ دنیا اُسے کیسی کراہیت کی نظر سے دیکھتی ہے اُسے کیا خبر کہ محلوں والے اپنی عیش و عشرت کی خوش فعلیوں میں اُن کے حقوق کو غصب کئے بیٹھے ہیں، بیچ روڈ پر امیروں کے بچے خوبصورت لباسوں میں آجا رہے تھے۔ فقیر کا بچہ حسرت سے اُن کی طرف دیکھتا اور پھر مایوس نظروں سے اپنے باپ کی دھنسی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر بولا" بابا تمہاری آنکھیں ایسی کیوں ہیں سب لوگ اچھے اچھے کپڑے پہنے موٹروں پر چلتے ہیں۔ ہمارے پاس کپڑا کیوں نہیں ہے، بابا؟ تمہاری آنکھ بھی اچھی ہوتی تو ہم کپڑا پہنتے نہ! بچہ اپنے مفلس باپ کے گرد آلود بالوں کو اپنی انگلیوں میں پھنساتا ہوا بول رہا تھا، فقیر نے اپنا سوکھا ہوا ہاتھ آسمان کی طرف بلند کرتے ہوئے کہا" بیٹا خدا کے یہاں کپڑے پہننے کو ملیں گے۔ دنیا میں ہمارے لئے نہ کھانا ہے اور نہ کپڑا، گھر ہے اور نہ آرام" مگر خدا کب دے گا بابا؟ ہم کو رات کے وقت ننگے بدن پر مچھر کاٹتا ہے، اور میری چھوٹی سی بابو کیسے مر گئی بابا؟ جس کو تم نے کہا تھا کہ بغیر کپڑے کے سردی لگ گئی ہے۔ اللہ میاں نے کہاں اس کو کپڑا دیا تھا اور جب ہم رات کو بھوک سے روتے ہیں تو تم کہتے ہو کہ سو رہو اللہ میاں کل روٹی بھیجدیں گے تو وہ کہاں بھیجتے ہیں؟ خدا کا ننھا سا بھوکا بندہ اپنی معصوم زبان سے اپنے آقا کی شکایت کر رہا تھا" ابھی نہیں بیٹا مرنے کے بعد اللہ میاں دیں گے۔ باپ نے بیٹے کو تسلی کے لئے کہا۔ تو پھر ہم کب مریں گے بابا؟ جلد ہی مرو نہ کہ ہم بھی دودھ کھائیں" بچے نے پھر اپنی للچائی ہوئی نظریں فالودہ کی دوکان پر کیں" منیر بھیک مانگو ان باتوں سے کیا فائدہ؟ اندھا فقیر نالے پر سے اُٹھتا ہوا بولا" مائی بھیک دے دے اندھا باپ ماں بیمار۔۔۔۔۔۔ ہم سب بھوکے ہیں کچھ دیدو بابو۔۔۔۔ مانگ بابو ایک پیسہ۔۔۔۔۔ ایک پیسہ دیدو"

بچہ ایک سگرٹ پیتے ہوئے نوجوان کی طرف بڑھا۔ نوجوان آدمی سگرٹ کی پنّی کا نقلی پیسہ بچے کے ہاتھ پر رکھکر ہنستا ہوا چلا گیا۔ ننھا منیر خوشی سے دوڑا ہوا باپ کے پاس آکر بولا بابا —— بابا ایک بابو نے روپیہ دیا ۔۔۔۔۔ اُجلا اُجلا روپیہ بابا" اندھا فقیر اُچھل پڑا" اللہ بھلا کرے دینے والوں کا بیٹا۔ مگر دکھاؤ تو روپیہ کہاں ہے" فقیر نے بچے کو ٹٹولتے ہوئے کہا" ہم نہیں دکھائیں گے۔ تم بے لوگے بابا، ہم تو دودھ لینے جاتے ہیں۔ تم بھی دودھ کھاؤ گے بابا؟! یہ کہہ کر حسرت نصیب بچہ اُچھلتا ہوا فالودہ کی دوکان پر پہونچا" مجھے ایک روپیہ کا یہ دودھ دو بھائی۔ اُس نے خوشی میں جھومتے ہوئے کہا" کہاں ہے روپیہ؟ لاؤ اِدھر دو" دوکاندار نے مغرور آواز میں فالودہ نکالتے ہوئے کہا، لو یہ روپیہ ہے بچے نے بڑی مسرت سے روپیہ اُس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا" بدمعاش شریر۔۔۔۔۔ یہ روپیہ ہے کہ تیرا سر ہے" دوکاندار نے پنّی کو نوچتے ہوئے کہا" تم نے میرا روپیہ کیوں توڑ دیا؟ بچے نے چلاتے ہوئے کہا" دور ہو یہاں سے شیطان کہیں کا" دوکاندار گرجتا ہوا بولا" میں نہیں جاؤں گا، پہلے میرا روپیہ بنا کر دو"! بچے نے چیختے ہوئے کہا، دوکاندار نے غصے میں دو چار تھپیڑ منیر کو لگائے معصوم بچہ تلملا اُٹھا وہ چیختا ہوا اپنے باپ کی طرف چلا جا رہا تھا، سڑک پر موٹر گاڑیوں اور سائیکلوں کی ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی، ننھے منیر نے اُن سے بچنے کی لاکھ کوشش کی، وہ سڑک کے اُس پار ہونا چاہ رہا تھا۔ مگر جلدی میں وہ بری طرح پھسل کر بیچ سڑک پر جا گرا یکایک ایک موٹر سائیکل موٹر سے دھکا کھاتی ہوئی تیزی میں ننھے منیر کو کچلتی ہوئی نکل گئی۔ بچہ بیہوش پڑا تھا اس کی مایوس آنکھیں حسرت کے ساتھ کچھ کھلی اور کچھ بند تھیں، اُس کا چکنا چور جسم کانپ رہا تھا اور اُس کے خشک لبوں پر ایک خاموش صدا تھی۔ وہ آہستہ آہستہ زیر لب کچھ کہہ رہا تھا، ایک بھیڑ تھی جو سڑک پر لگ گئی۔ کسی نے کہا" ہائے بچارا فقیر کا بچہ تھا" کوئی چیختا ہوا بولا دوسروں کا کیا قصور؟ یہ لوگ ٹھیک بیچ سڑک پر چلتے ہیں" کسی کے منہ سے آواز نکلی" ارے ابھی ابھی تو یہ فالودہ کی دوکان پر پنّی کا روپیہ لے کر فالودہ کھانے گیا تھا۔ فٹ پاتھ کے ایک کنارے اندھے فقیر نے سنا" موٹر —— لڑکا —— مر گیا —— زندہ ہے" وہ کانپ گیا۔ کہیں منیر ہی نہ ہو! وہ آہستہ آہستہ لاٹھی ٹیکتا ہوا بھیڑ میں پہونچا،

دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا "کیا ہوا بھائی کون کچلا؟ ایک بچہ فالودہ کی دوکان سے ابھی آرہا تھا کہ ایک موٹرسائیکل کی زد میں آگیا" ایک نے چیختے ہوئے کہا ارے اندھے تیرا ہی تو بیٹا ہے۔ یہ آواز نہیں تھی ایک بم تھا جو اندھے فقیر کو جھلستا ہوا گرا۔ بچارہ فقیر بیتابی سے اپنے بچے کو کلیجے سے لگائے ہوئے چیخنے لگا۔ "بھوکے تھے منیر اللہ میاں کے یہاں آج ہی کھانے چلے گئے۔ بچے نے اپنے باپ کی آواز سنکر آنکھیں کھولیں۔ حسرت بھری نیم باز آنکھوں سے دیکھتا ہوا بولا۔ با با........ دودھ........ با با........ دودھ........ با........ با۔ بچے نے اپنے کچلے ہوئے ہاتھوں اور پیروں کو بھینچی سے کھینچتے ہوئے ایک خاموش ہچکی لی اور ہمیشہ کے لئے چپ ہوگیا۔

ہوا کے جھونکے کی تمنّا

الٰہی! نرم رخساروں کو چوموں یہ نہیں خواہش
بہکتی انکھڑیوں سے پی کے جھوموں یہ نہیں خواہش
نہیں خواہش کہ زلفوں کی گھٹاؤں سے لپٹ جاؤں
لب گلرنگ کی میٹھی حلاوت کا مزا پاؤں
چمن میں گنگنانے کی تمنّا ہی نہیں مجھکو
کلی کو گدگدانے کی تمنّا ہی نہیں مجھکو

نہیں خواہش مئے الفت سے پھولوں کے شجر سینچوں
جوانی کے شرابی قہقہوں کو گود میں کھینچوں
میں گھبراتا ہوں چشم مست سے آنکھیں ملانے میں
میں شرماتا ہوں دوشیزاؤں سے شانہ لڑانے میں
تمنا ہی نہیں آنچل حسیں چہروں سے سرکاؤں
نشیلے زمزموں کو شوق سے پلکوں پہ بہلاؤں
مجھے بھاتی نہیں اک آنکھ جلووں کی حسیں وادی
جواں، مدہوش کن، رنگیں، ترنّم آفریں وادی
مری نظروں میں عارض کی دمک بھی ہیچ ہے یارب
مری نظروں میں اعضا کی لچک بھی ہیچ ہے یارب
تمنا ہے مجاہد کھیلتے ہوں جب شراروں سے
وطن کا نام چمکاتے ہوں شمشیروں کی دھاروں سے
میں بن کر سانس اُن کے آہنی سینوں کو گرماؤں
حیاتِ جاودانی کا جہاں میں مرتبہ پاؤں

الطاف مشہدی

نظیر اور انسان

مخمور اکبرآبادی

(یہ مضمون اگست ۳۸ء میں دلی سے ریڈیو میں پڑھا جاچکا ہے)

سب سے پہلی کیفیت جو انسان پر طاری ہوتی ہے وہ غالباً حیرت ہے اس لئے حکمار نے حیرت کو علم کی ابتدار یا بنیاد قرار دیا ہے۔ حیرت ایک ذہنی اور اضافی کیفیت ہے، یعنی یہ کیفیت انسان پر خود اپنے اور اپنے ماحول کے متعلق طاری ہوتی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ علم کا موضوع خود انسان ہے، مجھے اس وقت علم کے امکانات سے بحث منظور نہیں، صرف یہ بتانا ہے کہ علم جس چیز کا نام ہے وہ انسان سے شروع ہوکر، بہت سے درمیانی مدارج طے کرنے کے بعد، جن سے انسان کو اپنے تعینات کا ادراک ہوتا ہے، خود انسان ہی پر ختم ہوجاتی ہے۔ اس حکیمانہ رمز کے وقوف کے بعد دنیا کے تمام مذاہب اور فلسفوں نے انسان کو اشرف المخلوق اور کائنات کی خلقت کی غایت قرار دیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ خالق، فطرت، تمدن اور حکمت کا مطمحِ نظر انسان ہے۔

انسانی وجود کی اہمیت تسلیم کرلینے کے بعد، صاحبانِ بصیرت کے لئے، انسان کا مطالعہ ضروری ہوجاتا ہے۔ یہ کہنا بھی بے جا نہیں کہ یہ حقیقی موضوع جس مفکر کی نظر کا مرکز بن جائے۔ خود اس صاحبِ فکر کو صاحبِ نظر مان لینا فرض ہوجاتا ہے۔ حیرت کی طرح بصیرت بھی ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے، لیکن جب یہی لفظی پیکر اختیار کرے تو شعر بن جاتی ہے، واضح طور پر یوں سمجھئے کہ تخیل، حکمت اور مشاہدے کے سمونے سے جو ذہنی جمال خلق ہو، اس کے لفظی وجود کا نام شعر ہے۔ انسان کائنات کی سب سے نمایاں، اہم اور فائق حقیقت ہے اور یہ تینوں کیفیتیں انسانی ذہن کی پیداوار ہیں، اس لئے جس شاعر میں اس نوع کی بصیرت موجود ہو وہ حقیقی شاعر ہے اور اس کا موضوع بھی تمام دقیقہ سنجوں کی طرح انسان ہوگا، ہومر، کالیداس، فردوسی، شیکسپیر، میر انیس، سب کا موضوع کسی نہ کسی حیثیت سے انسان اور اس کے کارنامے ہیں۔ ان ناموں نے مجھے ایک اور الہی شاعر کا نام یاد دلایا۔ جو مدت مدید تک گمنام رہنے کے بعد آج پھر نگاہِ انتخاب کا مرکز بنا ہوا ہے۔ میاں نظیر اکبرآبادی ایک رمز شناس، حقیقت نگار شاعر ہیں اور ان کا موضوع بھی انسان ہے۔

اصل یہ ہے تمام حقیقی شعرار کا موضوع، انسان ہوتا ہے، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو زبان کے دوسرے شعرا کیا حقیقی شاعر نہیں، اور اگر ہیں تو کیا ان کا موضوع بھی انسان ہے۔ اس کا جواب اگر ہاں سے دیا جائے تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوگا کہ نظیر کو کیا فوق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شعر کے باب میں فوق کا سوال کرنا غلطی ہے، حقیقی شعرا میں ایک کو دوسرے پر فوق نہیں ہوتا۔ ہر فرد اپنے پیغام کا حامل اور اپنی حیثیت میں حق ادا کئے جانے کا مستحق ہوتا ہے۔ ہاں فوق کی بجائے امتیاز یا خصوصیت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

نظیر کا امتیاز سادہ لفظوں میں یہ ہے کہ دوسرے شعرار نے انسان پر جزوی نظر ڈالی ہے یا زندگی کا ایک پہلو، خواہ وہ کتنا ہی اہتم بالشان ہو،

پیش کیا ہے۔ میرؔ نے جذبات کا تجزیہ کیا اور جذبات میں بھی وہ پہلو منتخب کیا جو غم کہا جاتا ہے، انیسؔ نے رزم کے جوہر دکھائے، ذوقؔ نے توصیف کے دریا بہائے۔ مومنؔ نے حسیات کا مطالعہ کیا۔ غالبؔ نے مسائل حیات پر فلسفیانہ نظر ڈالی۔ داغؔ نے حسن وعشق اور معاملہ بندی میں کمال دکھایا اور اکبرؔ نے ظرافت کے پیرائے میں حکمت کے خزانے وا کئے۔ لیکن ان کمالات کے باوجود جوان بزرگواروں کا حصہ تھے، انسان کے ساتھ ان کا علاقہ جزدی رہا۔

اب نظیرؔ اکبرآبادی کو لیجئے۔ اُنھوں نے مکمل انسان پر نظر ڈالی، ان کے کلام میں انسان کے خیالات، اُس کے جذبات، اس کے افعال، غرض نفس انسان کا مکمل مرقع آپ کے سامنے آتا ہے، نظیرؔ کی تصویریں انسانی زندگی کی سچی تصویریں ہیں۔ ان کی صحبت میں آپ معاشرت کے ہر شغل میں حصہ لیتے نظر آتے ہیں۔ ہر پہلو سے باخبر اور ہر حالت سے آگاہ معلوم ہوتے ہیں۔ بچہ، جوان۔ بوڑھا، ہنستا کھیلتا، روتا۔ گاتا، پاکباز۔ گنہگار، عارف غافل۔ غرض ہر قسم اور ہر شغل کے انسان سے آپ کی ملاقات ہوتی ہے، اس امتیاز کے علاوہ ایک پہلو امتیاز کا یہ ہے کہ دوسرے شاعروں نے جزدی زندگی کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے، اُن کے نتائج اُن کی فکر کا ثمرہ ہیں، مگر میاں نظیرؔ نے مکمل انسان کو اس طرح دیکھا جس طرح وہ ان کے سامنے موجود تھا۔ ان کے مرقع ان کے مشاہدے کے شاہکار ہیں۔

نظیرؔ کے متعلق جب یہ کہا جائے کہ مکمل انسان پر نظر ڈالی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ مکمل نظر ڈالی ہے۔ تکمیل، معاملے کا دوسرا پہلو ہے۔ مکمل انسان پر نظر ڈالنا۔ مکمل نظر سے جداگانہ بات ہے، پہلی کے معنی یہ ہیں کہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں باقی رہتا جس پر نظیرؔ کی نظر نہ پڑی ہو، اس سے مشاہدے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ دوسری کا مطلب یہ ہے کہ جس جزو کو دیکھا، اُس کی مصوری کا حق ادا کیا۔ اس سے تحلیل اور تجزئے کی قوت ثابت ہوتی ہے۔ نظیرؔ کے باب میں یہ دونوں پہلو مخلوط نہ کرنے چاہئیں۔ زندگی کے بیشتر پہلو ایسے ہیں، جن کا مکمل تجزیہ کرکے نظیرؔ نے مصوری کا حق ادا کیا۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو تشنہ رہ گئے۔ نظیرؔ کا اصل آلۂ کار مشاہدہ ہے اور اس باب میں آپ اُنھیں کہیں قاصر نہ پائیں گے۔

میاں نظیرؔ ایک مجدد تھے جو اپنے عہد سے ایک صدی پیشتر پیدا ہوئے یا یوں کہئے کہ جس درخت کو اس عہد میں باروَر ہونا تھا اس کا بیج فطرت کی دُور بین فراست نے اتنی مدت پہلے بو دیا تھا۔ نظیرؔ کی اصل عظمت یہ ہے کہ انھوں نے مکمل انسان سے بحث کی اور اس طرح فطرت شناسی۔ فطرت نگاری اور فطرت سے مطابقت کا ثبوت دیا۔ فطرت نے انسان کو مکمل پیدا کیا ہے۔ تکمیل سے صرف ہر حالت یا ہر قسم مقصود نہیں، بلکہ ہر عہد۔ ہر ملک ہر مذہب اور ہر نوع کا انسان مراد ہے، میاں نظیرؔ کی تصویریں ان کے عہد کی تصویریں بھی ہیں اور اس معیار پر بھی پوری اترتی ہیں۔ غالباً یہی وہ خصوصیت ہے جس نے شکسپیر کو شہرت عام اور بقائے دوام کی عزت بخشی۔

عام شاعرانہ حیثیت۔ غزل گوئی۔ نظم گوئی۔ آرٹ۔ مصوری، ادبیت فن شعر کی واقفیت، ایسے پہلو ہیں جو میاں نظیرؔ میں دوسرے شاعروں کے ساتھ مشترک ہیں، ان حیثیتوں سے نظیرؔ اور دوسرے شعرا پر یکساں نقد کیا جا سکتا ہے، لیکن نظیرؔ کے خصوصیات یہ ہیں کہ انھیں پہلا ہندی شاعر، خاص ماحول کا مالک اور موضوع کا خلّاق کہا جاتا ہے۔ لوکل کلر کی آمیزش مستزاد ہے۔ کچھ خصوصیتیں ان سے بھی بالاتر ہیں۔ وہ اخلاق اور خودداری کا درس، بے تعصبی اور رواداری، قومی نظریہ، رسم ورواج سے واقفیت، عادات وخصائل کا درک، تاریخی ماحول اور لسانی نکتہ دانی ہیں، ان موضوعات میں ہر ایک فی نفسہ ایک مقالے کا محتاج ہے اور ان سب سے مل کر نظیرؔ کے انسانی شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس شغف کی یہ اہمیت ہے کہ اس کو نظیرؔ کی شاعری کی اساس یا روح رواں کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اب تاریخی ماحول اور لسانی نکتہ دانی پر نظر ڈالئے تاکہ اس شغف کی وضاحت ہو جائے۔

نظیرؔ کی بصیرت افروز ہمہ گیری جس طرح وسعتِ نظر، فطرت کے غائر مطالعے اور کائنات کی نبض شناسی پر مبنی ہے۔ اسی طرح بنی آدم سے ان کی انتہائی دلچسپی غالباً ان کے تاریخی ماحول کا نتیجہ ہے۔ میرے اعتقاد کے مطابق تو یہ جذبہ بھی اُنھیں فطرت نے ودیعت کیا تھا۔ لیکن حقائق کو اسباب وعلل کی روشنی میں دیکھنے والوں کے لئے خارجی سبب کا وجود لازمی ہے اور وہ صرف تاریخی ماحول ہو سکتا ہے۔

مارٹن لیوتھر نے ۱۵۱۶ء میں یورپ کی روایت پرستی کے خلاف حریتِ خیال کا آوازہ بلند کیا۔ یورپ کا نشاۃ الثانیہ جس نے آخر کار انسان کی عظمت کا جھنڈا اگاڑا، اسی تحریک کا نتیجہ تھا، جس طرح اس تحریک کی

اہمیت سمجھنے کے لئے یورپ کے اخلاقی، مذہبی اور سیاسی انحطاط کا مطالعہ ضروری ہے۔ اسی طرح میاں نظیر کے پیغام کی اصل و غائت سمجھنے کے لئے ان کے عصر کے ہندوستان کو واقعات و حوادث کی روشنی میں دیکھنا لازمی ہے۔

نظیر محمد شاہ کے عہد میں پیدا اور ۱۸۳۰ء میں فوت ہوئے۔ ان کا زمانہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف اور انیسویں کے اول ربع کو محیط ہے۔ یہ عہد اخلاقی، تمدنی، مذہبی، سیاسی غرض ہر اعتبار سے ہندوستان کے تنزل کا زمانہ تھا۔ امن و سکون کی حکومت، بدامنی اور طوائف الملوکی نے غصب کر لی تھی، اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷) کے بعد سے برطانوی حکومت کے قیام تک (۱۸۵۸) جو مدت گزری اُس میں زندگی کا معیار نہایت پست اور شرمناک رہا۔ اس دوران کے تاجدار اور شاہزادے، امرار اور اراکین عام طور پر سیرت کے بدترین نمونے پیش کرتے ہیں۔ مشاہیر کی زندگی، شرارت، غداری، فتنہ انگیزی، قتل و غارت مکروہ شہوت پرستی۔ شدید ظلم۔ بے نہایت ہوسناکی اور حرص و آز کا ایک طویل افسانہ نظر آتی ہے۔

مغل فرمانرواؤں کی کم ہمتی، غفلت اور عیش پرستی کے باعث سلطنت کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ صوبوں نے خودسری پر کمر باندھ لی تھی۔ اکبر اور اورنگ زیب کی میراث اغیار کے ہاتھوں حصے بخرے ہو رہی تھی۔ مرہٹوں روہیلوں اور پنڈاریوں نے رات کی نیند اور دن کی بھوک حرام کر دی تھی سکھوں کی شورش روز افزوں ترقی پر تھی۔ دلی کا نادر شاہی قتل۔ احمد شاہ ابدالی کا حملہ اور پانی پت کی تیسری لڑائی، غلام قادر کے مظالم، سب بلائیں اسی عہد میں نازل ہوئیں۔ اندرون ملک کا تو یہ عالم تھا اور ساحلوں پر بدیشی سوداگر فاتحانہ طرزِ عمل اختیار کرتے چلے جاتے تھے۔ امن و سکون، راحت و آسائش نے زندگی کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ انسان کی جان مال، آبرو ہر وقت سخت خطرے میں تھی۔ آزادی کا کوئی وقار اور زندگی کی کوئی عظمت باقی نہ رہی تھی،

یورپ اس وقت کم و بیش بیدار ہو چکا تھا، روسو اور والٹیر کی غفلت سوز تلقینوں نے مذہب اور استبداد کے عظیم الشان ایوان کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ آخر کار فرانس کے انقلاب نے یگانگی، مساوات اور حریت کا اعلان کیا۔ دنیا میں آزادی کی لہر دوڑ گئی۔ فرانس کا انقلاب جس اصول کو لیکر اُٹھا تھا وہ معاشرتی مساوات اور انسان کی عظمت کا اصول تھا۔

ہندوستان اور یورپ کے حوادث اور انقلابات ایسے نہ تھے کہ کوئی اہلِ دل یا صاحب بصیرت ان سے متاثر نہ ہو۔ نظیر ایک گوشہ نشین بزرگ تھے۔ ان کے زمانے میں مراسلت کے ذرائع نہایت محدود تھے، انھیں یورپ کی آزادی کی جنگ کا پورا علم ہونا محال نہیں تو دشوار ضرور تھا، مگر وہ یورپ کی نوا سے براہِ الہام اور ہند کے حوادث سے براہِ راست سخت متاثر ہوئے۔ وطن کے ابتلا نے جو درد ان کے دل میں پیدا کر دیا تھا اس کی جھلک کلام میں صاف نظر آتی ہے۔ ملک کی غفلت اور پستی کے حوالے جا بجا موجود ہیں۔ دنیا اور عیشِ دنیا کی ناپائداری اور بے ثباتی دکھا کر جگہ جگہ عبرت آموزی کی ہے۔ آلام و مصائب دور کرنے کے لئے غالباً پہلا سبق یہ ہے کہ معاشرتی فرق اور عمرانی عدم مساوات کو ذہنی پستی کا مترادف بتا کر یگانگی، اور مساوات کا احساس کرایا جائے اور اس طرح انسانی حیات کی صحیح عظمت اور وجود کی منزلت پر زور دیا جائے، نظیر نے یہ فرض بدرجۂ اولیٰ انجام دیا ہے۔

الہٰی نامہ۔ آدمی نامہ۔ بنجارہ نامہ۔ ہنس نامہ۔ فنا نامہ۔ عاشق نامہ اسی قسم کی نظمیں ہیں۔

دوسرا نکتہ جس سے نظیر کا انسانی شغف نمایاں ہے، اس کی لسانی مہارت ہے۔ اردو کے کسی شاعر کے یہاں لغات کا ایسا وسیع استعمال نہیں ملتا۔ اردو میں کثرت سے ایسے الفاظ ہیں جو نظیر نے ہندی سے چن چن کر اردو میں کھپائے، لسانیات کا ماہر غالباً اس حقیقت سے انکار نہ کر سکے گا کہ بازاری دیہاتی زناتی زبانیں کسی مفہوم کے ادا کرنے میں قاصر نہیں ہوتیں۔ یہی نہیں بلکہ بعض مفاہیم کے لئے ان کے الفاظ اتنے موزوں، حسین اور جامع ہوتے ہیں کہ اُن کے مترادف ثقات کو میسر نہیں آتے۔ نظیر نے اس راز کو سمجھ کر ان تینوں ذرائع سے الفاظ حاصل کئے اور اس خوبی سے اردو میں سموئے کہ نہ صرف ان کی اجنبیت زائل ہوئی بلکہ ان میں خود بخود سنجیدگی، ثقاہت اور ادبیت بھی پیدا ہو گئی۔ عوام اور خواص کی زبان کا اختلاف دور کرنے کی کوشش اصل میں ادنیٰ اور اعلیٰ کا بنیادی فرق مٹانے کی سعی ہے جو انسانی عظمت کے احساس اور تبلیغ کی کھلی دلیل ہے۔

توسیع کے احسان سے بڑا احسان یہ ہے کہ نظیر نے زبان کو سلیس اور عام فہم بنایا۔ زبان کی سلاست اور بیان کی سادگی اُن کی ویش بھگتی کا تقاضا

تھی۔ اپنا اصلاحی پیغام عوام تک پہونچانے کے لئے عوام کی زبان کا استعمال از بس ضروری تھا۔ نظیر کے اس طرزِ عمل سے شاعری کو پیغمبری کا جزو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اصلاح اور تبلیغ کے علاوہ شعر کا اثر مسرت، روشن خیالی اور بلند حوصلگی بھی پیدا کرتا ہے۔ نظیر کی کوشش تھی کہ شعر و سخن کی دولت میں جو خود انسان کی ذہنی کاوش کا ثمرہ اور اس کی غیر فانی میراث ہے۔ ہر فرد بشر برابر کا حصہ دار نظر آئے۔ علم کی دولت، زر و جواہر کے انبار کی طرح صرف خواص کا اجارہ نہ بن جائے۔

نظیر کے مخالف اُن کی سادگی اور عام فہمی کو علم کی کمی کا سبب قرار دیتے ہیں۔ یہ خیال غلط ہے۔ اُن کا تبحر فارسی اور بعض مقامات پر اردو کلام سے ثابت ہے۔ مگر وہ نمائش کے مخالف تھے۔ اغلاق اور نمائش سادگی اور فروتنی کے مقابلے میں نہ صرف بہت آسان ہیں بلکہ ان کو علم و فضل کی نمائش کا ذریعہ یا عمقِ فکر اور دقتِ خیال اور نظر کی دلیل سمجھنا ہے۔ نظیر نے اپنا اُسلوب دانستہ اختیار کیا تھا جو اُن کے مشن کا ایک پُراثر طریقۂ کار تھا۔ نظیر کی زبان ہندوستانی ہے اور وہ ہندوستانی جسے عہدِ حاضر میں مہاتما گاندھی نے زبان کا آئڈیل سمجھا ہے۔ یہ شعر کا معجزہ ہے کہ جس زبان کی ضرورت ملک کو آج محسوس ہوئی، اس کی بنیاد نظیر نے ڈیڑھ سو برس پہلے رکھ دی تھی۔ ان کا طرزِ عمل سیاسی بصیرت کی بڑی دلیل ہے، اور سیاسی بصیرت کا یہ مفاد ہے کہ وہ انسان کے لئے کسبِ منفعت کا ایک معقول ذریعہ ہے۔

ملک اور قوم کی محبت نفس کی شرافت کا لازمہ ہے، اس نوع کی محبت ہندوستانی کے دل میں، یہاں کی مختلف قوموں کو ایک ہندوستانی قوم بنانے کی آرزو پیدا کرے گی۔ نظیر کا قلب اس آرزو سے لبریز تھا، ایک قوم کے لئے واحد زبان ضروری ہے، اس احساس نے نظیر سے مشترک زبان کی بنیاد ڈلوائی۔ غیر مانوس فارسی محاورے۔ ترکیبوں اور لفظوں کو نکال کر ہندی محاوروں۔ ترکیبوں اور لفظوں کو رائج کرنا نظیر کے محبِ وطن ہونے کی بڑی دلیل ہے۔ افسوس ہے کہ یہ اہم خدمت ایک زمانے میں عیب خیال کی گئی۔ مگر آج کارنامہ سمجھی جاتی ہے۔ نفسیات کا مطالعہ کرنے والے اس پر تعجب نہیں کرتے۔ مرض کی شدت میں دوا کی تلخی طبیب کا ظلمِ عظیم محسوس ہوتی ہے۔ مگر پھر وہی تلخی تریاق بن جاتی ہے۔

محبِ وطن کی کوشش مشترک زبان تک محدود نہیں رہتی۔ وہ اپنے ملک میں تہوار۔ رسم و رواج، میلے، ہیرو اور دیوتا بھی مشترک دیکھنا چاہتا ہے، ہولی۔ دوالی۔ راکھی۔ داؤجی کا میلہ۔ کرشن جنم۔ بانسری۔ بسنت۔ تیراکی، کا میلہ نام کی نظمیں اسی جذبے کے تحت میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں ہر نظم ایک مفصل تبصرہ کی محتاج ہے۔ جس ملک میں مختلف مذہب رائج ہوں اور پھر اس کی قوموں کو ایک قوم بنانے کی کوشش کی جائے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ قومیں ایک دوسرے کی مذہبی روایات اور اعتقادات کو سمجھیں اور ان کی عزت کرنا سیکھیں۔ معجزہ حضرت علیؓ اور حضرت سلیم چشتی نام کی نظمیں جس خلوص اور عقیدت سے لکھی گئی ہیں اتنی ہی محبت اور ارادت کرشن جی کے جنم اور بابا نانک شاہ گرو، نام کی نظموں میں نظر آتی ہے۔

اشرف المخلوق ہونے کی حیثیت سے جہاں دنیا کی ساری نعمتیں انسان کا حق سمجھی جاتی ہیں، وہاں مصائب اور غم و الم کا سارا بار بھی انسان ہی کی گردن کے لئے مخصوص ہے۔ یہی نہیں بلکہ انسان خود بھی اپنا دشمن ہے، وہ اپنے کو خود ساختہ قید و بند میں گرفتار کرکے اپنی زندگی کو آرام و سہولت سے معرا کرتا رہتا ہے، نظیر کو یہ راز معلوم تھا۔ ان کی محبت کا تقاضا تھا کہ اس بار کو ہلکا اور ان بیڑیوں کو کاٹنے کی تدبیریں بتائیں۔ تعصب، خود غرضی۔ غلامی۔ لامذہبی، بے دینی۔ جاہ پرستی۔ حب دنیا۔ ظلم و تعدی، کبر و نخوت کے ذریعے نازل ہونے والی بلائیں، آپ اپنی لائی ہوئی مصیبتیں ہیں۔ نظیر نے انسان کو ان آفات سے محفوظ رہنے کی بار بار تدبیریں بتائی ہیں۔ دنیا کے علائق بھلانے کے لئے کہیں خوش باشی اور آزادانہ طرزِ زندگی سکھایا ہے، سخاوت و عشرت اسی قسم کی ایک نہایت دلچسپ نظم ہے۔

نظیر کے انسانی شغف کا مزید تجزیہ کرنے سے انسان کی محبت کی ایسی پُرخلوص مثالیں سامنے آتی ہیں، جن کی بنا پر اس محبِ اعظم کو مجدد تسلیم کر لینا پڑتا ہے۔ وہ اتنے کثیر الاحباب تھے کہ شہر میں عام طور پر لوگوں سے اُن کے تعلقات تھے، ان کی دوستی کے لئے حیثیت کی کوئی قید نہ تھی۔ ہر درجے اور معاشرت کا انسان ان کی صحبت میں بار پا سکتا تھا۔ پیشہ وروں اور اہلِ حرفت سے اُنھیں خصوصیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی معاشرت اور ان کے فنون کی اصطلاحوں پر نظیر کو اس قدر عبور تھا، سعدی کی طرح نظیر کا وسیع تجربہ ان کے اخلاق کی وسعت کا رہین منت ہے۔

نظیر کی انسانی محبت کا یہ عالم ہے کہ انھیں انسان کے بُرے سے بُرے فعل سے بھی نفرت نہیں ہے۔ ان کی مخالفت یا اشتعال، رحم کی صورت میں جلوہ نما ہوتا ہے۔ معلمی پیشہ اختیار کرنا ہمدردی کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ سوسائٹی نے معلم کو ذہن اور اخلاق دونوں کی تربیت کا موقع اور اختیار دیا ہے۔ معلم کا فرض ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے پست طبقے کی طرف زیادہ توجہ کرے، توجہ جبھی ممکن ہے جب معلم کی فطرت میں انتہا درجے کا تحمل اور رواداری ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے شاگردوں کی پستیوں سے بیزار ہو کر اُن سے نفرت نہ کرنے لگے۔ نہ صرف یہ بلکہ نفرت کو اپنے ذاتی ایثار اور نفس کشی کے ذریعے ہمدردی میں بدل دے۔ نظیر کے یہاں انسان کے افعال شنیعہ سے کہیں بیزاری کا اظہار نظر نہیں آتا۔ جا بجا رحم اور ہمدردی کے جذبے پائے جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کی فطرت میں ایثار کی کتنی عظیم الشان قوت موجود تھی۔

فواحش کی موجودگی کی بنا پر نظیر کے کلام کو رکیک اور سوقیانہ کہا جاتا ہے۔ یہ فیصلہ اول تو اس لئے قطعی غلط ہے کہ ایک عیب کی بنا پر ہزاروں بے مثل خوبیاں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ دوسرے فواحش کے باب میں نیت کا مسئلہ نزاعی ہے۔ دنیا اور لوازم دنیا کو نظیر کی طرح ہیچ اور لایعنی سمجھنے والا نفس، عیش و عشرت کی پست و فانی لذتوں میں مبتلا نظر نہیں آ سکتا۔ نہیں ہرگز ایسا ممکن نہیں۔ اس قسم کا گمان صریحی نفسیاتی غلطی ہے، اس لئے یہ مان لینا پڑے گا کہ فواحش کا واسطہ، بدنیتی کی بنا پر اپنے نفس کی پرورش یا حصول لذت کے لئے نہ تھا، جب یہ وجہ باقی نہیں رہتی تو دوسری وجہ تلاش کرنی پڑیگی، اور وہ نظیر کے عام رویے اور طریقۂ کار کے مطابق ہونی چاہئیے، یہاں پھر نظیر کی عالمانہ بصیرت ہماری جستجو کی مدد کرتی ہے۔ باغ کی سیر کرنے والا کانٹے سے قطع نظر نہیں کر سکتا۔ شہر کے آباد و معمور حصوں، فرحت بخش و دلکشا سڑکوں سے گزرنے والا، گندے نالوں کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور اگر کرے تو وہ پھر یہ نہ کہہ سکے گا کہ پورے باغ کی سیر کر لی یا تمام شہر دیکھ لیا، آگرہ میں تاج گنج کا روضہ اور ڈھولی کہار کا نالہ دونوں پائے جاتے ہیں۔ سوسائٹی کے مردوں میں نیکوکار اور بدکار دونوں قسم کے افراد موجود ہیں، جب نیک و بد حسن و قبح، خیر و شر کی دوعملی کا یہ عالم ہو تو صرف ایک کو دیکھنا اور دوسرے سے بے خبر رہنا نہ صرف اپنی بے بصیرتی کا ثبوت بلکہ فطرت سے ایک قسم کی بغاوت ہے۔ نظیر جیسے پروردۂ فطرت کے لئے اس نوع کی بغاوت حرام تھی۔ اس لئے بازاری زندگی کی جو تصویریں نظیر نے کھینچی ہیں وہ تمام و کمال صحیح، دلچسپ اور مکمل ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ نظیر نے خود بازاری زندگی بسر کی، اسی لئے انھیں اس زندگی کے حالات اتنے صحیح معلوم ہیں اور بعد کو وہ خود اپنی حالت پر پشیمان ہوئے، مجھے نہ اس خیال سے اتفاق ہے نہ پشیمانی کی کوئی مثال کلام میں میسر آتی ہے، حقیقت اس کے خلاف اور سادہ لفظوں میں یہ ہے کہ نظیر نے ہر قسم کی سوقیانہ زندگی کا غائر مطالعہ کیا اور یہ جبھی ممکن تھا، جب ان حالات میں زندگی بسر کی جائے۔ لیکن شرابی کی ہمنشینی۔ قمار باز کی دوستی اور عیاش کی ہم جلیسی سے یہ لازم نہیں آتا کہ ساتھی بھی ضرور شرابی، جواری یا عیاش ہو جائے۔ انسانی فطرت کے محقق کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ تمام فطرتوں کا قریب سے مطالعہ کرے۔ نظیر نے یہی کیا اور اپنی روح کو تمام آلودگیوں سے منزہ رکھا۔

مسیحیوں کا اعتقاد ہے کہ مسیح خود خدا تھے، باری تعالیٰ نے اپنے کو پہچنوانے کے لئے مسیح کا انسانی قالب اختیار کیا۔ اصول یہ ہے کہ ایک جنس کے لئے جنس کا عرفان محال ہے، خدا جب تک انسان بن کر، انسانوں میں نہ آئے، انسان کے لئے اس کا سمجھ سکنا ناممکن ہے۔ مذہبی اعتقاد سے قطع نظر کرکے محض نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس مسئلے پر نگاہ ڈالئے تو بڑی حقیقت بے نقاب ہوتی ہے، منبر نشین مولانا کا وعظ قلب پر اتنا اثر نہیں چھوڑتا جتنا ہمنشین کی برمحل فہمائش۔ نظیر نے سوقیانہ معاشرت میں گھل مل کر اس لئے حصہ لیا کہ عوام کی برمحل فہمائش کا موقع ہاتھ آئے۔ انھوں نے واعظ کے ملاءِ اعلیٰ پر کھڑے ہو کر، دنیا کو کبھی نصیحت نہیں کی، بلکہ جس طبقے کی فہمائش مقصود ہے۔ اس کے بدترین افراد کے گلوں میں باہیں ڈال کر سمجھایا اور اپنے کو خود اُنھیں کی جماعت کا ایک انسان قرار دے کر نصیحت کی ہے اس کا اثر لازمی طور پر یہ ہوتا ہے کہ سننے والے کو ناگوار نہیں ہوتا، اور سُنانے والے کو گوش شنوا میسر آ جاتا ہے۔ دوالی کی نظم میں قمار بازی کی خرابیاں بیان کرتے کرتے فرماتے ہیں۔

نظیر آپ بھی ہے جواریا دوالی کا

سری کرشن داس صاحب کا مکتوب

از پولیس لائن گوڑگانوہ

مکرم بندہ ایڈیٹر صاحب زاد عنایۃ

کمینگاہِ سخن عاجز کنند معنی نگاراں را
خس ایں بیشہ پہلو می دزد چابک سواراں را

تسلیم۔ کرمس کی تعطیلات میں میرے فاضل دوست سید مشتاق علی صاحب بی اے، ایل، ایل۔ بی پراز یکیوٹنگ سب انسپکٹر پولیس گوڑگانوہ نے رسالہ "طور" کا اپریل ۳۶ء کا پرچہ عنایت فرمایا، جس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔ میں اس کے مطالعے سے بے حد مسرور رہا۔ مگر مجھے اس رسالے میں ایک امر جو نہایت نمایاں و روشن تھا، قابلِ اعتراض بلکہ معیوب معلوم ہوا۔ اور وہ امر یہ ہے کہ دقیق و ادق بندشوں کے علاوہ جا بجا مہمل و مبہم الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ جن کی نظیریں مستند اُردو کی عبارات میں پائی جاتیں، اور جو قواعدِ صرف و نحو کی رُو سے بھی غلط ہیں۔ تمثیل کے طور پر ان میں سے میں چند ایک درج ذیل کرتا ہوں۔

(۱) ادبیات (۲) تجلیات (۳) سفلی رجحانات (۴) ذاتیات (۵) اقتصادیات (۶) عرفانیات (۷) شبابیات (۸) جمالیات (۹) تواریخی مقامات، (۱۰) طلسماتی حُسن (۱۱) مقدس تعلیمات (۱۲) مابعد الطبیعاتی (۱۳) مافوقی نظارہ

عربی اور فارسی مصادر کی تجنیس و تانیث اور پھر ایسے مصادر مؤنث کی جمعیں صرف و نحو یا علمِ ادب کے کسی قاعدہ سے بھی جائز نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض جمعیں تو غیر ضروری بھی ہیں، کیونکہ ان کے صیغہ جات واحد موجود و مروج اور صحیح معنوں میں استعمال ہوتے ہیں؛ مثلاً تجلی۔ رجحان۔ عرفان۔ جمال وغیرہ نامعلوم مضمون نگاروں کی جدت پسند طبائع نے کیوں غلط۔ غیر ضروری اور بے معنی الفاظ کے اختراع کی ضرورت محسوس کی۔ میں خود زبان داں یا انشا پرداز نہیں ہوں۔ بقول مخفی ع

زیب و زینت بس ہمینم نامِ من زیب النساست

مگر میرا خیال ہے کہ بعض الفاظ مثلاً شبابیات۔ جمالیات وغیرہ کے موجد خود بھی ان مشتقات کے ماخذ و مفہوم کی تلاش سے قاصر ہوں گے۔

تواریخی مقامات۔ طلسماتی حسن اور مقدس تعلیمات کے صحیح مترادف یعنی تاریخی مقامات۔ طلسمی حسن اور مقدس تعلیم اردو میں مروج و موجود ہیں۔ پھر نہ معلوم کہ یائے صفت لگانے سے پہلے اسم کی جمع بنانے کی کیا ضرورت درپیش تھی۔

بعض مرکبات مثلاً مابعد الطبیعاتی۔ مافوقی نظارہ وغیرہ ایسے مرکبات ہیں جو غیر مروج۔ غیر فصیح۔ خلافِ محاورہ اور خلافِ قواعد ہیں۔ نہ تو قواعد صرف و نحو ایسے مرکبات کی اجازت دیتے ہیں۔ نہ ہی اشاعتِ اُردو کے لئے اُن کی ضرورت ہے، اور نہ ہی اُن کا مطلب آسانی سے اخذ ہو سکتا ہے۔ بلکہ پڑھنے والے کی طبیعت پر اُن کا وہی اثر پڑتا ہے جو بالائی میں مصری کی ڈلیوں کے ساتھ سنگریزوں کی آمیزش سے پیدا ہوتا ہے۔

"تجلیات" کے راقم خود متضاد بندشوں کے مُوجد ثابت ہوئے ہیں، مثلاً صفحہ اول پر لکھتے ہیں۔

"جو مشکلات انھیں خریدار سازی میں دیکھنا پڑیں"

اور صفحہ دوئم پر لکھتے ہیں۔

"ہر ایک چیز کو آہستہ آہستہ ترقی کرنی چاہیئے"

الفاظ مشکل اور ترقی اردو میں مؤنث استعمال ہوتے ہیں۔ نہ معلوم اول الذکر کے لئے فعل دیکھا بصیغہ مذکر اور موخر الذکر کے بعد کرنی بصیغۂ مؤنث کیوں استعمال کئے گئے ہیں، مناسب تھا یا تو دونوں جگہ صیغۂ مذکر استعمال کیا جاتا یا صیغہ مونث، اگرچہ مختلف شعرا نے دونوں بندشوں کو استعمال کیا ہے، مگر ایک ہی مصنف کے ایک ہی مضمون میں دو متضاد صیغوں کا استعمال معیوب اور قابلِ اعتراض ہے، ارشد گورگانی فرماتے ہیں ع

اگر آنکھیں دکھانا تھیں دکھاتے اپنی آنکھوں سے

صفحہ ۵ پر لفظ نوازا ظاہر کرتا ہے کہ یہ بظاہر کسی اردو مصدر نوازنا کا صیغۂ ماضی ہے، مگر اردو زبان میں آج تک ایسا کوئی مصدر دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا۔ البتہ فارسی میں نواختن۔ نوازیدن۔ مصدر ہیں معلوم لفظ نوازا کہاں سے تلاش کیا گیا۔ یا کیوں اختراع کیا گیا ہے۔ ایسا ہی صفحہ ۳۴ پر درج ہے،

"وہ ایک بھارے تن و توش کا آدمی تھا"

اردو میں لفظ بھاری استعمال ہوتا ہے، آج تک کسی نے الفاظ بھارا یا بھارے استعمال نہیں کئے جیسا کہ شعر ذیل سے ظاہر ہوتا ہے۔

دیکھ لیتی جو اٹھا کر نہ ترے لوٹتے ہاتھ
لیلیٰ اتنا تو نہ تھا پردۂ محمل بھاری

صفحہ ۶۰ پر جو رباعی درج ہے، اُس کے مصرع دویم میں لفظ آرامیدہ استعمال کیا گیا ہے مگر شعرا اردو نے اب تک لفظ آرمیدہ ہی استعمال کیا ہے مثلاً

ظلمِ جہاں نہ دَورِ فلک کا مجھے خیال
دریا کے جوش میں تہِ پل آرمیدہ ہوں — امیر مینائی۔

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے — غالب

میرا مقصد تنقید یا نکتہ چینی نہیں ہے۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ رسالہ طلوع جیسا پُر مغز اور مفید ہے۔ اُسے ویسا ہی عام فہم بھی ہونا چاہیئے۔ تاکہ نہ صرف وہ اصحاب جو عربی اور فارسی سے بخوبی واقف ہوں، بلکہ اردو داں اصحاب بھی اس کے مطالعہ سے فیضیاب ہو سکیں اور مبتدیوں کے سامنے ایسی بندشیں اور ترکیبیں پیش نہ کی جائیں جس سے وہ گمراہ ہو کر خود غلط الفاظ کے موجد بنیں۔

ایک ادبی رسالہ کے مدیران کا فرضِ اولین ہے کہ اپنے قارئین کو علم و ادب کے صحیح الفاظ اور سبق سکھلائیں۔ اور اردو زبان کو لغزشوں اور مہمل بندشوں سے مبرّا رکھیں۔ ع

خود پرستاں ندمستِ بزمِ عشرت ساختن
کیست کو آید بروں در رزمِ سنداں بافتن

میں اپنے خیالات کی تائید میں جناب مولوی سید مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی کے چند اشعار جو ملک کے چوٹی کے انشا پرداز اور شعراء میں سے ہیں، نقل کرتا ہوں۔

نفسیات و علمیات و عشقیات و حسنیات و لمسیات و حرصیات و برفیات و شقیات
مالیات و حسیات و خواہشات و صدقیات و صرفیات و فضلیات و ہستیات و وقتیات
سالم جمعِ مونث ہنرلیات و واہیات
فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلات

ہر ادبی رسالہ کا ایک فرضِ اہم اردو کی مروجہ غلطیوں کی تصحیح بھی ہونا چاہیئے، اور میں سفارش کرتا ہوں کہ ہر پرچہ کے ساتھ ایک فہرست مروجہ اغلاط کی اور اُن کے صحیح مترادفات کی درج کی جائے۔ تاکہ زبانِ اردو کو جس کے متعلق گرامی صاحب فرماتے ہیں کہ

....

در نہ قرآں اُتر تا بزبانِ اُردو
اے گرامی لکشا ہرزہ سرایانہ زبان
نیستی واقفِ اسرارِ نہانِ اردو

یہ شعر زبانِ حال سے نہ کہنا پڑے ے

زباں ز جدتِ یارانِ فن بہ تنگ آمد
کہ بہر معنیِ پُر جوشش پُر آہنگ آمد

〰〰〰〰〰

[illegible]

رفتارِ وقت!

ادارۂ کلیم

کانگریس کا "میمنہ و میسرہ" بہ انداز "فراق بینی و بیناک" کے مرحلے پر!
(Congress at the Cross-roads!)

جس چیز کا اندیشہ تھا وہ اپنی توقع اور شاید اپنے قیاسی وقتِ ظہور کے مین لمحے پر پیش آ گئی! ہمارا اشارہ "المیہ" وہ سیاسی شقاق ہے جو عام کانگریس اور اُس کے "سوشیلسٹ بازو" کے درمیان عملاً واقع ہو گیا ہے! اور اس سانحے کے معرضِ وجود میں آ جانے میں اگر کوئی کسر رہ گئی ہے تو وہ اس قدر کسر نہیں جس قدر کہ اُس کی پردہ داری کی اک بیہودہ "پردہ در" کوشش ہے! کانگریس کا "سوشیلسٹ گروپ" شاید زبانِ حال سے یہ غیر ملفوظ پیام سنا رہا ہے کہ:

"محتسب" در پئے وجہے ز "حریفاں" بہ کمیں
"شبلیا" رندئ پنہانِ تو دُشوار اُفتاد!

اِس اجمال کی تفصیل اور اِس اِبہام کی تصریح مندرجۂ ذیل سطور میں ملاحظہ فرمائیے!

اِس بحث کے "جزوی پس منظر" کی حیثیت سے اگر قارئینِ کلیم، رسالۂ ہٰذا کے جنوری نمبر (سنہ رواں) کے بہرۂ "رفتارِ وقت" کے نوٹ بسرخی "نیشنل کانگریس اور ہندوستانی سوشیلسٹ جماعت" کو پیشِ نظر رکھ لیں تو فہمِ مطالب میں خاص آسانی بہم پہنچے گی!

عہدِ حاضر میں جہاں جہاں آزاد و نیابتی حکومتیں قائم ہوئی ہیں وہ اک قسم کے "اسٹیٹ سوشیلزم" کے مسلک کو اپنی پالیسی بنا رہی ہیں! آزادئ مُلک و قوم کی جتنی تحریکیں بھی اِس وقت معرضِ نشو و نما میں ہیں اُن کی "معاشی جمہوریت" کی اساس اُنکا اک غیر نوشت "نوشتۂ تقدیر" پایا جاتا ہے! انڈین نیشنل کانگریس کی جد و جہد بھی اِس کلیے میں کوئی اِستثنا نہیں رہی ہے، چنانچہ اُس کی ہستی قریب کی تاریخ کے دریا میں یہ "دو دھارے" —— لبرلزم اور سوشیلزم —— نمایاں طور پر پہلو بہ پہلو نمودار ہوئے ہیں! کراچی کانگریس ۱۹۳۱ء اگر "اعلانِ حقوق باشندگانِ ہندوستان" کے لئے یادگار ہے تو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اک اہم اجلاس منعقدہ بمبئی بماہ ۱۹۳۴ء صفحاتِ تاریخِ ہند پر اِس حیثیت سے ثبت ہو چکا ہے کہ اُس کی اک طویل و مفصل قرار داد نے نشستِ کراچی والی ابتدائی سلسلہ جنبانی دربارۂ "استحسانِ قیامِ ہندوستانی پرولتاریت" کی واضح و قاطع الفاظ میں تصدیق و توثیق کی! اِس نئی مجوزہ تدبیرِ اُمور (dispensation) نے کانگریسی پیام و نظام و پروگرام کے سارے سرشتوں کو شدید طور پر رنگین کیا! کانگریس روز بروز مزارعین و مزدوران کی انجمن بننے لگی، اُس نے اپنا پہلا دیہاتی اجتماع فیض پور کے "کمپرہ گوردہ" میں برپا کرنے کا انقلابی قدم اُٹھایا جس کے بعد ہی آئندہ انتخاباتِ زیرِ نو نفاذ آئینِ ہند کی شرکت کے لئے اپنا جو پولٹیکل مینی فیسٹو شائع کیا، وہ گویا کسانوں اور مزدوروں کے حقوق ہی کا اک بشارت نامہ تھا! کانگریس کے "الیکشن کیمپین" کا یہی نقیب بنا، اور سلطنتِ ہند کے ۶ ، ۷ صوبوں کے اندر اہلِ کانگریس کا "کوسِ لمن الملک الیوم" بجا دیا!

بلاشبہ کانگریسی وزارتوں نے اپنے مشتہرہ مواعید کو فراموش نہ کیا، اُنھوں نے مسندِ حکومت پر متمکن ہوتے ہی اصلاح پرستی، حریت پروری، صحافت نوازی، تعمیری مہمات کی پرچم کشائی، اہلِ دیہات و کارخانہ جات کی دستگیری و پُشت پناہی کا اک فاتحانہ دَور شروع کیا، اور اک ہفتہ عشرہ کے اندر ہی اندرونِ مظلوم کی فضا کو اُمید، آسودگی، راحت رسیدگی، اعتماد، اعتبار، بلکہ پندار کی برقی امواج سے لبریز کر دیا! ؎

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید!

تاہم دَورِ انقلاب کی اِس باثمرہ نوازتمہید میں قدرے "خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود" کے سیمیائی مناظر تھے! کانگریسی کابینہائے وزارت کے یہ جلوس ہائے اصلاح و امداد و تعمیر اپنے تنگ ممکنات کے آخری حدود سے جلد دوچار ہو گئے! برطانوی دفتریت و قیصریت کی محفوظ سَدِ سکندری اُن کے مزید تقدم میں حائل ہو گئی! لیکن یہ چیز تو ناگزیر اور مستحقِ نظر اندازی تھی، جو چیز دیکھنے والوں کو کھٹکی وہ یہ تھی کہ کم از کم حرفتی مزدوروں کی بعض ہنگامہ آرائیوں میں اُن کے ساتھ "ناپسندیدہ مفسدہ پردازوں" کا سا معاملہ برتا گیا! ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ "یہ بے ننگ و نام ہے"!
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں!

مشہور سوشیلسٹ ایجی ٹیٹر مسٹر باٹلی والا کی اک واشگاف تقریر کی بنا پر مدراس کی "رہبانیت مآب" حکومت بصدارتِ شری یت راجہ گوپال اچاریہ نے اُن کو اسیروں کی رائے کے علی الرغم تقریباً انتظاماً اسیرِ قفسِ جیل بنا دیا، اور کان پور کے ملِ مزدوروں کے فاقہ زدہ معدوں اور برہنہ جسموں کو تو فائرنگ سے بھی نوازا گیا! ——— اُن کے اُس "ووٹ" کی قیمت کی ادائی میں جس نے کانگریسی وزراء کو ایوانِ وزارت کا پروانۂ راہداری بخشا تھا! ؎

بجُرمِ عشقِ تو ام می کُشند و غوغائیست
تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشائیست!

بالآخر اک عرصے کی مشقِ ناز کے مشاہدہ و مطالعے کے بعد وقت کے کانگریس پریزیڈنٹ پنڈت جواہرلال نہرو کو کانگریسی وزراء و اُمراء کی پندار پروریوں اور تیز خرامیوں کا شکوۂ رنگیں کرنا پڑا! ؎

چو پردہ دار بشمشیر می زند ہمہ را
کسے مقیمِ حریمِ حرم نخواہد ماند!

صوبۂ بہار میں کانگریس و کسان سبھا کی اَن بن نے اِس آویزش کو قریب قریب اک درجۂ اوّل کے تصادم کی نوبت تک پہنچا دیا! بابو راجیندر پرشاد اور مسٹر سہجانند، علی الترتیب گرَوِ سرمایہ داری کانگریس اور دلدادۂ سوشیلزم کسان اندولن کے علمبرداروں کی حیثیت سے اک دوسرے کے دوبدو آ گئے! اول الذکر نے اک کانگریسی پر کسان سبھا کی ممبری حرام کر دی، اور آخر الذکر نے بادلِ ناخواستہ کانگریس سے استعفیٰ دیدیا! کیا بہار کانگریس کمیٹی کے اِس اقدام کی اثر آفرینی بہار کے زمینداروں اور تعلقداروں کی ستیاگرہ کی دھمکی تھی؟ اگر رازِ درونِ پردہ یہ تھا تو صوبجاتی کانگریس کا دشمن و دوست کا یہ نیا ترک و اختیار کہاں تک قابلِ رشک کہا جا سکتا ہے؟! ؎

بقولِ دشمنے پیمانِ دوست بشکستی! ببیں کہ از کہ بُریدی و با کہ پیوستی!

مسٹر سہجانند نے اُنہی ایام میں اِس نئی سیاسی شکست و ریخت کو اپنے اک مبسوط و مدلل پبلک اعلان میں واشگاف بیان کیا تھا! ؎

افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اُسے جتا تو دیا، مان تو گیا؟!

آخرکار آل انڈیا نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس ہری پورہ میں یہ "سیاسی جمود" پیش ہوا! راجیندر بابو کی ڈکٹیٹری کی عنانگیری کی گئی! کانگریس و کسان کے درمیان کی اِس مزعومہ تفریق سے اِنکار کیا گیا! اور کسانوں کی تنظیم و سیاسی تعلیم کانگریس کے مستحسن فرائض قرار دیئے گئے۔ نکہ کانگریس دشمنی یا کانگریس شکنی! کانگریس سوشلسٹوں کی طرف سے اس موقعے پر اک ہجو بلیغ کی گئی: اِتنا ہونا تھا کہ سردار پٹیل کو جلال آ گیا! اور اُنھوں نے اپنے سارے مشتہرہ و تکیۂ کلام "عدم تشدد و روحانی قوت" کو خیرباد کہہ کر یہ بلند بانگ چیلنج کیا کہ:-

"میں دو سال سے سوشلسٹوں کی رخنہ اندازیوں اور فتنہ پردازیوں کو برداشت کرتا رہا ہوں، لیکن اب برداشت نہ کروں گا!"

یہ اُس "ہندوستانی فاسزم" کی پہلی آواز ہے جس کی نسبت پنڈت جواہرلال نہرو نے وقتاً فوقتاً اپنی تحریرات و تقریرات میں اہلِ مُلک کو متنبہ کیا ہے! اور جس کے ہندوستان ایسے سرمایہ داروں اور مہاجنوں،

زمینداروں اور تعلقداروں، نوابوں اور راجوں، گھیمی جی کے پجاریوں اور مُبلغ علیہ السلام کے پرستاروں کے مُلک میں ظہور پذیر ہونے کے بڑے قوی امکانات و محرکات پائے جاتے ہیں! ع

ہُشدار کہ سیلابِ فنا درپیش است!

معلوم ہندوستان اور روشناس عالم بنگالی سوشلسٹ مصنف و صحافی و داعی مسٹر ایم۔ این۔ رائے کا ماضیٔ قریب کی بنگال کی پولیٹیکل کانفرنس کے پنڈال میں پھینکا ہوا یہ بم "اگر ہم اس موقعے پر اک دفعہ اوسُن لیں تو مُلک کی تحریکِ سیاسی کی موجودہ "موڑ" کی توجیہہ و تفہیم میں اہم آسانی بہم پہنچے گی! "منصور انا الحق صفت" رائے نے کہہ ڈالا کہ؛

"اگر آپ کانگریسیوں کے دلوں کو ٹٹولیں تو آپ کو اُن کی اکثریت ایسی نظر آئے گی جو بدستور اپنے ناخواندہ اور غریب ہموطنوں سے فائدہ اُٹھانا چاہتی ہے! اور آپ اگر اچھی طرح اُن کے مافی الضمیر کا جائزہ لیں تو آپ اُن کے قول و عمل کا اختلاف دیکھکر حیران و ششدر رہ جائیں گے! غریب مزدوروں اور کسانوں کی حالت پر ازراہِ تصنع اشک ریزی کرنے والے یہ لوگ، ساہوکاروں، کارخانہ داروں اور بڑے بڑے زمینداروں سے جو مُلک کے غریب کے جسم سے خون کا آخری قطرہ نچوڑ لینے پر تُلے ہوئے ہیں، گہرے تعلقات رکھتے ہیں! اِس وقت مُلک کی عام آبادی کو اِسی طرح کانگریسی کارکنوں کی خود غرضی سے نجات دلانے کی ضرورت ہے جس طرح غیر ملکی حکمرانوں کے اثر و اقتدار سے! اگر ایسا نکیا گیا تو ہم اپنی جدوجہد سے آزادی کے مُنتہائے مقصود سے قریب تر ہونے کے بجائے دور تر جا پڑیں گے!"

رائے کے اخیر جملے میں جس اندیشے کا اظہار کیا گیا ہے وہ اسپین اور اٹلی میں اک عملی تاریخی حادثہ بن چکا ہے! اول الذکر مُلک میں معاشی جمہوریت اک کامیاب انتخاب لڑ چکی تھی، اور آخر الذکر میں اک پورے با پر و بال سوشیلسٹ انقلاب کا جلوس رواں دواں ہو گیا تھا! لیکن ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے!

ہمارا مشارٌ الیہ اسپین کے اُمرا و قائدینِ عسکری کی باغیانہ مُداخلت فی الجمہوریۃ اور اٹلی کے کارخانہ داروں اور زمینداروں کا جوابی انقلابِ رجعت ہے! پہلی تحریک کا سرخیل جنرل فرینکو بنا، اور دوسرے فتنۂ فاسزم کا آلۂ کار بنیٹو مسولینی! جمہوریت جب معاشی جمہوریت کی صورت میں اپنی "تکمیلِ دین" اور اپنا "اِتمامِ نعمت" حاصل کرنے لگتی ہے تو "سرمایہ دارانہ لبرلزم" کے "بورژوا متمتعین" اس نشو و نما کو روکنے کی ایسی ہی جان توڑ کوشش کرتے ہیں جیسی کہ مُلوکیت کی معزولی اور حُریت کے آغاز کے لمحے پر شاہ اور شہزادے، اعیانِ دربار و ارکانِ دولت ہر کردنی و ناکردنی کر گزرتے ہیں: درحقیقت اِسی افتادِ بد کو روکنے کے لئے شاہی خاندان کی نظربندی اور "ڈکٹیٹرشپ آف دی پرولیٹیریٹ" کی ضرورت ہوتی ہے! اِس نکتۂ سیاست کو مارکس اور لینن نے بھیا پایا وہ اُنہی کا حصہ تھا، ہسپانیہ و ایطالیہ کے علاوہ یہ فروگزاشت جنگِ عظیم کے بعد کی سوشلسٹ جرمنی اور کمیونسٹ آسٹریا کے عوامی لیڈروں سے بھی سرزد ہوئی! اور دورِ عبوری کے اِس دشوار گزار "پُلِ صراط" پر سے گزرتے ہوئے سوشلسٹ انقلاب کا "زائرِ جنت" اوندھے مُنھ فاسزم اور ملیٹرزم کے "جہنم" میں جا گرا: ؎

مرے ڈوب جانے کا باعث نہ پوچھو کنارے سے ٹکرا گیا تھا سفینہ:

سیاسیات کے اِس چوراہے پر آکر ہندوستانی تاریخِ حریت کا اِس مزلتہ الاقدام کی ٹکر سے منحرف ہو جانا کوئی بعید امکان نہیں ہے! سچ تو یہ ہے کہ اِس خوگرِ استبداد اور بندۂ زر سرزمین میں "فاسزم" کا شجرِ خبیث اک خودرو روئیدگی نظر آتا ہے! آج بھی ہر چہار اطراف میں اس ملعون موسم کے تہدید آمیز آثار کافی نمایاں ہیں! مُسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا حقیقتہً مسلمان اور ہندو فاسزم کے زرخرید کارندے ہیں! اِس کنائے کی قرار واقعی تشریح کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو کے اُن مقالات کے پڑھنے کی ضرورت ہے، جن میں اُنھوں نے اِن پرورش پذیر فتنوں کی طرف دعوتِ نظر دی ہے! اُن لوگوں کی بصیرت قابلِ رحم ہے، جو لیگ اور سبھا کو اسلامی طبقۂ امارت اور ہندو مہاجنی ٹولے کے نقیبوں اور سنکھ نوازوں کے سوا کچھ اور سمجھتے ہیں! پونہ کا "شواجی ملٹری اسکول" اور یادش بخیر علی گڑھ (قلعۂ علی"، بزبانِ خواجہ حسن نظامی، لاٹ پادری آل انڈیا فسطائیت!) کا مجوزہ کُلّیۂ حربی مُستقبل کے ہندوستانی فاسزم زیر سایۂ برطانیہ کے "ریماؤنٹ ڈپو" ثابت ہونے والے ہیں! "رین بسیرے" کے "قلعۂ الموت" والا "شیخ الجبل" اپنی مہتم بالشان "خبر کمپنی" کے زیر تجویز اُردو، ہندی، انگریزی اخبارات و جرائد کے ساغروں کی گردش سے اک ہندوستانی رجعت و فسطائیت کا "عرقِ حشیش" بہ پیمانۂ کبیر تقسیم کرنے کے منصوبوں کا بانگِ دہل اعلان کر چکا ہے!

اُس کی زبان کی خوفناک معنی خیزی کا مطالعہ کیجئے! محمدؐ علی جناح کوئی "سید القوم خادمہم" نہیں ہیں "مختار الملک" ہیں! بعض اسلامی ریاستہائے ہند کے اندر اجرائے اصلاحاتِ سیاسی پر اُن کو تنبیہہ کی جاتی ہے! اور بجائے آئینی قسم کے شہریار بننے کے اُن کے سامنے ہٹلر و مسولینی کی جرمنی و اٹلی کا جلال و اقبال پیش کیا جاتا ہے! موجودہ تحریکِ عوامیہ کا تسمیہ "کمین گردی" سے کیا جاتا ہے! اور کانگریس سوشلسٹوں کی سرگرمیوں کو "روسی غلاموں" کی تہ و بالا کرنے والی انقلابی ہلاکت خیزیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے! ــــــــ پھر خود والیانِ ریاست اِن پشت گرمیوں پر جن بلند پروازیوں میں ہیں اُس کا اندازہ اِس امر سے کیجئے کہ اِن میں سے دو ایک تاجداروں نے گزشتہ ایام میں کانگریس کی پیش قدم انقلاب دوست جماعت کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے اک "داخلی مدنی جنگ" (Civil War) کا یہ الٹیمیٹم دیا ہے کہ "اگر ہمارے آبائی و پشتینی حقوقِ شاہانہ کو ٹیڑھی آنکھوں سے دیکھا گیا تو ہم اپنے اقتدار کی بزورِ شمشیر مدافعت کرنے میں بھی قطعاً تامل نہ کریں گے!"

یہ ساری خائف و خون آشام قوتیں "ہندوستانی فیڈریشن" کے مجوزہ نظام کی صورت میں دنیا کی سب سے بڑی عملی فاسسٹ طاقت برطانیہ عظمیٰ کے زیرِ سایۂ عاطفت صف بستہ ہونا چاہتی ہیں! لاریب کہ قانونِ ہند ۱۹۳۵ء کا مجوزۂ ایوانِ دفاق، اِس مُلک میں اک "فاسسٹ گرانڈ کاؤنسل" کا ہم مضمون واقع ہوا ہے! ؏

فتنہ می بارد ازیں طاقِ مُقرنس برخیز!

اک ممکن الوجود ہندوستانی فاسزم کی یہ پوری معرکہ آرائی نہیں ہے! اغیار اور اُن کے خواجہ تاشوں اور حلقہ بگوشوں کے علاوہ "تمام عملی اغراض کے لئے اک "حلیف" کی طرح کی اہم دستگیری خود مجاہدینِ آزادی کے لشکر کی بعض داخلی صفوف سے اِس چیز کو مِل رہی ہے! یہ مُلک کے سارے "بورژوا مُلقے" ہیں جو مخلص کانگریسی ہونے کے باوصف "فاسزم" کی قدرتی فوج ہیں! یہ دولت مندوں اور سرمایہ داروں کا طبقہ ہے، اور اپنی لاعلاج ازلی جماعتی فطرت کے ناگزیر تقاضے سے جنگِ آزادی میں کچھ زیادہ دور تک نہیں جاسکتا! وہ خارجی مُستبدوں کے اِخراج میں پورا ہم آہنگِ احرار ہے لیکن سرمایہ داریت کے شیطانی آئینِ حیاتِ قومی کو مَس ہونے دینا نہیں چاہتا، اور چونکہ معرکۂ آزادی اپنے آخری مراحل میں ہے وہ اب علانیہ اس جدوجہد پر اتر آیا ہے کہ جہادِ حریت کو "معاشی جمہوریۃ" کے آخری ثمرِ شیریں سے بار ور نہ ہونے دے، اس لئے کہ سوشلسٹ نظم و نسقِ مُلک کا نعرہ اُس کی دولت و عشرت و ریاست کے لئے اک "سازِ موت" ہوگا!

سردار پٹیل کا ہری پورہ کے کانگریس پنڈال میں یہ چیلنج کہ "اب میں سوشلسٹوں کو برداشت کرتے کرتے اپنے پیمانۂ صبر کو چھلکتا ہوا پا رہا ہوں!" ہندوستانی "بورژوا" کے ترکِ رفاقتِ جنگ کا وہ مرحلۂ آخریں ہے جبکہ مُلک کی بیخ گیر و سخت جان سرمایہ داری، وطن کی صفوفِ انقلاب کو اپنا مُقدرہ پیامِ "ہذا فراق بینی و بینک" سُنانے پر مجبور ہو رہی ہے! اب وہ اپنے نقابِ فریب کو چاک ہونے سے نہیں بچاسکتی!

اِس عجیب ماجرے میں مہاتما گاندھی کا مُوقف مطالعے کا دلچسپ موضوع ہے! بقول پنڈت جواہر لال کے مہاتما جی اک پیدائشی انقلابی ہیں، اور مظلوم و محروم خلق اللہ کے دلسوز حامی! لیکن وہ کیونزم کے مسلکِ تشدد سے خواس باختہ ہیں اور اربابِ دولت کے "منصبِ امانت داریٔ دولت" کے مُقدس خبط میں مُبتلا! پس اِس آغاز پذیر معرکے میں اُن کی زبردست شخصیتہ کا سارا وزن عملاً "بورژوا عناصر" کے پلڑے میں جاتا ہے، اور نادانستہ اُن کی معاشی خون آشامی کی حمایت کرتا ہے! سردار پٹیل، مہاتما کے فانی فی الشیخ مُریدین، وہ اب سرمایہ نواز کانگریس کے عَلَم کے نیچے ہندوستانی مزدوروں کی اک ہندوستان گیر تنظیم کے علمبردار بن کر میدان میں آگئے ہیں، احمد آباد کے حرفتی مزدوروں کی اک انجمن اُن کے اِدّعا میں مزدوروں کے لئے بہترین ممکن اُسوۂ حسنہ ہے، جو نہ ہڑتال کی عامل ہے! نہ مزدوری و سرمایہ کے درمیان کی "طبقاتی جنگ" کی قائل! گویا ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را!

سردار پٹیل کی معصومانہ خود فراموشی قابلِ دید ہے! غالباً وہ "حاکم و محکوم" کے درمیان کی بھی کسی ناگزیر نقیض کو بھی اب تسلیم نہ کرتے ہوں گے، جس پر اُن کے دیہاتی ستیا گرہ اور اِنکارِ ادائی ٹیکس کے سارے تاریخی یادگار معرکے اپنی تنہا بنیاد و اساس رکھتے تھے! تاہم ہندوستانی سوشلسٹ اِن ابلہ فریبیوں میں آنے والے نہیں، وہ مُلک کے مزدوروں اور کسانوں کی تنظیم و تعلیم کمیونسٹ اصولوں پر جاری رکھیں گے، تاکہ فرض کی پکار پر وہ اسپین کے تلخ تجربے سے دوچار نہ ہوں! ــــــ بلکہ روسی انقلاب

کی تاریخ کے اک ہندوستانی اعادے سے شرفیاب ہوں: ؂

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دُوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک؟

(ا۔ا۔خ)

مُسلم لیگ کا اجلاس کلکتہ!

مُسلم لیگ کا تازہ اجتماعِ کلکتہ عبرتناک شرمناکیوں اور زعفران زار مضحکہ خیزیوں کا اک متکلم و مترنم فلم ہے! حسبِ معمول رَجَز خوانی کی اِس محفل کا افتتاح بھی کانگریس کے خلاف "جہاد باللسان" سے ہوا، اک شیخ چلیانہ نعرہ یہ تھا کہ "مسلم لیگ اس کمسنی میں بھی سَو کانگرسوں کے برابر ہے"! ؂

لرزتا سامنے جوشِ آفتاب آئے گا
جب اِن اداؤں پہ پورا شباب آئیگا!

ضیغمِ اسلام مولٰنا فضل الحق نے اربابِ مُسلم لیگ کی سامعہ خراش و دماغ پاش غوغائیت کا اعتراف فرمایا، لیکن اِس کی وجہِ مُوجِبہ یہ بیان کی کہ ایک ایک لیگی مُسلمان "شیر اور شیرِ ببر" واقع ہوا ہے! ؂

بنگے زدیم و سرِ انا الحق شد آشکار
مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود!

برطانوی حکومت کی کمزوری مسٹر فضل الحق کو ہٹلر اور مسولینی سے بھی زیادہ زار و زبوں نظر آتی ہے! کاش اِس "نپولینِ ہند" کا سایہ اعیانِ انگلستان پر پڑ جائے تاکہ اُن کو کم از کم ایک صدی کی توسیعِ حکمرانی تو اور نصیب ہو جائے! مسٹر چیمبرلین، جنابِ "جلالۃ الملک فضل الحق" سے بزبانِ حال کہہ رہے ہیں کہ ؂

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند؟

عظیم الشان مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس کلکتہ میں اِس کے بعد "پانی پت اور تھانیسر" کے معرکہائے جدال و قتال لڑے گئے اور حسبِ توقع "لیگ ایکٹرز" اِن مُہمات سے بھی مُظفر و منصور عُہدہ بر آ ہوئے! ؂

ذوق! بازیٔ گہِ طفلاں ہے سراسر یہ زمیں
ساتھ بچوں کے پڑا کھیلا کرو یا ہم کو!

اسی طرح وزاتِ بنگال کی "میر جعفری" حکومت کو عالمگیرِ اعظم کی سلطنت بھی فرض کر لیا گیا! ع

بر تمنا ہائے عرفی خندہ می آید مرا!

والسرائے کی طرف سے مہاتما گاندھی کو نیازمندانہ دعوتِ ملاقات دیے جانے پر مسٹر حق بُری طرح خون در جگر ہیں! اور اپنی لو ڈیت کے باوجود اپنی "نظراندازی" کو ناقابلِ برداشت صدمہ محسوس کرتے ہیں! ع

اِس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا؟!

لطف یہ ہے کہ مسجد شہید گنج کے "قضیۂ نامرضیہ" میں تو مسٹر جناح مجسم صلح و آشتی ہیں، لیکن مُسلم لیگ اور کانگریس کی نزاعِ موہوم کو داورِ حشر ہی کے لئے اُٹھا رکھنا چاہتے ہیں! ؂

در کینہ ورزی تفسیدہ وشتے!
در مہربانی بُستاں سرائے!

اک نہایت پُرلطف ماجرا یہ نظر آتا ہے کہ مسلم لیگ کے بڑے بڑے خطیبوں اور آتش خواروں کے "طبلہائے بلند بانگ و از میانِ تہی" اپنی طفلانہ خوش فہمیوں میں شاید یہ سمجھتے ہیں کہ گویا اُنھوں نے ہندوستان کی سرزمین میں یوروپین "فاسزم" اور "نازی ازم" کا قلم لگایا ہے! اُن کے فتنہ جُو و النیلر گویا ہٹلر کے "اسٹارم ٹروپرز" سے کم نہیں! اُن کے برپا کئے ہوئے "ہندو مسلم فسادات" "اسپین کی داخلی جنگ کا مثنیٰ" ہیں! جواہر لال اور مہاتما گاندھی کی طرف سے جناح کو پیاماتِ اتحاد گویا متوازی واقع ہوئے ہیں، مسٹر چیمبرلین و لارڈ ہیلی فیکس کی دلجوئی مسولینی و ہٹلر کے! اور غالباً یو۔پی۔ کے گزشتہ تین انتخابات میں مسلم لیگی کامیابی بالمقابل رکھی جا سکتی ہے، اٹلی و جرمنی کی فتحِ حبش و اسپین و آسٹریا کے! تثلیثِ بمبئی۔ کلکتہ۔ لاہور اتحادِ ثلاثہ "عین مماثل کہا جا سکتا ہے" روم۔ برلن۔ ٹوکیو محاذ" کے! ——— زیرِ ذکر اجلاسِ لیگ میں مولٰنا شوکت علی اور مسٹر فضل الحق کی زبانِ بے ہنگام سے جو چیلنج بیک وقت کانگریس، ہندو قوم، اور والسرائے ہند کی طرف پھینکے گئے ہیں، وہ اِنہی شیخ چلیانہ خوابوں اور جعفر زٹلیانہ ہزلیات کے غماز نظر آتے ہیں! ع

گو تو خوش باش کہ ما گوشِ بہ احمق ندہیم!

(ا۔ا۔خ)

یوروپ!

برطانیہ اور اٹلی کے درمیان کا نوتکمیل "معاہدۂ دوستی" یوروپی سیاسیات کی تاریخ میں اک نئے دَور کا آغاز ہے! ابھی تک انگلستان اپنے کو براعظم کا سرتاج اور عالَم کا سیاسی قطب سمجھتا تھا! یوروپ کی گزشتہ طویل تاریخ نے بھی اُس کے اِس زعم و پندار کی قرار واقعی پرورش کی! اُس نے

فرانس کو مفلوج کیا، نپولین کو سرنگوں کیا۔ عہدِ زار کے روس کو پا بزنجیر کیا، دَوْرِ قیصر ولیم ثانی کے جرمنی کو بیدست وپا کیا، دنیا کے سمندروں پر "ملکۂ بحر" کا پرچم اُڑایا۔ اور اپنی آفاق گیر سلطنت میں "غروبِ آفتاب" کو ناممکن بنا دیا! سابقہ جنگِ عظیم میں اُس کی سربراہی وکامیابی نے اُس کو اپنی معراج کے فلک الافلاک تک پہنچا دیا! لیکن ...... یہ ساری ترقیٔ درجات شاید اُس کی آنے والی اُفتادِ بد کو عبرت انگیز تر بنانے کے لئے ہی تھی! آج برطانیۂ عظمیٰ یورپ میں عملاً اک "دوسرے درجہ کی طاقت ہے!" اُس نے اس سنگ آمد سخت آمد کو انگیز کر لیا ہے کہ وہ دُنیا کے اموالِ غنیمت کے خوانِ یغما پر نوظہور قزاقانِ اقوام کو دعوت دے گی، اور اپنی آئندہ تاریخِ قیصریت میں اپنے اسی موقف کو بسا غنیمت سمجھیگی! ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن ۔۔۔ کہ جاہا سپر باید انداختن!

خود گرم خون ومغرور المزاج فرانس بھی بادلِ ناخواستہ انگلستان کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے! یعنی روما ولندن کے مُعانقہ کے بعد پیرس وبرلن کا بھی مصافحہ ہونے والا ہے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل کی سیاسیاتِ براعظمی وبین الاقوامی میں بجائے انگلستان وفرانس کی جوڑی کے اب انگلستان۔ فرانس، اٹلی اور جرمنی چاروں مل کر دُنیا کی "پولیٹیکل ٹھکرائی" کے منصب کو بحصۂ مساوی تقسیم کر رہے ہیں! اک متعدد ایطالوی مُبصرِ سیاست کا یہ بیان کہ جرمنی کو اب اُس کی نوآبادیات از خود مل جائیں گی، اسی قسم کی معنی خیزی کا حامل نظر آتا ہے! آخر جرمنی کا شکارِ آسٹریا بھی تو مُدبرینِ انگلستان کی خلوتوں میں پہلے سے اک معلومہ راز اور اک منظور شدہ واقعہ تھا! ـــــ انگلستان کی دَلالہ کی سرپرستی میں یہ سارے نئے توڑ جوڑ خدانخواستہ "کمزور اقوام کی حفاظت" کی حماقت کی قبیل سے نہیں واقع ہوئے ہیں! یہاں غایت الغایات خود "اپنی سلامتی" ہے! چنانچہ اسپین کی گلوخلاصی اور وہاں سے ایطالوی افواج کی واپسی اک ستم ظریفانہ فریبِ مہیب ہے، اس لئے برطانیہ واٹلی کے درمیان کے زیرِ بحث معاہدہ پر دستخطوں کی عین ساعتِ سعید میں جنرل فرینکو "جمہوری اسپین" کی تسخیرِ کامل کی تاریخ کا روزنامچہ اپنی نوکِ شمشیر سے لکھ رہا تھا! ـــــ البتہ دیکھنا یہ ہے کہ سفید یوروپ کی ان چاروں (عملاً) فاسسٹ طاقتوں کے جتھے میں "کالا جاپان" کہاں تک شریک ہے! اس امر کا خاصا احتمال ہے کہ یہ جدید ائتلافِ اربعہ اک خالصتہً (Whitemans Club) ہوگا! جاپانی سیاسی حلقوں میں اس معاہدے پر جس تشویش کا اظہار کیا گیا ہے، وہ اسی قیاس کے خاکے کو رنگ بہم پہنچاتا ہے! اگر ایسا ہوا تو اسی میں ضمناً چین کی نجات بھی مضمر نظر آتی ہے: اٹلی وجرمنی کی اخلاقی پُشت پناہی کے خاتمے کے بعد مشرقِ بعید میں جاپان کی "دریدہ دہنی" ایسا مامون مَن مانا کھیل نہ رہے گا! اُس وقت رُوسی ہمدردی ودستگیریٔ چین اک غالب اثر انداز عنصر بن جائے گی! جاپان کی قاہر ضربوں سے "گرانِ خوابِ چینی" بیدار ومستعدِ کار ہو ہی گئے ہیں! ممکن ہے اس نئے نقشۂ بساطِ سیاست میں اُن کی مُدافعانہ زور آزمائی زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہو! کون کہہ سکتا ہے کہ چین کی تازہ جنگی کامیابیاں اسی عہدِ جدید کا فتح باب نہوں! ؎

بہ بینم کہ تا کردگارِ جہاں ۔۔۔ دریں آشکارا چہ دارد نہاں؟!

(ا۔ا۔خ)

مصر!

مصر کی سیاسیات کا موجودہ پلٹا ـــــ جس کے مظہر تازہ انتخاباتِ پارلیمنٹ کے نتائج ہیں! ـــــ اک نہایت پیچیدہ مطالعے کا موضوع نظر آتا ہے! نحاس پاشا کی حاویٔ پارلیمنٹ پارٹی کا ۱۲ کے عدد کے نقطۂ حضیض تک اُتر جانا! حتیٰ کہ خود رئیس حزب الوفد وصدرِ اعظم کا انتخاب میں اُڑ جانا، اور اس المناک شان سے کہ اُن کے زرِ ضمانت تک کا ضبط ہو جانا! نیز "سلطان کی پارٹی" کا فاتحانہ اکثریت میں پارلیمنٹ میں واپس ہونا، حیرت خیز واردات ہیں! معاملے کی اُلجھن یہیں ختم نہیں ہو جاتی! مزید طُرہ یہ ہے کہ "سعدی پارٹی" کے نام سے اک نئی مصری پارٹی معرضِ ظہور میں آئی ہے جو موجودہ پارلیمنٹری تعدادی موقف کے اعتبار سے ایوان کی دوسری سب سے بڑی پارٹی ہے، اور وہ سلطان کی برسرِ اقتدار پارٹی کی پُشت پناہ واقع ہوئی ہے! یہ "سعدی پارٹی" مرحوم سعد زاغلول پاشا کے نام پر قائم ہوئی ہے۔ اور جس کا مقصود یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ سیاسیاتِ مصر میں سعد پاشا اعظم کے مسلکِ حُریت واستقلال کی تجدید عمل میں لائے گی! یہ کیسی سنتِ سعد ہے جو "قصرِ عابدین" کے سیاسی طاغوت، سلطان، کی ہوا خواہ ہے؟! پھر کہا جاتا ہے کہ مصری پارلیمنٹ کی "انڈی پینڈینٹ پارٹی" بھی جملہ اغراضِ عملی کے لئے حکومتی پارٹی کی ہمنوا ہوگی! "وفد پارٹی" کے اندرونی اختلافات اُس کے فوق العادت زوال کی کافی توجیہہ نہیں تسلیم کئے جا سکتے! پولٹیکل پارٹیوں کے

اختلافات، سیاسیات کے صبح و شام کے طبعی احوال ہوتے ہیں، اور یہ چیز کسی جماعت کو آناً فاناً ایسا متزلزل نہیں کر سکتی! پھر سلطانی پوزیشن، مصری سیاسیات میں عرصہ دراز سے اک بیقرار عنصر بن چکی ہے! سلطان مستبدانہ پارلیمنٹ کو فسخ تو کر سکتا ہے اور کرتا رہا ہے، لیکن اک آزاد و عام انتخاب پارلیمنٹ میں اُس نے ہمیشہ منہ کی کھائی ہے! دوسری طرف "حزب الوفد" بھی اپنی گزشتہ سیاسی تاریخ کے سارے پست و بلند میں کبھی اتنی گردش میں نہیں آئی ہے کہ اُس کے سرخیل، اُس کے ممتاز اعیان، اُس کے کابینۂ وزارت کے ارکان، حرفِ غلط کی طرح محو ہو گئے ہوں: جب کہ ملک و ملت سے اک نیا "سینڈیٹ" طلب کیا گیا ہو!—— اور وہ بھی بظاہر مستبد سلطان کے ساتھ اک "آئینی نزاع" کے پیش آنے کی تقریب سے!

ہمارا خیال ہے کہ صورتِ حال کسی قدر اک بالغ نظرانہ اور ژرف نگاہانہ مطالعے کی دعوت دے رہی ہے! اصلی سرچشمۂ فتنہ، وفد پارٹی اور انگلستان کے درمیان کا سابقہ معاہدہ مودّت نظر آتا ہے! یہ معاہدہ اک سیاسی "سودے" سے زیادہ تو بہرحال نہیں ہو سکتا تھا، تاہم اُس کے وہ شرائط جن کے تحت بصورتِ جنگ، مصر برطانوی افواجِ قاہرہ کی پامال جولانگاہ بن جائے گا، اور جس ذلت آفریں ہنگامہ خیزی کے لئے اُسے جدید سڑکوں، ریلوے لائنوں، فوجی مستقروں، اور ہوائی اسٹیشنوں سے خود مصر کے اہتمام و مصارف سے آراستہ کیا جانا طے پایا تھا (اور جس پر بلاشبہ عمل درآمد بھی شروع ہو گیا تھا) اِن سب چیزوں نے رئیس وفد نحاس پاشا کی حکومت کے خلاف "وادیٔ نیل" کی ہوا کو یکسر بدل دیا! غیور ارکانِ حزب الوفد اک اضطراب سا محسوس کرنے لگے اور شاید اپنی "سیاسی خوارج" سے جدید الفیام "سعدی پارٹی" کا ساز و برگ بہم پہنچا ہے! تاہم سلطانی پارٹی کا اس ہنگامہ آرائی میں شرکت کرنا، اور مصر کے استقلال خواہ اور ترقی دوست عناصر کے ساتھ صف بصف استادہ ہونا، بلکہ اُن کی قیادت و ریاست کا منصب حاصل کر لینا، یہ اک اور عُقدہ ہے جو حل طلب رہ جاتا ہے۔ دراصل اسی گتھی میں اصل کلیدِ معاملہ چھپی ہوئی ہے! اغلب گمان یہ ہے کہ اس میں مسولینی کی ریشہ دوانی کارفرما ہے! اُس نے احرارِ مصر اور سلطانِ مصر ہر دو کے لئے اک اک اہم و دلکش پیشکش نذر کی۔ اول الذکر کے لئے انگلستان کے پنجۂ گلوگیر سے مخلصی، اور آخر الذکر کے لئے مصر کی تاریخی "ارضِ خلافت" کی سربلندی زیرِ سایہ خاندانِ شاہی! "فاسزم" کا یہ عنصر اُس کی مشہور روح الروح ہے! پھر چونکہ مسولینی اپنے اُمیدواروں کی بیباک پشت گرمی کے لئے تیار ہو گیا ہو گا، اور انگلستان نے نحاس پاشا کے ہاتھ مضبوط کرنے میں اپنی معمولی سُست رگی کا ثبوت دیا ہو گا، اس لئے پارلیمنٹری نتائج وہ پیدا ہوئے جو پیدا ہوئے: برطانوی سفیر متعینۂ قاہرہ کے ساتھ نحاس پاشا کی حالی کی بصیغۂ راز ملاقاتیں شاید اپنی عبرتوں کو اپنا موضوعِ ذکر و فکر بنا رہی ہیں۔　　(ا۔ا۔غ)

نقد و نظر!

ادارہ

طرحِ نو! عام رسالجاتی قامت، ۴۸ صفحات ضخامت، کتابت و طباعت (علی الترتیب) خوشخط و صاف، کاغذ سفید عام گیٹ اَپ خوشنما و باسلیقہ، لوحِ نو بنو، چندہ سالانہ تین روپے، مقامِ اشاعت، اُردو بک اسٹال، بیرون لوہاری گیٹ۔ لاہور،

"طرحِ نو" پر تنقید کرنے میں ہمیں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔ ہمارا خیال ہے کہ اربابِ رسالہ سے معذرت خواہی سے بھی اس کی کافی تلافی نہ ہو گی! پس ہم "عذرِ گناہ" کے ذریعے کسی "بدتر از گناہ" غلط کاری کا ارتکاب کرنا نہیں چاہتے، اور اپنے اِس تساہل کو اُس کے اپنے ہی معتقد کے رحم پر چھوڑ کر، اپنے تعویق زدہ فرضِ تنقید کو ادا کرنے میں عجلت کرتے ہیں!——

ز شکوہ ہائے جُدائی شود جدائی طویل بہ زبانِ کوتہ و دستِ درازمی خواہم!

"طرحِ نو" بلاشبہ اسم بامسمّٰی ہے! اُس کے مضامین و مقالات اور افسانوی ادبیات صاف صاف ترجمانِ ہیں، اک ترقی پسند نظریۂ ادب کے، حیات پرور تحریرات کے، اور انقلاب نواز نگارشات کے! پنڈت جواہر لال نہرو کا "طرحِ نو" کے مُدیر کے نام یہ استقبالی پیام کہ "میں آپ کے رسالے کا خیر مقدم کرتا ہوں" باوجود مختصر ہونے کے "از دل خیزد و بر دل ریزد" والا معنی و پر معنی لب و لہجہ رکھتا ہے! بیشتر مضامین بھی اِس قابلِ رشک استحقاق کے شاہدِ عادل ہیں! (ہمارے پیشِ نظر "طرحِ نو" کا فروری نمبر ہے!) لیکن رسالے کے شذرات (بعنوانِ "ایوانِ افکار") میں ایک جگہ شاہین بچوں کو خاکبازی کا درس دینے والے "خداوندانِ مکتب" کی "شکایت" سے متعلق "علامہ اقبال" کے

اک قول کا حوالہ ہمیں کچھ خوش نوا مسموع ہوا! ہندوستان کی سیاسیات میں اب وہ دَور ختم ہو رہا ہے کہ ایک پولیٹیکل پارٹی کا "مینی فیسٹو" اک دوسری حریف جماعت کا کوئی نفسِ ناطقہ ترتیب دیا کرے۔

اِسی طرح "طرحِ نو" کے سیاسی نشان ـــــ تصویرِ شمع ـــــ کے نیچے یہ مصرع کہ

"طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم"

لکھنا کچھ اچھے کلمات تعبیر نہیں! انقلاب اور ادبِ انقلاب محض "اشتیاقِ مذاق" جدت پسندی سے بمراحل بلند تر و متین تر واقع ہوا ہے! اُس کا مقصود کسی "حیرت خانۂ امروز و فردا" کی بھول بھلیاں سے مخلصی نہیں، "دامگاہِ استبدادِ سیاسی اور" عذاب کدۂ بیدادِ معاشی سے نجات ہے! ـــــ اگر رسالے کے نام "طرحِ نو" کی لفظی رعایت ہی ایسی ناگزیر ضرورت تھی تو اِس زیرِ بحث مصرعے کا کہیں بہتر نعم البدل یہ مصرع تھا کہ ع

فلک را سقف بشگافیم و "طرحِ نو" دراندازیم!

اخبارات و رسائل کی پیشانی پر اِس قسم کے اشعار یا آیات کا لکھنا جن کی ترکیبِ لفظی سے کسی جگہ متعلقہ اخبار یا رسالے کا نام ٹپک پڑے، ہماری اُردو اسلامی صحافت کی ایک سُنتِ مؤکدہ بن گئی ہے! بعض موقعوں پر تو اِس صنعتِ ادبی کا خواہ مخواہ التزام پُرلطف "بدحواسیاں" پیدا کیا کرتا ہے! یادش بخیر پنجاب کا جریدۂ فریدہ، "انقلاب" (لاہور) شاید اِس کی سب سے زیادہ مضحکہ خیز اور عبرت انگیز مثال ہے! غالی سیاسی رجعت کی یہ "پوٹ" جس کا نام "انقلاب" رکھا گیا ہے، اپنے اس "برعکس تسمیہ" میں کیا اس حقیقت کی مصداق نہیں کہ ع

برعکس نہند نامِ زنگی کافور!

مگر آخری ستم ایجادی یہ ہے کہ "انقلاب" اپنی "سیمائے صبیح" پر قرآن مجید کی یہ جلالی آیۂ قاہرہ لکھنے سے بھی نہیں شرماتا کہ "سیعلمو االذین ظلموا ای منقلب ینقلبون"! ـــــ قرآن کا یہ اعلان خود غلط کار و باطل کوش "دشمنانِ انقلاب" کے نام اک چیلنج تھا جس میں اُن کو یہ صدائے غفلت شکن رسید کی گئی تھی کہ وہ "اسلام کی تحریکِ حق کے خلاف اپنی ساری کوششیں اور کاوشیں صرف کر ڈالیں! بہت جلد وقت کا حکمِ ناطق یہ فیصلہ کر دے گا کہ "جوابی انقلاب" کے اِن قسمت آزماؤں کی اُلٹی آنتیں گلے پڑ جائیں گی!"

سیاسی و ادبی مقولوں کے انتخاب کی اِس تقریب سے ہم نے جو طویل ولاطائل جملۂ معترضہ چھیڑ دیا، ہم اُس کی قابلِ اعتراض نوعیت کو محسوس کر رہے ہیں! لیکن ہمارا یہی عذر ہے (بشرطیکہ وہ قابلِ قبول ہو) کہ ع

شنیع بود حکایت شدید تر گفتم!

ہاں باز آمدیم بر سرِ مطلب! رسالہ "طرحِ نو" اپنے مواد و منظروفات کے اصلی معیار کی روشنی میں غالباً اک درجۂ اول کا انقلابی صحیفہ ہے! خود مُدیر "طرحِ نو" اک خوشگو شاعر ہیں، اور اک انقلابی ادیب! رسالے کے اندر جا بجا اُن کی نظمیں "طرحِ نو" کی نثری تحریرات کی عام گرمی کو "سُرخ شراروں" میں اُڑانے لگتی ہیں! ہم جناب سراج الدین صاحب ظفر، بی۔اے کو پنجاب کی سیاسی طور پر "شور زمین" سے ایسا گُلِ صحافت و ادبیت نکالنے پر گرمجوش مبارکباد دیتے ہیں! "طرحِ نو" نسلِ نو کے ایک ایک فرد کے مطالعے کی ناگزیر چیز ہے!

(ا۔ا۔خ)

واقف ہوں، یہ خونابہ فشانی کس لیے ہے
یہ شیون و آہ و نوحہ خوانی کس لیے ہے
ہر سعی و عمل ہے زندگانی کے لیے
[illegible] کہ زندگانی کس لیے ہے

[illegible]

افسوس کہ کوئی کام ہوتا ہی نہیں
جب تک ہے یہاں قیام ہوتا ہی نہیں
سننے والے تمام ہو جاتے ہیں
افسانۂ غم تمام ہوتا ہی نہیں

[illegible]

ادب لطیف کا افسانہ نمبر
افسانہ نگاری پر لاجواب تنقیدی مقالات ——— فن افسانہ کے ہر پہلو پر گرانمایہ مضامین
دکھی زندگیوں کی اشک افشاں کہانیاں ——— مسرور ہستیوں کے مسکراتے ہوئے افسانے
مغربی شاہکار افسانوں کے کامیاب تراجم ——— روح پر وجد طاری کرنیوالی منظوم داستانیں
دلپذیر تصاویر!
شاندار گیٹ اپ!!
"ادب لطیف" کا افسانہ نمبر حقیقتاً
اردو کے افسانوی ادب میں ایک دلآویز اضافہ ہے
ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف ۱۲ر
اگر آپ یہ افسانہ نمبر اور ضخیم سالنامہ مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی تین روپے چار آنے بھیجکر خریدار بن جائیے
مقامِ اشاعت
مکتبہ اردو - ۱۵ - سرکلر روڈ - لاہور
مشتہرین حضرات کے لئے نایاب موقع ہے جلد اشتہار دیکر فائدہ اٹھائیں
اصغر علی شاہ
کاتب - لاہور

مطبوعات ۳۸ء

دلّی کا سنبھالا تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز۔ خواجہ محمد شفیع دہلوی نے دہلیٔ مرحوم کی داستانِ الم، اس کے ایام عروج کی مرقع نگاری، صاحبانِ کمال کا تذکرہ اس ٹکسالی زبان میں کیا ہے، جواب نابود ہے۔ انداز بیان ایسا موثر کہ دل بے اختیار ہو جاتا ہے، کتابت، طباعت اور تجلید کے لئے مکتبہ کا نام کافی ہے۔ صفحات ۱۵۵۔ قیمت فی جلد عہ

لطائفِ غالب مسٹر ایم۔ لے۔ شاہ۔ پی۔ ایس۔ سی۔ الیف۔ پی۔ اے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شوخیٔ بیان، خوش طبعی اور ظرافت سے محظوظ ہونے کے لئے اسے ضرور پڑھئے۔ قیمت عہ

شعلۂ طور "طبع ثانی" شاعرِ فطرت حضرت جگر مراد آبادی کے کلام کا مجموعہ، جو حضرات شعلۂ طور پر ایک دفعہ بھی اُچٹتی ہوئی نظر ڈال چکے ہیں وہ اُسے اس طرح لئے پھرتے ہیں جیسے کہ لوگ زمانۂ انقلاب فرانس میں "معاہدۂ عمرانی" لئے پھرتے تھے، اس ایڈیشن میں چند نئی ساحرانہ غزلوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ بالکل نئی ترتیب، از حد دیدہ زیب، ہیچ رنگی سنہرا کور، اور جگر کی ایک بے نظیر تصویر۔ قیمت ع۶

سبدِ چین مرزا غالب کے کیاب بلکہ نایاب فارسی کلام کا مجموعہ۔ اس میں قصائد۔ قطعات، مثنویاں۔ ترکیب بند۔ ترجیع بند۔ غزلیات اور رباعیات، سب کچھ شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مرزا غالب کی مکمل سوانح حیات اور تصنیفات کا تذکرہ بھی شامل کر دیا گیا ہے قیمت ۱۲؍

ذکرِ غالب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی مکمل سوانح حیات، اب تک مرزا صاحب کی سوانح حیات پر یادگارِ غالب۔ غالب اور غالب نامہ چھپ چکی ہیں، لیکن اس کے باوجود غالب کی زندگی کے بہت سے ایسے پہلو تھے جو تاریکی میں تھے، چنانچہ اس کتاب میں تمام ممکن ذرائع سے معلومات فراہم کرکے غالب کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ غرض یہ کتاب اتنی جامع اور مختصر ہے کہ شعر و ادب کا ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے عموماً اور یونیورسٹی کے طلبا کے خصوصاً از بس مفید۔ قیمت ۸؍

قرآن پاک کیا ہے اور اُس نے کیا کر دکھایا؟ یہ کتاب بچوں کی نفسیات، شعور اور استعداد کو مدِ نظر رکھ کر آسان زبان میں لکھی گئی ہے، قرآن پاک آنحضرت پر کس طرح اترتا تھا، آپ کس طرح لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ کیسے اس کی حفاظت آپؐ نے اور آپ کے بعد صحابہ کرام نے کی۔ اور کیسے اُس نے لوگوں کے دلوں پر اثر کیا۔ بہت مفصل، مع مثال قیمت ۶؍

دلّی بچوں کے لئے دہلی کی خاص عمارتوں کا دلچسپ بیان۔ جس کے پردے میں دہلی کی مختصر تاریخ بتا دی گئی ہے۔ بلاک کی چھ تصاویر، اُجڑی اور بسی ہوئی دہلیوں کے دو نقشے۔ قیمت ۴ہر

مکتبہ جامعہ

دہلی — نئی دہلی — لاہور

کلیم دہلی
۷۳۴
مئی
شائع ہو گیا!
نوید بہار
شائع ہو گیا!
کیا؟
ہفتہ وار اخبار گلفروش دہلی کا افسانہ نمبر
اس خاص نمبر کے تمام افسانے جناب سید محمود صاحب مورخ نے لکھے ہیں، حیرت انگیز، لرزہ خیز، معاشرتی، اصلاحی، سائنٹیفک اور رومانی افسانے
ان کے ساتھ ہی اردو کے بہترین رومانی شاعر حضرت اختر شیرانی کی زندہ جاوید نظموں کا مطالعہ کیجئے۔ ضخامت چالیس صفحات۔ قیمت صرف ۲ر آنے
ایک رعایت
ہفتہ وار اخبار گلفروش دہلی ایک کامیاب اور کثیر الاشاعت اخبار ہے۔ اس کا سالانہ چندہ مبلغ تین روپے آٹھ
آنے ہے۔ مگر جو صاحب ۳۱ر مئی تک خریداری قبول فرمادیں گے اُن کے نام دو روپے آٹھ آنے سالانہ میں
جاری کر دیا جائے گا۔ اور مذکورہ بالا افسانہ نمبر کے علاوہ ۱۵ر مئی کو شائع ہونے والا جوش نمبر اور ۳۱ مئی کو شائع ہونے والا افسانہ نمبر بھی بالکل
مفت ملیں گے۔ اس لئے آج اپنا چندہ بھیجکر خریدار بن جائیے۔ کیونکہ دیر کرنے سے ممکن ہے کہ افسانہ نمبر ختم ہو جائے اور آپ کو نہ مل سکے۔
نمونہ کی کاپی مفت منگوائیے
منیجر ہفتہ وار اخبار گلفروش دہلی
نئے سال کا بہترین تحفہ
حقیقت نگار علی عباس حسینی کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ
آئی - سی - ایس
طبع ہو گیا
قیمت صرف ایک روپیہ عہ
ملنے کا پتہ
انڈین پریس الہ آباد
برانچ آفس: کلکتہ — پٹنہ — بنارس — لکھنؤ — لاہور
ادارۂ ادبیات اُردو کا مصور دلچسپ ادبی رسالہ
سب رس
زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
پروفیسر جامعہ عثمانیہ
زیر ادارت
صاحبزادہ میکش دعثمانیہ
سالانہ چندہ
چار روپے آٹھ آنے
نمونہ کا پرچہ
سات آنے
ملنے کا پتہ
خواجہ حمید الدین مہتمم "سب رس"
مغنت منزل، خیریت آباد، حیدرآباد۔ دکن

وہ دوائیں جن کا بنانا میں نے دیر سے شروع کیا ہے
جمیلان
عالیجناب مسیح الملک حکیم جمیل خان صاحب سرپرست ہندوستانی دواخانہ دہلی کا
وہ نسخہ جس سے ۲ لاکھ مریضان جریان کو ابتک آرام ہوچکا ہے
جریان کا نتیجہ کیا ہے؟ دل و دماغ و جگر کا کمزور ہوجانا۔ ہاضمہ کا بگاڑ، حافظہ کی خرابی، ہمت کی پستی طبیعت کی سستی۔ اولاد سے محرومی، جوڑوں کا درد اور عام ناتوانی، پھر رفتہ رفتہ مالیخولیا یا جنون یا کوئی سخت بیماری، مثلاً دق وسل وغیرہ۔ اگر آپ کو جریان کی شکایت ہو تو فوراً توجہ کیجئے آج ہی اس بیش بہا اور کامیاب دوا کا استعمال شروع کردیجے
جمیلان مرض جریان کی بہترین اور کامیاب ترین دوا ثابت ہوچکی ہے۔ جس سے اب تک دو لاکھ بیماروں نے فائدہ اٹھایا ہے، جریان چاہے پرانا ہوچکا ہو یا نیا ہو ہر حالت میں اس سے فائدہ ہوجاتا ہے، رفتہ رفتہ دل و دماغ کی کمزوری اور اعضا کا اضمحلال دور ہوکر تندرستی اصلی حالت پر آجاتی ہے، قبض پیدا نہیں ہوتا۔ بھوک خوب لگتی ہے، غذا اچھی طرح ہضم ہوتی ہے۔ اور زرد چہرے پر سرخی جھلکنے لگتی ہے
جریان کی دواؤں میں
جمیلان سب سے بہتر ثابت ہوئی ہے
ترکیب استعمال
دو قرص۔ صبح دودھ کے ساتھ استعمال کریں۔ ترشی، تیل، گڑ اور ثقیل چیزوں سے پرہیز
قیمت
فی شیشی ۳۲ گولیاں
چار روپے آٹھ آنے
ملنے کا پتہ
ہندوستانی دواخانہ دہلی
نوجیون
جل جلان
قیمت ۵۰ قرص بارہ آنے
طلاء عجیب
قیمت فی شیشی ۲ ماشہ چار روپے
طلاء زود اثر
قیمت فی شیشی ایک ماشہ بارہ آنے
قرص عجیب
حب ممسک مشکی

بنامِ قوّت و حیات

کلیم دہلی

منظور شدہ

ڈائرکٹران تعلیم

ریاستہائے میسور ۔ پٹیالہ و حیدرآباد دکن

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم

آ گے گئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

سہ ماہی چندہ دو روپے
قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد ۵ — فہرست مضامین رسالہ کلیم بابتہ جون سنہ ۱۹۳۸ عیسوی — نمبر ۶

(جوش ملیح آبادی ایڈیٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر کلیم واقع [illegible] نمبر ۴ دریا گنج دہلی سے شائع کیا)

اشارات

مدیر

ایک صحیح ترین پیش گوئی

ہر پیش گو کی یہ دلی تمنّا ہوتی ہے کہ اُس کی پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہو — لیکن بعض اوقات حالات کی نوعیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ پیش گو یہ تمنّا کرتا ہے کہ اُس کی پیش گوئی کا ایک جزو بھی صحیح نہ ہوسکے۔

لیگ اور کانگریس کی مصلحت کے واسطے اِس وقت جو گُفت وشنُود کا سلسلہ جاری ہے، اور جس کے باب میں خوش عقیدہ حضرات بہتر توقعات قائم کئے ہوئے ہیں، اُس کے بارے میں میری یہ پیش گوئی ہے کہ یہ مصالحت کی تمام گُفت وشنُود قطعی بے نتیجہ، اور یہ اتحاد کے تمام مساعی کُلّیتہً غیر مشکور رہیں گے۔ اور ہرچند کہ میں جانتا ہوں کہ جو کچھ میں کہ رہا ہوں، حرف بحرف ایسا ہی ہوگا۔ پھر بھی میری یہ دلی آرزو ہے کہ کوئی لطیفۂ غیبی ایسا پیدا ہوجائے کہ میری یہ پیش گوئی ہر صورت سے جھُوٹی ثابت ہوکر رہ جائے۔

میری اس پیش گوئی کی بُنیاد معاذ اللہ یہ نہیں ہے کہ میں لیگ و کانگریس کے اتحاد کا حامی نہیں ہوں، اور خدا نخواستہ یہ چاہتا ہوں کہ ان دونوں جماعتوں کے درمیان کبھی صُلح نہ ہوسکے۔ کیونکہ ان دونوں جماعتوں کے درمیان عدمِ اتحاد کی وہی آرزو کرسکتا ہے جس کا دل و دماغ غدّاری کے مرض سے ماؤف ہوچکا ہے ——— نیز میری اس پیش گوئی کی بُنیاد یہ بھی نہیں ہے کہ میں سُوءِ ظن کا مریض ہوں، اور میرا دماغ اچھے خیالات کی روشنی سے محروم ہے، کیونکہ میں اپنی زندگی میں ہر قدم پر اس کا تجربہ کرچکا ہوں کہ میری سرشت کو حُسنِ ظن کی اِتنی کثیر مقدار ودلیعت کی گئی ہے کہ جب تک کسی شخص کی بُرائی دو اور دو چار ہوکر میرے سامنے نہیں آجاتی ہے میں اُس کے متعلق بُری رائے قائم کرنے کے تمام تصوّرات سے رُوگرداں ہی رہتا ہوں۔

اصل میں میری اِس پیش گوئی کی بُنیاد ہے (الف) لیگ کے "قایدِ اعظم" مسٹر جنّاح کی ذات، اور (ب) مُسلم لیگ کے اربابِ حلّ وعقد کی ذہنیّت۔

(الف) لیگ کے "قائدِ اعظم" مسٹر جناح کی ذات:-

مسٹر جنّاح کی ذات، ہندو مسلم مصالحت کی راہ میں سب سے بڑا پہاڑ ہے۔ کیونکہ مسٹر جنّاح کے خمیر میں یہ بات داخل ہے کہ وہ زندگی کی ہر منزل، اور حیات کے ہر میدان میں سب سے آگے اور سب سے پیش پیش رہیں۔ اور اِس قدر پیش پیش رہیں کہ اُن کے رفتار میں سے کوئی اُن کی گرد کو بھی نہ پہونچ سکے۔ بہ الفاظِ دیگر مسٹر جناح ہر حلقے میں ایک دیوتا بن کر رہنا چاہتے ہیں، اور دیوتا بھی ایسے جو "وحدہٗ لاشریک لہٗ" سے کم پایے کا نہو۔

ظاہر ہے کہ یہ بلاشرکت، وحدت، اُنھیں کانگریس کے حلقے میں میسر ہی نہیں ہوسکتی، کیونکہ کانگریس کے معمولی والنٹیر بھی اس قدر قربانیاں

کر چکے ہیں کہ مسٹر جناح اُن تک کے سامنے جھکنے اور اُبھرنے کا خواب نہیں دیکھ سکتے ــــــ اور جب صورتِ حال اس درجہ یاس انگیز ہے تو مسٹر جناح اپنی فطرت پر اِس قدر ظلم کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں کہ وہ لیگ و کانگریس میں مصالحت کرا کے اپنے اُس "قائدِ اعظم" کے خطاب کو جو سادہ لوح مسلمانوں نے اُنھیں بخشا ہے، ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے محو ہوجانے کے خطرے میں مبتلا کردیں۔

مسٹر جناح اِس راز سے بخوبی واقف ہیں کہ اُن کی تمام تر لیڈری مُسلم لیگ کے قیام سے وابستہ ہے۔ اِدھر مُسلم لیگ ختم ہوئی، اُدھر اُن کا سیاسی اقتدار بھی فنا ہو جائے گا ــــــ مسٹر جناح خوش قسمتی سے ہندوستانی ہیں، اور ہندوستانیوں میں ہنوز ایسے دیوانے بہت ہی شاذ ہیں جو اپنے شخصی مفاد پر اپنی پُوری قوم کو بھینٹ چڑھا دینے پر آمادہ نہیں ہوتے ہیں۔

یہاں تو اِس ضرب المثل پر عمل ہوتا ہے کہ مُردہ دوزخ میں جائے کہ جنّت میں، یاروں کو اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔

"کلیم" میں اِس سے پیشتر بھی اِس موضوع پر متعدد بار لکھا جا چکا ہے، اور ایک اشاعت میں کانگریس کو یہ مشورہ بھی دیا جا چکا ہے کہ وہ اتمامِ حُجت کی خاطر لیگ کے تمام مطالبات ایک سانس میں منظور کرلے، اور تمام مطالبات کو منظور کرکے یہ تماشا دیکھ لے کہ لیگ پھر بھی اتحاد پر آمادہ نہیں ہوگی، اور جلدی جلدی اپنے غیر معمولی اجلاس منعقد کرکے ایسے بیشمار جدید مطالبات پیش کردے گی جنھیں کوئی معقول جماعت قبول نہیں کرسکتی ہے ــــــ چنانچہ یہ بات اس وقت حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہی ہے، اور مسٹر جناح کے چودہ نکات پر سر دست سات جدید نکات کا اضافہ ہو چکا ہے ــــــ اور اِن جدید نکات کے بعد بھی جناح صاحب بغلیں جھانک رہے ہیں، اور اپنے خلوتیانِ راز سے مشورت کی خاطر ایک ماہ کی مُہلت طلب فرما چکے ہیں۔

(ب) لیگ کے اربابِ حلّ و عقد کی ذہنیت: ــــــ سو اِس باب میں زیادہ خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں ــــ ہر وہ شخص جو کلیتہً عقل و ادراک سے محروم نہیں ہے۔ اِس عُریاں حقیقت تک بہ آسانی پہونچ سکتا ہے کہ لیگ کے اربابِ حلّ و عقد کس شرمناک ذہنیت کے صیدِ زبُوں واقع ہوئے ہیں ــــــ لیگ کے اربابِ حلّ و عقد کا پہچاننا ذرا بھی دشوار نہیں ہے، اِس لئے کہ اِن سب کے ماتھوں پر سائن بورڈوں کی سائز کے لیبل چسپاں نظر آرہے ہیں اور اُن کے حروف اِس قدر جلی ہیں کہ ضُعفِ بصارت کے مریض بھی اُنھیں عُریاں آنکھ سے پڑھ سکتے ہیں ــــــ اُن کے لیبلوں کی عبارتیں ملاحظہ ہوں۔

"جاگیردار" "راجہ صاحب" "خان صاحب" "خان بہادر" "سر" اور "رائٹ آنریبل"

کیا ہندوستان کے مسلمان اب اِس درجے کو پہونچ چکے ہیں کہ اِتنی موٹی بات بھی اُن کی سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ جناح کا ساجاہ پسند اور ...... اصحابِ جناح کے سے خطاب یافتہ اُن کے کسی کام نہیں آسکتے، اور "اسلام زندہ باد" کے نعروں کے ذریعے سے اُنھیں ایک ایسے ہولناک غار کی طرف ہانکا جارہا ہے، جہاں پُرانی تباہ شدہ قوموں کی ہڈیاں پُکار پُکار کر کہہ رہی ہیں کہ خدارا اِس طرف نہ آنا کیونکہ یہ وہ غار ہے جس میں ایک بار گر جانے کے بعد پھر کوئی آج تک اُبھرا نہیں ہے۔

میں اِس سلسلے میں ایک بات اور عرض کردوں تو مناسب ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو معلوم ہے کہ مسٹر جناح اور سوبھاش چندر بوس وغیرہ میں کانگریس و لیگ کے درمیان مصالحت کی گفتگو ہو رہی ہے اور معاملات کو طے کرنے کی خاطر مسٹر جناح ایک ماہ کی رخصت حاصل فرما چکے ہیں ــــــ اس رخصت کے اختتام پر حرف و حکایت کا سلسلہ پھر چھڑے گا، اور اُن دو صورتوں میں ایک صورت طے ہو جائے گی، یعنی یا تو کانگریس اور لیگ میں اتفاق ہو جائے گا یا صلح نہ ہوگی اور نااتفاقی باقی رہے گی۔ اگر خدانخواستہ دوسری صورت پیش آئی تو اُس وقت کم سے کم تعلیم یافتہ اور سیاست آشنا مسلمانوں کا یہ فرض ہوگا کہ وہ عدمِ مصالحت کے اسباب پر غور کریں اور دیکھیں کہ خطا کس فریق کی ہے۔ اگر مسلمان ایسا کریں گے تو میں دعوے کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور اربابِ لیگ کی شخصیتیں اُس وقت اس درجہ برہنہ ہوکر اُن کے سامنے آجائیں گی کہ وہ لیگ کے فریب میں ایک لمحے کے واسطے بھی مبتلا نہیں رہیں گے، اور کانگریس کی طرف کارواں در کارواں کوچ

کرکے آزادی کی دشمن طاقتوں کے خلاف ایک ایسا متحدہ محاذ قائم کریں گے کہ دیوِ استبداد کے مُنہ سے خُون کا فوّارہ جاری ہو جائے گا۔

پروفیسر محمود شیرانی

آدمی جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اُس کے علم پر جوانی آتی ہے، علم کی دیوی کا مزاج، تمام عالم کے حسینوں سے مختلف و متضاد واقع ہوا ہے، ہر حسین دیوی نوجوان کے آغوش کی طالب ہوتی ہے۔ مگر علم کی دیوی نوجوانی کو حقارت کے ساتھ دیکھتی ہے، اور پیرانہ سالی کے آغوش کو ترجیح دیتی ہے۔ میر انیس مرحوم نے اسی حقیقت کو یُوں بیان کیا ہے:-

گھٹا زور، مشقِ سخن بڑھ گئی
ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا

علم کے منبر سے کسی شخص کو اس عُذر کے ساتھ اُتار لینا کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے ایک نہایت خطرناک قسم کی جہالت ہے۔ اور یہ وہ جہالت ہے جس کا مظاہرہ پنجاب یونیورسٹی کر رہی ہے۔

سُننے میں آیا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی ہندوستان کے مایۂ ناز ادیب اور مستند فاضل پروفیسر محمود شیرانی کو اس مضحکہ خیز علت پر وظیفہ دے رہی ہے کہ وہ پچپن سال کی زد میں آگئے ہیں۔

کیا کالج کی پروفیسری، کوئی پولیس یا فوج کا محکمہ، یا پہلوانوں کا اکھاڑہ ہے، جہاں جسم کی فربہی اور عُمر کی نارسیدگی ہی سب کچھ سمجھی جاتی ہے؟

پنجاب یونیورسٹی کو معلوم نہیں کہ علم کا پارہ، ماہ و سال کی گرمی سے چڑھتا ہے، اور جس قدر عُمر بڑھتی ہے اُتنا ہی علم میں اضافہ ہوتا اور تجربہ بڑھتا جاتا ہے ـــــ کیا اُسے یاد نہیں کہ براؤن کو پیرانہ سالی میں پروفیسری پیش کی گئی تھی؟ اور کیا پنجاب یونیورسٹی کو علم نہیں کہ نوجوان بی اے، ایم اے، اور نوسال پی ایچ، ڈی، ہرگز اس قابل نہیں ہوتے کہ پروفیسری کی سی اہم ترین خدمت انجام دے سکیں۔ کیا وہ پروفیسری کو ایسا سمجھتی ہے کہ مُرغی کا بچہ انڈا کھٹک کر باہر نکلا، اور فوراً دانہ چُگنے لگا؟

میرا یہ مدّعا نہیں کہ عُمر کی بنا پر کسی پروفیسر کو وظیفہ نہ دیا جائے، لیکن جب تک کسی پروفیسر کی آنکھوں میں روشنی، ہاتھ پاؤں میں چلنے پھرنے کی سکت اور دماغ میں تدبّر و تفکّر کی قوّت باقی ہے۔ یا بالفاظِ دیگر جب تک کوئی پروفیسر جسمانی حیثیت سے ٹھٹھیا نہیں جاتا، اُسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ کام کرتا رہے۔ اور اُسی وقت تک کام کرتا رہے جب تک کہ قدرت اُس سے کام کرنے کی صلاحیت نہ چھین لے۔

پروفیسر کوئی پھل نہیں کہ جیسے ہی وہ پُختہ ہو جاتا ہے، شاخ سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے؟

اِس لئے ہم نہایت روشن، گرم اور گرجتے ہوئے الفاظ میں پنجاب یونیورسٹی کو آگاہ کرتے ہیں کہ وہ یونیورسٹی کو پروفیسر محمود شیرانی کے علم اور تجربے سے محروم کرکے ایک ایسی جہالت کا ارتکاب نہ کرے، جس پر بے علمی بھی قہقہے مار سکتی ہے۔

ڈر ہے کہ نہ تلخ زندگانی ہو جائے
تمہیدِ الم نشاطِ فانی ہو جائے
ہاں بارِ عیش سے خدارا بچیے
ممکن ہے کہ کل عدوِ جانی ہو جائے

جوش

ظاہر میں کدورت ہے صفائی ہے یہی
ٹھکراتا ہے دل کو دلربائی ہے یہی
بیگانہ روی پہ ناز ہے کسی کا
نادان! یہی تو آشنائی ہے یہی

جوش

فیضی پراچہ

موجودہ دورِ رقم میں جبکہ انسانیت رقم کی محتاج محض ہوکر رہ گئی ہے، رقم کی حقیقت و ماہیت پر فکر و غور، اور اس کی ابتدائی وارتقائی ہئیت کو جاننا ضروری ہے۔ موجودہ وقت میں رقم چار شکلیں اختیار کر چکی ہے، اور یہ چاروں زیرِ عمل ہیں۔

رقم دھات۔ سکے۔ سونا۔ چاندی۔ پیتل۔ تانبا۔ لوہا وغیرہ

رقم وقار۔ شہنشاہی نوٹ۔ ڈاکخانے کے سرٹیفکٹ۔ حکومتی قرضہ بانڈ وغیرہ۔

رقم اعتماد باہمی۔ چیک۔ ہنڈوی، بینک نوٹ۔ اسناد تبادلہ وغیرہ۔

رقم پیداوار۔ غلہ۔ روئی۔ کوئلہ۔ تیل۔ مصنوعات وغیرہ

نمبر ۱۔ رقم دھات کی دو قسمیں ہیں، اعلیٰ و ادنیٰ۔ اعلیٰ کمیاب دھاتوں پر مشتمل ہے، اور ادنیٰ عام یاب دھاتوں پر۔ اعلیٰ کا تو عوام سے بہت کم تعلق رہ گیا ہے۔ یہ زیادہ تر حکومتوں کے زیرِ تصرف ہے، اور حکومتوں کے اعتماد اقتصادی کے یقین کا کام دیتی ہے، اور کبھی کبھی دولتوں کے جنگی قرض اور تاوان ادا کرنے میں بھی استعمال ہوتی ہے اور ادنیٰ روز بروز اپنی دھاتی حیثیت کھو کر پیداواری ہئیت اختیار کر رہی ہے، اس وقت اس ادنیٰ رقم دھات سے اقتصادی لحاظ سے بہت کم کام لیا جاتا ہے۔ یہ صرف ادنیٰ درجہ کی ضروریات کی تکمیل، اور لین دین میں کام آتی ہے۔ مثلاً روزمرہ کا سودا سلف، یا اور چھوٹی موٹی اشیاء، ہاں اس کی پیداواری حیثیت جنگ کے پیشِ نظر، روز بروز محکم سے محکم تر ہوتی جاتی ہے۔

نمبر ۲۔ رقم وقار۔ موجودہ دور میں بیشتر غلام یا پسماندہ ممالک میں رائج ہے۔ یہ نہ اقتصادیات میں لازمی عنصر ہے اور نہ باقی تین رقوم میں سے کسی کی ٹھوس نمائندگی ہی کرتی ہے، یہ رقم محض شاہی حکومتِ وقت کے وقار کی نمائندہ ہے، اور اس کی چلت کا تمام تر انحصار حکومت کے دبدبہ اور طاقت پر ہے، اس کا وجود کاغذی ٹکڑے ہیں، جن پر حکومت کے نمائندہ کی طرف سے رقم دھات کی مقررہ تعداد کے ادا کرنے کا وعدہ تحریر ہوتا ہے، لیکن جب کبھی بھی مروجہ حکومت کے وقار کو نقصان پہنچتا ہے یا کسی وجہ سے خطرے میں پڑ جاتی ہے تو اقتصادی منڈیوں میں اس کاغذ کے پرزے کی، ردی کاغذ کے سوا، کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔ جنگِ عظیم کے بعد اس رقم کا رواج کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں نہیں رہا۔ یہ رقم حکومت کو لوٹ (Exploi- tation) کے مواقع بہم پہنچاتی ہے۔ اس کے رواج سے رقم دھات سمٹ سمٹا کر حکومت کے قبضہ میں چلی جاتی ہے، اور رقم پیداوار پر حکومت کا غلبہ ہو جاتا ہے، اس طرح عوام محض اس وقاری کاغذ سے ضروریات پورے کرتے رہتے ہیں، اور حقیقی رقوم دھات، اور پیداوار کے قبضہ سے محروم ہو جاتے ہیں، اگر شہنشاہی حکومت ملکی ہو تو رقم دھات محفوظ رہتی ہے، اور رقم پیداوار کو بھی زیادہ سے زیادہ، ہنڈیوں میں رقم دھات سے مبدل کر کے

محفوظ کیا جاتا ہے۔ یہ محفوظ سرمایہ بین الملی حیثیت سے حکومت کے وقار اور دبدبہ کو بڑھاتا ہے۔ لیکن اگر حکومت غیر ملکی ہو تو اس طرح سے جمع شدہ تمام سرمایہ حکمراں قوم کے ملک میں منتقل ہو جاتا ہے، جس کے نتیجہ کے طور پر حکمراں ملک کی حکومت کی ساکھ تو بڑھ جاتی ہے۔ لیکن غلام ملک روز بروز نادار ہو جاتا ہے۔

نمبر ۳۔ رقم اعتماد باہمی۔ یہ رقم دھات اور کسی حد تک رقم پیداوار کی نمائندگی کرتی ہے، اس رقم کا وجود بینکوں۔ باہمی سوسائٹیوں، اور اجتماعی اداروں سے ظہور میں آتا ہے، یہ جن رقوم کی نمائندگی کرتی ہے اس پر صرف، مندرجہ بالا اداروں کو قائم کرنے والی سرمایہ دار جماعت کا قبضہ رہتا ہے، اور عوام اس جماعت کے توسط (Medium) سے اپنی ضروریات نباہتے رہتے ہیں۔ اس سے ایک فائدہ تو ہوتا ہے کہ انسانیت صرف ایک شہنشاہ کی احتیاج سے نجات پاکر ایک جماعت کی دست نگر ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود شہنشاہ اس جماعت کا محتاج ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسری طرف سے، زیادہ اور منظم ہونے کی وجہ، اس جماعت کی سرمایہ دارانہ گرفت شہنشاہی گرفت سے زیادہ سخت اور مضبوط ہوتی ہے، جس کے اثر سے یہ جماعت تو مالا مال۔ لیکن عوام زیادہ نادار اور مضمحل ہو کر رہ جاتے ہیں، یہ سرمایہ دارانہ نظام کی سنگ بنیاد ہے، اس وقت امریکہ انگلستان اور جاپان میں اسی رقم کا دور دورا ہے سنہ ۲۹-۱۹۲۵ء کے دوران میں ہر سال برطانیہ عظمیٰ نے کل لین دین کا قریباً ۹۴-۹۱ فیصدی اور امریکہ نے ۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۹ کل لین دین[1] ڈالر کا لین دین اسی رقم کے ذریعہ کیا، اور جاپان[2] نے کل لین دین کا ۶۱۰۸ فیصدی اس رقم کے ذریعہ بھگتان کیا۔ اس کا وجود یوں عمل میں آتا ہے۔ چند سرمایہ دار مل کر ایک ادارہ، بینک یا انجمن رقم (Money Society) کے نام سے، اپنے سرمایہ کو ملا کر، قائم کر لیتے ہیں، اور اس جمع شدہ سرمایہ کا کچھ فیصدی (Some Percentage) حکومت وقت کے پاس ضمانت کے طور پر رکھ کر اپنے ادارہ کے نام سے نوٹ اور ہنڈیاں (Drafts) جاری کر دیتے ہیں، یہی نوٹ عوام سے رقم دھات اور پیداوار، کھینچ کھینچا کر اس ادارہ کے تصرف میں لے آتے ہیں۔ اب اُن کی ساکھ بڑھ جاتی ہے۔ باقی میانہ سرمایہ دار (Bourgeoisie) اور نچلے سرمایہ دار (Petty Bourgeoisie) اپنا اپنا سرمایہ ان اداروں میں جمع کروا کر حساب کھلوا لیتے ہیں، اقتصادی منڈیوں میں ایسے اداروں کی ساکھ بڑھ جانے کی وجہ اب لین دین اسی ادارہ کے نام کے حامل کاغذ ——— چیک یا ہنڈوی سے ہونے لگتا ہے، اس طرح رقم اسی ادارہ میں ایک کے حساب سے دوسرے کے حساب میں منتقل ہوتی رہتی ہے لیکن اصل رقم دھات یا رقم پیداوار پر قبضہ بدستور اسی جماعت کا رہتا ہے۔ یہاں بھی اگر یہ ادارے دیسی ہوں تو قوم کا سرمایہ حکومت کے حدود کے اندر محفوظ رہتا ہے، اگر بدیشی ہوں تو تمام تر سرمایہ اُن ممالک میں منتقل ہوتا ہے جن کی وہ ملکیت ہیں۔ اس طرح اداروں کے مالک ممالک کے سرمایہ داروں کی ملکیت روز بروز بڑھتی رہتی ہے، اور جس غیر ملک میں یہ ادارے کام کر رہے ہوں وہاں کے عوام روز بروز بدحال سے بدحال ہو کر اقتصادی لحاظ سے اُن کے محتاج ہو جاتے ہیں، اس طرح سے برطانیہ کا ایک بھاری ادارہ (The Imperial Bank of Persia) بینک شہنشاہی ایران۔ احمد شاہ قاچار ابتدائی عہد سے لے کر رضا شاہ پہلوی کے ابتدائی دور تک، ایران میں ایرانی نام لیکن انگریزی ملکیت سے کام کرتا رہا جسے اب چار سال پیشتر پارلیمان ایران نے بند کر کے (De National Bank of Persia) بینک ملی ایران کی بنیاد رکھی، ہندوستان پر آج کل رقم وقار، اور رقم اعتماد دونوں کی یورشیں ہیں، اور تقریباً ایک صدی سے ہیں، اب اندازہ ہو سکتا ہے، کہ بچارے ہندوستان کے عوام کی مالی حالت کیا رہ گئی ہو گی، اس وقت مندرجہ ذیل بڑے بڑے بینک ہندوستان میں مصروف کار ہیں۔

برطانیہ عظمیٰ

(۱) لائیڈز بینک آف انڈیا
(۲) مرکنٹائل بینک آف انڈیا
(۳) چارٹر بینک آف انڈیا
(۴) نیشنل بینک آف انڈیا
(۵) گرینڈ بے بینک آف انڈیا
(۶) بینک آف انڈیا
(۷) پی اینڈ او بینک آف انڈیا
(۸) امپیریل بینک آف انڈیا (مشترکہ)

---

(1) The Communist answer to the worlds needs:- by Julius F. Hecker. P.34. Ch. III.
(2) Japan Finance, By B. Kobe Jalli. P.79.

امریکہ

(۱) دی نیشنل سیٹی بینک آف نیو یارک (۲) امریکن ایکسپریس بینک

جاپان

(۱) متسوئی بینک (۲) یوکوہاما سپیسی بینک (۳) متسوئی کیشا بینک

باقی ممالک

(۱) نیدر لینڈ ٹریڈنگ سینیڈرش بینک (۲) نیدر لینڈ ٹریڈنگ سوسائٹی

ہندوستانی

(۱) دی سنٹرل بینک آف انڈیا (۲) دی پنجاب نیشنل بینک آف انڈیا

(اس کے علاوہ کئی اور چھوٹے موٹے ہندوستانی بینک ہیں، لیکن اُن کی حیثیت ایک واحد ساہوکار کے کاروبار سے بھی کم ہے اس لئے درج نہیں کئے جاتے)

ان کے علاوہ بے شمار غیر ملکی تجارتی ادارے ہیں جو بینکنگ بھی کرتے ہیں، جن میں سے بڑے بڑے مندرجہ ذیل ہیں۔

برطانیہ عظمیٰ

(۱) رالی برادرز (۲) والکرٹ برادرز (۳) فاربس فاربس کیمبل (۴) ڈیوڈ ساسن (۵) ای۔ ڈی۔ ساسن (۶) پی اینڈ او کمپنی (۷) میکنین میکنزی

جاپان

(۱) متسوئی بوسان کیشا (۲) متسوئی بوسی سوجی کیشا (۳) نیپن یوسن کیشا (۴) اوساکا کیشا (۵) جاپان کاٹن کیشا۔

امپیریلسٹ ممالک کے سرمایہ دار اپنے زیر اثر ممالک کے عوام کو کس طرح تاخت وتاراج کرکے، اور سب کچھ لوٹ کر فاقہ کشی پر مجبور کر دیتے ہیں اس کا تھوڑا بہت اندازہ مندرجہ بالا اداروں کے اعداد وشمار سے ہوسکتا ہے۔

نمبر ۴۔ رقم پیداوار۔ حقیقت میں یہی وہ رقم ہے جس پر بقیہ تین رقوم کا بنیادی انحصار ہے، اور یہی وہ رقم ہے جو انسانی ضروریات کی تکمیل میں کام آتی ہے۔ اور اسی سے رقم کے لحاظ سے انسانیت سب سے پہلے متعارف ہوئی۔ اس پر زیادہ سے زیادہ تعداد میں قبضہ حاصل کرنے کے لئے چالاک دماغوں کے رقم کی بقیہ تین اشکال کو ایجاد کیا، اور انہی تین نئی اشکال نے انسانیت کو موجودہ ہائے وہو میں مبتلا کرکے ایک دوسرے سے لڑایا۔ اور فساد برپا کیا۔ چند ایک کو لوٹ کے اور عوام کو لوٹنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ اس ابتدائی رقم میں چند افراد کی چالاکی نے تغیر وتبدل پیدا کیا اور رفتہ رفتہ تبدیل شدہ اشکال رواج پذیر ہوتی گئیں۔ اور یہ ابتدائی رقم محض "جنس خام" کا نام رہ کر رہ گئی۔ پہلے جہاں رقم پیداوار انسانی ضروریات کے درمیان "معیار تبادلہ" کا کام دیتی تھی، اور حاجت کی تکمیل کے بعد زائد تبادلہ کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اب رقم دھات۔ رقم دقار۔ اور رقم اعتماد "معیار تبادلہ" کی حیثیت اختیار کرگئے اور ابتدائی رقم "جنس خام" کی شکل میں عوام میں تبدیل ہونے لگی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے جہاں "ضرورت" کا تبادلہ محنت سے ہوتا تھا، یعنی کاشتکار نے کھیتی باڑی کرکے جولاہے کو غلہ پیش کیا اور جولاہے نے محنت کرکے کاشتکار کے لئے کپڑا بنا، اب اجناس کا تبادلہ ہونے لگا، ضرورت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ملکیت کی بنیاد پر۔ یعنی پہلے اگر ایک جولاہا دس ہاتھ کپڑا یومیہ بُن سکتا تھا اور اس کی ضرورت صرف دو ہاتھ بُنے ہوئے کپڑے سے پوری ہو جاتی تھی تو وہ زائد نہیں بُنتا تھا۔ اور بقیہ وقت آرام میں کاٹتا تھا، لیکن اب وہی جولاہا، ضرورت سے قطع نظر، استطاعت کارکے ذریعہ، ملکیت، کو بڑھانے کے لئے زیادہ کام کرنے لگا، تاکہ ضرورت کو پورا کرکے فالتو مصنوعات سے زیادہ سے زیادہ رقم پیداوار پر قبضہ کیا جاسکے، اور چونکہ رقم پیداوار کی نمائندگی رقم دھات میں موجود تھی، اب رقم پیداوار رقم دھات میں تبدیل ہو کر جمع ہونے لگی۔ اس عمل کا نتیجہ عیاں ہے۔ انسان "ملکیت" کے لالچ میں ضرورت سے زائد پیدا (Produce) کرنے لگے، اور فالتو حاصل (Excess Production) جمع ہونے لگا۔ رقم پیداوار تو ذخیرہ ہو نہیں سکتی تھی۔ اس لئے بچت کو محفوظ کرنے کے لئے رقم دھات میں بدلنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اور رقم دھات زیادہ سے زیادہ رواج پذیر ہوتی گئی، ابتدا میں یہ فالتو حاصل دستکاروں کے پاس جمع رہا۔ بعد میں عقل نے دستکاری پر فتح حاصل کی سرمایہ بھی اہل فکر (Intellectuals) کے پاس منتقل ہو گیا، اور پھر سمٹتے سمٹتے اِتنا سمٹا کہ تمام دنیا میں صرف چند افراد یا جماعات کے زیر تصرف آگیا، محدود ملکیت نے دھات کی مانگ اور مقبولیت کو بڑھایا۔ رقم پیداوار کی ضرورت (حاجت) کے باوجود، وقعت گرتی گئی اور انسان زیادہ سے زیادہ رقم دھات حاصل کرنے کے لئے استطاعت سے زیادہ مصروف کار رہنے لگے، لیکن اس مصروفیت اور زائد محنت کے باوجود رقم دھات کا زائد حصول ممکن نہ ہو سکا۔ رقم دھات کی مانگ

جماعت نے، پیداوار کی کثرت کے پیشِ نظر، پیداوار اور دھات کے معاوضہ کی شرائط سخت کر دیں، پہلے جہاں ایک تولہ چاندی کے لئے دس دن محنت کے حاصل کی ضرورت تھی اب وہی تولہ چاندی ۲۰ دن محنت کے حاصل سے بھی دستکار کو دستیاب نہ ہوتی۔ اب ایک طرف تو رقم دھات گراں ہو گئی، دوسری طرف ضروریاتِ حیات "محنت" کی بجائے رقم دھات کی محتاج ہو گئیں اور تیسری طرف مصروفیت حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ اس عمل سے جہاں رقم دھات کھچ کھچا کر چند افراد کے قبضہ میں چلی گئی وہاں عوام محنت کے باوجود ضروریاتِ حیات کی تکمیل سے عاجز آ گئے، ردِ عمل لازمی تھا، بددلی چھا گئی۔ انسانیت استطاعت سے زائد محنت سے تھک گئی۔ اب اہلِ تخیل (Intellee-ctuals) نے موجودہ پیداواری مقدار کو قائم رکھنے اور پھر بڑھانے کے لئے مشینری ایجاد کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے جو چیز زائد محنت سے کم تعداد میں حاصل ہوتی تھی۔ اب کم محنت سے زائد تعداد میں حاصل ہونے لگی، تھکے ہوئے عوام کو ان ایجادات سے کچھ دیر آرام کرنے کا موقع مل گیا اور مشینری روز بروز مقبول سے مقبول تر ہو کر بڑھنے لگی، ضروریات بغیر سخت محنت کے رقم دھات کے عوض مشینری حاصل (Mechanical Production) سے پوری ہونے لگیں۔ لوگ آسودہ ہوتے گئے جب سابقہ زائد محنت سے حاصل کردہ محفوظ بچت مشینوی حاصل کے ذریعے سرمایہ دار کے قبضہ میں جا چکی۔ تکان اتر چکی، اور ضروریات کو پورا کرنے کے لئے رقم دھات کی ضرورت محسوس ہوئی تو لوگ کام کے متلاشی ہوئے۔ اب کام کہاں تھا۔ کام پر تو مشینیں چھا چکی تھیں۔ مفلسی و بیکاری کا دور دورا ہوا۔ کچھ لوگ نوایجاد مشینری کے ذریعے کام چلانے کے لئے تعلیم کی طرف راغب ہوئے، بڑی بڑی یونیورسٹیاں کھلیں۔ لیکن وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ مشینری میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ پہلے جس مشین پر ۱۰ آدمی کام کرتے تھے اب وہ ایک آدمی کی مدد سے پہلے سے زائد کام کرنے لگی، تعلیم روز بروز باریک سے باریک تر ہونے کی وجہ سے مہنگی ہوتی گئی۔ اور آمدنی کے ذرائع کم ہوتے گئے۔ عوام افلاس و بیکاری سے تنگ آ کر زندگی سے عاجز آ گئے۔ اس تنگی نے چند بہی خواہانِ نسلِ انسانی کو حقیقتِ حال پر فکر و غور پر مجبور کیا اور محسوس ہونے لگا کہ اس تنگی کی سب سے بڑی وجہ رقم دھات، اور اس کی نمائندگی کے تحت رقم وقار اور رقم اعتماد، اور اُن کی ذاتی (شخصی) ملکیت ہے، اُن کے خلاف آواز بلند ہوئی اور یہ خیال عام ہوا کہ اگر رقم ذاتی ملکیت کی بجائے عوام کی مشترکہ ملکیت پر اور حکومت عوام کے وسیع انتخاب کے ذریعے اجتماعی شکل میں قائم کر دی جائے اور وہ زمین، مشین اور ہر بہتر شے سے بدرجہ اتم کام لے کر تمام انسانیت کی ضروریات کو مہیا کرنے کی ذمہ دار ہو تو مشکلات کا حل ہو جائے گا۔ چنانچہ سب سے پہلے ۵۹-۱۸۴۹ء میں جرمنی کے عظیم انسان انسان کارل مارکس نے اس خیال کو عام کیا اور اسی خیال نے لفظی شکل "سوشلزم"[1] اختیار کی۔

〰〰〰〰〰〰〰〰〰〰

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا فی الواقع ہمیں رقم دھات کی ضرورت ہے؟ کیا ہم رقم دھات کے محتاج ہیں؟ کیا رقم پیداوار نظامِ حیات کے لئے کافی ہے؟ میرے خیال میں رقم دھات ایک ناقص و فضول عنصر اقتصادیات ہے اور نظامِ حیات میں ہمیں اس کی قطعی ضرورت نہیں۔ موجودہ دور میں بھی جہاں تک اجتماعی لین دین کا تعلق ہے دولتیں رقم پیداوار ہی سے کام لیتی ہیں، اس وقت جاپان کے ہندوستان، مصر، اور آسٹریلیا سے اقتصادی معاہدات بارٹر سسٹم[2] کے تحت ہیں۔ جن سے تمثیلاً مراد یہ ہے کہ جاپان ایک لاکھ ین کی روئی ہندوستان سے لے گا اور بدلے میں ایک لاکھ ین کا کپڑا دے گا، بظاہر تو ین (جاپان کا چاندی کا سکہ — رقم دھات) کا واسطہ اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن ادائیگی اور لین روئی اور کپڑے میں ہے۔ اسی طرح روس کے اقتصادی معاہدات چین۔ افغانستان۔ ایران اور ترکی سے تبادلۂ اجناس پر ہیں، رقوم کی ادائیگی پر نہیں — جاپان — امپیریلسٹ — روس — سوشلسٹ جو چیز سوشلسٹ ملک عوام کے لئے روا رکھتا ہے وہاں امپیریلسٹ صرف حکومت یعنی چند سرمایہ داروں کے لئے جائز قرار دیتا ہے باقی کے لئے نہیں۔ عوام کو دبانے اور لوٹنے کا واحد ذریعہ رقم دھات ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا کہ لوٹ کیسے ہوتی ہے؟ ایسے مثلاً زمین کے دو مساوی

---

[1] سوشلزم کے بنیادی اصولات کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل کتب معاون ثابت ہوں گی، (۱) داس کیپٹل۔ کارل مارکس (۲) ہسٹری آف سوشلسٹ تھاٹ (History of Socialist thought) H.W. Laider

[2] بارٹر سسٹم۔ اس سسٹم کی رو سے اجناس کا تبادلہ، ضرورت کی بنا پر، اجناس سے ہوتا ہے

۳ Basic Principal for Scientific socialism A.S. Sacks.

۴ Jayaprakash Narayan :- why socialism.

۵ J. Stalin :- Leninism.

ٹکڑے ہیں جن میں سے ہر ایک کی کاشت پر پانچ روپے اور دو کاشتکاروں کی دن کی محنت صرف ہوتی ہے، ایک پر ایک ایسے شخص کا قبضہ ہے جو سرمایہ دار ہے۔ لیکن خود محنت نہیں کرتا، بلکہ اجرت پر کرواتا ہے، اور دوسرے ٹکڑے کے مالک دو کاشتکار ہیں جو خود محنت کرتے ہیں۔ اس کاشت کا عمل یوں ہوگا۔

(۱) سرمایہ دار کا مملوکہ ٹکڑا۔

زمین + صرفہ کاشت ۵ روپے + دو کاشتکاروں کی دس دن کی مروجہ مزدوری ۸ / روپیہ = ۱۰ روپے کل = زمین + ۱۵ روپے۔ حاصل = ۲۰ من غلہ در ۵ روپے فی من = ۱۰۰ روپے۔

(۲) کاشتکاروں کا مقبوضہ ٹکڑا۔

زمین + صرفہ کاشت ۵ روپے + دو کاشتکاروں کی دس دن مزدوری بلا اجرت کل = زمین + ۵ روپے حاصل = ۲۰ من غلہ در ۵ روپے فی من = ۱۰۰ روپے۔

اس مثال سے صاف واضح ہے کہ سرمایہ دار سرمایہ کے باوجود محنت کا محتاج تھا، لیکن کاشتکار سرمایہ کا محتاج صرف صرفہ کی حد تک تھا یعنی اگر سرمایہ دار کل کام کا ⅔ حصہ احتیاج رکھتا تھا تو کاشتکار سرمایہ کا احتیاج کے لحاظ سے صرف ⅓ جہاں احتیاج میں اتنا فرق ہے وہاں اس کے برعکس حاصل کی تقسیم میں زمین و آسمان کا مندرجہ بالا دونوں ٹکڑوں پر کام کرنے والے محنتی افراد پر تقسیم حاصل مندرجہ ذیل تناسب سے ہوگا۔

(۱) سرمایہ دار کے مملوکہ ٹکڑے کے حاصل کی تقسیم۔

حاصل ۱۰۰ روپے۔ صرفہ ۱۵ روپے = ۸۵ روپے

تقسیم	صرفہ	۲ مزدور	سرمایہ دار
	۵ روپے	۵ + ۵	۸۵ روپے

(۲) کاشتکار کا ٹکڑا۔

حاصل ۱۰۰ روپے۔ صرفہ ۵ روپے = ۹۵ روپے

تقسیم۔	ایک کاشتکار	دوسرا کاشتکار
	½ ۴۷ روپے	½ ۴۷ روپے

اس لحاظ سے دو دو مزدوروں نے دو قطعات زمین پر مساوی محنت کی اور حاصل محنت بھی مساوی حاصل ہوا، لیکن ان میں سے دو کو ½ ۴۷ روپیہ فی کس حاصل ہوا، اور ۲ کو صرف ۵ روپے فی کس اس طرح مزدور کے جائز حق میں سے ½ ۴۲ روپیہ فی کس سرمایہ دار محض ذاتی ملکیت کی وجہ سے کھا گیا۔ ورنہ اُس نے کیا کرایا، کچھ بھی نہیں۔ میں نے اس مثال میں فرضی اعداد سے کام نہیں لیا۔ بلکہ ہندوستان کے مروجہ مزدوری اور نرخ کو استعمال کیا ہے۔ ہندوستانی کسان آج کل اسی شرح سے لُٹ رہا ہے۔

انسان مخلوقِ ارضی کا ایک قلیل جز ہے۔ لیکن یہی قلیل جز سب سے زیادہ دکھی۔ سب سے زیادہ مضطرب اور سب سے زیادہ پریشان ہے۔ کیوں؟ کیا قدرت کا منشا، اس کو اشرف المخلوقات قرار دے کر پریشان کرنا تھا؟ کیا اس کو فکرِ بلند اور ذہنِ رسا پریشانی و اضمحلال کے لئے عطا ہوئے تھے؟ اگر دونوں سوالات کا جواب اثبات میں تصور کیا جائے تو نتیجۂ لازمی یہ ہونا چاہیئے تھا کہ تمام نسلِ انسانی دکھی ہوتی بلا امتیاز۔ بلا تفریق۔ لیکن حالات بالکل اس کے برعکس ہیں۔ انسان، ایک ہی ہیئت و ساخت کا انسان، دُکھی بھی ہے سُکھی بھی، اقبال و ادبار کا یہ افتراق عام حدود سے بڑھا ہوا ہے، اس کی ایک وجہ، جو فلسفۂ پارینہ کی مٹتی ہوئی یاد ہے، عمل تبلائی جاتی ہے۔ اول تو عمل صالح و بد کی تعریف ہی فہم سے باہر ہے، ایک ہی فعل ایک سوسائٹی کے نزدیک احسن ہے، اور دوسرے کے قریب قبیح۔ لیکن اگر دلیل کے طور پر ایک ہی جماعت کے محدود اصولات کے تحت عملِ صالح و بد کو بھی لے لیا جائے تو آسودہ انسان بلا گنجائش شک و شبہ قباحتوں میں زیادہ مبتلا پائے جائیں گے، اور تنگدست کا اعمالنامہ بہت حد تک صاف و صالح ہوگا، انسانی حیاتِ حاضر کا مشاہدہ یہی پیش کرتا ہے، اور حیات کے ماقبل و مابعد حالات تک رسائی ہمارے بس کی بات نہیں، مزید براں زندگی۔ علم۔ نظام اور اقتصادیات کے جتنے بھی نظریئے اور عکس موجود ہیں سب اسی زندگی کے مشاہدات و تفکرات سے اخذ کردہ ہیں، اور جب ہم بھی اسی زندگی کے گرد و پیش کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اقبال و ادبار کے پس پردہ دو ہی اسباب نظر آتے ہیں۔

خوش قسمتی ———————— رقم و دولت کی افراط

بدقسمتی ———————— رقم و دولت کی قلت

بس یہ رقم ہی ایک ایسی شے ہے جو چند افراد کو خوش قسمت اور عوام کو بدقسمت بنائے ہوئے ہے۔ ورنہ صانعِ کائنات نے سب کو یکساں پیدا کیا ہے اور یکساں طور پر مارا ہے۔ مروجہ چالاکی کا انسداد، رقم پیدا وار کا رواج، اور اس کی مساوی تقسیم۔ موجودہ بے چینی۔ افلاس، اور بیکاری کا واحد حل ہے۔

عدالتِ حیوانات

حیوان کو سزا دینے کے دلچسپ طریقے

شوکت سبزواری - ایم اے

قدیم الایّام میں سزا کو قانونی انتقام تصور کیا جاتا تھا، اس لئے انسان کو یہ حق تھا کہ وہ جس طرح چاہے اپنے دشمن سے انتقام لے، اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ اس کا دشمن سنگِ راہ ہے یا چلنے پھرنے والا حیوان۔ ہرا بھرا درخت ہے یا بولنے اور سمجھنے والا انسان۔ جذبۂ انتقام کی تسکین مرکوزِ خاطر ہوتی تھی اور بہرحال سزا اس بھڑکتے ہوئے جذبہ کو ایک بڑی حد تک سرد کردیتی تھی،

یہی باعث تھا بیشتر حالات میں عدالتیں ہر ذی حیات اور مردہ چیز کو عجیب و غریب سزائیں دیا کرتی تھیں۔ قدیم انسان کا خیال تھا کہ ہر وہ چیز جو کسی انسان کو ضرر پہنچائے۔ یا کسی دوسری چیز کے لئے باعثِ ضرر بنے، اپنے اندر ایک ناپاک روح رکھتی ہے۔ ان کی رائے میں اس روح کو فنا کرنا ازبس ضروری تھا، چنانچہ وہ اس خبیث روح کو مختلف الانواع سزائیں دے کر نیست و نابود کیا کرتے تھے۔

مرورِ ایام سے یہ خیال بدل گیا، اس کے بعد سزا تنبیہہ و اصلاح کا ذریعہ سمجھی جانے لگی۔ اس وقت جو سزائیں دی جاتی ہیں وہ اسی خیال سے دی جاتی ہیں کہ مجرم کی اصلاح ہوجائے، اور وہ آئندہ جرائم کا ارتکاب نہ کرے۔ لیکن بایں‌ہمہ اس دورِ عروج و ترقی میں ایسے فیصلے بھی صادر کئے جاتے ہیں، جن کے متعلق وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں ہماری آنے والی نسلوں کے لئے اسی طرح باعثِ تفریحِ خاطر ہوں گے جس طرح ہمارے لئے ہمارے آباؤ اجداد کے فیصلے اور وہ عقوبات جو انھوں نے گاہے گاہے غیر ناطق حیوانات کو دیں۔

انسان ابتدا ہی سے یہ خیال کرتا رہا ہے کہ جو چیز عالمِ وجود میں ہے —— خواہ وہ غیر ذی حیات کیوں نہ ہو —— اُس کے لئے ایک نفس ہے جو اس کو دوسری موجود چیزوں سے ممتاز بناتا ہے۔ اس لئے قدیم انسان کو جب کسی چیز سے ضرر پہنچتا تھا تو وہ اس سے انتقام لینے پر آمادہ ہو جاتا تھا، اور بچوں کی طرح وفورِ جوش و غضب سے مغلوب ہو کر اُسے ہلاک کر ڈالتا تھا۔ یونان کے قدیم باشندے اُن آلات کو بھی سزا دیا کرتے تھے جن سے کسی انسان کو قتل کیا جاتا تھا، یہ سزائیں تین طرح کی تھیں، یا تو ان آلات کو فنا کر دیا جاتا تھا یا کسی بھٹی میں ڈال کر اُن کو تپایا جاتا تھا یا آبادی سے دور کسی ویران جنگل میں ڈال کر گویا اُنھیں خارج البلد کر دیا جاتا تھا، قرونِ وسطیٰ تک یورپ کا بھی یہی حال تھا۔ انگلستان میں وہ آلۂ جارحہ جس سے کسی انسان کو قتل کیا جاتا تھا، مقتول کے ورثا کو دے دیا جاتا تھا، کیوں؟ اس لئے کہ اُسے فنا کر دیا جائے اور جوشِ انتقام کو سرد کیا جاسکے۔

ایک مدت کے بعد جب حق انتقام حکومت کی طرف منتقل ہو گئی تو یہ طریقہ رائج ہوا کہ حکمران وقت اس چیز کو جس کے خلاف دعویٰ کیا جاتا تھا مجرم قرار دیتا تھا۔ اس "مجرم" کو فروخت کیا جاتا تھا، اور اس کی قیمت "راہِ خدا" میں صرف کر دی جاتی تھی، اس مجرم کو "دیو دند" کہتے تھے، جس کا ترجمہ ہے "اللہ کی قربانی"۔

"دیو دند" کے متعلق بکثرت احکام و قوانین وضع کئے گئے تھے، اگر کوئی انسان کسی گاڑی کے نیچے دب کر مر جاتا تھا تو تمام گاڑی کو مجرم قرار دیا جاتا تھا، اور اگر گاڑی کھڑی ہوتی تھی اور اتفاق سے کوئی بدبخت انسان اس کے کسی پہیہ سے ٹکرا کر ہلاک ہو جاتا تھا تو اس کی ذمہ داری تمام تر پہیہ ہی پر عاید ہوتی تھی، ایک کشتی دریا میں تیرتی جا رہی ہے سوءِ اتفاق سے کشتی میں سوار ہونے والوں میں سے کوئی شخص پانی میں گر کر غرق ہو جاتا ہے، اس صورت میں کشتی پر مقدمہ چلایا جاتا تھا، اور اُسے مستحق عقوبت تصور کیا جاتا تھا، یہی کشتی اگر سطح سمندر پر رواں ہوتی تھی، اور اس نوع کا کوئی حادثہ پیش آ جاتا تھا تو کشتی کو مجرم نہ سمجھا جاتا تھا، خیال کیا جاتا تھا کہ کشتی میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ سمندر کی بے پناہ موجوں کا مقابلہ کر سکے۔ امریکہ کی قدیم تاریخ کا یہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عہد استعمار کے اوائل ہی میں ایک شخص درخت کی شاخ سے گر کر انتقال کر گیا۔ ایوانِ داد و آئین نے فیصلہ صادر کیا کہ اس درخت کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا جائے۔

یہ جملہ واقعات قدیم انسان کے ضعفِ عقل اور نقصانِ فہم پر کھلے ہوئے دلائل ہیں، اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم عدالتی فیصلے کیا تھے، عہد ترقی کے اخبارات و جرائد کے تفریحی کالم تھے۔

جہاں جمادات پر دعوے کئے جاتے ہوں وہاں حیوانات کو سزا یاب کرانا چنداں تعجب انگیز نہیں۔ یورپ کی قدیم عدالتی دستاویزوں اور فیصلوں میں بے شمار اس نوع کی روایات ہیں جو اس درجہ تحیر خیز ہیں کہ بدشواری عقلِ انسانی اُن کو باور کر سکتی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یورپ کے بعض اطراف میں حیوانات کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے خصوصی عدالتیں قائم کی گئی تھیں۔ ان عدالتوں میں مجرم حیوانات کو مظلوم یا اس کے متعلقین کے سپرد کر دیا جاتا تھا، تاکہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے اُن کو سزا دیں۔ یہ عدالتیں دو نوع کی تھیں۔ دینیہ اور مدنیہ۔ اول الذکر عدالتیں وحشی یا موذی جانوروں کے مقدمے فیصل کیا کرتی تھیں، اور ثانی الذکر عدالتوں میں مانوس یا پالتو جانوروں کے مقدمے پیش کئے جاتے تھے، مقدمات کی سماعت اور اُن کے پیش کرنے کے طریقے قریب قریب وہی تھے جو اس عہد میں ہیں، باقاعدہ ججوں کے حضور میں، مدعی و مدعا علیہ یا مستغیث اور ملزم پیش کئے جاتے تھے، شہادتیں قلمبند کی جاتی تھیں، جرحیں کی جاتی تھیں، اور متخاصمین کے وکلاء بحثیں بھی کرتے تھے۔

چودھویں صدی کے "اوراقِ پارینہ" میں ہے کہ ایک مرتبہ فرانس میں ایک بیل کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ کہا گیا کہ اس بیل نے شہر "مورائی" کے قریب ایک انسان کو ہلاک کر دیا ہے۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ بیل پر فردِ جرم لگائی گئی اور اُسے قصاص میں قتل کر دیا گیا۔ ۱۳۱۴ء میں پیرس کی پارلیمنٹ نے اس انوکھے فیصلہ پر مُہر تصدیق بھی ثبت کر دی۔

۱۳۸۹ء میں فرانس کی عدالتوں نے ایک گھوڑے کو موت کی سزا دی، اس لئے کہ اس گھوڑے نے ایک شخص کو لاتیں مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ۱۶۹۱ء میں "اکس" کے ایوانِ داد و آئین نے قتل کے جرم میں ایک گھوڑی کو نذرِ آتش کر دیا۔

حیوانات کے مقدمات میں سب سے زیادہ دلچسپ اور انوکھا مقدمہ وہ ہے جو صفحات تاریخ میں "قضیہ سافینی" کے نام سے مشہور ہے، ایک مادہ خنزیر اور اس کے چھوٹے چھوٹے چھ عدد بچوں نے ایک نو عمر انسان کے بچہ کو ہلاک کر کے کھا لیا۔ خنزیر کے اس پورے "خاندان" کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ فرانس کے ایک مشہور و معروف قانون دان نے، جو تر زبانی اور فصاحت میں اپنی نظیر آپ تھا، مجرموں کی حمایت کی۔ یہ قادر الکلام قانون دان اپنی جادو بیانی سے بچوں کو موت کی گرفت سے بچانے میں کامیاب ہو گیا، لیکن اُن کی بے زبان ماں موت کے پنجہ سے نہ چھوٹ سکی، جج اور جیوری دونوں نے باتفاق مادہ خنزیر کو مجرم قرار دیتے ہوئے، اس کے لئے سزائے موت تجویز کی، اور عام تماشائیوں کے روبرو شارع عام پر اُسے سولی دیدی گئی۔

چند ایام کے بعد دوبارہ خنزیر کے بچوں پر مقدمہ دائر کیا گیا۔ اس مرتبہ عدالت نے فرمان صادر کیا کہ یہ بچے "مظلومہ" میڈم ڈی سافینی" کے سپرد کر دئے جائیں۔

۱۴۹۴ء میں فرانس میں ایک خنزیر کو، جس نے کنیسہ سے متعلق زمین میں ایک شخص کو ہلاک کر دیا تھا، گرفتار کیا گیا۔ اس قاتل خنزیر کا مقدمہ ایک مجلس کے سامنے پیش ہوا، جس کے ممبر تمام تر راہب تھے۔ مقدمے نے اپنے تمام عدالتی مدارج باقاعدگی کے ساتھ طے کئے۔ اور آخر میں حکم صادر ہوا کہ خنزیر کو بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا جائے۔ فیصلہ میں لکھا گیا تھا۔

"ہم سب تارک الدنیا راہب ہیں۔۔۔۔۔۔ ہماری رائے میں جرم کی نوعیت بدرجۂ غائت مکروہ اور سفاکانہ ہے، داد و انصاف کی تائید اور عبرت عامہ کی غرض سے ہم نے خنزیر کے لئے سزائے موت تجویز کی ہے۔"

دینی عدالتوں میں بالعموم ان جملہ مقدمات کی سماعت ہوتی تھی، جو چوہوں، چھچھوندروں، ٹڈیوں، مچھروں، مکھیوں، چیونٹیوں اور عام کیڑوں مکوڑوں پر دائر کئے جاتے تھے۔ بیشتر حالات میں، حشرات الارض اور ایذا پہنچانے والے جانوروں کو یہ اپنی عدالتیں جو سزا دیتی تھیں وہ لعنت ہوتی تھی۔ بارگاہِ خداوندی میں گڑ گڑا گڑ گڑا کر دعائیں مانگی جاتی تھیں کہ وہ ان مجرموں پر اپنی قہاریت کے صدقے میں لعنت نازل فرمائے۔ ۱۳۳۸ء میں ایک ٹڈی دَل کو، جس نے "تیرول" کے علاقہ کو برباد کر دیا تھا، سزائے لعنت دی گئی، اور جب اتفاق سے اِس گروہ پر کوئی لعنت نازل نہ ہوئی تو یہ سمجھا گیا کہ اس علاقہ کے باشندے گنا ہگار ہیں، اس لئے مستحق رحمت یزدانی نہیں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے کلیساؤں میں نمازیں پڑھی گئیں اور بھولے بھالے عامتہ الناس یہ سمجھتے رہے کہ خدا نے ان کی خطاؤں کو معاف فرما دیا ہے۔

اسی سلسلہ کا دلچسپ ترین مقدمہ "اوتان کے چوہوں" کا مقدمہ ہے، سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں فرانس کے جملہ اطراف و جوانب میں اُس کی کافی شہرت تھی، تفصیلات یہ ہیں۔ ایک علاقے کے چوہوں پر دعویٰ کیا گیا کہ اُنھوں نے جملہ مزروعات کو برباد کر دیا ہے، جس کی وجہ سے جَو کی فصل تمام تر تلف ہو گئی۔ فرمان صادر ہوا کہ چوہوں کو عدالت میں حاضر کیا جائے۔ ان کی طرف سے ایک قانون داں، جس کا نام "بار تولومیو شاسانی" تھا، پیش ہوا، اس قانون داں کی شہرت تمام تر اسی مقدمے کی رہین منت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قانون داں نے باحسن وجوہ اپنا فرض انجام دیا، اور بالکل اسی طرح ان چوہوں کی حمایت و دفاع میں اُس نے سعی و کوشش کی، جس طرح وہ کسی امیر کبیر یا باعزت شخص کی مدافعت کر سکتا تھا۔

اُس نے عدالت سے کہا کہ چوہے شہر کے اطراف و جوانب میں پھیلے ہوئے ہیں، اس لئے ان کے مساکن کی معرفت، اور انھیں عدالت میں پیش کرنا چنداں سہل نہیں۔ جب عدالت نے اُس کے اس عذر کو قبول نہ کیا تو وہ خود چوہوں کا نمائندہ ہو کر عدالت میں آیا۔ اور اُن کے دفاع میں اس نے ایک پُرمغز تقریر کی جس میں اُس نے خصوصیت کے ساتھ اس امر پر زور دیا کہ چوہے، جن کی طرف سے وہ نیابت کر رہا ہے، اس قابل نہیں کہ عدالت میں حاضر ہو سکیں۔ ان کے مساکن بہت دور ہیں، اور راستہ غیر محفوظ ہے، اس لئے کہ راہ میں بلیاں اور کتے بکثرت ملتے ہیں، جن کے دست و دہن سے مخلصی پانا چوہوں کے لئے بہت دشوار ہے۔ اگر مُدّعی یہ چاہتے ہیں کہ بہر حال میرے "موکل" عدالت میں حاضر کئے جائیں تو اُن کی زندگی و حیات کی ضمانت انھیں کرنا ہوگی۔

عدالت نے دعویٰ کرنے والوں سے دریافت کیا کہ کیا وہ ضمانت دینے کے لئے آمادہ ہیں، اور جب اُنھوں نے انکار کیا تو عدالت چوہوں کو بری کرنے پر مجبور ہوئی۔

اس سلسلہ کا ایک اور واقعہ جو سب سے زیادہ عجیب و غریب اور حیرت فزا ہے، یہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ کے شہر "بال" میں ایک مرغ نے انڈیا دیا۔ وہاں کے باشندوں نے اُسے قابلِ اعتراض جرم تصور کرتے ہوئے شہر کی عدالت میں مرغ پر دعویٰ کر دیا، مرغ کو عدالت میں لایا گیا، عدالت نے شہر کے کاہنوں، افسروں اور اعیان و اشراف کے روبرو فیصلہ صادر کیا کہ مرغ کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال کر ہلاک کر دیا جائے۔

حیوانات پر جو دعوے کئے جاتے تھے تو صرف اِس خیال سے کہ ان کے اجسام میں ناپاک روحیں حلول کئے ہوئے ہیں، خنزیر یا سور اُن کی نظروں میں ناپاک ترین جانور تھا، اس لئے اس کو سخت سے سخت سزا دی جاتی تھی۔

عہد قدیم کے انسان کسی طرح بھی دورِ حاضر کے دیوالزن اور صغیر السن

بچوں سے زیادہ عاقل، زیادہ فہیم، اور زیادہ باشعور نہ تھے، اُن کے اعتقاد میں حیوانات اور جمادات ان افعال و اعمال میں ذمہ دار قرار دیے جاسکتے تھے جو باضطرار یا بلاشعور اُن سے سرزد ہوتے تھے، یا کسی طرح ان کی طرف منسوب کئے جاسکتے تھے۔ یورپ اور امریکہ میں عہد قریب تک دیوانوں اور کم فہم بچوں کو اُن کے اعمال کا ذمہ دار بنایا جاتا تھا۔ بعض حالات میں ان ممالک کی عدالتیں مضحکہ خیز فیصلے دیا کرتی تھیں۔ حال ہی میں امریکہ کے ایک شہر میں چھ سال کے نوعمر بچہ پر دعویٰ کیا گیا کہ اُس نے بندوق سے ایک شخص کو ہلاک کر دیا ہے۔ جج نے حکم دیا کہ اس بچے کو پندرہ سال کے لئے اصلاحی جیل میں بھیجا جائے۔

۱۹۴۰ء میں امریکہ کی ایک عدالت نے دو شخصوں کو دس دس سال کی سزا اس بنیاد پر دی تھی کہ انھوں نے اشتراکیت کی تائید میں کچھ کہنا چاہا تھا۔

اس کے علاوہ چند اور عدالتی فیصلے بھی ہیں جن میں سہل سے سہل جرم کی سزا دشوار سے دشوار دی گئی ہے۔

یہ اور اس قسم کے بے شمار فیصلے علامت ہیں اس امر کی کہ یہ عدالتیں ذمہ داری کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کرتی ہیں، اور ان حالات و ظروف پر نظر کئے بغیر، جن میں جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ مجرموں کو سزا دیدیتی ہیں۔

جہاں تک ذمہ داری یا مسئولیت کا سوال ہے ہم بھی اس کا مفہوم وہی سمجھتے ہیں جو قرونِ متوسط میں یا اس سے پہلے سمجھا جاتا تھا۔ اگر کوئی فرق ہے تو اس قدر کہ ہم ذمہ دار صرف انسان کو قرار دیتے ہیں اور وہ حیوان اور جماد، جاندار اور بے جان سب کو ذمہ دار تصور کرتے تھے۔

تضمین

من در طلبِ تو بہ مرادے نہ رسیدہ　　صیادم و دارم سرِ آہوئے رمیدہ

محروم پر و بالم و تو اوج نشینی　　کوتاہ کمندم سرِ بامت نہ رسیدہ

معتوبم و افسردہ دلم، تشنہ مشامم　　وز گلشنِ مہرِ تو نسیمے نہ وزیدہ

صد برق بہ آغوشِ فلک شد متبسم　　حالانکہ سرِ شاخِ نشیمن نہ دمیدہ

با اینہمہ محسودِ رقیبانم و رسوا　　عاصی شدم و لذتِ عصیاں نچشیدہ

"در کوئے تو معروفم و از روئے تو محروم
گرگِ دہن آلودہ و یوسف نہ دریدہ" (سعدی)

رزمی صدیقی

جانوروں کے مختلف رنگ

محمد یوسف، کلکتہ

یہ مسئلہ علم نباتات (Botany) اور علم حیوانات (Zoology) کا مشترک موضوع ہے۔ جس قدر تحقیقات اس وقت تک ہوئی ہیں۔ وہ گو ایک مرتب صورت میں مدون کردی گئی ہیں۔ تاہم اُنھیں ابتدائی درجہ سے آگے بڑھنے کا موقع نہیں ملا ہے، کیونکہ مقاصد و علل کا بہت کم حصہ سامنے آیا ہے، اور بہت بڑا میدان ابھی باقی ہے۔

علمائے وظائف الاعضا (Physiology) کے ایک گروہ کی تحقیقات یہ ہے کہ حیوانات میں اختلافِ الوان محض فزیالوجی کل اسباب سے پیدا ہوا ہے۔ اور اس میں قدرت کے کسی ارادے اور قصد یا تقدیر و تخمینی کو دخل نہیں۔ فزیالوجی کا صحیح ترجمہ میرے خیال سے "علم وظائف الاعضا" ہے اور فزیالوجی کل اسباب، وہ اسباب و موثرات ہیں۔ جن کا تعلق علم وظائف الاعضا سے ہے۔ پس میں پہلے اُن کی تحقیقات کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

مادی اشیا، خواہ وہ حیوانات ہوں، یا نباتات یا جمادات، اُن کے لئے اکثر حالتوں میں رنگ کا ہونا لازمی ہے۔ حیوانات اور نباتات ایک طرف رہے جمادات میں بھی بمشکل کوئی ایسی مثال ملے گی۔ جس کا بعض گیسوں کی طرح کوئی خاص رنگ نہ ہو۔ چونکہ تمام حیوانات اور نباتات کے جسم اور جمادات سے مرکب ہیں اس لئے طبیعی طور پر اُن کے جسموں میں اِن جمادات کے رنگ کا رنگ ہونا ضروری ہے۔ البتہ ہماری آنکھوں کو صرف وہی رنگ نظر آتا ہے جو جسم کی بالائی سطح سے قریب ہوتا ہے۔ مگر جب کسی جسم کی تشریح کی جاتی ہے تو اس میں اُن تمام جمادات کے رنگ یا اُن کے آثار نظر آجاتے ہیں۔ جن سے اُن کا قوام مرکب ہوتا ہے۔

علم حیوانات کی اصطلاح میں، حیوانات کی ایک قسم پروٹوزوا Protozoa یعنی حیوانات اُولی ہے، جس قسم کے حیوانات پر اِس اصطلاح کا اطلاق ہوتا ہے اُن کی نسبت ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا درحقیقت وہ سلسلۂ حیوانات کا اولین حلقہ ہیں یا اُن سے بھی پہلے کوئی کڑی ہونی چاہیئے قطعی جواب تو اِس کا کوئی نہیں دیا گیا۔ اور غالباً دیا بھی نہیں جاسکتا۔ البتہ موجودہ معلومات سے یہ امر مسلمہ ہے، کہ اِس وقت تک جتنے بھی حیوانات دریافت ہوئے ہیں، اُن سب میں بسیط ترین اور اولین حیوان بھی ہیں۔ اِن حیوانات کے جسم سے ایک خاص قسم کا لیسدار مادہ خارج ہوتا ہے، اِس مادہ سے جب بالو کے ذرات ملتے ہیں، تو فوراً چپک جاتے ہیں، اور اِن سے ایک خول (case) سا تیار ہو جاتا ہے، عموماً اِس خول کا رنگ حیوان کے جسم کا رنگ سمجھا جاتا ہے، اب غور طلب چیز یہ ہے کہ اِس میں رنگ کس چیز کا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ بالو کے علاوہ اور کسی چیز کا نہیں ہوسکتا۔

حیوانات کے ظاہری اعضا کی طرح اندرونی اعضا کے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً جگر کا رنگ اور ہے۔ دل کا اور۔ گردہ کا رنگ جدا ہے اور آنتوں کا جدا۔ مگر ظاہری اعضا کی طرح اُن کے رنگوں کا اختلاف بھی فزیالوجی کل اسباب کا ہی نتیجہ ہے۔ چنانچہ اُن کی کیمیاوی تشریح کے نتائج اِس کی تسلی بخش شہادت دیتے ہیں۔

یہ ہیں علم وظائف الاعضا کی دلائل

خود علمائے علم الحیات نے ہمیں بتایا ہے کہ جاندار چیزوں کی بالیدگی

ایک خاص قانون کے ماتحت ہوتی ہے جس کو موازنہ یا "مقایسہ" کہتے ہیں۔ یعنی
مختلف اشیاء کا باہم قیاس میں لانا، اور اُن کا موازنہ کرنا۔ یہ قانون جس طرح
حیوانات کے قد، جسم اور اندرونی ساخت میں نافذ ہے، بالکل اسی طرح رنگ
میں بھی جاری ہے، چنانچہ جب ہم مختلف الوانِ حیوانات کو غور سے دیکھتے
ہیں، تو اُن کی رنگا رنگی اِس کے ماتحت نظر آتی ہے، اگر ایک جانور کے داہنے
بازو پر خاص رنگین خط یا گل ہے تو ضرور ہے کہ دوسرے بازو پر بھی بعینہٖ
اُس کی جگہ ویسا ہی رنگ ہوگا، کیونکہ دونوں بازوؤں کا خمیر ایک ہی قسم
اور ایک ہی مقدار کے مادہ سے بنا ہے،

شیر اور چیتے کے جسم کا موازنہ کیجئے۔ مور کے پروں کا مطالعہ کیجئے،
کس نظام و ترتیب اور تناسب و تقابل کے ساتھ ایک بہتر سے بہتر نقاش
کی طرح نقاشی کی گئی ہے، جس سے زیادہ متناسب اور باقاعدہ نقش ونگار
ہو نہیں سکتے۔ مختلف قسم کے ہوائی پرندوں پر نظر ڈالئے، اور چھوٹی چھوٹی
تتلیوں کو دیکھئے، جو شام کو اُڑتی ہوئی پودوں اور پھولوں پر آبیٹھتی ہیں،
اِن کے پروں میں نقش ونگار، رنگ کا نمود، کیسا باقاعدہ، کیسا منظم، کیسا
مرتب، کس درجہ بااصول ہے، ایک معمولی نقاش چند لکیریں بھی کھینچتا ہے
تو کسی نہ کسی تصویر و نقش کے مقصد کو اپنے سامنے رکھتا ہے، پھر کیا قدرت
کی اتنی بڑی نقاشی، محض ایک بے قصد و بے مقصد اتفاق اور ترکیب
جسمی ہی کا نتیجہ ہے؟ اور کوئی غرض اور کوئی حکمت اِس میں پوشیدہ
نہیں؟

علمائے حیوانات، قانونِ مقایسہ کو رنگوں میں ایک باقاعدہ
مؤثر قانون تسلیم کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اکثر شیر کے خطوط میں ایک ناقابلِ
محسوس تسویہ اور نظام محفوظ ہوتا ہے، تو اِس کی وجہ صرف یہی قانون ہے۔
جس کے سبب سے اِس کے دونوں پہلوؤں میں مماثلت و مساوات نظر
آتی ہے۔ بیشک بعض مثالیں ایسی بھی ملیں گی جہاں یہ قانون بظاہر غیر
مؤثر نظر آئے گا۔ لیکن جب زیادہ دقتِ نظر سے کام لیا جائے گا، تو
معلوم ہو جائے گا کہ دراصل وہاں بھی یہی قانون محفوظ ہے۔ مگر کسی
غیر طبعی سبب سے (مثلاً مختلف قسموں کے باہمی اختلاط سے یا گردوپیش کے
بعض مؤثراتِ خارجیہ سے، یا بعض عوارض اور اُن کے توارث وغیرہ سے)
یہ حالت پیدا ہو گئی ہے۔

ہمارے سامنے محققینِ فائزین کا ایک ایسا گروہ بھی ہے جس نے اسرارِ
الوان کا غائر تر نظر سے مطالعہ کیا ہے، اور اِسے محض فزیالوجی کل مؤثرات
کا نتیجہ بے قصد سمجھ لینے پر ہماری طرح قانع نہیں ہے، اس بارے میں ہمیں
سب سے زیادہ مشہور معلم چارلس ڈارون کا ممنون ہونا چاہئے، جس نے
اپنے سفر امریکہ کے جمع کردہ جانوروں کے متعلق تحقیقات کرتے ہوئے اِس
موضوع کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے بعد بعض علمائے حال ہیں جو علم حیوانات
کی تحقیق طلب راہوں میں تلاشِ منزلِ مقصود کے لئے تگ و دو کر رہے
ہیں۔ قانونِ نشوونما وارتقا یا ڈارونزم (Darwinism) کا
ایک بنیادی مسئلہ (Teleology) ہے جس کا ترجمہ قانونِ
مطابقت کیا گیا ہے، اور تراجم عثمانیہ یونیورسٹی نے اِس کا ترجمہ تاثراتِ
وسط، کیا ہے۔ مختصر الفاظ میں اِس کا خلاصہ یہ ہے کہ حیوانات پر اُن کے
گردوپیش اور مولد و موطن کے تمام حالات کا اثر پڑتا ہے، اور رفتہ رفتہ
اُن کے اعضاء اور جسم میں تغیرات پیدا کر دیتا ہے۔ جس قسم کی آب و ہوا میں
رہتے ہیں، جس طرح کا مکان اُنھیں ملتا ہے جیسی غذا اُن کے اندر جاتی
ہے، اُس کے مطابق اُن میں جسمی تغیرات بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اور اُن کے
مناسب اُن کے جسم کی ہر شے ہو جاتی ہے۔

اِس قانونِ مطابقت سے اختلافِ الوان کے ایک بہت بڑے بھید کا
انکشاف ہوتا ہے۔ خود علمائے حیوانات کی تحقیق میں ابھی لکھ چکا ہوں کہ اشیا
کا رنگ اُن اجزا کے رنگ کا نتیجہ ہوتا ہے، جس سے وہ ترکیب پاتے ہیں۔
مثلاً پتہ سبز ہوتا ہے، اس لئے کہ اُس میں کلوروفیل (Chlorophyll)
ہوتا ہے، جو سبز ہے، خون سُرخ ہوتا ہے کیونکہ یہ ہیموگلوبین سے مملو ہے، جو
سُرخ ہے۔

پس اگر صرف نباتات اور جمادات کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا
کہ کرۂ ارض کے مختلف حصوں میں عالمِ نباتات اور جمادات کی جس قدر بھی
پیداوار ہیں، اُن کی رنگت اُن اجزا کی وجہ سے ایک خاص قسم کی ہو گئی ہے،
جن کی اُن حصوں میں قدرت نے کثرت و فراوانی رکھی ہے، اور اسی لئے
ہر حصۂ زمین میں کسی خاص رنگت کا غلبہ اور احاطہ ہے۔

جب حیوانات اُن حصوں میں رہنے لگے تو قانونِ مطابقت نے جس
طرح اُن کی تمام جسمانی حالت اور قویٰ کو اُن کے وسط کے مطابق بنا دیا۔

اسی طرح ضروری تھا، کہ اُن کی رنگت بھی اُن کے وسط کے مطابق ہوتی، کیونکہ قانونِ مطابقت ہر جسمانی انفعال پر موثر ہے۔

چنانچہ تحقیقات سے نظر آتا ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ حیوانات کی ایک بہت بڑی تعداد کے متعلق ثابت ہو چکا ہے کہ اُن کے جسم کی رنگت بعینہٖ ویسی ہے، جیسی رنگت اُن کے گرد وپیش کے درختوں، پھولوں، پتوں، پتھر اور زمین کی ہے، یا اُن طبعی موجودات کی ہے، جن سے وہ خطہ گھرا ہوا ہے، علمائے نشوو ارتقار نے اس حالت کو ایک خاص موثر طبعی تسلیم کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ "مماثلت وسط" ہے۔ یعنی گرد وپیش سے حیوانات کے جسم کا رنگ ہم آہنگ ہو گیا ہے۔

مثلاً شیر نیستان میں رہتا ہے۔ اس کا اصلی وطن وہی ہے، گو وہ کسی غار کے اندر۔ یا دریا کے کنارے پر لیٹا ہوا نظر آ جائے، پس اسی لئے اس کی کھال کے بالوں کا رنگ دھاری دار خاکی، یا مٹیالا ہوتا ہے۔ بعض شیر ایسے ہیں، جو ریگستان میں رہتے ہیں۔ پس اُن کی رنگت بھی گرد آلود زردی مائل اور بالکل ریت کی سی ہوتی ہے۔

قطب شمالی کے دب کی رنگت دیکھی گئی ہے کہ بالکل سفید ہوتی ہے، کیونکہ اس کے وطن کی زمین ہمیشہ برف سے سفید رہتی ہے۔ اسی طرح بیشمار پرند جو درختوں میں آشیانے بناتے ہیں، اور اُن کی رنگت بالکل اُن پتوں کی ہوتی ہے جو اُن درختوں کی شاخوں میں لگتے ہیں۔

یہ مماثلت خواہ حیوانات اولیٰ کے لیس دار جسم کے ساتھ خارجی اجزائے ارضیہ کے مل جانے کا نتیجہ ہو، جیسا کہ علمائے وظائف الاعضار کا قول اور لکھا جا چکا ہے۔ یا کسی مخفی قانونِ طبعی کا نتیجہ۔ مگر بہرحال قانونِ نشوو ارتقا کے علمار تسلیم کرتے ہیں کہ اس کے اندر بعض بیش بہا منافع اور حکمتیں نظر آتی ہیں۔

از آنجملہ ایک حکمت جس تک فہم انسانی دسترس پا سکی، یہ ہے کہ یہ مماثلت حیوانات کی زندگی کے بقا اور دشمنوں سے حفظ کا ایک بہت بڑا وسیلہ ہے، یہ اگر نہ ہوتی تو ہزار ہا حیوانات دنیا سے نابود ہو جاتے ہیں، اس مماثلت کی وجہ سے وہ اپنے دشمنوں اور اپنے سے قوی تر حیوانات کی نظروں سے پوشیدہ ہو جاتے ہیں، کیونکہ اُن کی رنگت اور اِن کے گرد وپیش کی اشیا کی رنگت ایک ہی ہے، اس لئے اِن کے دشمن کی نظریں

اِن کے وجود کو اردگرد کی چیزوں سے الگ کرکے نہیں دیکھ سکتیں اور وہ اِن کے حملہ سے محفوظ رہ جاتے ہیں۔ گویا رنگت اِن کے لئے ایک بہترین کمین گاہ کا کام دیتی ہے۔

برفستان کے اندر جانوروں کو دیکھنا کس قدر مشکل ہے، جن کی رنگت کی سفیدی اور برف کی سفیدی میں کوئی تمیز نہیں۔ ریگستان کے اندر اُن جانوروں کو کیونکر پہچانا جا سکتا ہے جو ریت کے کسی ٹیلے کے ساتھ لگ کر لیٹ گئے ہیں، اور اُن کی کھال بالکل اُسی رنگ کی ہے جو رنگت ریت کی ہوتی ہے۔ اس کا صحیح اندازہ اُن لوگوں کو ہو سکتا ہے جو شکار کے شائق ہیں، اور بسا اوقات جنگلوں میں، سانپ کی نکلی ہوئی دُم کو ایک خوشنما اور رنگین پتہ سمجھکر پکڑ لیا ہے، حالانکہ وہ اُس رنگت کا سانپ تھا جس رنگ کے پتوں اور گھاس سے جنگل کا وہ ٹکڑا ابھرا ہوا ہے۔

یہ دنیا تنازع للبقا کا (Struggle for Existence) میدانِ کارزار ہے، اور ہر حیوان اپنے دشمنوں کی بڑی بڑی صفیں اپنے سامنے رکھتا ہے، جو اس کے قرب وجوار میں پھیلی ہوئی ہیں، یا اُس فضا میں اُڑتی پھرتی ہیں، جو اس کے اوپر پھیلا ہوا ہے، اگر حیوانات کی رنگت اُس زمین اور وسط سے مطابق نہ ہوتی جس میں وہ رہتے ہیں، تو اِن کے لئے اپنے گھونسلوں سے نکل کر تلاشِ غذا میں پھرنا اور زندہ رہنا کس قدر مشکل ہوتا۔ لیکن قدرت نے اِن کی رنگت کو اِن کے وسط کی رنگت کے مثل بنا کر اُنھیں دشمنوں کی نظر سے آڑ میں کر دیا۔ وہ نکلتے ہیں، زمین پر پھرتے ہیں، ایک درخت سے اُڑ کر دوسرے درخت پر جاتے ہیں۔ لیکن اُن کے دشمن اکثر اوقات اُنھیں پہچان نہیں سکتے۔

اگر ایک طبیعانہ مذاق رکھنے والا قدرت کی نوازش اور مہربانی کے علاوہ کسی دوسری چیز کا بھی طالب ہو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اِن حیوانات میں پہلے وہ تمام رنگ پیدا ہوئے، جنھیں علم وظائف الاعضار کی رو سے پیدا ہونا چاہئے تھا، مگر بعد میں انتخابِ طبعی (Natural Selection) کا عمل شروع ہوا، جس کے معنی یہ ہیں کہ فطرت صرف، قوی۔ موافق، مناسب، موزوں، اور صحیح وسالم چیزوں کو باقی رہنے دیتی ہے، اور نشوونما کے لئے چھانٹ لیتی ہے۔ باقی معدوم ونابود ہو جاتے، پس جب یہ انتخاب نافذ ہوا تو صرف وہی رنگ رہ گئے جو اُن کے

وسط اور محیط کے مناسب تھے۔ اور بقیہ سب رنگ بہت سے اعضا کی طرح ناپید ہوگئے۔

اِس سے بھی بڑھکر اختلاف الوان کے مصالح کا پتہ و سراغ اُس نظریہ سے لگتا ہے۔ جسے انتخاب جنسی (Sexual Selection) کہتے ہیں۔ خواہ اسباب کچھ ہوں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ہر قسم کے حیوانات کی خاص خاص اور الگ الگ غذائیں ہیں، علم وظائف الاعضا کی رو سے جسم پر جن چیزوں کا اثر پڑتا ہے، ان میں ایک بڑی شے غذا بھی ہے، غذا کا اثر رنگ پر بھی ہوتا ہے، جو بقدرِ استعدادِ طبعی کم و بیش ہوتا رہتا ہے، چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ حیوانات کی غذاؤں کے رنگ اگر روشن ہیں تو خود اُن کے جسموں کے رنگ بھی روشن ہوتے ہیں، اگر غذا کا رنگ تاریک ہے تو خود اُن کا رنگ بھی تاریک ہے۔ مثلاً طوطا زیادہ تر پھل کھاتا ہے، اس لئے اس کا قیام پھل والے درختوں میں رہتا ہے۔ درختوں کے رنگ عموماً روشن ہوتے ہیں، اس لئے اس کا رنگ بھی روشن ہے، یا بعض قسم کی مکھیاں ہیں، جو گندی جگہ پر رہتی ہیں، اور نجاست پر زندگی بسر کرتی ہیں۔ جس کا رنگ تاریک ہوتا ہے تو خود بھی اُن کا رنگ تاریک ہوجاتا ہے۔

ایک عرصہ کے استعمال سے جانوروں کو اپنی غذاؤں کے رنگ سے ایک خاص قسم کی موانست ہوجاتی ہے، اس لئے جب اِن کی تناسلی خواہش میں حرکت ہوتی ہے، تو دوسری جنس کے اُنھیں افراد کی طرف بالطبع زیادہ مائل ہوتے ہیں۔ جن میں اُن کی غذاؤں کے رنگ زیادہ نمایاں ہوتے ہیں، یہی شے ہے جس کو انتخابِ جنسی (Sexual Selection) کہتے ہیں،

پس جس طرح قانونِ ارتقار کا انتخابِ طبعی ایک مدتِ مدید کے بعد پوری نوع کی نوع میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ اِسی طرح انتخابِ جنسی بھی انواع کے رنگ پر حیرت انگیز تغیرات طاری کر دیتا ہے۔

بہت سے جانور ایسے ہیں، جن کے رنگ عام طور پر تو معمولی حالت میں رہتے ہیں۔ مگر جب اِن کے توالد و تناسل کا موسم آتا ہے، اور نر اور مادہ کی یکجائی ضروری ہوتی ہے، تو رنگوں میں ایک دلفریب چمک دمک اور ایک خاص رونق و حُسن پیدا ہوجاتا ہے، حیوانات کی بعض انواع یعنی کبوتر، فاختہ، مور وغیرہ ایسی ہیں جو اتحاد و تناسل سے پہلے اپنی مادہ کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے مستانہ رقص و تواجد کرتے ہیں، اور اپنے پروں کے دلفریب رنگوں کی ایک خاص انداز سے نمائش کرتے ہیں۔ اِس کی وجہ سے اِن کے اندر ایک خاص دلفریبی و رعنائی کی کشش پیدا ہوجاتی ہے، جو بے اختیار مادہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اور جذبۂ طبعی کے لئے اختلافِ الوان ایک بہت بڑا معینِ خارجی بن جاتا ہے۔

غرضیکہ حیوانات کی جنسی خواہش پر رنگوں کا اثر پڑتا ہے، اور زیادہ تر وہی رنگ موثر ہوتے ہیں، جو محبوب و دلفریب، نظر افروز و دلپسند ہوتے ہیں۔ اس لئے ثابت ہوا کہ حیوانات کی نسل کی افزائش و حفاظت کے لئے قانونِ انتخابِ جنسی اپنا کام کرتا رہتا ہے اور حیوانات کی رنگت ایک بہت بڑے مقصدِ حیات کو پورا کرتی ہے۔

محشر میں پناہ ہے یہی مجبوریِ جبر
اک بندۂ مجبور کی آخر تقصیر؟
آواز تو دو کوئی کدھر ہیں آخر
اجلال و وراثت و سرشت و تقدیر
جوش

حق بحق دار رسید یا لیٹرا بادشاہ

عبدالواسع عصری چیمگلوری

افرادِ ڈراما

بادشاہ۔
فرخندہ یا حسینہ۔ بادشاہ کی بیٹی۔
نوجوان۔

پہلا ایکٹ

منظرِ اول۔ صحرا کا لق ودق میدان جنگلی ڈاکو ایک حسین دوشیزہ کو مارپیٹ کر رہے ہیں، وہ آہ و نالہ کر رہی ہے، ایک نوجوان گھوڑے پر سوار اُسی راستے سے گزرتا ہے اور رونے کی آواز سُنکر گھوڑا کھڑا کرکے اِدھر اُدھر نظر ڈالتا ہے، یکایک اُس کی نگاہ چند درختوں کے جُھنڈ پر پڑتی ہے۔

نوجوان۔ آہا ہا ظلم ـــــ ایک بیکس پر، کمزور ہستی پر ـــــ کس قدر سنگدل ہیں یہ دنیا کے لوگ ـــــ کیا کیا جائے (سوچتا اور اپنے ریوالور کو نکال کر دیکھتا ہے) ظالموں کی تعداد بہت ہوگی ـــــ اور میں تنہا اُن کا مقابلہ ـــــ ناممکن ـــــ (پھر کچھ سوچنے کے بعد) نہیں ـــــ میں انسان ہوں ـــــ مجھے مظلوم کی حمایت کرنی چاہیئے۔ یہ میری زندگی کا فرض ہے۔ (اُٹھتا ہے، ریوالور ہاتھ میں لئے ہوئے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا جائے وقوع پر پہنچتا ہے۔ تھوڑے ڈاکو گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنکر فرار ہوجاتے ہیں، صرف دو ڈاکو جو حسینہ کو مار رہے تھے ٹھہرے رہتے ہیں۔)

نوجوان۔ شراب کھینچی جا رہی ہے یا کسی انسان کی کھال؟

ڈاکو۔ تم کون ہو؟

نوجوان۔ پہلے میرے سوال کا جواب دو۔

ڈاکو۔ تمہارے سوال کا جواب (کوڑے دکھا کر) اِن سے دیا جائے گا۔

نوجوان۔ اے بھیڑیئے کا دل رکھنے والے شیطانو! شرم کرو، اور اس حسینہ کی مشکیں کھول دو۔

ڈاکو۔ اے نوجوان! آنکھوں کی گرد صاف کر اور غور سے دیکھ ـــــ پھر سمجھ لے کہ ـــــ

نوجوان۔ (گھوڑے سے اُتر کر) خبردار۔ (ریوالور نکال کر) پھر دوسرا لفظ زبان سے نکلا تو سمجھ لو کہ خیر نہیں۔ (ڈاکو ڈر جاتے ہیں، اور بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نوجوان حسینہ کے سینے کی رسی کھولتا ہے۔ ڈاکو فرار ہوجاتے ہیں، نوجوان بے ہوش حسینہ کو ایک چشمے کے قریب لے جاتا اور زخم دھوتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد حسینہ کو ہوش آتا ہے)

حسینہ۔ (آنکھیں کھول کر) یہ کون ـــــ انسان یا فرشتہ۔

نوجوان۔ میں فرشتہ نہیں بلکہ فرشتہ سیرت انسانوں کا غلام۔

حسینہ۔ آپ نے میری جان بچائی۔

نوجوان۔ نہیں، بلکہ خدا نے۔

حسینہ۔ آہ ـــــ تم کتنے خوبصورت ہو

نوجوان۔ خوبصورتی، ظاہری خط و خال میں نہیں ـــــ دل کی صفائی اور نیک افعال میں ہے۔ آہ ـــــ انسان کتنا ظاہر بین ہے، خدایا ان غریبوں مسکینوں، اور مظلوموں کا کیا حال ہوگا جو خوبصورت ہونے پر بھی، کالی گھٹا میں چاند کی طرح منہ چھپائے پڑی ہیں (حسینہ کی طرف دیکھ کر) آپ اپنا ٹھکانا بتا دیجئے، تاکہ میں آسانی سے وہاں پہنچا دوں۔

حسینہ۔ آپ کا نام کیا ہے اور کہاں کے باشندے ہیں۔

نوجوان۔ یہ نہ پوچھئے کہ میں کون ہوں؟

حسینہ۔ آپ کے احسانوں کا بھاری بوجھ مجھے شرمندہ بنا رہا ہے،

نوجوان۔ بے شک۔ مگر میں مجبور ہوں، اس کے سوا اور کیا کرسکتا تھا۔

حسینہ۔ تو کیا آپ مجھکو مایوس کرنا چاہتے ہیں ـــــ

نوجوان۔ معاف فرمایئے۔ میں ایک پراسرار زندگی بسر کر رہا ہوں، میری زندگی کی کشتی زمانے کے مسلسل حادثوں کا شکار ہو رہی ہے۔ دشمن میری گھات میں ہیں، اللہ سے امید رکھئے۔ اگر آپ میری سچی قدر کر رہی ہیں تو وہ ہمیں ضرور ملا دے گا۔

حسینہ۔ آہ کتنی دل دکھانے والی بات ہے۔

نوجوان۔ بات نہیں سمجھا ہے، اچھا چلئے۔ جلد اپنے گھر کا پتہ بتا دیجئے۔

حسینہ۔ میں عراق کے ایک سردار کی بیٹی ہوں۔ اور بصرہ میرا شہر ہے۔

نوجوان۔ میرے گھوڑے پر سوار ہو جایئے۔ اس کے سوا اور کوئی صورت اس وقت ممکن نہیں۔ نوجوان حسینہ کو گھوڑے پر سوار کرکے روانہ ہو جاتا ہے، اور لڑکی کو اس کے مکان میں پہنچا کر خدا حافظ کہتا ہوا نکل جاتا ہے۔

دوسرا منظر

بصرہ کا ایک تنگ و تاریک کوچہ، رات کا وقت ہے، فضا خاموش ہے۔ نوجوان کا اس کوچے سے گزر ہوتا ہے۔ ایک گھر کا سارا کنبہ باہر نکل کر بے سر و سامانی کا نوحہ کر رہا ہے۔ نوجوان وہاں پہونچ کر حالات پوچھتا ہے،

نوجوان۔ بتا اے مرد غریب! کس سیاہ کار کے زہر آلود ناخن نے تیرے دل کو زخمی کیا ہے۔

بوڑھا۔ بھائی! میں ایک غریب کسان ہوں۔ سرمایہ دار زمیندار نے مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے، اُس نے میری ساری جائداد اپنے قرض میں ضبط کرلی ہے، آہ میرے ننھے ننھے بچے بھوک سے تڑپ رہے ہیں۔ آہ۔ ان کمزور ہاتھوں اور کندھوں میں اتنی طاقت کہاں کہ بوجھ ڈھو کر ان کے لئے دال بھات کا سامان کروں۔

نوجوان۔ خدایا کتنا درد انگیز نظارہ ہے، اُس امیر کا مکان کہاں ہے؟

بوڑھا۔ اسی گلی کے قریب بڑی سڑک کے وسط میں ایک عالیشان کوٹھی ہے۔

نوجوان۔ ٹھیرو ـــــ میں ابھی آتا ہوں ـــــ (نوجوان جاتا اور سڑک پر پہنچکر گھوڑے کو چھوڑ دیتا ہے، اور سیاہ لباس پہنکر ریوالور ہاتھ میں لئے ہوئے چھپتا ہوا، کوٹھی کے بالائی حصے پر چڑھ جاتا ہے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ شمع جل رہی ہے۔ امیر ایک کرسی پر بیٹھا ہوا کسی ناول کا مطالعہ کر رہا ہے، نوجوان کمرے میں داخل ہو کر ریوالور آگے بڑھاتا اور کہتا ہے)

نوجوان۔ خاموش رہنا، زبان سے کوئی لفظ نہ نکلے، (امیر مڑ کر دیکھتا اور گھبرا جاتا ہے، پکارنے کی ناکام کوشش کرتا ہے، مگر نوجوان ریوالور کی نال سینے سے لگا دیتا ہے)

امیر۔ تو کیا چاہتا ہے۔

نوجوان۔ روپیہ اور کاغذات۔

امیر۔ کتنا اور کاغذات کیسے؟

نوجوان۔ غریب کسان کی جائداد کے کاغذات اور پانچ ہزار روپیہ

امیر۔ یہ میں نہیں دے سکتا۔

نوجوان۔ تو موت کے پنجے سے بھی نہیں چھوٹ سکتا۔

امیر۔ تو کون ہے،

نوجوان۔ یہ میں نہیں بتا سکتا۔

امیر۔ ظالم! تو چور ہے۔ ابھی پولس کو خبر کر دوں گا۔ کسی کو پکارنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر نوجوان اس کو گھونسے مار کر دم بخود کر دیتا ہے اور اپنی رسی سے امیر کو ستون سے باندھ دیتا ہے، پھر پلنگ سے کنجیوں کے گچھے کو اٹھاتا اور الماری کھول کر روپے کا کاغذات کی گڈی اٹھائے جاتا ہے، اور غریب کسان کے گھر پہنچکر کہتا ہے۔

نوجوان۔ (تھیلی سامنے رکھتے ہوئے) یہ لو۔ کاغذات اور روپوں کی تھیلی۔

کسان۔ (خوش ہوکر) اے غریبوں کے دلوں پر راج کرنے والے، زخمی جگر پر مرہم رکھنے والے یہ تو بتاؤ کہ تم ہو کون؟

نوجوان۔ یہ نہ پوچھو۔ مگر خبردار! یہ راز کسی پر فاش ہونے دینا۔ خدا حافظ۔ (باہر نکل جاتا ہے)

تیسرا منظر

سرائے

سرائے میں مسافروں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ سرائے کا داروغہ صدر دروازے میں بیٹھا ہوا ہے۔ انھیں مسافروں میں ایک بڑھیا ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ سرائے میں داخل ہونا چاہتی ہے۔

بڑھیا۔ داروغہ صاحب ہمیں اس سرائے میں ایک رات ٹھہرنے کی اجازت دیجئے۔ میں مصیبت کی ماری ہوں۔ سردی سے ہاتھ پاؤں ٹھٹھر رہے ہیں۔

داروغہ۔ جا جا ـــــ بڑی آئی آرام کرنے۔ کیا سرائے تیرے باپ نے بنوائی تھی۔

بڑھیا۔ ارے بابا! سرائے تو مسافروں کے لئے ہے۔ خدا کے لئے مجھ غریب پر رحم کھاؤ۔

داروغہ۔ جا جا ـــــ مسجد میں جا ـــــ رحم کی درخواست ملاؤں سے کر۔

لڑکی۔ کیا سرائے غریبوں کے لئے نہیں ہے؟

داروغہ۔ اری مغرور لڑکی! اگر سرائے میں رہنا پسند کرتی ہے تو یہ بتا کہ تو نے کسی سے آنکھیں لڑانا بھی سیکھی ہیں؟

لڑکی۔ یہ سرائے ہے یا کسبی بازار۔ شاید تم بازاریوں کے ٹھیکیدار ہو، سرائے کے نگراں نہیں۔

داروغہ۔ اری بدزبان لڑکی ـــــ اپنی عزت اور عصمت کی خیر چاہتی ہے تو یہاں سے نکل جا۔ ورنہ ـــــ

لڑکی۔ ایک شریف لڑکی تیرے سے شہوت پرستوں کے دماغ کی کیلیں ڈھیلی کردے گی۔ مگر اپنے دامنِ عصمت پر دھبا نہ آنے دے گی۔ سمجھتا کیا ہے؟

داروغہ۔ (غصے سے) اپنا ڈنڈا اٹھاتا اور مارنا چاہتا ہے کہ ایک نوجوان فوراً داروغہ کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔

نوجوان۔ عورتوں پر مرد ہاتھ نہیں اُٹھاتے۔ مسلمان کسی بیکس و مظلوم کا دل نہیں دُکھاتے۔ زخمی شیر کو پچھاڑ کر، مرنے والے کو مار کر اپنی بہادری کا دعویٰ نہیں کرتے۔ البتہ ایک کمزور عورت پر لاٹھی چلا کر اپنی فوقیت جتانا اور اپنا رتبۂ بہادری بڑھانا چاہتے ہیں یہ اچھا نہیں ـــــ آہ آج کل کمزوروں پر دباؤ ڈال کر اپنا مطلب نکالنا اور اپنے ہم قوموں کا گلا گھونٹ کر دوسروں کو فائدہ پہنچانا، کامیابی کی کنجی سمجھا رہا ہے ـــــ

داروغہ۔ آخر تو کونسا امیرزادہ ہے۔

نوجوان۔ تجھ کو یہ پُوچھنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر تو مسلمان ہے عورتوں کی تعظیم کر اور اُن کے لئے آرام کا سامان کر۔

داروغہ۔ میں نے تیرے سے مسلمانوں کو بہت دیکھا ہے۔ ہوٹلوں کے بھٹیارو! تم کو عورت بچوں سے کیا غرض، ہوٹلوں کی دال روٹی، پردہ بیگمیں کی عاشقی تمہارا دن رات کا مشغلہ ہے اور ہمارے ہی منہ پر اپنی بڑائی۔

نوجوان۔ کیا تو اس بڑھیا پر رحم نہیں کھائے گا۔

داروغہ۔ نہیں، ہرگز نہیں۔

نوجوان۔ دیکھ، او مردم آزار دیکھ! بڑھیا سردی سے کانپ رہی ہے۔

داروغہ۔ وہ مر جائے یا جئے۔ جہنم میں جائے یا جنت میں میری بلا سے۔

نوجوان۔ لعنت ہے تیری مسلمانی پر ـــــ تو چاہتا کیا ہے آخر؟

داروغہ۔ دام

نوجوان۔ کتنے

داروغہ۔ ایک رات کے پانچ روپے

نوجوان۔ لے (جیب سے پانچ روپے نکال کر پھینکتا ہے) اگر ان کا ذرا بھی بال بیکا ہوا تو پھر تیری جان کی خیر نہیں ـــــ سُنا

داروغہ۔ بہت اچھا۔

نوجوان۔ (دونوں عورتوں کو کمرے میں داخل کرتا ہے۔ اور سرائے سے باہر نکلتے ہوئے داروغہ سے کہتا ہے) ذرا سنبھل کے رہنا، کل ہی دن تجھ پر بھی آنے والا ہے (چلا جاتا ہے)

چوتھا منظر

سرائے سے تھوڑے فاصلے پر داروغہ کی کوٹھی، داروغہ بستر لیٹا ہوا ہے، نوجوان آدھی رات میں سیاہ لباس پہنے ہوئے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ داروغہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہے،

داروغہ۔ کون ـــــ چور ـــــ رحم ـــــ رحم ـــــ خدا کے لئے رحم

نوجوان۔ درندوں میں رحم کا مادہ نہیں ہوتا۔

داروغہ۔ تو چاہتا کیا ہے،

نوجوان۔ کرایہ

داروغہ۔ کس کا، کیسا، اور کتنا

نوجوان۔ کمرے کا۔ پانچ ہزار روپے

داروغہ۔ افسوس، بُرا پھنسا

نوجوان۔ اس وقت جب کہ جناب عدالت کی کرسی پر تشریف فرما تھے۔

داروغہ۔ مجھے معاف کیجے۔

نوجوان۔ دام کے بغیر معافی نہیں مل سکتی

داروغہ۔ ہائے میں لُٹ گیا، برباد ہو گیا۔

نوجوان۔ کیا لٹیرے بھی کہیں لٹتے ہیں۔ محنت کی کمائی تھوڑی ہی ہے جو مرا جاتا ہے کمبخت!

داروغہ۔ دیکھو تم چور ہو ـــــ آخر ایک نہ ایک دن پھنسو گے اُس وقت میں کام آؤں گا۔

نوجوان۔ میں ایک غلام ملک کے غلام انسان سے مدد کی درخواست نہیں کرتا۔ لومڑی بھی کہیں کسی کے آڑے وقت میں کام آتی ہے۔

داروغہ۔ مجھ پر رحم کرو۔

نوجوان۔ آج کل دام کی قدر رحم سے بڑھکر ہے، روپیہ دو ـــــ ورنہ تمہاری جان کی خیر نہیں۔

داروغہ بادلِ ناخواستہ اُٹھتا اور صندوق کھول کر روپوں کی تھیلی چور کے حوالے کرتا ہے، نوجوان لے کر سیدھا سرائے کے کمرے میں داخل ہوتا اور بڑھیا سے کہتا ہے: یہ لو اماں! (روپے کی تھیلی پیش کرتے ہوئے) صبح سرائے سے نکل کر کہیں آرام کی زندگی گذارو، یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔

بڑھیا۔ خدا تیرا بھلا کرے۔

جوان۔ مگر خبردار، یہ راز فاش نہ ہونے پائے۔

دوسرا ایکٹ

پہلا منظر

محل۔ دربار۔ بادشاہ تخت پر بیٹھا ہے۔ فریادیں سنی جا رہی ہیں۔ وزرأ مصاحب، اُمرا اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہیں، یکایک کسی کے رونے کی آواز سُنائی دیتی ہے۔

امیر۔ دُہائی ہے ـــــ دہائی، ہائے میں لُٹ گیا، مِٹ گیا۔

بادشاہ۔ (کوتوال سے) یہ شور کیسا، دیکھو کون ہے۔

کوتوال۔ ہاں حضور! ایک فریادی ہے۔

بادشاہ۔ حاضر کرو ـــــ (کوتوال اُس کو لاتا ہے) کیا حال ہے، کیوں پریشان ہو۔

امیر۔ جہاں پناہ! کیا بتاؤں۔ زندگی بھر کی ساری کمائی چند منٹوں میں ایک چور کے حوالے ہو گئی۔ امیرانہ ٹھاٹ جاتے رہے، نانِ شبینہ کا محتاج ہو گیا ہوں۔

بادشاہ (کوتوال سے) یہ کیا ماجرا ہے۔ پائے تخت اور یہ اندھیر نگری۔

کوتوال۔ حضور عالی! جان بخشی ہو تو پورا قصہ عرض کروں۔

بادشاہ۔ کیا تم نے اب تک اُس چور کا پتہ نہیں لگایا؟

کوتوال۔ لگایا کیوں نہیں، عالی جاہ! قدم قدم پر جاسوس مقرر ہیں، ـــــ چور کو پکڑ کر لانے پر انعام کا اعلان بھی سارے شہر میں کرا دیا گیا ہے، مگر افسوس ساری تدبیریں بیکار ثابت ہو رہی ہیں۔

بادشاہ! وہ کیسے؟

کوتوال۔ بات اصل یہ ہے کہ وہ چور نہیں بلکہ غریبوں مظلوموں بے کاروں، زمینداروں کی شمعِ اُمید ہے۔ شہر کے غریب طبقے کی کھیتی اُسی سے ہری بھری ہے۔ وہ مُلک کے بیکار طبقے میں عمل کا محرک بن کر بجلی کی طرح گرتا ہے۔ مظلوموں کے تازہ زخم اُسی سے مندمل ہو رہے ہیں۔ مگر امیر اور سرکاری طبقہ اُس سے نالاں ہے۔ میں مجبور ہوں۔ لاکھ جتن کئے مگر سُراغ نہیں ملتا۔

بادشاہ۔ کیا راتوں میں سپاہی شہر میں گشت نہیں کرتے۔

کوتوال۔ کیوں نہیں حضور! اور جب سے اُس کا شور مچا ہے۔ بیچاروں کی جان پر بن آئی ہے۔

بادشاہ۔ (تعجب سے) کیا اس کا پتہ لگانا دشوار ہے۔

کوتوال۔ جان جوکھوں کا کام ہے۔

بادشاہ۔ واہ رے چور ــــــ (وزیروں کی طرف دیکھکر) ایسا چور بھی بھلا آپ لوگوں نے کہیں دیکھا اور سنا ہے۔

وزیراعظم۔ وہ تعریف کے لائق بھی ہے اور قابلِ نفرت بھی۔

کوتوال۔ ظل اللہ! جو کام آج کل حکومت کے لئے دشوار ہے اُس نے آسان بنا دیا ہے۔

بادشاہ۔ کونسا کام

کوتوال۔ بیکاری کا مسئلہ

بادشاہ۔ وہ کیسے

کوتوال۔ وہ امیروں، سرمایہ داروں۔ سرکاری حاکموں کے خرمنِ اُمید پر غضب کی بجلی گراتا ہے، اور غریبوں کو ہر طرح مدد پہنچاتا ہے۔

بادشاہ۔ سمجھتے بھی ہو وہ امیروں کو لوٹ کر ملک کا فائدہ نہیں کرتا۔

کوتوال۔ ضرور کر رہا ہے حضور! وہ حاجت سے زیادہ کسی کو نہیں لوٹتا۔

بادشاہ۔ آخر وہ رہتا کہاں ہے؟ کچھ یہ بھی معلوم ہوا۔

کوتوال۔ وہ ہرجائی ہے۔ ممکن ہے کسی جنگل میں رہتا ہو۔ کیونکہ سارے قافلے اُسی کی پناہ میں صحیح سلامت شہر میں داخل ہوتے ہیں۔ (ایک چپراسی محل میں داخل ہوتا اور سونے کی کشتی میں ایک عرضی گزرانتا ہے)

بادشاہ۔ یہ کیا ہے؟

چپراسی۔ ایک سوار یہ دے گیا ہے۔

کوتوال۔ وہ کِدھر گیا۔

بادشاہ۔ تم کیوں اس قدر حیران ہوتے ہو۔

کوتوال۔ عالی جاہ! ممکن ہے وہی ہو۔

بادشاہ۔ اچھا اس کو پڑھو تو

کوتوال۔ (پڑھتا ہے) "عالی جاہ! ملک میں سرکاری حکام کی رشوت ستانی زوروں پر ہے۔ کسان بیچارے سرمایہ داروں کی چکی میں پسے جارہے ہیں۔ غریبوں کے خون سے ماتھوں پر قشقہ لگایا جارہا ہے۔ اس کی روک تھام آپ کا فرض ہے، آپ کا جاہ و جلال بجا، مگر قدرت بھی کوئی چیز ہے۔ اگر اب بھی آپ نے غفلت کی تو اندیشہ ہے کہ آپ کو بھی قدرت کے زہر آلود خنجر سے دوچار ہونا پڑے گا۔ جو آپ کی بہارِ زندگی کا آخری پیام ہوگا"

بادشاہ۔ یہ لو ــــــ وہ تو مجھے اور میری حکومت کو چیلنج دے رہا ہے۔ بدمعاش کہیں کا ــــــ (کوتوال سے)

کوتوال۔ اگر تم نے اس کو تین دن کے اندر گرفتار نہ کیا تو تمہارے جسم کے ٹکڑوں سے کُتوں کی ضیافت ہوگی۔

کوتوال۔ حضور ہی کوئی تدبیر بتا دیں تو بہتر

بادشاہ۔ (وزیروں سے) کیا کوئی تدبیر سمجھ میں آتی ہے۔

وزیر۔ ہاں ــــــ

بادشاہ۔ کونسی

وزیر۔ اگر کوئی شخص غریبانہ بھیس میں کسی جنگل میں دردبھری آواز سے چیخے اور فریاد کرے گا تو یہ ضرور اُس کی مدد کو آپہنچے گا۔ بس فوراً اپنا کام کر دیجئے۔

بادشاہ (خوش ہوکر) واہ واہ کیا دانائی کی بات بتائی ہے۔ ــــــ شاباش ــــــ سنا کوتوال تم نے

کوتوال۔ جی ہاں، عالی جاہ!

بادشاہ۔ تو جاؤ اِس پر فوراً عمل کرو، اور اس کو زندہ گرفتار کرکے میرے پاس لاؤ۔

کوتوال۔ بہت اچھا ــــــ عالی جاہ! (کوتوال جاتا ہے۔ دربار برخواست ہوتا ہے)

دوسرا منظر

جنگل، ایک موٹے درخت کی ٹہنی پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔

نوجوان۔ خدایا ــــــ آج میرے دل پر مایوسی پانی پر کائی کی طرح کیوں جم رہی ہے۔ دنیا کا ہر منظر اماوس کی رات کی طرح خوفناک کیوں دکھائی دے رہا ہے۔ آہ ــــــ آج میری زندگی کا آخری دن ہے؟ آہ ــــــ واقعی میں گنہگار ہوں، مگر معاف کر خدایا تیرے

باران رحمت برنثار ـــــ آہ اگر دنیا کے سنگدل امیر جونکوں کی طرح خون چوسنے والے سرمایہ دار غربا کی سچی ہمدردی کرتے تو مجھے یہ ناروا پیشہ اختیار نہ کرنا پڑتا ـــــ آہ انسانی بھیڑیئے قوم وملت کے نام پر مہذب ڈاکے ڈال کر اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کی بجائے قوم کی صحیح رہنمائی کرتے تو آج یہ روز بد دیکھنا نصیب کیوں ہوتا۔ میں بدنام ہوا۔ سوسائٹی کے قابل نہ رہا۔ مگر مطمئن ہوں کہ میری زندگی کا ہر لمحہ قوم کی آسودہ حالی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی طرح سود مند ثابت ہوا۔ اب اگر پکڑا بھی جاؤں اور قتل بھی کر دیا جاؤں تو مجھے غم نہیں میں خوشی سے موت کا پیالہ پینے کے لئے تیار ہوں (کوتوال اسی جنگل میں سپاہیوں کو لے آتا اور چھپا دیتا ہے۔ نوجوان ٹہنی پر مغموم بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا ہے، دُور سے کسی کے رونے کی آواز آتی ہے۔ نوجوان گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھتا اور کہتا ہے) شکر ہے کہ میری زندگی کا آخری لمحہ بھی ـــــ (پھر گھبرا کر) ـــــ یہ دھوکا تو نہیں دیا جا رہا ہے ـــــ (سوچتے ہوئے) ساری زندگی انہیں کاموں میں صرف ہوئی ہے۔ آخری وقت میں کیوں گھبراؤں۔ اگر یہ دھوکا بھی ہے تو اللہ میرا حامی و ناصر ہے (درخت سے کودتا اور آواز کی طرف دوڑتا ہے۔ مگر سپاہی اس کو گھیر لیتے ہیں۔ نوجوان چپ چاپ اپنے آپ کو اُن کے حوالے کر دیتا ہے۔ سپاہی اور کوتوال اُس کو زنجیروں میں جکڑ کر بادشاہ کے پاس لے جاتے ہیں۔)

تیسرا منظر

محل کا پائیں باغ۔ سپاہی اور کوتوال قیدی کے قریب کھڑے ہوئے ہیں۔ بادشاہ چند مصاحبوں کے ساتھ باغ میں آتا ہے۔ شاہزادی فرخندہ اپنے کمرے میں کھڑی ہوئی کھڑکی سے دیکھ رہی ہے۔

بادشاہ۔ اُف۔ یہ قیدی ہے یا مایوسیوں کا مرقع۔

قیدی۔ مایوسی مذہب اسلام میں کفر ہے۔

بادشاہ۔ او ہو دیکھو تو آج تم کس قدر مجبور ہو۔

قیدی۔ ایک بہادر موت کے آخری اور تلخ لمحوں میں بھی خوش رہتا ہے۔

بادشاہ۔ وہ دھمکی جو تم نے مجھے دی تھی یاد ہے۔

قیدی۔ جی ہاں۔ وہ دھمکی نہیں تھی بلکہ حضور کو حقیقت سے آگاہ کرنا میرا فرض تھا۔

بادشاہ۔ کیا حکومت کے آگے بھی کسی کا زور چلتا ہے۔

قیدی۔ بیشک حضور حکومت سے بڑھکر بھی ایک طاقت ہے۔

بادشاہ۔ آج وہ غریب کہاں ہیں جن کی مدد پر تو ـــــ

قیدی۔ وہ غریب تو یہاں نہیں، لیکن اُن کی دعائیں میرے ساتھ ہیں۔

بادشاہ۔ (نمائشی ہنسی ہنستے ہوئے) بے وقوف۔ پگلا کہیں کا ـــ

قیدی۔ پگلے وہ ہیں جو اپنے چند روزہ جاہ و جلال کو، عزت و مرتبہ کو دنیا کی ظاہری چیزوں میں ڈھونڈھتے ہیں۔

بادشاہ۔ مگر آج تجھکو مرے پنجے سے کون چھڑا سکتا ہے

قیدی۔ وہی جس نے خلیلؑ کو نمرود کی آگ سے، موسیٰ کو فرعون سے، یوسفؑ کو کنوئیں سے نکالا تھا۔

بادشاہ۔ کیا تو پیغمبری کا دعویٰ کر رہا ہے۔

قیدی۔ قدرت کی حقیقت اور اپنے ایمان کا اعتراف کر رہا ہوں۔

بادشاہ۔ تیری موت رسوائی کے ساتھ عمل میں آئے گی۔

قیدی۔ میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں۔

بادشاہ۔ یہ بات ہے

قیدی۔ جی ہاں۔

بادشاہ۔ (کوتوال سے) سارے شہر میں اس کی موت کا اعلان کرا دو۔

کوتوال۔ (ادب سے) عالی جاہ! مصلحت اسی میں ہے کہ اُس کی موت خاموشی سے عمل میں لائی جائے۔ ورنہ بغاوت کا اندیشہ ہے۔

بادشاہ۔ اچھا تو اس کو ابھی سولی پر چڑھا دو۔ (کوتوال اور سپاہی قیدی کو سولی پر چڑھاتے ہیں۔ فرخندہ فوراً اپنے ترکش سے تیر کھینچتی اور تاک کر سولی کی رسّی پر نشانہ لگاتی ہے، رسّی ٹوٹ جاتی ہے)

بادشاہ۔ (حیران ہوکر) یہ کیا؟

قیدی۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟ ـ ـ ـ

بادشاہ۔ پھر چڑھاؤ اس مردود کو۔ (سپاہی قیدی کو دار پر کھینچتے ہیں۔ دوسرا تیر سنسناتا ہوا آتا اور رسّی کو کاٹ دیتا ہے)

بادشاہ۔ یہ جادو کا زور ہے یا رسّی کمزور ہے۔

قیدی۔ صرف قدرت کا کھیل ہے۔

بادشاہ۔ لو اس کو پھر دوبارہ لو، چھوڑو مت (قیدی سولی پر لے جایا جاتا ہے۔ تیسرا تیر پھر آتا ہے اور رسی کو کاٹ دیتا ہے۔ ساتھ ہی ایک کاغذ بھی گرتا ہے، بادشاہ چھٹی کو جھٹ سے اُٹھا کر کوتوال کو پڑھنے کے لئے دیتا ہے، کوتوال پڑھتا ہے) "یہ بے گناہ قیدی ہے۔ حقیقی مجرم میں ہوں اور ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

بادشاہ۔ یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے۔ (کوتوال سے) تم نے مجھے دھوکا دیا۔ (آن کی آن میں کالی گھٹا چھا جاتی ہے۔ بجلی کوندتی ہے، اتنے میں ایک حسین دوشیزہ برقع اوڑھے ہوئے بادشاہ کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے)

بادشاہ۔ (گھبرا کر) تم کون ہو۔

اجنبی۔ آپ کو ابھی ابھی معلوم ہو جائے گا۔

بادشاہ۔ کس لئے آئے ہو۔

اجنبی۔ حضور کا وعدہ یاد دلانے کے لئے۔

بادشاہ۔ میں نے کیا وعدہ کیا تھا اور کب؟

اجنبی۔ غور کیجئے۔ سوچئے

بادشاہ۔ مجھے یاد نہیں آتا۔

اجنبی۔ کیا یاد دلانے پر پابند رہیں گے حضور!

بادشاہ۔ ضرور

اجنبی۔ اُس شخص کا بھروسا ہی کیا جس نے دولت کے لالچ میں حقیقی ——

بادشاہ۔ (حیران ہو کر) آئیں —— کیا کہا —— جلد بتاؤ

اجنبی۔ قسم کھائیے

بادشاہ۔ میرے تاج و سر کی قسم، للہ جلد بتاؤ

اجنبی۔ صحرائی ڈاکوؤں سے جس وقت مجھکو ——

بادشاہ۔ کون —— فرخندہ —— میری بیٹی —— افسوس۔

(فرخندہ برقع اُتار کر آنکھیں نیچی کئے ہوئے بت کی طرح کھڑی رہ جاتی ہے، قیدی اس کو غور سے دیکھتا اور یکایک چیخ مار کر بادشاہ کے پاؤں پر گر جاتا ہے۔ بادشاہ اُس کو اُٹھانے کے لئے جُھکتا ہے، اور اُس کے گلے کی سنہری زنجیر دیکھ کر چلا اُٹھتا ہے) آہا ہا —— فیروز —— میرا بھتیجا ——

(فیروز ہوش میں آتا اور ایک طرف ادب کے ساتھ کھڑا رہ جاتا ہے)

فیروز۔ ہاں میں وہی کمبخت فیروز ہوں جو جلا وطن کر دیا گیا تھا حضور

بادشاہ۔ (آنسو بہاتے ہوئے) آہ بیٹا، خدا کے لئے مجھے معاف کر دو میری خطاؤں کو بخش دو، میں مجرم ہوں، ہوسِ دولت اور خواہش تاج نے مجھے اندھا کر دیا تھا —— آہ کس قدر ظالم ہوں میں۔ بیٹا! یہ لو (تاج کو پہناتے ہوئے) تمہارا تاج جس کے تم حقیقی وارث ہو۔ (فرخندہ کا ہاتھ میں ہاتھ دے کر) آج سے یہ تمہاری ملکہ ہے۔

بادشاہ جاتا ہے، درباریوں پر سناٹا چھا جاتا ہے اور یہ آواز گونج جاتی ہے۔

عجب دنیا ہے یہ کھلتا نہیں راز اُس کی قدرت کا
ابھی دوزخ کا منظر تھا، ابھی نقشہ ہے جنت کا (محوی)

ہندوستانی ادب میں بین الاقوامی نقطۂ نظر کی ضرورت

ترقی پسند ادیبوں سے ایک گزارش

احمد حسین - الہ آباد یونیورسٹی

آج ہندوستان ایک شدید انقلاب کے دروازوں پر کھڑا زور آزمائی کر رہا ہے جو نہ معلوم کس وقت کھل جائے اور سارا ملک تہ و بالا ہو جائے۔ خود اُس نظام کے سر پر جو ہمارے سماج کا سنگِ بنیاد ہے۔ تخریب اور فنا کی مبہم بجلیاں کوند رہی ہیں جو گر کر نہ معلوم کب اُسے خاکستر کر دیں ـــــ بھوک، عزبت اور بیکاری کے سوال کو اُٹھے حالانکہ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے، لیکن یہی سوال اتنی اہمیت حاصل کر چکا ہے کہ آج ہمارے تمام سیاسی۔ معاشی اور اقتصادی سوالوں کا مرکز بن گیا ہے، اور ہندوستان کی آزادی کا سوال ایک جذباتی سوال نہیں بلکہ یہاں کے مفلس اور بے بس ترین طبقوں کی "اقتصادی آزادی" کا مسئلہ ہو گیا ہے، المختصر یہ افلاس ہی کے تند جھونکے ہیں جو سینۂ ہندوستان میں بھڑکنے والے شعلۂ انقلاب کو تیزی سے ہوا دے رہے ہیں۔

ہمارا ادب بھی جو حیاتِ قومی کے مختلف پہلوؤں کی مصوری کرتا ہے اِن انقلابی محرکات سے بخوبی متاثر ہوا ہے۔ ہمارے شاعروں کے خیالات ہجر و وصل اور ساغر و مینا کی خنک فضا سے نکل کر مفلس کے دل کو پھونک دینے والی آگ کے شعلوں میں کود پڑے ہیں۔ ہمارے افسانہ نگار اور ناول نویس حضرات کے قلم، آراستہ سیلون، برقی روشنی۔ کلب گھر اور رومانی واقعات کے تذکروں کے بجائے گاؤں میں پھوس کے کچے جھونپڑے، بجھتے چراغ۔ لاغر بیل شکستہ ہل، زمیندار کے ظلم۔ طوفان اور طغیانی کی بربادی۔ روٹی کی فکر۔ امراض کی تکلیف دوا کی پریشانی۔ محنت۔ مزدوری اور پھر بھی فاقہ مستی وغیرہ کی المناک، داستانیں ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں ـــــ اور انہی ترقی پسند رجحانات میں ہم کو "اردو۔ ہندوستانی" زبان کی بقا اور ترقی کا ایک خوشگوار مستقبل نظر آ رہا ہے۔ کیونکہ زندگی کی لحظہ بہ لحظہ متحرک حالتوں کے ساتھ ہم اس زبان کو بدلتا ہوا پاتے ہیں۔ اور اِس کے ادب میں اپنی حیاتِ جدیدہ کے مختلف نقوش اس قدر کامیابی کے ساتھ منعکس ہوتے دیکھ رہے ہیں۔

یہ سب درست، اور ہم کو اِن خوشگوار علامات سے ایک گونہ اطمینان بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ ہمارے مصنفین کا بیشتر حصہ اپنے بناؤٹی اور ناقابلِ تعبیر خواب سے بیدار ہو کر عصرِ حاضر کی زبردست اور طوفانی حقیقتوں سے آنکھ ملانے کی اب بھی جرأت نہیں کر سکا ہے۔ پھر بھی "اردو۔ ہندوستانی" ادب میں عوام سے ہمدردی اور اُن کی زندگی کی ترجمانی کے جو جراثیم پیدا ہو چلے ہیں کافی امید افزا ہیں۔ لیکن حیاتِ قومی کے اِن تمام زندہ مسائل کو سمجھنے اور اُن کی صحیح ترجمانی کرنے کے باوجود ہمارے شاعر اور نثار ایک بڑی زبردست، بنیادی اور اہم ترین حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، یا شاید اُن کی نظروں نے اس کے دور رس نتائج کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اور اُن کے خیالات اُس کی انقلابی قوت کا اندازہ نہیں کر سکے ہیں۔

غالباً ہمارے ادیب ابھی اِس چیز کو محسوس نہیں کر رہے ہیں، کہ ظلم و تشدد کے خلاف، بیکاری، تنگدستی اور فاقہ مستی کے خلاف، سیاسی غلامی۔ قومی پامالی اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کے خلاف، شہنشاہیت، استعماریت اور

سرمایہ داری کے خلاف محض ہندوستان ہی میں جنگ نہیں جاری ۔ ، بلکہ دنیا کے ہر گوشہ میں "سماجی ترقی" کا پرچم بلند کیا جا چکا ہے اور انسانیت کا ہر پائمال طبقہ اپنی اقتصادی آزادی کی کوشش کر رہا ہے ۔ شاید ابھی ہم یہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ ہماری آزادی کی وہ تحریک جس میں کسان اور مزدور سب سے زیادہ پیش پیش نظر آرہے ہیں کوئی مقامی جھگڑا نہیں بلکہ ایک عالمگیر جنگ ہے ، جو ہر مورچہ پر پوری قوت کے ساتھ لڑی جا رہی ہے ۔

اور آج بیسویں صدی کے وسط میں تو اس جنگ کی عالمگیری حیثیت اتنی واضح ہو گئی ہے کہ خود ہندوستانی سیاست میں بھی اس کی جھلک آئے بغیر نہ رہ سکی ۔ دنیا کی تاریخ کو ترقی بنا کر اُس کو نئے سانچوں میں ڈھالنے والے واقعات جتنی شدت اور کثرت سے ہر طرف رونما ہو رہے ہیں ، انسانیت کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی قوتیں جس گرمجوشی سے برسرِ پیکار ہیں یا اُس کی تیاریاں کر رہی ہیں ۔ دنیا کی مظلوم قومیں اور مجبور طبقے جتنی تیزی کے ساتھ متحد و منظم ہو رہے ہیں ، اور جتنی مستعدی سے اپنی قومی یا طبقاتی جد و جہد میں مشغول ہیں اس کی مثال تاریخ کے کسی دوسرے دَور میں نظر آنا تقریباً ناممکن ہے ـــــ سرمایہ داری نے انسانیت کے ہر طبقے کا خون جی بھر کے چوسا ہے ۔ اس لئے اس کے ردِّ عمل نے دنیا کے ہر حصہ کو ایک وسیع برادری میں منسلک کر دیا ہے ۔ شہنشاہی کے عام خطرے کے خلاف ہر ملک اور ہر قوم میں ایک عام آواز اُٹھ رہی ہے اور تمام پامال طبقے اُس اصولِ معاشرت کے خلاف جو نہ صرف اس قسم کے اجتماعی مظالم کو روا رکھتا ہو بلکہ خود اُن کی حفاظت کے لئے قائم کیا گیا ہو ، اور جس کی باعث دنیا کی مٹھی بھر جماعت کے علاوہ زمین و آسمان کے درمیان سانس لینے والا ہر انسان ایک مصیبت اور عذاب کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہو ، ایک جذبۂ تخریب تیزی سے اثر کرتا جا رہا ہے ۔ ننگے ، بھوکے اور غیر آسودہ افراد کا ایک عظیم الشان کارواں بڑی تیز رفتاری سے اُسی منزل کی طرف رواں ہے ، جہاں وہ استعماریت کو مٹا کر انسانیت کی ہمہ گیر مصیبتوں کا خاتمہ کر سکیں گے ، اور جہاں تشدد اور بے اطمینانی کو نیست و نابود کر کے سوسائٹی کے لئے ترقی کی اُن شاہراہوں کو کھولنے میں کامیاب ہو سکیں گے جو آج بالکل مسدود ہو چکی ہیں ۔

اس کے برخلاف سرمایہ داری بھی اپنی دھن میں مشغول ہے وہ ان تمام محرکات کو خوب سمجھتی ہے اور حالانکہ اکثریت کی قوت سے کچھ نہ کچھ ہراساں ضرور ہے ۔ لیکن پھر بھی اُس کو اپنے غلبہ و طاقت پر بھروسہ ہے ، اس کے پاس خوفناک آلاتِ حرب کا ایک بے پناہ انبار ہے ، اس کے پاس دولت ہے اور دولت سے خریدی ہوئی ایک عظیم سپاہ جس کے کس بل پر اُسے یقین ہے کہ وہ زبردست سے زبردست مخالفت کو بھی انتہائی بے دردی سے کچل دے گی ۔

لیکن آج سرمایہ داری نے خود اپنے ہاتھوں اپنی شامت بُلا لی ہے ، کیونکہ اس کے باعث اس سے زیادہ شدید اور بھیانک چیز یعنی شہنشاہی معرضِ وجود میں آچکی ہے ، شہنشاہی (یا سامراج) کے معنی ہیں سرمایہ دارانہ حقوق کا ٹھیکہ کی طرح کسی خاص قوم یا ملک کے ہاتھوں بک جانا ، اس کا نتیجہ خام اشیا کی منڈیاں حاصل کرنے اور فروخت کے لئے بازار تلاش کرنے کی کوشش میں نمودار ہوا ہے ۔ یورپ کی اقوام اور دیگر ممالک کی ہوسِ ملک گیری اور نوآبادیات حاصل کرنے کی دیوانہ وار دوڑ سامراج کی اسی حکمتِ عملی کا ایک فطری انجام ہے ۔ لیکن اسی میں خود اُس کی فنا کا راز بھی مضمر ہے ۔ کیونکہ اس ملک گیری کی زد میں آکر ایک طرف تو اُن سرمایہ دار اقوام کو دشمن بنایا جاتا ہے جن کی حریصانہ نظریں کمزور ممالک پر ہمیشہ پڑا کرتی ہیں جو دوسروں کے مفتوح ممالک کی لُوٹ میں بڑے سے بڑا حصہ لے کر بھی آسودہ نہیں ہوتیں ، جو برّی بحری اور ہوائی راستوں کی پیچیدگی کی وجہ سے کسی بھی قوم کی فتوحات میں اپنے حقوق پر چوٹیں لگتے ہوئے دیکھ لیتے ہیں اور تجارتی رقابت کے باعث کسی دوسرے ملک کی ہر طاقت کو اپنی کمزوری کا پیش خیمہ اور ہر ترقی کو اپنے مقاصد اور حکمتوں سے متصادم پاتے ہیں ۔ اس طرح "قومی دشمنی" اور رقابت کے جذبات میں اُلجھ کر یہ حاسد اقوام خود آپس ہی میں دست و گریباں ہو جاتی ہیں اور نہایت ہی خوفناک اور بھیانک جنگلوں سے زمین کے چپہ چپہ کو ہلا دیتی ہیں اور دوسری طرف مفتوح ممالک کے وہ لاتعداد انسان جن کو یا تو تلوار کی دھار اور توپ کے دہانوں سے فتح کیا جاتا ہے اور یا پھر سرمایہ دارانہ تجارتی معاہدوں کی زہر پاشی سے رفتہ رفتہ تمدنی موت کے جام پلائے جاتے ہیں ، سامراج کی قوت کے خلاف ایک متحدہ محاذ تیار کرنے میں سرگرم ہیں تاکہ جب دو سرمایہ دار قومیں آپس میں نبرد آزمائی کر رہی ہوں اور جب قوت و طاقت

کی کنجیاں حکومت کے ایوانوں سے نکل کر میدانوں میں حرکت کرنے والی اکثریت کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی ہوں۔ تشدد سے خائف ہو، اور جب دونوں جنگل کے اُن جانوروں کو جن پر کل تک دست درازیاں روا رکھتے تھے جنگل کی شاداب وادیوں کی قسمیں دلا دلا کر اپنی مدد کے لئے بلا رہے ہوں اُس وقت — اُس نازک لمحہ میں یہ مظلوم اور پسپا انسان اٹھیں اور اِن دونوں ہلاکت آفرین بھیڑیوں کا خاتمہ کر دیں۔ اسی وقت وہ اپنی اقتصادی آزادی کا مسئلہ پوری قوت اور آواز کی پوری ہم آہنگی کے ساتھ اُٹھا کر سرمایہ دارانہ جماعتوں کو روندتے ہوئے دنیا کے ہر گوشے پر چھا جائیں اور طاقت پر غلبہ حاصل کریں — یہ گزشتہ جنگِ عظیم میں ہو چکا ہے اور تاریخ اپنا یہ کارنامہ آئندہ جنگِ عظیم میں ایک بار پھر دوہرانے والی ہے۔

ہمیں چاہیئے کہ ہم آج بہت صاف طریقہ سے اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ دنیا کی سیاست اس وقت قومیت کے تنگ چولے کو اتار کر بین الاقوامی لباس زیبِ تن کر رہی ہے، ہر مظلوم قوم آج دنیا کی مظلوم اقوام کی آواز پر آواز دیتی نظر آتی ہے، ہر غلام ملک جب شہنشاہیت کی سفاکانہ قوتوں کے خلاف جہاد کرتا ہے تو وہ اپنے نعروں کے ساتھ دوسرے غلاموں کی آزادی کے نعرے بھی لگاتا ہے۔ اور یہ واقعہ ناقابلِ انکار حد تک درست ہو چکا ہے کہ دنیا کی کل سیاسی تحریکوں میں تمام انسانیت کی جدوجہد کو منظم کرنے کی تحریک بڑی سُرعت سے دماغوں میں جڑ پکڑ رہی ہے۔

اس مسئلہ پر ملک کے ادیبوں اور خصوصاً ترقی پسند ادیبوں کو خاص طور سے متوجہ کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ یہی وہ پہلو ہے جہاں ہمارا ادب ہماری سیاست سے بہت کافی بچھڑ گیا اور یہی وہ بڑی تحریک ہے جس کی صحیح تصویر پیش کرنے سے ہندوستانی ادب یکسر غافل ہو رہا ہے۔ آج دنیا میں جو بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں ہندوستان اُن سے روز بروز زیادہ متاثر ہوتا جا رہا ہے، وہ دوسری پامال اقوام کی ہمدردی میں آواز اُٹھاتا ہے۔ جب غلام ممالک اپنی آزادی کے مسئلہ کی چھیڑ چھاڑ شروع کرتے ہیں تو اُن کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ یا جب کوئی سامراجی قوت کسی کمزور ملک کی آزادی پر ڈاکہ ڈالتی ہے تو اس کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار بھی کرتا ہے۔ یومِ حبش۔ یومِ فلسطین۔ یومِ چین وغیرہ منا کر وہ اپنی ہمدردیوں کا اظہار ان غریب اور مظلوم ممالک کے ساتھ کرتا ہے، اسپین میں مالی مدد بھیج کر اور بین الاقوامی فوجی دستہ میں ہندوستانی سپاہیوں کو بھرتی کرا کر اسپین کی حکومت سے اپنی ہمدردی کا اعلان کرتا ہے۔ لیکن ہمارا ادب خیالات میں وسعت پیدا کرنے والی ان تحریکوں سے سراسر بیگانہ ہے۔ کوئی نظم۔ کوئی افسانہ اور ڈرامہ یا کوئی ادبی مضمون ہم اپنے ادبی رسالوں میں مشکل ہی سے پائیں گے جس میں اطالیہ کے خلاف اظہارِ نفرت، چین کے بہادروں کے لئے ہمدردی اور محبت کے خیالات کا اظہار ہو، فلسطین کے عربوں کے لئے ادب میں جتنی ہمدردی کا اظہار ہو رہا ہے وہ صرف مذہبی نقطۂ نظر سے جس کو بین الاقوامی وسعتِ نظری سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں پر یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ آج ہندوستان میں زبان کا مسئلہ جو اس قدر سخت بنا دیا گیا ہے تو ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہی زبان ترقی کر کے ہندوستان کی مشترکہ زبان بن سکتی ہے جس میں دوسرے ممالک سے گفت و شنید کرنے کی آسانیاں ہوں، اور یہ آسانیاں اُس وقت تک ہم نہیں پہونچ سکتیں جب تک کہ ہمارا ادب مختلف ممالک کی تحریکات سے اپنی ہمنوائی کا ثبوت نہ دے۔

آخر میں ترقی پسند ادیبوں سے میں پھر عرض کروں گا کہ جب آپ کا دل کسی بیکار ہندوستانی نوجوان کو خودکشی کرتے دیکھ کر کھول جاتا ہے، جب آپ ہندوستان کے عوام کو شہنشاہیت کے مظالم سے کچلتے دیکھ کر مظالم کے خلاف ایک زبردست احتجاج کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، تو پھر آپ کے دل میں چین کے بہادروں کو بر گولوں کے شدائد جھیلنے اور جاپانی شہنشاہیت کی سختیاں برداشت کرتے دیکھ کر جوش کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ ہندوستان کی جس بھوک اور مفلسی کے نظارے ہم کو تھوڑی دیر کے لئے ساری دنیا میں آگ لگا دینے کا خیال دلا دیتے ہیں تو جب اسی بھوک کے خلاف اور اسی مفلسی کو مٹانے کے لئے جب دنیا کے دوسرے گوشوں میں لڑائی ہوتی ہے تو ہم اُس کی ہم آہنگی کے لئے کیوں نہیں تیار ہوتے، ہمارے ادیب کا یہ فرض ہے کہ دنیا کی مختلف تحریکوں کی ایک بین الاقوامی جھلک ہمارے سامنے ضرور پیش کرے۔ اور ہمارے ذہن کو اس طرف منتقل کر دے جب کہ دنیا کے ہر کونے میں سُلگنے والی آگ ایک بڑے شعلہ ریز آتشکدہ میں منتقل کی جا سکے۔

تضاد

آسماں پر چھا چکی تھیں شام کی تاریکیاں
جیسے بیوہ کے غمِ ناکام کی تاریکیاں

اور کلکتہ کے بازاروں میں روشن تھے چراغ
جس طرح مفلس کے دل میں یاس و محرومی کے داغ

سیر کو نکلے تھے باہر شہر کے سرمایہ دار
دعوتِ اہلِ نظر تھا جن کی پوشش کا نکھار

مطمئن چہرے خوشی کے نور سے شاداب تھے
عیش والے مسکرانے کے لئے بیتاب تھے

اُڑ رہے تھے اہلِ زر حرص و ہوا کے زور میں
سانس لیتی تھی امارت موٹروں کے شور میں

پھر رہی تھیں ہر طرف ڈالے ہوئے ہاتھوں میں ہاتھ
چند دلکش عورتیں کچھ خوشنما مردوں کے ساتھ

وہ تبسم ریزیاں باہم اشارے دیکھکر
آسماں پر مسکرا اُٹھے ستارے دیکھکر

میں بھی اس ہنگامۂ عشرت میں تھا کھویا ہوا
رُوح میں بیداریاں تھیں ذہن تھا سویا ہوا

یک بیک کانوں میں آئی اک صدائے دلخراش
جس نے پیدا کر دیا جذبات میں اک ارتعاش

فکر نے منزل بدل دی، دل کی راہیں مُڑ گئیں
میں نے دل پر ہاتھ رکھا اور نگاہیں مُڑ گئیں

دیکھتا کیا ہوں کہ اک بڑھیا بہت زار و نحیف
مُضطرب مُفلس، پریشاں حال، افسردہ ضعیف

جبر کرکے شدّتِ درد و غم و آلام پر
کہہ رہی ہے "ایک پیسہ دو خدا کے نام پر"

پیچھے پیچھے آرہا ہے ایک بُوڑھا آدمی
اس طرح چلتا ہے جیسے کوئی اندھا آدمی

جسم میں رعشہ ہے، منہ پر جھرّیاں ہیں، سر پہ خاک
دیکھتا جاتا ہے شاید کوئی خوابِ ہولناک

سامنے تھیں میرے اپنی قوم کی رسوائیاں
رفتہ رفتہ وقت نے لیں کئی انگڑائیاں

نصف شب تک اہلِ دولت دل کو بہلاتے رہے
اور یہ دونوں سڑک پر ٹھوکریں کھاتے رہے

شاہد صدیقی

کیا کرشمہ ہے کہ اب تمہارے آنسوؤں میں اک تبسم منعکس نظر آتا ہے ؟!۔۔۔
کیا ہنری لوٹ آیا ؟! اب تو اُسے ہمارے ہوئے دو برس ہونے آتے ہیں! سلطان عثمان کی طرف سے اُس کی مشروط رہائی کو اِس سے کم بھلا کیا زمانہ گزرا ہوگا ؟ کیا سچ مچ ہنری آگیا ہے! اور ہم سب کی رقمِ فدیہ ادا کر دی گئی ہے ؟!

زائرہ - اسیرانِ جنگ جو قول و قرار اپنی گلو خلاصی حاصل کرنے کے لئے کیا کرتے ہیں، شاذ و نادر ہی اُنھیں وفا کیا کرتے ہیں! ہنری، جو ہمارے یارانِ زنداں میں سے تھا، اب نہ کبھی آئے گا، نہ ہمیں بندِ اسیری سے چھڑائے گا! ؎
یارانِ تیز بال سے ہے یہ گلہ کہ ہائے ہم کو اسیرِ پنجۂ صیاد کر گئے!
لیکن بہن میریا! اب مجھے بھی آزاد ہونے کی کہاں ہوس باقی ہے!! ع
ہوں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبراؤں گی کیا!

میریا - اچھا !!۔۔۔۔۔۔۔ لیکن فرض کرو کہ وہ فرانسیسی نائٹ آج ہمیں چھڑانے کے لئے آجائے !

زائرہ - سرزمینِ فلسطین میں صرف ایک شخص ہے جو میری بند آزاد کر سکتا ہے، دوسرا کوئی نہیں! ـــــ اور وہ ہے ہمارا آقا سلطان عثمان !۔۔۔۔ وہ شریف ترین، شجاع ترین، شیریں ترین روح ہے جو اس "ارضِ مبارکہ" کی خاکِ پاک سے اُٹھی ہے !۔۔۔۔۔۔۔۔ اور اُس نے مجھے قبل ازیں غمِ دو عالم سے آزاد کر دیا ہے !۔۔۔۔۔۔۔ تاہم میں اپنے کو ہمیشہ سے زیادہ اسیر و پابزنجیر پاتی ہوں !! ؎
ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز!

میریا - سلطان عثمان ؟ سلطان عثمان !۔۔۔۔۔۔۔

زائرہ - مجھسے محبت کرتا ہے ! ـــــ میں تمہارے "مبتدا" کی "خبر" بہم پہنچاتی ہوں !!۔۔۔۔۔۔ ہاں اب دوسرا مژدۂ جاں نواز سُنو کہ اُس نے مجھے اپنی حرمِ محترم بننے کا پیامِ خوش بھی دیا ہے !! ـــــ سُلطانۂ قاہرہ و قدس بننے کا !! ع
جاہ و جلالِ عیش و وصالِ بتاں نہ پوچھ !

میریا - ناممکن ! ناممکن !! اک دخترِ مسیحیت، اور اِس پیشکش کو نوازے ؟! پھر اک وحشی مسلمان کی آغوش بھی تمہارے آبگینۂ حسیاتِ دینی کی کیا رعایت کریگی ؟!

زائرہ - دُخترِ مسیحیت ؟! یہ کیا کہا ؟ مجھے مادرِ مسیحیت کا یہ نسبِ روحانی نصیب نہیں! میں سلطان کی عاشق ہوں، اور اُسی کے خدائے اسلام کی بندی!

میریا - آج بھی وہ ننھی سی سُنہری صلیب تمہارے سینے پر، تمہارے اصلی کعبۂ ایمان کی، اک قُطب نما کی طرح، قبلہ نمائی کر رہی ہے! یہ صلیب تمہاری مسیحی ولدیت پر اک مُہرِ طلائی ہے !

زائرہ - وقتِ ولادت بپتسمے کے چھینٹے ہماری لوحِ دل پر کوئی تحریرِ ایمان نہیں لکھا کرتے ! یہ دراصل ہماری تعلیم و تربیت ہوتی ہے جو ہماری معلمِ ایمان بنتی ہے ! مجھے اوائلِ طفلی ہی سے محمدِ عربی کا دین زبان، اور تمامی شریعت و شعار سکھایا گیا ہے۔

(سلطان عثمان داخل ہوتا ہے !)

عثمان - شریف و شیریں زائرہ ! قبل اِس کے کہ ہماری شادی کا رشتۂ ریشمی میرے تمہارے درمیان "من تو شدم تو من شدی" کے انقلاب کا فتحِ باب کرے - میں تجھے یہ بات بتائے اور جتائے دیتا ہوں کہ میں نے اُن آساں پسند، سُست رگ، رُخصت نواز و حیلہ جُو مراسم و شعائرِ اسلام کو خیر باد کہہ دیا ہے جو فقہاءِ دُنیا پرست نے سلاطین کی کامجوئیوں کے لئے اختراع کر رکھے ہیں! امرائے اسلام بندگانِ ہوس بن گئے، اُنھوں نے محلسراؤں کو بیگمات اور خدام کے اصطبل بنا ڈالا! پھر میں نے اپنی آنکھوں سے اُن کے پرچم سرنگوں ہوتے دیکھے! غیور صلیبی مجاہدوں نے اُن کی سلطنتوں کو درہم برہم کر ڈالا! لیکن تم میری زائرہ میری تنہا بیوی ہو گی! میری واحد موضوعِ اُلفت !! اور میں تمہارا عاشق ہوں گا۔ اور تمہارا شیدائی و فدائی! تم میری جانِ جاں ہو گی - تم ہی میری روح پروری کرو گی، تمہاری کنارِ شیریں سے براہِ راست میں میدانِ کارزار میں اُتروں گا: میں سلطنتِ اسلام کے مسمار شدہ قصر کو بارِ دگر تعمیر کرونگا! اور اُسے روئے ارض کی اک بے پناہ طاقت میں تبدیل کر دوں گا!

زائرہ - میرے آقا، میری روح و رواں - میرے محبوب، میرے معبود !۔۔۔۔ اگر تم میرے غلامِ بے دام بھی ہوتے، ـــــ جیسی کہ اس وقت میں تمہاری کنیزِ ناچیز ہوں ! ـــــ اور میں ملکۂ عالم ہوتی، تب بھی میں فرازِ تخت سے سرنگوں ہو کر تمہاری حضیضِ اسیری تک اُترتی - اور تمہیں اُٹھا کر اپنا پہلو نشین بناتی ! عثمان میں خود تمہاری والہ و شیدا ہوں، تمہاری ثروت و شوکت کی دلدادہ نہیں !

(خالد داخل ہوتا ہے۔

خالد۔ ہنری، وہ مسیحی غلام جو عہد کرکے گیا تھا کہ واپس آئے گا، اور فدیہ دے کر اپنے سارے رفقائے اسیری کو چھڑائے گا، آیا ہے، اور میرے آقا حضور کی باریابی کی درخواست کرتا ہے!

میریا۔ تیری شان، اے سبحان!

عثمان۔ اُسے آنے دو!

(ہنری داخلِ دربار ہوتا ہے)

ہنری۔ شہامت وشرافت کے پیکر سلطانِ ذی شان! خاکسار بار دگر شرف اندوزِ حضوری ہوتا ہے! میں اُس عہد کو پورا کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں ـــــ زائرہ اور میریا اور وہ دس صلیبی مجاہد، جو سلیمانیہ کے معرکے میں سلطان کی حراست میں آئے تھے اُن سب کی رقومِ فدیہ موجود ہیں! لیکن خود اپنا زرِ رہائی میں بہم نہ پہنچا سکا! جس کی پاداش میں میں اپنی گردن دوبارہ طوقِ اسیری کے لئے پیش کرتا ہوں!

عثمان۔ شریف النفس صلیبی! تو نے خوب ہی اپنا قول نبایا، لیکن شرافت ومروت کے کارناموں میں اک فرزندِ اسلام اک مسیحی غلام کو بھلا کب بازی لے جانے دے گا؟! اچھا تم بھی دوسروں ہی کی طرح آزاد ہو! جو زرِ فدیہ تم لائے ہو اُسے بھی میں عطائے تو بلقائے تو کرتا ہوں، نہیں، بلکہ یہ رقم سہ چند کرکے تم کو واپس کی جائے گی! پھر بھی نہیں، بلکہ اُن دس صلیبی مجاہدوں کے بجائے میں پورے ایک صد غازیانِ صلیب کی گلو خلاصی کرادوں گا! پھر تم کو یہ بھی اختیار ہے کہ جس زندان خانے میں سے چاہو یہ منظور شدہ سَو کی تعداد منتخب کرلو!........ تاہم ایلفرڈ اِس سے مستثنیٰ رہے گا!--------- میں اُس کے بارے میں کوئی رعایت نہیں کرسکتا! وہ اُس شاہی خاندان بوئیلن کا کلمہ گو ہے، جس کے زیرِ نگیں کبھی یہ زمین رہ چکی ہے! بس وہ میرا سیاسی حریف ہے!.........

اب رہی زائرہ ـــــ وہ الہٰیۃ الجمال زائرہ!ـــــ تو اگر سارے شاہان ولاآبانِ فرنگ مجھ پر اپنی مجموعی افواج کے طوفان کو ریل دیں، تب بھی اِس گوہرِ نایاب کو میری صدفِ سینہ سے نکال کر نہیں لے جاسکتے!

ہنری۔ کیا فرمایا سلطان نے؟! کیا عالی نفس امیر اسلام کو اپنا وہ پیمان متین یاد نہیں کہ وہ کم سن زائرہ اور کہنہ سن ایلفرڈ کو فدیۂ رہائی بخشنے کے لئے تیار ہے! زائرہ اک عجیب الطرفین مسیحیہ ہے، اور ایلفرڈ اک قابلِ رحم پیر اسیر ہے!

عثمان۔ بس جو کچھ میں نے کہدیا ہے اُس سے میں باز آنے والا نہیں! پس اب تخفیفِ تصدیعہ! ایک دن کے اندر اندر میرے سارے عطایا و مراعات کو لے کر رخصت ہوجاؤ! تمہاری تاخیر میرے عتاب کی تعجیل کا باعث ہوگی! (زائرہ کی طرف متوجہ ہوکر) اچھا زائرہ! اُم حرم سرا کی طرف مرکتِ خرام ہو! میں بھی جلد حضورِ حُسن میں باریاب ہوتا ہوں!

(زائرہ اور ہنری مختلف دروازوں سے رخصت ہوجاتے ہیں!)

دوسرا ایکٹ

زائرہ اور ہنری

زائرہ۔ پیارے ہنری! سلطان نے ازراہِ مہربانی مجھے اجازت بخشی ہے کہ تم سے ملاقات کرلوں! اور میں ایک خوشخبری کی پیامبر بن کر آئی ہوں! تم جانتے ہو میں تمہاری کتنی ممنونِ نوازش ہوں! ہم چھوٹے ہی چھوٹے تھے کہ سلطان صلاح الدین کے قیدیوں کی طرح ایک ہی بندی خانے میں رہا کرتے تھے! اس قید کے زمانے میں ہم اسیرِ محبت ہوگئے، اور غمِ ہستی سے آزاد! تمہاری خاطر میں نے کتنی کوشش وکاوش کی ہے، اور آخر کار اُس چیز کو حاصل کرلیا ہے جو تمہیں اتنی عزیز ہے!ـــــ یعنی بابائے محترم ایلفرڈ مدظلہم کی رہائی! آج وہ حکمِ سلطانی سے آزاد ہیں!

(ایلفرڈ داخل ہوتا ہے)

ایلفرڈ۔ ہاں، بلاشبہ میں آزاد ہوں! لیکن وہ سب کہاں ہیں؟!ـــ میرے بچے! میری گود اُن سے سُونی کردی گئی! میرا بچہ اور میری بچی قیصریہ کے سقوط کے بعد قیدی بنائے گئے تھے اور سلطان عثمان کے محل کی حراست گاہ میں منتقل کئے گئے تھے!

ہنری۔ مجھے یاد ہے، مجھے یاد ہے! میں اُس وقت بالکل بچہ تھا، لیکن آج بھی اپنی خوابوں میں اُس سوختہ بخت جلتے ہوئے شہر کو دیکھا کرتا ہوں! نیز اُن عرب یاجوج وماجوج کو جو مسیح کی بھیڑوں کو تہ تیغ کررہے تھے! زائرہ میرے ساتھ، چند اور اسیروں کی معیت میں، بیت المقدس بھیجی گئی تھی،

الیفرڈ (زائرہ اور ہنری کی طرف دیکھکر) تم دونوں ساتھ ساتھ پا بزنجیر کرکے یہاں لائے گئے! قیصریہ کی تسخیر کے وقت! ——— میں ان حوادث و مناظر کا شاہد نہیں بنا! میری دنیا تاریک تھی! میرا محبس اتنا تیرہ و تار تھا کہ میں کچھ دیکھ نہ سکتا تھا! میری آنکھیں اب تو روشنی کی خوگر بھی نہیں رہی ہیں!

——— یہ زنجیر کیا ہیں اسے؟

(وہ زائرہ کی گردن کی زنجیر کو پکڑتا ہے، اُس پر جھکتا ہے، اُسے دیدے پھاڑ پھاڑ کے دیکھنا چاہتا ہے، اور پھر ایک دم اِس زنجیر کو کھینچ لیتا ہے، جس پر زائرہ کے گلوئے حسین کی سُنہری صلیب کھُل جاتی ہے!)

الحمد للہ! ثم الحمد للہ! میرے بچو، بولو بولو تعریف ہمارے خداوند خدا کی! یہ ہے وہ صلیب جو میری دیندار بیوی کو میرا روحانی ہدیہ تھی! اور جسے اُس نے اپنی نورِ دیدہ کے گلے کا ہار بنایا! ------ اور ہاں ہنری! جس وقت اُن بیدردوں نے میرے پہلوے میرے لختِ جگر کو کاٹ لیا تو مجھے یاد پڑتا ہے کہ اُنھوں نے اُس کے سینے کے بالائی حصّے کو زخمی کیا تھا! ——— وہ زخم ———

ہنری۔ یہ موجود ہے پدرِ محترم!

(ہنری فی الفور الیفرڈ کے قدموں پر گر پڑتا ہے! الیفرڈ اُسے گلے لگاتا ہے، ساتھ ہی اپنا دوسرا خالی بازو زائرہ کو کنار گیر کرنے کے لئے پھیلاتا ہے!!)

زائرہ۔ باپ! میں آپ کی آغوشِ اُلفت کے قابل نہیں! میں مُرتدہ ہوں! میں مسلمان ہوگئی ہوں!

الیفرڈ۔ اے کاش کہ اک برقِ خاطف گرے، اور مجھے خاکِ سیاہ کر ڈالے! میں اک ہشتاد سالہ پیر نابینا ہوں، اے خدا! میں نے پورے ساٹھ سال تیری راہ میں قتال کیا ہے! پھر ۲۰ طویل سال تک میں تیری ہی رضاجوئی میں ایک زندانِ سیاہ کے اندر تحلیل ہوا کیا ہوں!! دشمنانِ حق نے میری بیوی اور میرے بچوں کو شہید کر ڈالا! میری خدا پرست قوم کے کثیر التعداد افراد کے حلقوموں سے اک جوئے خون بہا دی! اس ارضِ مقدس کو ویران کر ڈالا! اور اے میرے خداوند خدا جن اماکنِ پاک کو تیرے قدموں نے مَس کیا تھا، وہاں اُنھوں نے اپنے اصنام و اوثان نصب کر دئے!! اور آج میری بیٹی تیرے دشمنوں کی صفوف میں کھڑی ہوئی ہے! ——— تیرے دامنِ پاک کا اک داغ!! ......

نہیں نہیں، میری بچّی! تو خدائے قدوس کی گود سے گریزاں نہیں ہوسکتی!!

آنکھیں اُٹھاکے دیکھ، جدھر تیرا جی چاہے! اور آیات اللہ کے منارے تیری نظروں کے سامنے بلند ہوتے دکھائی دیں گے! ہاں، ایک ہی نگاہِ غلط انداز ڈال، اور دیکھ لے کہ وہ ہے سامنے وہ پہاڑی جہاں ابن اللہ نے ہمارے لئے جان دی تھی!!

زائرہ۔ باپ، میرے باپ! مجھے بتا کہ میں کیا کروں؟!

الیفرڈ۔ اُف! بس میرے بڑھاپے کے بھڑک اُٹھتے ہوئے سر پر سے غم اور شرم کا بارِ لعنت اُٹھالے! ہاں کہدے کہ "میں مسیحی ہوں"!

زائرہ۔ میں مسیحی ہوں!

(سلطان عثمان داخل ہوتا ہے!)

عثمان۔ مردودو! یہاں یہ بدآموزی، باطل کوشی، فتنہ پردازی جاری ہے؟! کفار لااعتبار! نکلو یہاں سے! .... کیا میرا فرمان تمہارے لئے یہ نہ تھا کہ فی الفور یہاں سے مُنہ کالا کر جاؤ؟!

(مسیحی درانداز رُخصت ہوجاتے ہیں! زائرہ دم بخود کھڑی رہجاتی ہے ——— زرد رُو اور لرزہ براندام!)

(عثمان، زائرہ سے) آؤ میری زائرہ! ہماری شادی خانہ آبادی کی تیاریاں مکمل ہیں! عود کے بخورات، مسجد کی فضا کو لبریز کئے ہوئے ہیں! میری قوم کے مُشتاقانِ جمال کی نظریں تمہارے جلوے کی جویا ہیں! سارا جشنِ عروسی تیار ہے! تختِ شاہی تمہارے قدوم کا اور عثمان کا سینہ تمہارے ورودِ مسعود کا منتظر ہے!

زائرہ۔ میرے اللہ، میں کہاں جا چھپوں! اے میرے باپ کے خدا، میری مدد کر! .... عثمان! اگر تم کو مجھ سے محبت ہے تو لِللہ اس شادی کو مُلتوی کر دو! اور ہاں میری روح کا واسطہ کہ مجھے بزرگ سال الیفرڈ سے ملنے دو!

عثمان، الیفرڈ؟ اِس کھوسٹ غلام سے تم کو کیا واسطہ؟ تم کوئی مسیحی نہیں! تم ابتدائے طفلی سے اُسی خدا کی حمد گو ہو جس کا میں ستائش گر ہوں!

زائرہ۔ بہرحال، شادی کو ابھی اُٹھا رکھنا چاہئیے! ع

نہ چھیڑ اے نگہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی!

عثمان۔ آنچہ می شنوم بہ بیداری ست یارب یا بخواب!! ......

زائرہ! یہ تم ہو جو بول رہی ہو؟!

زائرہ ۔ قہرمان سلطان! اس کنیز ناچیز میں آپ کے عتاب کی تاب نہیں، آہ؀
من شمع جاں گدازم، تو صبح دلکشائی سوزم گرت نہ بینم، میرم چو رخ نمائی!
نزدیکت ایں چنینم، و دور آنچناں کہ گویم نے تاب وصل دارم، نے طاقت جدائی!
میرے آقا! کرم اندکرم اس وقت مجھے رخصت دیجئے، میرے آنسوؤں کو
میرے کلبۂ احزاں میں روپوش ہو جانے دیجئے!! (جانا چاہتی ہے)

عثمان ۔ تو پھر اس سن سفید ایلیفرڈ کو مفت میں کیوں ستاتی ہو؟
اس فرانسیسی جوانِ رعنا، ہنری، کا نام کیوں نہیں لیتیں؟!------ہاں،
یہ نوجوان ہنری ہی ہے جو زائرہ اور عثمان کے درمیان حائل ہو گیا ہے!!
------ بلاشبہ وہی ہے! تب ہی تو یہ پروانہ پھر تمہاری شمع حسن کا طواف
کرنے لوٹ آیا! کامل دو سال کے فصل نے بھی اس کے سوزِ الفت کو سرد
نہیں کیا!!

(خالد داخل ہوتا ہے)

خالد ۔ میرے آقا! یہ پیام میرے ہاتھ میں ڈالا گیا ہے! اک مسیحائی
قاصد اسے آستانۂ سلطانی پر لایا!

عثمان ۔ (مکتوب کو کھولتا ہے، اور پڑھتا ہے) "پیاری زائرہ! اپنا
عزوہ، ایلیفرڈ جاں بحق تسلیم ہو گیا! اب اک نہایت ضروری پیام تمہارے
گوش گزار کرنے کے لئے مجھے تم سے اولین فرصت میں ملنا ہے! کیا تم آج
رات کو آسکتی ہو؟ ------ اُسی مسجد کی سرنگ سے! میں ٹھیک نصف
شب کے وقت تمہیں وہاں ملوں گا!"

(عثمان، خالد سے) خالد! یہ خط زائرہ کے نام کا ہے، اسے اس کے
پاس لے جاؤ!

خالد ۔ یہ خط، میرے آقا!؟

عثمان ۔ ہاں ہاں، اُسے بے تکلف جانے دو، اور اپنے محرمانِ
راز مسیحیوں سے ملنے دو! میں بھی وہیں اک گوشے میں کھڑا ہو کر ان کی
گفت و شنید کا سامع بنوں گا،

تیسرا ایکٹ

سلطان عثمان اور شاہی پیش خدمت خالد

عثمان ۔ خالد! زائرہ میری جانِ جاں ہے! میں اسے کیسے مار ڈال
سکتا ہوں!! اُف ع
جو اپنا دشمنِ جاں ہو وہی دل کی دوا ٹھیرے؟!

خالد ۔ کیوں، کیا اب بھی وہ آپ کی امانت دار دل بنی ہوئی ہے؟!

عثمان ۔ صرف ایک شعاعِ اُمید ہے جو ہنوز اُفق پر غروب نہیں ہوئی!

خالد ۔ وہ نوجوان صلیبی مجاہد بڑا دلدادۂ تمنا اور ناشکیبا واقع ہوا ہے! جس
وقت وہ اُس دن اک مدت کے بعد واپس آکر زائرہ سے دوچار ہوا ہے،
اُس نے زائرہ کے لئے اپنی شیفتگی و اضطرابِ قلبی کا بے نقاب مظاہرہ کیا!
میں دونوں کی ایک ایک ادا کو عقابی نظروں سے دیکھ رہا تھا، میں نے
فرانسیسی نوجوان کی دلدوز آہیں اور بیباک نگاہیں صاف صاف سنیں،
اور دیکھیں! اور اگرچہ یہ واردات میرے جذباتِ رشک و رقابت کو
آتش زدہ کئے دے رہے تھے، تاہم میں خاموش یوں رہا کہ میں نے یہ بھی
اچھی طرح دیکھ لیا کہ خود زائرہ اِن راز و نیاز پر غیر متاثر رہی!!

خالد ۔ لیکن میرے آقا! اب تو ہنری، زائرہ سے ملاقات کی اک موکد
فرمائش کر رہا ہے!!

عثمان ۔ اُسے کرنے دو! میرا خیال ہے زائرہ اس پیام پر لبیک نہ
کہے گی! تاہم تم مسجد کے پاس ضرور جا پہنچو، اور پہریدار سپاہی کے ساتھ
وہیں توقف کرو! جس وقت وہ نصرانی نوجوان وہاں نظر پڑے اُسے
گرفتار کر لو!

(عثمان و خالد رخصت ہو جاتے ہیں، اور زائرہ اور میریا داخل
ہوتے ہیں!)

زائرہ ۔ دیکھو، یہ ہے وہ خط! پڑھو اسے، اور بتاؤ مجھے کہ کیا
کرنا چاہیئے؟

میریا ۔ یقیناً تمہیں ہنری سے یہ ملاقات کرنی چاہیئے!

زائرہ ۔ ناممکن! ہنری سے ملنا موت سے ملاقی ہونا ہے! پھر میں بہت
سی مسیحی جانوں کو بھی خطرے میں ڈالوں گی! انہی میں میرا بھائی بھی ہوگا! اور
وہ سارے مسیحی قیدی مفت میں مارے جائیں گے جن کی رہائی کا سلطان حکم
دے چکا ہے۔

میریا ۔ نہیں نہیں، میری بھولی زائرہ! جس شدید اندیشے کو یہ خداوند
پرست بیباکانہ تحدی کر رہے ہیں تاکہ تم کو ان بیدینوں کے پنجۂ کفر سے نجات

دین، وہ اندیشہ تمہیں اس قدر مُشوش نہیں کر رہا ہے! تمہارے دلِ نازک
کے اِس طوفانِ اضطراب کا سرچشمہ بجائے "احساسِ خوف" کے اک "کیفِ
محبت" ہے! ——— جس نے تمہارے دماغ کو مکدّر اور روح کو مضطر
کر رکھا ہے! ننھی قُمری! تم کانپ رہی ہو اِس بات سے کہ کہیں اِس وحشی
انسان (عثمان) کی چشم و اَبرو پر کوئی بَل نہ آجائے! ——— وہ عثمان
جس کی محبت اک درندے کی دلدادگیٔ شکار سے زیادہ نہیں! کیا سچ
مچ عشق کا بھوت ایسا ہی اندھا بہرا ہوا کرتا ہے؟! کیا تمہاری آنکھوں
میں اتنی برائے نام بینائی بھی باقی نہ رہی کہ تم اُس ملعون درندگی کو دیکھ
لو جو تمہارے "سلطان" کے یمین و یسار چلتی ہے!! وہ اک "گرگِ جگر خوار"
ہے، تاہم اک "نرم لحم حلوان" اُس کے لئے آہ کشی کر رہا ہے!! ع

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو!

زائرہ - آہ میریا! ؎

دل کو روؤں کہ یا جگر کو میرؔ؟
میری دونوں سے آشنائی تھی!

ایکاش کہ میں اُس سرزمینِ مسیحیت کی زیارت کرتی جس میں میرا بھائی مجھے لیجانا
چاہتا ہے! واحسرتا کہ مجھے عثمان کی خلوتِ الفت ہی میسر ہوتی!.......
میریا! میں اک دوگونہ رنج و عذاب میں مُبتلا ہوں! اِس اذیتِ دوئی میں
میرا دلِ بیمار گرفتار ہے! وہ التزامِ فرض اور وفائے عشق کسی کا بھی اہل
نہ رہا! وہ اک قیامت خیز تہلکہ کے اندر متزلزل ہے! او میرے اللہ! مجھے
میرے تاریک توہمات سے نجات دے!....... ہاں، میں اُس سے ملونگی!
اُس سے دو بدو باتیں کروں گی! اور جس وقت وہ قدس سے رخصت ہوگا،
میں اپنی زندگی کا رازِ سربستہ اپنے عاشق پر بے نقاب کر دوں گی! وہ میری
"انجیلِ دل" کا بے پردہ مطالعہ کرے گا، اور اک غریب نصرانی لڑکی پر ترس
کھائے گا، جو سُلطان کی محبت اور مسیح کی ارادت کے درمیان معلق ہو رہی ہے!
...... اچھا ہرچہ بادا باد! بھیجو اُس غلام کو جو یہ تحریری پیام میرے پاس
لایا! (میریا جاتی ہے، اور غلام آتا ہے!)

زائرہ - (غلام سے) تم ہی یہ خط لائے تھے، فرانسیسی صلیبی مجاہد کے
کے پاس سے؟

غلام - جی ہاں!

زائرہ - اچھا کہو اُس سے کہ میں اُس کی مُرادِ دل سے وفا کروں گی!
...... اب جس وقت وہ موقعے پر پہنچے اُسے سیدھے یہیں لے آؤ!

(زائرہ رخصت ہو جاتی ہے، اور سلطان اور خالد داخل ہوتے ہیں)

عثمان - اللہ اکبر! ایک ایک گھڑی ساعتِ قیامت کی طرح گزر
رہی ہے! اگر وقت کی رفتار یہی ہے تو میں یقیناً مجنون ہو جاؤں گا!! (غلام
کو آتا دیکھکر) کہو کہو اُس نے کیا کہا؟ ہاں ہاں جلدی کہہ! ابے تو بولے گا
کہ نہیں؟!

غلام - میرے آقا! اُس نے کہا کہ میں کہدوں کہ وہ یہاں اُس کا انتظار
کرے گی، اُس سے ملاقات کرے گی، اور اُس کے مقصدِ دلی سے بے وفائی
نہ کرے گی!

عثمان - اچھا، جاؤ! معلوم ہو گیا!

(غلام چلا جاتا ہے)

(خالد سے) اچھا تم بھی چلے جاؤ! ابھی ابھی! ہاں بس رخصت، رخصت!
فوراً میرے سامنے سے ہٹ جاؤ، نہیں تو میرے ہاتھ سے دو چار کا خون
ہو جائے گا!!

(خالد چپکا چلا جاتا ہے!)

(تنہائی میں) میں کہاں ہوں؟ میں کہاں ہوں؟! اُف یہ تاریکی؟!
ایسی فضائے ظلمات!! مجھے کچھ سُجھائی نہیں دیتا!...... زائرہ!...... زائرہ!
نہیں نہیں، میں کیوں کسی کو پکاروں!! ع

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بِن آئے نہ رہے!!

آہ! میری خوش قسمتی کے مطلعِ زریں پر یہ اَبرِ تاریک اُسی کی کم نگاہی
ہی کا تو پرتو ہے! ؎

اے پرتوِ مہتاب جہانتاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے!

ہائے زائرہ کی شیریں لبُ شکستیٔ پیماں کی یہ پہلی تلخی ہے! اور ؎

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو؟
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے!

ہاں زائرہ تو اب عثمان کے پاس نہ آئے گی، لیکن ہنری حریفانہ زائرہ
کے دامنِ پاک کی طرف بڑھ رہا ہے!...... اچھا آ رہا ہے مردود! ادھر

غدار بھی شریکِ کار ہیں! آنے دو اِن سب سیہ کاروں کو! سبھی کو داخلِ
جہنم کردوں گا ہَل مِن مَزید جہنم! .... ہاں کیا میرا عزمِ انتقام ناجائز
ہے؟! .... خالد! خالد! پلٹ آ!

(خالد داخل!)

کہو وہ نظر آیا؟ تم نے اُسے گرفتار کیا؟!
خالد۔ میرے آقا! وہ ابھی تک نہیں آیا!
عثمان۔ رات! خوفناک رات!! اک طوفانِ ظلمات!!!...... اے
شبِ دیجور! اپنی ساری سیاہی کے باوجود تو اِن کفارِ زشت کار کے
جُرمِ سیاہ کو کیوں کر اپنے پردۂ تاریک میں چُھپا سکے گی؟!..... اُف
زائرہ! تیری، میرے حریمِ دل میں یہ "قدم نمائی و فزود آئی" اور پھر ایسی
گریز پائی!! آہ! ؎

مجھکو خبر نہیں تھی کہ ہیں کتنے ہفت خواں
جامِ شرابِ ناب و لبِ میگسار میں!

اُف میرا یہ عشقِ مجنونانہ، اور اُس پر ایسا جفا کار تازیانہ؟!
خالد۔ میرے مظلوم آقا! یہ شیون و شیون اب ختم ہونے دیجئے! اور
اپنے ہاتھ میں حسامِ انتقام سنبھالئے!
عثمان۔ اومیرے خدا! اک عورت کیسی ناگن ہوتی ہے! اپنی نیرنگی
میں بالکل اک گرگٹ! اُف رنگِ حنا، خونِ شہیداں کو کس طرح اپنی ہی
طرح اک "منم دیے بود" سمجھتا ہے! آہ خالد، تم نہیں جانتے کہ میں اس
گردن زدنی غزالۂ گریز پا کا کیسا قتیلِ خرام ہوں! اُف خالد، رحم رحم!
دَوڑ، دَوڑ! مجھے اس صدمۂ جانکاہ سے بچا! آہ زائرہ! تو کیسی میٹھی چُھری
ہے!! واویلا! وامصیبتا!!
خالد۔ اَیں! سلطانِ عثمان، اور حسرت شیون و بُکا؟! اے خدا یہ
میں کیا دیکھتا ہوں؟!
عثمان۔ ہاں ہاں، ٹھیک ہے! قہرمانِ سُلطان کے یہ پہلے آنسو ہیں
جو اُس کی آنکھوں سے نکلے ہیں! ہاں وہ خون کے گھونٹ بن کر پئے جائیں گے!
اُن کی تلخی اک "ذائقہ بازگشت" چکھائے گی! ہشیار کہ اُن میں خونِ محبوب
کی رنگینی ہے اور مرگِ عدو کی زہرناکی!!....... زائرہ! میرے سر پر
پہلے وہ ابرِ کرم، اور اب برقِ سوزاں کا یہ پرچم؟! اپنے کرتوت کے
خمیازے سے ناآشنا لڑکی! تجھے کیا خبر کہ تو نے حقِ زلیست کھو دیا ہے!!
تیرے سر کے سُنہرے بالوں پر خونی موت مُنڈلا رہی ہے!.......
اَیں یہ کیا؟! یہ کون؟! خالد! جلدی جلدی! گرفتار کر اُسے، گرفتار!!
ہاں اِس موذی کو پابزنجیر کر کے کشاں کشاں میرے حضور میں لا!

(خالد بھاگ کر جاتا ہے! زائرہ اور میریا دُھندلی سُرنگ میں دکھائی
دیتی ہیں!)

زائرہ۔ آؤ میریا!
عثمان۔ وہ آواز!....... یہی وہ صوتِ جاں نواز ہے جو کبھی
میرے لئے اک کلمۂ سحر بنی تھی، لیکن آج کی رات اک خنجرِ خونریز ہے! اُف
نیرنگ ساز تتلی! میں تیری خون آشام رنگ طرازی سے اب فریب میں
نہ آؤں گا! تجھے تیرے اصلی رنگ میں بے نقاب کردوں گا!!

(وہ میان سے اک تیغچہ نکالتا ہے، اور چُپکے چُپکے آگے بڑھتا ہے!)

ہاں ہاں، وہی ہے، وہی ہے! میرے خدا، زائرہ، اور اُس کے
ہاتھوں وفا کی نعش کی تدفین اِس لحدِ سیاہ میں؟!

(خنجر اُس کے ہاتھ سے گر پڑتا ہے، اور وہ پیچھے کھسک آتا ہے!)

اُف اُف! یہ خنجرِ خونیں اور اُس کا گلوئے حسین؟! حیف مجھ پر!
زائرہ۔ میریا! یہ کیا آواز تھی؟!
میریا۔ اُسی ہنری فرانسیسی کی آمد کی مُخبر!

(عثمان معاً پھر خنجر بکف ہو جاتا ہے!)

عثمان۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری سازش پوری پخت و پز ہو چکی!
زائرہ۔ آہ، مجھ پر ہراس و یاس کا غلبہ ہو رہا ہے! آہ، میرا دل
دونیم!! کیا یہ تم ہی ہو ہنری پیارے؟
عثمان۔ نہیں، یہ ہے عثمانِ مبغوض!..... وہ جسے غدارانہ تم ٹھکرا
رہی ہو۔ نہ کہ وہ جس سے معشوقانہ معانقے کے لئے جا رہی ہو! اور (خنجر کھینچ کر)
لو یہ ہے تمہارا صلہ، تمہارے رنگین دھوکے کے لئے!!

(زائرہ قدموں پر گرتی ہے، عثمان جھٹک دیتا ہے، اور خنجر اُس کے
سینے میں پیوست کر دیتا ہے!)

زائرہ۔ عثمان، عثمان! ارے یہ تم! تم! آہ!

(جاں بحق ہو جاتی ہے!)

عثمان۔ ہا! خوش کام انتقام کی قلبی آسودگی! ...... اچھا اب مجھے جانا چاہیئے۔ اب میں اُس کی طرف ایک نظر نہیں دیکھ سکتا! اُس کی نعش بھی میرے لئے اب نامحرم ہے! ...... اچھا، کوئی بتائے گا، میں نے کیا کیا؟ —— کیا کیا؟ —— کیا کیا؟، انصاف! انصاف! ..... اچھا تھوڑا اور ٹھہر جاؤں، وہ دیکھو اُس کا ناشاد عاشق بھی آتا ہے! مجھے عنادِ رقیبانہ کی لذت سے پورا شکم سیر ہی ہو لینے دو!!

(ہنری اسیر و پا بزنجیر لایا جاتا ہے۔ خالد اور مُسلح سلطانی سپاہی اُس کو محاصرے میں لئے ہوئے ہیں!)

دیکھ، او بدبخت، دیکھ! تو نے میری حیاتِ ارضی سے ساری روحِ مسرت نکال لی! لیکن سُن کہ اب ع

برگردِ تو بماند و بر ما بگذشت!

بدمعاش، دیکھ! وہ بیوفا مخلوق، جسے تو نے اپنا ہدفِ عشق بنایا، اور اپنی بدآموزی سے اُسے اِس مخفی سرنگ کی راہِ غداری پر چلایا، —— یہ تیرے سامنے پڑی ہوئی ہے!!

ہنری۔ ایں، مقتول! میری بہن مقتول؟! زائرہ! پیاری زائرہ!!

(غش کھا جاتا ہے!)

عثمان۔ ایں، بہن! اُس کی بہن؟! کرشمہ سازِ خدا۔ کیا یہ ممکن ہے؟!

ہنری۔ او عفریتِ خبیث! یہ ممکن کیا، مسلّمہ حقیقت ہے! ارے ظالم۔ وہ میری بہن تھی، ماں جائی بہن!! ...... اور ایلفرڈ اُس کا باپ تھا!..... وہ واصل باللہ ہوگیا، اور آہ میں زندہ درگور! میں زائرہ کے پاس والدِ مرحوم کا اک پیامِ وصیت لا رہا تھا، جس کی نسبت میں نے یہ امیدِ موہوم وابستہ کی تھی کہ شاید وہ اُس کے کمزور دلِ وارستہ کو مسیح کے دینِ حق کی طرف واپس لے آئے گا! لیکن وہ خدا کی غیر خوشنودیٔ مزاج کی مرتکب ہوئی، اور اُس نے تجھ سے محبت کرنے کی پاداش میں تیرے ہی ہاتھوں کیفرِ کردار کو پہنچایا!

عثمان۔ (زائرہ کی نعش کے پاس جاکر) خالد! کھول دو مشکیں اِس نصرانی نوجوان کی! ...... اور جاؤ، میری ساری دولت زیرِ حراست مسیحی اسیروں کے درمیان تقسیم کر دو! اور سب کو رہا کرکے یافہ (بندرگاہِ قدس) پہنچا دو!

خالد۔ لیکن میرے آقا ——

عثمان۔ بس میرے خادم! دم بخود ہو کر میرے حکمِ ناطق کی تعمیل کرو! (ہنری سے مخاطب ہو کر) اور تو اے سوختہ بخت مجاہدِ صلیبی اور قتیلِ محبتِ خواہری اپنی ہمشیرِ عزیز کو لے جا، اور اُس کی مادرِ وطن کی آغوشِ لحد میں اُسے سُلا دے اور اگر زبانِ خلق یوں شکوہ سنج ہو کہ ہائے یہ تو وہ پیکرِ نسوانی تھا جو شرافت تیسری، عالی منشی، اور معصومی کے آب و گِل سے کبھی دستِ قدرت نے بنایا تھا، تو کہنا کہ لاریب ایسا ہی تھا! عثمان نے اُس سے محبت کی، اور سوئے ظن کے خنجرِ مسموم سے اُسے شہید کیا، اور پھر اپنے ہی سے اپنے مقتول کا انتقام لیا! اِس طرح! دیکھ!

(وہ خودکشی کر لیتا ہے!)

(کاپی رائٹ)

زیبا نہیں شیخ پہ زندگانی ایسی
اللہ سے اور [illegible] ایسی
[illegible]
[illegible] جوانی ایسی

[illegible]

درسِ غیرت

زرد رُخ، نیچی نظر، افسردہ خاطر، دل نڈھال
کس قدر ہے تجھکو دختر کی ولادت کا ملال

شوق میں بیٹے کے پانی پھر گیا ارمان پر
حشر برپا ہو گیا اک بے گنہ کی جان پر

اُف یہ نازک وقت اور یہ ترش ابروئی تری
اب کہاں کمبخت کی قسمت میں دلجوئی تری

منفعل اور مشتعل، دل سرد، آہیں گرم، گرم
سرخ سرخ آنکھیں بھبوکا سی نگاہیں گرم گرم

شعلۂ جوّالہ گھر میں پھر رہا ہے ہر طرف
اک جہنم سا نظر میں پھر رہا ہے ہر طرف

ہو کے برہم اس قدر رکھلوا نہ تو اپنا بھرم
تجھکو کیا حق ہے کرے پیدائشِ دختر کا غم

تجھکو قدرت نے کیا تھا مرد، تُو نے کیا کیا
او غلامِ سلطنت نامرد تُو نے کیا کیا؟

مرد ہونے سے ترے لعنت بڑی اک بڑھ گئی
تجھ سے زنجیرِ غلامی میں کڑی اک بڑھ گئی

تُو نے بزمِ کبر و نخوت میں اُجالا کر دیا
تو نے میعادِ غلامی میں اضافہ کر دیا

بڑھ گیا تیرے سبب سے اور عصرِ سلطنت
تجھ سے محکم ہو گئی بنیادِ قصرِ سلطنت

اُس کو گر زندہ نہ رکھیں گھونٹ تیرے خون کے
اک جنازہ ہے حکومت دوش پر قانون کے

ہاں مناسب کچھ یہی معلوم ہوتا ہے ہمیں
بیٹیاں ہی بیٹیاں ہوتی رہیں اُس قوم میں

جس کے بیٹے چھوڑ دیں ماں باپ کی تعلیم کو
مضحکہ سمجھیں بڑوں کی عزت و تعظیم کو

مکتبوں کو چھوڑ کر جو داخلِ اسکول ہوں
دین میں مفلوج ہوں اخلاق میں مجہول ہوں

ہوں بزرگوں کے شعائر سے جنھیں بیزاریاں
ٹھوکروں میں جن کی ہوں ماں باپ کی خودداریاں

نازِ محبوبانہ سے ہر طور جن کا منفعل
اور ہر انداز سے جن کے نسائیت خجل

جن کی ایک ایک بات سے مجروح ہو فرزانگی
ہر ادا ہر ناز سے محجوب ہو مردانگی

جن کے دل نفرت سے معمور اور آنکھیں شعلہ بار ۔ جن کی تاریخیں تعصب سے جہنم در کنار
بُزدلی کی ہوں سند جن کی کتابوں کے ورق ۔ لیں بجائے درسِ حُرّیت غلامی کا سبق

جس کے بیٹے مادرِ بھارت کی رسوائی کریں
جس کے بیٹے غیر کے در پر جبیں سائی کریں

تیر برسیں جن کی ہر تقریر سے مضمون سے ۔ رنگ لیں دامن جو اپنے بھائیوں کے خون سے
راہ میں چیونٹی کی پامالی کا بھی ڈر ہو جنھیں ۔ شیرِ مادر کی طرح خونِ برادر ہو جنھیں
جو نہ جیتے ہوں نہ مرتے ہوں وطن کے واسطے ۔ ہوں جو نافرمان گُل اپنے چمن کے واسطے
جیل جانے کے عوض جائیں جو دفتر کی طرف ۔ ہوں غلامانہ نگاہیں جن کی افسر کی طرف
آہ وہ دفتر، جہاں حیوانیت ہو حکمراں ۔ ابنِ آدم کی شرافت ذبح ہوتی ہو جہاں
عدل اور انصاف کا نیلام ہوتا ہو جہاں ۔ خنجرِ بیداد خوں آشام ہوتا ہو جہاں
حق کیا جاتا ہو ناحق اور ناحق، حق جہاں ۔ عدل کا خوں، رحم کا ہوتا ہو سینہ شق جہاں
کوڑیوں کے مول میں انسان بکتا ہو جہاں ۔ چند سکّوں کے عوض ایمان بکتا ہو جہاں
مکر و کذب و فسق کی تلقین ہوتی ہو جہاں ۔ صدق و عدل و رحم کی توہین ہوتی ہو جہاں
حقِ آزادی و حرّیت جہاں محبوس ہو ۔ اپنی رفعت سے جہاں انسانیت مایوس ہو
دادخواہی جس جگہ روتی ہو دھاڑیں مار کر ۔ بیگناہی مار ڈالی جائے باڑیں مار کر

غور تو کر تجھ سے مرد اچھے ہیں اب یا عورتیں؟ ۔ شرم کہ تیری طرح محروم ہیں کیا عورتیں
بدنصیبی سے ہے یوں تو قوم ساری ہی غلام ۔ تُو ہے غیروں کا، مگر بیٹی ہے اپنوں کی غلام

سوچ دل میں شکر تجھ کو یا شکایت چاہیئے
نام سے بیٹے کے او نامرد غیرت چاہیئے

بسمل سعیدی جوشی

ٹونک

افسانہ نگاری

محمد یوسف ظفر۔ بی اے

دَورِ حاضر میں افسانہ کو تعلیم و تربیت کا بہترین ذریعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور فی الحقیقت موجودہ نسلوں کو گزشتہ زمانے کے تجربات اور موجودہ وقت کی ضروریات سے آگاہ کرنے کے لئے افسانہ ہی بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ افسانہ میں رومانی حیثیت کے علاوہ واقعات کو جس قدر دخل ہے وہ ظاہر ہی ہے۔ اگرچہ ان میں جدت بہت کم ہوتی ہے، لیکن بہر کیف انسان کے اخلاق اور عادات پر انہیں افسانوی واقعات نے جس قدر اثر ڈالا ہے وہ شاید ادبیات کی تمام دیگر صنوف سے بڑھکر ہے، افسانے عہدِ ماضی کے ماحصل ہیں، اور دَورِ جدید کے لئے یہ گنجینہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ نسلوں کی تعلیم و تربیت میں افسانوں کا درجہ بہت بلند ہے، اُس زمانے میں جب استادوں اور کتابوں نے انسان کو سدھارنے کا بیڑا نہیں اُٹھایا تھا، کہانیاں اور صرف کہانیاں ہی اس مقصد کو حل کرسکتی اور کرتی تھیں۔ بچے اور نوجوان۔ مرد اور عورتیں اپنے بزرگوں کے گرد حلقہ لگائے عشق و محبت، شجاعت و دلیری قربانی اور ایثار کے رنگین اور دلکش افسانے سنا کرتے، یہ افسانے حقائق پر مبنی ہوتے اور کوئی شخص بھی اِن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا، آج بھی ماں اپنے بچے کو لئے رات کے اولین حصّے میں اپنے بزرگوں کی تقلید کرتی ہے، اور اسی روش پر گامزن ہے جو قدما اور متاخرین نے تیار کی تھی، آج بھی وہ اپنے بچے کو خوش کرنے کے لئے افسانے سناتی ہے۔ لیکن اُسے یہ خبر نہیں ہوتی کہ اس "ایک تھی طوطی اور ایک تھا طوطا" میں کس قدر زندگی ہے، اور یہ افسانہ اُس کے بچے کی آئندہ حیات پر کس قدر اثر انداز ہوگا۔ مذہبی میدان میں افسانوں نے جس قدر حصہ لیا ہے، وہ اظہر من الشمس ہے۔ حضرت سلیمان، حضرت موسیٰ، حضرت یوسف علیہم السلام اور دیگر واقعات قرآن حکیم میں، کورو پانڈوں کی جنگ۔ سری کرشن جی اور سری رام چندر جی کے واقعات رامائن میں اور دیگر مذہبی کتابوں میں بزرگوں کے تذکرے فی الحقیقت افسانے ہیں اور انہی افسانوں نے انسان کی زندگی کو رنگنے کی جس قدر کامیاب سعی کی ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش و تحسین ہے۔

دنیا بھی ایک افسانہ ہے اور افسانہ کو پسند کرتی ہے، لیکن بہت کم ایسے لوگ ہیں جنھوں نے افسانہ نگاری کا ملکہ حاصل کیا ہو، انسان کے دل و دماغ ایک رنگین اور دلکش کامیاب افسانے کے تاثرات کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن بہت کم افسانہ نگاروں کو یہ محسوس ہوسکا ہے کہ وہ احساس جو اس طرح پیدا ہوتا ہے کس قدر اخلاقی قوت کا حامل ہے اور اس اخلاقی قوت کو کس طرح جائز طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ ایک ایک عمدہ اور کامیاب افسانہ، افسانہ نگار کے اپنے ذہنی ارتقا کا شاہد ہے۔

افسانوں کی ابتدا درس آموزی کی غرض سے ہوئی۔ اُس زمانے میں جب ادب صرف افسانوں اور کہانیوں کا دوسرا نام تھا، اُن کا مقصد محض تعلیمی تھا، واقعات ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں افسانے کی

صورت میں منتقل کردئے جاتے تھے۔ تاکہ وہ نوجوانوں کی زندگیوں کے بنانے میں
کامیاب ثابت ہوں۔ اس طرح انسان قدرت کے احکام کی خلاف ورزی کرنے
کی پاداش اور فطرت کے جذبۂ انتقام سے آگاہ کردئے جاتے تھے، اور اس
طرح وہ شجاع پرستی اور اخلاقی جرأت کی خوابیدہ روحوں کو بیدار کیا کرتے تھے،
جوں جوں ہم انسان کے ارتقا کی منازل پر غور کرتے چلے آتے ہیں ہم دیکھتے
ہیں کہ افسانوں کا درجہ کسی حالت میں بھی کم نہیں ہوتا۔ ہر عہد میں ہر نسل کے
پاس افسانوں کا موروثی ذخیرہ سینہ بسینہ چلا آتا ہے جو تاریخی لحاظ کے علاوہ
اور افسانوی پہلو کے باوجود ایک بلند و بالا مقصد لئے ہوئے ہوتا ہے آجکل
ہمارے اپنے زمانہ میں بھی افسانہ اپنی عظیم الشان وقعت لئے ہوئے ہے اور
ہم اس امر کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ شاید انسان کی زندگی پر اخلاقی
تدریسی کتب نے بھی اس قدر احسان نہیں کیا جس قدر افسانہ کی ماہیت نے کیا
ہے۔ افسانہ نے جو سلوک گزشتہ نسلوں کے ساتھ روا رکھا تھا وہ آج ہم سے
بھی وہی رعایت برت رہے ہیں، اور ہم اُن کے مرہونِ منت ہیں۔

اگر ہم جانوروں اور انسانوں کی دماغی زندگی کے فرق پر غور کریں تو
ہمیں معلوم ہوگا کہ اس مسئلہ میں انسان کی فوقیت بالخصوص اس امر میں ہے
کہ وہ مستقبل کے لئے اپنا مقصد قائم کرلیتا ہے، اور جانور اپنے آباؤ اجداد کی
طرح اپنی مشینی زندگی بسر کرنے پر مجبور اور مطمئن ہیں۔ انسان کے دماغ میں اُن
چیزوں کے تصورات کے دھندلے دھندلے نقوش پیدا ہو جاتے ہیں جو آئندہ
پردۂ سیمیں پر وقوع پذیر ہونے دیتے ہیں۔ بچہ جانور اور انسان کی حدِ فاصل
پر کھڑا ہو کر اپنے قرب و جوار پر نظر ڈالتا ہے۔ اپنے اندرونی جذبات کے تحت
اور تخیلی بینائی کی بنا پر وہ ہر چیز کو ایک شفقی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اب یہ
افسانوں کی ذمہ ہے کہ وہ بچے کو اس تخیلی اور شفقی دنیا سے نکال کر مادی
دنیا سے متعارف کریں اور بچے پر اُس کی حقیقت اور اُس کی زندگی کی عزائم
اور مقاصد واضح کردیں۔

اب سوال یہ ہے کہ افسانہ کس کو کہتے ہیں؟ اگرچہ یہ سوال سطحی طور پر دیکھنے
میں معمولی نظر آتا ہے لیکن بہت کم اہلِ قلم افسانہ کی صحیح تعریف پیش کرسکے ہیں،
وہ واقعات کی بے نقابی یا تاریخی بیان کو افسانہ قرار دے دیتے ہیں حالانکہ
حقیقت کچھ اور ہے۔ میرے نزدیک افسانہ سچے یا تخیلی واقعات کا اس طرح
پیش کیا جانا ہے کہ واقعات بتدریج ایک دوسرے سے منسلک رہیں، اور
بجائے دماغ کے احساسات پر اثر پڑے۔

چند چیزیں جو ہر افسانہ کے لئے جزو اتم ہیں اور جن کے بغیر افسانہ
کی حقیقت فی الواقع افسانہ ہو جاتی ہے، ہر افسانہ نگار کے لئے ضروری ہوتی
ہیں، یہ نقاط ہر افسانہ کی جان ہیں۔ خواہ وہ افسانہ اخلاقی ہو یا معاشرتی۔
سیاسی یا مذہبی، ہر افسانہ نگار ان پر جانتے ہوئے یا نہ جانتے ہوئے عمل کرتا
ہے۔ ان میں یہ نقاط افسانہ کی روح رواں ہوتے ہیں۔ (۱) تمہید (۲) واقعات
کا بتدریج بڑھاؤ (۳) (Climax) یا افسانہ کا معراج (۴)
اختتام۔

تمہید ہر چیز کے لئے لازمی ہے۔ لیکن افسانے کی ابتدا افسانے کی جان ہوتی
ہے۔ جس طرح گھوڑ دوڑ میں ایک گھوڑے کی دوڑ آغاز پر منحصر ہوتی ہے بعین
اُسی طرح افسانے کا آغاز بھی اُسے کامیاب یا ناکامیاب بنانے میں بڑا حصہ
لیتا ہے اور محض بُرے آغاز کی بنا پر کئی افسانے ناکام ہو جاتے ہیں۔

تمہید میں مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہیرو سے پڑھنے والے کو تعارف کرادیا
جائے یا ایک پردہ پس پشت اضافہ کے لئے تیار کیا جائے۔ اسے
(Background) کہنا چاہئے۔ لیکن اس تمہید سے پڑھنے والے
میں دلچسپی ضرور پیدا ہو۔ اور یہ افسانے کی رنگینی اور چاشت میں اضافہ کرے۔
افسانہ نگار کے لئے لازم ہے کہ وہ تمہید ہی میں ایسی جاذبیت پیدا کرکے اُن
احساسات کو جگانے کی کوشش کرے جن کا تعلق نفسِ افسانہ سے ہے۔ یہاں
یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جس قدر تمہید چھوٹی ہوگی اُسی قدر بہتر اور موثر ہوگی۔
لمبے لمبے جملے اور بیکار تمہیدیں بلاوجہ باعثِ تکلیف ہو جاتی ہیں، اور پڑھنے والے
پر اُن کا بار پڑتا ہے اور وہ اُن کو روندتا ہوا اصل افسانہ کی طرف بڑھتا چلا
جاتا ہے۔ آجکل اس افسانہ کی نسبت بھی اُس کی چاشت اور دلچسپی اہم ہے۔
اور تمہید سے ہی پڑھنے والے کو یہ معلوم ہو جانا چاہئے کہ جس افسانے کا وہ
مشتاق ہے وہ افسانہ یہی ہے۔ لمبی چوڑی تمہید کی بجائے چند توصیفی اور
ترکیبی جملے استعمال کرنے چاہئیں اور آغاز کو سوچ کر چند حروف ہی بطور تمہید
کافی ثابت ہوں گے۔

نفسِ افسانہ میں معراج کی طرف واقعات کا بتدریج بڑھاؤ بھی بہت
اہم ہے۔ اس مقام پر ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ واقعات کو قدم بقدم بڑھایا
جائے، اور پڑھنے والا کم از کم معراج کو پہلے سے ہی سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔

تاکہ اُس کی دلچسپی میں خاطر خواہ اضافہ ہو۔ ہر افسانہ نگار صرف ربط پر ہی زور دیکر افسانہ کی خوبی پر چار چاند لگا سکتا ہے۔ یہاں پر محاوروں کا استعمال اور سلاست کو بھی دخل ہونا چاہیئے۔

معراج یا (Climax) پر تمام افسانے کا دارومدار ہوتا ہے، افسانے میں محض معراج کی خاطر واقعات کو بڑھاتے چلے جانا چاہیئے کیونکہ معراج کی ناکامی تمام افسانے کی ناکامی ہے، افسانہ کی زندگی کا تمام تر انحصار معراج پر ہے، اور معراج میں افسانہ نگار کی قابلیت کی جھلک ہوتی ہے۔ بغیر معراج کے کوئی افسانہ افسانہ ہی نہیں ہوسکتا۔ اگر یہاں پر ذرا سی حیرانی کو دخل ہو جائے تو یہ بھی اُس کی خوبی ہے۔ اور کم از کم مذاحیہ میں حیرانی افسانہ کے لئے جزو لازم ہے اور اخلاقی افسانہ تو بغیر معراج کے بے معنی تحریروں کا مجموعہ ہے۔

معراج کی طرح افسانے کے انجام کو بھی کامیابی اور ناکامی میں دخل ہے۔ ایک اچھا افسانہ خاطر خواہ انجام نہ پانے کی وجہ سے بے معنی سا ہوجاتا ہے، کیونکہ اُن احساسات کا جو معراج میں انتہا تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں، سنبھالنا انجام پر منحصر ہے۔ اور پڑھنے والا خود بخود یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ افسانے کا انجام بھی ہے اور وہ وہی تاثرات لے کر اُٹھے جو معراج میں اُس کے لئے رکھے گئے تھے۔ یہاں پر دماغ کو قدرے سکون ملنا چاہیئے۔ تاکہ تمام افسانہ پر ایک نظرِ غائر ڈالنے اور گہرائیوں کی تہ تک پہنچنے میں کامیابی ہو۔

اس لئے ہر اچھے افسانے میں دلچسپی پیدا کرنے والی تمہید۔ واقعات کا باقاعدہ اور مکمل چڑھاؤ، اور معراج جو تمام افسانے کی روح ہے کا نظام اور ایک لطیف انجام جس سے پڑھنے والے کو سکون سا نصیب ہو۔ ہونا چاہیئے۔ یا دوسرے الفاظ میں ایک افسانے کے لئے ہیرو۔ واقعات کی رفتار، پلاٹ اور انجام اُس کا جسم ہیں۔

چند واقعات کو ایک لڑی میں پرو دینے کا نام افسانہ نہیں، بلکہ افسانہ کا جزوِ اساسی واقعات کا درجہ بدرجہ ربط اور اُن کا ایک زبردست روشنی میں ظہور اور چھوٹے چھوٹے کمزور واقعات پر دسترس ہی افسانہ کو یہ نام دے سکتے ہیں، اور اس سے بھی بڑھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ افسانہ میں سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ اس میں کچھ ہونا چاہیئے۔

مقدار یا معیار

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ "کلیم" کے حجم کو دیکھتے ہوئے اُس کا چندہ زیادہ ہے۔ حالانکہ یہ سراسر خلافِ واقعہ ہے، اتنے بڑے سائز کے ساتھ "کلیم" کا جو حجم ہے وہ اُردو زبان کے کسی پرچے کو میسر نہیں۔

چھوٹے سائز کے پرچے زیادہ سے زیادہ ساٹھ صفحوں پر مشتمل ہوتے ہیں، اور "کلیم" بڑے سائز کے باوجود تقریباً سو صفحے پیش کرتا ہے، اور اس لحاظ سے وہ اردو کا سب سے زیادہ سستا پرچہ ہے۔

اور اگر یہ خلافِ واقعہ امر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ "کلیم" کا حجم حسبِ مُراد نہیں ہے، پھر بھی یہ اہم سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اشیاء کی "مقدار" قابلِ توجہ ہوتی ہے، یا اُن کا "معیار" اور کسی شئے کا "وزن" اُس کی خوبی کا ضامن ہوتا ہے، یا اُس کے "محاسن"؟

اگر "معیار" و "محاسن" سے قطع نظر کرکے کسی شے کی قدر و منزلت "مقدار" و "وزن" پر مبنی ہوسکتی ہے تو خاک کے ایک بہت بڑے انبار کو ترجیح دی جاسکتی ہے، ایک ہیرے کے نگینے پر، کیونکہ ہیرے کا نگینہ چھوٹا ہوتا ہے۔ اور ایک ہاتھی کو ترجیح دی جاسکتی ہے انسان پر، کیونکہ ہاتھی کا جسم گوشت کی ایک بہت بڑی مقدار کا حامل ہوتا ہے۔

(منیجر کلیم)

انڈین نیشنل کانگریس

اور ہندوستانی مسلمانوں کے بڑے بڑے سوال

مرتب کردہ

شعبۂ اطلاعات سیاسی و معیشی آل انڈیا کانگریس کمیٹی - الٰہ آباد

گذارش

۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۷ء تک مختلف اوقات میں کانگریس نے بارہا ایسی تجویزیں منظور کی ہیں جن کا براہِ راست یا بالواسطہ مسلمانوں سے تعلق ہے، ان سب تجاویز کو جمع کرنے اور ان کے متعلق تفصیلی طور پر لکھنے سے ایک خاصی کتاب مرتب ہو جائے گی۔ ہمارا مقصد اس وقت صرف اس قدر ہے کہ کانگریس کی کارروائیوں میں سے بعض چیدہ چیدہ تجاویز درج کر دیں تاکہ مسلمانانِ ہند کو اس قومی ادارہ کی ہمہ گیری اور اہمیت کا ہلکا سا اندازہ ہو جائے اور وہ اُسے محسوس کریں کہ مسلمانوں کی حقیقی خدمت فرقہ پرست انجمنیں نہیں بلکہ صرف استعمار دشمن اور کثیر قومی ادارے کر سکتے ہیں، جن کے دروازے ہر ملت کے غریب اور جدوجہد کرنے والے لوگوں کے لئے یکساں کھلے ہوئے ہوں۔

ہم نے بعض تجاویز بیرونی اسلامی ممالک کے متعلق دی ہیں اس کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کی دلجوئی نہیں ہے بلکہ مدعا یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند سے خوب محسوس کر لیں کہ آج ہندوستان اور اسلامی دنیا میں اس لئے قرب و یگانگی پیدا ہو رہی ہے چونکہ بیشتر ایشیائی ممالک مغربی استعمار اور خصوصیت سے برطانوی استعمار کے نیچے دب گئے ہیں اور ایک کی قومی جدوجہد کا دوسرے پر لازماً اثر پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج مصر، شام، فلسطین، ترکی طرابلس اور دوسرے اسلامی ملکوں پر ہندوستانی قومی تحریک کی برابر نگاہ رہتی ہے اور خلافت کی تحریک نے تاریخی طور پر ہندوستان میں ایک بلند پایہ قومی اور ملکی تحریک کا درجہ اختیار کر لیا تھا، اس سے یہ بات بھی صاف ہو جائے گی کہ بہت سے ایسے سیاسی مسئلے جنھیں مسلمان خالصاً مذہبی اور ملّی تصور کرتے ہیں۔ کانگریس کے استعمار دشمن مسلک کی وجہ سے ہم کانگریسیوں کے لئے اسی درجہ اہم ہیں اور ہماری سیاست کا لازمی جزو ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں پنڈت جواہر لال نے تقسیم فلسطین اور واقعاتِ سرحد سے برابر گہری دلچسپی لی ہے اور کانگریس نے برابر تجاویز منظور کیں اور اُن پر عمل کیا ہے۔

مسلمانوں کے سیاسی مطالبات کے متعلق کانگریس کی تجاویز پڑھنے سے یہ خوب واضح ہو جائے گا کہ کانگریس نے یا تو مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کر لیا ہے مثلاً سندھ کی علیحدگی اور صوبہ سرحد کے لئے اصلاحات کا سوال یا غیر مشتبہ الفاظ میں اس کا اعلان کر دیا ہے کہ کانگریس فرقہ وارانہ مسئلہ کا کوئی مخصوص حل اس وقت تک تسلیم نہ کرے گی جب تک تمام فرقوں کو یہ صورت منظور نہ ہو، کانگریس کی تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ملیں گی جب اس نے نزاعی فرقہ وارانہ سوالات کا ایک حل پیش کیا لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ ایک یا دونوں فریق اس مخصوص تجویز سے متفق نہیں ہیں، تو اس نے

بلا تامل اُسے منسوخ کر دیا۔

غرضکہ اقلیتوں اور مسلمانوں کو بالخصوص کانگریس کے رویہ اور نیت کے متعلق اطمینان ہونا چاہیئے جنھیں وقت بے وقت (اور خاصکر ایسے زمانہ میں جب متحدہ قومی تحریک کے آثار بڑھنے لگیں اور آزادی کی جدوجہد سامنے ہو) یہ خوف دلایا جاتا ہے کہ کانگریس میں غیر مشروط طور پر شریک ہونے سے اُن کے جائز حقوق خطرہ میں پڑ جائیں گے۔ اعتراض کرنے والوں اور خوف دلانے والوں کا بظاہر قومی اور ملکی آزادی کی جدوجہد سے کم ازکم اس وقت دور کا بھی تعلق نظر نہیں آتا۔

میں نے کانگریس کی تجاویز مضامین کے اعتبار سے نہیں بلکہ سنہ اور تاریخ کے لحاظ سے بلا عنوان دیئے درج کر دی ہیں تاکہ تسلسل کا اظہار ہو جائے۔ (محمد اشرف)

۱۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی بنارس ۳۰، ۳۱ مئی ۱۹۲۰ء

" آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی یہ قطعی رائے ہے کہ ترکی کو صلح کی جو شرائط پیش کی گئی ہیں وہ ان وعدوں کے خلاف ہیں جو حکومت برطانیہ نے کئے تھے اور قومی خود مختاری کے اصول، جسے اتحادی حکومتوں نے تسلیم کر لیا تھا، کے منافی اور ہندستان کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو تکلیف پہنچانے والے ہیں۔ اس بات کا خیال کرتے ہوئے کہ دوران جنگ میں ہندستان کی دولت اپنی آزادی کے ساتھ استعمال کی گئی تھی، یہ کمیٹی اس کی مذمت کرتی ہے کہ اس استعمال کا نتیجہ متذکرہ بالا صلح کی شرائط کی صورت میں ظاہر ہو جس سے خلافت کا وقار اور طاقت تباہ ہوتی ہے اور مسلمانوں کے مقدس مقامات خلافت کے قبضہ و حفاظت سے نکل کر عیسائیوں کے قبضہ یا اثر میں آتے ہیں۔

یہ کمیٹی پر زور مطالبہ کرتی ہے کہ ہندوستان میں امن اور اطمینان کے قیام کی خاطر صلح ترکی کی شرائط پر ایسی نظر ثانی کی جائے کہ وہ متذکرہ بالا وعدوں اور ہندستان کے مسلمانوں کے جائز مطالبات کے مطابق ہو جائیں "

۲۔ اجلاس خاص کلکتہ ۴، ۶، ۸، ۹، ستمبر ۱۹۲۰ء

" اس امر کے پیش نظر کہ خلافت کے مسئلہ پر ہندوستان کے مسلمانوں سے متعلق جو ذمہ داریاں عاید ہوتی تھیں اُن کو پورا کرنے میں حکومت برطانیہ اور حکومت ہند دونوں نمایاں طریقہ پر ناکام رہی ہیں اور وزیر اعظم نے ارادۃً ان وعدوں کو جو انہوں نے مسلمانوں سے کئے خلاف ورزی کی ہے اور چونکہ ہر غیر مسلم ہندوستانی کا یہ فرض ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کی ان کی مذہبی مصیبتوں کے دور کرنے میں ہر جائز طریقہ سے مدد کرے۔

" اور اس واقعہ کے پیش نظر کہ اپریل ۱۹۱۹ء کے حادثات میں دونوں متذکرہ بالا حکومتوں نے پنجاب کے بے گناہ لوگوں کو بچانے اور ان افسروں کو جنھوں نے ان کے ساتھ غیر سپاہیانہ اور وحشیانہ سلوک کیا تھا سزا دینے میں یا تو کوتاہی کی ہے بالکل ناکام رہی ہیں اور سر مائیکل اوڈوائر کو جو اکثر سرکاری جرائم کے براہ راست یا بالواسطہ ذمہ دار تھے اور جنھوں نے ان لوگوں کی مصیبتوں سے جو ان کی حفاظت میں رکھے گئے تھے، بے پروائی برتی، ذمہ داریوں سے بری کر دیا ہے، نیز چونکہ دار العوام اور دار الامراء کے مباحثوں میں ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ ہمدردی کی تکلیف دہ کمی ظاہر ہوتی ہے اور صوبہ پنجاب میں باقاعدہ تشدد اور ہیبت انگیزی کی حمایت کا پتہ چلتا ہے، اور چونکہ وائسرائے کے آخری اعلان میں پنجاب اور خلافت کے معاملات پر ندامت یا تاسف کی کوئی علامت نہیں ملتی اس لئے

" اس کانگریس کی رائے ہے کہ ہندوستان کو اس وقت تک چین نہیں آسکتا جب تک اوپر ذکر کی ہوئی دو بے انصافیوں کی تلافی نہ ہو جائے اور یہ کہ قومی وقار برقرار رکھنے اور اس قسم کی دوسری بے انصافیوں کو روکنے کا موثر ذریعہ صرف سوراج کا حصول ہو سکتا ہے، اس کانگریس کی مزید رائے ہے کہ ہندستان کے لوگوں کے لئے اس کے علاوہ کوئی دوسری راہ عمل نہیں ہے کہ غیر متشدد ترک موالات کی پالیسی جسے مسٹر گاندھی نے شروع کیا ہے، اختیار کی جائے تا آنکہ متذکرہ بالا بے انصافیوں کی تلافی ہو جائے اور سوراجیہ حاصل ہو جائے "

۳۔ ورکنگ کمیٹی بمبئی ۱۴، ۱۵، ۱۶ جون ۱۹۲۱ء

اس مسئلہ کے متعلق کہ اگر حکومت برطانیہ، انگورہ کی ترکی سلطنت کے خلاف جنگی کارروائیاں شروع کرے تو ہندستانیوں کو حکومت کی مدد کرنی مناسب ہے یا نہیں؟ ورکنگ کمیٹی کی رائے ہے کہ ترک موالات کی

اس تجویز کے پیشِ نظر جو کلکتہ کانگریس کے خاص اجلاس میں منظور کی گئی تھی، ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ مسلمانوں کی رائے عامہ کے خلاف ان کارروائیوں میں حکومت برطانیہ کی مدد کرنے سے باز رہے۔ اور اس لئے ہندوستان کے سپاہی پیشہ طبقہ کو چاہیئے کہ وہ اس سلسلہ میں حکومت کی خدمت کرنے سے انکار کردے۔"

۴۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی بمبئی ۲۸، ۲۹، ۳۰، جولائی ۱۹۲۱ء

"حسب ذیل تجویز کو جو مرکزی خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام اہالیانِ بمبئی کے ایک عام جلسہ میں پاس ہوئی ہے نوٹ کرلیا جائے۔

" اس واقعہ کے مدنظر کہ ہندوستان کے باشندوں کی قسمت لازمی طور پر ہمسایہ ایشیائی اقوام اور حکومتوں کے ساتھ وابستہ ہے، مسلمانانِ بمبئی کا یہ جلسۂ عام آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ہمسایہ حکومتوں کے ساتھ محبت اور اتحاد کے جذبات کو ترقی دینے کی کوشش کرے اور ایک دوسرے کے ساتھ بہی خواہی اور ہمدردی کے تعلقات قایم کرنے کی غرض سے ہندوستان کی ایک واضح اور قطعی خارجی پالیسی ترتیب دے۔

"طے کیا گیا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی طرف سے تجویز کی رسید مسٹر چھوٹانی، جلسہ کے صدر اور مرکزی خلافت کمیٹی کے پاس روانہ کردی جائے اور اس بات کا شکریہ ادا کیا جائے کہ انھوں نے اتنے اہم مسئلہ کی طرف آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی توجہ مبذول کرائی اور ورکنگ کمیٹی سے درخواست کی جائے کہ وہ متذکرہ پالیسی کے متعلق ایک بیان تیار کرے تاکہ اُسے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دوسرے اجلاس میں غور و خوض کے لئے پیش کیا جائے۔"

۵۔ ورکنگ کمیٹی ۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء بمبئی

خارجی پالیسی کی اس تجویز کے متعلق جس کے ذریعہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے جولائی کے اجلاس بمبئی میں خاص طور پر ورکنگ کمیٹی سے ایک بیان تیار کرنے کی درخواست کی تھی، ورکنگ کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ کانگریس پڑوس کی حکومتوں اور دوسری سلطنتوں پر ظاہر کردے کہ

(۱) حکومت ہند کسی طرح بھی ہندوستان کی رائے عامہ کی نمائندگی نہیں کرتی ہے اور اس کی جو پالیسی بھی ہوتی ہے اس کی غرض روایتی طور پر ہندوستان کی سرحدوں کی حفاظت نہیں ہوتی بلکہ ہندوستان کو ہمیشہ اپنی غلامی میں رکھنا ہوتی ہے،

(۲) کہ ہندوستان کو ایک خود مختار ملک کی حیثیت سے حاصل کر لینے کے بعد دوسری حکومتوں سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، چونکہ اس کے باشندے ان میں سے کسی کو نقصان پہنچانے کے خواہشمند نہیں ہیں، اور اس لئے ان کا ارادہ کسی ایسے تجارتی رشتے کا قائم کرنا نہیں ہے، جسے متذکرہ بالا حکومتوں کے باشندے نہ پسند کرتے ہوں یا جو ان کے اغراض و مفاد کے منافی ہو۔

(۳) نیز یہ کہ ہندوستان کے باشندے اکثر ان معاہدوں کے متعلق جو حکومت برطانیہ اور ہمسایہ حکومتوں کے درمیان طے پائے ہیں، یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ استعماری حکومت نے ہندوستان میں لوٹ جاری رکھنے کے لئے کئے ہیں، اور اس لئے ان حکومتوں سے جو ہندوستان کے باشندوں کی بدخواہ اور ہندوستان کے مفاد کو نقصان پہنچانے کے خواہشمند نہیں ہیں، مطالبہ کرتی ہے کہ استعماری حکومت کے ساتھ اس قسم کے معاہدے کرنے سے باز رہیں۔

"کمیٹی اسلامی حکومتوں کو یہ بھی یقین دلاتی ہے کہ جب ہندوستان خود مختاری حاصل کرے گا تو اس کی خارجی پالیسی ایسی رکھی جائے گی جس میں مسلمانوں کے مذہبی فرائض کی توقیر کا خاص لحاظ ہوگا۔۔۔۔"

۶۔ اجلاس سالانہ منعقدہ احمد آباد ۲۷، ۲۸، دسمبر ۱۹۲۱ء

"یہ کانگریس غازی مصطفےٰ کمال پاشا اور ترکوں کی کامیابی پر مبارکباد پیش کرتی ہے اور ترکی قوم کو یقین دلاتی ہے کہ ہندوستان کو اُن کے ساتھ پوری ہمدردی ہے اور ان کی موجودہ حیثیت اور آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے جد و جہد میں مدد کرنے کے لئے تیار ہے۔"

۷۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی، ۲۰ تا ۲۴ جون ۱۹۲۲ء، کلکتہ

"آل انڈیا کانگریس کمیٹی ترکی قوم کو حالیہ فتوحات پر مبارکباد دیتی ہے

اور اپنی اس قطعی رائے کا اظہار کرتی ہے کہ ایشیا اور یورپ کے ترکی علاقوں میں پوری اور بے روک آزادی دینے کے متعلق حکومت انگورہ کے تمام مطالبات پورے نہ کر دیئے جائیں اور جب تک جزیرۃ العرب کو غیر اسلامی قبضہ سے آزاد نہ کر دیا جائے ہندوستان میں امن و اطمینان نہیں ہو سکتا۔"

۸- اجلاس سالانہ منعقدہ گیا ۱۹۲۲ء

"چونکہ مشرقِ قریب کے نازک حالات خلافت اور حکومتِ ترکی کے وجود کے لئے خطرہ ہو رہے ہیں اور ہندو و مسلمان اور ہندوستان کے دوسرے لوگ اس خطرے سے ہونے والے نقصانات کو روکنے کا عزم رکھتے ہیں، یہ کانگریس طے کرتی ہے کہ ورکنگ کمیٹی، خلافت ورکنگ کمیٹی کے مشورہ سے ایسے ذرائع اختیار کرے جن پر عمل کر کے ہندو مسلمان اور دوسرے لوگوں کی طرف سے ناجائز مقاصد کی خاطر ہندوستان کو استعمال کئے جانے سے روکنے کے لئے متحدہ محاذ پیش کیا جا سکے اور صورت حالات کا بندوبست کیا جا سکے۔"

۹- آل انڈیا کانگریس کمیٹی بلگام ۲۸ر دسمبر ۱۹۲۴ء

"طے پایا کہ کانگریس مصریوں کے ساتھ ان کی مصیبتوں میں مودبانہ ہمدردی کا اظہار کرتی ہے اور امید کرتی ہے کہ وہ بہادری کے ساتھ ان آلام کو برداشت کریں گے اور اُن کے ملک میں تشدد کا جو دور دورہ ہے اُس کا کامیابی سے مقابلہ کریں گے۔"

۱۰- ورکنگ کمیٹی سابرمتی ۴ر مئی ۱۹۲۶ء

"بحث و مباحثہ کے بعد ہندو مسلم مسئلہ کے متعلق منجملہ اور باتوں کے حسب ذیل تین تجویزوں پر اتفاق رائے ہوا۔

(۱) لکھنؤ پیکٹ کی شرائط کے پیش نظر کسی مجلس قانون ساز کے کسی کانگریسی ممبر کو یہ اجازت نہ ہوگی کہ کوئی تجویز یا قانون جداگانہ انتخاب کو ختم کر کے مشترکہ انتخاب جاری کرنے کے لئے پیش کریں جب تک کہ اس کے متعلق مجلس قانون ساز کے ہندو مسلمان اراکین کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہ ہو جائے۔

(۲) مجلس قانون ساز کے مسلمان امیدواروں کا انتخاب کرتے وقت صوبجاتی کانگریس کی مجلس عاملہ عام طور پر ان لوگوں کو ترجیح دے گی جن کی سفارش صوبائی خلافت کمیٹی نے کی ہو۔

(۳) مجلس قانون ساز کی کانگریس پارٹی کا کوئی رکن فرقہ وارانہ مسئلہ سے متعلق کوئی ایسی تجویز قانون یا ترمیم پیش نہ کرے گا جس کی کانگریس پارٹی کے ہندو یا مسلمان اراکین کی تین چوتھائی کی اکثریت خلاف ہو۔

۱۱- آل انڈیا کانگریس کمیٹی بمبئی ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸ مئی ۱۹۲۷ء

ہندو مسلم مسئلہ کے متعلق حسب ذیل مزید تجویزیں منظور ہوئیں۔

(۱) مسلمان لیڈروں کی یہ تجویز کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ میں اور برطانوی بلوچستان میں اس قسم کی اصلاحات نافذ کی جائیں جیسی کہ دوسرے صوبوں کو حاصل ہیں، کمیٹی کی رائے میں مناسب اور معقول ہے اور اس کو عمل میں لانا چاہیئے، اور اس کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ دوسرے انتظامی اصلاحات کے ساتھ ساتھ ان صوبوں میں ایک مناسب عدالتی نظام بھی نافذ کیا جائے۔

(۲) اس تجویز کے متعلق کہ سندھ کو الگ صوبہ بنا دیا جائے اس کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ زبان کی بنیاد پر صوبوں کی دوبارہ تقسیم کا وقت آگیا ہے، یہ ایک ایسا اصول ہے جسے کانگریس کے دستور میں تسلیم کر لیا گیا ہے۔

"کمیٹی کی یہ بھی رائے ہے کہ صوبوں کی دوبارہ تقسیم کا کام فوراً شروع کر دینا چاہیئے اور جو صوبہ زبان کی بنیاد پر علیحدگی کا مطالبہ کرے اس کا اس اصول کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔"

"کمیٹی کی مزید رائے ہے کہ اندھرا، سندھ اور کرناٹک کو علیحدہ صوبہ قرار دے کر اس کام کی ابتدا کی جا سکتی ہے۔"

(۳) آئندہ دستور میں ہر شخص کو ضمیر کی آزادی حاصل ہوگی اور مرکزی یا صوبجاتی کسی کونسل کو آزادی ضمیر میں مداخلت کا حق حاصل نہ ہوگا۔

"ضمیر کی آزادی، سے مراد اعتقاد اور عبادت کی آزادی، مذہبی رسوم کی ادائیگی اور اجتماع کی آزادی، دوسروں کے جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے اور دوسروں کے اسی قسم کے حقوق میں مداخلت کئے بغیر مذہبی تعلیم و تبلیغ کی آزادی ہے۔"

۱۲- اجلاس، کلکتہ ۱۹۲۸ء

"یہ کانگریس مصر، شام، فلسطین اور عراق کے لوگوں کو، مغربی استعماریت

کے نتیجہ سے جو کانگریس کی رائے میں ہندوستان کی جنگ آزادی کے لئے بڑا خطرہ ہے، آزادی حاصل کرنے کی کوششوں پر مبارکباد پیش کرتی ہے اور ان کو ہندوستان کی پوری ہمدردی کا یقین دلاتی ہے۔"

۱۳۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی لکھنو ۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء

"آل انڈیا کانگریس کمیٹی ان ذلت آمیز اور تکلیف دہ پابندیوں کو جو جنوبی افریقہ کی یونین حکومت نے اپنے ملک میں مقیم برادران کے داخلہ پر عائد کی ہیں نہایت افسوس کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور ان پابندیوں کو قومی توہین خیال کرتی ہے، کمیٹی کی رائے میں حکومت ہند، یونین حکومت پر ان ناقابل اعتراض پابندیوں کو اٹھانے اور جنوبی افریقہ میں مقیم برادران کے داخلہ میں سہولتیں بہم پہنچانے پر اصرار نہ کرکے قومی وقار کو برقرار رکھنے میں ناکام رہی ہے، خاصکر ایسی حالت میں جبکہ انھوں نے اس ملک میں قیام کے دوران میں سیاسی مباحث سے الگ رہنے کا خود ہی وعدہ کیا تھا۔

۱۴۔ ورکنگ کمیٹی نیو دہلی ۳، ۴ فروری ۱۹۲۹ء

"کمیٹی نے افغانستان کی مالیہ اندرونی مشکلات، اور شاہ امان اللہ کی نافذکردہ اصلاحات کو ختم کرنے کی رجعت پسندانہ کوششوں کا کھینچنے کے ساتھ مطالعہ کیا ہے، یہ کمیٹی دل سے ملک کی ترقی پسند عناصر کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتی ہے اور افغانستان کو متحد اور ترقی پرور ملک بنانے کی کوششوں کو کامیاب دیکھنے کی آرزومند ہے۔"

۱۵۔ ورکنگ کمیٹی لاہور، ۲ جنوری ۱۹۳۰ء

"نیچے درج کی ہوئی تجویز (جو کانگریس میں پیش کرنے کے لئے تیار کی گئی اور ورکنگ کمیٹی کو بھیجی گئی) کے متعلق یہ کمیٹی ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر کچلو اور لالہ دونی چند انبالوی کو اس تجویز میں مندرجہ الزامات کے متعلق تحقیق کرنے اور جن قوانین اور ضوابط کا حوالہ دیا گیا ہے اُن کی نوعیت اور اُن کے نفاذ کے طریقوں کے متعلق رپورٹ تیار کرنے پر مامور کرتی ہے، ضرورت ہو تو یہ اصحاب دو مقامی اصحاب کو بھی جن کی تعداد زیادہ سے زیادہ دو ہو شریک کار کرسکتے ہیں۔ یہ رپورٹ آئندہ مارچ کے اختتام سے پہلے کمیٹی کے پاس پہنچ جانی چاہیئے۔

تجویز متذکرہ بالا کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

"چونکہ شمال مغربی سرحدی صوبہ، میں فرنٹیر کرائم ریگولیشن (ضوابط جرائم صوبہ سرحد) مرڈرس اوٹریجس ایکٹ (قاتلانہ جرائم کے متعلق قانون) اور ضوابط تحفظ (سیکیوریٹی ریگولیشن) وغیرہ کے انتہائی تباہکن طریقے نافذ کئے گئے ہیں جن کی وجہ سے عام شہریوں کی زندگی اس صوبہ میں ناقابل برداشت ہوگئی ہے اور جن کے غیر محتاط اور بلا امتیاز استعمال کی زد سے اچھے تعلیمیافتہ اصحاب بھی بچنے نہیں پاتے۔

"اور چونکہ قانونی سماعت، بحث یا اپیل کا موقع باقی نہیں رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے سرکاری عہدہ داروں کو من مانے طریقے پر بے گناہ اشخاص کو ہراساں کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

یہ تجویز کی جاتی ہے کہ جلد ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جائے جو اوپر ذکر کئے ہوئے قوانین کو جانچے، شہادتیں لے اور ان کی وجہ سے جو نقصانات ہوئے ہیں ان کا پتہ چلائے اور ان کو جلد از جلد ختم کرنے کے ذرائع پر غور کرے۔

۱۶۔ اجلاس سالانہ لاہور ۱۹۲۹ء

"چونکہ نہرو رپورٹ کو منسوخ کردیا گیا ہے، اس لئے فرقہ وارانہ مسائل کے متعلق کانگریس کی پالیسی کا اعلان کرنا غیر ضروری ہے۔ کانگریس کو یہ یقین ہے کہ آزاد ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسائل کو صرف قومی اصول پر حل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن چونکہ سکھوں نے خاصکر اور مسلمانوں اور دوسرے فرقوں نے عام طور پر فرقہ وارانہ مسائل کے اس حل سے بے اطمینانی ظاہر کی ہے جو نہرو رپورٹ میں پیش کیا گیا ہے، کانگریس سکھوں، مسلمانوں اور دوسرے فرقوں کو یقین دلاتی ہے کہ کسی آئندہ آئین میں اس مسئلہ کا کوئی ایسا حل کانگریس کے لئے قابل قبول نہ ہوگا جو تمام متعلقہ جماعتوں کو پورا اطمینان نہ دلا دیں۔"

۱۷۔ سالانہ اجلاس فیض پور ۱۹۳۷ء

کانگریس کی رائے میں شمال مغربی سرحد پر حکومت ہند کی اختیارکردہ

پالیسی قطعاً ناکام رہی ہے اور اس لئے ہندوستان اور سرحد پار کے قبائل کے مفاد کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہ پالیسی ملوکیت کے اغراض کی خاطر اختیار کی گئی جس کا مقصد زیادہ تر یہ ہے کہ ہندوستان کے گرانبار فوجی اخراجات کو جائز ثابت کیا جائے، اور نیم جنگی حالات پیدا کر کے ان فوجوں کو جو عام طور پر نکمی پڑی رہتی ہیں، استعماری اغراض کے لئے ٹریننگ دی جائے۔ کوئی پالیسی جو ہوائی جہازوں کے ذریعہ بمباری جیسے خلافِ انسانیت اور وحشیانہ طریقوں کے استعمال اور سرحد پار کے علاقوں پر ہمیشہ فوجی حملوں کو ضروری قرار دے قابلِ مذمت ہے، اس کے علاوہ یہ پالیسی سرحد پر امن قایم کرنے میں نمایاں طریقہ پر ناکام رہی ہے اور اکثر سرحد پار کے حلیف قبائل کو دشمن اور مخالف بناتی رہی ہے۔

ہندوستان کے اندرونی و بیرونی دونوں مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ سرحد پر امن ہو اور ہمارے ہمسایوں کے ساتھ دوستوں کا سا تعلق قائم رہے، اور کانگرس یقین رکھتی ہے کہ یہ دوستانہ تعلقات اور امن بغیر کسی دقت کے قائم کئے جا سکتے ہیں، اگر سرحد پار کے قبائل کے ساتھ دوستوں اور اچھے ہمسایوں کے مانند سلوک کیا جائے اور تہذیب پھیلانے یا اقتصادی اعانت پہنچانے کے حیلے سے فوجی سڑکیں تیار کر کے یا کسی دوسرے پردے میں ان کے معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔ کانگرس یقین رکھتی ہے کہ سرحد کے پٹھان قبائل کے خلاف غیر متمدن، خطرناک، ظالم اور حملہ آور ہونے کے الزامات بے بنیاد ہیں، اور اس لئے تراشے گئے ہیں کہ اُن کی بنا پر ناجائز مداخلت اور کثیر فوجی اخراجات کو صحیح ثابت کیا جائے۔

کانگرس اعلان کرتی ہے کہ ہندوستان کے لوگ اپنے ہمسایوں سے دوستی چاہتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ امن اور فلاحِ انسانی کو ترقی دینے والے بڑے کاموں میں تعاون کے لئے تیار ہیں۔

سرحد پار کے علاقوں میں پچھلی تعزیری کارروائیوں کی، جو حکومت ہند کی بے نتیجہ اور خطرناک سرحدی پالیسی کی مزید مثال ہے اور جس سے تباہی اور ناخوشگواری کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے کانگرس مذمت کرتی ہے۔

کانگرس کی رائے میں سرحد کے مسئلہ کو حل کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ سرحدی علاقہ کی اقتصادی سیاسی اور فوجی حالات کی تحقیقات کی جائے، تاکہ سرحدی قبائل کو ساتھ لے کر سرحدی مسائل کو پر امن طریقہ پر ہمیشہ کے لئے طے کر دیا جائے۔"

وہ واقعہ!

اختر اوریوی، ایم۔اے

انسان کی زندگی بعض دفعہ کتنے چھوٹے چھوٹے واقعات سے شدید طور پر متاثر ہو جاتی ہے۔ یہ بظاہر معمولی واقعات کیسے انقلاب انگیز ثابت ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ روزمرہ کی ناقابلِ التفات باتیں وہ معجزہ نمائی کرتی ہیں کہ اہم حادثات بھی انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتے ہیں۔

میں اور شاہد لڑکپن سے ساتھ رہتے سہتے آئے تھے، وہ میرا چچا زاد بھائی تھا، ہم لوگ ابتدا سے برابر لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، میں اُسے اکثر چھیڑا کرتا تھا، اُس پر پھبتیاں کستا رہتا، اُس کی نقلیں اُتارتا، اور سو سو طرح سے اُسے پریشان کرتا تھا، شاہد بھی بڑا زود رنج تھا محض مذاق کی باتیں اُسے رُلانے کے لئے کافی تھیں، وہ بہت حسّاس تھا، دن گزرتے گئے اور ہم لوگ اسکول کی منزل طے کر کے کالج میں پہنچے سِن شعور کو پہونچ کر لڑکپن کی باتیں تو خیر ختم ہوئیں۔ لیکن اب بھی میں اور شاہد برسرِ پیکار رہتے تھے۔ یہ تقریری جنگ ہوتی تھی۔ خیالات اور عادات میں ہم دونوں بہت ہی مختلف تھے۔ لہٰذا ہم لوگوں کے درمیان اکثر مباحثہ و مناظرہ ہوا کرتا تھا۔

شاہد کا دل ایک شاعر کے دل کی طرح نازک تھا۔ مگر وہ رسمی شاعر نہ تھا، وہ حد درجہ جذباتی تھا، لیکن جذبات پرست نہ تھا۔ اُسے اپنے جذبات پر اقتدار حاصل تھا اور یہ اقتدار رفتہ رفتہ پیدا ہوا تھا، مجھے حیرت ہوتی تھی کہ لڑکپن میں بات بات پر رونے والا شاہد کس طرح ایک زبردست قوتِ ارادی کا مالک ہو گیا ہے، پھر بھی اُس کے دل کی رقّت علیٰ حالہٖ قائم تھی۔ وہ جذبات کی آگ میں جلتا رہتا تھا، مگر اظہارِ جذبات میں وہ پہاڑ پر آہستہ آہستہ گرنے والی برف کے گالوں کی طرح تھا، شاہد نے بی اے میں معاشیات اور تاریخ کا مضمون لے رکھا تھا اور اس کا زیادہ وقت مطالعے میں صرف ہوتا تھا۔

یوں تو میں بھی پڑھنے لکھنے میں ہیٹا نہ تھا، مگر میں کتابوں کو لحاف کی طرح اوڑھے نہیں رہتا تھا۔ کھیل کود اور صحبتِ احباب کا مجھے کافی شوق تھا۔ نازک احساسات شاید میرے دل میں کبھی نہیں رہے اور میں دل پر جبر کرنے کا بھی عادی نہ تھا۔ میں نے بی اے میں انگریزی اور فارسی ادب لیا تھا۔ کالج میں ہم دونوں کی جولانگاہ بھی جدا جدا تھی۔ شاہد معاشیات اور تواریخ کی سوسائٹیوں کا ممبر تھا، اور میں بزم ادب اور کشتی رانی کے کلب کا۔ البتہ مجلسِ مناظرہ میں ہم دونوں برابر کے شریک تھے۔ وہاں بھی اکثر و بیشتر ہم لوگ ایک دوسرے کی مخالفت ہی میں زبان آوری کے جوہر دکھلاتے تھے، ہوسٹل کی عام صحبتوں میں بھی جب نظریۂ اخلاقیات یا طریقۂ تعلیم و تعلّم کی بحث چھڑتی یا سینما کی جدید فلموں پر رائے زنی ہوتی تو ہم دونوں فریقِ مخالف ہی کی حیثیت سے ان میں حصہ لیتے۔ غرض ہم لوگ ایک دوسرے کے حریف تھے۔

شاہد نے معاشیات میں اعزاز کے ساتھ درجہ اعلیٰ میں اوّل ہو کر بی اے پاس کیا۔ میں نے بھی انگریزی ادب میں اعزاز حاصل کرتے ہوئے معمولی طور سے بی اے کر لیا۔ ایم۔اے میں شاہد معاشیات میں غرق ہو گیا، اور میں انگریزی ادب کی دلفریب وسعتوں میں محوِ گلگشت

رہنے لگا۔ شاہد کی غرقابی ایک غواص کی غرقابی تھی، جس سے وہ دُنیا کے بازار میں فائدہ اٹھاتا ہے۔ ہر چند کہ شاہد کو فوری فائدے کی توقع نہ تھی، پھر بھی اُس نے اپنے مطالعے کی دولت کو دنیا کی اجتماعی فلاح کے لئے عملی طور پر استعمال کیا۔ ام اے میں پہنچکر شاہد کے دائرۂ عمل میں بہت وُسعت پیدا ہو گئی۔ وہ اتحادِ طلبار کی مجلس اور انجمن نوجوانان کا معتمد تھا۔ نیز صوبہ کی اشتراکی انجمن کا نائب معتمد۔

ایک اتوار کو ہوسٹل کے چند طلبار کی معیت میں، میں اور شاہد کامن روم میں مشغولِ تفریح تھے۔ اخبار دیکھتے دیکھتے میں نے کہا " دیکھو شاہد! تمہارے روس میں بھی سرمایہ داری نے آخر غلبہ حاصل کر ہی لیا " بعض طلبا مسکرانے لگے۔ شاہد نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

" اگر ایسا ہو گیا ہے تو مجھے افسوس ہے، بُری صحبت کا آخر کچھ تو اثر ہو، مجلس اقوام میں روس اور کیا سیکھے گا " ـــــ سب لوگ اب متوجہ ہو گئے۔ میں نے کہا ـــ " ناممکن العمل نظریئے ہمیشہ ناکامیاب ہوتے ہیں " شاہد نے زیرِ نظر رسالہ کو بند کرتے ہوئے کہا ـــ " بہت سی باتیں ایک خاص فضا میں ناممکن العمل ہو جاتی ہیں۔ آپ اگر اصولِ صحت و صفائی پر نقطہ بہ نقطہ بھی عمل کیجے اور آپ کے محلے والے بے اصولے ہوں تو آپ اُن کے اعمال کے نتائج سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ ایسی صورت میں ممکن ہے آپ اصولِ صحت و صفائی کو ہی کوسنے لگیں۔ سمجھتے ہو حامد! بیماری کے جراثیم کی طرح ظلم و ستم، گناہ و عصیاں کے بھی جراثیم ہوتے ہیں، طاعون سے محفوظ رہنے کے لئے ساری بستی کو پاک و صاف کرنے کی ضرورت ہے بلکہ ساری دنیا کو۔ اشتراکیت کی کامیابی تکمیل کو اس وقت پہنچے گی جب سارے ممالک اس اصول کی پیروی کریں گے۔ اب رہی اشتراکیت کے عملی پہلو کے متعلق گفتگو، عشرت و ادب میں ڈوبے رہنے والوں کے لئے تو رکوٹر کا پراپگنڈا ہی حرفِ آخر ہے۔ کاش تم اس امر پر غور کرتے کہ وہ نظریہ جو کروڑوں انسانوں کی ناگفتہ بہ حالت کو چند سالوں میں بدل دے، وہ ناممکن العمل نہیں ہو سکتا، حیات آفرین و حیات پرور تبدیلی ایک خالق و قیوم قوت کی دلیل ہے "

شاہد کے لہجے میں ایک مبلغانہ جوش تھا، اسی طرح دیر تک رَد و بدل ہوتی رہی، تب میں نے کہا ـــ " یہ ساری دنیا کو ایک لاٹھی سے ہانکنا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ فرق و تفاوت تو قدرت نے بھی روا رکھا ہے۔

شاہد بولا۔ تم لوگوں نے فطرت اور انسان کے تعلق کو اب تک نہیں سمجھا۔ اصلاحِ نظرت اور فطری رجحانات میں توازن کا قیام مقصدِ انسانیت ہے۔ اخلاقِ فاضلہ کی تاسیس اور مذہب کی بنا دبھی اسی اصول پر ہے۔ جذبات و شہوات کی روک تھام کے آخر کیا معنی ہیں؟ سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لئے بند باندھے جاتے اور نہریں بنائی جاتی ہیں۔ اگر فطرت کے پیدا کردہ فرق و تفاوت سے انسانیت کو نقصان پہنچتا ہے تو ہمیں اس میں ترمیم و تنسیخ کا حق ہے۔ یہی آدم کا مقامِ خلافت ہے، انسانیت فطرت کی غلام نہیں آقا ہے۔ فطرت کے نوامیس، فطرت کے مظاہر و آثار انسانیت کے لئے خام پیداوار ہیں، جن سے اُسے اعلیٰ و ارفع چیزیں تیار کرنا ہیں، جس طرح ایک معمار سنگِ ناکارہ سے محل و قصور کی تعمیر کرتا ہے۔ یہی انسانیت کی الوہیت ہے۔ اور اس ترمیم و تنسیخ، تعمیر و تخلیق کا معیار اجتماعی فلاح و بہبود ہے ــــــــــــ تمہارے اعتراض کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ ممکن ہے وہ پہلو تمہارے پیشِ نظر نہ ہو۔ مگر لوگ اکثر اس سوال کو اٹھاتے ہیں کہ انسانی فطرت ذاتی ملکیت کے تصور سے علیحدہ ہو کر دولت آفرینی کی محرک نہیں ہو سکتی۔ یہ اعتراض بھی غلط ہے۔ اشتراکیت سے قطعِ نظر، موجودہ سماج کے سارے اجتماعی اعمال ذاتی سود و نفع کی تحریص سے بلند تر ہوتے ہیں۔ انسانی فطرت اتنی پست نہیں جس قدر اُسے سُود خوار سرمایہ داروں نے سمجھ رکھا ہے اور دوسروں کو غلط طور پر سمجھانا چاہتے ہیں، اور اگر تم خالص " افادیت " کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھو تو اجتماعی فلاح و ترقی کے معنی انفرادی فوز و کامرانی کے ہیں۔ حامد! پھر اس امر پر بھی غور کرو کہ لوگ جسے " انسانی فطرت " سمجھتے ہیں وہ بعض حالات میں نفسی لحاظ سے محض " حجابِ فطرت " ہوتا ہے۔ انسانی فطرت ماحول، عادات اور توارث کے پردے میں روپوش بھی رہتی ہے "

شاہد نہایت ہی پُرسکون مگر پُراثر انداز میں اپنے خیالات کو واضح کر رہا تھا کہ ایک صاحب " پنگ پانگ " کھیلتے ہوئے بول اُٹھے۔

" شاہد صاحب کچھ بھی ہو اشتراکیت مذہب کے خلاف ہے، روسی دہریئے ہیں۔ سرمایہ داروں کے ساتھ ان لوگوں نے خدا کو بھی ملک بدر کر دیا ہے " میں نے بھی ان صاحب کی پُرزور تائید کی، شاہد ایک اندازِ

تاسف کے ساتھ مسکرایا اور گویا ہوا۔

"افسوس اور تعجب ہے کہ آپ لوگ مسائل کو اُلجھا کیوں دیتے ہیں اشتراکیت ایک خاص معاشیاتی و اقتصادی مسئلہ ہے، آپ اِسے اسی نظریئے سے دیکھئے۔ عمران کے اقتصادی کی ایک خاص نہج سے تنظیم کا نام اشتراکیت ہے۔ اگر یہ تنظیم دوسری تنظیموں سے اعلیٰ و افضل ہو تو اِسے تسلیم کیجئے اور اگر ادنیٰ و اسفل ثابت ہو تو اِسے رد کر دیجئے۔ غالباً مذہب سے آپ کی مراد اسلام ہے، اسلام نے تفصیلی طور پر کوئی اقتصادی پروگرام پیش کرنا پسند نہیں فرمایا۔ اسلام نے بعض اصول پیش کئے ہیں، اور وہ میرے علم میں اشتراکیت سے نہیں ٹکراتے۔ مختصراً اشتراکیت کے معنی دنیا کے "دولت آفرین ذرائع" پر اجتماعی قبضہ کے ہیں۔ ایسی چیزیں جو دولت پیدا کرتی ہیں وہ انسانیت کی ملکیت ہیں۔ جب تک دنیا ایک ریاست نہیں بن جاتی یا ایک وفاقِ عالم جنم نہیں لیتا۔ اُس وقت تک عملِ اشتراکیت کو ملک ملک کے اندر محدود کر لیجے۔ ہاں تو وہ اشیاء جو دولت آفرین نہیں انفرادی ملکیت بن سکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ کھیتوں، کارخانوں، اداروں، کانوں، دریاؤں، پہاڑوں وغیرہ پر انفرادی قبضہ نہیں ہوتا بلکہ یہ ساری چیزیں ریاست کی ملکیت میں داخل ہوتی ہیں، گو یا ہر فرد انکا مساوی طور پر مالک ہے، اشتراکی ریاست میں ہر فرد کو محنت و عمل کی آزادی ہے۔ مگر اُس حد تک کہ اس کی محنت و عمل سے جماعت کا اور اُس فرد کا نقصان نہ ہو۔ انفرادی فائدہ کے لئے کوئی فرد اپنی صحت کو خراب نہیں کر سکتا۔ اپنی کمائی ہوئی دولت سے ایک فرد ذرائع دولت آفرینی پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ ہاں وہ اپنی پسند اور ضرورت کی چیزیں خرید سکتا ہے۔ مثلاً گھڑی۔ موٹر، گائے وغیرہ مگر موٹر آپ کرایہ پر نہیں چلا سکتے۔ اور گائے کا دودھ بھی فروخت کرنے کی اجازت نہیں کہ اس سے ریاست کی تجارت یعنی اجتماعی تجارت کو نقصان پہنچتا ہے۔ جہاں تک چھوٹی تجارتوں اور زراعت کا تعلق ہے، روس میں بھی ابھی تک اشتراکیت کامل طور پر جلوہ گر نہیں ہوئی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ روس کو ابھی کافی وقت نہیں ملا ہے اور اس کی راہ میں بین الاقوامی موانع بھی حائل ہیں۔" ٹھیک اسی وقت ایک اور صاحب "پریم نگر میں بناؤنگی گھر میں"...... گاتے ہوئے کامن روم میں داخل ہوئے۔ کچھ دیر ٹھیرے اور فضا کی ثقالت کو محسوس کر کے ایک تازہ گولڈ فلیک سلگاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ شاہد کا لوگ احترام کرتے تھے لہٰذا درمیانِ گفتگو کوئی اُسے ٹوکتا کم تھا، اس نے تھوڑے سے توقف کے بعد سلسلۂ کلام جاری کیا ـــــــ

"معلوم نہیں آپ اشتراکیت کو مذہب کے خلاف کیوں سمجھتے ہیں، شاید آپ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انفرادی ملکیت کو اس نظامِ معیشت نے سرے سے منسوخ کر دیا ہے، سو یہ واقعہ نہیں، انفرادی ملکیت صرف اُن اشیاء کے لئے ممنوع ہے جو "دولت آفرین" ہیں۔ آپ انفرادی ملک کی چیزوں کو شوق سے اسلامی قانونِ وراثت کے لحاظ سے بانٹیے۔ اسلام نے وراثت کے لئے کھیتوں، کارخانوں وغیرہ کی شرط تو کی نہیں، جو بھی ترکہ ہو اُس پر قانونِ وراثت کا عمل ہو گا، اور میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ اگر اشتمالیت کا دور دورہ ہو تو بھی اسلام کے اصل الاصول کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔ اسلام کی روح اجتماعیت ہے، قانونِ زکوٰۃ، سود کی مخالفت اور خود قانونِ وراثت اس امر کا ثبوت ہیں، دورِ اشتمالیت میں جب ترکہ ہی نہ ہو گا تو پھر قانونِ وراثت کا نفاذ ہو گا، جیسے آج بھی جس کے پاس پس انداز سرمایہ نہ ہو، اس پر زکوٰۃ کا قانون عاید نہیں ہوتا، یا جس طرح غلامی کے مٹ جانے کے بعد غلاموں کے متعلق احکام ضروری نہیں رہے۔ یہ قوانین ارکانِ دین تو ہیں نہیں۔ سمجھے آپ؟۔ اکثر سرمایہ دار ملکوں میں بھی ریل، ڈاکخانے وغیرہ وغیرہ، ریاست کی ملک ہیں۔ اس اجتماعی ملکیت پر آپ لوگ کیوں مداخلت فی الدین کا فتویٰ صادر نہیں فرماتے؟"

پنگ پانگ کا کھیل تو ختم کر ہی دیا گیا تھا، معترض صاحب میرے ساتھ ہو کر پوری طور سے بحث میں دلچسپی لے رہے تھے، کہنے لگے "یہ طول فضول گفتگو تو رہنے دیجئے، آپ کی اشتراکیت ہی نے تو روس کو خدا دشمن بنا ڈالا ہے، اندھیر ہے، صاحب اندھیر ہے۔ مذہب کا نام لینا وہاں جرم ہے، خدا کی پناہ!"

شاہد نے جواب دیا ـــــ "عجیب بات ہے صاحب! آپ یورپ کی بے حیائی اور عیاشی کا ذمہ دار نظامِ سرمایہ داری کو کیوں قرار نہیں دیتے؟ اشتراکیت کیوں روس کی بے دینی کی ذمہ دار ہو؟ بھائی صاحب! بات یہ ہے کہ روس میں جیسا مذہب رائج تھا اُسے مٹنا ہی چاہیے تھا۔ ارتقائے حیات کا ایک جلوہ انقلاب بھی ہے، اور جب انقلاب آتا ہے

تو بہت سی عزوری چیزیں بھی اس سیلاب میں تباہ ہو جاتی ہیں، روس کی خدا سے بیزاری اشتراکیت کا نتیجہ نہیں انقلاب کا حاصل ہے، روس کے مذہبی ٹھیکہ واروں نے خدا کو زار کی ایک تصویر کلاں کی شکل میں پیش کیا تھا۔ لہٰذا انقلاب کی شعلہ سامانیوں نے جب زار اور زاریت کو خاکستر کر ڈالا تو خدا پر بھی آنچ آ گئی۔ پادریوں کا خدا اب وہاں حکومت نہیں کرے گا بلکہ انسانیت کا خدا رب العالمین اپنے جمال و جلال کا تخت وہاں بچھائے گا؟ شاہد کی گفتگو میں ایک اثر تھا۔ مگر میں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ معترض صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔۔۔ "چلو محمود کرکٹ کھیلنے! شاہد کو خوش اعتقادی کی جنت میں رہنے دو!" ہم دونوں کمرے سے باہر نکل آئے اور دوسرے طلبا نے بھی ہماری پیروی کی۔ شاہد پھر رسالہ کے مطالعہ میں مشغول ہو گیا ہو گا۔

شاہد روز بروز اپنے مشاغل میں سرگرم ہوتا جا رہا تھا۔ کالج کے ارباب اختیار نے والد صاحب کو اس کی اطلاع بھیج دی۔ وہ شاہد سے سخت برہم ہوئے اتفاق سے اُن دنوں اُن کا پٹنہ ہی میں تبادلہ ہو گیا تھا، انہوں نے ہم لوگوں کو ہوسٹل سے ہٹوا لیا۔ ہم لوگ اُن کے ساتھ رہنے لگے۔ مگر شاہد کو جائے قیام کی تبدیلی نے ذرہ برابر بھی نہیں بدلا۔ ان دنوں وہ انجمن کارکنانِ مطبع کی تنظیم میں مشغول تھا اور میں نوکری کی تلاش میں راہ ناپتا پھرتا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ایک روز میں ڈی۔پی۔آئی صاحب سے ملنے گیا تھا۔ واپسی میں ایک رکشا کرایہ کر کے میں نے گھر کی راہ لی، میرا رکشا والا بہت ہی آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ مجھے کوفت ہو رہی تھی۔ مئی کی دوپہر میں سوٹ اور ٹائی میں بندھے رہنا خاصی مصیبت ہے، میں رکشا والے کو راستہ بھر ہانکتا رہا مگر وہ کمبخت تیز چلنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا، اُس کے نحیف و عریاں جسم سے پسینہ ٹپاٹپ گر رہا تھا اور وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ الکترے کی پختہ سڑک توے کی طرح جل رہی تھی اور گرم ہوا کے تیز جھونکے رُخ پر طمانچے مار رہے تھے۔ میں رکشا میں بیٹھا ہوا پُھنکا جا رہا تھا۔ مگر کرتا تو کیا کرتا۔ میں نے رکشا والے کو دو چار سخت سُست جملے سُنائے۔ مگر وہ تو کچھوے کی چال چلنے پر مصر تھا، کشاں کشاں میں اپنے مکان پہنچا۔ مکان کے برآمدے پر شاہد کہیں جانے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ میں رکشا سے اترا، پرس جیب سے نکال رکشا والے کو پیسے دینے لگا۔ وہ غریب مجھے اُتار کر رکشا کے سائے میں بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا، ناتواں گردن جھکی جا رہی تھی، دھنسی ہوئی کمزور آنکھیں نقاہت سے بھیانک ہو رہی تھیں اور ایک خفیف سا رعشہ سارے جسم پر طاری تھا۔

میں نے دریافت کیا۔۔۔ "کیوں جی رکشا والے، بیمار ہو گیا؟ بیمار ہو تو کام کیوں کئے جاتے ہو؟" پیسے میں نے اُس کے سامنے پھینک دیئے۔ وہ جواب دینے سے قاصر تھا۔ میں سر برآمدہ سے وسط میں چلا آیا اور شاہد کے پاس بیٹھ گیا۔ شاہد خاموش بیٹھا حالات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"کہاں جانے کی تیاری ہے شاہد؟" شاہد خاموش تھا۔ میں اپنی ٹائی ڈھیلی کر رہا تھا۔ ٹائی کھول کر میں نے کوٹ اُتار کرسی کی پُشت پر ٹانگ دیا۔ رکشا والا ابتک اسی حالت میں تھا۔ مجھے اُس کے حال پر ترس آ رہا تھا۔ میں نے پھر پوچھا "کیوں جی رکشا والے تم بیمار ہو؟" رکشا والے نے مضمحل انداز میں سر اُٹھایا اور بولا۔۔۔۔۔

"جی ہاں حجور" وہ دام لینے کے لئے رکا اور پھر بولا "حجور مجھے مونیہ ہو گیا تھا، پرسوں سے بوکھار اترا ہے۔ کل پتھ پایا۔۔۔" اس کا دم پھولنے لگا "حجور مالک کا رکسا ہے۔ دس دن سے مالک کو روجینہ نہیں ملا ہے۔ دو تین روج سے اُن کا آدمی تکاجا کر رہا تھا۔۔۔۔" رکشا والا رُک رُک کر بول رہا تھا "سرکار! مالک دوسرے کو رکسا ٹھیکہ دینے کو کہتے تھے۔۔۔۔۔ حجور بیماری میں کرج دام بھی ہو گیا ہے۔ تین روج سے گھر میں کھرچی نہیں۔ بال بچے۔۔۔۔۔ سب بھوکے ہیں۔ بنیا اُدھار بھی نہیں دیتے ہے حجور" مجھے اِس کے حالِ زار پر بہت رحم آ رہا تھا میں نے پرس سے دو چونیاں نکال کر رکشا والے کو دیں۔ وہ بیحد مسرور ہوا۔ دو آنہ تو اُس کو مزدوری مل ہی چکی تھی۔ اُس کے لب سے شکریے الفاظ بھی نہیں نکل سکے۔ صرف نگاہوں میں جذباتِ تشکر رقص کر رہے تھے۔ میرے دل میں افتخار و مسرت کی کیفیتیں مچل رہی تھیں۔ شاہد ایک اندوہگین مسکراہٹ کے ساتھ سارے ماجرے کو دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا "یہ پندار و خودی ہے حامد نیکی نہیں" مجھے ایسا محسوس ہوا کہ شاہد نے میری دکھتی ہوئی رگ پکڑ لی۔ میں شرمسار ہو رہا تھا، مجھ سے کوئی جواب بن نہ آیا۔ شاہد نے سلسلۂ کلام

جاری رکھتے ہوئے کہا ـــ " چرائی ہوئی نیکی اور دزدیدہ مسرت! کاش لوگ کو مجموعی طور پر دیکھ لیتے! حامد! تمہاری نیکی میں بالیدگی نہیں، زندگی نہیں - بے روح نیکیاں ان دنوں عام ہیں - ایک خلاکت زدہ رکشا والا سماج کے مظلوموں کا نمائندہ تھا، کیا تم آٹھ آنے بخش کر سارے دکھی لوگوں کو ظلم سے بچا سکے؟ نہیں! بلکہ اُس ایک فرد کی زندگی بھی سنوارنے سے تم قاصر رہے۔ تم نے اپنے غرور و پندار میں اضافہ کر لیا اور اُس غریب مزدور کی عزتِ نفس پر تیر چلایا - تمہاری نیکی اُس مارواڑی کی نیکی کی طرح ہے جو ہزاروں انسان کے خون چوس لینے کے بعد کسی اتوار کو خیرات بانٹ کر نیکی خریدتا ہے یا اُس نمازی کی نیکی کی مانند ہے جو عیدین کی نمازیں پڑھ کر سال بھر کی نمازوں سے غافل ہو جاتا ہے - حامد! انفرادی نیکیوں کا بھی مقام ہے، مگر ترکِ فرائض کے بعد نوافل کا اہتمام مضحکہ خیز بات ہے"

شاہد کا حرف حرف اثر بن کر میرے دل میں اترا جا رہا تھا، شاہد اُٹھا اور چلا گیا - رکشا والا ہمارے مکان کے سامنے سڑک پر ایک سایہ دار درخت کے نیچے اپنے اور میرے مستقبل سے بے خبر رکشا کے جوا سے تکیہ لگائے سو رہا تھا - گرم لُو کے تیز جھونکے چل رہے تھے - فضا میں بگولے رقص کناں تھے -

بس اِسی معمولی واقعہ نے میری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا - اس کے بعد میں شاہد کا ہم خیال تھا اور شریک کار -

غزلِ مسلسل

فصلِ گل و نسیمِ بہاراں نہ پوچھئے ۔۔۔ ابرِ سیاہ و زلفِ پریشاں، نہ پوچھئے

جوشِ شباب و بادۂ و محبوبِ حور وش ۔۔۔ سب ہیں شکستِ توبہ کے ساماں، نہ پوچھئے

اک اک نگاہِ مست ہے محشر طراز - اُف! ۔۔۔ رودادِ زہد و دانشِ حیراں، نہ پوچھئے

پیچھے ہی رہ گئی ہیں جنوں کی حدیں تمام ۔۔۔ طغیانِ ذوق و شوقِ فراواں، نہ پوچھئے

یہ سر ہو اور اُس بُتِ کافر کا آستاں ۔۔۔ شوقِ نیاز مند کے ارماں، نہ پوچھئے

میں ذرہ اور ذرہ نوازیٔ آفتاب ۔۔۔ تابندگیٔ قسمتِ نازاں، نہ پوچھئے

اُس مہ جبیں کے عشق میں ہوش و خرد سے آج ۔۔۔ کیونکر جنوں ہے دست و گریباں، نہ پوچھئے

اب حالتِ خرابِ محبت نہ دیکھئے ۔۔۔ ذکرِ وفائے قلبِ پریشاں، نہ پوچھئے

سُن لیجئے فسانۂ بے چارگیٔ عشق! ۔۔۔ لیکن مآلِ حُسنِ پشیماں، نہ پوچھئے

اک کافرِ حسیں کا پجاری ہے آج کل
اب مسلکِ خلیقِ مسلماں نہ پوچھئے

خلیق قریشی - لائلپور

نیکدل سرمایہ دار[1]

احسان دانش

(یہ نظم ایک خاص واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے، جو جناب حفیظ ہوشیارپوری نے مجھے سنایا۔)

اک دن کہ دوپہر کی جوانی تھی کامیاب　　آتش فشانیوں میں تھا مصروف آفتاب
تھی بام و در پہ رُوحِ جہنم فسانہ خواں　　جھنجھلائی سی زمین، بھڑکتا سا آسماں

ایسے میں اک مریضِ ادب خستہ و زبوں
لیکر عقیدتوں کا اُبھارا ہوا جنوں

ہر سانس میں خلوص کی خوشبو لئے ہوئے　　دل میں خیالِ خدمتِ اُردو لئے ہوئے
سودا رُسوخ کا نہ جنونِ مصاحبت　　سرسام منتوں کا نہ خبطِ ملازمت
خواہش نہ قرض کی، نہ سفارش کی آرزو　　شہرت کی اور نہ دادِ نگارش کی آرزو

ملنے کو اک محافظِ اُردو کے گھر گیا
روکا ہزار ذوقِ خودی نے، مگر گیا

نیکی کا جس کی سارے زمانے میں شور ہے　　ہاتھوں میں ہی نہیں ہے، قلم میں بھی زور ہے
ہے جس کے رنگِ رُخ کا زر و سیم پر مدار　　قرنوں سے کامگار ہے، پشتوں سے مالدار

لیکن بغیر پوچھے اس آنے کا کیا سبب؟
اس دھوپ میں عذاب اُٹھانے کا کیا سبب!

باصد غرورِ جاہ و باندازِ پیچ و تاب　　دولت کی بیخودی نے یہ پڑھکر دیا جواب

آرام کا یہ وقت ہے اسوقت جائیے
گر ہو سکے تو شام کو تشریف لائیے

ارماں بھری نگاہ کو چکر سا آگیا　　دنیائے آرزو پہ اندھیرا سا چھا گیا
رنگیں بیانیوں کے قدم رُک کے رہ گئے　　خودداریوں کے سبز علم جھک کے رہ گئے

ثابت ہوا کہ فطرتِ زر میں غرور ہے
شہرت کا طمطراق حقیقت سے دُور ہے

احسان دانش

[1] یہ حضرت احسان کی سیدھی سادی سی نظم جو معنوی و لفظی حیثیت سے اُن کی دوسرے لفظوں کے مقابلے کی نہیں ہے، اس لئے درج کی جاتی ہے کہ اس سے زردار مدعیانِ ادب کے اخلاق پر روشنی پڑتی ہے۔ سچ ہے ادیب ہونے کے باوصف زردار، زر پرداز ہی رہتا ہے۔ (مُدیر)

ماں کا خط

جی۔ آر۔ قیس، شیخوپوروی

ہر چند اس خط میں خط کی شان مفقود ہے، اور یہ خط کے پردے میں ایک مضمون ہے۔ لیکن چونکہ اس سے ہندوستان کے افلاس پر روشنی پڑتی ہے اس لئے اسے شائع کیا جا رہا ہے۔ — مدیر

میری زندگی کی روشنی ——— !

بیٹا اشوک! اب میں بڑھی ہو گئی۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ زندگی کی کتنی راتیں میرے لئے باقی ہوں گی۔ میں کتنے دن اور جیوں گی نہیں کہہ سکتی۔ اس دنیا میں میرا بسیرا اور چند روز سے زیادہ نہیں۔ نہ معلوم کب ——— ؟ میری کشتیٔ حیات منجدھار میں آکر ڈوب جائے۔ مرنے سے پہلے چاہتی ہوں کہ تمہیں سکھ اور شانتی کی زندگی گزارتے دیکھوں۔ تم نہیں سمجھ سکتے کہ ماں کے پریم بھرے دل میں کتنے جذبات۔ کتنی آندھی اور کتنا طوفان اُٹھتا رہتا ہے۔ بیٹا ——— ! ماں کا دل پریم کا اتھاہ ساگر ہوا کرتا ہے۔

جب سارا سنسار سو جاتا ہے، حتیٰ کہ رات کی خوفناک تاریکی میں سمندر کی لہریں بھی خاموش ہو جاتی ہیں تو میرے دل کی گہرائیوں میں صرف تمہارا ہی خیال ہوتا ہے۔ گو تم میری نظر سے دور ہو۔ لیکن میں اپنے دل کے قریب پاتی ہوں۔ پردیس میں نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے پھرتے ہو گے۔ تمام دن چکر کے بعد رات کو کہاں اور کدھر سوتے ہو۔ بی اے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ لیکن نوکری کے لئے جان دینی پڑتی ہے۔ تمہیں اب تک کوئی نوکری ملی یا نہیں۔ بہت دنوں سے تمہارا کوئی خط نہیں ملا جس سے دل میں دھڑکن اور بے چینی رہتی ہے۔ آج دو روز سے آنکھیں پھڑک رہی ہیں جس سے طرح طرح کی بدشگونی ہو رہی ہے۔ بھگوان کُبلا کرے۔ رات کو پنجرے میں مینا ڈر کے پھڑپھڑانے لگی، اور پھر درد ناک آوازیں ایسی بولی، جیسے وہ زخمی ہو گئی۔ یا ڈر گئی ہے! مارے ڈر کے درختوں سے اور پرندے بھی خوفزدہ ہو کر اُڑ گئے۔ میں رات بھر جاگتی رہی، پلک بھی نہیں مار سکی۔

ہر اتوار سے ڈاکیہ اُسی طرح ڈاک کا تھیلہ لئے گاؤں میں پہونچتا ہے۔ ڈاکیہ کو دیکھکر شاما دوڑی جاتی ہے اور اپنی توتلی زبان سے بولتی ہے "کہ میلے بیا کا خط دو۔" ڈاکیہ کو میری بے چینی، اضطراب اور پریشانی کا حال کیا معلوم ——— ؟ آج بھی تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔ شاما اور بھی اُداس ہو گئی۔ اُس کو تمہارے خط سے شانتی ملتی ہے۔ اور میرے دل کو بھی۔ تم بڑے کابل ہو۔ نہ ماں کا خیال ہے نہ شاما کا۔ شاما کہتی ہے کہ "اب بیا سے کبھی نہ بولوں گی" "وہ ہم کو یاد نہیں کرتے" لو تمہاری شاما تم سے رُوٹھ گئی۔

آج دس روز سے بیمار پڑی ہوں۔ بخار ہے، اور حرارت سے بدن پھنک رہا ہے۔ کچھ بیماری، کچھ تنگدستی اور کچھ مجبوری نے حالت خراب کر دی ہے۔ چلنے پھرنے سے مجبور ہو گئی ہوں۔ ایک قدم چلنے کی سکت نہیں، دوسرے، درد و غم، رنج و الم، مفلسی و مایوسی نے اور بُرا حال کر دیا ہے، بھوک سے مر رہی ہوں۔ گھر میں نہ اناج ہے، نہ پیسہ، مشکل سے ایک وقت روٹی میسر ہو جاتی ہے، اور دوسرے وقت پیٹ پر پتھر باندھ کر سو رہتی ہوں۔ بھوک سے تڑپتی ہوئی شاما اور بلکتے ہوئے بچوں کو دیکھا نہیں جاتا۔ مصائب اور تکلیفات

سے بھری ہوئی زندگی کو صبر اور حوصلے سے بسر کرنا صرف غریبوں کا کام ہے، اور رومان صرف امیروں کے لئے مخصوص ہے۔ غریبوں کے لئے نہیں۔ قدرت نے بھی امیروں کو راج رچنے کے لئے، اور غریبوں کو دُکھ سہنے کے لئے پیدا کیا ہے۔

میں اپنی غمناک کہانی کہاں تک لکھوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری آنکھوں سے اشکوں کا چشمہ پھوٹ نکلے۔ تمہیں غمزدہ دیکھکر بڑا دُکھ ہوتا ہے۔ ساون کا مہینہ بھی آگیا۔ گھر گرا جا رہا ہے۔ جہاں چھپر بے مرمت ہونے کی وجہ سے بیٹھا جا رہا ہے۔ آج سات دن، اور سات راتیں گزر گئیں ہیں۔ لیکن پانی کا زور کسی طرح نہیں رُکتا۔ چھاجوں پانی برس رہا ہے۔ ایسی جھڑی لگی ہے جو کسی وقت نہیں تھمتی ہے۔ سرد اور طوفانی رات ہے۔ جب بادل زور سے گرجتا ہے، تو ساری بستی کانپ کر جاگ اُٹھتی ہے۔ بادل کی کڑک، بجلی کی چمک، اور ہوا کے زور و شور سے دل دہل جاتا ہے۔ آس پاس کے مکانات تاریک اور ڈراؤنے معلوم ہوتے ہیں، اور رات بھی موت سے زیادہ بھیانک معلوم ہو رہی ہے۔ امیروں اور دولت مندوں کی امیری قائم ہے۔ وہ آنند کے ساتھ رات بھر سوتے ہیں۔ اُن کی نیند سُکھ کی نیند ہوتی ہے۔ غریبوں کے دُکھ کو وہ کیا جانیں۔ ہم غریبوں کے لئے خوشنما اور عالی شان مکانوں کی جگہ نہایت پست کوتاہ کچی مٹی کا جھونپڑا ہوتا ہے۔ جن پر گھانس، پھونس کے چھپر پڑے ہوتے ہیں، اور قید خانے کی کوٹھریوں سے بدتر ہوتا ہے۔ پھر بھی بھگوان کو منظور نہیں تھا۔ اور ستم ڈھانا تھا۔ گھر نہیں بچ سکا۔ گاؤں کا شاید ہی کوئی ایسا کچا گھر ہوگا جو بچا ہوگا۔ اپنا گھر بھی اسی آندھی پانی میں بیٹھ گیا۔ صرف ایک کونہ رہ گیا ہے۔ جس کے سہارے پناہ گزیں ہوں۔ افلاس کی زندگی گزار رہی ہوں۔ پیسہ پیسہ کے لئے محتاج، اور دانہ دانہ کے لئے ترس گئی ہوں۔ ناداری سے مجبور ہوں۔ پیسہ نہیں جو مکان کی مرمت کراؤں۔ پھر قرض کس سے مانگوں، اور قرض کون دیتا ہے۔ امیروں کو قرض آسانی سے مل جاتا ہے امیر مقروض بھی ہزاروں لاکھوں ہی کے ہوتے ہیں۔ غریب کو کوئی ایک پیسہ بھی مشکل سے دینے والا نہیں۔ اب تم ہی کہو کہ اِس مفلسی اور بیچارگی میں کس کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں، اور نہ اب اتنی سکت ہے کہ زندگی بسر کرنے کے لئے محنت

مزدوری کرسکوں، اور نہ ہاتھ پیر میں اتنی قوت ہے جو دن رات ایک کرکے چکی پیسوں۔ وہ زمانہ اور تھا بیٹیا ـــــــ! جب صبح ہونے سے پہلے محنت کی دیوی پر اپنی خوشگوار نیند بھینٹ چڑھا دیتی تھی۔ اور چکی لیکر پیسنے بیٹھ جاتی تھی۔ صبح سے شام تک محنت مزدوری کرنے کے بعد گھر کا خرچ نکل جایا کرتا تھا۔ لیکن اب خون پانی کرنے کے بعد روٹی نہیں ملتی۔ جب سے یہ لوہے کی مشین گاؤں میں آئی ہے۔ کسی گھر سے چکی پیسنے کی آواز نہیں آتی۔ نہیں تو گھر گھر چکی چلتی تھی۔ اس لوہے کی مشین نے یتیموں اور بیواؤں کے سہارے کو اور بھی توڑ دیا۔ گاؤں کے بڑے بابو اور بھیا خوشی کے ساتھ مشین ہی میں آٹا پسوانے لگے۔ غریب ہمیشہ دولت مندوں اور امیروں سے رحم و کرم کی توقع رکھتے ہیں۔ لیکن اُن کی نظر غریبوں پر نہیں ہوتی ہے۔ گاؤں کی لوکھیایاں مزدوری کے لئے مرتی ہیں۔ مگر اُن کی مزدوری چھین کر ایسے کو دی جاتی ہے جو کسی طرح مستحق نہیں۔ سنتے ہیں کہ منوں آٹا آدھ گھنٹہ کے اندر پسوالو، اور مزدوری بھی بہت کم ہے۔ اب اس سنسار میں ہم ایسے غریبوں کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ عزت آبرو بچانا مشکل ہوگیا ہے۔ غریب رُوکھی سوکھی روٹی کھا کر بھگوان کا شکر بجا لاتے ہیں اور اپنی غریبی کو قسمت کا نتیجہ قرار دے کر چپ ہو رہتے ہیں۔ اور دولت مندوں کی عشرت آرائیاں غریبوں، محتاجوں، یتیموں اور بیواؤں کی پاک مسرتوں کا خون اور محنت ہے۔ غریبوں میں اپنی حالت کا احساس نہیں ہوتا ہے صرف اس لئے کہ غریب ہیں، نادار ہیں، اور محتاج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِن کی آن بان اور ٹھاٹھ قائم ہے۔ ورنہ آج اگر ذرا بھی دل میں احساس ہو جائے تو اِن کی عشرت آرائیوں کا چراغ کبھی نہ جلنے پائے۔

بیٹیا ـــــــ! اِن آفتوں کے بعد دوسری مصیبت اپنی بھیانک اور مکروہ شکل میں نظر آرہی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ رادھا بچپن کی خوشگوار منزلوں سے گزر کر اب شاہراہِ جوانی پر قدم دھر چکی ہے۔ جوانی کا احساس اب اُس پر بُری طرح غلبہ پاچکا ہے۔ دیکھتی ہوں کہ اُس کی جوانی مٹی میں ملی جارہی ہے۔ ساتھ کی کھیلی لڑکیوں میں اب کوئی کنواری نہیں۔ جوان لڑکی کو کب تک گھر میں بٹھائے رکھوں۔ ہر وقت گہرے سوچ میں پڑی رہتی ہوں، اور جس قدر سوچتی ہوں گہری اُلجھنوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک ایک دن میرے لئے ایک ایک برس ہو رہا ہے۔ دنیا کی کسی چیز میں میرے لئے سکھ نہیں۔ جب سب لوگ آرام کرتے ہیں میں اکیلی جاگ کر ساری رات گزار دیتی ہوں کہ رادھا میری حیات

کی آخری خوشی ہے، اس کا بیاہ ہو جاتا، میری آتما کو شانتی ملتی۔ لیکن بیاہ کہاں سے کروں، جس کو ایک وقت کھانے کا ٹھکانہ نہیں جس کو رہنے کی جھونپڑی نہیں وہ نقد ہزار، پانچسو کی رقم کہاں سے لائے۔ زمانہ کی ترقی کے ساتھ رواج ہوگیا ہے کہ لڑکی والے جب تک لڑکے کو کم ازکم ہزار ——— پانسو نہ دیں۔ شادی کرنا پاپ سمجھتے ہیں۔ پڑھے لکھے نوجوانوں کو دیکھتی ہوں کہ وہ ولایت جانے کا خرچ مانگتے ہیں۔ موٹر چاہتے ہیں، اور بہت کچھ فرمائشیں ہوتی ہیں۔ ہائے پہلے کے لوگ کیسے سیدھے سادے ہوتے تھے۔ پہلے روپیہ اور سونے چاندی کے زیورات شادی کے موقعہ پر مرد کی جانب سے عورت کو دئے جاتے تھے۔ مگر ہائے زمانہ کتنا پلٹ گیا۔ وہ کارخانہ ہی بدل گیا ہے کہ اب عورت ہی کی طرف سے مرد کو سونے چاندی دئے جاتے ہیں۔ غریب لڑکی والے مارے جاتے ہیں۔ وہ چکی کی طرح پسے جاتے ہیں۔ اور امیر اپنی شادیوں میں دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ ہزار، دو ہزار کی آتش بازی پھونک ڈالتے ہیں۔ دان جہیز حوصلے کے مطابق دیتے ہیں۔ تمام ارمان دل کھول کر نکالتے ہیں۔ برات کے ساتھ ڈھول باجہ ہوتا ہے۔ عیش ونشاط کی محفلیں آراستہ کرتے ہیں۔ غیر ضروری اور بُرے رسموں میں بڑی بے دردی کے ساتھ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ امیر اپنی دلچسپی اور عیش و آرام کے سامان میں کمی کرنا گوارا تک نہیں کرتے ہیں۔ غریب خون بہانے کے لئے اور سرمایہ دار جونک کی طرح خون چوسنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اُن کی آنکھیں یہ بھی نہیں دیکھتیں کہ پڑوس میں کتنی بدنصیب عورتیں ایسی ہیں جن کا کوئی سہارا نہیں۔ جن کے سہاگ کے دن برباد ہو رہے ہیں۔ دکھیاری ماں رو رہی ہے۔ ایک طرف گھر میں جوان لڑکی بیٹھی سڑ رہی ہے، اور دوسری طرف یتیم بچے سڑکوں پر بھوک سے بلبلاتے مارے پھر رہے ہیں۔ بچوں کی بُری حالت اور گھر کی تباہی دیکھ کر، باپ جرم کی طرف قدم اُٹھانے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اور وہاں ایک عصمت فروش عورت کی طرح گھر کی چہار دیواری سے باہر نکل پڑتی ہے، بیٹا ——— ! انسان سب کچھ کرسکتا ہے، مگر بھوک کی آگ برداشت نہیں کرسکتا۔

بیٹا ——— ! اِس احساس کے بعد ——— جب مستقبل کا بھیانک خواب دیکھتی ہوں، تو کانپنے لگتی ہوں، اور جب اُس کی گہرائیوں پر نظر ڈالتی ہوں تو اس تاریک پردے میں کسی طرف سے مدہم روشنی بھی دکھائی نہیں دیتی ہے۔ چاروں طرف گھُپ اندھیرا معلوم ہوتا ہے اس لئے گھر کی تباہی اور بدبختی سے بچنے کے لئے میرے جیتے جی رادھا کے ہاتھ، برہمن کے ہاتھ نہ سہی، اچھوت کے ساتھ بیاہ کر دو۔ تم اس بچار پر مجھ سے نفرت کرو گے۔ لیکن اونچ ذات کا برہمن، اور نیچ ذات کا بھنگی سبھی ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اگر آج نہیں تو کل، آخر ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ میں اُس کو ذلت اور رُسوائی سے اچھا سمجھتی ہوں۔ بہت سی لڑکیاں بے آسرا ہو کر اِدھر اُدھر بھٹک گئیں۔ اس لئے قسمت کہیں ایسے غار کی طرف لے نہ جائے۔ جو تباہی کی آخری حد ہوتی ہے، سماج اور سماج کا بنایا ہوا قانون اندھا ہے۔ سماج کو چھوڑ دو۔ سماج کو بکنے دو۔ وہ بڑ بڑا کر خود ہی چپ ہو جائیں گے۔ ظلم و تشدد کرنے والے رہزنوں کی مجلس کا نام سماج ہے، اور تم اُس کی پوجا کرنا چاہتے ہو۔

زمانے کی بے وفا رفتار کو دیکھتے ہوئے اصلاح کا بیڑا اٹھاؤ۔ اخلاقی جرأت پیدا کرو۔ چھوت چھات کے بُت کو ہمیشہ کے لئے توڑ دو۔ تمہاری مخالفت زیادہ سے زیادہ ہوگی۔ لیکن رفتہ رفتہ تم لوگوں کو اپنا ہمنوا بنالوگے۔ تمہاری آواز آج نہیں، مگر ایک روز اچھی طرح سُنی جائے گی۔ لوگوں دلوں پر اثر کرے گی، اور کیا تعجب ہے کہ اپنی زندگی میں اِس کا خوشگوار نتیجہ دیکھ لو۔ یا اگر نہ دیکھ سکو تو نسلیں تم سے سبق لیں گی۔ آنے والی عورتیں تمہیں انصاف کا دیوتا کہیں گی، اور تم دُنیا کے محسن سمجھے جاؤ گے۔

تخیلات کے تین پھول

سلام مچھلی شہری

۱۔ پریم کی موت

میرے پیارے! میرے مرنے کے بعد میرے ماتم میں حسرت آگیں نغمے نہ گانا۔ میرے سرہانے پھول نہ چڑھانا۔ میری قبر پر کوئی سایہ دار درخت نہ لگانا۔

صرف سبز گھاس شبنمیں قطروں کے ساتھ میری قبر پر اُگے گی۔
کبھی کبھی مجھے یاد کر لینا ——— یا بالکل بھول جانا:
میں سایوں کو نہ دیکھ سکوں گی۔
بارش کو نہ محسوس کر سکوں گی۔
عندلیب کے حسرت آگیں نغمے نہ سن سکوں گی۔
اور طویل خواب نیم شبی میں کبھی کبھی تجھے یاد کیا کروں گی ———
یا شاید بھول جاؤں گی۔

(ترجمہ) (کرسچیانا روزیٹی)

۲۔ نگاہ کا پجاری

عام لڑکیوں کی طرح وہ ظاہری حُسن سے موصوف نہیں۔

جب وہ دیکھکر مجھے مسکرائی تو پہلی بار میں نے اُس کے حُسن کو بے نقاب دیکھا۔ اور پہلی بار میں اس حقیقت سے آگاہ ہوا کہ اُس کی نظر ایک چشمۂ الفت اور ایک جُوئبار نور ہے ——— لیکن اب اُس کی نگاہیں سرد اور فراموش گار ہیں، اور میری پُرشوق نگاہوں کا جواب نہیں دیتیں۔

پھر بھی میں اُس کی نظر میں محبت کی روشنی دیکھتا ہوں، اور اب بھی اُس کی چڑھی ہوئی تیوریاں مجھے دوسری لڑکیوں کے تبسموں سے زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

(ترجمہ) (کولرج)

۳۔ اندھی لڑکی

اندھی لڑکی نے ماں کی اُنگلی چھوڑ دی اور باغ میں ایک جگہ بیٹھ گئی۔ پھر ادھر کان لگا کر اور یہ اطمینان کرکے کہ کوئی سُن تو نہیں رہا ہے اور اپنے ہاتھ دعائیہ انداز میں اُٹھائے اور آسمان کی طرف منھ کرکے کہنے لگی۔

"میرے اللہ میاں! اُمّی جان کہتی ہیں کہ تم نے سورج بنایا ہے جو اپنی روشنی سے ساری دنیا کو روشن کر دیتا ہے، چاند اور سورج بنائے ہیں جو اندھیری راتوں میں دن کی طرح اُجالا کر دیتے ہیں۔

اُمّی جان کہتی ہیں کہ تم نے طرح طرح کے پھول کھلائے ہیں جو اپنے رنگ و بُو سے دیکھنے والوں کی آنکھوں میں طراوت اور دل میں تازگی پیدا کر دیتے ہیں۔

اُمّی جان یہ بھی کہتی ہیں کہ تم نے بڑے بڑے پہاڑ دریا، سمندر اور جنگل بنائے ہیں جن سے تمہاری قدرت ظاہر ہوتی ہے!

میرے اللہ میاں! تم نے جو مجھے اِن چیزوں کے دیکھنے کے لئے آنکھیں نہیں دیں تو میں اُس کی شکایت نہیں کرتی اور ان میں سے کسی چیز کو دیکھنا نہیں چاہتی ——— لیکن میرا دل اتنا ضرور چاہتا ہے کہ کم از کم اپنی اُمّی جان کی صورت تو دیکھ لیتی"!!!

(طبعزاد) (سلام مچھلی شہری)

التماس پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت ہر مہینہ کی دسؔ تاریخ تک بھیجدینی چاہیئے ورنہ بعد میں تعمیل نہیں کی جائے گی۔ (منیجر کلیم)

بیر کا درخت

سعد منیر کانپوری

جاڑے کا موسم تھا۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں اور جوار کی سفید بالیوں سے لدے خمیدہ پودوں کے کھیتوں سے سرسراتی ہوئی گزر رہی تھیں، گذر رہی تھیں اور ایک عجیب اُداس نغمہ پیدا کر رہی تھیں، بوڑھا موہن کھیتوں کی روش پر آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا۔ بڑھا رہا تھا اور کچھ گزری ہوئی باتوں کا خیال کرتا جاتا تھا۔ بیس برس قبل کے واقعات اُس کے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ عہدِ پارینہ کے گزرے ہوئے حالات اِس طرح اُس کے سامنے آ رہے تھے جیسے فلم کے پردۂ سیمیں پر تصویریں گزر رہی ہوں۔ ایک ایک واقعہ اُس کی آنکھوں میں ایسا تازہ تھا۔ گویا وہ ابھی گزرا ہو، آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا وہ داہنی طرف گھوما اور ایک کنویں کے قریب لگے ہوئے بیر کے درخت کو کھڑے ہو کر تکنے لگا۔ ہرے بھرے درخت میں کچے، زرد اور سُرخ بیر ڈالیوں کو جھکائے ہوئے تھے۔ کہیں دور سے قمری کی دلگداز نوحہ خوانی نسیم کے دوش پر آ رہی تھی اور فضا کو غمگین بنا رہی تھی وہ خیال کر رہا تھا، وہ دن بھی اُس کی زندگی کا کتنا سنہرا اور پیارا دن تھا، اُسی دن تو صحیح معنوں میں اُس کی زندگی کا آغاز ہوا تھا، اُس دن کو وہ کبھی نہیں بھول سکتا، وہ تو اُس کے دماغ میں اس طرح آباد ہے جیسے ستاروں کے درمیان روشن چاند۔

یہی سردیوں کا زمانہ تھا اور یہی سہ پہر کا وقت، نیلے آسمان کے سمندر میں آفتاب ایک نُور کی کشتی کی طرح مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ اپنی موسی کے گاؤں جا رہا تھا، کہ گھومتا، سیر کرتا اِدھر آ نکلا، ایک خاص کشش تھی، جو اُسے اس طرف کھینچ لائی تھی ایک ایسی مقناطیسی طاقت جس کے زیرِ اثر اُس کے قدم خود بخود اُٹھتے چلے آئے تھے۔

سندری اسی جگہ بیر کے درخت کے نیچے کھڑی بیر توڑ رہی، وہ کس قدر حسین تھی شباب کے بوجھ سے دبی ہوئی اُس وقت اُس کے رخسار مشقت کی سختی سے کیسے گلنار ہو رہے تھے۔ وہ سندر مکھڑا اب بھی اُس کے دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے۔ اُس کی بکریاں اُسے دیکھکر ریاتی ہوئی بھاگ گئی تھیں، اُن کے بھاگنے سے جو سرسراہٹ پیدا ہوئی تھی وہ ابھی تک اُس کے کانوں میں گونج رہی ہے، وہ اُسے دیکھکر چونک پڑی تھی۔ اور شرما کر نگاہیں نیچی کر لی تھیں، اُس وقت اُس کی یہ ادا عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھی۔

دن گزرتے گئے۔ ان کی ملاقات بڑھتی گئی اور چپکے چپکے محبت میں تبدیل ہوتی گئی۔ وہ نیچ ذات کی ضرور تھی۔ لیکن پریم ذات پات کو تو نہیں دیکھا کرتا۔ اب اُس کا دل اپنے گاؤں میں بالکل نہ لگتا۔ اس لئے زیادہ تر وہ اپنی موسی کے گاؤں میں رہنے لگا، سندری کی ہم نغمہ رفاقت اُسے اپنے اندر جذب کئے رہتی۔ بڑی رات تک وہ اور سندری اسی فردوسِ محبت میں چہل قدمی کیا کرتے۔ بیٹھا کرتے اور میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتے۔ باتیں کیا کرتے اور کبھی نہ اُکتاتے، ایک رات جبکہ چندرما پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان پر براج رہا تھا، زرد جواہر کی طرح آکاش پر تارے بکھرے ہوئے ہوئے تھے جنگلی پھولوں کی باس سے بسے ہوئے ہوا کے جھونکے فضا کو معطر کر رہے تھے، رومان و شعریت کی بارش ہو رہی تھی۔ ان دونوں نے پیمان باندھا محبت

کا لطیف و معصوم بیان، چاندی کی نقرئی کرنوں کے زیر سایہ، ننھے ننھے نازک پھولوں کو گواہ بنا کر۔

جلدی ہی گاؤں والوں کو اُن کے ملنے جلنے کی خبر ہو گئی، اور وہاں سے رفتہ رفتہ اُس کے پتا کے کانوں تک بھی پہونچ گئی، اُس کے پتا اُس کی ہر طرح سے دلدہی کر سکتے تھے، اُس کی ہر بات اور ہر آرزو پوری کر سکتے تھے، لیکن اُس کو ایک نیچ ذات کی لڑکی سے ملتے اور دھرم تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے، اپنی ذات، اپنے خاندان کو دھبہ لگنے کو نہیں برداشت کر سکتے تھے، برادری میں سبک ہونا نہیں چاہتے تھے، جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ سندری سے بیاہ کرنا چاہتا ہے تو بہت ہی برہم ہوئے۔ اول سمجھاتے سمجھاتے رہے، اور دھمکاتے بھی رہے۔ لیکن وہ تو محبت کا مذہب قبول کر چکا تھا۔ پریم دیوی کے چرنوں کے آگے سر جھکا چکا تھا اور پریم دیوی کا سچا پجاری ہی بنا رہنا اُس کے لئے بڑی پرارتھنا تھی، اسی خیال میں مدہوش وہ ہر مخالفت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کو تیار ہو گیا۔ جب اُس کے پتا نے اُس کی ضد اور ہٹ دیکھی تو سخت غصہ ہوئے۔ اسی شدید غصے کی حالت میں اُسے بڑی لعنت ملامت کی، اور دنیا میں ہمیشہ آلام و مصائب کی زندگی بسر کرنے کی بد دعا دیکر گھر سے نکال دیا۔

گھر سے نکلنے کے بعد وہ بالکل مفلس تھا، اِس لئے اس نے پہلے کچھ پونجی جمع کرنے کا فیصلہ کیا اور بعد میں بیاہ کرنے کا، کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سندری اُس کی ہو جانے کے بعد تکلیف اور پریشانی میں زندگی بسر کرے۔ دونوں گاؤں میں اُس کا مقاطعہ ہو چکا تھا، اس لئے اُسے وہاں کوئی کام ملنے کی اُمید نہ تھی۔ اگر اُمید تھی تو شہر میں، اگرچہ وہ سندری کی طویل مفارقت اور جدائی نہیں برداشت کر سکتا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس عارضی جدائی میں اُس کی اور سندری کی آئندہ بہتری کا راز پوشیدہ ہے۔ اسی خیال نے اُس کے ارادہ کو مضبوط بنا دیا تھا۔ جب اُس نے اپنے ارادہ کو سندری پر ظاہر کیا تو وہ گھبرا گئی۔ سخت پریشان ہو گئی اور عاجزی و خوشامد سے اُسے روکنے لگی۔ لیکن جب اُس نے اُسے طرح طرح سے سمجھایا اور جانے پر اصرار کیا تو وہ رونے لگی، اُس کی آنکھوں کی اتھاہ ندی سے محبت کے قطرے ٹپکنے لگے، اُس نے روتے ہوئے کہا تھا "میں یہ جدائی نہیں برداشت کر سکوں گی" اتنا کہکر اُس نے اپنا سر اُس کے سینے پر رکھدیا تھا، موہن نے سندری کو بہت دلاسا دیا اور جلد لوٹ آنے کے وعدہ پر اُسے روتا ہوا چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ پردیس میں اُسے سخت تکلیف اور مصیبتیں اُٹھانا پڑیں۔ کئی روز کام نہ ملنے کی وجہ سے فاقہ کرنا پڑا، آخر بڑی دقتوں اور مشکلوں سے چپکے چپکے چاپ چاپ کر اُس نے کچھ رقم جمع کی اور اُس کو لے کر چھ مہینے کے بعد گاؤں واپس آیا۔ وہ خوش خوش سیدھا سندری کے جھونپڑے کی طرف جا رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا، سورج تیزی سے چمک رہا تھا۔ پسینے میں شرابور جب وہ راستے میں برگد کے درخت کے نیچے سے گزرا تو کسی نے کہا "سندری تو مر گئی" اُسے یقین نہ ہوتا تھا۔ لیکن اُس کا دل خوف و ہراس سے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جوں جوں سندری کا گھر نزدیک آتا گیا اُس کے قدموں کی رفتار سُست ہوتی گئی۔ اُسے اندیشہ ہونے لگا تھا کہیں یہ بات سچ نہ ثابت ہو جائے دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ وہ جھونپڑے میں داخل ہوا، اُس وقت اُس کا سانس رُکا جاتا تھا، گھر میں اُداسی چھائی ہوئی تھی، سندری کی ماں چپ چاپ رنج و غم کی مورت بنی بیٹھی تھی اُسے دیکھتے ہی وہ چیخیں مار مار کر رونے لگی اور روتے ہوئے کہنے لگی "اُس نے تمھارے لئے جان دیدی۔ تمھارے جانے کے بعد کئی روز تک اُس کے منہ میں ایک کھیل بھی اُڑ کر نہیں گئی تھی، چند روز بعد گاؤں کے نمبردار، چوکیدار اور تمھارے پتا آئے اور مجھے اُس کی شادی جلد اپنی برادری کے کسی لڑکے کے ساتھ کرنے پر مجبور کرنے لگے، مجھے طرح طرح دھمکایا، ڈرایا، آخر خود ہی بر تلاش کیا اور بیاہ کا انتظام کر دیا، جس صبح کو بیاہ کا دن تھا، سندری کا پتہ نہ تھا۔ بہت جستجو کے بعد اُس کی لاش بیر کے درخت کے پاس والے کنوئیں سے برآمد ہوئی، اُس وقت اُس کا دماغ چکرا گیا تھا، اُسے یاد نہیں وہ جھونپڑے سے کب اور کیسے نکل گیا تھا، اور حزن و ملال میں ڈوبا ہوا معلوم نہیں کہاں کہاں کی خاک چھانتا پھرا تھا۔

ماضی کے خوشگوار ایام کے آغاز اور اُس کے خونی انجام کی یاد سے اُس کا دل ایک بار پھر بیچین ہو گیا، اُس کی بے رونق مگر دنیا دیکھی آنکھوں سے آنسوؤں سے قطرے گرنے لگے۔ ــــــــ چٹیل میدانوں سے سرد ہوائیں آ رہی تھیں اور جوار کی سفید بالیوں سے لدے ہوئے خمیدہ پودوں کے کھیتوں سے سرسراتی ہوئی گزر رہی تھیں، گزر رہی تھیں اور غم انگیز اداس نغمے پیدا کر رہی تھیں۔

شاہ پارے

از نتیجۂ افکار عالی جناب معلیٰ القاب فرمانروائے ریاست ٹونک دام اقبالہٗ

ٹھمری

جب شام کی مُرلی کان پری		میں جات ڈگریا ٹھاری رہی
گھونگھٹ سے جو واکو دیکھا سکھی		پت لاج اجیرن مو پہ بھئی

انترہ

جب شام نے بپتا دیکھی موری		تب راج نگر کی باٹ لئی
جب برہ اگن میں پھنکن لگی		واہو مُرلی نے سانچے سُر میں کہی
تن من کو جلا دے سُن ری سکھی		جو خاک بھئی اکسیر بھئی		جب شام

ٹھمری

ہے برہ اگن کی آنچ نئی		تن چھور کے جائے من میں لگی
سُلگت ہوں نہ پُوچھے بات کوئی		کانوں پہ دھرت ہیں ہاتھ سبھی

انترہ

جب کوک کروں سنسار ہنسے		جب چُپکی رہوں تو گھاؤ لگے
اس غم کی بِکھا کو کون سُنے		اپنے بھی پرائے ہو کے چلے
میں ہائے کروں تو راج کہے		جب رُوئی جلی تب جوت بھئی		ہے برہ اگن

ٹھمری

کرجور رہی ٹھکرائے گیو		بیدردی موئے تریائے گیو
دِن رین کا چین لیو سجنی		مُکھ مور کے سوتن سنگ بھیو

چور — ٹیگور کی ایک نظم سے ماخوذ

افسر ماہ پوری

دو بیگہ کے سوا میری تمام زمینیں مہاجنوں اور زمینداروں کی نذر ہوگئیں۔ میں نکبت و عسرت کے بھیانک غار میں گر پڑا۔ دو بیگہ زمین کی بساط ہی کیا! دال دلیے پر بھی گزر اوقات کرنا دشوار ہوگیا۔ اکثر فاقہ کرنا پڑتا تھا۔ مگر بُرا ہو غربت کا کہ یہ دو بیگہ زمین بھی جس پر میری تمام زندگی کا مدار تھا، گاؤں کے زمیندار کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ چنانچہ ایک دن زمیندار مجھے بلا کر کہنے لگا۔

"اوپن! ایک خاص کام کے لئے تمہاری زمین کی شدید ضرورت ہے۔ اگر میرے ہاتھوں فروخت کر دو تو بڑی اچھی بات ہوگی معقول قیمت دے دوں گا۔"

"آپ زمیندار ہیں سرکار! آپ کے پاس تو دنیا بھر کی زمینیں موجود ہیں۔ آپ کو مزید زمین کی کیا ضرورت ہوسکتی ہے، اگر ہو بھی تو میں قطعی مجبور ہوں سرکار! صرف دو بیگہ زمین باقی رہ گئی ہے۔ اگر اسے بھی بیچ دوں تو کھاؤں گا کیا سرکار"

"تم میرا مطلب نہیں سمجھے اوپن!" زمیندار چرب زبانی سے کام لیتے ہوئے بولا "بات یہ ہے کہ تمہاری زمین کو اپنے باغ سے ملحق کر کے اس میں بھی پودے لگا دینا چاہتا ہوں۔ اس طرح باغ کی خوبصورتی اور نظر فریبی دو بالا ہو جائے گی۔ قیمت کی طرف سے مطمئن رہو۔ کچھ زیادہ ہی دیدوں گا۔"

میری آنکھوں میں آنسو از خود اُمنڈ آئے، زمیندار کے سامنے میں بالکل مجبور تھا، بالآخر میں نے گلوگیر آواز میں کہا "معاف کیجئے سرکار! مجھے تباہی میں نہ ڈالئے۔ کیا یہ میرے لئے باعث ندامت نہیں ہے کہ صرف دو بیگہ زمین جو میرے باپ دادا کی واحد یادگار رہ گئی ہے اُسے بھی فروخت کر کے نان شبینہ کے لئے محتاج ہو جاؤں؟"

زمیندار کا چہرہ مارے غصّہ کے سرخ ہوگیا، اُس کے بشرے سے خشم و قہر کے آثار نمایاں ہوگئے۔ وہ چند سکنڈ تک خاموش رہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے بولا "اچھا کچھ ہرج نہیں دیکھا جائیگا۔"

ابھی بمشکل دو ماہ گزرے ہوں گے کہ زمیندار نے ایک جعلی ہینڈ نوٹ بنا کر مجھے دونوں بیگہ زمین سے بے دخل کر دیا۔ افسوس! جن لوگوں کے قبضہ میں دنیا کی ساری وسعتیں سمٹ کر آ گئی ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ زمین حاصل کرنے کے لئے بدترین فعل کرنے سے گریز نہیں کرتے ہیں۔

"شاید خدا کو یہ منظور نہیں ہے کہ میں اب دنیا میں زندہ رہوں۔" میں نے دل میں سوچا "اسی لئے تو اُس نے میری بچی کھچی زمین بھی چھین کر زمیندار کو دے دی۔"

یہ خیال کر کے کہ مجھے دنیا کی نعمتوں اور مسرّتوں میں حصہ لینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ میں نے ایک سادھو کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے ہمراہ در در مارا مارا پھرنے لگا۔ گلی گلی کی خاک چھانی۔ میں نے دنیا سے تعلق منقطع

کرکے پرسکون زندگی گزارنے کی متعدد بار سعی کی۔ مگر ہر دفعہ ناکامی ہی سے دوچار ہونا پڑا۔ کیونکہ تنہائی میں اکثر گاؤں کی جدائی اور دو بیگہ زمین کا غم مجھے خون کے آنسو رُلاتا تھا۔

اس کوچہ گردی میں پندرہ سال بیت گئے۔ اب میرے دل میں گھر کا خیال برابر آنے لگا۔ لہٰذا ایک روز اپنے گاؤں کی طرف چل کھڑا ہوا۔

چند دنوں کی مسافت کے بعد میں اپنے گاؤں پہونچ گیا۔ مجھے کتنی مسرت و خوشی ہوتی تھی: گاؤں کے ہرے بھرے کھیتوں نے میرا نہایت پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ گنگا کی فرحناک اور سرور انگیز ہوانے میرے غمزدہ اور مجروح دل کو سکون و اطمینان بخشا۔ کھیتوں کے درمیان ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں، گاؤں کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں آم کے گھنے گھنے جھنڈ میرے دل کو اپنی طرف بے اختیار کھینچنے لگے۔

گاؤں کی معصوم لڑکیاں اپنی اپنی کمروں پر ایک ایک گگری رکھے ہوئے کنوئیں سے گھر واپس جا رہی تھیں، ان کا معصوم دل سینے کے اندر ایک لطیف دھڑکن پیدا کر رہا تھا۔ میں اُنھیں دیکھکر کسی قدر مسرور ہوا! ہر ایک کو میں نے جھک کر سلام کیا، اُنھوں نے مجھے ماں کی طرح دعائیں دیں۔

دوسرے روز گاؤں کی سیر کرنے کے لئے نکلا۔ کمہار کے گھر، بازار، اور مندر سے گزرتا ہوا میں اس جگہ پہونچ گیا جہاں کبھی میرا مکان تھا۔ مگر افسوس! آج اس کا نام و نشان بھی باقی نہ تھا۔ میں تھک گیا تھا چنانچہ میں نے چاروں طرف ایک سرسری نظر دوڑائی۔ زمیندار کے باغ کی دیوار کے نزدیک وہی قدیم آم کا درخت اب تک کھڑا تھا جس کے سائے میں میں نے بہت سے دن گزارے تھے۔ میں اسی کے سایہ میں جا بیٹھا۔

کسی غیر معلوم جذبہ سے متاثر ہوکر میں زار و قطار رونے لگا۔ آنسوؤں نے میرے دل کی بھڑاس نکال دی۔ گزشتہ واقعات ایک ایک کرکے میری نظروں کے سامنے رقص کرنے لگے۔ جیسا کہ میں ایک مرتبہ جب کہ آندھی نہایت تیزی سے چل رہی تھی میں رات بھر جاگتا رہا تھا۔ علی الصباح مالی باغ میں آم چننے کے لئے آیا تھا۔ میں اسی خیال میں غلطاں تھا کہ دفعتاً ہوا کا ایک تند جھونکا آیا۔ میرے پاؤں کے قریب ہی دو پکے ہوئے آم درخت سے گر پڑے۔ میں بہت خوش ہوا اور انھیں حسرتناک نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

اسی اثنا میں باغ کے ایک گوشے سے مالی نکلا اور مجھے بُری بُری گالیاں دینے لگا۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ مگر اپنی بیکسی کا جائزہ لے کر خاموش رہ گیا۔ "دو آم پر اتنا عتاب" میں نے دل میں سوچا۔

مالی مجھے پہچانتا نہیں تھا۔ وہ مجھے پکڑ کر زمیندار کے پاس لے گیا، جو اُس وقت تالاب میں مچھلی پکڑ رہا تھا، اُس کے چاپلوس دوست اُسے گھیرے ہوئے تھے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ جب زمیندار نے کل واقعہ سن لیا تو اس کا چہرہ مارے غصے کے لال بھبھوکا ہو گیا۔

"تجھے مار مار کر ادھ موا کر دوں گا" زمیندار نے گرجکر کہا، اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"آپ تو خواہ مخواہ خفا ہو گئے، میں نے تو صرف دو آم اُٹھائے تھے" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"سادھو کا روپ تجھے سادھو نہیں بنا سکتا ہے! چور بدمعاش" یہ کہہ کر زمیندار اپنے دوستوں کے ساتھ ہنسنے لگا۔

زمیندار کے اس جملے نے میرے دل پر کاری ضرب لگائی۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

"ہاں سرکار! آج کل ریاکار زمیندار تو سادھو سمجھے جاتے ہیں مگر فی الحقیقت سادھو چور" یہ میرے دل کی غمناک آواز تھی جو سینے سے بلند ہو کر ہوا میں منتشر ہو گئی۔

ہیں چشمے ابل رہے ہیں پایاب
[illegible] چل رہے ہیں پایاب
[illegible] تری [illegible]
[illegible] ابل رہے ہیں پایاب

[illegible]

رفتارِ وقت!

ادارۂ کلیم

اُڑیسہ کا سبق!

صوبۂ اُڑیسہ کا سانحۂ جمود اور اس کا معلومہ حل، کانگریسی وزارتوں کی سیاسی فتوحات میں اک طُرۂ افتخار کا اور اضافہ ہے! کانگریس کا قبولِ مناصب اگرچہ ہر لوث اور ضعف سے پاک رہا ہے، لیکن انگریزی سرمایہ داری اور برطانوی سامراج مُسلسل اُسے ترغیب اور ترہیب کی دوگونہ آزمائش میں گرفتار کرتا رہا ہے! اک مُستبد، غاصب حکومت خود اپنی جگہ طاقت اور دولت کی صیدِ زبوں ہوا کرتی ہے، پس اپنی زار و زبوں رعیت کو وہ ان دونوں مذکورہ فتنوں کی کارفرمائی سے بالاتر کیونکر سمجھ سکتی ہے؟! نتیجہ یہ ہے کہ وہ بار بار یہی دوگونہ طلسم اُس پر چلاتی ہے اور ہر ناکامی پر اک تلخ کام استعجاب سے دوچار ہوتی ہے! سے

خدایا! جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے!
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے!

اپنے مدمقابل حریف کا یہ خطاب سننے کی صلاحیت غلط کوش حکومت بمشکل رکھتی ہے کہ سے

بر و ایں دام بر مرغِ دگر نہ　　کہ عنقا را بلند است آشیانہ:

حقیقتہً اس معرکے کے فریقینِ جنگ یہ ہوتے ہیں:

اُس طرف تیغ و تفنگ، اِس طرف اک ذوقِ عمل
جنگ پھر ہوتی ہے دیوانوں کی فرزانوں سے!

شانِ نمرود اُدھر آنِ براہیمؑ ادھر
جا کے ٹکرائے ہیں درویش جہانبانوں سے!

الغرض حکومت اِس ماجرائے عجیب کو نہیں سمجھتی۔ غلط فہمی، غیر معاملہ دانی، غیر مردم شناسی، غلط کوشی، غیر عبرت پذیر ناکامیابی، بے سود دست و پا زنی، یہی اُس کے کاروبار ہوتے ہیں، جو اُس کی آنکھیں اُس وقت جا کر کھولتے ہیں جب کہ نقاب افگنی بھی بے مصرف ہو جاتی ہے! تاج و تخت کے مُتزلزل ہونے سے پہلے تاجپوشوں اور تخت نشینوں کے دماغ معطل اور حواس مختل ہو جایا کرتے ہیں! سے

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ　　جس دل پہ ناز تھا مجھے "وہ دل" نہیں رہا!

بہار اور یو پی میں کانگریسی وزرائے اعظم کو نذرِ تغافل کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر، اب اُڑیسہ میں کانگریسی وزارت کی بیداریٔ حواس و استقامتِ ضمیر کا حکومت نے جائزہ لیا! اُس نے شاید فرض کر لیا کہ خانۂ کانگریس کے ساکنین ابتک سو گئے ہوں گے۔ کیا مضائقہ ہے اگر اُن کے پاؤں کی جوتی اُتار کر اُن کے سر کا تاج بنا دی جائے؟! یعنی وزارت کے ماتحت سیکریٹیریٹ کے اک اہل کار کو صوبے کی گورنرشپ کی شہ نشین پر متمکن کر دیا جائے! یہ کتنی معصوم عیاری اور کیسی محفوظ پس مکمین تیراندازی ہوگی!!

کانگریسی حلقوں کی طرف سے اک ہوش آور جُرعۂ احتجاج پلایا گیا جس سے حکومت کی خود فریبی کا پردہ تو اُسی وقت چاک ہو گیا تھا، تاہم وہ دوسروں کو اپنے پر قیاس کرنے کی انسانی کمزوری سے جلد نجات نہ پا سکی! اُس نے اگرچہ

"گورنر سازی" کی کارروائی کو اک شریف آدمی کے گھر میں "مداخلت بوقت شب کا اقدام" سمجھا تھا تو کانگریسی وزارت کی تنبیہہ کو بھی اک "گیڈر بھبکی" سے زیادہ فرض نہ کیا! پھر دیکھئے کہ اِس قیاسِ فاسد کی اساسِ فاسد پر اربابِ حل و عقد کی قسمت آزمائی کس نوبت تک پہنچی! مسٹر داس وزیر اعظم اڑیسہ جب بغرضِ ادخالِ استعفیٰ، پوری روانہ ہونے کے لئے اپنی کار میں پا بہ رکاب ہوگئے تو اُس وقت گورنر بہار کے قدم متزلزل ہوئے اور اُنھوں نے بذریعۂ ٹیلیفون مائلِ پرواز وزیر اعظم کو مطلع فرمایا کہ "آپ تکلیف نہ فرمایئے۔ میں نے اپنا عزمِ رخصت فسخ کر دیا ہے، اور سارا معاملہ رفت و گزشت ہے! ؎

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر!

تاہم قضیۂ اڑیسہ کا اصلی سبق ایک قدم آگے واقع ہے! "قبولِ منصب" کے وقت یہ اندیشہ کیا گیا تھا کہ کہیں کانگریسی وزرا اِس بخیلانہ آئین کے جامۂ تنگ کے شکنجے میں کچل کر نہ رہ جائیں! جامے کی تنگی میں شک نہ تھا، لیکن قوم پرست وزیروں کی "سیاسی و اخلاقی تنومندی" بھی ہر شک و شبہ سے بالا ثابت ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے زندہ و بالیدہ اجسام نے جامۂ آئین کو کہیں کھینچ تان کر فراخ کر لیا اور کہیں اپنے گداز بدن کے وزن سے اُسے پھاڑ ڈالا! جو مطلق العنان گورنر، منتخب شدہ وزرا پر عرصۂ زیست تنگ کر دینے والے تھے، خود اُن کی ولادت اور وضعِ حمل میں، آج کانگریسی وزیر حائل ہو گئے!

در جہاں مانندِ جوئے کوہسار از نشیب و ہم فراز آگاہ شو
یا مثالِ سیلِ بے زنہار زی فارغ از پست و بلندِ راہ شو!

جو وزارت چھتاری وغیرہم کے لئے اک "دامگاہ" تھی وہ داس و امثالہم کے حق میں اک "ورزشگاہ" بن گئی! ؎

ہر چہ گیرد علتی علت شود "کفر" گیرد کاملے "ملت" شود

(ا-ا-خ)

میسور میں کانگریسی عَلَم کی سرفرازی!

"ودھورا شوا تھم"، ریاست میسور کا اک گمنام گوردہ، شاید جدید العہد تاریخِ میسور میں اُس سے زیادہ یادگار مقام بننے والا ہے جتنا کہ انگلو انڈین ہسٹری آف انڈیا میں نامور قلعۂ سرنگاپٹم! یہی ارضِ دکن کا وہ تاریخ ساز نقطہ ہے جہاں دس ہزار خلق اللہ نے اپنے خونِ گرم سے ملتِ ہند کے عَلَمِ قومی کے ساتھ اپنی بے پناہ عقیدت کا طغریٰ "فائرنگ" کی زبانِ شہادت کی ہمنوائی میں خاکِ میسور کی لوحِ محفوظ پر لکھ دیا! اور پھر اِس عقیدت کے اخلاص کے احترام و خیر مقدم میں دربارِ میسور شریفانہ و فیاضانہ آگے بڑھا، اور کانگریس کے "ترنگے جھنڈے" کو اپنی مملکت کا "ثانوی عَلَم" تسلیم کر لیا! ؎

دیکھیں تو کس طرح اُنھیں ہوتا نہیں اثر
لو آج نامہ لکھتے ہیں خونِ جگر سے ہم!

"شہید کا جو خون" اک "کلیسا" کی تعمیر کے لئے "آب و گِل" بہم پہنچاتا ہے وہ "آزادی کے مندر" کے خاکے کی صورتگری بھلا کیوں نہ کر دیگا؟! شش جہت میں قربانی ہی کے کلمۂ کُن فیکون کی کائنات نظر آتی ہے! ؎

سعئ جرأت ہے نشانِ قیس و شانِ کوہکن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت و کوہسار!

"حادثۂ ودھورا شوا تھم" کے بعد پے در پے جو واقعات ظہور میں آئے اُن کی بلیغ زبانِ حال بجز اِس کے کس حقیقت کی ترجمان ہے کہ سارا سانحہ اک وقتی غلط فہمی کی تباہکاری تھا! میسور، ہندوستان کی اک درجۂ اوّل کی ریاست ہے! "ترقی و تقدم" اُس کی پیشانی پر بخطِ جلی کندہ رہے ہیں! گزشتہ سنین کے اک دسہرے کی تقریبِ سعید پر مہاتما گاندھی نے دربارِ میسور کے نظم و نسق کو "رام راج" کا قریب ترین دستیاب ہندوستانی نمونہ فرمایا تھا! ماضئ قریب کی اِس نیکنام اور روشناسِ ہندوستان "تاریخِ زریں" کی جلد کا ایک جُزو بھلا "ودھورا شوا تھم" کا "ورقِ خونیں" کس طرح بن سکتا تھا؟! نیک محضر ریاستِ میسور کی شاہراہِ ترقی و ارتقا کا جلوسِ رواں ایسے غارِ تاریک کی اُفتاد سے بالا واقع ہوا تھا! چنانچہ وقوعِ واقعہ کی پہلی صدائے بازگشت پر گویا میسور کے نظامِ عصبی کا ایک ایک ریشہ بیدار ہو گیا! اور وہاں کی حکومت نے عاجلانہ تسلسل و تکرار سے متعدد ایسے دلیرانہ اقدامات کا مظاہرہ کیا کہ ہندوستان کی بیشمار نگراں آنکھوں کو جو "خوش جمال میسور" کے رُخِ روشن پر ناگہاں پڑ جانے والی اِس نقابِ تاریک پر مرکوز ہو رہی تھیں، معاً میسور کا اصلی چہرۂ زیبا پھر نظر

آگیا! ع

مبادا ایں جمع را یارب غم از بادِ پریشانی!

سر مرزا اسمٰعیل بالقابہ اور سردار پٹیل کے درمیان جو معاہمتہ عمل میں آئی ہے وہ مستقبلِ قریب کے برطانوی ہند اور "ہندوستانی ہندوستان" کی بغلگیری کا تمہیدی "شیک ہینڈ" ہے!ؔ

شکر ایزد کہ میانِ من و او صلح فتاد
حوریاں رقص کناں ساغرِ مستانہ زدند

عالی جناب مہاراجہ بہادر میسور کی پیشگاہ سے ترحم خسروانہ کے جو ایک سے زائد اعلانات ہوئے اُن میں "شکست خوردگی" کے کسی پہلو کی تلاش کی کاوش، اِس شاہانہ کریم النفسی پر بُرا اخراجِ تحسین ہوگا!ؔ

تو نے ظاہر میں رعایا سے جو کھائی ہے شکست
یہ حقیقت میں ظفرمندیٔ سلطانی ہے!

اگر وہ "عور اشوا کتم" کے شہداء کا خون، قومی پرچم کو اتنا سُرخ رو کرسکتا ہے تو ہم اِسے ناکافی "خونبہا" نہیں سمجھتے! اگر اک غلط کار عاملِ حکومت کا فائرنگ آرڈر، اصل قلبِ ریاست سے تمامی مملکت کے جمہوری رنگ میں رنگ دیئے جانے کے اک نمائندہ کمیشن کے تقرر کی "گلبانگ" کا آہنگِ پیشیں بن سکتا ہے تو ہم اُسے "سینہ شگاف" کیا معنی "سامعہ خراش" کہنے میں بھی تامل کریں گے!ؔ

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستنِ در و من "فتح باب" می شنوم

(ا-ا-خ)

گفتگوئے مُصالحت!

مُسلم لیگی بچوں کو منانے پر چلانے کا بزرگانِ کانگریس نے پھر اک مرتبہ سلسلہ شروع کیا ہے! گاندھی جی کو اِس "سعیٔ بیجا حاصل" کی "لذت" مبارک ہو!ؔ

گفتہ گفتہ من شدم بسیار گو   از شمایک کس نشد اسرار جو!

"مطلوبِ عربدہ جو" کی نزاکتِ طبع کی اِتنی رعایت اِس "مجازی طالب" (مہاتما) کو منظور رہے کہ وہ اپنی اور جناح کی ملاقات کی بِناکی واقعیت کو اِس "عاشقانہ معاملہ بندی" کی زبان میں ادا کرنا پسند کرتے ہیں کہ "میں مسٹر جناح کے جناب میں باریاب ہونے کے لئے جارہا ہوں"!ؔ

مقصد ہے ناز و غمزہ، وے گفتگو میں کام
بنتا نہیں ہے "دشنہ و خنجر" کہے بغیر!

تاہم آپ یہ خیال نہ کیجئے گا کہ مسٹر جناح کی بارگاہِ ناز کے مجلسی آداب کے یہ آخری ممکن حدود ہیں! حاشا وکلا! اس اجمال کی تفصیل آپ یوں سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ ابھی زیرِ ذکر ایامِ گفت وشنید کی افتتاحی تاریخوں میں کہیں بدبختی سے مولانا ابوالکلام آزاد نے برسبیلِ تذکرہ اک نمائندۂ پریس سے اتنا کہہ دیا کہ "آغاز مذاکراتِ صلح اک مثلث نما خط وکتابت کا ماحصل ہیں جس کے ایک فریق مسٹر جناح بھی ہیں"۔ اِس پر ہندوستان کے "مختار الملک"، اسلامی ہندوستان کے "قائدِ اعظم"، ملابار ہل، بمبئی کے "شہزادۂ اسلام" نے معاً اک برقی پیام سے ملکی پریس کو نوازا، جس میں اِس شائبے تک کو مُسترد کیا گیا کہ اُنھوں نے موجودہ گفتگوئے مُصالحت کی سلسلہ جنبانی وطرح اندازی کے کسی ننگ کو گوارا کیا ہے!! ع

بندہ پرور! مگر خدا شدۂ!!

جن بزرگوں کو وطنِ مظلوم کے مسائل ومشکلات سے اِتنی ہمدردی ہے جتنی کہ مسٹر جناح کی ذاتِ "صمدیت مآب" کے اِن کلمات سے مترشح ہوتی ہے، اُنکی "مشکل کشائی" پر ہم ایمان لائے ہیں؟!ؔ

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید   جو نہیں جانتے وفا کیا ہے!

سچ تو یہ ہے کہ مسٹر جناح خود مسلمانانِ ہند کی اک لاعلاج سیاسی مشکل ہیں، نہکہ اُن کا حلِ مشکل! خدا اک عقدۂ دشوار کو ہم نے "ناخنِ تدبیر" فرض کر رکھا ہے! اک "طاعون" کو "تریاق"!

ہاں زیرِ بحث گفت وشنید کے آئندہ مراحل سے اگر آپ اُس کی یاس پروریوں کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو اِس خبر کے اندر اک سُراغِ مستقبل پایئے کہ اب مزید گفتگو جناح اور بوس کے درمیان خط وکتابت کے ذریعے ہوگی! یہ مکتوب "نصف الملاقات" نہوں گے "نصف التفریق" ہوں گے!ؔ

تعلیم رسم مروت کہاں رہی باقی؟   ذریعہ باتوں کا اب جبکہ ٹیلیفون ہوا!

حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ اک دردِ لادوا ہے! اربابِ لیگ کے جو مقاصد مرکوزِ خاطر ہیں وہ تو ناگفتہ بہ ہیں، اور جو گفتنی ہیں وہ تحصیلِ حاصل ہیں! پھر وہ کوئی سمجھوتہ، داد وستد کے اصول پر کرنے کے لئے تیار نہیں! وہ زیادہ

سے زیادہ "بافت" کا بدلہ زیادہ سے زیادہ "طلب" سے دینا چاہتے ہیں۔ اور دوسرے کو زیادہ سے زیادہ پابند کرنے کا نعم البدل ان کے ہاں اپنی زیادہ سے زیادہ آزادی و بیقیدی ہے۔ ان کے فلسفۂ آئینی میں حقوق کے بالمقابل فرائض واقع نہیں ہوتے ہیں۔ صرف حقوق کی "ہوس" ہے۔ کانگریس کی کوئی بات انہیں، کانگریسی وزارتوں کی کرسیوں کے سوا، پسند نہیں یعنی وہ کانگریسی جہادِ آزادی پر تو تبرّیٰ بھیجتے ہیں۔ لیکن اُس کے اثمارِ فتح میں اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اُن کی شرائطِ مفاہمت یہ ہیں کہ "ہم تمہارے یہاں آئیں گے تو کھا کھلاؤ گے؛ اور تم ہمارے یہاں آؤ گے تو کھالاؤ گے"؟ غالباً اِس یک طرفہ معاملت میں اک راز ہے۔ اور وہ یہ کہ اہل لیگ، فریق ثانی کی ساری پیشکشوں اور مراعات کا معاوضہ اپنی طرف سے یہ سمجھتے ہیں کہ "ہم آیندہ اپنی رخنہ اندازیوں اور فتنہ پردازیوں کو ترک کر دیں گے"؟ پس ہم سے کوئی سمجھوتہ کرے تو اس حیثیت سے نہیں کہ ہم کوئی حقدار فریق ہیں جسے اپنا حق ملنا چاہیئے۔ یا یہ کہ ہم کوئی کار آمد ملکی جماعت ہیں جنہیں اپنے سیاسی مستقبل سے مطمئن کر کے استخلاصِ وطن کے معرکے میں دوش بدوش کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس لئے اور محض اس لئے کہ اگر ہماری "دہن دوزی" نہ کی گئی تو ہم تمہارا بھی خواب و خور حرام کر دیں گے بس صرف ہمارے شر سے ڈر کر ہم سے معاملہ کرو۔ اور تمہارے عطیات کی ہماری طرف سے یہ کافی و وافی قیمت ہے۔ کہ ہم اب شرارت نہ کریں گے!!" ـــــ یہ کوئی پارٹی پالیٹکس نہیں ہے، "پولیٹکل بلیک میلنگ" ہے۔

مسلم لیگ کے اربابِ حل و عقد کے یہ آخری ممکنات ہیں! امراء و رؤسا نوابان و تعلقداران کو اگر آپ سارے ہندوستان کی پیشکش بھی نذر دیدیں تب بھی وہ برطانوی سامراج کے خلاف کسی جد و جہد میں شریک نہیں ہو سکتے! آخر الذکر چیز اُن کے دولتمندانہ شاخ و برگ کی بیخ و بنہ ہے۔ اور کوئی شئے امکاناً اپنے مادر و پدر کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتی۔ اگر امراء سے سمجھوتا ممکن ہے تو ہندوستان کے قلعہ نشین برٹش سو لجرز سے بھی اک معاہدے کی طرح ڈالنی بعینہٖ اسی طرح دائرہ امکان میں ہے! ہم سادہ لوح کانگریس کے دماغ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟ آخر اس درد کی دوا کیا ہے!

مسلم لیگ کے عقبی پشتے بھی "مخصوص مفادات" ہیں۔ نہ کہ مسٹر جناح!

جو محض اک "پردہ" ہیں! اگر آج وہ کانگریس سے متفق ہو جائیں "قائد اعظم" کی بلند نشینی سے معزول ہو کر اک "سیاسی مرتد" کے گڑھے میں دھکیل دیئے جائیں۔ کانگریسی مولانا محمد علی مرحوم کا اکثر مسلم حلقوں میں قبل ازیں یہی حشر ہو چکا ہے؛ الغرض جناح انہی مذکورہ بالا اربابِ دولت و ریاست اور ان ہی خطاب یافتہ درباریوں اور حکام رس خواجہ سراؤں کا "وکیل" ہے، جو "اہل معاملہ" نہیں۔ "قائد اعظم" کا خطاب صرف "محنتانے" کا اک جزء ہے جو بجائے نقد کے "جنس" میں ادا ہوا ہے؛ اسی طرح "مختار الملک" کا لقب امراء کے مقدمے میں "مختار نامہ" لگانے کی اک "فیس" ہے! ـــــ پس مسٹر جناح کو فیصلہ کن عنصر سمجھنا بڑی مغالطہ آمیز تشخیص ہے! اصل فریقِ معاملہ محمود آباد و چھتاری ہیں۔ چنانچہ مجوزہ راضی نامے کی شرائط کو "وکیل" نے اپنے "موکلوں" کی طرف رجوع کر دیا ہے۔ جو ۲ جون کو اس کے وکالت خانہ واقع بمبئی میں قدم رنجہ فرما ہو کر اپنے عدالتی نمائندے کو ضروری احکام دیں گے۔

سوال یہ ہے کہ کانگریس پنڈال کی ساری وسعت کے باوجود کیا وہ اتنا فراخ کیا جا سکتا ہے کہ محمود آباد و چھتاری کو اس کے اندر "ایکاموڈیٹ" کیا جا سکے؟!

صلح گرانِ کانگریس کی طرف سے یہ غیر ملفوظ فریاد ہمارے گوش زد ہوتی معلوم ہوتی ہے کہ:

بس ہجومِ نا امیدی خاک میں مل جائیگی یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے!

(ا۔ا۔خ)

کان پور کی اسٹرائک

کان پور کے کارخانجات پارچہ بافی کی "تازہ" آغاز مہیب ہڑتال، سرمایہ داری کی نا اہلی اور بے دردی کی اک پُر شور رسوائی ہے! بہاتما گاندھی سرمایہ داری کی مریضہ کے اک ہمدرد معالج اور دلسوز تیمار دار واقع ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ سرمایہ داری کی اصلاح ضرور کرنی چاہیئے۔ لیکن اُسے منسوخ نہ کر دینا چاہیئے۔ تمام دولتمندوں کو "امانت داران دولت" کے قالب میں ڈھال لو۔ اور پھر تم کو، بالشوک انقلاب کی ضرورت ہے، نہ کمیونسٹ تشدد کی۔ نہ ڈکٹیٹر شپ آف دی پرولیٹریٹ" کی! امراء اور غربا زیادہ سے زیادہ بس ذرا بے فکر والدین اور قدرے محروم نظر

مہرِ اولاد کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور تھوڑی سی تعلیم و تلقین اور بیداریِ ضمیر و سلسلہ جنبانیِ کرم کے بعد دونوں کے درمیان صلۂ رحمی کے تعلقات بحال ہوسکتے ہیں! ـــ مہاتما جی کی نیکی و معصومی کا یہ اک نہایت خطرناک پہلو ہے۔ جس چیز کو وہ "بھائی" کہتے ہیں اس کی تاریخی سپشت پر روزِ ازل سے لے کر کسی وقت بھی کوئی ایسی شئے کبھی معرضِ وجود میں نہ رہی جو "بجز طبقاتی آویزش" کے "مادر و دختر کی آمیزش" کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہو! بلاشبہ ایسے افراد بکثرت ہوئے ہیں جنہوں نے اس اِذعان کو اپنے سینوں میں پایا کہ وہ ایک ہی خاندانِ آدم کے ارکان ہیں جن کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر انہوں نے کھانا کھایا۔ وکٹر ہیوگو کی لامزریبل کا "بشپ" اک ایسی ہی ہستی تھا۔ سقراط اسی امتِ بشری کا اک دوسرا داعی تھا۔ مسٹر ایچ۔ جی ویلز زندۂ و زندہ جاوید مورخِ "تاریخ عالم" اک ایسا ہی عالمی دل و دماغ رکھتا ہے۔ جو دنیا کو "ہمارا بڑا گاؤں" کہتا ہے۔ خود مہاتما گاندھی اسی سلسلۂ عالیہ کے اک حلقۂ زریں ہیں۔ اور پھر تاریخ کی سب سے بڑی بوالعجبی یہ ہے کہ سوشیلزم و کمیونزم کا پیغمبر، کارل مارکس۔ شائی لاک کا ہم نسل تھا۔ اور ساری دنیا کے لکھ پتیوں اور کروڑ پتیوں کی دولت کو۔ محرومین و مساکین ارض کے لئے حلال کردینے والا ا بہی قارونوں اور فرعونوں کے بڑے بڑے لمتہائے ترسے "تا زیست گریزاں و روگرداں رہا!

تاہم سب کچھ کہنے کے بعد حقیقت اس سے آگے نہیں بڑھتی کہ یہ سب "افراد" کی داستان تھی، افراد کی! لیکن ناپیداکنار انسانی جنگل کے یہ معدودے چند گل و شگوفہ اس "نیستانِ سوسائٹی" کے منظرِ خارزار میں کوئی قابلِ شمار تبدیلی پیدا نہیں کرتے۔ ایسے افراد دردِ انسانی کا درماں بننے میں جتنے "کامیاب" ہیں اتنے ہی "کمیاب" ہیں۔ ان کو کثیر التعداد، عامۃ الورود اور سہل الوصول سمجھنا اس قدر نیک خواہی نہیں جس قدر کہ بدعقلی ہے! اگر میر آج موجود ہوتا تو گاندھی جی کو بتاتا کہ: ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں   تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں!

اخلاقی و معاشی و اجتماعیاتی فلسفیوں نے اسی حقیقت کو "اخلاقی فرد اور اخلاق سوز سوسائٹی" کے اصطلاحی کلمات میں بیان کیا ہے! ع نیست

جز انساں دریں عالم کہ بسیار ست و نیست!

اس وقت کان پور کے سرمایہ داران، "اجتماعی طب" کے دار التشخیص میں کھڑے کئے جاچکے ہیں۔ اب گاندھی جی دیکھ لیں کہ ان مریضوں کی "ہتنان الرمی" حرکاتِ مذبوحی کے چارٹ کے اندراجات کیا بتاتے ہیں۔ ان "امانت داران دولت قومی" نے کارخانجات کان پور کی گذشتہ متعدد و متواتر ہڑتالوں میں فاقہ کش و نشانۂ فائرنگ مزدوروں کا رقصِ بسمل دیکھا! "تا ایں حرفت" کے مراعاتی قانون سے پورا فائدہ اٹھانے کے باوجود مزدوروں کی اجرت کو قوت لایموت کے پیمانۂ تنگ تک بھی نہ پہنچایا! روئی کے بھاؤ کے گرنے کے نتیجے میں ہندوستانی کاشتکار کو کروڑوں کا مجموعی خسارہ ہونے کے علی الرغم، کارگاہوں کے بازاری ساختہ کپڑے کے نرخ میں مطلق کسی تخفیف پر آمادگی کا اظہار نہ کیا۔ حکومت کی مامور کردہ تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے "پاک حساب" کے سارے ادعا کے باوصف محاسبۂ کتبِ حساب سے مجرمانہ گریز کیا۔ کانگریسی وزارت کی تنبیہ پر بھی کمیٹی کی نہایت معتدل سفارشات کو عملی جامہ پہنانے سے انکار کردیا۔ حکومت کی حزمگیری پر خود اس کی مقرر کردہ کمیٹی کو گوناگوں اصطلاحی بے ضابطگیوں کے ارتکاب کا ملزم گردانا۔ لیبر کمیٹی سے اشتراکِ عمل کرنے کے بجائے اُس کے ارکان کو عین وقتِ آخر پر اپنی سفارشات میں ترمیم و تحریف کرنے کی سازش کی اثر آفرینی کی! ابتدائی اعلانِ اسٹرائک کے بعد کارخانوں کو کھلا رکھنے کی کوشش کی اور ہڑتالی مزدوروں کے راستے میں لیٹے ہوئے اجسام کو "خرامِ نازِ کار" سے ٹھکراتے ہوئے اپنی فیکٹریوں کے دفتروں کے کاشانوں میں درآتے ہوئے چلے جانے کی معشوقانہ جفاکاریوں کی نمائشیں کیں! چالیس پچاس ہزار کے درمیان مزدوروں اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ نفوس رکھنے والے مزدور خاندانوں کے زن و بچہ کو بے آب و ناں اور شاید بے خانماں چھوڑ کر نینی تال۔ شملہ اور ولایت کی بہشتوں کی طرف رفع الی السماء فرماگئے! ـــ سبحان اللہ بریں "امانت داریِ دولتِ قومی"! صلِّ علیٰ بریں "علاج پذیریِ سرطانِ سرمایہ داری"!

ہندوستان کے سرمایہ دار مہاتما گاندھی کے اُپدیشوں پر اُس سے بڑھ کر شرحِ صدر کا ثبوت نہیں دے سکتے۔ جتنا کہ پریزیڈنٹ روزویلٹ کے پروگرامِ تجدیدِ معیشت پر امریکن ملوک التجار نے دیا ہے ؎

مایۂ طینتِ آدم ز خمیرِ دگر است   تو توقع ز گِل کوزہ گراں میداری!

موجودہ لمحے پر بھی ارتقا یافتہ بشریت کی پسماندگی کا یہ نقشہ ہے: ؎

ہاں نوعِ بشر "میں" بچیں ہے اب تک   انسان رہِ راست پہ نہیں ہے اب تک

اللہ کو ہو مژدہ کہ حبا مد انساں — تھا روز ازل جہاں وہیں ہے اب تک!

بشریت کا دیرینہ سرطان، نیز اس کے لئے اک جدید فاتحکار جراحانہ نشتر یہ ہے:

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب — در جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب! انقلاب اے انقلاب!! (ا۔ا۔ غ)

لیبر کمیٹی

لیبر کمیٹی کے نام سے آل انڈیا نیشنل کانگریس نے اک جداگانہ ادارہ قائم کیا ہے۔ جس کے اغراض و خدمات کی نوعیت کا اک عمومی تصور اُس کے نام ہی سے قائم کیا جا سکتا ہے، یہ جدید صیغہ آئندہ کے ہندوستان گیر کانگریسی ایوانِ حکومت کا اک پورا با پر و بال مستقل محکمہ بن سکتا ہے۔ اور یہ امکان بھی چنداں بعید نہیں کہ وہ مستقبل کی سوشلسٹ حکومتِ ہند کا تخم ثابت ہو؎ شاید کہ ہمیں بیضہ برآرد پر و بال!

بمبئی۔ یو پی۔ بہار اور بڑودہ وغیرہ میں حرفتی مزدوروں کی زندگی و ملازمت کے حالات کی جو تحقیقات ماضی قریب میں عمل میں آئی ہے۔ بے روزگاروں کے بارے میں جو اعداد و شمار جمع کئے گئے ہیں۔ اوقات خدمت کی ساعات میں جو تخفیف اور مقدارِ اُجرت میں جو اضافہ ہوا ہے۔ افرادِ مرض و ہرج میں جو رعایتیں منظور ہوئی ہیں۔ زنانہ مزدوروں کو ایامِ وضعِ حمل و ابتدائی زمانہ زچگی میں جن مراعات کی سفارش کی گئی ہے۔ نیکر ٹریڈ یکٹ کی جو توسیع عمل میں آئی ہے۔ بچہ بردار مزدور عورتوں کی خدمت کے کارخانجات و مقامات میں سوویٹ آدابِ حکومت کی اتباع میں شیر خواروں کے لئے جن گہواروں کی مبارک حدت کا اجرا کیا گیا ہے، وغیرہ ذٰلک۔ اِن تمام حرفتی و مزدوری والے عنوانِ حیاتِ وطن کے تحت جس قدر قابلِ ذکر و داد تازہ نشو و نما مختلف کانگریسی صوبوں اور بعض ترقی کوش ریاستوں کے اندر ظہور میں آئی ہے، اُس پر اِس لیبر کمیٹی نے اظہار استحسان کیا ہے اور اِن سرگرمیوں کی مزید ترقی و توسیع کی باصرار و تکرار متعلقہ جماعتوں اور حکومتوں سے فرمائش و سفارش کی ہے۔ کانگریس کا یہ اہم شعبہ ہمارے پُرجوش خیر مقدم کا مستحق ہے! (ا۔ا۔ غ)

ماہرین کی کمیٹی

کانگریسی صوبجات ہند کے وزرائے اعظم نے اپنے حال کے اجتماعِ بمبئی کی تقریب سے "ماہرین کی کمیٹی" کے قیام و انتخاب کی اک غیر معمولی تجویز پیش کی۔ اِس اجمال کی کچھ تفصیل ملاحظہ فرمایئے:

ماہرین فن کی ایسی کمیٹیاں جو مخلوط و مشترک علمی و فنی و حرفتی و حکومتی مسائل و مہمات پر متعلقہ ارکانِ حکومت کو مشورہ دیں تاکہ آخرالذکر کی تعمیری تجاویز بیش از بیش کامیابی سے بار آور ہوں، اپنے وسیع ترین مالہ و ماعلیہ میں اک بالکل جدید العہد تصور ہے۔ مہذب ممالک کی حکومتیں اگرچہ صدیوں سے دینی تسلط سے آزاد ہو چکی ہیں اور اسی تقریب سے "ایوان حکومت اور حرم کلیسا کا افتراق" عمل میں آیا ہے، لیکن اِس الہامی محور سے لنگر گسستہ ہو جانے کے بعد اُن کو کوئی دوسرا سفینہ مرکزِ ثقل بھی نہیں ملا ہے۔ ان کا عام ترقی پسندانہ، متمدن زاویۂ نگاہ کافی نہیں کہا جا سکتا۔ عالمِ غیب کے الہامی دین سے اِن ریاستوں نے جو رہائی حاصل کی تھی وہ عالمِ ظاہر کے مثبت علم و سائنس کی علم کشائی پر کی تھی۔ لیکن اِس پس منظر کی روشنی میں انتقالِ حکومت کا داخل خارج عین صحیح فریق کے نام نہ ہوا۔ ہم "پادریوں" کے پنجے سے چھوٹے اور "پالیٹشنوں" کے چنگل میں پھنس گئے! علم کی حکومت نہ وہ تھی، نہ یہ ہے! ہمارا نقلِ مکان، کورانہ عقیدے سے عام سیاسی توہمات اور قوم پرستانہ تعصبات کو ہو گیا۔ ضرورت تھی کہ گلو خلاص شہری کا ہاتھ جہل و جمود سے چھڑا کر عین علم و فن، تقدم و تمدن کے دست بیعت میں دے دیا جائے، اور جاہل پادری اور عامی سیاسی ہر دو کو سر رشتۂ حکومت سے خارج البلد کر دیا جائے۔

انسانی دماغ ابھی تازہ تازہ ہی اس تصور کی علی الاطلاق وسعت و قطعیت سے آشنا ہوا ہے۔ چنانچہ اس مسلک سیاست و حکومت کی ترجمانی کے لئے جو اصطلاحی نام تجویز ہوا ہے وہ "ٹیکنوکریسی" (Technocracy) ہے! — یعنی نظم و نسق علم و فن!

کانگریسی وزراء کی مجوزہ "کمیٹی ماہرین" اسی تصور کا خواب ابتدائی ہے! اور اسی نئی "تدبیر امر" کا نقش اول۔ ان حکومتی کمیٹیوں کے

ایک پیش کردہ رُکن، سر وِشوِیشوَریا دُنیائے صنعت و انجنیرنگ کے ایک منارہ عظمت و جلالت واقع ہوئے ہیں۔ (ا۔ ۱۰ ۔ خ)

دہلی اور نئی دہلی!

دہلی کی میونسپلٹی میں ماہِ مختتمہ کے دوران میں میونسپل کمیٹی کے غیر سرکاری صدر کی تائید میں ایک بلند آہنگ ریزولیشن پیش ہوا۔ جس پر ایوان کی دونوں پارٹیوں کے درمیان ہنگامہ خیز مجادلہ ہوا۔ مابہ النزاع یہ چیز تھی کہ پایۂ تخت سلطنتِ ہند کی ۷۵ سالہ میونسپل کارپوریشن کی "پیرنابالغی" کا یہ کیا حال ہے کہ بایں ہمہ ریش و فش اُس کی مسند صدارت پر اس کا خضرِ راہ ایک سرکاری حاکم چلا آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کہاں تک قابلِ برداشت شرمناکی ہے؟!

دلی صدیوں اور قرنوں سے ہند و یا مسلمان سلطنتوں کی تختگاہ بنی ہوئی ہے۔ پس اُس کے رگ و ریشے میں طاقت کے سامنے سجدہ ریزی کا ذوق مخمر ہو چکا ہے۔ سلطنتوں کے پایۂ تخت سیاسی سطوت کے "قلعے" ہوتے ہیں اور اخلاقی بزدلی کے "زنانخانے"! یہاں کا ہر شخص طبعاً ایک "امیر" ہوتا ہے، اور ہر امیر فطرتاً ایک "خواجہ سرا"! دلی کا ایک ایک چپہ اور اُس کے کرۂ باد کا ایک ایک جرعۂ ہوا اِسی روح کی پرورش کا دیرینہ دایۂ خانہ ہے۔ پس عہد جدید کی ساری طاغوت شکنیوں کے علی الرغم یہاں کا قدیم الایام "سیاسی سومنات" آج بھی خاصا باآب و تاب ہے۔ البتہ اس معبد کے مجاوروں کی اکثریت محمودِ غزنوی اور ابراہیم خلیل اللہ کے نام لیوا مدعیوں کے خانوادوں سے بھرتی ہوا کرتی ہے!" ؎

اگر حقیقتِ اسلام در جہان این ست   ہزار خندۂ کفر ست بر مسلمانی!!

چنانچہ انگلستان کے "سیاسی سینٹ پال" میں جو زلزلہ زیرِ ذکر میونسپل ریزولیشن سے ڈالا گیا اُس میں ایک سے ایک بڑھ کر "ستونِ اسلام" اور "بُرجِ توحید" نے اس کی متزلزل بنیادوں کی پشت پناہی کی؛ اور اپنے عقیدے میں اپنے "صنمِ کبیر" نیز اپنے "نفعِ کثیر" دونوں کے تحفظ کی ضمانت کر لی! ؎

تو جو چاہے تو بنے خاک بھی اک بندۂ پاک   میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے!

اللہ اللہ سرکاری صدر کا "ظلِ الٰہی"! — اگر آپ کہیں کہ غیرت قومی کے لئے یہ تصور بھی کس درجہ شرمناک ہے تو معاف فرمایئے۔ ہماری "قوم" جاہلون" کی آنکھوں پر ایسے حجاباتِ غلیظ پڑے ہوئے ہیں کہ وہ اس ذلت آفرینی کے دیکھنے سے قطعاً قاصر ہے: ساتھ ہی "خان بہادر" اتنا بلند بانگ اسمِ اعظم ہے کہ ہر جاہل کا سامعہ اُس کے تلفظ ہی پر مرعوب ہو جاتا ہے:

نئی دلی کی حالت "پرانی دلی" سے کہیں زیادہ ناگفتہ بہ ہے۔ بر اعظم ایشیا کا یہ جدید ترین شہنشاہی شہر دقیانوسی ترین آئینی زندگی رکھتا ہے؛ یعنی اس کی بلدۂ عالیہ کے ایوانِ ذی شان کی کرسیوں کو ایک بھی منتخب شدہ ممبر کی نشست داغدار نہیں کرتی: یہ "پارلیمنٹوں کی والدۂ ماجدہ" والی قوم کا ایک "آزاد شہر" ہے۔ یا قبلائی خاں و چنگیز کا مستقرِ استبداد "حصارِ کان بلو"؟ (ا۔ ۱۰ ۔ خ)

یورپ

یورپ کے سیاسی ہیجان و بحران کی "دیگ" سکون و تبرید پر آتی معلوم نہیں ہوتی۔ مسٹر چیمبرلین صدر اعظم برطانیہ، اپنے محبوب عقیدے میں ایک نسخۂ شفا لے کر اُٹھے تھے۔ جس کی نسبت اُن کا راسخ ایمان یہ تھا کہ اگر "اللہ شافی۔ اللہ کافی" کے زمزمہائے دُعا کے زیرِ سایہ اُس کے پلانے کا موقع انہیں دیا گیا تو وہ "فرنگی بر اعظم" اور اس کے بعد ہفت اقلیم کے امن رفتہ کی متاع گم گشتہ کو آپ کی ہتھیلی پر لا کر رکھ دیں گے! — انہوں نے پہلے تمام یورپ پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور بیک نظر اس کے ماؤف ترین نقطۂ بدن پر اُنگلی رکھ دی! یہ عبارت تھی اٹلی سے!

انہوں نے کہا کہ یورپ کا اصل "فتنہ گر" مسولینی ہے۔ اور اس کے جذبۂ فتنہ گری کا فوری علاجِ شافی ایک معاہدہ ہے۔ یہ معاہدہ اتنی فاتحکار چیز ہے کہ اگر "ٹریفالگر اسکوئر" "نادر" کی چوٹی پر کھڑے ہو کر بھی وہ اُس کی اثر آفرینی مسولینی سے کریں تو مُنافیِ مُدبری کوئی بات نہ ہوگی۔ بوڑھے، لاغر اندام چیمبرلین کا دل ایسا لوٹ کے مسولینی کے نستعلیق خط و خال پر آیا کہ مجنوں کے عشقِ لیلیٰ کا رومان سرد پڑ گیا ہے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ — کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے!

اٹلی کے "آہنگر زادے" پر پہلی قربانی مسٹر چیمبرلین نے اپنے نوجوان فرزندِ سیاست کپتان ایڈن کی چڑھائی جس غریب نے اضطراراً کہہ دیا تھا کہ آپ کس مردم دُزد کو اپنا "دلبر" بنا رہے ہیں؟" صاحبِ حال چیمبرلین نے ایڈن کو جھڑک دیا! اور ع

گفت خاموش شو تو مجنوں نیستی

بالآخر چیمبرلین اور مسولینی کی بغل گیری میں حائل کوئی کانٹا نہ رہا، اور آزادانہ ان کی پیش کش عشق کے کاروبار شروع ہوئے۔ وزیر اعظم انگلستان نے بحر الروم کے پورے نصف پانی سے آتش خوار "آل ڈیوس" کا غضب ٹھنڈا کیا! لیکن قبل اس کے کہ اس عملی تدبیر کے اثرات مترتب ہوں۔ ہر ہٹلر اپنے "کارخانہ کرپ" کے سارے جہنم کی حرارت کو اپنی جلو میں لئے رومہ آدھمکا! اُس نے اپنے گرمجوشس معانقے اور آتش افروز خطبوں سے اٹلی کی فضا میں "جوّ نزلۂ حار" کی امواج پیدا کیں اُن کی پیمائش آپ مسولینی کی مابعد تقریر جنیوا سے کیجئے۔ جس میں اعلان کیا گیا کہ "اٹلی اور جرمنی کا اتحاد غیر متزلزل ہے۔ دونوں کو جو طاقت و نصرت نصیب ہوئی ہے وہ ایک دوسرے کی پشت گرمی کا نتیجہ ہے۔ جرمنی کا الحاقِ آسٹریا پر ہمارا صاد لوگوں کو بُری طرح چراغ پا کرچکا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ ۱۹۳۶ء کے حالات اب اک قصۂ پارینہ بن چکے ہیں مستقبل کی لا محدود دُوربیوں تک رومہ اور برلن عناں بعناں نظر آتے ہیں"

چنانچہ اسپین سے مسولینی کی موعودہ دست کشی نے یہ کرشمہ دکھایا کہ فرینکو کے دست و بازو میں شاید وہ چند قوت آگئی۔ اور اس نے سارے اسپین کو بحر اوقیانوس اور بحرالروم کے سواحل کے درمیان پامال کرڈالا!

انگلستان کے بعد اب فرانس دوسرا شکار ابلہ فریبی بن رہا ہے وہ جب انگلستان کی سی تلون پیشگی سے قاصر نظر آیا تو ہٹلر نے اپنے تازہ دم جیوش قدرتی حصار پیرنیز پر دوڑا دیئے! تجویز یہ ہے کہ انگلستان کے بے دردانہ و بزدلانہ سکوت سے فائدہ اٹھاکر فرانس کو مرعوب و مغلوب کرلیا جائے۔ رُوس سے بھی اس کے روابط دوستی منقطع کردیئے جائیں اور سارے خرخشوں کو صاف کرکے دنیا کا اک نیا نقشہ بنایا جائے جس پر فرانس اور انگلستان سے طوعاً یا کرہاً دستخط کرائے جائیں۔ کشورکشائی کا یہ بے پناہ جلوس رواں دواں ہے۔ آجکل وہ زیکوسلواکیا کی جرمن سرحد کو تھپیڑے دے رہا ہے۔ بہت جلد یہ امر مقدر اخبارات میں افسانۂ بزم و انجمن بن جائے گا۔

(۱۰۱۰ خ)

دیکھئے اور ذرا غور فرمائیے کہ پروگریسو کمپی ٹیشن صرف چھ آنے صرف کرنے پر آپکی خدمت میں پیش کر رہی ہے
داخلہ ۲۱ جون ۱۹۳۸ء تک
نتیجہ ۲۸ جون ۱۹۳۸ء کو
گارنٹی
WIN
Rs 3,000
تفصیل انعامات
عشق ماہی و سحر و داستان
۳۰۰۰
تین ہزار روپیہ

دِلّی کا سنبھالا — تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ / نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز — خواجہ محمد شفیع دہلوی نے دہلیٔ مرحوم کی داستانِ الم، اس کے ایامِ عروج کی مرقع نگاری، صاحبانِ کمال کا تذکرہ اس ٹکسالی زبان میں کیا ہے جواب نابود ہے، اندازِ بیان ایسا موثر کہ دل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ کتابت، طباعت اور تجلید کے لئے مکتبہ کا نام کافی ہے۔ صفحات ۱۰۵ قیمت فی جلد ایک روپیہ

لطائفِ غالب — مسز ایم۔ اے۔ شاہ۔ پی۔ ایس۔ سی۔ ایف۔ پی۔ ای۔ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی شوخیٔ بیان، خوش طبعی اور ظرافت سے محظوظ ہونے کے لئے اسے ضرور پڑھئے۔ قیمت ایک روپیہ۔

شعلۂ طور — طبع ثانی "شاعرِ فطرت حضرتِ جگر مرادآبادی کے کلام کا مجموعہ، جو حضرات شعلۂ طور پر ایک دفعہ بھی اُچٹتی ہوئی نظر ڈال چکے ہیں وہ؟ اس طرح لئے پھرتے ہیں جیسے کہ لوگ زمانۂ انقلابِ فرانس میں "معاہدۂ عمرانی" لئے پھرتے تھے۔ اس ایڈیشن میں چند نئی ساحرانہ غزلوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ بالکل نئی ترتیب۔ از حد دیدہ زیب۔ پنج رنگی سنہرا کور۔ اور جگرؔ کی ایک بینظیر تصویر۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

سبدِ چین — مرزا غالبؔ کے کمیاب بلکہ نایاب فارسی کلام کا مجموعہ۔ اس میں قصائد۔ قطعات۔ مثنویاں، ترکیب بند۔ ترجیع بند۔ غزلیات اور رباعیات سب کچھ شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مرزا غالبؔ کی مکمل سوانح حیات اور تصنیفات کا تذکرہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲/ (

ذکرِ غالب — مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی مکمل سوانح حیات، اب تک مرزا صاحب کی سوانح حیات پر یادگارِ غالبؔ۔ غالب اور غالب نامہ چھپ چکی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود غالبؔ کی زندگی کے بہت سے ایسے پہلو تھے جو تاریکی میں تھے۔ چنانچہ اس کتاب میں تمام ممکن ذرائع سے معلومات فراہم کرکے غالبؔ کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ غرض یہ کتاب اتنی جامع اور مختصر ہے کہ شعر و ادب کا ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے عموماً اور یونیورسٹی کے طلبا کے لئے خصوصاً ازبس مفید۔ قیمت آٹھ آنے

قرآن پاک کیا ہے اور اُس نے کیا کر دکھایا! — یہ کتاب بچوں کی نفسیات، شعور اور استعداد کو مدِ نظر رکھ کر آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ قرآن پاک آنحضرتؐ پر کس طرح اُترتا تھا، آپ کس طرح لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ کیسے اس کی حفاظت آپؐ نے اور آپ کے بعد صحابہ کرام نے کی۔ اور کیسے اُس نے لوگوں کے دلوں پر اثر کیا۔ بہت مفصل مع مثال قیمت چھ آنے

دِلّی — بچوں کے لئے دہلی کی خاص عمارتوں کا دلچسپ بیان، جس کے پردے میں دہلی کی مختصر تاریخ بتا دی گئی۔ بلاک کی چھ تصاویر۔ اُجڑی اور بسی ہوئی دہلیوں کے دو نقشے۔ قیمت چار آنے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی ــــ نئی دہلی ــــ لاہور